بھٹو کے مقالات

مرتّب: احمد سلیم

بھٹو کے مقالات

ترتیب و تہذیب

احمد سلیم

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

ناشر	:	میر شکیل الرحمٰن
اشاعت اول	:	اگست 1996ء
تعداد	:	500
قیمت	:	300 روپے
زیر اہتمام وادارت	:	مظفر محمد علی
پبلشر	:	جنگ پبلشرز (جنگ انٹرپرائزز لیمیٹڈ کا ذیلی ادارہ)
پرنٹر	:	جنگ پبلشرز پریس 13 ۔ سر آغا خاں روڈ لاہور

انتساب

دخترِ مشرق بے نظیر بھٹو کے نام

www.bhutto.org

www.bhutto.org

فہرست

حصہ اول ...... آفاقیت اور قوم پرستی کے درمیان 21
(زمانہ طالب علمی کی تحریریں)

دنیا کا آفاقی تصور 23

اسلامی میراث کے خدوخال 27

نیویارک کے تاثرات 41

نوع انسانی کی آفاقیت 45

پاکستان کی بالیدگی 49

دوسرا حصہ ...... آئینی مسائل

پاکستان ایک وفاقی یا وحدانی ریاست 53

ون یونٹ کا پھندہ 65

آئینی روایات 67

آئین کے لوازمات 73

www.bhutto.org

تیسرا حصہ ...... بین الاقوامی قانون

سیاسی اور قانونی تنازعات کا فرق 93
جارحیت کی تعریف 103
علاقائی سمندری حدود 115
بین الاقوامی قانون میں دریا کے ساحلی باشندوں کے حقوق 127
اقوام متحدہ کے تاثرات 131

چوتھا حصہ ...... خارجہ پالیسی اور بیرونی معاہدوں کی سیاست

پاکستان ..... بیرونی دنیا کی نظر میں 141
خود حفاظتی کے معاہدے اور علاقائی انتظامات 143
پاکستان اور بیرونی معاہدے 155
(ا)
(ب)
مشروط امداد 193
کیا غیر ملکی امداد خیرات ہے ؟ 199
پاکستان اور روس کے مابین تیل کا معاہدہ 215
تخفیف اسلحہ کے مسائل 219
پاک ، چین سرحدی معاہدہ 227
اقوام متحدہ اور عالمی امن 235
دو طرفہ تعلقات 241
پاکستان اور نیوکلیائی افزودگی 249
پاک ، چین دوستی کی سیاسی بنیادیں 253
آر سی ڈی ..... چیلنج اور جواب 257
دو طرفہ تعلقات کا نظریہ ..... نئی سمتیں 265

پانچواں حصہ ...... پاک بھارت تعلقات اور کشمیر

پاکستان کی تباہی کے لئے نہرو پلان (ذوالفقار علی بھٹو کی ایک انتہائی خفیہ فائل) 289
جموں و کشمیر ..... اساسی دستاویز 305

www.bhutto.org

کشمیر آزاد ہو کر رہے گا 313
اعلان تاشقند 315
تاشقند کی کہانی 321

چھٹا حصہ...... ایوب حکومت کے ساتھ ساتھ

پاکستان کے دوسرے پنجسالہ منصوبے کی اساس 329
ہمارا صدر اور انقلاب 341
سندھ کے کاشتکاری نظام کی اصولی تنظیم 353

ساتواں حصہ...... ایوب کے خلاف جدوجہد اور اس کے بعد

صحافت میں میرا پہلا قدم 357
ایک نئی پارٹی کیوں ؟ 369
پاکستان کی سیاسی صورت حال 377
اپوزیشن جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت 411
گورنر مغربی پاکستان کو جواب 415
حلفیہ بیان 431
رٹ پٹیشن واپس لینے کی وجوہات 465
انتخابات اور تحریک 469
مذاکرات 487
ہمارے عہد کے سیاسی مسائل 489

آٹھواں حصہ...... عظیم المیہ

مشرقی پاکستان کی صورت حال 497

نواں حصہ...... تیسری دنیا

تیسری دنیا کے افلاس زدہ عوام 503

دسواں حصہ...... پھانسی کے سائے تلے (خطوط)

میری سب سے پیاری بیٹی 515

www.bhutto.org

www.bhutto.org

مقدمہ

بھٹو: سیاسی منظر نامہ اور ذہنی ارتقاء

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں قائداعظم کے بعد جس شخصیت نے تاریخ کے صفحات پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اور عوام کے انتہائی مقبول رہنما ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت ہے۔ بھٹو کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ان کے بارے میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں طالب علم بھی ہیں، خواتین بھی ہیں، قانون دان بھی ہیں، سیاسی مدبر بھی، ادیب اور شاعر بھی ہیں اور محنت کش عوام کے نمائندے بھی۔

لکھنے والوں نے بھٹو کی زندگی اور جدوجہد کے ہر پہلو کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک عوامی سیاست دان بھی تھے اور قومی اور بین الاقوامی سطح کے ایک عظیم سیاسی مدبر بھی۔ انہوں نے ایک طرف عوام میں آزادی، انصاف اور مساوات کے شعور کا پرچم بلند کیا تو دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر سامراج سے نبرد آزما مظلوم مگر خوددار قوموں کی حمایت کا نعرہ بھی لگایا۔ مزدور، کسان، عورتیں، دانشور، اقلیتیں، بچے کوئی بھی ان کی انسان دوست توجہ سے محروم نہیں رہا۔ بھٹو کے سوانح نگاروں نے خارجہ تعلقات اور بین الاقوامی امور میں ان کے تخلیقی کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس میدان میں انہیں بے حد سراہا ہے۔ دوطرفہ تعلقات کا ان کا نظریہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا۔

ذوالفقار علی بھٹو جن کا انہوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے، سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ لکھنے والوں میں ان کے حامی ہوں یا مخالفین، بھٹو کی زندگی اور شخصیت کے ہر پہلو پر تفصیل اور باریک بینی سے

www.bhutto.org

روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کے ابتدائی دور کی مصروفیات اور ان دنوں کے ان کے سیاسی خیالات کو سبھی نے بری طرح نظرانداز کیا ہے۔

58 - 1948ء کا دس سالہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا وہ دور ہے جب اس کی آغوش میں سیاسی غلط کاریوں کے طوفان پل رہے تھے اور آمریت کے اتحاد ثلاثہ (غلام محمد، ایوب اور اسکندر مرزا) نے اس بدقسمت ملک اور اس کے عوام کے مقدر سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس دور کا آغاز قائداعظمؒ کی رحلت سے ہوا۔ 1951ء میں امریکہ نے راولپنڈی سازش مقدمے کے نام پر ایک ڈرامہ رچایا اور پاکستان کے طالع آزما فوجی سربراہ ایوب خان کو اقتدار پر قبضہ کر لینے کی ترغیب دی۔

اسی دور کے ابتدائی برسوں میں آئین کی تشکیل کی کوششوں کو سبوتاژ کیا جاتا رہا۔ 1953ء میں لاہور میں مارشل لاء لگا کر فوج کو اقتدار پر قبضہ کر لینے کی ایک اور ترغیب دی گئی۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان میں جگتو (متحدہ) فرنٹ کی مسلم لیگ کے خلاف عظیم کامیابی کے بعد فرنٹ کی حکومت کو دو ماہ کے اندر اندر گورنر راج میں بدل کر مرکز میں حکمران سول اور ملٹری بیوروکریسی نے مشرقی پاکستان کے عوام کو باور کرایا کہ ان کے جمہوری حقوق اسی طرح پامال کئے جاتے رہیں گے کہ یہ حکمرانوں کے لئے ایک عظیم خطرہ ہیں۔ اسی سال اکتوبر میں دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ جب اس آمرانہ فیصلے کو اسمبلی کے صدر مولوی تمیزالدین نے اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کیا تو گورنر جنرل غلام محمد، ڈپٹی سیکرٹری فرخ امین کو ہر دوسرے تیسرے روز اپنے خفیہ پیغام کو ڈورڈز کی صورت میں جسٹس منیر کو بھیجتا رہا۔ اس خفیہ پیغام رسانی کا جو نتیجہ نکلا وہ آج بھی "نظریہ ضرورت" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسمبلیوں کی بحالی نہ کرنے کا فیصلہ دینے کے بعد دفاعی معاہدوں کے لئے راہ ہموار کی گئی۔ 1955ء میں ون یونٹ لگایا گیا۔ پھر 1956ء کا آئین نافذ ہوا۔ انتخابات کی تاریخیں مقرر اور ملتوی ہوتی رہیں امریکی منصوبے کے مطابق آئین کو توڑ کر اور اسمبلیوں کو دوسری بار واپس بھیج کر فوجی آمریت کی باقاعدہ داغ بیل ڈال دی گئی۔ "ایک بھی گولی چلائے بغیر اس کامیاب "انقلاب" کی کوکھ سے جنم لینے والی صدارتی کابینہ کے رکن ذوالفقار علی بھٹو بھی تھے۔

58 - 1948ء کے اس دور کی ہنگامہ خیزیاں بھٹو کی توجہ بار بار اپنی طرف مبذول کراتی رہیں۔ بھٹو کی اس دور کی تحریریں ان کی حیرت انگیز سیاسی بصیرت کا اظہار کرتی ہیں۔ وہ ان دس برسوں میں مسلسل لکھتے رہے۔ انہوں نے ایک سیاسی تبصرہ نگار اور قانون دان کے طور پر پاکستان کے آئینی مسائل پر بار بار لکھا اور اسی عشرے میں ان نتائج پر پہنچ گئے جن پر پہنچنے کے لئے ہم نے پچیس سال لگا دیئے اور پاکستان توڑ دیا۔ پھر پاکستان توڑنے کا الزام بھٹو پر عائد کر کے ہم نے ان نتائج سے ایک بار پھر روگردانی کی اور اگلے بیس برسوں میں پاکستان کو وہاں پہنچا دیا جہاں وہ آج اپنی تاریخ کے انتہائی سنگین آئینی بحران کا سامنا کر رہا ہے۔ چنانچہ بھٹو کے جو سوانح نگار ان کی اس دور کی تحریروں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ وہ بھٹو کی سوانح کو ہی نہیں، پاکستان کی تاریخ کو بھی ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔

www.bhutto.org

1948ء میں بھٹو جب حصول تعلیم کے لئے امریکہ میں مقیم تھے، انہوں نے نئے پاکستان اور پوری دنیا کے لئے ایسے رومانوی خواب دیکھے۔ جنہیں آگے چل کر بری طرح روندا جاتا تھا۔ اپنے تین اولین مضامین کے ذریعے انہوں نے ایک شاعر اور ایک انقلابی کے تصورات کا حسین امتزاج پیش کیا۔ ان کا مضمون "دنیا کا آفاقی تصور" 3 ر فروری 1948ء کو سامنے آیا جس میں انہوں نے ایک عالمی شہری کی حیثیت سے انتہائی جذباتی اور رومانی لہجے میں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ "اب ہماری نجات دنیا کے ایک ہو جانے میں ہے۔" سیاست کے مردہ طریق کار سے اجتناب کرتے ہوئے نوجوان بھٹو نے "ایک نئے انقلابی نظام پر تشکیل کرنے" کی خوش کن بات کی۔ انہوں نے نعرہ لگایا۔ "پوری دنیا ایک ہے" اور کہا کہ "ہماری اس متحدہ دنیا کا ہتھیار ایٹم بم نہیں، محبت ہے جس کی اساس سادگی پر ہے۔" اپنے ایک اور مضمون "نوع انسانی کی آفاقیت" میں بھٹو نے "مزاحمت سے عاری چرخی پر تیزی سے گردش کرتی دنیا" کی بوقلمونیوں کا نقشہ پیش کیا اور کہا کہ آدمی آزاد بھی ہوتے ہیں اور غلام بھی، امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی اس زمین سے دکھ اور غربت کے خاتمے کے لئے متحد ہو جانا چاہئے۔ انہی دنوں کی نیویارک کی ایک رات یادداشتوں میں انہوں نے سوال کیا کہ غار کا انسان زیادہ خوش نصیب تھا یا ان فلک بوس عمارتوں میں مقیم اس کا بیٹا زیادہ خوش نصیب ہے۔؟

یکم اپریل 1948ء کو بھٹو نے جنوبی کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں اپنے سامعین کے سامنے اسلامی ورثہ کو کھول کر رکھ دیا۔ اپنے طویل خطاب میں بیس سالہ بھٹو نے ایک ایسے عالم اسلام کی تصویر کشی کی جسے وہ 77 - 1972ء کے دوران خود تشکیل دیتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے اسلام کی جانب امریکی اور مغربی دانشوروں کی معاندانہ سوچ کا پردہ چاک کرتے ہوئے بتایا کہ صنعتی انقلاب سے قبل یہ اسلام ہی تھا جس نے مشرق و مغرب کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کیا۔ اسلامی کنفیڈریشن کا خواب پیش کرتے ہوئے اور اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا کہ اسلامی کنفیڈریشن کا انہیں اس طرح یقین ہے جس طرح تقسیم ہند سے قبل پاکستان کی تخلیق کے بارے میں تھا۔

53 - 1948ء کا عرصہ انہوں نے بیرون ملک اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں گزارا۔ کیلی فورنیا کی یونیورسٹی برکلے سے سیاست میں گریجوایشن کے بعد بھٹو نے 1952ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ چرچ کالج سے فلسفہ قانون میں اعزاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ 1953ء میں انہیں لندن کی "لنکن ان" میں پیشہ وکالت کے لئے نامزد کیا گیا اور ساؤتھمپٹن یونیورسٹی میں وہ بین الاقوامی قانون کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ پاکستان واپسی پر انہوں نے سندھ مسلم لاء کالج کراچی میں دستوری قانون پڑھانے کا آغاز کیا۔ اسی دوران (58 - 1954ء) وہ ہائی کورٹ میں بطور بیرسٹر وکالت بھی کرتے رہے۔ اکتوبر 1953ء میں جب وہ پاکستان پہنچے تو یہاں سیاسی اور مادی مفادات کے لئے غیر اخلاقی اور مجنونانہ دوڑ دھوپ شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیا اور آمرانہ روش کے

برعکس جمہوری اداروں کے استحکام کے لئے نظریاتی تحریروں سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ 56 - 1954ء کے دوران انہوں نے "ویژن" میں جتنے بھی مضامین لکھے ان میں انہوں نے اس واحد نکتے پر زور دیا کہ آئینی نظام اور قانون کی بالادستی فائق ہوتی ہے۔ اس سے انحراف، انتشار اور خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ اپنے اسی دور کی تحریروں میں انہوں نے ون یونٹ کی بھی مکمل کر مخالفت کی۔ بھٹو کے نزدیک یہ ایک ناقابل عمل اسکیم تھی جس کے نفاذ سے ملک کے دونوں بازوؤں میں مخاصمت و مخالفت کی دوڑ تیز ہو گئی اور جس کا اختتام پاکستان کے دولخت ہو جانے پر ہوا۔ بھٹو اس شیطانی منصوبے کے مصنفین کے سیاسی عزائم کو بھی سمجھتے تھے۔

مئی 1954ء میں انہوں نے کراچی کے ایک جریدے "ویژن" میں آئینی روایات کے موضوع پر اپنا پہلا مقالہ سپرد قلم کیا۔ اگلے ماہ وہ "پاکستان ایک وفاقی یا وحدانی ریاست" کے موضوع پر اظہار خیال کرتے نظر آئے جس میں انہوں نے ون یونٹ کے زیر تشکیل منصوبے پر کڑی تنقید کی۔ 24 نومبر 1954ء کو انہوں نے لاڑکانہ سے ایک اخباری بیان میں ون یونٹ سے سندھ کو درپیش خطرات کا اظہار کیا۔ "آئین کے لوازمات" اور "جمہوریت کی نشوونما" بتدریج مئی 1955ء اور دسمبر 1956ء میں شائع ہوئے۔

یہ وہ دلچسپ لیکن عبرت ناک دور تھا جس میں آئین ساز اسمبلی تو تھی لیکن آئین نہ تھا۔ بھٹو دیکھ رہے تھے کہ کرسیوں کی چھینا جھپٹی کے سوا کسی کو کوئی اور کام نہیں تھا۔ یہ وہ دن تھے جب کالے اور جبری قوانین نافذ کر دیئے گئے اور بنیادی حقوق اور شہری آزادیاں چھین لی گئیں۔ یہ مضامین جبر اور بربادی کے انہی ناپاک دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔

اپنی ان تحریروں میں بھٹو نے نظم و نسق اور آئینی نظام کی وکالت کی ہے کیونکہ ان کے بغیر اگر پاکستان کے بعد کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر پاکستان کے ابتدائی دو تین برسوں میں آئین مرتب کر لیا جاتا اور قانون کی بالادستی قائم ہو جاتی تو ہم نے ایک مختلف تاریخ کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہوتا۔ مستقبل میں پاکستانی آئین کے خدوخال پر بھٹو کا مقالہ ایک واضح اور ٹھوس دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس کے بعض حصے الہامی پیش گوئی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنے اس مقالے میں بھٹو نے متفقہ جمہوری آئین تیار نہ کر پانے کی قومی نااہلی کے سنگین نتائج کو شروع میں ہی بھانپ لیا تھا۔ بھٹو نے لکھا کہ قوم کو کسی ایسے مسیحا کا انتظار ہے جو اس بنجر سرزمین کو زرخیز رنگینی میں تبدیل کرے۔

پاکستان کو ابتداء سے ہی سوویت یونین اور سوشلسٹ دنیا کے خلاف مغربی / امریکی بلاک سے وابستہ کرنے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ 8 ستمبر 1954ء کو منیلا میں امریکہ کی زیر نگرانی معاہدہ جنوب مشرقی ایشیاء (سیٹو) کے مسودے پر پاکستان نے دستخط کر دیئے یہ اور بعد میں ہونے والے دفاعی معاہدے پاکستان کو بتدریج تباہی اور بربادی کی طرف لے گئے۔ بھٹو نے "خود حفاظتی کے معاہدے اور علاقائی انتظامات" کے عنوان سے نومبر 1954ء کے "ویژن" میں معاہدہ منیلا کو اپنا موضوع بنایا۔

معاہدے کی بعض شقوں کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد بھٹو اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کو معاہدہ خیلا کی تصدیق سے قبل اس کے تمام اہم نتائج کا پتہ لگالینا چاہیئے۔

اپنے ایک اور مقالے ("ویژن" ...... اکتوبر 1954ء) میں بھٹو نے بین الاقوامی قانون کے سوال پر سیاسی اور قانونی تنازعات کے فرق کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انہوں نے بتایا کہ تنازعہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی دعویٰ مسترد کر دیا جاتا ہے کسی تنازعے کو یا تو پرامن ذرائع سے یا جنگ کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔ بھٹو کے لفظوں میں "آخری تجزیئے میں ہر شخص کو خود سے یہ استفسار کرنا چاہیئے کہ آیا سیاسی مقاصد پرامن ذرائع سے حاصل کرنا چاہئیں یا طاقت کے وحشیانہ استعمال سے۔ اگر پرامن ذرائع مقدم ٹھہرتے ہیں تب تو حصول مقصد کا واحد منطقی اور مہذب طریقہ قانون کا ذریعہ ہے

25 اکتوبر 1957ء کو بھٹو نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی چھٹی کمیٹی سے خطاب کیا تھا اس خطاب میں نوجوان قانون دان نے جارحیت کی تعریف کو اپنا موضوع بنایا اپنے خطاب میں بھٹو نے واضح کیا کہ قانون ایک جبری حکم ہے یہ قانون کا ایک ایسا وصف ہے جو زمانہ قدیم سے مسلمہ چلا آرہا ہے اس لئے پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا عالمی قانون سچا قانون ہے اگر یہ فوجداری اور دیوانی جرائم کے خلاف تعزیری اور تادیبی اقدامات کر سکتا ہے تو یہ سچا قانون ہے کیونکہ کوئی معاشرہ قانون کے بغیر اور کوئی قانون تعزیرات کے بغیر رائج نہیں ہو سکتا۔

اپنے طویل خطاب میں بھارت کے ساتھ پانی کے تنازعے کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا کہ اگر آب پاشی کے پانی کی معمول کے مطابق اور ضروری سپلائی میں کوئی مداخلت ہوئی تو ان کے ملک کو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ جارحیت کی انتہائی عداوت انگیز اور تباہ کن صورت ہوگی انہوں نے واضح کیا کہ اس قسم کی جارحیت سے پاکستان ہی نہیں بعض دوسرے ملک بھی دوچار ہیں۔

17 مارچ 1958 کو ذوالفقار علی بھٹو نے جنیوا میں سمندری قوانین سے متعلق اقوام متحدہ کی پہلی کمیٹی سے اپنے خطاب میں "علاقائی سمندری حدود" کے بارے میں بحث کی۔ اس طویل خطاب میں بھی بین الاقوامی قانون پر بھٹو کی دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

58 - 1948ء کے دور کی مذکورہ بالا تحریروں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آئینی مسائل سے بین الاقوامی قانون تک اور عالم اسلام کے اتحاد انسانی وحدت کے تصور پر ان بنیادی خیالات کا اظہار کر رہے تھے جو آگے چل کر ان کے سیاسی فلسفے کی بنیاد بنے۔ ان ابتدائی تصورات میں جو زیر نظر کتاب کے پہلے تین حصوں میں بکھرے پڑے ہیں مستقبل کے بھٹو کے جوش، کمٹ منٹ تدبر اور ایقان کی واضح جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

66 - 1958ء کے دوران ذوالفقار علی بھٹو خارجہ پالیسی اور بیرونی معاہدوں کی سیاست کی گتھیاں سلجھاتے نظر آتے ہیں چوتھے حصے کے آخری تین مقالات کو چھوڑ کر جو اگلے چند برسوں میں

www.bhutto.org

سپرد قلم کئے گئے بھٹو ایوب حکومت کا حصہ تھے اور اسی حیثیت میں وہ ملک کی خارجہ پالیسی میں بنیادی تبدیلیوں کا ذریعہ بنے۔ یہ سوشلسٹ دنیا سے اولین رابطوں کا دور تھا۔ ابھی وہ ایندھن، بجلی اور قدرتی وسائل کے وزیر تھے جب انہوں نے سیٹو اور سینٹو کی زبردستی حامی حکومت کے دور میں سوویت یونین کے ساتھ تیل کے معاہدے پر دستخط کئے۔ انہوں نے 23 مارچ 1961 کو انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" میں اس موضوع پر ایک مقالہ شائع کیا انہوں نے لکھا کہ 4 مارچ 1961 کو طے پانے والے اس معاہدے سے پورے پاکستان میں اور شاید کسی حد تک بیرونی ملک بھی اس سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ دلچسپی قابل فہم تھی کیونکہ بقول بھٹو تیل ترقی پذیر معیشت کے ایک بنیادی عنصر کی تشکیل کرتا یا کم از کم تشکیل میں مدد دیتا ہے "تیل عالمی منڈی کی ایک اہم شریان ہے اس قدر اہم کہ اس کی تقسیم ملکیت اور قیمت کے تعین سے نہایت دور رس پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں" بھٹو نے لکھا۔

بھٹو ماسکو سے پہلے سمرقند اترے اور وہاں ایک ناقابل فراموش دن گزارا۔ اس کے مشہور اور تاریخی مقامات اور مساجد کو دیکھا۔ تیمور اعظم اور وہاں کے جانشینوں کے اس حصار میں اسلامی فن تعمیر اور ثقافت کی شان و شوکت سے متاثر ہوئے اور یہ احساس ہمارے لئے باعث فخر تھا کہ ہم اسی تاریخ، نسل اور مذہب کا حصہ ہیں...... بلند پہاڑوں، مختلف زبانوں اور نظریات کے باوجود جو ماضی کے سمرقند اور حال کے پاکستان میں حائل ہیں ہم ایک غیر مرئی مگر دائمی رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں" یہ بات بھٹو نے 33 برس قبل لکھی تھی، اور آج جب کئی دیواریں گر چکی ہیں بھٹو کی بیٹی ایک بار پھر انہی دائمی رشتوں کا اعلان کر رہی ہیں۔ ماسکو میں بھٹو نے روسی رہنماؤں سے مذاکرات کے بعد اس معاہدے پر دستخط کئے جو ان کے اپنے لفظوں میں "دور حاضر کی اس روح کا مظہر تھا" جو سیاسی تعصبات اور نسل و نظریہ کے امتیازات سے بالاتر ہو کر انسانیت کی باہمی بہبود کے لئے وسیع تر عالمی تعاون کا تقاضہ کرتی ہے۔"

یہ ایک عظیم آغاز تھا اسی اثناء میں وہ "مشروط امداد" اور "کیا غیر ملکی امداد خیرات ہے؟" جیسے مقالے سپرد قلم کر چکے تھے اپنے دوسرے مقالے (27 اکتوبر 1961ء) میں بھٹو نے واضح کیا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ کی راکھ پر امریکہ کی بے پناہ اقتصادی امداد کے ذریعے ایک نئی صنعتی طاقت پیدا کر دی گئی تھی اور امریکہ جنگ میں ملوث ضرور تھا لیکن تباہی سے محفوظ رہا تھا۔ بھٹو نے مزید واضح کیا کہ یورپ کی تعمیر نو کا مقصد محض اتنا نہ تھا کہ تباہ شدہ ملکوں کے کھنڈرات پر نئے چرچ اور فنون لطیفہ کے نئے ادارے تعمیر کئے جائیں۔ جتنا کہ یورپ کو کمیونزم کی دلدل کے منہ میں جانے سے بچانا تھا اگر مغربی یورپ کمیونزم کے زیر اثر آ جاتا ہے براعظم امریکہ کی طرف اس کی پیش قدمی اتنی ہی یقینی ہوتی جتنی کہ اس ٹڈی دل کی ہوتی ہے جو صحرائے عرب سے ہوتا ہوا براعظم پاک و ہند اور وسطی چین میں داخل ہو جاتا ہے۔

www.bhutto.org

اپنے مقالے میں آگے چل کر بھٹو نے بتایا کہ یورپ میں امارت ہے اور ایشیا و افریقہ میں غربت اگر ایشیا اور افریقہ کی دولت کی لوٹ مار نہ کی جاتی تو شاید ہی یورپ اپنی خوشحالی کی معراج کو پہنچ سکتا۔ سامراجیت کی تاریخ یک طرفہ لوٹ مار ہے...... ہندوستان میں برطانوی لوٹ مار کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا کہ تجارت پرچم کے پیچھے پیچھے چلتی ہے جس میں "مہنگا بیچنا اور سستا خریدنا ممکن ہوتا ہے۔" طویل بحث کے بعد بھٹو غیر ملکی امداد کے موضوع پر واپس لوٹتے ہیں اور یہ انکشاف کرتے ہیں کہ پسماندہ اور دوسروں کی مدد پر انحصار کرنے والے ممالک کی اقتصادی ترقی کے لئے جو سرمایہ درکار ہے اس کا اس پوری دولت اور سرمائے سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا جو گزشتہ برسوں میں ان کی جیبوں سے نکالا جا چکا ہے۔ ایشیا کی بے پناہ غربت کے دل دہلا دینے والے واقعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا کہ اس غربت کو دور کرنے کے لئے غیر ملکی امداد کی ضرورت ہے۔ انہوں نے لکھا کہ یورپ کی گلیوں میں ایک فاقہ زدہ بچہ شدید جذبات پیدا کر دیتا ہے لیکن ایشیا کی گلیوں میں سینکڑوں بچے ایشیائی طرز زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یورپ کے لئے امداد کا کوئی حساب نہ تھا لیکن ایشیا کے لئے امداد ہر سطح پر کاٹ کاٹ کر اور جھجک جھجک کر دی جاتی ہے انہوں نے زور دے کر کہا کہ امداد، خیرات ہرگز نہیں۔

عالمی امن اور تخفیف اسلحہ کے سوال پر بھی انہوں نے کھل کر لکھا جن میں اقوام متحدہ کے کردار کو بھی زیر بحث لایا گیا تھا۔ بھٹو نے کہا کہ تخفیف اسلحہ کے علاوہ دنیا کو درپیش بڑے بڑے مسائل میں دم توڑتا ہوا نو آبادیاتی نظام بھی شامل ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں نئی قوموں کے ظہور نے دنیا کی تاریخ میں بہت ہی اہم نئی طاقت کو جنم دیا ہے اب انسانی معاملات کو تمام نسلوں اور قوموں کو مل جل کر اور برابری کی بنیاد پر سلجھانا چاہئے۔

اس حصے کا آخری مقالہ "دو طرفہ تعلقات کا نظریہ...... نئی سمتیں" (1976) بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں ایک اہم دستاویز کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ انہوں نے لکھا "دو طرفہ بنیاد پر تعلقات خارجہ حکمت عملی کا وہ رہنما اصول ہے جو ایک نظریئے کی حیثیت سے کسی الجھاؤ یا پیچیدگی کا شکار نہیں بڑی طاقتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ دو طرفہ بنیاد پر ہمارے تعلقات کی استواری کا تصور یہ ہے کہ ایک طاقت کے ساتھ اپنے اتحاد کی نفی کئے بغیر دوسری طاقت کے ساتھ تعاون کے شعبوں کا تعین کیا جائے۔ طویل تاریخی مباحث کو سمیٹتے ہوئے بھٹو نے بتایا کہ یہ نظریہ اختیار کرنے سے پہلے پاکستان کی خارجہ پالیسی ایک طرف اپنے بدترین دور میں تلون مزاجی کا شاہکار تھی تو دوسری طرف ایک بھولی بسری نظریاتی اساس پر سود مندانہ حقیقت پسندی کا پیوند۔

اس کتاب کا پانچواں حصہ بھٹو کی ان تحریروں پر مبنی ہے جو مسئلہ کشمیر سے براہ راست متعلق ہیں۔ اس میں اہم ترین دستاویز 30 نومبر 1967ء کو پیپلز پارٹی کی تاسیس کے موقع پر سامنے آئی جس پر ذوالفقار علی بھٹو کا نام نہیں تھا۔ اس حصے کے دوسرے مقالات میں وہ معاہدہ تاشقند کو زیر بحث لاتے

www.bhutto.org

ہیں۔ کتاب کا چھٹا حصہ جو ترتیب کے اعتبار سے پہلے آنا چاہئے تھا لیکن جسے پانچویں حصے کے بعد رکھا گیا ہے۔ دراصل بھٹو کے اس انتہائی اہم دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ ایمانداری اور صدق دلی سے ایوب حکومت کے ساتھ تھے۔ 1961ء میں پاکستان اینوئل PAKISTAN ANNUAL میں شائع ہونے والا ان کا مقالہ، اسی دور کی یاد تازہ کرتا ہے جس میں وہ نہایت دیانت داری سے صدر ایوب کے لئے زبردست تعریفی کلمات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس حصے میں ایک اور اہم مقالہ پاکستان کے دوسرے پنجسالہ منصوبے سے متعلق ہے جو 23 مارچ 1960ء کو انگریزی روزنامہ "ڈان" میں شائع ہوا۔ مقالے کا عنوان ہے۔ پاکستان کے دوسرے پنجسالہ منصوبے کی اساس بھٹو کا خیال تھا کہ یہ منصوبہ بحیثیت مجموعی حقیقت پسندانہ ہے کیونکہ یہ مقامی حالات سے ہم آہنگ ہے تاہم انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ اس کا دائرہ محدود ہے کیونکہ خرچ کی استعداد کا انحصار کمائی کی استعداد پر ہے۔ سرمایہ کاری کی قوت کا انحصار، وسائل کو ترقی دینے اور کام میں لانے پر ہے۔ انہوں نے لکھا کہ ہم اپنے کمانے کی استعداد بڑھا کر مصارف کی استعداد بڑھائیں گے۔ یہ خیال بعد میں اگرچہ درست ثابت نہ ہوا لیکن ان مباحث کی تاریخی ریکارڈ کے طور پر آج بھی اہمیت ہے۔

کتاب کا ساتواں حصہ، اس جدوجہد سے عبارت تحریروں پر مبنی ہے جو عوام کے جلو میں، ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان کے خلاف کیں۔ اس حصے کا پہلا مقالہ "صحافت میں میرا پہلا قدم" ایک دلچسپ تحریر ہے۔ جنوری 1967ء کو ڈھاکہ سے نکلنے والے انگریزی روزنامہ "پاکستان آبزرور" میں بھٹو نے بتایا کہ وہ صحافت میں پہلی مرتبہ قدم نہیں رکھ رہے اور چند سال قبل، طالب علمی کے زمانے میں پہلی بار انہوں نے اس میدان میں قدم رکھا اور ابلاغ کے اس فن سے واقفیت پیدا کی۔ دنیا کے مزید الجھتے ہوئے حالات کا تذکرہ کرتے بھٹو بتاتے ہیں کہ اخبارات کا کردار اہم تر ہوتا جارہا ہے۔

بھٹو کا خیال تھا کہ مغربی دنیا کی ترقی یافتہ صحافت کے مقابلے میں افریقہ اور ایشیا میں ابھی تک صحافت کی جڑیں مضبوط نہیں ہونے پائیں۔ یہ اسی طرح ہنگامہ خیز اور غلطیوں کی آماجگاہ ہے جیسے کہ ایشیا اور افریقہ کے حالات ہیں۔

بھٹو نے 1967ء میں جب وہ ایک اپوزیشن رہنما تھے۔ لکھا۔ "پہلے زمانے سے کہیں زیادہ ہمارے زمانے میں صحافت روشنائی اور خون دونوں سے لکھی جاتی ہے۔ اس نے بےپناہ رکاوٹوں کے خلاف جرات کا ثبوت دیا ہے۔ صحافت حالات کی قیدی ہے لیکن اس کے ہاتھ میں جیل کی چابی بھی ہے۔" ان کا خیال تھا کہ صحافت محض ڈاک خانے کا کردار ادا نہیں کرتی وہ حالات و واقعات کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ رہنمائی کرتی ہے۔ پیش بینی کرتی ہے اور پرکھنے کا کام بھی سرانجام دیتی ہے۔ جرات اور حق گوئی اس کا بنیادی وصف ہونا چاہئے۔

آزادی اظہار کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ جس طرح اخبارات کی

بے لگام آزادی قومی مفاد کے لئے مضر ہے اسی طرح آزادی پر قدغن اس سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اگر عوام کے جذبات اور مایوسیوں کو ڈھانپ دیا جائے تو ماحول خوفناک بدبو سے بھر جاتا ہے۔
بھٹو نے بتایا کہ پاکستان میں صحافت ایک مشکل عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ انگریزی صحافت کے حالات مخدوش ہیں۔ اردو، بنگالی اور کچھ علاقائی زبانوں کی صحافت نے قابل ذکر ترقی کی ہے۔ اپنے صحافتی تجربے کے بارے میں بھٹو نے لکھا۔ "میں نے شغل اور دوستوں کے لئے لکھا ہے اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ باقاعدہ لکھنا ممکن بھی ہوگا یا نہیں۔"
اور جلد ہی سیاسی سرگرمیاں تیز ہونے کے باعث بھٹو کی صحافتی سرگرمیاں جاری نہ رہ سکیں لیکن انہوں نے سیاسی حالات پر لکھنا جاری رکھا۔ ان تحریروں کے ذریعے سیاسی حالات کو پہلی بار تخلیقی لب ولہجہ نصیب ہوا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کی تاسیس کے موقع پر جو چھ بنیادی دستاویزات پیش کیں ان میں "ایک نئی پارٹی کیوں؟" کے عنوان سے ایک دستاویز بھی شامل تھی۔ یہ دستاویز بھٹو کی اپنی تحریر کردہ تھی۔
اس کے چند ماہ بعد انہوں نے ایک طویل مقالہ..... پاکستان کی سیاسی صورت حال..... کے عنوان سے تحریر کیا۔ یہ کتابچہ بھٹو کی "لال کتابوں"، جنہیں جناب محمد حنیف رامے شائع کر رہے تھے۔ میں سے ایک تھا اور بے حد مقبول ہوا۔ بھٹو کے اپنے بیان کے مطابق یہ تحریر 1968ء میں لکھی گئی تھی۔ اس انگریزی تحریر کا ترجمہ بھی جناب رامے نے کیا تھا..........
"پاکستان کی سیاسی حالت" میں چھ ذیلی ابواب تھے جو بنیادی حقوق، جمہوریت اور سوشلزم، جمہوریت اور اسلام، خارجہ پالیسی، استحکام کے ایوبی افسانے اور راہ عمل سے بحث کرتے تھے۔ بھٹو نے لکھا کہ شہری آزادیوں میں ہماری آئندہ مسرت کا راز مضمر ہے۔ مختلف مفادات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے جو عناصر ناگزیر ہیں ان میں شہری آزادیوں کو اولین مقام حاصل ہے۔ سوشلزم کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ سوشلزم ہی سب کے لئے مساوی واقع پیدا کر کے۔ انہیں استحصال سے بچا سکتی ہے۔ خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا کہ جس حکومت کی خارجہ پالیسی نے 1959ء میں بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کو قابل قبول سمجھا تھا اس نے 1965ء میں اس ملک کے ساتھ اپنے آپ کو برسرجنگ پایا۔ پاک..... امریکہ تعلقات کے ضمن میں پاکستان کے غیر حقیقت پسندانہ رویئے پر تنقید کرتے ہوئے بھٹو نے لکھا۔
"جان فاسٹر ڈلس کا عہد، اس کی موت سے پہلے ہی، اپنی موت مرنے لگا تھا۔ لیکن پاکستان حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بجائے امریکہ کے لئے آغوش محبت وا کئے بیٹھا رہا اور جفاکار محبوب کے فراق میں آہیں بھرتا رہا۔
اپنے مقالے میں بھٹو نے ایوبی عہد کے استحکام کے افسانے کا بھی مضحکہ اڑایا۔ یہ تحریک ایوب خان کے اقتدار کے خاتمے سے چند ماہ قبل لکھی گئی تھی۔ بھٹو نے بتایا کہ استحکام محض افسانہ ہے کیونکہ

www.bhutto.org

(ایوب) حکومت کی پالیسیوں میں تواتر کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ داخلہ اور خارجہ دونوں پالیسیاں غلط کارانہ اور تضاد کا شکار ہیں۔ وہ پنڈولیم کی ایک انتہا سے دوسری انتہا کی جانب جھولتی چلی آتی ہیں۔ ان کا خیال تھا مسئلے کا صحیح حل۔ ایوب خان کے صدارتی نظام کے دائرے سے باہر کوئی جمہوری اقدام ہی ہو سکتا ہے لیکن حکمران اسے آزمانے سے کترائیں گے۔ تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے بھٹو نے لکھا:

"مسئلے کی اساس یہ ہے کہ موجودہ نظام کو ناگہانی انقلاب اور ہلاکت آفرین خانہ جنگی کی راہ اختیار کئے بغیر کیونکر منسوخ کیا جائے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر اقتصادی اور سماجی انصاف کے سوال کو نظرانداز کیا گیا تو پاکستان کی سالمیت نہ صرف خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ اس کا پارہ پارہ ہونا یقینی ہو جائے گا...... جب تک تبدیلی کا آغاز نہیں ہو جاتا۔ تمام ترقی پسند قوتوں کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرح ایک ترقی پسندانہ جمہوری اور مساوات انگیز نظام حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرتی چلی جائیں۔ اسی حصے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ایک اہم مقالہ جو 13 اگست 1969ء کے روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوا تھا۔ اس عہد کے سیاسی مسائل کا احاطہ ہے۔ بھٹو نے اپنے مخصوص، تخلیقی انداز میں ایوب خان کے فوراً بعد کے پاکستان کو درپیش مسائل اور ان کے ممکنہ حل سے بحث کی ہے۔

کتاب کا ساتواں حصہ...... اس پوری کتاب کی روح ہے جس میں ذوالفقار علی بھٹو کے دو نہایت اہم مقالے "مشرقی پاکستان کی صورت حال" (فروری 1968ء) اور عظیم المیہ (اگست 1971ء) شامل کئے گئے۔ "عظیم المیہ" کو جنگ پبلشرز کی جانب سے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کئے جانے کے باعث یہاں سے نکال دیا گیا۔ عظیم المیہ، اس موضوع پر ایک ایسی بنیادی تحریر ہے جو پاکستان کے دولخت ہونے کے سانحے سے صرف چار ماہ قبل لکھی گئی تھی۔ اس تحریر سے اتفاق کرنے والوں کے ساتھ ساتھ اختلاف کرنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور 1971ء کے واقعات کی ذمہ داری بھٹو اور صرف بھٹو پر ڈالنے والے تو اس تحریر کے استدلال کو سرے سے مانتے ہی نہیں اور بنیادی طور پر یہی اس کی اہمیت ہے۔

بھٹو نے اس مقالے کے پیش لفظ میں لکھا کہ پاکستان کے عوام خود جانچ سکتے ہیں کہ یہ عظیم المیہ کیسے واقع ہوا اور یہ کہ بحران کا حل سب سے اہم ضرورت ہے۔ یہ مقالہ یحییٰ، مجیب، بھٹو ملاقاتوں (15 تا 25 مارچ 1971ء) پر تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ 25 مارچ کی رات۔ یحییٰ خان نے بنگالی عوام کے خلاف فوجی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ بھٹو لکھتے ہیں:

"ساڑھے دس بجے رات عشائیے سے فارغ ہو کر ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ ایک گھنٹے کے بعد توپوں کی گھن گرج سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ میرے دوستوں کی خاصی تعداد میرے کمرے میں جمع ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ فوج نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ ہم نے تین گھنٹے ہوٹل (انٹرکانٹی نینٹل اور آجکل شیرٹن) کے کمرے سے اپنی آنکھوں سے ملٹری آپریشن دیکھا۔ کئی مقامات پر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے انگریزی روزنامے "دی پیپل" (عوامی لیگ کا

ترجمان) کی عمارت زمین بوس ہوئی ..... میں حیران تھا کہ ہمارے لئے کیا رہ گیا تھا۔ یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے، ہمارے اپنے عوام، موت اور تباہی سے ہمکنار ہو رہے تھے..... کیا اب ہم اس سطح پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپسی ناممکن ہو جاتی ہے یا یہ زخم مندمل ہو جائیں گے اور پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا"

پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا لیکن بھٹو کی توقعات کے برعکس ایک مختلف انداز میں۔ طویل بحث کے بعد بھٹو نے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان شعلوں میں گھرا ہے اور پورا ملک تباہی کے نزدیک پہنچ چکا ہے۔ بھٹو نے اپنا بیان لینن کے ان لفظوں پر ختم کیا۔

انسان کی عزیز ترین شے زندگی ہے لیکن اسے یہ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے اس لئے اسے یہ زندگی ایک بے مقصد، بزدلانہ طریقے سے یا اس طرح بسر نہیں کرنی چاہئے کہ بعد میں اپنے ماضی پر شرمندگی ہو۔ اس طرح زندہ رہ کہ مرتے ہوئے کہہ سکو میری تمام زندگی اور قوت دنیا میں صرف ایک مقصد کے لئے وقف رہی ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان کی آزادی۔"

آٹھویں حصے میں ان کا عالمگیر شہرت کا حامل مقالہ "تیسری دنیا کے افلاس زدہ عوام" شامل کیا گیا ہے جبکہ آخری اور نواں حصہ، بھٹو کی زندگی کی ایک انتہائی اہم تحریر "میری سب سے پیاری بیٹی" پر مشتمل ہے۔ یہ خط ایک نئے لب و لہجے کی نشاندہی کرتا ہے۔ بھٹو نے لکھا۔

"تمہارے گرد آگ جلا دی گئی ہے"

ان کا کہنا تھا کہ یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے جلائی ہے۔ انہوں نے بے نظیر کو بتایا کہ ان کے دادا نے انہیں فخر کی سیاست سکھائی ان کی دادی نے انہیں غربت کی سیاست کا سبق دیا۔ وہ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں تاکہ ان دونوں کا انضمام ہو سکے۔

"پیاری بیٹی! میں تمہیں ایک پیغام دیتا ہوں۔ یہ پیغام آنے والے دن کا پیغام ہے۔ صرف عوام پر یقین کرو۔ ان کی نجات اور مساوات کے لئے کام کرو۔ اللہ تعالیٰ کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے۔ سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے..... تم بڑی نہیں ہو سکتی ہو جب تک تم زمین کو چومنے کے لئے تیار نہ ہو..... تم دفاع نہیں کر سکتیں جب تک کہ تم زمین کی خوشبو سے واقف نہ ہو..... نظریات، اصول، تحریریں، تاریخ کے دروازے سے باہر ہی رہتی ہیں۔ غالب عنصر عوام کی تمنائیں ہیں..... جب اس راگ یا موسیقی کے معنی سمجھ لئے جاتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہو جاتے ہیں" اس کے بعد بھٹو نے لکھا۔ "میں اس جیل کی کوٹھڑی سے تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں۔ جس میں سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال سکتا؟ میں تمہیں عوام کا تحفہ دیتا ہوں۔"

یہ بھٹو کی سیاسی بصیرت کا اعجاز تھا کہ انہوں نے پندرہ سال پہلے براعظم افریقہ کے روشن مستقبل کی پیشگوئی کر دی تھی۔ بھٹو، جب وزیر خارجہ تھے، ایک جرمن سفارت کار نے ان سے اسلام آباد میں 1965ء میں کہا تھا کہ افریقہ ایک برف کی چادر کے مانند ہے جس پر تیل کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی

ہے اور یہ کہ وہ اس حالت میں طویل عرصہ تک رہے گا۔

"اس کے ایسا کہنے سے میں متاثر ہوا تھا" بھٹو نے خط میں آگے چل کر لکھا "میرے جیسا ویسی آدمی ایک ایسے سفارت کار کے تجزیہ پر اعتراض یا تنقید نہیں کر سکتا تھا جس کا تعلق آقاؤں کی نسل سے تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے تجزیئے کا احترام کرتا ہوں لیکن میری منکسرانہ رائے میں، افریقہ گو کہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے، اسے نظرانداز کر دیا گیا ہے، اس کا تمسخر اڑایا گیا ہے لیکن وہ دو عشروں سے کم عرصہ میں دنیا کے اسٹیج کے مرکز پر نمودار ہو گا۔"

اسی خط میں بھٹو نے یہ بھی لکھا. "اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے تو پھر تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں بچے گا یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہو گا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

بھٹو نے جیل سے دوسری جیل میں قید اپنی بیٹی کو عوام کے ساتھ ساتھ یہ بصیرت بھی تحفے میں دی۔

اپنے مقدمے کے اختتام پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے یہ افکار آج بھی زندہ ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ تحریریں، اس عہد کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہیں۔ ان کی قدر و قیمت گھٹانے کے مترادف ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں صرف مورخ کے کام کا مواد ہی نہیں بلکہ وہ بنیادی تصورات اور خواب بھی ہیں جن کا تخلیقی اظہار وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے خیالات اور پالیسیوں سے واضح طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ بے نظیر بھٹو نے اپنے مرحوم والد کے انقلابی خیالات تج دیئے ہیں اور ایسے خیالات سے وابستہ ہو گئی ہیں جو بھٹو کے ان مقالات کی روح سے متصادم ہیں۔ یہ رائے سطحی اور متعصبانہ ہے۔ یہاں بے نظیر بھٹو کے سیاسی تصورات، خصوصاً نئے سوشل کنٹریکٹ پر تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کا نیا عمرانی معاہدہ، دراصل ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی ویژن کا تسلسل ہی ہے۔ تسلسل کا یہ جدلیاتی عمل، چونکہ کورانہ تقلید سے روگردانی کرتے ہوئے اپنایا گیا ہے اس لئے بعض کم نظر، اسے بھٹو کے نظریات سے روگردانی قرار دینے لگتے ہیں۔

احمد سلیم

4ر جون 1994ء

www.bhutto.org

پہلا حصہ

آفاقیت اور قوم پرستی کے درمیان

زمانہ طالب علمی کی تحریریں

www.bhutto.org

www.bhutto.org

دنیا کا آفاقی تصور

آج میرا دل کچھ اس طرح خون کے آنسو روتا ہے کہ اس سے قبل کبھی نہیں رویا تھا۔ ایک عالمی شہری کی حیثیت سے میں یہ اپنا مقدس فریضہ سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کروں کہ اب ہماری نجات دنیا کے ایک ہو جانے میں ہے ہمیں جنگ اور امن 'موت یا حیات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ یقیناً ہر کس و ناکس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ نہ صرف آج کی دنیا بلکہ کل کی دنیا بھی کسی مزید جنگ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

ہم اگر ماضی کے تیرہ و تار دور پر نظر ڈالیں تو ہمیں خون اور تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا لاکھوں جانیں تلف ہو چکی ہیں لندن 'برلن اور سٹالن گراڈ جیسے قدیم اور بڑے بڑے شہر جلے اور راکھ کے ڈھیر بن گئے ہیروشیما اور ناگاساکی پیوند زمین ہو گئے لیکن اس تمام تباہی و بربادی سے بھی ہم نے کوئی عبرت حاصل نہیں کی لیک مرتبہ پھر ہمارے عفریت پیکر سیاسی حالات خطرناک طور پر دھماکہ خیز نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا توازن بہت ہی نازک ہو گیا ہے۔

ابھی ایٹم بم سے تباہ شدہ دو شہروں کی گرد بمشکل بیٹھی ہے کہ ہم نئے سرے سے اس جنگ کی بچی کھچی تباہ حال تہذیب کو مٹا دینے پر تل گئے ہیں۔

ہمیں انسانیت کی خاطر بغیر کسی تعصب کے اپنے عقائد پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ آیئے ہم جنگ کا خونیں باب بند کر کے لوگوں کو ایک دوسرے کا ہمدم و دمساز بنانے کی سعی کریں آیئے ! ہم اپنے ذہنوں سے قومیت کے محدود اور سطحی خیال کو محو کریں جو ہمیں جنون اور عدم برداشت کی طرف مائل کرتا ہے۔ کسی

www.bhutto.org

روشن خیال انسان کے لئے اس کا تصور بھی محال ہے کہ کسی مقام پر محض اتفاقیہ پیدائش عالمی امن کی راہ میں اتنا اہم کردار ادا کر سکتی ہے اگر ہم بیوقوفی سے فرسودہ خیالات و نظریات سے چمٹے رہے تو بہت جلد یعنی سحر کے وقت ہی ہمارا آفتاب غروب ہو جائے گا۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہمیں ہمارے بڑوں پر پچھاڑ کھایا ہے ہمیں ان کے نقش قدم پر چل کر آنے والی نسلوں کو دھوکا نہیں دینا چاہئے کم از کم ہمیں کوشش تو کرنی چاہئے کہ ہم جمود کی اس دبیز دھندلی فضا میں گھس کر اسے آئندہ نسلوں کے لئے کچھ ہلکا کر دیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ طاقت میں توازن کا نظریہ جنگ کو کچلنے میں ناکام رہا ہے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ عدم توازن پیدا کرنا اس سے بہت آسان تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس وقت کے سیاست دانوں نے یہ ناکام تجربہ کیا تھا خود غرضی پر مبنی جمیعت اقوام کی بنیادیں یا تو سرے سے تھیں ہی نہیں یا برائے نام تھیں اس لئے اس کا دھڑام سے گر جانا ناگزیر تھا ولسن کے چودہ نکات تاریخ کے کباڑ خانے میں پھینک دیئے گئے۔

اور اب پھر ہمارے دور کے سیاست دان ایک ایسا ڈھانچہ تخلیق کر رہے ہیں جو ان کے خیال میں وقت کا دباؤ برداشت کر سکتا ہے میں خلوص دل سے ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں گو میری عقل اب بھی اسے پوری طرح تسلیم نہیں کرتی کیونکہ اس ڈھانچہ کے معمار 'قوت کے دیوانے اور نفرت ولالچ سے معمور سیاست دان ہیں۔ اقوام متحدہ کا طریقہ کار مجھے اور بھی بے چین و مضطرب کر دیتا ہے۔ جلیل القدر افراد کا یہ عظیم اجتماع تیزی سے جعلی پلیٹ فارم میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے یقیناً ہمیں اپنی خواہشات و توقعات کو استہزا اور تصنع سے وابستہ نہیں کرنا چاہئے۔ نہیں 'ہمیں ٹھوس تعاون کی ضرورت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں پیش کردہ کوئی اہم مسئلہ بھی تسلی بخش طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس کا پورا تنظیمی ڈھانچہ دو مطلق العنان قوموں کی برتری کی نوڑ کے سوا کچھ بھی نہیں جس میں باقی ماندہ دنیا ذلت و بے چارگی کی تصویر بنی ان کی عظیم کارروائیاں دیکھ رہی ہے! اس نو تعمیر ادارے نے بہت سی قوموں کے جذبات مجروح کئے ہیں اس سے حاصل تو کچھ بھی نہیں بلکہ اس کی کارکردگی سے دنیا میں مخاصمت فروغ پا رہی ہے۔ دونوں قومیں محض ذاتی اغراض کے لئے اسمبلی کو کنٹرول کرتی ہیں، کمزور قوموں کے مفادات کو عمداً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ایران کا مسئلہ بڑے ذلت آمیز طریقے سے حل کیا گیا تھا' ایران کی کمزوری سے دوسری اقوام نے اپنی دولت میں اضافہ کیا اور اس چھوٹی سی سلطنت کو اس طریقہ کار سے غریب تر کر دیا گیا۔ انڈونیشیا کے بہادر اور غیور عوام اقوام متحدہ سے امداد کے طالب ہیں لیکن ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ جمہوریت کی کوکھ سے جنم لینے کا دعویٰ کرنے والی اقوام سے جمہوریت رخصت ہو چکی ہے۔ فلسطین کا جھگڑا وسیع ہوتا جا رہا ہے لیکن اقوام متحدہ کا ادارہ اس مسئلہ کے حل میں بھی ناکام رہا ہے' دوسری طرف پاک بھارت نزاع میں بھی اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے' اپنی تاریخ کے نازک موڑ پر ہندوستان اور پاکستان کو کشمیر کے مسئلہ پر گمبھیر مشکل کا سامنا ہے۔ پاکستان اور بھارت دونوں نے اپنا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کیا لیکن ابھی تک کوئی قابل ذکر تصفیہ نہیں ہو سکا۔ برصغیر پاک و ہند کا مسئلہ ان تمام ممالک کے

www.bhutto.org

لئے گہری تشویش کا سبب بنا ہوا ہے جو خود کو آزادی کا علمبردار کہتے ہیں دراصل یہ وسیع خطۂ ارض اپنی ذات میں ایک پورا جہان ہے۔

صمیم قلب سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم اس سیاست کے مردہ طریقہ کار سے اجتناب کرتے ہوئے اپنا جہان ایک نئے انقلابی نظام پر تشکیل کریں میں یہاں اقوام متحدہ کی خوبیاں اور خامیاں گنوانے نہیں آیا میں صرف اس نظریہ کی وکالت کر رہا ہوں کہ پوری دنیا ایک ہے خواہ آپ اسے فیڈریشن کہہ لیجئے یا کنفیڈریشن کا نام دے لیجئے جو چاہے پکاریئے 'لیکن اطمینان رکھئے کہ ہماری اس متحدہ دنیا کا ہتھیار ایٹم بم نہیں محبت ہے۔ جس کی اساس سادگی پر ہے ایسی سادگی جس کی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر انداز میں صحرائے عرب میں تشریح کی تھی۔ ۔ ایک دنیا کے عالمگیر تصور سے ہم نہ صرف ان مسائل سے نجات حاصل کر لیں گے جو کہ ہماری تہذیب کا بنیادی مسئلہ ہے بلکہ یہ ہمارے لئے ایک نئے اقتصادی و سماجی نظام کو نوید بھی ہے۔

ایک دنیا کے قیام کے لئے میری استدعا سیاست دانوں سے نہیں بلکہ عوام سے بھی ہے اور خصوصیت سے میں طلبہ سے گزارش کرتا ہوں۔ میرے ساتھی بھائیو ! متحد ہو جاؤ............ ہمیں اس دنیا میں رہنے والے ہر آدمی کی بہتری مقصود ہے۔ آپ اور میں باہم مل کر اولوالعزمی سے نئے نظام کی روشن قندیل لئے اخوت کے نقیب بنے آگے بڑھیں گے۔ ہم اپنے پیدائشی حقوق کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے اور اعلیٰ انسانوں کی طرح اخوّت و مساوات کی زندگی بسر کریں گے۔

فی الوقت ! ہم پریشان کن حالات سے دوچار ہیں لیکن مجھے ٹیگور کے ان الفاظ سے حوصلہ ملتا ہے۔

"جہاں دل کو خوف نہیں ہے اور سربلند ہے۔

جہاں علم مفت دیا جاتا ہے۔"

جہاں دنیا کو تنگ خانگی دیواروں میں ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاتا۔

جہاں سچائی کی گہرائی سے الفاظ پھوٹتے ہیں۔

جہاں علم پیہم تکمیل کی طرف پیدا کئے ہوئے ہے۔

جہاں عقل و دانش کا شفاف چشمہ مردہ عادات کے ہولناک صحرا میں اپنی راہ گم نہیں کرتا۔

جہاں "تو" ذہن کو دائما وسعت پذیر خیال اور اور عمل پیہم کی طرف لے جا رہا ہے' اے میرے مولا آزادی کی اس بہشت میں میرے ملک کو بیدار کر دے"

3 ر فروری 1948ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

اسلامی میراث کے خدوخال

اسلامی میراث میں اپنے عظیم ورثہ کو کس طرح آپ کے سامنے کھول کر رکھ دوں میں اس کی ابتداء کہاں سے کروں ؟ مشترکہ میدان کی تلاش کہاں کروں جہاں ہماری اور آپ کی تہذیب کے ڈانڈے ملتے ہوں ؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کا آغاز صلیبی جنگوں سے ہوتا ہے بعض کی رائے ہے کہ اس کی جستجو قسطنطنیہ کی خونریز فتح سے کرنی چاہیے' دوسروں کی رائے ہے کہ یہ سلسلہ بربر اور عربوں کی فتح سپین سے شروع ہوتا ہے' چند لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مغرب اور اسلامی مشرق کے باہمی ارتباط کا آغاز سر طامس رو کی ہندوستان کے شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں آمد سے ہوا۔ درحقیقت اسلامی تہذیب کے کسی ایک گوشہ سے پردہ اٹھایئے تو متعدد اہم گوشے پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ زندہ جاوید عمرؓ' جری خالدؓ' دانشمند اکبر' بہادر طارقؒ اور بہت سی دوسری عظیم شخصیتیں جن میں حضرت علیؓ' حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شامل ہیں' اگر ان ناموں کو نظرانداز کر دیا جائے تو میں اسے اسلامی میراث کہنے کی جرات کس طرح کر سکتا ہوں۔ صلیبی جنگوں سے اس کا آغاز بھی محض اس وجہ سے کہ ہماری زندگیوں پر مغرب کے بےباکانہ اثرات اس دور میں پڑنے شروع ہوئے' بےاصولی کے مترادف ہو گا۔ اسلامی تاریخ کے ان امور کا تذکرہ بھی بےسود ہو گا جن کے بارے میں آپ میں مشترکہ احساس نہیں پایا جاتا تاہم میری کوشش یہ ہو گی کہ میں تمام اہم واقعات اور اسلامی خدمات کو اس طرح مربوط کر کے پیش کروں جو آپ کے لئے دلچسپی کا موجب بنیں۔

میں اپنی اس تمام گفتگو کے دوران اسلام کے جوہر کمال کو اپنا جوہر کمال سمجھوں گا کیونکہ میں بجا طور پر

www.bhutto.org

مسلمانوں کے کسی کارنامہ کو اپنا ذاتی کارنامہ سمجھتا ہوں جیسا کہ میں مسلم دنیا کی ناکامی کو ذاتی ناکامی تصور کرتا ہوں۔کوئی چیز ضرور ایسی ہے جو اسلامی دنیا کو منقسم ہونے کے باوجود مربوط رکھے ہوئے ہے ممکن ہے یہ آپ کو عجیب لگے مگر یہ حقیقت ہے یہ عدیم المثال وابستگی کچھ تو ایک دین کی وجہ سے ہے جس نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ اخوت کا رشتہ برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے اور اسے دین کا لازمی جزو قرار دیا ہے اس نظریہ کی پرورش مسلمانوں کے باہمی روابط اور جغرافیائی رشتے سے بھی جو یورپ سے لے کر ایشیا کے دور دراز حصوں میں موجود ہیں ہوتی ہیں۔

میں یہاں اسلام کی تبلیغ کے لئے نہیں آیا اور نہ ہی اس کی خفتہ قوتوں سے آپ کو خوف زدہ کرنا چاہتا ہوں میں صرف آپ کو اسلام کے بارے میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں جو ماضی کی شمع فروزاں ،حال کی چنگاری اور مستقبل کا نورانی شعلہ ہے۔ میں یہ اس لئے چاہتا ہوں کہ میں نے اسلام کے مستقبل پر مخصوص نظریئے سے غور و خوض کیا ہے۔ میں آپ کے سامنے اس کا اعتراف بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں مذہبی نقطہ نگاہ سے کوئی کٹر اور پکا مسلمان نہیں ہوں۔ میں صوم و صلوٰۃ کی پابندی باقاعدگی سے نہیں کرتا ابھی تک

میں نے فریضہ حج بھی ادا نہیں کیا اس لئے مذہبی طور پر میں ایک عام مسلمان ہوں تاہم میری دلچسپی اسلامی میراث کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی حدود تک محدود ہے میں عقیدہ کی نازک گتھیوں کو زیر بحث لانے کی بجائے اس کے سیاسی اور ثقافتی ارتقا پر روشنی ڈالوں گا۔ایسا کرنے سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ میں آپ کے سامنے اسلام کے بنیادی اصول اور ان کا پس منظر اختصار سے بیان کر دوں۔

چھٹی صدی کا عرب ان ممالک کے درمیان گھرا ہوا تھا جو عالمی تہذیب کے گہوارے تھے اس کے ایک طرف مصر میں اسکندریہ ،شام میں دمشق ،ایشیائے کوچک میں انطاکیہ۔ میسوپوٹیمیا ،قدیم بابل ،عراق میں بغداد ،ہندوستان کا طمطراق اور مشرق بعید میں چین کی شاندار تہذیب اور دوسری طرف یونان کا جاہ و جلال ،روم کی شان و شوکت اور بازنطینی سلطنت کی عظمت و سطوت تھی۔ عرب کے ارد گرد وسیع صحرا تھا جسے آسانی سے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے اس کے بارے میں معلومات بہت کم تھیں ان تہذیب کے اثرات صحرا کے بدوؤں پر ابھی منعکس نہیں ہوئے تھے تک ہی بانجھ نہ تھا لوگوں کے اذہان بھی بانجھ ہو چکے تھے لوگوں کو اخلاقی ضوابط توڑنے کا عارضہ لاحق تھا۔ لڑکیوں کی پیدائش کو وہ باعث ننگ سمجھ کر انہیں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ عورت کے حصول کے لئے اس پر اپنا جبہ پھینک مارتے اور وہ ان کی ملکیت ہو جاتی تھی مکہ ان کی عبادت کا مرکز تھا جہاں کعبہ میں پرستش کے لئے تین سو پچاس بت رکھے ہوئے تھے۔

لیکن جلد ہی صحرا کے یہ سوسمار کھانے والے اور دم توڑتے ہوئے بدو ایک عظیم طاقت سے جاگ اٹھے ایک مقدس اور عظیم الشان قوت نے ان کی کایا پلٹ دی۔ اس فعال قوت کا سرچشمہ محمدؐ کی ذات اقدس تھی جن کے دین کے نور نے تیزی سے تینوں بڑا عظموں کو اپنی آغوش میں لے لیا یہ دین اسلام تھا

www.bhutto.org

جس کا مفہوم ایک خدا کے آگے جھک جانا ہے۔

اس کے بنیادی عقائد یہ ہیں۔

الف........ خدا کی وحدانیت

ب........ سادہ بے لوث عقیدہ

ج........ انسانی اخوت

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مافوق الفطرت قوت یا کسی الوہی ہستی سے اپنی نسبت کا اعلان نہیں کیا بلکہ محض یہ کہا کہ خدائے واحد' خالق حقیقی نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے اور حضورؐ اس کے پیغمبر ہیں' حضورؐ نے تمام برائیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور انہیں مٹا ڈالا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم متعدد بار تلوار اٹھانے کے لئے مجبور ہوئے لیکن اپنے تحفظ کے لئے نہیں بلکہ دین اسلام کی حفاظت کے لئے۔

اگر اس دور کے عرب صرف آپؐ کی جان کے درپے ہوتے تو آپؐ کسی پس وپیش کے بغیر اپنی جان قربان کو دیتے لیکن اخلاق سے عاری بے لگام اور خون کے پیاسے عرب حضورؐ کا نہیں' اسلام کا نشان مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ عرب بڑے وحشی اور تند خو تھے۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جنہوں نے انہیں شائستگی کا درس دیا ان میں دینی و اخلاقی بلندیوں کی جستجو پیدا کی ان قوانین کو بہتر بنایا شراب اور جوئے کی ممانعت کی' عورتوں کو تحفظ دیا اور انہیں پستی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر تہذیب و تمدن میں نمایاں حیثیت دی۔ حضور انورؐ نے ان لوگوں میں اخوت و وفاداری کا جذبہ پھونک دیا اور بے شمار اوصاف پیدا کر کے انہیں ایک بامقصد ضابطہ حیات دیا کسی غیر مبہم اشارت اور خود نمائی کے طمطراق کے بغیر حضورؐ نے صرف عربوں ہی کے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کے دل کو خدائے لم یزل کے پیغام لازوال کے نور سے بھر دیا۔

"اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو اور ان کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور انسان ہونے کے ناطے تم سب مساوی ہو۔"

آپ نے یہ باتیں بار بار کہیں حتیٰ کہ ایک مسلمان حبشی کو مسلمانوں کے خلیفہ کے برابر سمجھا جانے لگا۔ یورپ کے لوگ جو نسلی تفریق کا شعور اجاگر کرتے ہیں یہ جان لیں کہ اسلام نے پہلے دن ہی نسلی تفریق کو ختم کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے آزادانہ روابط نے ایک خاص نسل کی دوسری نسل پر فوقیت کا احساس معدوم کر دیا تھا وضاحت کے لئے اس تاریخی حقیقت کا حوالہ دینا بہتر ہو گا کہ صدیوں قبل جب آریہ قوم ہندوستان پر حملہ آور ہوئی تو اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے ذات پات کے مکروہ نظام میں جکڑ دیا لیکن جب مغل ہندوستان میں وارد ہوئے تو انہوں نے ہندوؤں سے شادی بیاہ تک کی اجازت دے دی اور انہیں امور سلطنت میں اپنا شریک کار بنایا۔ آزاد کردہ غلام تک بادشاہ بنا دیئے گئے۔

www.bhutto.org

اب میں اسلام کے تیزی سے پھیل جانے کے اسباب پر اختصار سے روشنی ڈالتا ہوں ایک سو پچاس سال کے عرصے میں اسلام کے قدم دور دراز کے علاقوں تک جا پہنچے مغرب میں انیس سالہ طارق بن زیاد نے سپین کی سنگین فصیلوں کو مسمار کر ڈالا اور اس اہم چٹان پر قبضہ کر لیا جو آج بھی اس کے نام سے موسوم ہے جبل الطارق یعنی طارق کی پہاڑی جسے اب جبرالٹر کے نام پکارا جاتا ہے مشرق میں نبی کریمؐ کے پیرو کار وادیٔ سندھ اور گنگا کے میدان تک جا پہنچے وی آنا اور فرانس کے محلوں سے لے دیوار چین تک ، دوسری طرف روس کے لق ودق صحرا ' وینس کے قلعے ' ایران کے میدان ' انڈونیشیا اور ملایا کے جنگلات ' ڈینوب سے لے کر دریائے ینگ سی تک کے وسیع علاقے ان لوگوں کے زیر نگیں آ گئے جن میں پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کو اخوت کا درس دینے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

بہت سے اہل مغرب اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ اسلام عیسائیت کے لئے ایک خطرہ تھا لیکن یہ خیال قطعی بے بنیاد ہے۔ اسلامی استحکام میں عین عروج کے وقت بھی عیسائیوں کے ساتھ نہایت مہربانی کا سلوک روا رکھا گیا اور ان کو ان کے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی بھی دی گئی نبی اکرمؐ نے بارہا فرمایا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی جان و مال اور ان کے مذہبی قوانین خدا کی امان میں ہیں۔ حضورؐ نے کہا ' " اگر کوئی ان کے حقوق غصب کرے گا تو بذات خود اس کا دشمن ہو کر خدا کے حضور اس پر الزام عائد کروں گا۔ "

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو اسلامی راہ میں بھٹک گئے ہیں لیکن یہ احکام سے انحراف کے سبب ہوا ہے نہ کہ اسلام کی وجہ سے جس طرح بہت سے عیسائی ایسے ہیں جو دوسروں سے معاملات میں عیسائی تعلیم کے خلاف عمل کرتے ہیں عیسائی پادری ' بشپ اور پوپ بار بار حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ بے دینوں کو نیست و نابود کر دیں گے یا ضی قریب میں گلیڈسٹون کے زمانے تک ترکی کو خطرہ لاحق تھا کہ اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے گا کیونکہ وہ ایک مسلم ملک ہے ازابیلا اور فرڈینینڈ نے سپین میں مسلمانوں کا صفایا کر ڈالنے کا کام زیادہ " خوش اسلوبی " سے انجام دیا بہ نسبت کسی " ملحد " کے جو اس نے کسی اسلامی ریاست میں عیسائیوں کے لئے روا رکھا ہو گا۔ رواداری کسی ایک مذہب کی اجارہ داری تو نہیں۔ تمام پیغمبروں اور مصلحین نے انسانیت سے محبت کا درس دیا ہے لیکن تمام مذاہب کے پیرو کاروں نے کسی نہ کسی طرح ان بانیان مذہب کی تعلیمات سے انحراف کی راہ تلاش کر لی۔

میں نے اس ملک میں اسلام پر جتنا لٹریچر پڑھا ہے ، اس میں زیادہ تر اسلام کی تنگ نظری اور جارحانہ انداز کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ایسا پراپیگنڈہ کرنے کا مقصد واضح ہے لیکن تاریخی حقائق سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ محض رقابت پر مبنی تعصبات کا نتیجہ ہے۔

دور جہالت میں جب عیسائی بادشاہ اور پوپ منکر بے دینوں کو نیست و نابود کر رہے تھے مسلمان ان غیر مسلموں کو اپنے ملک میں پناہ دیتے تھے۔ اسوقت جب عیسائیوں نے غیر عیسائیوں کو نفرت و حقارت کی بناء پر یورپ سے نکال باہر کیا تھا ' اسلامی دنیا نے ان کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے تھے اور انہیں

www.bhutto.org

تمام سماجی و مذہبی حقوق عطا کئے تھے۔

بھارتی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں۔

"اس وقت جو عیسائیت مروج تھی وہ تنگ نظری اور عدم رواداری کی مظہر تھی اس میں اور عرب مسلمانوں کی رواداری اور اخوت انسانی کی تعلیمات میں نہایت نمایاں فرق تھا اور یہی وجہ تھی کہ تمام لوگ عیسائیت کے نزاع سے تنگ آکر حلقۂ اسلام میں داخل ہو سکتے تھے۔

مغرب میں مسلمانوں کا غلبہ اتنا زبردست تھا کہ پاپائے روم خدا کے نام پر عیسائی دنیا کو منظم کر رہے تھے تاکہ "بے دینوں" کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اسلام کے خلاف آٹھ صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ آٹھ مواقع پر یورپی افواج نے مسلمانوں کو ان کی اپنی زمین پر شکست دینے کا تہیہ کر کے چڑھائی کی۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے پہلی صلیبی جنگ مسلمانوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی' عیسائی فوجوں نے بڑے جوش و خروش اور عزم و حوصلے سے "ملحدوں" کو کچل ڈالنے کے لئے ہر طرف سے محصور کر لیا اور وحشیانہ طور پر راہ میں آنے والے مسلمانوں کا قتل عام کرتے رہے۔ پہلی صلیبی جنگ کے سورماؤں نے نسلِ انسانی کے چہرے کو بری طرح داغدار کیا یہ عیسائیوں کے خدا کی شاندار فتح قرار دی جا سکتی تھی لیکن درحقیقت یہ خدا کے نام پر انسان کا انسان کے خلاف بہیمانہ اقدام تھا۔

عیسائیوں کی نگاہ میں پہلی جنگ کے علاوہ تمام صلیبی جنگیں ناکام ثابت ہوئیں' جب شیر دل غازی صلاح الدین نے یروشلم پر دوبارہ قبضہ کیا تو وہ ہزیمت خوردہ عیسائیوں کے حق میں بڑا کریم النفس ثابت ہوا۔ اس نے تمام عیسائیوں کو فدیہ ادا کرنے کے بعد "رخصت" ہونے کی اجازت دے دی اور جو فدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے ان کے جانے کے لئے معافی کا دروازہ کھول دیا' جنہوں نے شہر میں رہ جانے کی تمنا کی ان کی خواہش کا بھی احترام کیا گیا حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل متعدد مواقع پر خطرناک "نفخۃ کالم" کا کردار ادا کر چکے تھے اس وقت مسلمانوں نے نہ صرف صلیبی افواج کو پسپا کیا بلکہ تند خو منگولوں کو بھی شکستیں دیں جو بار بار مشرقی جانب سے حملہ آور ہو رہے تھے۔

باربروسا کا پوتا فریڈرک ثانی 1248ء میں پوپ گریگری کی طرف سے مسلمانوں سے مذاکرات کے لئے فلسطین آیا تو اسے بڑی عزت و احترام سے خوش آمدید کہا گیا اس نے مسلمان حکمرانوں کو اس امر پر رضامند کر لیا کہ وہ اسے عیسائی قوم کے نام پر یروشلم واپس کر دیں۔ کسی کی دلجوئی کے لئے یہ نہایت شاندار اقدام تھا جو کبھی کہیں کیا گیا لیکن پوپ اس سے بھی مطمئن نہ ہوا بلکہ وہ مزید تند خو ہو گیا اور اس نے غصہ میں حکم صادر کیا کہ عیسائیوں کو "ملحدوں" کا دوست بننے کی بجائے ان سے جنگ کرنی چاہئے۔

ان مثالوں کو پیش کرنے سے میری مراد یہ نہیں کہ صرف ہم ہی رواداری کے حامل ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہم بھی نیکیوں اور اخلاقی خوبیوں کا شاندار متاثر کن اثاثہ رکھتے ہیں ہم ان سے قطعی مختلف ہیں جیسا یورپ والے ہمیں تصور کرتے ہیں ہم وحشی نہیں ہیں بلکہ ہم نے تو تہذیب و تمدن کے دروازے وا کئے

www.bhutto.org

ہیں۔

اشاعت اسلام نے یورپ اور ایشیا میں حالت جمود کو اس درجہ متاثر کیا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں چارلس مارٹل کے بیٹے پیپن دی شارٹ نے پوپ سے خود کے لئے فرانکی اقوام کا حکمران بن بیٹھنے کی منظوری حاصل کر لی یہ استحقاق صرف اس لئے تھا کہ پیپن کے باپ نے ٹورز کی جنگ میں 732ء میں مسلمانوں کو شکست دی تھی۔ مسلمانوں کی اس واحد شکست نے جو ایک جنگ میں ہوئی میروونجی سلاطین کا خاتمہ کر دیا اور کیرولینجین حکمرانوں کی بنا رکھی یہ مملکت عیسائی دنیا کے لئے وجہ افتخار بنی کیونکہ اس نے شارلیمان کو جنم دیا۔

مزید تفصیلات میں جانے کی بجائے میں اتنا کہہ دینا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ صنعتی انقلاب سے قبل یہ اسلام ہی تھا جس نے مشرق و مغرب کی متعلقہ قوتوں کا مقابلہ کیا۔

ٹوائن بی کہتا ہے کہ کمیونزم سے صدیوں قبل ہمارے اسلاف نے اسلام سے خوف و خطر محسوس کیا تھا۔ جس طرح سولہویں صدی میں اسلام کے خلاف مغربی دل و دماغ پر ایک جنون طاری ہو گیا تھا اسی طرح بیسویں صدی میں کمیونزم نے جنون پھیلا دیا ہے۔ اسلام نے روحانی ہتھیار استعمال کیا جس کا مادی اسلحہ خانوں میں کوئی توڑ نہ تھا۔

کسی تہذیب کی گہرائی ناپنے کا کام وقت طلب ہے۔ آرٹ اور لٹریچر سائنس اور فلسفہ خواہ کسی بھی شخص کا ہو بڑی جانفشانی کا کام ہے میں بھلا اس مختصر سے عرصہ میں کسی حافظ یا کسی اقبال کی اپنی قوم کے لئے خدمات پر کس طرح روشنی ڈال سکتا ہوں ؟ میں آپ سے یہ کہاں کہہ سکتا ہوں کہ ایک لمحہ کو توقف کر کے آرٹ کی ان نادر زمانہ اشیاء کی تعریف کریں ؟ بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کی مسجد ہو یا لاہور کی بادشاہی مسجد' دہلی کی جامع مسجد ہو یا فتح پور سیکری کا شہر' حضور اکرمؐ کے پیروکار غرناطہ' قاہرہ' بیت المقدس' بغداد اور دہلی جہاں بھی گئے اپنے پائیدار نقوش ثبت کر گئے۔ حضرت عمرؓ کی شاندار مسجد' حسین کی عظیم الشان مسجد' یہ طویل اور پر شکوہ قطب مینار مسلمانوں کے تخلیقی فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

دہلی کا سربلند قلعہ جو مردانہ ہمتوں کا نشان ہے اس کی سونے چاندی کی چھت گیریاں' سنگ موسیٰ و سنگ مرمر کے فرش' اور ان سب کے شایان شان فارسی کتبے جو عربی رسم الخط میں کندہ ہیں وہ جواہرات سے مرصع بڑے بڑے ہال اور پر عظمت تخت طاؤس یہ سب ابھی تک محفوظ ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است

آگرے کا قلعہ اور فتح پور سیکری آج نہایت شکستہ و خستہ حالت میں ہیں لیکن یہ خستگی وقت کے ہاتھوں نہیں بلکہ لوٹ مار اور تاراج کئے جانے کی مظہر ہے۔ ان کے کھنڈرات ہماری شکست کی حقیقی تصویر اور ہمارے انتشار کی زندہ علامت ہیں۔ ہندوستان کے فاتحین یقیناً جمالیاتی حسن سے محروم ہوں گے کیونکہ انہوں نے ہماری مساجد' قلعوں' محلات اور مقابر کے حسن و نزاکت کو تہس نہس کر کے رکھ دیا لارڈ ولیم

www.bhutto.org

پیٹنگ نے تو ایک بار تاج محل کو ایک ہندو ٹھیکیدار کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کیا تھا جو یقین رکھتا تھا کہ اس میٹریل کا بہتر استعمال ہو سکتا ہے۔

تاج محل ہمارے فن کا مایہ ناز شاہکار ہے جسے ہم رومانی طور پر عشق مرمریں کہتے ہیں یہ مرقع کمال ہے' یہ نہایت گہری اور ٹھوس محبت کا نشان ہے۔ یہ کسی انسان کی شفقت و محبت اور خلوص کا جاوداں مظہر ہے اس کے دروازۂ خاص پر قرآن کریم کے یہ الفاظ کندہ ہیں کہ مخلص لوگ ہی باغ بہشت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ تاج محل کی تعمیر پر کوئی بیرونی اثرات نہیں' یہ خالص مسلمانوں کے فکر اور ذوق کا آئینہ دار ہے۔ امریکی مورخ ول ڈیورنٹ کہتا ہے کہ اس کی تعمیر میں بغداد' قسطنطنیہ اور دوسرے اہم مسلم مراکز کے ماہر کاریگروں نے حصہ لیا تھا اور یہ مکمل طور پر مسلمانوں کے فن تعمیر کا نمونہ ہے۔

لاہور شالیمار باغ اور کشمیر کے نشاط باغ کی جگہ کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا گیا ہے' ان کے خوبصورت اور متناسب لان' خوشنما پھولوں کے پودوں کی پرداخت اور جوش سے اچھلتے فواروں کی حسین ترتیب انسانی مساعی کا حسین ترین مجموعہ ہیں۔ ایچ جی ویلز کہتا ہے۔

"مغلوں کے فنکارانہ اور تعمیری فن کے کارنامے اب بھی بے شمار ہیں' جب لوگ ہندوستانی آرٹ کی بات کرتے ہیں تو عام طور پر ان کے ذہن میں اس عظیم دور کا تصور ہوتا ہے۔"

اس مقام پر یہ جاننا دلچسپی کا موجب ہو گا کہ منگول اسلام قبول کرنے سے قبل بڑے تند خو اور غیر مہذب تھے۔ جنگجو چنگیز خاں کی نسل جب رضا کارانہ طور پر حلقہ بگوش اسلام ہوئی تو اس نے عمدہ تہذیبی قدروں کو بڑا فروغ بخشا۔

اب میں مسلمانوں کے سائنس اور ادب کے کارنامے بیان کروں گا' اس کا آغاز میں آج کی کچھ یونیورسٹیوں اور ان کی سابقہ خدمات سے کر رہا ہوں۔

قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی دنیا میں طلبا کی سب سے بڑی درس گاہ ہے اور اسلامی دنیا کا ثقافتی مرکز ہے اس میں تحقیق کے لئے تمام تر مراعات موجود ہیں' علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی اسلامی علوم کی ممتاز درسگاہ ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کا عظیم تعلیمی سرمایہ ہے' حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی بھی بڑی شہرت کی حامل ہے' اس کی شاندار عمارت' عمدہ کیمپس' ممتاز اور مخصوص نظام نے اسے تعلیم کا اہم مرکز بنا دیا ہے۔

مسلمانوں کے علوم نے نہایت گہرے اثرات مرتب کئے ہیں' عربی زبان کے یہ الفاظ جیسے زیرو' صفر ٹریفک' ایڈمرل' میگزین' الکوحل' کاروان' چیک اور ٹیرف بین الاقوامی الفاظ بن چکے ہیں۔ چین کے موروں کی تاریخ بڑی ممتاز ہے' ان کی محنت و جانفشانی سے اسلامی دولت میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ انہوں نے کاشتکاری کے سائنٹفک طریقے اختیار کئے' کھاد کا استعمال کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے زمین کی صلاحیت کے مطابق فصلوں کی کاشت شروع کی' باغبانی کے فن کو انہوں نے نہایت فروغ دیا۔ پھلوں اور پھولوں کی نئی اقسام دریافت کیں۔ نیز مشرق کے بہت سے اشجار اور پودوں کو مغرب میں روشناس کرایا۔

www.bhutto.org

فن زراعت پر متعدد کتابیں لکھیں۔ آبپاشی کا موزوں ترین طریقہ اپنایا جو آج تک سپین میں مروج ہے انہوں نے کماد چارے اور کپاس کی کاشت کو رواج دیا اور عطریات مشروبات اور مختلف قسم کی شراب تیار کی نیز قالین سازی زردوزی اور ریشمی کشیدہ کاری اور چمڑے کا کام شروع کیا اور ان فنون کو کمال تک پہنچایا۔

ہم سپین کے مسلمانوں کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے بہت سے کار آمد سائنسی علوم سے ہمیں روشناس کرایا خاص طور پر کیمیا سے۔ انہوں نے سادہ عربی ہندسوں سے متعارف کرایا جنہیں ہم حساب میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں حساب، علم فلکیات، علم ادویات اور فلسفہ سکھایا۔ وہ مسیحی اقوام سے علوم میں اتنے آگے تھے کہ یورپ کی تمام مسیحی اقوام کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ قرطبہ کے عربی سکولوں سے تعلیم حاصل کریں۔

پندرہویں صدی تک زمین کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور خیال یہ تھا کہ سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے لیکن قرآن کریم نے اپنی 36ویں سورۃ میں کہا۔

"سورج اپنے مقررہ راستوں پر چلتا رہتا ہے اور ہر ستارہ اپنے آسمان پر گردش کرتا ہے" اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ سورج چاند زمین اور دیگر اجرام فلکی اپنے اپنے محور کے گرد گھومتے ہیں جب مغربی سائنس دانوں نے قرآن کی اس وضاحت کو پڑھا تو انہوں نے اس کا مذاق اڑایا نو سو سال بعد سائنسی دنیا نے بطلیموسی نظریات کی مذمت کی اور مغربی سائنس نے قرآنی نظریہ کو اپنایا۔

زیرو کو کوئی نہیں جانتا تھا، حتیٰ کہ ابن موسیٰ نے نویں صدی میں اسے رواج دیا۔ اعشاری نظریہ کو بھی سب سے پہلے اس نے روشناس کرایا ہندسوں کی حیثیت ترتیب دی کچھ ہندوستانیوں کا دعویٰ ہے کہ زیرو ہندوستانیوں کی ایجاد ہے تاہم یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ الجبرا خاص طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہے الخوارزمی نے فلکیات اور ریاضی پر رسالے لکھنے کے علاوہ الجبرا میں بھی بڑی اہم خدمات سرانجام دیں۔ عمر خیام نے 1079ء میں کیلنڈر کی اصلاح کی اور اس نے مساوات استعمال کر کے اپنی خدمات کا دائرہ بڑھا دیا۔ مدد علم مثلث مسلمانوں کا دوسرا کارنامہ ہے جس میں جیب زاویہ مماس اہتمام کی تخلیق کی گئی طبیعات میں پنڈولم عربوں کی ایجاد ہے۔ الہیثم نے علم بصر کو ترقی دی اور بطلیموس اور اقلیدس کے اس خیال کو چیلنج کیا کہ آنکھ شے کی طرف بصری شعاعیں پھینکتی ہے عربوں نے متعدد رصدگاہیں تعمیر کیں اور فلکیاتی آلے ایجاد کیے جو ابھی تک استعمال ہوتے ہیں انہوں نے سورج گرہن کی حالت کے زاویے اور نقطۂ اعتدال کی پیمائش کی۔ ہماری یونیورسٹیوں نے مابعد الطبیعات، علم الحیوانات اور علم کی طرف بھی خاص توجہ دی اور پھر کیمیا میں بھی مسلمانوں نے سب سے پہلے نائٹریٹ آف سلور اور نائیٹرک اور سلفیورک ایسڈ کے استعمال کو دریافت کیا علم الابدان اور حفظان صحت کو بھی مسلمانوں نے فروغ دیا مخزن الادویہ جس کا استعمال ہمارے اسلاف نے کیا آج بھی وہی استعمال ہو رہی ہے۔ مسلمان سرجن

www.bhutto.org

صدیوں پہلے سن کر دینے والی ادویات کے علم میں بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے بعض بہت مشکل آپریشن کیے جو بڑے مشہور ہوئے۔ اس زمانے میں جب کلیسا نے یورپ میں ادویات پر پابندی عائد کر رکھی تھی مسلمانوں کی ادویات کی سائنس بڑی ترقی یافتہ تھی۔ ابن سینا نے جسے رئیس الاطبا کہا جاتا ہے اصفہان میں علم طب اور فلسفہ کی تعلیم برسوں جاری رکھی بارہویں صدی سے ستارہویں صدی تک وہ یورپ میں رہبر طب اور معلم طب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام رازی نے طب پر دوسروں سے زائد کتابیں لکھیں انہیں چیچک اور خسرہ کے علاج کے بارے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی صنعتوں میں مسلمان صناعوں نے خوبصورت ڈیزائن اور کاریگری میں دنیا بھر میں فوقیت حاصل کی۔ سوتی کپڑے کے فروغ کے سلسلے میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں مسلمانوں نے صنعت ظروف سازی میں بھی کمال حاصل کیا۔ رنگنے کے تمام مشکل طریقوں کا استعمال کیا تیز چمڑے کی دباغت کے طریقے ایجاد کیے انہوں نے کاغذ بنایا، کاغذ بنانے کا فن انہوں نے وسط ایشیا کے ذریعہ چین سے سیکھا اور پھر اس فن کو عربوں نے یورپ تک پہنچایا۔ اس سے قبل یورپ والے چمڑے یا جھلی پر لکھا کرتے تھے مسلمان تاجروں نے تجارت کو بھی بڑا فروغ دیا اس سے ان کا عالمگیر رابطہ تیزی سے بڑھتا چلا گیا اور عربی عالمی زبان کا درجہ اختیار کر گئی۔

آٹھویں صدی کے وسط اور خلیفہ المنصور کے دور میں بغداد میں ایک تحقیقاتی دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس میں یونانی' ژند' سامی' لاطینی اور سنسکرت کی کتب کے تراجم کیے گئے۔ شام میں قدیم خانقاہوں سے قیمتی مسودات تلاش کیے گئے یونانی فلسفہ' خاص طور پر افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ ان علماء کی وساطت سے اسلامی دنیا میں آیا جنہیں قدیم اسکندریہ کی درس گاہوں سے زبردستی نکال دیا گیا تھا بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں میں بطلیموس اور اقلیدس پر بڑا تحقیقی کام ہوا جن دنوں ارسطو کی کتابیں یورپ کی درسگاہوں میں پڑھانے کی ممانعت تھی ان اداروں میں مسلمان علماء نے ان کا گہرا مطالعہ کیا۔ برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ ارسطو کی شہرت مسلمانوں کی رہین منت ہے اس سے قبل اس کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے اور اسے افلاطون کا ہم پلہ نہیں سمجھا جاتا' افلاطون بالخصوص ارسطو کے فلسفیانہ افکار کا مسلمانوں کے اذہان پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ آٹھویں صدی میں مسلمانوں کی درس گاہوں میں ان کا مطالعہ ضروری ہو گیا یونانی فلسفہ کے مادی مکتبہ فکر کے زیر اثر اسلامی دنیا میں مادیت اور عقلیت کے مکاتب فکر قائم ہوئے دونوں مکتبوں کے درمیان جس ذہنی تصادم کا آغاز بغداد میں ہوا وہ جلد ہی اسلامی دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں نیز سپین تک پہنچ گیا مذہبی جنون کے اس دور میں بھی مختلف مکتبوں میں خدا کی حقیقت پر آزادانہ مباحث ہوئے۔ ممتاز فلاسفر ابن رشد نے خدا کی حقیقت پر پوری آزادی سے تفصیلی بحث کی۔ ماسوائے حکمرانوں کے مختصر گروہ کے' اس کے نظریات سنے اور برداشت کیے گئے۔

مسلمانوں کا ادب نظم و نثر کے خزانوں سے معمور ہے عمر خیام کا بطور شاعر سعدی' حافظ اور نظامی جیسے بلند پایہ شعراء سے موازنہ کریں تو اس کی شاعرانہ حیثیت کمتر گنا جاتی ہے الف لیلہ کی خیرہ کن داستانیں ہمارے ادب کا محض ایک جزو ہیں۔ مغربی دنیا میں ہماری رسائی بہت کم ہوئی ہے شاید اس لیے کہ ان کا ترجمہ

www.bhutto.org

کرنا مشکل تھا اور شاید اس لئے بھی کہ ان کے نفس مضمون اور اسلوب نگارش میں روایتی اختلاف موجود ہے۔

مسلم ثقافت کی شادابی نے مختلف ذرائع سے بالیدگی حاصل کی ہے عربوں نے زود اثری اور سادگی' ترکوں نے توانائی کا جذبہ' ہندوستانیوں نے دقیقہ سنجی اور ایرانیوں نے اسے تخلیقی رجحان اور لطافت و نزاکت عطا کی ہے۔

ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جسے باہمی نزاع نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ایک دنیا جس میں بین الاقوامی تعلقات دو وجوہ سے غالب ہیں' اولاً اجتماعی تحفظ' ثانیاً طاقت کا توازن مختلف ناساز گار ادوار کے اثرات نے ہمیں بلاکوں میں صف آراء کر دیا ہے ایک سانس میں عالمی رہنما امن کی تبلیغ کرتے ہیں اور دوسرے میں ایٹم بموں سے تہذیب کو معدوم کرنے کی دھمکی دیتے ہیں ہماری حیثیت افسوس ناک طور پر ناپائیدار ہے سامراج نے دنیا کے ہر حصے میں ہمارا خون نچوڑ لیا اور ہماری قوت کو مفلوج کر دیا ایسے وقت میں مسلمانوں کی نئی نسل جو ایک نئی حرکت یعنی انصاف پر مبنی ایک نظام کی رہنما ہوگی استحصال کا خاتمہ چاہتی ہے اب بھی ہم میں متعدد یکسانیت کے رشتے برقرار ہیں اور اپنی ثقافت کی وحدت کی بناء پر ہم سیاسی طور پر دوبارہ متحد ہو سکتے ہیں اسلامی کنفیڈریشن مسلمانوں کو ان کے محفوظ مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہے اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں شدنی امور سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

تہذیب کو نشوونما کا جوہر ہم نے عطا کیا ہے اور اس کے عوض ہم ہی بیرونی قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئے ہیں انڈونیشیا میں ہمیں اس لئے ذبح کیا جا رہا ہے کہ ہم بیرونی تسلط سے نجات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جاوا سے مراکش تک ہمارے دشمن موجود ہیں میں انتقام لینے کے لئے متحد ہونے کو نہیں کہوں گا لیکن ان حقوق کے تحفظ کے لئے جو ابھی تک ہمارے پاس ہیں ہمیں طاقت ور ہونے کی ضرورت ہے طاقت کے لئے اتحاد بے حد ضروری ہے بدقسمتی سے قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں ہمارے عوام کا مستقبل ہے اور ہم پر ان کی آزادی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ہم دنیا کو اخوت انسانی کا بلیو پرنٹ دیں گے جیسا کہ ہمارے اسلاف نے تیرہ سو سال قبل دنیا کو باہمی انسانی تعاون کا فارمولا دیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران ہندوستانی مسلمانوں نے ترکی کے مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا جب 1911ء میں ترکی پر حملہ ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں نے ان کے لئے دلی ہمدردی کی پرجوش لہر محسوس کی۔ مسلم قائد مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی کو انگریزوں نے ترکوں سے ہمدردی کی بنا پر جیل بھیج دیا ہندوستانی مسلمانوں کی "تحریک خلافت" اس اخوت کی تلخیص تھی جو انہیں دوسری مسلم اقوام سے رہی ہے شاعر پاکستان علامہ اقبال نے ترکی کے حشر پر مسلمانوں کے جذبات کا اظہار کر کے انہیں لافانی بنا دیا۔ جب اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا کا انتقال ہوا تو عالم یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان رنج و غم میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔

www.bhutto.org

ان دنوں میں بہت چھوٹا تھا لیکن مجھے بھی یاد ہے کہ میرا ملازم ڈبڈبائی آنکھوں اور خشک ہونٹوں سے مجھ سے کہہ رہا تھا " کاش مصطفیٰ کمال کی موت کی خبر سننے کی بجائے میں اپنے اکلوتے بیٹے کے مرنے کی خبر سن لیتا "

میں اخوت کے ان گہرے جذبات کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں جو مسلمانوں کے مابین انڈونیشیا اور عرب اقوام کے لئے پائے جاتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایران کے بحران کے بارے میں ہمیں بڑی تشویش رہی اور کشمکش ختم ہو جانے پر دنیا بھر کے اسلامی وفود پاکستان پہنچے اور انہوں نے ہماری نئی مملکت کے لئے جس خلوص و محبت کا اظہار کیا' اس سے ہم بے حد متاثر ہوئے۔ "لیبرز آف دی نارتھ ویسٹ" کے عنوان سے لندن "اکانومسٹ" نے حال ہی میں ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں اسلامی اخوت کے اس جذبے کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے جو پاکستان اور افغانستان کے مابین فروغ پا رہا ہے۔ اس مضمون میں برطانوی اور پاکستانی انتظامیہ کا تقابل کرتے لکھا گیا ہے۔ "حکومت پاکستان اس قابل تھی کہ وہ اسلامی جذبات کو ابھارے اور اس نے بالآخر ایسا کیا جس میں اس کو قطعیت حاصل ہوئی۔ یہ بات ماقبل انتظامیہ میں مفقود تھی۔"

مسلمانوں کے مابین جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے میں اس کی لاتعداد شہادتیں پیش کر سکتا ہوں' لیکن اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ یہ جذبات ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ نئی کشمکش کی علامات ابھر رہی ہیں اور میرا پختہ یقین ہے کہ اس سے قبل کہ اسلامی مملکت میں وسیع پیمانے پر صنعتوں کو فروغ ہو' باہمی رشتے مزید مستحکم و استوار ہوں گے۔ فنی ترقی کی تیز رفتاری سے جو اقدار پنپ رہی ہیں' ہو سکتا ہے کہ ماضی کے خصائص پر کچھ ناخوشگوار اثر پڑے۔ اس موڑ پر ہمارا یہ اہم فریضہ ہے کہ ہم اپنی مضبوط ترقی یافتہ پوزیشن کے پیشِ نظر ایسے جدید نظام کی بنا رکھیں جس کا رشتہ ماضی سے بھی استوار رہے۔ دوسرا عنصر جو ہمارے اتحاد کے لئے باعثِ تقویت ہو سکتا ہے وہ مسلمان اقوام کے مشترکہ دکھ اور ظلم' ناانصافیوں اور مصائب کا احساس ہے جو ان سب کو بلا استثنیٰ برداشت کرنے پڑے۔

بعض لوگ اسلامی کنفیڈریشن پر اس بنا پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے کوئی اقتصادی مفادات حاصل نہ ہوں گے۔ قوموں کا باہمی تعاون بذاتِ خود ترقی پسندانہ اقدام ہوتا ہے۔ اس کے سیاسی اور اقتصادی فوائد ہیں لیکن اگر زیادہ فوائد نہ بھی ہوں تو چند مسلمان ملکوں کو اقتصادی لحاظ سے چند سال کے لئے ایثار کرنا چاہئے۔ یہ اتحاد ایک خون' ایک ثقافت اور ایک میراث کی بنیاد پر ہونا چاہئے کیونکہ ایک صدی سے زائد عرصہ تک بہیمانہ استحصال کا ہدف بنے رہے ہیں۔ یہ ورثہ اس اتحاد کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی صدی ہے جس میں ترقی پذیر ممالک ترقی کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اقتصادی وسائل بکثرت ہیں جس کا بیّن ثبوت اس خطے میں مغربی دنیا کی دلچسپی سے ملتا ہے۔

بدقسمتی سے ہماری کمزوری کے سبب بیرونی طاقتوں نے ہمارے اقتصادی وسائل کا بے دریغ استحصال کیا ہے۔ مغرب کے سفاک استحصالی شرمناک انداز میں اپنی تجوریوں کو بھرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن

www.bhutto.org

اسلامی کنفیڈریشن اپنی کمزوری کے باوجود اپنی دولت کی محافظ ہوگی اور اسے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں محفوظ رکھے گی۔

اب میں اس منصوبے کا اجمالی ساخاکہ پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ قانونِ ارتقا کے مطابق یہ شراکت مختلف سطحوں پر فروغ پائے گی۔ پہلی سطح پر عوام سے وسیع رابطہ کے ذریعے ان کے درمیان وسیع ہم آہنگی کو ابھارا جائے گا۔ یہ رابطہ طلبہ، پروفیسروں، فنکاروں اور دوسرے دانشوروں کے بڑے پیمانے پر تبادلے سے ہوگا۔ یہ دانشور کنونشنوں اور کانفرنسوں کے ذریعے اہم باہمی امور پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس اثنا میں بڑے بڑے شہروں میں مستقل طور پر اطلاعاتی، ثقافتی اور عوامی رابطے کے مراکز قائم کئے جائیں گے۔ ایک مسلم ملک سے دوسرے ملک میں عوام کے سفر کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور انہیں کرایوں میں مراعات دی جائیں گی۔ پاسپورٹ کی پابندیاں اٹھالی جائیں گی اور مواصلاتی نظام کو فروغ دیا جائے گا۔ ان مساعی کے نتیجہ میں اقتصادی تعاون کی راہ ہموار ہو جائے گی اور ایک سیاسی الحاق ان کے مابین وجود میں آجائے گا۔

اگر ہم شعوری طور پر اس سمت گامزن ہو جائیں تو میرا خیال ہے کہ آئندہ بیس سال کے اندر یہ تحریک ٹھوس شکل اختیار کر لے گی۔ میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کی اساس خیالی، اصولی یا نظریاتی نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ میں چند غیر مسلم ممالک آج بھی عرب لیگ کے ممبر ہیں۔ یہ ملک اپنے باہمی مفادات کے لئے رضاکارانہ طور پر اس میں شریک ہوں گے۔ اس ضمن میں اس مقدس جذبہ اور وجدان کے لئے ہمیں خاص طور پر پاکستان ہی سے توقع قائم کرنی پڑے گی۔ ترکی سے ہمیں جدید طرز کے ایسے طریقے حاصل کرنے ہوں گے جن سے اسلامی تشخص مجروح نہ ہونے پائے۔ ایران سے افہام و تفہیم کا جذبہ لیں گے۔ عرب اور افریقہ، ہندوستان اور انڈونیشیا ہر ملک اس میں اہم کردار ادا کرے گا۔ نئے تصورات روحانی اقدار اور جمہوری سوشلزم سے مرکب ہوں گے۔ ہمیں اپنی سرزمین سے ایک اتاترک یا قائداعظم جناح کو ابھارنا ہوگا، جو ہمارے عوام کو متحرک اور ہماری روحوں کو دوبارہ منور کرے، ہماری روایات و رواج کو از سرنو پاکیزگی عطا کرے اور انہیں فنی ترقی سے ہم آہنگ کر کے ناقابلِ تسخیر بنا دے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ترکی فی الحال اس یونین میں شرکت سے اجتناب کرے گا۔ اس خیال میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ترکی، اس حلقے سے اس بنا پر پسپا ہونے پر مجبور ہوا کیونکہ مسلم اقوام کی کمزوری اس کی قوت کو بری طرح متاثر کر رہی تھی۔ اسی طرح اسلامی دنیا کی کمزوری اور یورپی امور میں ترکی کی نازک حیثیت کی بنا پر ترکی کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ مغرب میں ترقی کے لئے پوری پوری توجہ مرکوز کر دے۔ اس کی اہم اور نمایاں جغرافیائی حیثیت نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان ممالک سے معاہدے کرے جو ہمیشہ اسے نیست و نابود کرنے پر تلے رہتے تھے۔ وہ اس ملک کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گیا، جو اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یہ اس لئے ہوا کہ اس کے لئے اور کوئی

www.bhutto.org

راہ باقی نہیں رہی تھی۔ ترکی اپنے اسلامی تشخص کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا اور جب اسلامی ملکوں کی ٹھوس تنظیم اپنی شرائط دوسروں سے منوانے کی پوری طرح اہل ہوگی تو ترکی اپنوں کے ساتھ صف بندی میں ضرور شامل ہوگا اور جب اپنے بیدار ہو جائیں گے تو ترکی خوشی سے مغرب کی زنجیروں کو اتار پھینکے گا اور اپنوں سے آن ملے گا۔

اسلامی کنفیڈریشن کا مجھے آج اسی طرح یقین ہے، جس طرح تقسیم ہند سے قبل پاکستان کی تخلیق کے بارے میں تھا۔ پاکستان نے دنیا کی اقوام میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ کل اسلامی کنفیڈریشن کا خواب بھی حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو مسلم اقوام کے اتحاد کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے، وہ اپنے نظریہ سے پسپائی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ناگزیر حقیقت ہے کہ اگر چھوٹے چھوٹے ذرے واقعات کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو خود بہہ جاتے ہیں۔ ہم اپنے لوگوں کی دوبارہ خوشحالی اور احیاء کے لئے انتھک محنت کریں گے۔

ٹوائن بی کہتا ہے۔ " پان اسلام ازم ابھی خفتہ ہے، لیکن ہمیں اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ یہ شدت سے کسی وقت بھی بیدار ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی وسیع المشرب عوام نے مغربی تسلط اور اس کی قیادت کے خلاف آواز بلند کی تو طبعی طور پر اس کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوں گے اور یہ اسلام کے مجاہدانہ جذبہ کو بیدار کر دیں گے۔ خواہ یہ روایتی سات سونے والوں (اصحاب کہف) جیسی طبعی نیند کیوں نہ سو رہے ہوں۔ اس طرح مجاہدانہ دور کی صدائے بازگشت جاگ اٹھے گی۔ ماضی میں دو تاریخی مواقع پر اسلام ایک علامت رہا ہے، جس سے مشرقی تہذیب مغربی حملہ آوروں کے خلاف کامیاب و کامران رہی۔ اگر موجودہ حالت نوع انسان کو بے تامل نسلی جنگ میں جھونک دے تو عین ممکن ہے کہ اسلام ایک بار پھر اپنا تاریخی کردار ادا کرے۔ "

تقدیر باہمی اسلامی اتحاد کی متقاضی ہے۔ سیاسی حقائق اس کی صحت پر دلالت کرتے ہیں۔ آئندہ نسلیں اس کی منتظر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے۔ شجاعت ہمارے خون میں ہے، ہم عظیم ورثہ کے حامل ہیں، ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

یکم اپریل 1948ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

نیویارک کے تاثرات

نیویارک میں گزرے ہوئے دن یوں تو یادگار ہوتے ہی ہیں 'مگر خاص طور پر وہ دن جب کہ اس عظیم شہر کو الوداع کہنے کا وقت قریب ہو۔ میرے لئے یہ الوداعی دن تھا۔ نیویارک کے قیام کے آخری دنوں میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ دن بھر کی کارکردگی کے بعد میں نے قدرے آرام کیا۔

اگلے دن بیدار ہو کر میں نے اپنا پسندیدہ چارخانہ سوٹ زیب تن کیا اور لیگز نگٹن ایوینیو کو عبور کر کے اس جگہ پہنچا جہاں جانے پہچانے قدامت پسند گھرانے کے ایک فرد نے 'جس سے میری پہلے کوئی ملاقات نہ تھی' دوپہر کے کھانے پر مجھے مدعو کیا تھا۔

اس کے غلط زمانی نظریات سے قطع نظر اس آدمی نے تارکینِ وطن سے متعلق قواعد و ضوابط کے بارے میں غلط معلومات فراہم کر کے مجھے پریشان کر دیا۔ اس کی بیان کی ہوئی معلومات نے مجھے گھنٹوں الجھائے رکھا اور اس طرح اس نے قیمتی وقت ضائع کیا۔

ہوٹل سے واپسی پر میری ملاقات یونیورسٹی کے ایک دوست سے ہوئی 'جو جنوبی کیلیفورنیا کی یونیورسٹی میں معاشیات کا طالب علم تھا۔ اس کا نام سلیمان تھا۔ وہ ترکی النسل تھا۔ اس نے مجھے ترکی ڈنر پر مدعو کیا۔ گزشتہ روز میں نے اسے راجہ ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا تھا۔ یہ اس کا ایشیائی انداز میں جوابی دعوت کا نہایت پیارا طریقہ تھا۔

کھانا نہایت لذیذ تھا۔ کھانے کے بعد ہم بیٹھ گئے اور مباحثہ کے غروب آفتاب تلے ہم نے پان اسلام ازم سے لے کر درآمدی قوانین تک 'لاس اینجلز کے شاندار حب الوطنی کے تذکرہ سے نوجوان

www.bhutto.org

ترکوں کے انقلاب تک، علم طبقات الارض سے لے کر امریکی خواتین کے کردار تک اور کرکٹ سے لے کر کمیونزم اور ہمبرگرز تک کے بارے میں غرضیکہ سب ہی موضوعات پر بے تکلف باتیں کیں۔ آخر آدھی رات کے وقت ہیڈ بیرے نے ہمیں باہر نکال دیا۔ سلیمان اس پر مشتعل ہوگیا اور اس کا اظہار اس نے بیرے کو بخشیش نہ دے کر کیا۔ بیرا اتنی زبان میں کچھ بڑبڑایا مگر سلیمان نے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔

ہوٹل سے نکل کر ہم بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے۔ دونوں خاموش تھے، مگر دونوں ہی سوچ میں غرق تھے۔ ہم فلم دیکھنے گئے۔ اس نے میری پسند کی کسی فلم کو مسترد کیا تو میں نے جواباً اس کی تجویز کردہ فلموں کو ناپسند کیا۔ نتیجتاً دوسرے سمجھوتوں کی طرح فلم کے بارے میں ہمارا سمجھوتہ لغو ثابت ہوا۔ یہ 1930ء کے اوائل کی فلم تھی جس میں گیری کوپر اور کیری گرانٹ کا جوڑا تھا۔ صبح ساڑھے تین بجے ہم باہر نکلے۔ شہر اونگھ رہا تھا مگر زندگی کے آثار باقی تھے۔ ہم سلیمان کے ہوٹل کی سمت فلم اور فلمی صنعت کے مختلف شعبوں پر تنقید کرتے ہوئے چلتے رہے۔ تقریباً نصف گھنٹہ بعد ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں سلیمان نے مجھے اس امر پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ میں کچھ روز اس کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں گزاروں لیکن میں اس پر رضامند نہ ہوا۔ میں نے کہا کہ خوبصورت مگر ننھا سوئٹزرلینڈ مجھے بور کرتا ہے۔ پھر ہم میں پکاڈلی میں دوبارہ ملنے پر مصالحت ہوگئی۔

تقریباً پانچ بجے جب صبح طلوع ہو رہی تھی، میں دوبارہ اس عظیم شہر کی راہوں پر نکل آیا۔ میں تھک کر چور ہو گیا تھا مگر آگے بڑھتا رہا اور سوچتا رہا۔ یکے بعد دیگرے مختلف خیالات کا جم غفیر بڑی تیزی سے میرے ذہن سے گزر گیا۔ اس عظیم شہر میں اپنی آمد کے ابتدائی ایام کا مجھے خیال آیا۔ پھر متعدد مواقع پر اس شہر میں آنے والے یادگار لمحات واضح انداز میں ذہن میں آئے۔ مجھے پُرسکون مشرقی ساحل کا خیال آیا جو ہمیشہ کی نسبت زیادہ سرسبز و شاداب تھا۔

میں نے اپنے خوشگوار قیام کے دوران اس ملک کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس الوداعی سیر میں بہت سے خیالات و تصورات ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھے احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ میں خاموشی اور ویران گلیوں، کوڑا کرکٹ صاف کرنے والوں، دودھ والوں اور ان پُرشکوہ فلک بوس عمارتوں کو دیکھتا رہا، جو بظاہر اپنے اندر وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے بالکل لاتعلق اور بے نیاز ایستادہ تھیں۔ وقتی طور پر یہ سیمنٹ کی بنی ہوئی عمارتوں کے جنگل نظر نہیں آتے تھے۔ وقتی طور پر وہ شدید انسانی جذبات سے پُر محسوس ہوئیں۔ یہ ایک بہت ہی عجیب و غریب احساس تھا جس کا پہلے کبھی مجھے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اچانک ان کا کردار بدل گیا۔ نقاب اٹھ چکا تھا۔

بلاشبہ یہ فلک بوس عمارتیں اب بے جان یادگاریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اب یہ انسانی عظمت کی عظیم الشان شبیہیں معلوم ہونے لگی تھیں۔ یہ حقیقی تخلیق نظر آنے لگیں۔ انسانی مساعی کی واحد تخلیق۔ انسان کی اپنی روح کا انعکاس۔ انسانی مساعی کی بلند ترین رفعتوں کو چھونے کی علامت۔ خاک اور

www.bhutto.org

پتھر سے تعمیر شدہ ڈھانچے انسانیت کے خادم اور غلام دکھائی دینے لگے۔

جوں جوں میرا اثر زور تخیل بلند سے بلند تر ہوتا گیا' میں اس پر غور کرنے لگا کہ کیا یہ عظیم الشان تعمیراتی کمالات ہمارے مفاد کے لئے ہیں اور آیا ان پر ہمارا اختیار ہے۔ میں نے سوچا شاید یہ انسان کے دائرہ اختیار سے نکل کر بے قابو عفریت بن گئے ہیں۔ پھر میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ کہیں وہ اپنے لئے زندہ تو نہیں اور خود غرضی سے اپنی زندگی کی عنان اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تو نہیں۔ میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ اپنے خالق یعنی انسان کے خلاف سازش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا' اپنے خیالات کو جان بوجھ کر خلط ملط کرتا رہا۔ پھر میں خیالی پلاؤ پکاتا ہوا جلد بازی سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کے تخلیق کردہ عفریت سمجھتے ہیں کہ انسان کا ان کی تخلیق سے کوئی واسطہ نہیں' جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کی تخلیق میں خدا کا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں نے ان کے بارے میں خیال کیا کہ وہ سوچتے ہوں گے کہ ان میں چونکہ نہ تو مشابہت ہے اور نہ یکسانیت' وہ قانون ارتقا کی پیداوار ہیں اور یہ بات ڈارون کے نظریہ کے برعکس تھی۔

ایسے ہی خیالات مجھے ہراساں کرتے رہے۔ میرا انسانی تفاخر مجروح ہو کر رہ گیا۔ میرے اندرونی احساسات نے مجھے ان خیالات سے نکالا۔ میں نے بلند آواز میں پتھر کی ان بلند و بالا عمارتوں کی سرزنش کی اور انہیں احسان فراموش قرار دیا۔ میں نے جان لیا کہ میں نے ہی انہیں بنایا ہے' یہ میرے جذبہ تفاخر کا اظہار تھا جو میری ترقی اور خوش تدبیری کا ثبوت تھا۔ غاروں سے فلک بوس عمارتوں تک' تاریکی سے خیرہ کن روشنی تک یہ میری تکمیل کی نشانیاں ہیں۔ اس پر مجھے خوشی ہوئی اور میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

میرا تخیل آگے بڑھتا رہا۔ میری تہذیب کی ترقی کی تصویر اس قدر وسیع ہو گئی کہ مجھے اس میں بنیادی تضادات دکھائی دینے لگے۔ پہلے ان خونریز جنگوں کا خیال آیا جن میں نوع انسانی کا ایک حصہ نیست و نابود ہو گیا۔ پھر مجھے نسلی حقوق کے نظریہ کی عقوبت کا خیال آیا۔ میں نے ابھرے ہوئے تعصب اور نفرت کے بارے میں سوچا' پھر مجھے اپنے زمانے کے تمام مصائب کی بازگشت سنائی دی۔

میں پھر سوچنے لگا کہ الٰہی یہ ترقی ہے یا تنزل؟ غار اور تاریکی کے ادوار اپنی خامیاں رکھتے تھے' لیکن حالیہ رجحانات تو نیکی کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں لوگ سادہ اور مہمان نواز ہوا کرتے تھے۔ اب وہ سرد مہر' تنہا اور پیچیدہ سے ہو گئے ہیں۔ یہ ترقی ہے یا تنزل؟ میں اس بارے میں مسلسل سوچتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ابھی میرے کانوں سے ترقی اور تنزل کے الفاظ کی گونج بمشکل ختم ہوئی ہوگی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی' ہوٹل کا کلرک کہہ رہا تھا "جناب آپ کے جانے کا وقت ہو گیا۔"

اگرچہ میں نیویارک کی دنیا چھوڑ کر پاکستان چلا آیا لیکن اب بھی میں سوچتا رہتا ہوں کہ غار کا انسان زیادہ خوش نصیب تھا یا ان فلک بوس عمارتوں میں مقیم اس کا بیٹا زیادہ خوش نصیب ہے۔

15 ستمبر 1948ء - نیویارک

www.bhutto.org

www.bhutto.org

نوع انسانی کی آفاقیت

یہ دنیا بڑی ہی ظالم ہے۔ زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب کوئی شخص بنفشہ کی خوشبو سے لدی ہوئی فضا میں ہر سانس کے ساتھ تازگی محسوس کرتا ہے اور ایسے لمحات بھی جب کثرتِ جذبات کا زہر اس کے ذہن میں اس حد تک سرایت کر جاتا ہے کہ وہ خود کو ساری مخلوق میں اسفل ترین محسوس کرنے لگتا ہے اور ایسے اوقات بھی آتے ہیں جب دنیا مزاحمت سے عاری چرخی پر تیزی سے گردش کرتی دکھائی دیتی ہے اور بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غم و اندوہ انسان کا مقدر بن چکا ہے۔

وہ کون سا عارضہ ہے جو ایک سوموار کو حضرت انسان کو حیوان کا روپ دیتا ہے۔ اگلے ہی دن اسے عظمت بخشتا ہے۔ بدھ کو اسے وحشی بنا دیتا ہے۔ جمعرات کو اسے مسیحا بننے پر اکساتا ہے۔ جمعہ کو اس میں افلاطون کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ہفتے کے دن وہ قدرے میکیاولی کے کردار کا مظہر بن جاتا ہے اور پھر اتوار آ جاتا ہے جس دن حلقۂ کلیسا کے کسی کمرے میں کفارے کی عبادت کا اجتماع پوری شان و شوکت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

یہ ایک عجیب و غریب دنیا ہے۔ یہاں ایسے بھی ہیں جو مجھ سے 'آپ سے' غرضیکہ ہر ایک سے نفرت کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ہمارے افکار و فلسفے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کسی جگہ جایئے تو آپ کو خوشامدی لوگ ملیں گے۔ کسی دوسری جگہ جایئے تو ایسے لوگ ملیں گے جو آپ کو ذلیل کریں گے۔ آج ترک اگر انحطاط پذیر ہیں تو کل برطانیہ کا راج ہے۔ تاہم میرے غلبہ کا دن ابھی آنا باقی ہے اور میری طرح کئی اور بھی ہوں گے۔

www.bhutto.org

ہم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو گھڑی کی سوئیاں روک کر ماضی کو لوٹانا چاہتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو وقت سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ بہت تھوڑے ایسے بھی ہیں جو وقت کو ہمیشہ کے لئے ٹھہرانے کے آرزومند ہیں۔ کچھ اصطلاحی ناموں پر فخر کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تان بالعموم کسی نہ کسی سیاسی تحریک (ازم) پر ٹوٹتی ہے۔ کچھ لوگ مذہب کے اصول و عقیدہ کو جانے اور سمجھے بغیر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ بعض شدید اور بے لوچ عقائد رکھتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ پوری نوع انسانی ان پر مستقل طور پر عمل پیرا ہو۔

ہم خود کو ترقی یافتہ قرار دیتے ہیں اور تہذیبوں کے خالق، ثقافت کے معمار اور عظیم مذاہب کے علمبردار۔ لیکن اگر آخری تجزیہ میں سوچا جائے تو ہم فی الحقیقت ذہانت، رواداری اور زمانے کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہیں؟ ہم میں سے کچھ کی رائے ہے کہ قدیم یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے سے ہم دنیاوی اور اُخروی زندگیوں کے علم کے بارے میں مہارت نامہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ان مسائل کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش میں کہ ہم نے ترقی کے تمام بیج بو دیے ہیں۔ دراصل ہم تطہیر کی تلاش کے خلاف داخلی مزاحمت کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔

ہم نے مسلسل اور مستقل طور پر یہ سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ ہم دوسروں سے بہتر ہیں اور دوسروں سے بہتر عمل کرتے ہیں۔ ہم خدا پر اور دوست پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر بھی ہم کس طرح انہیں منہ دکھانے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ ہم کمتر لوگوں کو حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں جو درحقیقت ہم سے کمتر نہیں بلکہ صرف ہمارے مقابلے میں کم خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔

ہم انسان ہیں، جنہیں ذی عقل قرار دیا جاتا ہے۔ معاشرتی حدود مقرر نہیں کی جا سکتیں۔ یہ قانون فطرت ہے جو انسانیت کو ازل سے عطا ہوا ہے۔ لیکن اس کھلی صداقت کے باوجود ہم نے مادر گیتی کو ویرانہ بنا دیا ہے اور انسانیت کے تصور یعنی نظریہ مساوات و آزادی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے۔

ماضی کے تکلیف دہ تجربات اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم انسانیت کو ایک واحد اور ناقابلِ تقسیم تنظیم قرار دے کر غور و فکر کریں، ہم سب اپنے نسلی اور ثقافتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کو اس مقدس وحدت کا رکن سمجھیں اور عوام الناس کو مسرت بخشنے کے لئے جان کی بازی لگا دیں۔ ان سیدھے سادے عوام کے لئے جن کے پاس نہ دھن دولت ہے، نہ اختیار۔ ہم ہر قسم کے ذہنی خوف و ہراس سے مبرا ہوں۔ ہماری روحیں ہمت شکنی کا شکار نہ ہونے پائیں۔ صرف اس صورت میں زندگی بامقصد اور معنی خیز محسوس ہو پائے گی۔ یہ وقت ہے جب ہم عزم صمیم سے اپنے شکستہ حال لوگوں کو قعرِ مذلت سے نکال کر موجودہ جنت تک پہنچائیں۔

ہماری اصلاح انسانیت کی فلاح سے وابستہ ہے کیونکہ ہم اس کا اٹوٹ انگ ہیں۔ ہماری کامرانیاں سب کے لئے ہونی چاہئیں کیونکہ یہ دنیا سب کے لئے بنائی گئی ہے۔ ہم خواہ کسی بھی سرزمین پر رہتے ہوں لوگ جہاں کہیں بھی حقوق کے لئے نبرد آزما ہوں اور جہاں جہاں بھی وہ انصاف اور صداقت کے حصول

www.bhutto.org

کے لئے جدوجہد کر رہے ہوں، آپ بھی ان کے ساتھ پوری گرمجوشی اور دل وجان سے شریک ہو جائیں۔ جب بھی انسان جور و ستم، لغزش یا بے انصافی یا ظلم واستبداد کا شکار ہو جائے تو پھر کسی خوف وخطر کے بغیر جدوجہد اور ایثار کا علم بلند کر کے جہاد شروع کر دیجئے۔ آدمی آزاد بھی ہوتے ہیں اور غلام بھی، امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی اس زمین سے دکھ اور غربت کے خاتمے کے لئے متحد ہو جانا چاہئے۔

کیا اس کی کچھ اہمیت ہے کہ ہم دوسروں سے مختلف زبان بولتے ہیں؟ اس سے کیا کچھ فرق پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو مختلف النوع چیزوں اور گوناگوں رنگینیوں کا مسکن بنایا ہے؟ دکھ اور بھوک، خوف اور قحط، ہر زبان میں سمجھے جاتے ہیں۔ قادر مطلق کی قوت کو ناپنے کی بجائے انسانی ارادوں کو جانچنا چاہئے۔ اس صورت میں ہم نئے عقائد کے مشعل بردار اور اخوت واتحاد کے داعی بن سکتے ہیں۔ یہ ایک چیلنج ہے۔ نہ خدا اور نہ ہی انسان ہم سے اس سے زائد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

آیئے، ہم اپنا سر فخر سے بلند کریں اور آسمان پر نظر ڈال کر ان دنوں کا تصور کریں جن میں اضطراب کی جگہ سکون ہو گا اور یہ دور انشاء اللہ شورش اور تاریکی کے دور کے بعد آئے گا۔ صرف اور صرف اس وقت ہم اپنی آئندہ نسلوں کو یہ بتانے کی جرأت کر سکیں گے کہ خدا ہمارا حامی وناصر ہے اور ہمیں اس کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوگی۔

12 / نومبر 1948ء
یونیورسٹی آف کیلی فورنیا۔ برکلے

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان کی بالیدگی

(وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ کے موقع پر نوزائیدہ اسلامی مملکت پر ایک نظر)

امریکہ اور جدید ایشیا کے درمیان سیاسی ' معاشی اور ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے صدر ٹرومین نے مختلف آزاد ایشیائی ملکوں کے رہنماؤں کو امریکہ کے دورے پر مدعو کرنے کی قابلِ تعریف پالیسی کا آغاز کیا ہے۔

پاکستان کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خاں چھ ماہ کے مختصر عرصے میں اس ملک کا دورہ کرنے والے تیسرے ایشیائی رہنما ہوں گے۔ قبل ازیں شاہ ایران اور بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو امریکہ کا دورہ کر چکے ہیں۔ لیاقت علی خان کا دورہ امریکہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

تاہم اس امر پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ ایسے دورے فریقین کے مابین مفادات اور نصب العین کے حقیقی اشتراک کی صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ تعاون کی یک طرفہ خواہشات بار آور نہیں ہو سکتیں۔ جب تک امریکہ کے لوگ ایشیائی مزاج سے شناسائی حاصل نہیں کرتے 'امریکہ اور ایشیا کے مابین کسی اشتراک کے امکانات معدوم ہیں۔ اگر امریکی عوام دونوں ممالک کے درمیان تعاون کی حقیقی خواہش رکھتے ہیں تو انہیں کم از کم پاکستان جیسے ملک کے بنیادی تشخص کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔

ایشیا میں سیاسی بیداری کے ساتھ بہت سی تبدیلیوں نے جنم لیا ہے۔ یہ تبدیلیاں اس قدر ہنگامہ خیز اور طوفانی نوعیت کی حامل ہیں کہ سامراجی ڈھانچے کی فرسودہ اور از کار رفتہ زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑی ہیں۔ نو آزاد ایشیائی ممالک میں مینارِ نور کی حیثیت رکھنے والا پاکستان 15 / اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ اس ملک کا قیام ایک منفرد اور کٹھن کارنامہ تھا جو غیر معمولی حالات میں سرانجام دیا گیا۔

www.bhutto.org

برِ صغیر ہندوستان میں اس نئی ریاست کے بانی محمد علی جناح تھے جو اپنی تخلیق کردہ مملکت کے پہلے گورنر جنرل بھی بنے۔ قدیم ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے بعد سے وہ پہلے ہندوستانی تھے جو اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیئے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست تخلیق کی۔ علاوہ ازیں پاکستان کو دنیا کی پانچویں بڑی مملکت ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ایشیائی ممالک میں جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے پاکستان چند اہم ممالک میں شامل ہے۔

ابتدا ہی سے اس نئی مملکت کو گوناگوں مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ نوزائیدہ ریاست میں داخل ہونے والے پناہ گزینوں کے سیلاب کے مقابلے میں یورپ میں بے گھر ہونے والوں کی تعداد بے حد معمولی معلوم ہوتی ہے۔ حکومت پاکستان کو نہ صرف راتوں رات پناہ گزینوں کیلئے کیمپ قائم کرنا پڑے بلکہ ان بے گھر افراد کے لئے روزگار اور خوراک کا بندوبست بھی کرنا پڑا۔

نئی ریاست میں بالکل نئے سرے سے انتظامی ڈھانچہ تخلیق کیا گیا۔ سماجی اور زرعی اصلاحات کی منصوبہ بندی کی گئی اور انہیں عملی جامہ پہنایا گیا۔ مزید بر آں بھارت سے تنازعات پیدا ہوگئے۔ نوابوں اور مہاراجوں کے زیرِ عنان ریاستوں کے ضمن میں بھی گوناگوں پیچیدگیوں نے سر اٹھالیا۔

مندرجہ بالا سطور میں نوزائیدہ مملکت کو درپیش مشکلات میں سے صرف چند ایک کا ذکر کیا گیا ہے۔ دارالحکومت کراچی گویا مسائل کے محاصرے میں تھا اور یکے بعد دیگرے نت نئی مشکلات سامنے آرہی تھیں۔ جمہوریت کی بنیادیں استوار کرنے کی غرض سے بیک وقت دستور ساز اور قانون ساز مجالس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پاکستان کے مخالفین نے مملکت کو معاشی اعتبار سے ناکام بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ہم نے پٹ سن، کپاس اور دیگر غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی بر آمد، آبپاشی کے وسیع منصوبوں، تین سالہ متوازن بجٹ، گندم کے اضافی ذخائر، صنعتی ترقی، خام وسائل کی دریافت اور عوام کی بڑھتی ہوئی خوشحالی جیسے اقدامات سے دشمنوں کے عزائم کا مسکت جواب دیا ہے۔

1950ء

www.bhutto.org

دوسرا حصہ

آئینی مسائل

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان ایک وفاق یا وحدانی ریاست

برصغیر کی تقسیم سے قبل ہی پاکستان کے آئین کی تشکیل کے کام سے "وفاقی" اور "وحدانی" اصطلاحیں منسوب رہی ہیں، تاہم وفاقی آئین کے تقاضے جغرافیائی حالات اور ثقافت زبان اور تاریخ کی گمشدہ کڑیوں سے دوچند ہو جاتے ہیں! اگرچہ مقامی تقاضوں کے حقائق کے باوجود ایک چھوٹے مگر موثر طبقے نے حال ہی میں وحدانی حکومت کے لئے جوش و ولولے کا اظہار کیا ہے۔ خصوصاً اس بنیاد پر کہ اس طرز حکومت سے صوبائی عصبیت کے مکروہ اور روح کش زہر سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔

دراصل ہم معانی کو صحیح طور پر سمجھے بغیر سیاسی اصطلاحیں غیر ذمہ دارانہ طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔ صحیح سمجھ بوجھ کے لئے سب سے پہلے ان اصطلاحوں کی تشریح نہایت ضروری ہے۔ یہ بتانا بھی لازمی ہے کہ تشریحات تشریح کرنے والے کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اور سیاسی اصطلاحیں بھی اس اصول سے مبرا نہیں۔

آکسفورڈ کے منفرد تاریخ دان کے۔ سی۔ وہیئر نے وفاقی اصول اور وفاقی آئین میں ایک اچھوتا امتیاز پیدا کیا ہے! اگر ہم موضوع کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اس فرق کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہیے۔ وفاقی اصول کا مطلب ہے:

"اختیارات کی تقسیم کا طریقہ جس سے مرکزی اور علاقائی حکومتیں اپنے اپنے دائرے میں رہ کر خود مختار بھی ہوں اور اشتراک عمل بھی کریں" مگر اس مسئلہ میں کوئی ایک رائے نہیں ہے، مختلف ماہرین کے نزدیک وفاقیت کی ہر طرح ایک مختلف اصول کے تحت ہے۔ کئی صاحب نظر حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ وفاقی اصول

www.bhutto.org

کا انحصار اختیارات کی اس طرح تقسیم پر ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے اختیارات مختص اور واضح ہوتے ہیں اور باقیات علاقائی حکومتوں کو بانٹ دیئے جاتے ہیں ریاست ہائے متحدہ کا آئین اس اصول پر مبنی ہے۔ اس میں سارے آئین ساز ادارے کے شعبوں کی تقسیم کر دی گئی ہے اور جو اس ادارے کو تفویض نہیں کئے گئے وہ ریاستوں کے پاس رہ جاتے ہیں۔ کے۔ سی وہیر (K.C.Where) کے قول کے مطابق یہ پیمانہ امریکی آئین کی نسبتاً سطحی تصویر پر منطبق ہوتا ہے بنیادی بات یہ نہیں کہ اختیارات کی تقسیم میں علاقائی حکومتیں آئین کے تحت باقیات کی وصول کنندہ ہوتی ہیں بلکہ اختیارات اس طرح تقسیم ہوتے ہیں کہ مرکزی حکومت اور علاقائی حکومتیں ایک دوسرے کی زیر دست نہیں رہتیں۔

وفاقی اصول کو سمجھنے کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وفاقی نظام میں مرکزی اور علاقائی حکومتیں دونوں براہ راست لوگوں پر حکمران ہوتی ہیں جبکہ کنفیڈریشن یعنی آزاد حکومتوں کے وفاق کی صورت میں صرف علاقائی یا ریاستی حکومتیں ہی لوگوں پر حکمران ہوتی ہیں۔ مگر یہ تعریف بھی ناکافی ہوگی مثال کے طور پر جنوبی افریقہ کی یونین میں مرکزی اور صوبائی حکومتیں ویسے ہی براہ راست لوگوں پر حکمران ہوتی ہیں جس طرح ریاست ہائے متحدہ میں ایک دوسرے کی معاون ہوتی ہیں۔

بلاشبہ اس ضمن میں اور بھی نظریات پائے جاتے ہیں۔ لارڈ ہالڈین کی طویل بحث جو انہوں نے اٹارنی جنرل برائے کامن ویلتھ آسٹریلیا بنام کلونیل شوگر ریفائننگ کمپنی لمیٹڈ کا فیصلہ لکھتے ہوئے کی، وہ بڑی فکر انگیز ہے البتہ آخری تجزیہ کے طور پر یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ وفاقی اصول کو اس سے منسلک تمام قیود سے علیحدہ دیکھا جائے تو اس کا مطلب ہے۔

"ایک ایسی حکومت جس میں بالادستی اور سیاسی اقتدار مرکزی اور مقامی حکومتوں میں منقسم ہوتا ہے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے دائرے کے اندر خود مختار ہو۔"

یہ تشریح سر رابرٹ گیران نے بھی 1929ء کے آسٹریلین آئین پر رائل کمیشن کی رپورٹ میں کی تھی۔

وفاقی اصول کی تعریف کے بعد ہم وفاقی آئین کے معانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس بات کا آسان مگر صحیح جائزہ لینے کے لئے کہ آیا آئین میں وفاقی اصول کو غالب حیثیت دی گئی ہے یا نہیں ؟ اگر یہ صورت غالب ہے تو آئین وفاقی ہے۔ اگر وفاقی آئین میں ردّ و بدل کر دیا گیا ہو تو پھر آئین وفاقی متصور نہیں ہوگا۔ اس کا یہی ایک پیمانہ ہے لہٰذا وفاقی آئین کی باضابطہ تعریف کرنا نہایت ضروری ہے اور اس کو صاف طور پر آئین کی ہیئتِ ترکیبی پر نافذ کرنا ہوگا۔

اوصاف کے واضح تضاد کے لحاظ سے ایک وحدانی حکومت دراصل مرکزیت کی حامل ہوتی ہے اور یہ ایسے خود مختار حصوں میں تقسیم نہیں ہوتی جن میں صرف مرکزی حکومت کے مقرر کردہ قانون کے مطابق طبقاتی حکومت کو ایک چھوٹی سطح پر اختیار دیا جاتا ہے۔ وحدانی آئین میں بالادستی مرکزی اور مقامی حکومتوں

www.bhutto.org

میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ غیر منقسم طور پر مرکز کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور علاقائی حکومتیں اگر موجود ہوں بھی تو مرکزی حکومت کے معاون کار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذیلی طور پر ہوں گی۔ اس طرح وحدانی مملکت میں مرکزی اور مقامی حکومتوں کے مابین کوئی اشتراک عمل نہیں ہوتا۔ صرف ایک حکومتی ذریعہ ہوتا ہے جس کو تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح اس نظام کی اکائیت کے مدِنظر اصول اور قانون میں خط فاصل کھینچنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

اصطلاحات کی تشریح ہو چکی 'اب آیئے ہم وحدانی اور وفاقی طرز ہائے حکومت میں اگر کوئی فرق ہے تو اس کا جائزہ لیں۔ اس مسئلے میں اختلاف رائے موجود ہے۔ بعض کے نزدیک اصولی طور پر دونوں میں بالکل کوئی فرق نہیں۔ ان کے دلائل کے مطابق فرق اگر ہے تو عارضی پہلو سے ہے جو قانون کی مرکزیت سے ختم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے نزدیک نہ صرف دونوں نظاموں میں بنیادی فرق ہے بلکہ ان کا دو قسمی ہونا مستقل نوعیت کا ہے۔

پہلے نظریہ کے حامی اصحاب کی دلیل یہ ہے کہ وفاقوں کی چند واضح خصوصیات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے علاقائی حکومتوں کی قیمت پر مرکزی حکومت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ مدات جن سے علاقائی خود مختاری کم ہوتی ہے لامحالہ مرکزی حکومتوں کے قبضہ میں ہوتی ہیں ۔ لہٰذا قانون کی مرکزیت ناگزیر ہے۔ مرکزی حکومتیں ملکی تحفظ کا انتظام کرتی ہیں اور انہیں جنگ کرنے اور امن قبول کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ایسی حکومت جس کو اس قدر مرعوب کن اختیارات حاصل ہوں ' خصوصیت سے مالیات کے سلسلہ میں علاقائی حکومتوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر سیلی کہتا ہے۔

" مجھے اس بات سے انکار ہے کہ وحدانی حکومت اور وفاق یا وفاقی ریاستوں میں کسی قسم کا بنیادی فرق موجود ہے "

وہیر اپنی کتاب " وفاقی حکومت " میں لکھتا ہے کہ اصل وجوہ جن کی بنا پر صوبوں کی قیمت پر حکومت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے ' " جنگ ' اقتصادی بدحالی ' معاشرتی سہولتوں میں اضافہ اور ذرائع آمدورفت اور صنعتوں میں مشینی انقلاب ہیں۔ جنگ اور معاشی بدحالی کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ان کی چارہ جوئی وحدانی طرز سے کی جائے تاکہ مسائل سے مؤثر طور سے نمٹا جاسکے اور ان پر جتنا بوجھ پڑتا رہا وہ صرف مرکزی حکومتیں برداشت کرتی رہی ہیں " ——— آخر میں وہیئر کہتا ہے کہ

" ذرائع آمدورفت اور صنعت میں انقلاب کی وجہ سے ہر ریاست کے الگ تھلگ رہنے کی بجائے ' ریاستوں کی باہمی زندگی میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور عمل کی زیادہ تر سرگرمی مرکزی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جرائم سے نبرد آزما ہونا بھی کانگریس کے سپرد ہے "

ان حقائق کے پیش نظر یہ دلیل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حقیقت میں دونوں نظاموں کا فرق صرف قانونی

www.bhutto.org

ڈھانچے کی مرکزیت میں مضمر ہے۔ ابتدائی سطح پر قانون کی مرکزیت وفاقی مرکزی حکومت میں اس قدر گہری نہیں ہوتی جتنی کہ وحدانی حکومت میں مگر بتدریج یہ اس قدر استوار ہو جاتی ہے کہ اصولی طور پر امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر کیلسن کہتے ہیں۔

عدم مرکزیت کا یہی ایک درجہ وحدانی ریاست اور وفاقی ریاست میں امتیاز پیدا کرتا ہے اور جس طرح وفاقی حکومت وحدانی حکومت سے ممیز ہوتی ہے، اسی طرح بین الاقوامی سطح پر ریاستوں کی گروہ بندی بھی اونچے درجے کی غیر مرکزیت سے ممیز ہوتی ہے۔

عدم مرکزیت کے پیمانے کے مطابق وفاقی ریاست کا درجہ متحدہ بین الاقوامی ریاستوں اور وحدانی ریاست کے وسط میں آتا ہے۔ یہ وفاقی حکومت ایک ایسے درجے کی عدم مرکزیت پیش کرتی ہے، جو ملکی قانون کے تحت تشکیل شدہ ایک قوم اور ریاست کے موافق ہوتی ہے اور ایک اس درجہ کی مرکزیت جو بین الاقوامی قانون کے تحت تشکیل شدہ بین الاقوامی گروہ کے مطابق نہیں ہوتی۔

یہ نظریہ البتہ کئی مستند حوالوں کے خلاف ہے مثال کے طور پر ویئر لکھتا ہے

"یہ نظریہ کہ وفاقی حکومت، وحدانی حکومت کی منزل کی طرف محض ایک قدم ہے 'ایک پیش گوئی تو ہو سکتی ہے مگر تاریخ کا فیصلہ نہیں۔" یہ تسلیم کہ جنگ اور بد حالی، مالیات اور بیرونی تجارت، چند ایسی وجوہ ہیں جن کے باعث مرکزی حکومتوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مگر بات اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ مرکزی حکومتوں کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ علاقائی حکومتیں بھی ترقی کرتی ہیں۔" تمام وفاقوں میں علاقائی حکومتیں جس قدر اب فرائض منصبی ادا کرتی ہیں وہ فرائض وفاقوں کے وجود میں آنے سے قبل یا تو انہوں نے کبھی ادا ہی نہیں کئے تھے یا اگر ادا بھی کئے تھے تو اب سے کہیں کم۔

وییئر یہ کہہ کر بات ختم کرتا ہے کہ علاقائی حکومتوں کے احساس اہمیت، شعور ذات اور اونائیت ذات میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ یہ ترقی مرکزی حکومتوں کی اہمیت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی ہے اور اسی سے اس کو تحریک ملی ہے۔

لہٰذا اس مفید نقطۂ نگاہ سے ریاست کے حقوق بالکل معدوم نہیں ہیں اور وفاقیت خواہ کچھ بھی ہو ختم ہونے والی نہیں۔

ممتاز مصنف لاسکی اپنی کتاب "سیاسیات کی قواعد" (گرامر آف پالیٹکس) میں پورا زور دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اقتدار اس لئے وفاقی ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے مابین اختلافات کسی طرح ختم نہیں ہو پاتے۔ اس اصولی مسئلہ کو لاسکی نے اس قدر عمدگی سے پیش کیا ہے کہ اس کا تفصیل کے ساتھ حوالہ دینا ضروری ہے:

بطور انسان ہم کبھی بھی کسی رشتے میں مکمل طور پر منسلک نہیں ہوتے۔ ہم سے متعلق کوئی حلقہ ایسا

ضرور ہوتا ہے جو ہمیں دوسروں سے جدا رکھتا ہے یا زیادہ سے زیادہ دوسروں سے ہمارا میل جزوی ہو سکتا ہے۔ معاشرتی طور پر ہم دنیا میں جو یکجہتی پاتے ہیں وہ کبھی مکمل نہیں ہوتی۔ تھوڑے عرصہ کے لئے ہم سب ایک ہی منزل کی خواہش کر سکتے ہیں مگر یہ ایک منزل محض بیانیہ حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ جو زندگی میرے لئے اچھی ہے وہ آپ کے لئے اتنی اچھی نہیں ہو سکتی۔ اس میں کچھ مشابہت البتہ ضروری ہے جو معاشرتی سکون کو موثر اور پائیدار بنا دیتی ہے۔ مگر مشابہت یکجہتی کا درجہ نہیں رکھتی جن چیزوں کی ہمیں ضرورت ہے ان کی ساتھ ساتھ تکمیل ضروری نہیں۔

ہمارے تعلقات ایک اہم نغمہ کے سُروں کی تنظیم ہم آہنگی کی طرح نہیں جس میں اہمیت آخری تاثر کی ادائیگی کی ہوتی ہے۔ ہمارے تجربہ کا ہر جزو ہمارے حق میں سچائی ہے اس لئے ہر جزو نئے الجھنیں ہماری شخصیتوں کی وفاداریوں کے ایک نظام کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ اس بات کا فیصلہ ہم میں سے ہر ایک کو کرنا ہے کہ ایسے نظام میں توازن برقرار رکھا جا سکتا ہے جس پر کسی بھی وقت زور عمل ڈالا جا سکے کیونکہ وہ نظام صرف اور صرف ہمارا ہے۔ میرے خیال میں اس سے جو سیاسی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ واضح ہے۔ ایک سماجی تنظیم کو اگر اس کی موزونیت مطلوب ہو وہ لازماً وفاقی ہونا چاہئے اس کے سانچے کی لپیٹ میں محض میری ذات اور مملکت میرے گروہ اور مملکت ہی نہیں بلکہ یہ سب اور ان کے باہمی رشتے بھی آجاتے ہیں۔

اس طریقے سے مملکت معاشرتی تکمیل کی صحیح معنوں میں متلاشی بن سکتی ہے۔ یہ معدودے چند لوگوں کے آلہ کار بننے سے باز آ سکتی ہے کیونکہ ان کا "منشا" بہت سے لوگوں کی خواہشات پر مبنی ہو گا۔ یہ اثر پذیر ہو گی ان لوگوں کے لئے جن کا اقتدار کے مطالبات کو فوری اور نہایت شدید بنا دیتا ہے بلکہ وہ سب جو کچھ انفرادیت رکھتے ہیں تحفظ اور پھیلاؤ سے ہمکنار ہوں گے اور اپنی خواہشات کے بیان و وضاحت پر قادر ہوں گے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو سکے گا کہ ان کی خواہشات کا احترام اس وجہ سے نہیں کیا جا رہا کہ وہ کسی معاشی دباؤ کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خواہشات معاشرتی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی زندگی کے تجربات اور ان تجربات کی قیمت جو ان کے نزدیک ہے وہ سب خاطر میں لائی جائیں گی۔

اس قسم کی مملکت صحیح معنوں میں کسی قوم کی رہنما ہو گی اس کے مختلف مقاصد اتحاد کے مناسب ذرائع رکھتے ہیں جو اس کی خوش حالی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ یکساں قانون کا اطلاق نہیں کرے گی۔ اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ مادہ اتنا مختلف النوع ہے کہ وہ ایسی سادگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ایک مملکت جس میں سیاست کا فن عام طور پر صرف چند اشخاص ہی کو معلوم ہو وہ کبھی اکثریت کو نہال نہیں کر سکتی کیونکہ وہ صحیح طور پر کبھی اکثریت کی ضروریات کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ یہ ان کی ضروریات کا تصور محض اس مفروضے پر کرتی ہے کہ اس کے اپنے آمروں کی خواہشات ان ضروریات کے مطابق ہیں۔

مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک یا دوسرے نظریئے کی حمایت کی جائے تاہم اگر محض بحث کی خاطر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ امتیاز محض عارضی ہے تب بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے

www.bhutto.org

ملکوں میں ایسے حالات موجود ہیں جن کے سبب کم سے کم عارضی طور پر ہی سہی وفاقی حکومت کا قیام لازمی ہے۔ اگر وحدانی طرز حکومت کو ایک غیر مرکزی معاشرے پر مسلط کر بھی دیا جائے تو وہ اپنی اصلیت برقرار نہیں رکھ سکے گی یا مصنوعی طور پر اگر مرکزیت کے عمل میں تعجیل برتی جائے تو مشابہت کے امکانات ہمیشہ کے لئے معرض خطر میں پڑ جائیں گے لہٰذا یہ عبوری دور بذات خود بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اسی سے وفاقی طرز حکومت کی ضرورت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

یہ عمومی جائزہ لینے کے بعد اب ہم ان مخصوص صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں جن میں وقتی ضروریات اور متعلقہ حالات نے وفاقیت کو ناگزیر بنا دیا ہے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ملک کی فراخی مختلف نسلوں کے اجتماع اور مملکت کی مشمولہ ریاستوں سے غیر اقوام مثلاً برطانیہ' سپین اور فرانس کے تاریخی رشتوں نے وفاقیت کو یکجہتی اور قومی احساس کا ستون بنا دیا ہے۔

روس کی مثال شاید سب سے واضح ہے۔ مارکس اور اینجلز وفاقیت کے متعلق ادعائی نظریات رکھتے تھے ان کے خیال میں اس نظام سے آزاد وفاقیت کی بقا اور سماجی ترقی میں رکاوٹ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اینجلز نے لکھا ہے کہ "پرولتاری (مفلس لوگ) صرف ایک اور ناقابل تقسیم جمہوریہ کا طرز رائج کر سکتے ہیں" مگر ان قطعی نظریات کے باوجود مارکس اور اینجلز نے وفاقیت کو بالکل مسترد نہیں کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ مخصوص حالات میں وفاقیت سے کچھ پیش رفت ہو سکتی ہے اور یکجہتی کے سلسلہ میں یہ ایک کڑی کا کام دے سکتی ہے۔ نیز مرکزی وحدانی ریاست کے ارتقاء میں کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔

روس میں اس کے وجود میں آنے سے اب تک مسلمہ طور پر وفاقی طرز کی حکومت ہے۔ لہٰذا مارکس اور اینجلز کے نظریات کی رو سے یہ مملکت اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے اور اینجلز کی ایک اور ناقابل تقسیم جمہوریہ کی ناگزیر منزل اس کے سامنے ہے۔ ان مضبوط آراء کے پیش نظر روسی قائدین بڑی ستائش کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان مخصوص حالات کا فہم و فراست سے مطالعہ کیا جن کی بناء پر انہیں وفاقی آئین بنانے پر مجبور ہونا پڑا۔

1917ء سے اب تک مسلسل دساتیر کی بدولت وفاقیت نے ایشیاء سے لے کر براعظم یورپ تک کے بیشتر خطۂ ارض کی بیشتر قوموں کو ان کی مخصوص تاریخ' روایات' مذہب' نسلی رواج اور زبان کے باوجود جغرافیائی اکائی کی شکل دی ہے۔ لینن نے جو کسی وقت وفاقیت کا مسلمہ مخالف تھا' ایک موقع پر کہا تھا:

> "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وفاق کو اگر صحیح جمہوری رنگ دیا جائے تو وفاق کی تشکیل حقیقی جمہوری مرکزیت کے لئے ایک عبوری اقدام ثابت ہوتی ہے۔ جمہوریہ روس کی مثال پوری طرح یہ بات واضح کرتی ہے کہ جس وفاق کو ہم نے رائج کیا ہے' اسی سے روس کی مختلف قومیتوں کے مضبوط اتحاد اور روسی مملکت کے جمہوری اور مرکزی بننے میں بڑی مدد ملے گی۔"

سٹالن جو خود اقلیتی قومیتوں میں سے ایک سے تعلق رکھتا تھا' اس کے رو بروایک تو شامل ہونے والی

www.bhutto.org

قومیتوں کی معاشی ' سیاسی اور سماجی خود مختاری اور مفلسوں کی تراشی ہوئی فرمانروائی کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف یک جتی پرولتاریت کی آمریت کا۔ سٹالن نے مقامی خود مختاری پر جو زور دیا ہے اس کا خلاصہ خود اس نے اس طرح بیان کیا کہ :

"ایک ریاست کی صورت میں لوگوں کا انضمام اس وقت تک پائیدار نہیں ہو سکتا جب تک لوگ رضا کارانہ طور پر اس قسم کا فیصلہ خود نہ کریں۔ اسی وجہ سے ہر اکائی کا اپنا آئین ہے جو وفاقی آئین سے مطابقت رکھتا ہے اس کے علاقے کے حدود اربعہ میں اس کی اجازت کے بغیر رد و بدل نہیں کیا جا سکتا اور یہ حق اسے حاصل ہے کہ وہ آزادانہ طور پر متحدہ ریاست ہائے روس کی جمہوریہ سے الگ ہو جائے"

متحدہ ہندوستان کا 1935ء کا آئین وفاقی تھا اگرچہ بعض لوگ اسے محض نیم وفاقی کہنا پسند کریں گے جن لوگوں نے یہ وفاقی آئین تشکیل دیا تھا ان کیلئے ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں میں اختلاف مذہب 'نسل ' زبان اور سماج کے پیش نظر متبادل طرز کے آئین کے امکان کی گنجائش بھی نہ تھی۔ تقریباً انہی وجوہ کی بنا پر 1950ء کے آئین میں بھی وفاقیت کے اصول کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں شامل صوبوں کو آپس میں ضم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کے برعکس آندھرا کا مزید ایک صوبہ تخلیق کیا گیا۔

پاکستان میں آئین سازی کا مسئلہ اپنی نظیر آپ رہا ہے۔ ارباب اقتدار سخن سازی کی بھول بھلیوں کے گرد ناچتے رہے ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے قائداعظمؒ نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں شامل اکائیوں کو آئین کے ذریعے برابری اور خود مختاری دی جائے گی۔

پاکستان کے بانی کے پیش نظر وفاقی آئین تھا مگر اس کی وجہ دوسرے طرز ہائے حکومت کے خلاف تعصبات نہیں تھے بلکہ انہوں نے اس کا تہیہ کر رکھا تھا کہ ملک کو وہی آئین دیا جائے جو اس کے عوام سے فطری طور پر ہم آہنگ ہو۔

ہمارے قدرے غیر مرکزی ,معاشرے میں نسلی 'لسانی اور سماجی اختلافات اور مغربی و مشرقی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کے فاصلے کے پیش نظر صرف وفاقی طرز حکومت ہی لوگوں میں معاشرتی استقامت کی افزائش کر سکتا ہے۔

غیر منقسم ہندوستان ایک قوم نہیں تھا 'بلکہ ایک برا عظم تھا جس میں گنجان آبادی اور زبانوں کی کثرت یورپ کی طرح تھی۔ یہاں کی زبان اور نسل 'ادب اور مذہب ' رواج اور فنون سب ہی مختلف تھے۔ ہر حملہ آور نے ان علاقوں پر اپنے نقش ثبت کیے جنہیں اس نے تاراج کیا مختلف نسلوں کے میل ملاپ نے جس کے ڈانڈے پتھر کے زمانے سے ملتے ہیں ' بالآخر تہذیبوں کو جلا بخشی۔

مغلوں کے دور کے آغاز سے قبل ہندوستان کو ایک متجانس اکائی میں پرونے کی کوئی اجتماعی کوشش نہیں کی گئی۔ جب مغل اس عظیم کارنامے میں کامیاب ہونے لگے تو ان کے زوال کا دور شروع ہو گیا اور وہ اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

برطانیہ عظمیٰ کا اپنی ماتحت ریاستوں میں کٹر اصول "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" تھا۔ ڈیڑھ صدی

www.bhutto.org

سے زیادہ عرصے تک انگریز حکام کے اس بنیادی اصول نے آپس میں مربوط ہونے کی قوتوں کو دبائے رکھا۔ شائد چند لوگوں کا یہ خیال ہو کہ ہندوستان کو راجہ اشوک کے دور میں اتحاد نصیب ہو گیا تھا۔ مگر یہ دلیل قطعاً غلط ہے۔ تاہم اگرچہ یہ عظیم موریہ شہنشاہ برصغیر کے شمال سے تامل خطے کے کنارے تک اپنی حکومت بڑھانے میں کامیاب ہو بھی گیا تھا، مگر اس کے دور اور اورنگزیب کے دور میں ہندوستان کو پھر سے ایک مرکزی حکومت دینے کے دوران کئی صدیوں کا وقفہ پڑا۔ تقریباً 240 قبل مسیح سے 1700ء تک ہندوستان مختلف نسلوں کا مجموعہ رہا ہے۔ اگر اشوک نے اپنے شاندار دور حکومت میں قومی شعور کا ایک نشان قائم بھی کیا تھا تو وہ مغلوں کی سلطنت کے قیام سے پہلے ہی مٹ چکا تھا۔

علاوہ ازیں قومیت کا تصور جس سے آج ہم آشنا ہیں، موریہ اور گپت راجاؤں کے دور میں بالکل ناپید تھا اور اسی وجہ سے ان قدیم ادوار میں مضبوط مرکز کے ذریعے قومی استحکام کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی گئی۔

پنڈت نہرو جو دو قومی نظریہ کے شدید مخالف تھے اپنی کتاب انکشاف ہند "ڈسکوری آف انڈیا" میں ہندوستان کی گونا گونی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں شدید قسم کا تنوع ہے، اور ہر سطح پر ہی عیاں ہے جو چاہے دیکھ لے۔ اس کا تعلق، وضع قطع، عادات و اطوار سے ہے، بظاہر شمال مغرب کے پٹھان اور جنوب کے تامل میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ان نسلوں کی نسل مختلف ہے۔ ان میں کچھ عنصر مشترک ہو سکتے ہیں لیکن وہ شکل و شباہت، خوراک و پوشاک نیز زبان میں بلاشبہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں"

اس بحث سے پنڈت نہرو نے جو اپنا مخصوص نظریہ قائم کیا، انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا بھی حوالہ دیا جائے ورنہ ان کے متعلق غلط فہمی کا احتمال ہے۔

"ان سب اختلافات کے باوجود پٹھانوں پر ہندوستان کا نقش ماند نہیں ہے اور تاملوں پر بھی یہ نقش خوب واضح ہے۔"

یہ گہرے اور واضح اختلافات ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی بھلا نہیں دیئے گئے۔ اگرچہ اسلام کی برتر اتحاد کی طاقت نے نسل، معاشرت، زبان اور رواج کی دیو قامت رکاوٹوں کو بیخ میل اور غیر متجانس لوگوں کی ایک آزاد مملکت کے وجود کی خاطر ختم کر دیا، پھر بھی ریاستوں کی اندرونی دوئی اور امتیازات جو ابتدائی زمانہ سے تھے ختم نہ ہوئے۔ اسلام کا یہ منشا نہیں ہے کہ آمرانہ طریقوں سے یکسانیت پیدا کی جائے۔ اس کی راہ خود اختیاری ہے اور پاکستان بھی اسی طرح کے ابدی اور سچے طور طریقوں ہی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوا۔ اسلام کی عظیم الفطرت روح جبر و اکراہ کی راہ اختیار کر کے آلودہ نہیں ہونا چاہتی، لہٰذا ثقافتوں کو جبر کے ساتھ یک رنگ بنانا ایک لحاظ سے مذہب سے برگشتگی کے مترادف ہے۔

اسلام کی درخشاں تاریخ گواہ ہے کہ جو خطے وقت کے ساتھ ساتھ آغوش اسلام میں آئے وہاں کبھی مطلق العنان معیار مسلط نہیں کیے گئے۔ اسلام کی ذی قدر میراث کے سوتے بے لطف نشوونما اور اکتا دینے والے کڑے اصولوں سے نہیں پھوٹتے بلکہ متنوع ثقافتوں اور قدروں کے اثر آفریں امتزاج سے عبارت ہیں۔ قرون وسطیٰ کی تنگ نظر عیسائیت کے برعکس اسلام میں جو بردباری اور بے تعصبی ہے اس نے

مسلمانوں کو عالمگیر اوصاف سے سرشار میراث عطا کی ہے۔

اسلام کی روح اپنی اصل کے اعتبار سے اگرچہ عربی ہے مگر یہ رسوم و روایات تک محدود نہیں۔ یہ تقریباً تمام مشرقی اقوام اور مغرب کے ایک اچھے خاصے امتزاج کا احاطہ کرتی ہے۔ عام طور پر اسلام کے مجاہدین اپنے مخالفین سے حد درجہ رواداری اور تحمل سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف مفتوح لوگوں کی زبان و ثقافت کو صحیح و سالم رکھا بلکہ ان کی جغرافیائی اکائیوں کو بھی ملحوظ رکھا جب محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا تو اس نے تمام انتظامی امور مقامی لوگوں کے سپرد کر دیئے صرف یہ شرط لگائی کہ بغداد کے اقتدار کو تسلیم کریں۔

اسلامی معاشرت کی ساخت کا محور بنیادی طور پر وفاقیت کے اصول کا طریق عمل ہے۔ مفروضے کے طور پر اگر آج بھی عرب ممالک ایک مربوط اکائی میں مدغم ہونا چاہیں تو وہ محض وفاقیت کی بنا پر ہی ایسا کر سکیں گے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عربوں کے درمیان یکسانیت اور رشتے بہت ہیں مثلاً مذہب، زبان اور نسل کے رشتے لیکن اگر وہ اس میں مدغم بھی ہوں تو اس کی صورت ایک ڈھیلے وفاق کی ہوگی جس میں مشمولہ ریاستوں کی خود مختاری کا تحفظ ایک بنیادی قانون کے ذریعے ہوگا۔

بلاشبہ اس قسم کے ادغام سے عربوں کا اتحاد قائم ہوگا اور مشتمل ریاستوں کی برابری کی بھی ضمانت ہوگی۔ تنہا وفاقیت ایسے مخلصانہ اتحاد کا فارمولا ہے۔ اس لئے کہ اس کے باوجود بعض لوگ خواہ کچھ خیال کریں، وفاقیت یکجہتی کی ضد نہیں ہو سکتی بلکہ وسیع تر اتحاد کے اندر متنوع ورثوں کی محافظ ہوتی ہے۔

تاہم اگر اتحاد کے تصور کی بنیادی مشابہت، عدم اختلافات سے ہو تو بہت بڑا وحدانی آئین بھی غیر موزوں ہوگا لیکن اگر اتحاد کے معنی یہ ہوں کہ ایک جغرافیائی وجود کے لوگ بنیادی وفاداریوں کو تسلیم کر لیں تو پھر ان وفاداریوں کے تحفظ کا بہترین راستہ وفاقیت کے ذریعے ممکن ہے اور خصوصیت سے جب مرکزیت کا معیار اتنا بلند نہ ہو کہ ایک وحدانی حکومت کو ایک ناقابل تقسیم مرکز سے اقتدار استعمال کرنا پڑے۔

ان بنیادی حقائق کو مانتے ہوئے ہی 1940ء کی قرارداد لاہور میں یہ واضح کیا گیا کہ پاکستان میں وفاقی حکومت ہوگی قرارداد مقاصد جو قائد اعظمؒ کے قابل اعتماد اور لائق نائب نے پیش کی تھی، اس میں بھی اس عہد کو غیر مبہم الفاظ میں دہرایا گیا۔

چودہ سال سے زائد عرصے تک مسلم لیگ کے ذمہ دار ارباب نے عاقبت اندیشی سے کام لے کر وفاقی آئین بنانے کی ضرورت کو تسلیم کیا، روحانی حالات اور ماضی کے تجربات نے مل کر وفاقیت کی راہ کو ناگزیر بنا دیا ہے۔

کیوبک اور مشرقی بنگال میں مطابقت کی بے اندازہ اہمیت ہے جس طرح کیوبک لوگوں کی یہ بڑی جذباتی خواہش ہے کہ وہ کینیڈا کی قومیت میں رہ کر بھی اپنی ثقافت، نسل اور زبان کا تحفظ کریں، اتنی ہی بڑی ہے جتنی مشرقی پاکستان کے لوگوں کی۔ ایک ایسا آئین جس میں محسوسات کی پرواہ نہ کی گئی ہو، سرتابی کا موجب بن سکتی ہے۔

ان لاافانی حالات کے پیش نظر وفاقی آئین کی مخالفت کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ انسانی اجتماعی تقاضوں کے

www.bhutto.org

تعین کے ضمن میں منطقی جبر محفوظ اور راہنما ذریعہ نہیں ہے البتہ موجودہ خاص صورت میں بے شمار تقاضوں نے وفاقیت کو ناگزیر بنادیا ہے مگر متعدد ذہن اختراعیں نکال لیتے ہیں اس ضمن میں مسٹر ممتاز دولتانہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب نے 23 اپریل 1954ء کو خود ہی اقرار کیا ہے۔

"میں نے پاکستان کے لئے ہمیشہ وحدانی طرز حکومت کی وکالت کی ہے اگر چہ میں اقلیت میں رہا۔"

انہوں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وفاقیت پر مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ہمیشہ کنفیڈریشن یا عملی طور پر اس کے قریب ہر طرز حکومت کی مخالفت کی ہے۔ ایک صوبے کے زرمبادلہ کو صرف اسی صوبے کے استعمال کے لئے مختص کرنے کا مسئلہ، اور صوبے سے متعلق مرکزی ملازمتوں کو اسی صوبے کے شہریوں تک محدود کرنا اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنی یہ تجویز کہ پنجاب کی سپاہ صرف پنجاب کے دفاع کے لئے استعمال ہو، یا یہ کہ ایک صوبے کے وسائل اور آبادی کی مدد سے جو پبلک فنڈ جمع کیا جائے وہ صرف اس صوبے یا علاقے کے مفاد میں صرف کیا جائے۔ میرے خیال میں اس قسم کی محدود صوبائیت پاکستان کے صوبوں اور ہمارے عظیم خطہ ارض دونوں ہی کی بہبود کے لئے تباہ کن ہے"۔

وفاقیت سے متعلق اس سے زیادہ غلط رائے نہیں مل سکتی۔ تین غیر معمولی مہینوں کے دوران اس طرح کی خطرناک حد تک غیر فطری سادہ تشریحوں کی وجہ سے ایک مہیب کایاپلٹ ظہور میں آئی ہے۔ اس دوران میں مغربی پاکستان میں مسٹر دولتانہ کی تنہا آواز پُرشور سُروں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جان دی بپٹسٹ (حضرت یحییٰ علیہ السلام) کی طرح پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان کے عوام کو اس طرح کی راست بازی کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں اب قوم کو کسی ایسے مسیحا کا انتظار ہے جو اس بنجر سرزمین کو زرخیز زمین میں تبدیل کر دے۔

جان سٹوارٹ مل نے کہا ہے؛

سیاسی ادارے انسانوں کی تخلیق ہیں اور ان کا منبع اور ان کا وجود انسانی عزم کا مرہون منت ہے۔ ایسا نہیں کہ انسان کسی خوشگوار صبح کو بیدار ہوا تو یہ سب موجود پائی گئیں۔ نہ ہی ان کی مثال درختوں جیسی ہے کہ ایک بار اُگا دیئے گئے اور انسان کی نیند کے دوران بھی بڑھتے رہے۔ اپنے وجود کے ہر مرحلے پر وہ محض انسان کے ارادی وسیلوں سے تشکیل پاتے ہیں"۔ مل فاش غلطی کا شکار تھا۔

فی الواقع 1954ء کی ایک خوشگوار صبح کو اصول وفاقیت جو اپنی نشوونما اور اپنے ارتقا کے ہر درجے پر انسانی ارادوں کے وسیلوں سے وجود میں آیا تھا۔ اسے سیاست دانوں کے ایک طاقتور گروہ نے اچانک قطعی طور پر ناقص قرار دیا۔

وفاقی آئین کی صورت پذیری کے دوران اس کی دھجیاں اڑانے اور ایک بے شکل معجون مرکب پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں مغربی پاکستان کے لئے ایک وحدت کی کچھ اس طرح گنجائش رکھی گئی گویا ناقابل مصالحت طریق میں مصالحت کرائی گئی یعنی وفاقی اور وحدانی طرز حکومت میں امتزاج کی تدبیر کی گئی۔

عوام کو اس تجویز کے حسن و قبح پر غور کرنے کا موقع مہیا کئے بغیر اور ان کو اس معجون مرکب کا کوئی

مسودہ فراہم کئے بناقوم کو "قطعی فیصلہ" جیسی صورتحال سے دوچار کرنے کی انتھک کوشش کی گئی۔
اس نئے منصوبے کو مرتب اور پیش کرنے والوں نے عمومی اور مبہم پروپیگنڈے کے ذریعے یہ شور بلند کیا کہ مغربی پاکستان کے ایک وحدت میں پرو دیئے جانے سے صوبائی تعصب کا خاتمہ ہو جائے گا اور قومی اخراجات میں کمی واقع ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے انتشار کی صورت پیدا ہوگی۔
علاوہ ازیں مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں پرونے کی تجویز سے 1940ء کی تاریخی قرارداد لاہور اور قرارداد مقاصد کی نفی ہوگی ریاست کشمیر اگر کبھی پاکستان میں شامل ہوئی تو یہ تجویز اس کے لئے بھی قابل قبول ہوگی۔
یہ امر واضح ہے کہ کشمیر اپنی خودمختاری کی حفاظت کرنے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہندوستان سے اس کی کشمکش اس قدر ظاہر ہے کہ یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ یہ توقع ہرگز نہیں ہے کہ کشمیری قائدین بھی اپنے جذبات اور اعتقادات سے منحرف ہو سکیں گے جن کا اعلان وہ اپنی سالہاسال کی تکلیف دہ جدوجہد کے دوران کرتے رہے ہیں۔ کیا ہمیں کشمیر کے معاملے میں ترجیحی برتاؤ رکھنا ہے اور اس کا درجہ مشرقی بنگال کے مساوی تسلیم کرنا ہے؟ کیا ہم کشمیر کو بالکل بھول گئے ہیں اور کشمیر سمیت مغربی پاکستان کا تصور ہمارے پیش نظر نہیں؟
ایک وحدت کے گرد رقص ایک پُر جمال شے کی صورت اختیار کر گیا۔ تمام دوسری طرز ہائے حکومت 'خصوصیت سے وفاقیت کو قومیت کے منافی گردانا گیا اور اتنی پرزور تالیوں کے شور میں کہ نئے نظام پر کوئی سمجھوتہ ناممکن دکھائی دیتا تھا۔
لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جب اس منصوبہ کی مخالفت نے زور پکڑا تو وحدت مغربی پاکستان کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد ایک متبادل منصوبہ لے آئی جسے انہیں نے نامعلوم فہم کی بنا پر "منطقہ وفاق" کا نام دیا۔ یہ چونکا دینے والی قلابازی ان کے اصولوں کے دیوالیہ پن کی مظہر تھی۔
یوں مغربی پاکستان کے عوام کو ایک اور حماقت خاموشی سے برداشت کرنا پڑی۔ اس بے جا حد تک وسیع احتراز سے جو راہ نکلی اس نے نقصان پر ہزیمت کا اضافہ کیا۔ منطقہ وفاق کے نمایاں خدوخال ایسے تھے کہ ان کی کوئی سند تاریخ نہیں ملتی اور اس فرسودہ نعرہ کے علاوہ کہ اس سے صوبائی تعصب کا خاتمہ ہو جائے گا اس کی اور کوئی تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔
اس کے ظاہری خاکہ سے تاثر ملتا ہے کہ یہ اونچے اور بھاری بھرکم لوازمات کا موجب ہوگا جس کی بنا پر حکومت پر اخراجات کے ہمالیہ ٹوٹ پڑیں گے جن لوگوں نے ایک وحدت کے منصوبے کی اس وجہ سے حمایت کی کہ اس سے اخراجات میں کمی ہوگی' دراصل وہی لوگ تھے جو ایک اور متضاد تجویز کے بھی حامی رہے ہیں جو قومی خزانے کو خالی کرنے کے درپے تھی یہی اس بے باکی کا لب لباب تھا۔
سیاسی نیرنگیاں ایسی ہیں کہ تادم تحریر منطقہ وفاق کی تجویز بھی بالائے طاق رکھ دی گئی ہے اور ایک وحدت کا منصوبہ انتقاماً پھر سامنے آیا ہے۔ کشمکش اور کشیدگی کے دور کے بعد ایک وحدت کے

حامیوں کو پھر سے سیاسی برتری حاصل ہوگئی ہے۔ ایک سابق وزیر نے جو اپنے آپ کو اس تصور کا خالق کہتے ہیں فرمایا کہ نوشتۂ دیوار صاف ظاہر ہے اور صوبائی تعصب کا خاتمہ ہونے کو ہے۔

اس کی قیمت خواہ کچھ بھی پڑے ' تحریر ایک دیوار پر واقعی عیاں ہے۔ مگر جہاں تک صوبائی عصبیت کے ازالہ کا سوال ہے اس میں بڑا شبہ ہے۔ دو بڑی اکائیوں کے صوبائی تقابل سے ایک نئی فکر نے جنم لیا جو صوبائیت کی بت شکن ہونے کی دعویدار ہے اگر اس کو نافذ کر دیا گیا تو بلاشبہ چھوٹی اکائیوں کی جغرافیائی حدود تو ختم ہو جائیں گی لیکن یا سی قطعیت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ صوبائی عصبیت مستقل صورت اختیار کر جائے گی۔

صوبائی عصبیت کی مہلک بیماری حالیہ ہے اور اس کی مضبوطی کی وجوہ دوسری وجوہ کے علاوہ سخت دباؤ کے وہ حربے ہیں جنہیں ایک وحدت اور منطقۂ وفاق کے منصوبوں کے نفاذ کے لئے استعمال کیا گیا۔ جغرافیائی حدود بیک جنبش قلم مٹائی جا سکتی ہیں مگر ثقافتی امتیاز کا صفایا قانون سازی یا انتظامی ضوابط سے ممکن نہیں۔

یہ بات بیکار محض ہے کہ تاریخ کے دھارے کے مخالف سمت چلا جا سکتا ہے۔ تنوع کی حقیقت تسلیم کی جانی چاہئے اور حکومت کی ہیئت ترکیبی اس طرح ہونی چاہئے کہ لوگوں کی خوشحالی روز افزوں ہو۔

پاکستان کی اکائیوں کو کم سے کم کر دیجئے۔ مگر ثقافتی ' جغرافیائی اور تاریخی نسبتوں کی بنیاد پر ہی ایسا ہونا چاہیئے مطلق العنانیت کے بل پر نہیں کچھ تضادات جو صوبوں کے اپنے تراشیدہ ہیں ختم کرنے سے اخراجات میں تخفیف ہو سکتی ہے اس طرح کے امتزاجات منطقی بھی ہیں اور جائز بھی نیز وفاقی عنصر کے لئے خطرے کا باعث بھی نہیں۔ ان بے قاعدگیوں کی صحت کے علاوہ محض ادغام کی کوششیں طوائف الملوکی کو جنم دے گی۔ وفاقیت کسی عشرت پسند دوشیزہ کی طرح نہیں ' جس کی دلکشی اور پسندیدگی پر لوگ اختلاف رکھتے ہوں۔ کسی آئینی تصور میں واہمہ کیا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ وفاقی تجربہ کو کامیابی کے ساتھ ان ممالک میں آزمایا گیا ہے ' جہاں پر عدم مشابہت کا وجود ہے۔

اگر صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جائے تو امریکہ اور روس کی مثالیں تاریخ کے اوراق پر منقش ہیں۔ ان دو عظیم جمہوری مملکتوں میں شاندار معاشی ' سیاسی اور معاشرتی ترقی حاصل کی گئی ہے۔ یہ ترقی وفاقیت ہی کی مرہون منت ہے۔

بلاشبہ وہ وقت دور نہیں جب ان ممالک میں ہمارے ملک سمیت ارتقا کے سنگ دل عمل سے ایک مرکب نظام وجود میں آئے گا جیسے کہ انگلستان میں ہوا۔ یہ وہ وقت ہے جب عارضی دور اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

اگست 1954ء

www.bhutto.org

ون یونٹ کا پھندہ

ان لوگوں کی طرف سے تاریخ سندھ کا آخری باب لکھنے کی سنگدلانہ کوششیں جاری ہیں جو غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ موئن جوڈرو کی قدیم سرزمین صرف اس وقت وجود میں آئی تھی جب برطانیہ نے انتخابی مقاصد کے لئے برِصغیر کو چھوٹے چھوٹے علاقوں میں تقسیم کرنے میں مصلحت دیکھی۔ اس طرح میانی کی جنگ ہمارے تخیل کا واہمہ ہے۔

یہ بات انتہائی المناک ہے کہ ہم پر بعض بے بنیاد الزامات اس لئے لگائے جا رہے ہیں کہ جو کچھ ہمیں عزیز اور ہمارے لئے مقدس ہے، ہم اسے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگر یہ واقعتاً مخصوص مفادات کا سوال ہوتا تو ہمارے گلے میں ون یونٹ کا پھندا ڈالنے کے لئے ایک جاگیردار وزیر اعلیٰ نہ بنتا۔

جہاں تک حقیقی خدشات کا تعلق ہے، وہ واقعتاً حقیقی ہیں۔ کوئی انتظامی طریقہ کار بھی مستقبل قریب میں انہیں دور نہیں کر سکتا۔ پچھلے سات سال کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

سندھ نے اس مملکت کے قیام میں انتہائی دلیرانہ کردار ادا کیا ہے جس میں اسے توقع تھی کہ دوسرے حصوں کی طرح اسے بھی برابر کا شریک سمجھا جائے گا۔ سندھ آج بھی صرف دو بڑے یونٹوں کی بجائے تمام صوبوں میں سیاسی طاقت کی مساوی تقسیم کے مؤقف پر قائم ہے۔

24 نومبر 1954ء ۔ لاڑکانہ

www.bhutto.org

www.bhutto.org

آئینی روایات

"دستوری قوانین سے ذمہ داریاں بالکل اسی طرح وجود میں آئی ہیں جس طرح نجی قانون سے 'مگر اس کے اثرات سیاسی طور پر مقتدر افراد پر قانونی سطح سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں 'مثلاً انقلابات 'فعال اور انفعال مدافعت اور رائے عامہ کا خوف۔ ان مضمرات اور نتائج کے خوف ہی سے قوانین اخذ کئے جاتے ہیں"

(وینو گریڈوف۔ آؤٹ لائنز آف ہسٹاریکل جورسپروڈنس)

اس ناقابلِ تردید حقیقت کے پیشِ نظر کہ اس ملک میں گذشتہ چھ سال کے عرصے میں بارہا آئینی روایات کی توڑ پھوڑ ہوئی 'ان روایات کی آئینی اساس 'اہمیت اور اس کے دائرہ کار کا جائزہ لینا کسی حد تک سود مند ثابت ہو گا۔

آئین کی ہیئت ترکیبی میں قانونی (Legal) قاعدے اور روایتی (Non-Legal) ضابطے دونوں ہی شامل ہوتے ہیں۔ قطعی قانونی قواعد وہ ہوتے ہیں 'جنہیں عدالتیں جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے تسلیم کرتی ہیں اور عمل میں لاتی ہیں۔ روایتی (Non-Legal) ضابطوں کو عدالتیں نہ تو تسلیم کرتی ہیں اور نہ ہی ان کو نافذ کرتی ہیں۔ اگر کبھی کوئی عدالت کسی ایسے قاعدہ کو تسلیم کر لے تو ایسی صورت میں وہ قاعدہ قانون کا لازمی حصہ بن جاتا ہے۔

کسی آئین کے ماہر وکیل پر یہ بات بخوبی روشن ہے کہ آئینی ڈھانچے میں موجود قاعدے اور روایتی (Non-Legal) ضابطے مسلسل ایک دوسرے پر لازماً اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اس باہمی مرکب کے بغیر کوئی آئین کامیابی سے نہیں چل سکتا۔

www.bhutto.org

قانونی قاعدے آئین پر عمل کی ضمانت ہوتے ہیں' جب کہ روایتی (Non-Legal) ضابطے آئین کے اعضاء کے مجموعی عمل میں لچک پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں' جو اس کی فطری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اس ضمن میں کا ایک غیر معمولی قول یہ ہے۔

"برطانیہ کی آئینی ترقی میں جو بات خصوصیت کی حامل ہے' وہ یہ نہیں کہ قانون کو روایت سے علیحدہ کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ آئینی حدود میں رہ کر قانون کے ساتھ روایت کا جوڑ ملا دیا جائے' جو اس کا ناگزیر خاصہ ہے"

ہر چند کہ یہ حوالہ برطانیہ کے نام نہاد "روایتی اور غیر تحریری" آئین کے بارے میں ہے' تاہم معنوی لحاظ سے اس کی مثال برطانیہ کے مثالی قانونی ڈھانچے تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ معمولی ردوبدل کے ساتھ اس کا اطلاق تمام جمہوری آئینوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس' سویڈن اور ریاست ہائے متحدہ کے تحریر شدہ آئینوں میں قطعی قانونی اور روایتی قواعد کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ فرانس کے 1875ء کے آئین میں جو قانونی اختیارات صدر کو تفویض کئے گئے ہیں' ان کا استعمال رسوم کے تحت ہی کیا جاتا ہے۔ سویڈن میں کابینہ کی حکمرانی کی جو طرح پڑی تو اس کی بنیاد روایت ہی تھی۔ ریاست ہائے متحدہ میں جو مخصوص ترین آئینی تبدیلی روایات کے عمل سے وجود میں آئی وہ صدارتی رائے دہندگان کے اختیارات ہیں۔

بہرصورت یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان تمام دستوروں کے ڈھانچوں میں قانونی قواعد اور روایتی قواعد کے باہمی میل اور ادغام کے اسلوب کو خصوصیت حاصل ہے۔ مگر یہ کہنا محض قیاس ہوگا کہ آیا قانونی قواعد اور روایتی قواعد پر یکساں زور دیا گیا ہے یا ان میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے جواب کا انحصار ہر قوم کے انفرادی نقطہ نظر اور سماجی روایات پر ہے۔ اینگلوسیکسن نسل عموی طور پر اور برطانوی خاص طور پر دونوں قسم کے قواعد کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور برطانیہ کی آئینی تاریخ میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے روایتی قواعد ہی کو آئین کا مرکزی عنوان بنایا۔

سٹیچوٹ آف ویسٹمنسٹر 1931ء کی پارلیمانی کارروائیوں کے ریکارڈ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جب مسودہ قانون پارلیمینٹ میں پیش ہوا اور بعض ممبران جو اس پر معترض ہوئے تو اس کے مندرجات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعے آئینی روایات کو قانونی قواعد سے کمتر دکھانا مقصود تھا۔ لارڈ ہلمانسٹر (سابق چانسلر) کہتے ہیں۔

"یہ نہیں کہ اس کے اصل مندرجات ہمارے اور ہمارے مقبوضات کے مابین تعلقات پر کوئی ضرب لگاتے ہیں بلکہ میرے خیال میں پہلی بار یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان قواعد کو جو مملکتِ برطانیہ میں شامل تمام ملکوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں' پارلیمینٹ کے ایک ایکٹ کی صورت دی جائے اور میرے نزدیک یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اس ملک کی ترقی کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کا کبھی کسی طرح کا تحریر شدہ آئین نہ تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وقتاً فوقتاً اس مملکت کے مختلف حصوں اور ان کے

www.bhutto.org

اختیارات کے مابین اشتراکِ عمل ممکن رہا اور کبھی بھی کوئی سنگین غلطی یا نقصان رونما نہیں ہوا"

یہ بیان اگرچہ تحریر شدہ اور غیر تحریر شدہ دستوروں کے بارے میں گمراہ کن ہے ' تاہم یہ کھلے الفاظ میں لارڈ بکماسٹر کے اس اجتناب اور احتراز کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انہوں نے روایتی قواعد کو قانونی قواعد کی شکل دینے کے سلسلے میں برتا۔ علاوہ ازیں 1921ء کی امپیریل کانفرنس کے موقع پر مندوبین کی اکثریت نے آسٹریلوی وزیر اعظم مسٹر ڈبلیو ایم ہیو کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ۔ "برطانیہ اور اس کے مقبوضات کے مابین تعلقات کی تخصیص کو ضبطِ تحریر میں لانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے"

برطانوی آئین میں روایت کا عمل بے حد نمایاں اور فیصلہ کن ہے اور خالص قانونی آئین کا تصور وہاں سرے سے مفقود ہے۔ اگر کسی اہم روایت یا رسم کو توڑا جائے تو وہاں شدید سیاسی اور سماجی ردِّ عمل رونما ہوتا ہے۔ برطانوی آئین کے متنوع خدوخال کا اصل ماخذ روایت ہے اور اگر کسی ایک بھی (روایتی قاعدہ) سے انحراف برتا جائے تو وہاں کا آئین بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ذیل میں چند انتہائی اہم روایات درج کی جاتی ہیں۔

الف۔ بادشاہ کے بیشتر مخصوص اختیارات وزراء کو سونپ دیے جاتے ہیں۔

ب۔ کابینہ معاملات کے چلانے والے ایک عام ادارے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔

ج۔ بادشاہ اپنے وزراء کے مشورے پر عمل کرتا ہے۔

د۔ جو پارٹی "کامنز" یعنی دارالعوام میں اکثریت حاصل کرے ' بادشاہ اس کے قائد کو حکومت بنانے کی دعوت دینے کا پابند ہوتا ہے۔

ل۔ وزیر اعظم کے مشورہ پر بادشاہ کے لئے پارلیمنٹ توڑ دینا لازمی ہو جاتا ہے

م۔ اگرچہ قانون کے مطابق بادشاہ کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اپنے وزراء کا تقرر کرے یا انہیں سبکدوش کر دے ' مگر پھر بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان افراد کو وزیر مقرر کرے جن کے تقرر کا وزیر اعظم مشورہ دے۔

ن۔ بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منظور شدہ مسودہ ہائے قانون کی توثیق کرے۔

و۔ پارلیمنٹ کا اجلاس سال میں کم سے کم ایک دفعہ ضرور بلایا جائے۔

یہ تمام روایتی قواعد ہیں اور کسی عدالت کے ذریعے نافذ نہیں کئے جا سکتے۔ مگر اس کے باوجود کسی برطانوی بادشاہ یا وزیر اعظم کے لئے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ ان قابلِ احترام قواعد سے روگردانی کرے۔ مگر یہ پوچھنا جائز ہے کہ روایت پر اس قدر باقاعدگی اور پابندی سے عمل کیوں ہوتا ہے جبکہ وہ قانونی طور پر نافذ العمل نہیں ہیں۔ کون سی ایسی قوت ہے جس کے ذریعے آئینی روایات پر عملدر آمد کی ضمانت ملتی ہے۔ ڈائسی کے قول کے مطابق اس کے خصوصی محرکات مندرجہ ذیل ہیں۔

www.bhutto.org

الف۔ یہ تقاضہ کہ آئینی حکومت کی روایت کو برقرار رکھا جائے۔

ب۔ یہ خواہش کہ حکومت کی پیچیدہ مشینری کو کار آمد رکھا جائے تاکہ اس کا سفر رواں رہے۔

ج۔ یہ فکر کہ لوگوں کا اعتماد حاصل رہے اور اس کے ذریعے اقتدار اور حکومت برقرار رہے۔

"یہ اثرات اس بات کی ضمانت ہیں کہ یکے بعد دیگرے آنے والے سب وزراء "کابینہ کی حکومت کی ان روایات کے پابند ہوں جن کی بنیاد لازمی مثالوں اور سہولتی رواج پر قائم ہے" ڈائسی نے بھرپور جذبے اور انتہائی زور کے ساتھ روایات کے منشا کو آگے بڑھایا۔ اس یقین کے ساتھ کہ "روایات کا اصل مقصد بالآخر رائے دہندوں کی برتری کا تحفظ ہے جو حقیقی طور پر سلطنت کے مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں"

اصل بات یہ ہے کہ روایت قانونی قواعد کے ساتھ اس طرح باہم شیر و شکر ہے کہ روایت کو توڑنے سے جو پیچیدگی رونما ہوگی۔ وہ لامحالہ اصل قانون کو بھی توڑنے کے مترادف ہوگی۔ علاوہ ازیں ایک باخبر اور سیاسی شعور کے حامل معاشرے میں کسی آئینی روایت سے انحراف شدید عوامی نفرت پر منتج ہوتا ہے' جس کا نتیجہ آتش زنی کی صورت میں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔ ان قابل لحاظ حقائق کے پیش نظر اس بات کی توقع ہے کہ ایک باشعور قوم جو ذمہ داری کے احساس سے سرشار ہو وہ مثال اور روایت کا راستہ ہی اختیار کرے گی۔

البتہ یہ ممکن نہیں ہے کہ سب افراد مسائل سے متعلق ایک سی طرزِ فکر اختیار کریں اور ایک سی سماجی اور سیاسی قدریں اپنائیں۔ خاص کر جبکہ اقوام کی تاریخ اور معاشرت ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ ہر ایک قوم اپنے لئے ایک طرزِ حکومت منتخب کرتی ہے جو اس کے منفرد اندرونی تقاضوں اور عوام کی اکثریتی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قوم معاشرتی مکتبِ فکر اختیار کرنے پر آزاد ہو اور خارجی اثرات اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

سامراجیت کی ایک برائی اور بے اصولی یہ بھی ہے کہ محکوم اقوام کو ان کے حقیقی اندرونی تقاضوں اور معاشرتی قدروں کے مطابق ترقی کرنے سے روکا جاتا ہے۔ بیرونی پیمانے ان پر زبردستی مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر ملکی لوگوں کی رسوم غلام اقوام کے سماجی تانے بانے کا حصہ بن جاتی ہیں' اگرچہ ان میں سے بعض قدریں تو کبھی بھی ان سے مطابقت پیدا نہیں کر پاتیں۔

بدقسمتی سے برطانوی سامراج نے اس حقیقت کا احساس نہ کیا کہ برِّصغیر کے لوگ روایتی قواعد کو ان جیسی قدر و منزلت سے نہیں دیکھتے۔ چنانچہ وہ کئی لحاظ سے اپنی ہی جیسی آئینی ہیئت ہمیں ورثے میں دے گئے۔ اس آئینی بے اصولی کے نتائج کئی مواقع پر خطرناک ثابت ہوئے۔ جدید ترین مثال اس کی یہ ہے کہ سندھ اسمبلی کو ختم کر کے ایک اہم روایت سے کسی پاداش کے بغیر انحراف کیا گیا۔

اگر ہمیں یقین ہو یا ہمیں یہ باور کرایا جائے کہ روایت ہیئت آئینی کی ایک اہم شکل ہے جس کا پاس اور احترام ضروری ہے تو ہمیں چاہئے کہ گزشتہ چھ سال کے واقعات کے باوجود ہم مروّجہ آئینی روایات کا پاس کریں۔ اس لئے کہ ان لچک دار قواعد کی افادیت اور اہمیت اندازہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ لیکن اگر

www.bhutto.org

ان کو محض لفظی خانہ پری تصور کریں جس کی قبولیت کی بنیاد محض مصلحت پر ہو تو یہ بدرجہا بہتر ہوگا کہ ہم تمام اہم آئینی روایات کو مثبت قانون کی شکل میں تبدیل کر دیں۔ یقیناً یہ ایک اچھوتی تدبیر ہوگی۔ مگر حالات کے مطابق اگر ہمارے سیاسی اور معاشرتی تقاضے روایات کے تحفظ کے ضمن میں حوصلہ افزانہ ہوں تو بہتر ہوگا کہ ان کو آئین میں محض ایک غیر مؤثر شے کی حیثیت دینے کی بجائے ان روایات کو مثبت قانون کی لازمی قوت عطا کر دی جائے۔

مئی 1954ء "ویژن" کراچی

www.bhutto.org

www.bhutto.org

آئین کے لوازمات

24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل پاکستان نے حسب ذیل اعلان جاری کیا۔ "گورنر جنرل ملک کو درپیش سیاسی بحران پر غور و فکر کے بعد بڑے افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آئینی مشینری ناکارہ ہو چکی ہے اس لئے انہوں نے پاکستان بھر میں ہنگامی حالات کے اعلان کا فیصلہ کیا ہے۔ آئین ساز اسمبلی اپنی موجودہ حیثیت میں عوام کا اعتماد کھو چکی ہے اور مزید کام نہیں کر سکتی۔

آخری اور اساسی اختیار عوام کے پاس ہے' جو آئینی مسائل سمیت تمام امور کا اپنے ان نمائندوں کے ذریعے فیصلہ کریں گے جنہیں وہ از سر نو منتخب کریں گے۔ انتخابات کرائے جائیں گے' ملک کا نظم و نسق نو تشکیل کابینہ کے ذریعہ چلایا جائے گا۔ انہوں نے وزیر اعظم سے کابینہ کو نئے سرے سے تشکیل دینے کے لئے کہا ہے تاکہ ملک کو ایک موثر اور مستحکم انتظامیہ دی جا سکے' چنانچہ دعوت قبول کر لی گئی ہے۔ خیال رہے کہ ملک کی سلامتی اور استحکام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' اس لئے تمام ذاتی' گروہی اور علاقائی مفادات کو وسیع تر قومی مفادات کے تابع ہونا چاہئے۔"

اس انتہائی دور رس نتائج کے حامل اعلان نے پہلی ہی شق سے آئین سازی کے مسئلہ کو دوبارہ شروع کر دیا ہے' اس لئے قوم کو اپنی تمام تر توجہ اس پر مرکوز کر دینی چاہئے جو بلاشبہ بنیادی قانونی معیار کا اساسی اصول ہے۔

انارکسٹ ہمیں یہ تاثر دے سکتے ہیں کہ قانون سازی بجائے خود ایک برائی ہے جو صرف ریاست کی گرفت کو دوام بخشتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ معاشرتی ارتقا کے بنیادی مرحلہ میں انسان انتہائی برادرانہ

www.bhutto.org

ماحول میں رہتے ہیں کیونکہ وہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک ریاست اور اس کو منضبط کرنے والے قوانین دونوں کو ختم کرکے انسانیت کے لئے ان پُرسکون ایام کو واپس لانا چاہئے جو قانونی اقدار ریاست سے بھی پہلے کی ہیں۔

تاہم اگر برائے بحث یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ تاریخ میں کوئی ایسا دور بھی آیا تھا جب انسانی عقل و دانش قانون کی پابندیوں سے جکڑی ہوئی نہ تھی تو معاشرتی نظام کے ارتقا میں وہ مرحلہ موجودہ دور میں زندگی کی حقیقتوں سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ "نیپچون" اس کرہ ارض سے دور ہے۔

فلسفہ قانون کے تجزیاتی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوانین مملکت کے ستون ہیں اور آئین جو کہ اعلیٰ ترین قانون ہے، مملکت کی اساس ہے۔ یہی وہ عظیم معیار ہے جس سے ریاست اپنا وہ قانونی جواز حاصل کرتی ہے، جو ایک ایسا قانونی منبع ہے جہاں سے ریاست بین الاقوامی برادری میں اپنے فرائض و حقوق کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔

جو طاقتیں اس بنیادی معیار کو مشخص کرتی ہیں وہ قانونی تفتیش کے دائرہ کار سے قطعاً باہر ہیں۔ گاہ بگاہ یہ تغیر پذیر قانونی عناصر "عوام کی مرضی" کے اظہار میں ملتے ہیں لیکن پھر بھی "عوامی قانون ساز" اس کی پیدائشی قوت سے قطع نظر ریاست کو قانونی جواز دینے کا نا اہل ہے کیونکہ قانون صرف قانون کے باہر ہی پیش قدمی کرتا ہے اور قانون کی طاقت بذات خود قانون ہے۔

اس قول کے پیشِ نظر تجزیاتی نقطہ نگاہ سے امریکی آئین کا دیباچہ نہایت مناسب ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"ہم ریاست ہائے متحدہ کے عوام..........."

بانی آبا اس وقت تک "ریاست ہائے متحدہ کے عوام" نہیں تھے جب تک کہ آئین نے اس قانونی وحدت کو متشکل نہیں کر دیا جسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کہتے ہیں۔ آئین کے نفاذ کے لئے پہلے جمہوریہ کا وجود میں آنا ضروری تھا۔ ایک اسمبلی کو جو کنفیڈریشن کی تیرہ ریاستوں کے نمائندگان پر مشتمل تھی اور جسے آئین سازی کا کام سونپا گیا تھا۔ ایسی ریاست کے عوام کی حیثیت حاصل نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی، جو اس وقت تک بالخصوص اس خاص مرحلہ پر وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔

یہ دیباچہ اس باریک فرق کو نمایاں کرتا ہے جو بنیادی قانونی اور تغیر پذیر قانونی ذرائع کے درمیان ہے۔ اگرچہ موخر الذکر کو ہمیشہ بنیادی قانونی منبع۔ یعنی آئین پر برتری حاصل ہوتی ہے اور جس کی اس کے موثر نفاذ کے لئے ضرورت ہے پھر بھی اس امر کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ صرف اول الذکر ہی ریاست کے قانونی حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ اگرچہ متعدد معاملات میں "آئین" ہی ریاست کا بنیادی منبع ہے، لیکن ہر معاملہ میں اس کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، وہ بنیادی معیار جس نے پاکستان کے قانونی وجود کا تعین کیا ہے "قانون آزادی ہند 1947ء" ہے۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے سامنے ایک مقتدر

مملکت کی تخلیق و تشکیل کا کام نہ تھا بلکہ تیرہ امریکی کالونیوں کے نمائندگان کی اسمبلی کی طرح برطانوی پارلیمینٹ کا ایک قانون' یہ مقصد حاصل کر چکا تھا۔ لہٰذا پاکستان کی مجلس آئین ساز کے ذمہ یہ فرض تھا کہ وہ ایسا آئین وضع کرے جو پاکستان کو اس کی آزادانہ حیثیت کے عین مطابق ایک حکومت کی شکل دے سکے۔ اس صورت میں نہایت پُرزور انداز میں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ ترمیم شدہ انڈیا ایکٹ اگر قانون آزادی ہند 1947ء کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہی پاکستان کا آئین ہوگا۔ اس لئے قول میں کوئی حقیقی استثنیٰ نہیں ہے کہ آئین تمام ممالک کا بنیادی معیار ہے۔ اس لئے اس پر خواہ مخواہ نکتہ چینی کی چنداں ضرورت نہیں۔

ان ممالک میں جہاں آئین بنیادی معیار ہے' آئین سے دستبرداری یا محرومی خود ریاست کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے مترادف ہے۔ پاکستان کو اس وقت تک اس قسم کے نتائج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جب تک کہ آئین بنیادی قانون نہیں بن جاتا اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ایسا آئین نہ بنے جو دوسرے تمام معیاروں پر فوقیت حاصل کرلے۔ اسی وقت اور صرف اسی وقت یہ آئین " قانون آزادی ہند 1947ء اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء " کی جگہ لے گا اور پاکستان کا بنیادی معیار قانونی علت غائی بن جائے گا۔ وہ لوگ جو قانون آزادی ہند کو " آئین " سمجھتے ہیں' ان کے نزدیک اس ایکٹ کی تنسیخ ہی مملکت پاکستان کے قانونی جواز کو چیلنج کرنے کے لئے کافی ہے جو اسی ایکٹ کے تحت قائم ہوئی ہے۔

اس قسم کی بے ترتیب اور بے قاعدہ صورت حال میں فوری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قومی آئین کے نفاذ سے قبل ہی برطانوی پارلیمینٹ کی طرف سے قانون آزادی ہند 1947ء کی تنسیخ مملکت پاکستان کو ختم کر دیتی ہے؟

یہ قطعی ایک علمی سوال ہے لیکن پھر بھی قانون آزادی ہند کا سیکشن 6 (4) اس قسم کے امکانات کے خلاف تحفظ دیتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ۔

" برطانوی پارلیمینٹ کا کوئی قانون جو مقررہ دن یا اس کے بعد منظور کیا جائے' کسی طور' دونوں نئی "ڈومنینوں " میں سے کسی پر بھی ڈومینیں کے قانون کے جزو کے طور پر محیط نہیں ہوگا۔ بجز اس کے کہ اس ڈومینیں کی مقننہ ایک قانون کے تحت اسے نافذ العمل قرار دے۔ "

تاہم آئین کی تنسیخ کو ایک ایسے قانون کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہئے جو حکومت میں تبدیلی لاتا ہے۔ اول الذکر سے براہ راست ریاست کے وجود پر زد پڑتی ہے ' جب کہ موخر الذکر کو ریاست کے اندر صرف حاکم تبدیل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر نئی حکومت پُرزور انداز میں عام قوانین کو بدل دے اور پہلے سے موجودہ آئین میں ترمیم کرے تو بھی اس سے ریاست کے قانونی جواز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

واحد شرط جس کے تحت حکومت کی تبدیلی ریاست کی قانونی حیثیت کو ختم کر دیتی ہے ' یہ ہے کہ جب قانون کے تحت قائم شدہ حکومت کو طاقت کے استعمال کے ذریعے الٹ دیا جائے تو اس قسم کے حالات

www.bhutto.org

میں ایسے ذرائع کو بروئے کار لانا ہی نئے آئین کا تغیر پذیر قانونی منبع ہے جن کی 'ملک کا آئین' اجازت نہیں دیتا۔ اس زائد عدالتی وسیلے کو بالعموم "انقلاب" کہا جاتا ہے۔

چونکہ ریاست اور اس کا آئین ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے اساسی قانون کے بنیادی اوصاف کا تجزیہ ضروری ہے۔ اگر کسی آئین کو اپنے اثرات آنے والی نسل پر بھی مرتب کرنے ہوں تو اسے حسب ذیل قواعد کی پابندی کرنی چاہئے۔

1۔ اسے عوام کی شخصیت اور مرضی میں ہم آہنگی ہی سے مرتب کرنا چاہیے۔

2۔ اسے اپنی لچک برقرار رکھنی چاہیے۔

3۔ اسے صرف لازمی معیاروں تک محدود رہنا چاہیے۔

ایک آئین اپنی نوعیت کے لحاظ سے وفاقی اور وحدانی ہو سکتا ہے۔ اس میں عدلیہ کی آزادی کا اہتمام بھی کیا جا سکتا ہے۔ عدلیہ کی آزادی کو سلب کیا جا سکتا ہے۔ یہ انتظامات کا منبع صدر یا وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو قرار دے سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ انتظامیہ کی پوری تفصیل مہیا کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی شقیں اور دفعات خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں، اسے اس وقت تک "اچھا آئین" نہیں کہا جائے گا جب تک اس کی ہیئت لیون ڈوگیوٹ کے بقول عوام کے "معاشرتی استحکام" کے منافی ہے۔ ہیئت اہم ضرور ہے لیکن سب سے زیادہ اہمیت اس کے جوہر اصلی کی ہوتی ہے۔

تاریخ میں اس قسم کے واقعات کی بھرمار ہے، جن سے ایسے آئین کا انجام صاف نظر آتا ہے جو عوامی جذبات اور معاشرتی فہم کا حقیقی مظہر نہیں ہوتا۔ ہر چند کہ کسی کو ہیگل کے اس مقولے سے ہمیشہ اتفاق نہیں ہو سکتا، تاہم وہ کہتا ہے۔

"جسے آئین سازی کہتے ہیں وہ ایک ایسی شے ہے جو تاریخ میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ ایک آئین اپنی ترقی کی خواہشوں اور امنگوں سے ہم آہنگ قومی جذبہ سے جنم لیتا ہے۔"

یہ بات واضح ہے کہ کوئی آئین اس وقت تک سرکاری مشینری کو تسلی بخش انداز میں کنٹرول نہیں کر سکتا، جب تک اس میں انتظامیہ کی تشکیل عوامی مزاج کے مطابق نہ ہو۔ بلاشبہ اگر دستور "عوامی قانون" یعنی عوام کی مرضی اور جذبات کا مظہر نہیں ہے تو اس کے خلاف یقیناً بغاوت ہوگی۔ سب سے زیادہ خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب آئین کو اس کے قدرتی اور منطقی ماحول سے اکھاڑ کر بعجلت تمام اسے کسی قطعاً مختلف سرزمین پر نافذ کر دیا جائے۔ البتہ نظریات کو مستعار لینا اور فطری علاقے کے سانچے میں انہیں ڈھالنا ہوگا لیکن آئین کی دستاویز کے بیشتر حصہ کو مقامی کیفیات میں فٹ ہونا چاہیے اور اسے معاشرے کی شخصیت میں سمو لینا چاہیے۔

"اصول پرستانہ نعرے آئین کو آراستہ کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ موجودہ قوت کے تناسب کے لحاظ سے بے ہنگم ہوں تو ان کی حیثیت زیور سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور "قوت کے تناسب" سے صرف ایسی صورت حال مراد نہیں جس میں ملک کی اکثریت کی ننگی طاقت اقلیت پر غالب آ جائے یا ایک مسلح اور خونخوار اقلیت اکثریت پر حکومت کرے، بلکہ اس میں تخفتہ یا روایتی روحانی اقتدار بھی ایک واحد قوم کے متعدد

گروہوں پر جو اکٹھے رہتے ہیں، حاوی ہوتی ہیں۔"

آئین کوئی ایسی سبک چیز نہیں کہ جسے سنگین مضمرات کے بغیر ایک نمونے کے معاشرے سے اکھیڑ کر دوسرے نمونے کے معاشرے میں اسے بالکل اسی حالت میں لگادیا جاسکے۔ اس لئے مستعار نظریات اور اجنبی آئینوں کے تصورات کو اپنانے میں مقامی ضروریات واقدار کے محتاط مطالعہ اور دانشمندانہ شعور کی ضرورت ہے۔ آئین سازی میں نقالی ایک ناقابلِ معافی غلطی ہے اور آخری تجزیہ کے طور پر آئین کے ضمن میں نری کج فہمی ہے۔

مشہور یورپی قانون دان مونٹیسکیو نے اس ضمن میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"قانون جہاں تک کہ اس کرۂ ارض کے تمام لوگوں پر لاگو ہوتا ہے، بالعموم اسے انسانی عقل کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور ہر قوم کے سیاسی اور سول قوانین ہی مخصوص امور ہیں جن پر اس انسانی عقل کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ قوانین اس قوم سے، جس کے لئے تیار کئے جاتے ہیں، اتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ایک قوم کے قوانین کبھی کسی دوسری قوم کے تقاضوں کے مطابق بھی ہوسکتے ہیں۔

قوانین کو فطرت اور اس حکومت کے امور سے ہم آہنگ ہونا چاہئے جو قائم ہوچکی ہو یا قائم کی جانی مطلوب ہے۔ چاہے یہ اس حکومت کی تشکیل میں سیاسی قوانین کے طور پر بروئے کار لائے گئے ہوں یا شہری قوانین کی طرح اس کی حمایت کرتے ہوں۔

قوانین کو ملک کے طبعی خدوخال اور اس کی آب وہوا سے خواہ وہ سخت سرد ہو، گرم ہو یا معتدل اور زمین کی زرخیزی، اس کی کیفیت اور وسعت سے اس میں بسنے والوں کے مروجہ اندازِ حیات سے خواہ وہ زرعی ہو، راعیانہ ہو یا شکار سے متعلق ہو، انہیں اس درجہ آزادی سے مربوط ہونا چاہیے جو یہ آئین ملک کے باشندوں کو مذہب، ذوق، مال و دولت، اعداد و شمار، تجارت اور ان کے اخلاق وعادات کے سلسلہ میں دیتا ہو۔"

اگر آئین بے لچک اور غیر تغیر پذیر ہو تو اس کے لئے قومی خواہش اور تشخص کو زیادہ دیر تک برقرار رکھنا ناممکن ہوگا۔ عوامی اقدار مسلسل بدلتی رہتی ہیں اور ایک اچھے آئین کے لئے لازم ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا نوٹس لے ورنہ وہ اپنی قوت کو برقرار نہیں رکھ سکے گا اور عوامی آرزوؤں کا سچا مظہر نہیں رہے گا۔ بلاشبہ آئین کے لئے وہ ان بدلتی ہوئی حقیقتوں کا عدالتی آئینہ ہو جو عوامی رجحانات اور طاقت سے تعلقات کی تبدیلی کا مظہر ہوں۔

یہ بدقسمتی ہے کہ خوبصورتی سے تحریر شدہ اور بنیادی طور پر اچھے کئی آئین منسوخ کردیے گئے ہیں، کیونکہ وہ اس اصول کی پابندی کرنے میں ناکام رہے۔ رہی یہ بات کہ بعض آئین بے لچک کیوں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رجعت پسندانہ مفکرین نے بنیادی قانون میں ردوبدل کو غیر مناسب جانا۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ آئین۔ قومی قانونی نظام کی بنیاد ہے، اس لئے اسے عام قانون کی بجائے زیادہ مستقل نوعیت

www.bhutto.org

کا ہونا چاہئے ' اسی باعث آئین میں ترمیم کو عام قوانین میں ترمیم سے زیادہ مشکل رکھا گیا ہے۔

بنیادی قانون کو الوہی درجہ دینے کے خلاف پس پردہ عقلی عقیدہ یہ ہے کہ آئین ایسی شے ہے جسے ہماری خدمت کرنی چاہیے نہ کہ اس کی خدمت اور پرستش کی جائے۔ برطانوی آئین کی نمایاں صفت اس کی غیر معمولی لچک ہے۔ ایمری نے اپنی تصنیف " آئین کے بارے میں خیالات " میں بجا طور پر لکھا ہے کہ۔

" یہ ایک جاندار ڈھانچہ ہے جو بدلتے ہوئے بیرونی حالات کے ساتھ انفرادی اغراض اور اجتماعی جبلتوں کے داخلی عمل سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ خود اپنی نمو کے قوانین کی تقلید کر تا رہا ہے نہ کہ کسی پہلے سے طے شدہ دانشورانہ منصوبے کی جو اس کی نگرانی اور اس کی نمو کو محدود کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہو۔ "

" لچک کا اصول استدلالی ہے۔ ایسی دنیا میں جو تیزی سے بدل رہی ہے ' جہاں اقتصادی اور سیاسی قوتیں ایک سمت سے دوسری سمت حرکت کرتی ہیں اور جہاں سائنس ' روز بروز قدیم تصورات اور اداروں کو ختم کر رہی ہے ایک باشعور معاشرہ تجرباتی دسترس کا علم حاصل کرتا ہے اور تبدیلیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ "

بہرحال ایک طرف لچک کے اصول کو تسلیم کرنا اور دوسری طرف آئین میں جلد جلد تبدیلیوں کو نامناسب سمجھنا کسی طور پر بھی متصادم اور متضاد نہیں ہے۔ بنیادی قانون کو تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونا ہی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات نہایت اہم ہے کہ آئین ان بنیادی اور حقیقی خدوخال کو برقرار رکھے جو در حقیقت بعض دائمی اصولوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ اس طرح گویا آئین کو بنیادی مسلمات کے ساتھ ساتھ لچک کے اصولوں کو بھی تسلیم کرنا چاہئے۔

بلاشبہ اس توازن کا حصول مشکل ہے اور صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آئینی مشمولات کو صرف لازمی قانونی معیاروں کے تعین تک محدود رکھا جائے۔ تفصیلی اور بھاری بھرکم آئینی دستاویز سے اس توازن کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔

بہرحال آئین کسی معاشرے کے قانون کا صرف ایک جزو ہے اور اس سے تصور میں آنے والی ہر بات پر محیط ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بنیادی طور پر یہ ایک قانونی دستاویز ہے جس کا مدعا صرف قانون کے نہایت اہم ضابطوں کا تذکرہ ہے اور اس لئے اسے سختی سے قانون کے بالاتر ضابطوں کے تذکروں تک محدود ہونا چاہیے۔ آراء اور نظریات کو اس پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو آئین کو خالصتاً ایک قانونی دستاویز نہیں سمجھتے ' ان کے نزدیک یہ ایک مینی فیسٹو یا منشور ہے۔ " تصورات و نصب العین کا تذکرہ اور سرزمین کا منشور " اسی لئے طویل دیباچوں اور پالیسی ہدایات کا رجحان جدید ترین آئینوں کا روایتی حصہ بن گیا ہے۔

یہ ایک ناخوشگوار رجحان ہے اور بنیادی قانون کے بارے میں حقیقی دسترس کی وضاحت کی بجائے انتشار پیدا کرتا ہے۔ چونکہ دیباچے اور پالیسی ہدایات قانونی طاقت کی بجائے نظریاتی قوت کی حامل ہوتی ہیں اور انہیں

www.bhutto.org

کسی قانونی عدالت کے ذریعے نافذ نہیں کیا جاسکتا' اس لئے آئین کو موضوعی نوعیت کی آراء اور سیاسی منشوروں میں ملوث ہونے سے بچایا جانا چاہیے۔

امریکہ کے چیف جسٹس مارشل 'میکلوچ بنام میری لینڈ کے مقدمے کے فیصلے میں لکھتے ہیں۔

"ایک آئین میں ان تمام ذیلی تقسیم کی صحیح تفصیل کو سمیٹنے کے لئے ایک ایسے قانونی ضابطے کی طوالت درکار ہے جس کی اس کی عظیم قوتیں اجازت دیں گی اور جس میں ان تمام ذرائع کا ذکر ہو جن کے توسط سے ان پر عمل ہوگا اور جسے انسانی ذہن بمشکل قبول کر سکے گا۔ اسے شاید عوام کبھی نہ سمجھ سکیں' اس لئے اس کی نوعیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ صرف اس کے اہم نکات کی نشاندہی کی جائے۔ اہم مقاصد کا تعین کیا جائے اور ان کے چھوٹے اجزا ان مقاصد کی نوعیت سے اخذ کئے جائیں۔"

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے' اس ممتاز امریکی جج کا مقولہ پیغمبرانہ انکشاف کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

محب وطن اور جوشیلے لوگ "اسلامی آئین" کے بارے میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے وقت بنیادی قوانین کے علم کی محض شُدبُد رکھتے ہیں۔ دراصل پاکستان کو ایک بالکل "نئی چیز" دینے کی معصوم خواہش نے پراگندہ ذہنی کو فروغ دیا ہے اور سالہا سال سے آئین سازی کا کام ناقابلِ فہم پہیلیوں کے تسلسل کے مترادف ہو کر رہ گیا ہے۔

اس قسم کے انتشار اور دماغی کاہلی کی فضا میں تذبذب نے ایک عمدہ فن کی صورت اختیار کر لی ہے اور وہ لوگ جنہیں آئین سازی کا مشن دیا گیا تھا' باہمی محاذ آرائی میں الجھ کر رہ گئے۔ انتشار کے اس عالم میں صرف ایسی دستاویز وجود میں آسکتی ہے جو بے محل جانبداری سے داغ داغ ہو اور اسلامی آئین کی بجائے کسی تجارتی فرم کی "لیجر بک" ہی قوم کا ورثہ ہوتی۔ چنانچہ سات سال کی لاپروائی کے بعد ایک اعلان کے ذریعہ اس سوانگ کو ختم کر دیا گیا۔ یہ اعلان آئین ساز اسمبلی کے کتبہ مزار کے لئے نہایت موزوں عبارت تھا۔

اس قسم کے مشکل حالات میں کوئی فرد یا محبِ وطن مہم جو بھی خواہ وہ کتنا ہی جری کیوں نہ ہو' قوم کو آئینی پستیوں کی ناقابلِ فہم گہرائیوں سے نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس سنگین بحران میں آزاد افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ مہلک تصادم کو ختم کرائیں تاکہ یہ لوگ محض چند گنے چنے حکمرانی کے اصولوں کے جھمیلے میں نہ پڑے رہیں بلکہ ملک میں امن و سکون قائم کرنے کی کوشش کریں۔

پرانی اسمبلی کو بعض نمایاں پابندیوں کے ساتھ خواہ دوبارہ کام کرنے کی دعوت دی جائے یا خواہ کسی نئے قانونی ادارے کو آئین سازی کا یہ اہم فریضہ سونپا جائے' اس کے قطعی نتیجے کے بارے میں کوئی الجھن نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے فرائض میں سیاسی الجھنوں کے دھنسی دلدل سے نکل کر قانون کی حکمرانی کا سربلند کرنا اور اس کی برتری و فوقیت کو اس طرح ثابت کرنا ہے کہ کوئی طاقت بھی اس کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کرے۔

قوم گہری دلچسپی سے سیاسی و آئینی تبدیلیوں کا جائزہ لے گی۔ لیکن آنے والے واقعات کی صورت

www.bhutto.org

خواہ کچھ بھی ہو، فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہرمن فائنر (Herman Finer) کے الفاظ میں "آئین قوت کے تعلقات کی خود نوشت دستاویز ہے" اور چونکہ یہ ظاہر ہے کہ ریاست کے اندر قوت کے تعلقات اگر ہوتے بھی ہیں تو مستقل نوعیت کے شاذ ہی ہوتے ہیں۔

آئین کے مصنفین کو اس میں متذکرہ بالا اصولوں کا کچھ نہ کچھ احترام کرنا ہی پڑے گا اور اگر آئین بنانے کی خواہش ہے تو اسے مقابلتاً دائمی نوعیت کا اور ایسا ہونا چاہئے کہ کسی نئی آئینی ہنگامہ آرائی کا امکان نہ رہے۔

اس عظیم اسلامی ملک کی قسمت کانٹے میں تل رہی ہے۔ ہمیں ان بڑی بڑی زیادتیوں کی اصلاح کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہئے جو ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے سے روا رکھی ہیں۔

مئی 1955ء

www.bhutto.org

جمہوریت کی نشوونما

ہم سیاسی جماعت کی تعریف ایک ایسی تنظیم کی حیثیت میں کر سکتے ہیں جو کسی اصول یا نظام سیاست کی حمایت کے لئے منظم کی گئی ہو۔ یہ آئینی ذرائع سے اصول یا نظام سیاست کو حکومت میں ایک فیصلہ کن صورت دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس قسم کی جماعتی تنظیم کے بغیر نہ تو اصول کی وحدت اور نہ ہی پالیسی کا کوئی منظم ارتقا ممکن ہے۔

{Mactver}

مسلم لیگ نے قائداعظمؒ کی زیر قیادت پاکستان حاصل کیا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مختلف مواقع پر 14، اگست 1947ء کے کافی عرصہ بعد تک جو لوگ لیگ میں شامل ہوتے گئے، انہوں نے اس خوش فہمی کے ساتھ اس مسلّمہ اصول پر تکیہ کرنے کا فیصلہ کیا کہ دائمی اقتدار میں دائمی تسکین کے لئے ایک غیر معمولی کارنامہ کافی تھا۔

مسلم لیگ نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے فوری بعد اپنی قوت کو عوام کی خدمت کے لئے بروئے کار لانے کی بجائے رضا کارانہ تحلیل کو مقدم سمجھا۔ اس نے عوام سے اپنا رابطہ کھو دیا اور ان کے احساسات و مسائل سے کوئی سروکار نہ رکھا۔

لیکن ان واضح ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود طویل مدت تک مسلم لیگ برسراقتدار رہی۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ مسلم لیگ اور پاکستان ہم معنی لفظ بن کر رہ گئے تھے، خاص کر مہاجرین کے لئے جن کے ہجوم بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ دشمن کی سرحد سے اس موعودہ سرزمین میں داخل ہوئے تھے۔

www.bhutto.org

جماعت کا واحد سرمایہ اس کا نام تھا اور نام کے جادو سے اس نے نئی قوم پر سات سال سے زائد عرصے تک حکومت کی۔ ان قیمتی اور بے بدل سات سالوں میں اس نے بہت سے قیمتی مواقع ضائع کر دیئے۔

اسی شہر میں جس میں پاکستان کی تاریخی قرارداد منظور ہوئی تھی۔ مسلم لیگ نے خود کو ختم نہ کیا ہوتا تو وہ سازشوں کا اکھاڑہ بن جانے کے باوجود پاکستان کے مقدر کے ساتھ کافی عرصے تک کھیل سکتی تھی۔

جس گھٹیا اور پست طریق سے مسلم لیگ نے ڈاکٹر خان صاحب سے معاملہ طے کیا وہ اس کی فوری تباہی کا سبب بنا۔ اس تباہی کی زیادہ بنیادی وجوہ ان امور میں ملیں گی جن کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ نے اپنے شاندار آغاز کے باوجود عام آدمی کی خدمت کے تمام مواقع بری طرح ضائع کر دیئے۔ انکساری اور فعالیت کی جگہ زعم باطل اور انفعالیت نے لے لی۔ جس سے آخر کار وہ جسم بے روح ہو گیا جو ایک وقت نہایت خوبصورت اور قوی تھا۔

دراصل یہ مسلم لیگ کی وفات نگاری یا نوحہ گری نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد زیادہ عام اور تعمیری ہے' یعنی یہ اس جماعت کے لئے ایک تنبیہ ہے جو مغربی پاکستان کے ایوان اقتدار میں داخل ہوئی ہے۔

سیاسی جماعتیں ترقی بھی کرتی ہیں اور تنزل سے بھی ہمکنار ہوتی ہیں اور بعض دفعہ انہیں احیا کے مواقع بھی میسر آتے ہیں۔ جمہوریت میں احیا کے مواقع ہمیشہ موجود ہوتے ہیں' شرط یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے وجود کو قوی کرنے کے عزم سے بالکل محروم نہ ہو جائے۔ جمہوری نظام ایسے احیا کی ضمانت دیتا ہے۔ سیاسی جماعتیں انتخابات میں بار بار عروج' زوال اور پھر عروج کا دائرہ مکمل کرتی ہیں۔ اس لئے جب تک پاکستان میں جمہوریت ہے' مسلم لیگ کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے امکانات کو معدوم نہیں کیا جا سکتا۔

جدید قومی ریاست کی عمارت خواہ وہ جمہوری ہو یا آمرانہ' اس کی جڑیں جماعتی نظام میں ہوتی ہیں۔ آمریت میں ریاست کا پورا نظم و نسق حکومتی پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس میں اپوزیشن برائے نام ہوتی ہے۔

روس میں کمیونسٹ پارٹی کو ملک کے آئین میں "محنت کشوں کی محافظ" قرار دیا گیا ہے اور یہ "پرائیویٹ اور سرکاری تمام محنت کشوں کی تنظیموں کا مرکز اور سرچشمہ سمجھی جاتی ہے"۔ سٹالن نے روسی حکومت کے تعلق سے پارٹی کی پالیسی کی وضاحت یوں کی۔

"سوویت یونین جو پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کی سرزمین ہے' اس میں درحقیقت کوئی بھی سیاسی اور تنظیمی اہم مسئلہ حکومت اور دوسری تنظیمیں جماعت کی ہدایات کے بغیر طے نہیں کر سکتیں۔ اس لئے پارٹی ہر چیز پر مقدم ہے"

کمیونسٹ پارٹی سوشلسٹ ریاست کے اندر اپوزیشن کے تمام نشانات کو ختم کر دیتی ہے اور یوں اقتدار پر اپنی اجارہ داری قائم کرتی ہے۔ پارٹی میں سلسلہ وار تبدیلیاں بھی پارٹی کے اتحاد اور غلبہ کے بنیادی اصول کو آج تک متاثر نہیں کرنے پائیں۔ طاقتور پارٹی کی اساس' مرکزیت اور نظم و ضبط۔ باقی

www.bhutto.org

رہنے والے یہ وہ اسباق ہیں جو خانہ جنگی میں بالشویکوں نے اپنی فتح سے حاصل کیے۔

اسی طرح، فاشسٹ ممالک میں حکومت کی تنظیم اس اصول پر کی جاتی ہے کہ حکمران جماعت تمام سیاسی قوت کا سرچشمہ ہے۔ نازی جرمنی میں ایڈولف ہٹلر نے جرمنی کے عوام کی مرضی کو حکمران جماعت نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی "مرضی" میں مدغم کر دیا۔ نازی جرمنی کے مشہور قانون دان ڈاکٹر ہینز فرینک (Dr Hans Frank) نے لکھا ہے کہ "ہمارا آئین فیوہرر (Fuehrer) ہٹلر کی مرضی ہے" اور فیوہرر کی قوت کا سرچشمہ سوشلسٹ پارٹی ہے۔

جو جماعت ڈکٹیٹرشپ قائم کرنا چاہتی ہے اس کا اوّلین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپوزیشن کو دبا دیا جائے اور اگر ممکن ہو تو سرے سے کچل دیا جائے۔ قوّت کی جستجو غالب مقصد ہوتا ہے۔ ایک بار قوّت مل جائے تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ آیا برسراقتدار پارٹی عوام کی مرضی سے حکومت کرتی ہے یا آزادانہ طور پر یہ متعلقہ مسئلہ نہیں رہتا۔ ریاست پر حکومت کے کنٹرول کی ضمانت خوف اور طاقت کے استعمال سے کی جاتی ہے۔ تاہم ڈکٹیٹرشپ میں حکمران جماعت اپنے تسلّط کو اس وقت تک برقرار رکھتی ہے جب تک وہ لوگوں کو قابو میں رکھ سکتی ہے۔ ممکن ہے حکمران جماعت کچھ عرصہ کے لئے جیسا کہ نازی جرمنی میں ہوا، عوام کی حمایت حاصل کرے، لیکن جہاں تک پارٹی کے نصب العین کا تعلق ہے، یہ حمایت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ پارٹی عوام کی حمایت سے محروم ہو کر بھی اقتدار نہیں چھوڑتی جب تک اسے اندرونی ہنگاموں یا بیرونی حملہ سے الگ نہیں کر دیا جاتا۔

اس کے برعکس جمہوریت کا لائحہ عمل بالکل الٹ ہوتا ہے۔ آئینی اپوزیشن کے بغیر جمہوریت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے حکمران جماعت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دوسری سیاسی جماعتوں کا احترام کرے۔ حقیقی جمہوریت میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ برسراقتدار جماعت کو عوام کی لازمی تائید حاصل ہو۔ اگر وہ عوام کی تائید سے محروم ہو جاتی ہے تو اسے اقتدار اس جماعت کے حوالے کر دینا چاہیے جسے عمومی تائید حاصل ہو۔ اس عمومی تائید کا ذریعہ انتخابات ہوتے ہیں۔

جمہوریت میں تمام سیاسی پارٹیوں کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ عوام کی رائے اور جذبات کو ملحوظ خاطر رکھنے کی سعی کریں۔ جو پارٹی عوامی خواہشوں اور امنگوں کی زیادہ ترجمان ہو، وہ کامیاب ہوتی ہے۔ ترقی اسی تقابل سے ہوتی ہے۔ جو پارٹی اقتدار سے باہر ہوتی ہے، وہ رائے دہندگان کی تائید حاصل کرنے کے لئے برسراقتدار جماعت کے مقابلے میں زیادہ دلکش اور دلفریب وعدے کرتی ہے تاکہ انہیں اپنا ہمنوا بنا سکے۔ اس تقابل میں کچھ نقائص بھی ہوتے ہیں۔ اکثر مواقع پر، بالخصوص غیر ترقی یافتہ ممالک میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے غیر ذمّہ دارانہ وعدے کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے غلط وعدوں کے بارے میں جب لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ یہ محض سیاسی سٹنٹ تھے تو ان میں مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس اجاگر ہو جاتا ہے۔ تاہم ان نقائص کے باوجود متحارب سیاسی جماعتوں میں مستقل آویزش اور تقابل سے عوام کو فائدہ پہنچتا ہے۔

www.bhutto.org

جمہوریت میں ایک سیاسی جماعت مستقل نظریاتی مقاصد کی حامل ہونی چاہیے۔ وقتاً فوقتاً مختلف چیزوں کی اہمیت کے بارے میں فرق پڑ سکتا ہے لیکن مستقل نصب العین کی عدم موجودگی میں کوئی سیاسی پارٹی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ تمام دنیوی اشیاء اضافی ہوتی ہیں' اس لئے مختلف مواقع پر مستقل نوعیت کے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ اگر سیاسی جماعتیں اپنی زندگی کی طوالت کی خواہاں ہوں تو انہیں مستقل مقاصد کے حصول کے بعد پائیدار نوعیت کے حامل نئے مقاصد فوری طور پر اپنانا چاہئیں۔

مثال کے طور پر غیر منقسم ہندوستان میں کانگرس کا مستقل نصب العین ہندوستان کی آزادی اور مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان کا حصول تھا۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے دونوں جماعتوں نے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی۔ جب ہندوستان کو آزادی مل گئی اور پاکستان بن گیا تو دونوں جماعتوں کو یہ انتخاب کرنا تھا کہ یا تو وہ ختم ہو جائیں یا نئے مقاصد اور نصب العین اپنا لیں۔ ہندوستان میں کانگرس نے فوری طور پر اپنی تشکیل نو کی اور ایک مستقل پروگرام اختیار کیا جس کا مقصد ہندوستان کو فلاحی مملکت بنانا تھا۔ پاکستان میں' جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے مسلم لیگ نے نئے اور دلکش مقاصد کو اپنانے کی بجائے اپنی فتح پر قناعت کر کے بیٹھ رہنے کو پسند کیا۔ ان حالات میں اس کا روشن اور تابناک کارنامہ دھندلانا شروع ہو گیا اور اس نے لوگوں کو وہ نئی اور روشن راہ نہ دکھائی جس پر لوگ گامزن ہو سکتے۔

انگلستان میں دو مستقل جماعتوں' کنزرویٹو اور لیبر۔ دونوں کے مستقل نصب العین ہیں اور انگلستان کے عوام انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اعلیٰ مقاصد اور ان امور کے حصول کے لئے جو ان کی دسترس میں ہیں' کوشاں رہتی ہیں اور عوام کی توقعات پر پورا اترنے کی سعی کرتی ہیں جب کہ لبرل پارٹی جس کی صفوں میں چند سال قبل نہایت ذہین سیاست دان شامل تھے' اب ایک قریب المرگ پارٹی ہے۔ اس انقلابی اور ایٹمی دور میں ایسی جماعتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ انتہا پسندوں کے درمیان تصادم کی گنجائش ہے جو مضبوط مرکز پر زور دیتے ہیں کیونکہ اب یہ نظریہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔

امریکہ میں جمہوریت کی روح کی بقا ڈیموکریٹک اور ری پبلکن جماعتوں کے درمیان رقابت ہے۔ صعوبت کے دور میں کہ وہ عظیم معاشی بحران کا دور تھا، دوسری سیاسی جماعتیں بھی امریکہ کے افق سیاست پر نمودار ہوئیں لیکن بہت تھوڑے عرصہ کے لئے۔ مختلف وقتوں میں صرف ڈیموکریٹک اور ری پبلکن جماعتیں ہی سیاسی طاقت میں حصہ دار بنتی رہیں۔ دونوں جماعتیں اس لحاظ سے بنیادی ضروریات پوری کرتی ہیں کہ ان کے پاس مستقل مقاصد ہیں' حالانکہ ان کے مسائل کے حل کے طریق میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔

اگر کوئی شخص ان رقیب جماعتوں کے بنیادی فرق کو معلوم کرنا چاہے تو اسے یا تو امریکی ہونا چاہیے یا پھر اسے امریکی طرز حیات کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔ عظیم معاشی بحران کے تاریک دور میں بنیادی اختلاف زیادہ واضح تھا لیکن حالات معمول پر آنے سے شگاف معدوم ہونے کی حد تک بند ہو گئے۔ تاہم اہم بات یہ ہے کہ دونوں جماعتیں امریکی رائے دہندگان کے لئے کشش کا باعث ہیں۔ یہ کشش اپنی

www.bhutto.org

نوعیت کے لحاظ سے عارضی مقاصد کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ترقی یافتہ جمہوریت میں سیاسی جماعتیں ایسے نظریات کی وکالت نہیں کرتیں' جن پر سمجھوتہ ہو سکے۔ ان کے اختلافات کی باریکیوں کا دائرہ محدود ہوتا ہے لیکن یہ باریکیاں اہمیت اختیار کر جاتی ہیں۔ جب ڈیمو کریٹک اور ری پبلکن بے ضرر چیزوں کو شدید مسائل بنا کر انہیں ہوا دیتے ہیں اور ایک دوسرے پر جانبدارانہ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں شدید نکتہ چینی کرتے ہیں تو رائے دہندگان سمجھتے ہیں کہ یہ تنازعے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے خواہ ری پبلکن حکومت کے تحت ہی سہی' نئے اور پرانے اقدامات کو تباہ کرنے کا خواب بھلا کون دیکھ سکتا ہے؟

جس طرح یک جماعتی نظام ڈکٹیٹر شپ کی طرف لے جاتا ہے' اسی طرح بہت سی پارٹیوں کا نظام عدم استحکام اور انتشار کا موجب بن جاتا ہے۔ متعدد سیاسی پارٹیوں کا نظام مشکل اور ناپاک اتحاد کی بنا پر کام کرتا ہے۔ یہ سیاسی سمجھوتے مصلحتوں کے رہینِ منت ہوتے ہیں اور عام طور پر تباہی پر منتج ہوتے ہیں۔ ایسے نظام میں سازشیں فروغ پاتی ہیں اور تمام تعمیری مقاصد آئے دن کے سیاسی جھگڑوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

جمہوریت میں سیاسی جماعتوں کو اپنی ذاتی قوت پر انحصار کرنا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں برسرِاقتدار جماعت عوام سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کر سکتی ہے اور اسی صورت میں وہ اپنے وعدوں کی ناکامی کی ذمہ داری قبول کر سکتی ہے۔ دوسری جماعت کے ساتھ مشترک ذمہ داری کمزوری کی علامت ہوتی ہے اور حقیقی ذمہ داریوں سے فرار کا ذریعہ بنتی ہے۔ ایسے حالات میں اپوزیشن میں رہنا زیادہ باعزت ہوتا ہے۔ اتحاد کی ضرورت صرف انتہائی قومی اہمیت کے مسائل پر قابل قبول ہو سکتی ہے۔ صرف ہنگامی دور میں سیاستدانوں کو اپنے اختلافات اور جذبہ انتقام کو دبا دینا چاہیے۔

اس سے تین نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اولاً - جمہوریت میں حکمران جماعت کے لئے آئینی اپوزیشن ناگزیر ہوتی ہے۔

ثانیاً - سیاسی جماعتیں مقابلتاً مستقل نظریات کی حامی ہونی چاہئیں۔

ثالثاً - سیاسی جماعتوں کو اپنی ذاتی قوت پر انحصار کرنا چاہیے۔

مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کی تشکیل بڑے منحوس اور مشکوک حالات میں ہوئی۔ یہ نہ سمجھتے ہوئے کہ خرابی اس کی تشکیل میں مضمر ہے اس پارٹی کا خیر مقدم ان لوگوں نے کیا جو یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ایک حریف سیاسی قوت پیدا نہیں ہوگی' اس وقت تک کم از کم ملک کے اس حصے میں ایک پارٹی کی حکومت کا منحوس سایہ قائم رہے گا۔ ایسے حالات میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ نئی جمہوریت کسی وقت بھی فاشسٹ ڈکٹیٹر شپ کا روپ دھار سکتی ہے۔ اس لئے جب ری پبلکن پارٹی نے خراب حالات میں جنم لیا تو اس ملک کے بہت سے لوگوں کو یہ امید بندھی کہ اس سے جمہوریت کی بقا میں مدد ملے گی۔

یہ امر کہ مسلم لیگ کے آزمودہ اور تجربہ کار کارکن گروہ در گروہ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے'

www.bhutto.org

اتنا اہم نہیں تھا جتنا یہ کہ زوال پذیر مسلم لیگ کی جگہ لینے کے لئے اپوزیشن آگے بڑھتی اور جمہوری حکومت کی اوّلین شرط کو پورا کرتی۔

مسلم لیگی یہ استدلال کرتے ہیں کہ ناکامی ری پبلکن پارٹی کا مقدر ہے کیونکہ اس کی تخلیق میں ہوسِ اقتدار کی تنگ اور خود غرضانہ خواہش چھپی ہے۔ یہ ان مستقل نظریات سے عاری ہے جو کسی بھی سیاسی جماعت کے وجود کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔ ایک ضمنی مگر ٹھوس الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ اس جماعت میں بیشتر لوگ مسلم لیگ سے بھرتی کئے گئے ہیں اور یہ ارزاں جنس بن کر رہ گئے ہیں اور انھیں دوبارہ پھر خریدا جا سکتا ہے۔

یہ الزام تراشی درست ہے لیکن اس جماعت سے قبل مغربی پاکستان میں کوئی ایسی تنظیم موجود نہیں تھی جس میں سیاستدان اپنی خواہش کی تکمیل کا سامان پاتے۔ یہ ہر آدمی کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ذاتی قوت سے ممتاز مقام حاصل کرلے۔ اس صورت میں پسند کا سوال ہی نہیں تھا۔ سیاستدان اسے پسند کرتے یا ناپسند، اس سے اتفاق کرتے یا عدم اتفاق لیکن وہ واحد جماعت پارٹی مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے پر مجبور تھے۔ جونہی انھیں متبادل صورت نظر آئی انھیں انتخاب کا موقع مل گیا۔ اب اگر ری پبلکن پارٹی انقلابی رجحانات کے ذریعے لوگوں کو خاص طور پر نوجوانوں کو اپنی طرف راغب کرلے تو پھر یہ کافی حد تک فعال جماعت بن جائے گی، لیکن اس ضمن میں شکوک وشبہات کے اسباب موجود ہیں۔ تقسیم کے بعد پنجاب میں یونینسٹوں اور سندھ میں کانگریسیوں نے مسلم لیگ میں شمولیت ہی میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔ اب وہی سب سے پہلے مسلم لیگ کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔

ری پبلکن پارٹی جن حالات میں معرض وجود میں آئی ان میں اس کے لئے کوئی جوش اور ولولہ نہیں تھا۔ وسعت نظر سے دیکھا جائے تو وہ حالات ہیں جن میں پارٹی نے جنم لیا بلکہ نشوونما، ترقی اور دوسرے عوامل اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کیا ری پبلکن پارٹی مسلم لیگ کے جابرانہ نظام کو چیلنج کرنے کے لئے جمہوریت کی نقیب بن کر اٹھی ہے یا موقع پرستوں اور طالع آزماؤں کی ہوسِ اقتدار نے اسے جنم دیا؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ اس دوران میں نئی نسل کسی مثبت احساس کے بغیر اس بات کا مشاہدہ کرے گی کہ کیا نئی جماعت کوئی ایسا واضح معاشی، سماجی اور سیاسی لائحہ عمل مرتب کرتی ہے جو مستقل فلسفے کے تحت رائے دہندگان کو اس کی طرف راغب کرسکے۔

افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ کئی قیمتی ماہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک ری پبلکن پارٹی نے اس ضرورت کے لئے کسی فراست کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ اپنے پیش روؤں کی اندھی تقلید کررہی ہے۔ اس جماعت کے معمار بھی سازش کی دلدل میں گھر چکے ہیں اور تباہ کن تصادم کا شکار ہورہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹی کی قیادت بنیادی ضروریات کے تصوّر سے بھی محروم ہے۔ اس لئے پارٹی کے ذمہ دار عناصر پر یہ لازم ہے کہ وہ ایک ایسا منشور تیار کریں جو عوام کی خواہشات کا آئینہ دار ہو۔ جماعت کو اپنے

www.bhutto.org

بوڑھے رہنماؤں کے اچھے اور غیر مبہم مقولوں سے زندگی نہیں مل سکتی۔ اصولوں سے انحراف یقینی طور پر تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ ری پبلکن پارٹی اب تک ان عناصر مثلاً مستقل نظریات وغیرہ کا جائزہ لینے میں قطعی ناکام ثابت ہوئی ہے جو جمہوریت میں کسی سیاسی جماعت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وقت بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ اگر کام موت کے وقت مکمل کیا جائے تو اس سے عملاً کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت صرف کھلی آمریت ہی آتی ہے۔

موجودہ حالات میں ملک کو کسی سنگین قومی بحران کا سامنا نہیں ہے۔ مرکز میں اس وقت کولیشن حکومت کی کوئی ضرورت نہیں۔ محض مجبوری کی وجہ سے ری پبلکن ایک ایسی جماعت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں جس کی جڑیں ایک ہزار میل دور مشرقی پاکستان میں ہیں اور اس کے لئے اسے چاندی کی طشتری میں رکھ کر وزارت عظمیٰ کا عہدہ پیش کرنا ہوگا۔ ایسی پارٹیوں کے اتحاد کے لئے جن کی جڑیں الگ ہوں، خوش آئند مستقبل کی نوید نہیں دی جا سکتی۔

حال ہی میں ری پبلکن پارٹی کی ایک اہم شخصیت نے اس اہم تأثر کا اظہار کیا ہے کہ یہ اتحاد عارضی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ری پبلکن پارٹی اقتدار پر قابض ہو جائے یہ اتحاد غیر ذمہ دارانہ اور عاجلانہ ہے کہ ہر جماعت کا مقصد اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ ڈکٹیٹر شپ میں بر سر اقتدار جماعت رضاکارانہ طور پر اقتدار نہیں چھوڑتی اور نہ ہی حصولِ اقتدار کے لئے آئینی ذرائع کو بروئے کار لاتی ہے۔

عوامی لیگ کی خواہشات بھی یقیناً ویسی ہی ہیں جن کا اظہار ری پبلکن پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے کیا ہے۔ سیاسی حالات کا غیر جانبدارانہ تجزیہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ عوامی لیگ زیادہ منظم جماعت ہے، اس لئے اس کے ری پبلکن پارٹی پر فوقیت حاصل کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

ری پبلکن پارٹی کو چاہیے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ کرے اور سبق حاصل کرے۔ پاکستان ویمر (Weimer) ری پبلک کی طرح اپنی سیاست میں فاشزم کے جراثیم رکھتا ہے، اس لئے آیئے ہم جرمنی کے آمریت کے وقت سے قریب کے حالات کا جائزہ لیں۔

کولیشن کے مرض نے ویمر ری پبلک کے چہرے کو داغدار کر دیا تھا۔ جنگ سے مفلوج جرمنی کے لئے سماجی اور اقتصادی حالات نے مزید سنگین حالات پیدا کر دیئے۔ اس سنگین بحران کے دور میں جمہوری جماعتیں ان گمبھیر مسائل کو حل کرنے میں قاصر رہیں، جنہوں نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اپنی اس بے کسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر پارلیمانی جماعتیں انتہا پسندوں سے گفت و شنید پر مجبور ہوئیں۔ ان حالات میں ہنڈن برگ (Hindenberg) لیوہیئین کارپورل کو رضامند کرنے پر مجبور ہوا۔

جرمنی کی دائیں بازو کی حامل جماعتوں نے جنوری 1933ء کے آخر میں نازی پارٹی سے کولیشن بنائی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس ہنگامی ضرورت کے دور میں نازیوں کو آلہ کار بنایا جائے اور پھر مناسب موقع پر انہیں کولیشن سے خارج کر دیا جائے گا۔ پاپن (Papen) نے بڑے فخر سے کہا کہ اس نے ہٹلر کو قید کر لیا

www.bhutto.org

ہے کیونکہ اس نے جن شرائط کو تسلیم کیا ہے اس سے ہٹلر کے ہاتھ پاؤں بندھ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہٹلر کو چانسلر بنایا گیا جبکہ پاپن کے خیال میں قوت کا مرکز وائس چانسلر کی ذات تھی اور وائس چانسلر وہ خود تھا۔

وائس چانسلر کو صدر کا خاص اعتماد حاصل تھا۔ پرشیا کے وزیر۔ صدر کا کلیدی عہدہ بھی اس کے پاس ہوتا تھا۔ پرشیا کا نظم ونسق اور پولیس کا سربراہ بھی وہی تھا۔ اسے یہ حق بھی حاصل تھا کہ وہ ان تمام مواقع پر موجود رہے جب چانسلر صدر کو رپورٹ پیش کرے۔ کابینہ کی گیارہ نشستوں میں سے صرف تین نازیوں کو ملیں مگر چانسلر کے سوا دونوں ہی غیر اہم تھیں۔

مورخ ایلن بلک (Allan Bullock) کے الفاظ میں "شاید ہی کبھی کسی وہم اور مایوسی کا اتنی تیزی سے ازالہ ہوا ہو۔ ۔ ۔ ۔ اگلے چھ ماہ میں کولیشن حکومت کی ہیئت ترکیبی میں ہٹلر اور اس کے ساتھی جھجک کے بغیر کلیت اور عدم احتیاط کا مظاہرہ کرتے جس سے اس کے ساتھی پوری طرح بہرہ مند تھے۔ اس سے پاپن اور ہنڈن برگ کے سانس جلد ہی پھول گئے۔ ان چھ مہینوں کے آخر میں انہیں ریگا کی نوجوان خاتون کی طرح یہ محسوس ہوا کہ چیتے پر سواری کرنا خطرات سے خالی نہیں ہوتا۔ "

تمثیلی استدلال میں ہمیشہ خطرے کا عنصر شامل ہوتا ہے مگر ایسا استدلال ضروری ہو جاتا ہے۔ ری پبلکن پارٹی عوامی لیگ کے ساتھ مرکز میں اس خیال کے ساتھ شامل ہو گئی تھی کہ ری پبلکن، قومی اسمبلی میں اپنی قوت کے بل پر اور مرکزی کابینہ میں اپنے نمائندوں کی وساطت سے مسٹر سہروردی اور ان کے ساتھیوں کو قابو میں رکھیں گے۔

رہا یہ سوال کہ آیا پاکستان میں کوئی ہنگامی صورت تھی یا دوسرے حالات نے مجبور کیا تھا کہ ری پبلکن پارٹی عوامی لیگ سے کولیشن وزارت بنائے۔ اس کا بہتر جواب ری پبلکن پارٹی کی قیادت ہی دے سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تجزیاتی تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہنگامی حالت جیسی کوئی صورت نہیں تھی۔ ری پبلکن پارٹی نے اپنا کوئی سیاسی نظریہ مُرتب نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کی ہیئت ترکیبی سے یہ واضح ہے کہ یہ دائیں بازو کی جماعت ہے۔ اس کے برعکس عوامی لیگ جہاں تک اس کے اقتصادی مقاصد کا تعلق ہے بائیں بازو کی جماعت ہے اور وہ اس کا دعویٰ بھی کرتی ہے۔

یہ بات قابلِ فہم ہے کہ جرمنی کی دائیں بازو کی جماعتوں کی طرح ری پبلکن پارٹی بھی، اگر اس کے لئے اتحاد ناگزیر تھا تو وہ اپنے فلسفہ اور نظریات سے قریب جماعتوں سے اتحاد کرنے میں ناکام رہی۔ یہ ملک اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ مسٹر سہروردی کی عوامی لیگ نازیوں کے برعکس جمہوری اصولوں پر یقین رکھتی تھی، اس لئے اس نے ان تمام حربوں کو نہیں آزمایا جو نازیوں نے اپنے ساتھیوں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کئے تھے۔ ری پبلکن پارٹی کی حکمت عملی میں بنیادی نقص اس کی اپنی بنائی ہوئی کولیشن میں مضمر ہے جس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنا مشکل ہے تاہم ملک کو اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

www.bhutto.org

یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے کہ آیا ری پبلکن پارٹی اپوزیشن کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت دے گی جو جمہوریت کا بنیادی تقاضا ہے۔ ویسے ' پارٹی کا قائد یہ کہتے نہیں تھکتا کہ وہ آزادانہ انتخابات کا اہتمام کرے گا۔ اس وعدے پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حکومت اپوزیشن جماعتوں پر نہ تو دباؤ ڈالے گی اور نہ انہیں ملعون قرار دے گی۔ تاہم اپوزیشن کو دبانے کی خواہش کے امکانات کو یکسر نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری سیاست میں مبہم رواداری کا رجحان شروع سے موجود ہے۔ یہ امید کرنا چاہئے کہ ری پبلکن پارٹی ان جراثیم کو ختم کر دے گی لیکن امید کی جگہ مایوسی بھی لے سکتی ہے۔

مغربی جمہوریت کے معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ خیال کرنا کہ ری پبلکن پارٹی بھی عام انتخابات میں مغربی جمہوری نظام کی طرح اپوزیشن جماعتوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت دے گی یا اسمبلی کے اجلاس میں مغربی جمہوریت کی روایات کو نبھائے گی تو یہ بات ناممکن ہے۔ بلکہ یہ توقرین قیاس ہے کہ ری پبلکن پارٹی روایتی حزبوں سے دستبردار نہیں ہوگی۔ اس سے ہماری سیاست نئی راہ اختیار کرے گی اور یہ واضح ہو جائے گا کہ جمہوری نظام سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ تاہم موجودہ حالات کسی قسم کی رجائیت کے حامل نہیں۔

ری پبلکن پارٹی کی عمر آٹھ ماہ ہے ' اس لئے یہ ابھی عہد طفولیت میں ہے۔ لیکن یہ امر کسی سیاسی جماعت کے لئے درکار بنیادی شرائط کو پورا کرنے کے لئے بہانہ نہیں بن سکتا۔ اگر بچے مکمل اقتدار اور اقتدار سے وابستہ فرائض کے متلاشی ہیں تو انہیں سیاسی زندگی کے بنیادی لوازم پورے کرنا چاہئیں۔

اگر میکئیور (Maciver) کی سیاسی جماعت کی تعریف صحیح ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ری پبلکن پارٹی حقیقی معنوں میں سیاسی جماعت نہیں ہے بلکہ صرف ایک انجمن ہے جو اصولوں اور پالیسی کی حمایت منظم طریق سے کرتی دکھائی نہیں دیتی حالانکہ یہ بات کسی حکومت کے لئے قطعی اور لازمی ہوتی ہے۔

ان ضروری شرائط کے ساتھ جن کا ذکر کیا گیا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک سیاسی جماعت خود کو ایک اچھی طرح کام کرنے والی مشین کی طرح خوش اسلوبی سے منظم کرے۔ پارٹی کو قومی مزاج عوام کی ضروریات ' اقتدار کو ملحوظ رکھنے سے آگاہ ہونا چاہئے اور پھر ان اہم اور قابلِ غور بنیادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصولوں اور نظریہ کو کچھ اس طرح استوار کرنا چاہیے کہ وہ نہ صرف ایک گروہ بلکہ زیادہ سے زیادہ افراد کے لئے قابلِ قبول ہو۔ یہ ایک عظیم کام ہے ' اس لئے اسے پوری فراست ' شعور ' بصیرت اور عزم و استقلال سے کرنا چاہئے۔ ری پبلکن پارٹی کی بصیرت کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ موریس ڈوورگر (Maurice Duverger) لکھتا ہے کہ۔

" سیاسی جماعت ایک گروہ نہیں بلکہ گروہوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ ملک بھر میں بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے جو باہمی رابطہ کے اداروں کے ذریعے ملحق ہوتے ہیں۔ "

ان منتشر گروہوں کو باہم مربوط رکھنے کے لئے پارٹی کو ملک بھر میں اپنی شاخیں قائم کرنا چاہئیں۔

www.bhutto.org

رابطہ کی یہ باہمی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ان میں ترتیب و تصفیہ کی ہم آہنگی موجود رہے۔ صفوں میں ترتیب جماعت کے ڈھانچے کا اہم جزو ہوتی ہے کیونکہ اس سے صحیح قیادت ابھرتی ہے۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ ری پبلکن پارٹی اپنے آپ کو منظم کرنے کے لئے ایسے اقدامات نہیں کر رہی جو جدید قومی ریاست میں ضروری ہوتے ہیں۔ اقتدار میں ہوتے ہوئے اس کے پاس ایسے وسائل موجود ہیں کہ وہ خود کو قومی سطح پر منظم کرے۔ لیکن اس نے اس اہم ضرورت کی طرف مناسب توجہ نہیں دی اور یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے حیران کن ہے۔ کسی جماعت کے لئے اچھی اور اعلیٰ تنظیم بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنا سیاسی فلسفہ۔ جرمنی میں نازیوں اور اٹلی میں فاشسٹوں نے منفی نظریات کے باوجود اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور قابلیت کے بل پر اقتدار حاصل کیا۔

ری پبلکن پارٹی کو قیادت کے انتخاب کے طریقوں پر بھی خصوصی توجہ مبذول کرنا چاہئے اور ان امور کا بھی جائزہ لینا چاہئے جن کے تحت اقتدار اور ذمہ داری میں قیادت اور عوام شریک ہوتے ہیں۔ اس بارے میں بھی اب تک کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ جب تک اس کا تعین نہیں کیا جاتا پارٹی میں حقیقی اور نام نہاد قیادت اور حقیقی قیادت اور عوام کے درمیان اختلافات اسے ٹکڑوں میں منقسم رکھیں گے۔

جس طریقے سے پارٹی میں افراد اکٹھے کئے گئے ہیں' وہ بھی ایک اہم عنصر ہے۔ عوام کا باہمی اتحاد ہی پارٹی کو استحکام بخشتا ہے۔ اس ملک میں جوہر قابل کی کمی نہیں لیکن اس کی دریافت اور پھر اسے اپنے ساتھ ملانے کے لئے ان تھک مساعی کی ضرورت ہے۔ جو لوگ پارٹی کے وفادار ہیں' انھیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کرنا چاہیے۔ نوجوانوں' مزدوروں اور کسانوں کو بھی اس میں مؤثر نمائندگی ملنی چاہیے۔

بہت سے دوسرے امور پر بھی سیاسی جماعت کو' اگر وہ عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی ہے' لازمی توجہ دینی چاہئے۔ یہ ری پبلکن پارٹی پر منحصر ہے کہ وہ ملکی سیاست کو ایک اہم اور نمایاں مقام دے سکتی ہے جس کی پہلے کوئی مثال نہیں یا پھر سرے سے جمہوریت کو تباہ کر سکتی ہے۔ ہر دو حالت میں اسے تیزی سے اقدام کرنا ہوگا۔

آخری جائزہ میں صرف اقتدار کا حصول ہی نہیں ہوتا' باعزت شکست بے عزتی کی فتح سے بہتر ہوتی ہے۔ اگر ری پبلکن پارٹی چاہتی ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ پر ان مٹ نقوش چھوڑے تو اسے منزل کی بجائے ذرائع پر غور کرنا چاہیے جو منزل کے حصول کا باعث بنتے ہیں۔

ان اہم معنوں میں اس کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے۔ خدا کرے ہمارے یہ الفاظ اور توقعات غلط ثابت ہوں۔ ملٹری ڈکٹیٹرشپ کے لئے راہ ہموار کرنے کی بجائے غلط قیاس کر لینا بہتر ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ری پبلکن پارٹی اس خطرہ سے آگاہ نہیں۔ تمام سیاستدانوں اور ان کے رائے دہندگان کو اس کا علم ہو جانا چاہیے کہ ہم فوجی ڈکٹیٹرشپ کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

دسمبر 1957ء

www.bhutto.org

تیسرا حصہ

بین الاقوامی قانون

www.bhutto.org

www.bhutto.org

سیاسی اور قانونی تنازعات کا فرق

تنازعہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی دعویٰ مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے تنازعے کی ابتدائی شرط دعویٰ اور اس کا استرداد ہے۔ کسی تنازعہ کو یا تو پُرامن ذرائع سے یا جنگ کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔ انسانی تہذیب کی تاریخ میں موخرالذکر طریقہ پوری طرح استعمال کیا جا چکا ہے۔ البتہ ماضی قریب میں خود مختار اور آزاد قوموں نے دوسرے متبادل امکان کا تجربہ کرنے کے واضح رجحان کا اظہار کیا ہے۔ جدید جنگ کی مکمل تباہی کے امکان نے قوموں کو عملاً مجبور کر دیا ہے کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ مذاکرات، بحث و تمحیص اور مفاہمت میں حصہ لیں، یہ امر ایٹمی دور سے پہلے نہ ضروری تھا اور نہ ہی ممکن۔ اگرچہ ہم میں ابھی تک کچھ لوگ موجود ہیں جو اس خیال سے سختی کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں کہ صرف جنگ ہی تنازعات کو نمٹانے کا موثر ترین طریقہ ہے۔ یہ خیال اس حقیقت کے بعد بھی برقرار ہے کہ جنگ ان مسائل کو ختم کرنے کی بجائے جن سے جنگ کے شعلے بھڑکتے ہیں، بہت سے نئے مسائل اور انتقامی لڑائیوں کو جنم دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل بحث جنگ کے علاوہ تنازعوں کو حل کرنے کے دوسرے طریقوں تک ہی محدود ہے اور بالخصوص سیاسی اور قانونی تنازعوں میں امتیاز تک۔

تنازعات کا پُرامن ذرائع سے حل دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(1) تنازعے میں ملوث فریقین میں سمجھوتے کے ذریعے اور (2) بین الاقوامی اداروں کا پابند بنانے والے فیصلے سے۔

اصولی طور پر یہ دونوں قانونی طریقے ہیں لیکن بعض ماہرین کا یہ خیال ہے کہ فریقین کے سمجھوتے کے

www.bhutto.org

ذریعے تنازعات کا حل ایک سیاسی مسئلہ ہے کیونکہ فریقین تنازعہ کو حل کرنے کے لئے مروجہ قانون کے اصولوں سے ہٹ کر ہمیشہ اپنے اصول نافذ کرتے ہیں۔ "سمجھوتہ" کا لفظ وسیع سیاق و سباق میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں یہ فن کی اصطلاح نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے وسط سے لے کر سمجھوتوں کا مسئلہ متواصل رہا ہے۔ بارودی سیاست کے عیارانہ کھیل میں حقیقی تفہیمی معنوں میں باہمی اور انفرادی سمجھوتے استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔

قانونی تنازعات کی عام تعریف "لور کین" کے مشہور رسالوں میں ملتی ہے 'جن کے مطابق قانونی تنازعات وہ تمام تنازعات ہیں جن میں فریقین اپنے اپنے حقوق پر متصادم ہیں۔ یہ تعریف مشتبہ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اس میں صرف حقوق کا ذکر ہے 'فرائض کا نہیں' اگرچہ تمام تنازعات میں فرائض ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔

غالباً قانونی تنازعات کو سیاسی تنازعات سے ممیز کرنے کا صحیح ترین اور مناسب ترین طریقہ یہ ہے کہ قانونی تنازعات وہ تنازعات ہیں جنہیں موجودہ قانونی اصولوں کو استعمال میں لا کر حل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ سیاسی تنازعات وہ ہوتے ہیں جو تنازعہ کے فریقین پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے اصولوں کے مطابق انہیں حل کرلیں۔ اس بات پر زور دینے کی کوئی ضرورت نہیں کہ تنازعہ کی نوعیت کا انحصار نفس مضمون پر نہیں بلکہ قطعاً اس معیار پر ہے جو تنازعہ کو حل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

قانونی تنازعوں کو سیاسی تنازعوں سے ممیز کرنے کے سلسلے میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ایسے تنازعے بھی ہوتے ہیں جن پر بین الاقوامی قانون کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ایک مکمل اور ہمہ گیر سلسلہ قوانین نہیں۔ اسی خامی کی بنا پر فریقین مجبوراً خود اپنے معیار استعمال کرتے ہیں۔ کسی تنازعہ کا قانون کے اصولوں کے مطابق فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہی ایسے معیار موجود ہوں جن کا کسی خاص تنازعہ پر اطلاق ہو سکتا ہو۔ اگر ایسے اصول موجود نہ ہوں تو یہ ممکن نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر عمل کیا جا سکے۔

اس استدلال میں فطری کمزوری موجود ہے۔ یہ اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے کہ جب کوئی فریق اپنا جھگڑا بین الاقوامی ٹربیونل میں لے جاتا ہے تو اسے ٹربیونل سے یہ کہنے کا حق دیا جاتا ہے کہ وہ اس کا تصفیہ پہلے سے موجود قوانین کے مطابق کرے یا اس کو فطری انصاف اور عدل کے اصولوں کے تحت حل کرے۔ ہر حالت میں ٹربیونل کا فیصلہ قانونی فیصلہ متصور ہوتا ہے۔

حتیٰ کہ اگر ٹربیونل فطری انصاف اور عدل کے اصولوں کے تحت فیصلہ کرتا ہے تو بھی جھگڑے کا فیصلہ قانونی متصور ہوگا۔ جس طرح ایک جج قومی قوانین اور قانونی معیار کی وضاحت سے مقدمہ کا قانون بناتا ہے۔ اسی طرح بین الاقوامی قانون ، ٹربیونل کا فیصلہ اگرچہ فطری قوانین اور اصولوں کے تحت ہوتا ہے لیکن بعد میں ہونے والے فیصلوں کے لئے اس کی حیثیت قانونی معیار کی بن جاتی ہے۔ ہر واقعہ میں اضافی اصول انفرادی طور پر قانونی معیار میں بدل جاتے ہیں۔ ایک بار اگر کوئی جھگڑا بین الاقوامی ایجنسی میں چلا

www.bhutto.org

جائے تو اس کے متعلق جو بھی قانونی معیار ملحوظ رکھا جائے وہ بلا لحاظ قانون بن جاتا ہے۔

تاہم اس کو لازمی طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ سیاسی اور قانونی جھگڑوں میں فرق روا رکھنے والے وکلا بین الاقوامی قوانین میں موجود بہت سے نظائر کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود اس قسم کے نظائر مبہم ہوتے ہیں' کیونکہ ان میں سے بیشتر میں بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ منطق اور عقلی وجوہ کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ مزید براں کسی واقعہ میں بھی لامرکزی قانون کی نظیر اتنی قوت کی حامل نہیں ہوتی جتنی کہ متعلقہ مرکزی قانونی نظام کی۔

جمعیت اقوام کی تشکیل کرنے والے افراد ہی سب سے پہلے عصری بین الاقوامی امور میں قانونی اور سیاسی جھگڑوں کے درمیان فرق روا رکھنے کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے یہ اس لئے کیا تاکہ قابلِ سماعت اور ناقابلِ سماعت جھگڑوں کو الگ الگ کیا جاسکے۔ قابلِ سماعت جھگڑے کا تصفیہ مروّجہ بین الاقوامی قوانین کے تحت کیا جاسکتا ہے جبکہ ناقابلِ سماعت جھگڑوں کا فیصلہ اس طرح نہیں کیا جاسکتا' لہٰذا انہیں فریقین پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

بحرالکاہل کے بین الاقوامی جھگڑوں کے بارے میں تصفیہ کا ایکٹ جو جمعیت اقوام نے بنایا تھا اس کی اساس قابلِ سماعت اور ناقابلِ سماعت جھگڑوں کی تقسیم کے اصول پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایکٹ قانونی جھگڑوں کے لئے ثالثی کا طریق کار تجویز کرتا تھا اور اس میں اس امر کی بھی صراحت کی گئی تھی کہ دوسرے جھگڑے مصالحت کے ذریعے حل کئے جائیں۔ اگر مصالحت کی کوششیں ناکام ہو جائیں' تب جھگڑے کو ٹریبونل میں پیش کیا جاسکتا ہے اور اگر ٹریبونل یہ دیکھے گا کہ بین الاقوامی قوانین کے معیاروں کا اس پر پوری طرح اطلاق نہیں ہوتا تو وہ اس کا تصفیہ فطری قوانین اور عدل کے اصولوں کے مطابق کرے گا۔ بعض ترمیموں کے سوا ایکٹ نافذالعمل رہتا ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں بھی قانونی اور سیاسی جھگڑوں کے فرق کو اس امر کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اگر عالمی عدالت کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوتا تو سلامتی کونسل اس کے لئے دوسرے ذرائع کی سفارش کر سکتی ہے۔ اس طرح اگر یہ سفارشات عالمی عدالت کے قانونی فیصلے کے خلاف بھی ہوں تو اس سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا' آرٹیکل 94 میں ہے۔

(1) اقوام متحدہ کے ہر رکن پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بین الاقوامی عدالت کے فیصلے کو جس میں وہ فریق ہو' ہر صورت میں تسلیم کرے۔

(2) اگر کوئی فریق عدالت کے فیصلے کی تعمیل میں ناکام رہتا ہے تو دوسرا فریق سلامتی کونسل سے مدد حاصل کر سکتا ہے۔ اگر ضروری ہو تو سلامتی کونسل سفارشات یا فیصلہ کو موثر بنانے کے لئے اقدام کر سکتی ہے۔

چنانچہ سفارشات مرتب کرتے وقت سلامتی کونسل کو اس بات کا پابند نہیں کیا گیا کہ وہ عالمی عدالت کے فیصلے کو جسے متعلقہ فریق نے تسلیم نہیں کیا' پس پشت نہ ڈال دے۔ دوسرے الفاظ میں ویٹو یا

www.bhutto.org

حق استرداد سے بہرہ مند پانچ طاقتیں جو سلامتی کونسل کی مستقل ارکان ہیں' انہیں تمام بین الاقوامی جھگڑوں میں حرفِ آخر کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس قسم کی شرط کسی شک وشبہ کے بغیر قانون پر سیاست کو مقدم بنا دیتی ہے۔ منشور میں یہ بات عجیب لگتی ہے کہ ایک طرف تو اس کے آرٹیکل 2 پیراگراف 1 میں درج ہے کہ "تنظیم کی بنیاد اس کے تمام اراکین کی خود مختارانہ مساوات پر ہے۔" اور دوسری طرف اس کے تمام اراکین پانچ مستقل اراکین کے مہرے کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی اطاعت شعاری پر مجبور ہیں۔

منشور کے سیاسی مفادات کی طرف واضح رجحان کے باوجود' جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے عقلی اور منطقی قوانین کو سیاسی مقاصد کے تابع نہیں رکھا جا سکتا۔ مثبت بین الاقوامی قانون کے سائنٹفک تجزیے کے مطابق سیاسی اور قانونی جھگڑوں میں قطعی طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ فرق صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی مخصوص عنصر اسے اپنے ذاتی مفاد کے لئے فائدہ مند سمجھتا ہے۔ معروضی نقطہ نظر سے یہ بات بالکل بناوٹی ہے اور ہو سکتا ہے کوئی ایک فریق بین الاقوامی معیاروں کے مطابق جھگڑے کے تصفیہ پر رضامند نہ ہو تو اس طرح جھگڑے کی نوعیت سیاسی نہیں بنے گی؟

مثال کے طور پر کشمیر کے سات سالہ پرانے جھگڑے کے ابتدائی مرحلوں میں بھارتی حکومت کا اصرار یہ تھا کہ مہاراجہ جموں و کشمیر نے قانونی طور پر اس کا الحاق بھارت سے کیا ہے۔ معاہدہ الحاق کی بنا پر جو قانونی طور پر کشمیر اور بھارت میں طے پایا ہے بھارتی حکومت قانونی معاہدے کے تحت ریاست جموں و کشمیر کی مدد کرنے کی پابند ہے۔ پھر یہ موقف اختیار کیا گیا کہ الحاق کی وجہ سے کشمیر بھارت کا نوٹ انگ بن گیا ہے۔ چنانچہ یہ واحد قانونی جواز تھا جس کی بنا پر بھارتی وزیر اعظم اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں لے گئے۔ اس طرح جھگڑے کو بین الاقوامی ایجنسی میں پیش کر دیا گیا اور کشمیر کے جھگڑے کو ایک ٹھوس قانونی جھگڑا بنا دیا گیا جیسا کہ خود بھارت نے تسلیم کیا ہے۔

بعد میں بھارت نے دوبارہ غور کیا اور بھارتی حکومت نے اپنے عزائم اور مقاصد کے تحت اسے سیاسی رنگ دے دیا اور اس طرح بین الاقوامی قانونی مشینری کو مفلوج بنا کر رکھ دیا' حالانکہ بین الاقوامی قانون اس جھگڑے کا تصفیہ کرنے کا مجاز تھا۔ ایک فریق کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ فیصلہ اس کے سیاسی اغراض کے خلاف جائے گا۔ اس لئے اس نے بین الاقوامی ایجنسی کے ہر اقدام کو ناکام بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

سیاسی اور قانونی جھگڑوں کے فرق میں پہلے ہی سے سقم کا نظریہ موجود تھا۔ یہ "قانون میں سقم" کا نظریہ ہے جو سیاسی اور قانونی جھگڑے کا سرچشمہ ہے۔ اس نظریہ کی علتِ غائی یہ ہے کہ قانونی طریقوں سے ایسا اہتمام کیا جائے کہ ایک ایسی دفعہ وضع ہو سکے جو بتدریج اس سقم کو دور کر دے۔

سقم کا نظریہ مقابلتاً لامرکزی بین الاقوامی قوانین تک محدود نہیں' بلکہ یہ مرکزی قومی قوانین میں بھی موجود ہوتا ہے۔ سقم کا نظریہ خطرناک فسانہ طرازی ہے اور یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ انتہائی ترقی یافتہ قومی

ضابطہ ہائے قوانین کے جسد میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس خیال کی تائید کرنا قطعاً غلط ہو گا کہ مروجہ قانون کا کسی مخصوص مسئلہ پر اطلاق نہیں ہو سکتا' کیونکہ اس میں کوئی ایسا عمومی معیار نہیں ہے جو اس کی طرف اشارہ کرتا ہو۔

پروفیسر ہینز کیلسن اپنی کتاب "قانون اور سیاست کا عمومی نظریہ" میں رقمطراز ہیں کہ "ضابطہ" قانون میں کوئی سقم نہیں ہونا چاہئے۔ اگر جج کو ایک خاص تنازعہ میں بطور قانون دان فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ حقیقی مسلّمہ قانون کے سقم کو پُر نہیں کرتا بلکہ وہ مسلّمہ قانون میں انفرادی ضابطے کا اضافہ کرتا ہے جس پر کسی عمومی ضابطے کا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ اس صورت میں ہو گا کہ قانونی حکم میں کوئی ایسا عمومی ضابطہ موجود نہیں جو اس روش کے بارے میں مدعا علیہ پر پابندی عائد کرے جس کا مدعی دعویدار ہے۔ حقیقی مسلّمہ قانون کا مقدمے کو خارج کر کے ٹھوس معاملے پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ بہرحال جج کو ٹھوس معاملے کے لئے قانون کو تبدیل کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اسے کسی ایسے فرد کو قانونی طور پر پابند کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے جو پہلے قانونی طور پر آزاد تھا"

یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جب قانونی ٹریبونل فطری قوانین اور اعلیٰ شعور کے اصولوں کو مروجہ قوانین پر مقدم ٹھہرا کر ان کا اطلاق کرتا ہے تو اس کا فیصلہ قانونی متصور ہو گا۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ عمومی بین الاقوامی قانون کے بارے میں ایک اہم مقولہ یہ ہے کہ قانون جس چیز کی ممانعت نہیں کرتا' اس کی قانونی طور پر اجازت ہے' اس لئے بین الاقوامی قانون کے دائرے سے باہر کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ بے شک بین الاقوامی قانون جھگڑے کے فریقین کو اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے اپنے معیار قائم کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس مقولہ کی بنا پر اگرچہ فریقین کو اپنے جھگڑے اپنے معیاروں کے مطابق حل کرنے کی اجازت ہے' تاہم بین الاقوامی قانون کے احاطہ سے باہر رہ کر بھی وہ عمومی بین الاقوامی قانون کی دفعات کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس طرح جھگڑے کے فریقین قانونی سقم کو دور نہیں کرتے بلکہ وہ محض پہلے سے موجود قوانین کا اطلاق کرتے ہیں۔ تب قانون میں خامی کہاں سے آئی؟

وہ لوگ جو "قانون میں سقم" کا نظریہ تجویز کرتے ہیں' وہ درحقیقت قانون پر سیاست کی برتری کے لئے عقلی ترجیحات کے متلاشی اور خواہاں ہوتے ہیں۔ ایک پر دوسرے کی برتری ثابت کرنے کی کوششیں اس لئے شروع ہوتی ہیں کہ ان دو سماجی تکنیکوں کے حقیقی رشتوں کو آپس میں الجھا دینے کا رجحان عام ہے۔ سیاست اپنی ذات میں مقصد ہے' منزلِ مقصود جس کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس قانون سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اگر اس رشتہ کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایک کی دوسرے پر برتری ثابت کرنے کی ضرورت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

آخری تجزیے میں ہر شخص کو خود سے یہ استفسار کرنا چاہیے کہ آیا سیاسی مقاصد پُرامن ذرائع سے حاصل کرنا چاہئیں یا طاقت کے وحشیانہ استعمال سے۔ اگر پُرامن ذرائع مقدم ٹھہرتے ہیں تب تو حصول مقصد کا واحد منطقی اور مہذب طریقہ قانون کا ذریعہ ہے۔ کوئی دوسرا پُرامن طریقہ اس کا بدل نہیں ہو

www.bhutto.org

سکتا۔ اگر ایک بار ہر شخص قانون کی مستقل اور ہمہ گیر حیثیت کو تسلیم کر لے تو غیر سائنٹفک اور عارضی حیلے حوالے ختم ہو جائیں گے۔

قومی قانونی نظام میں 'چند استثنیٰ' سے قطع نظر عوام مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے دوسرے ذرائع پر قانون کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے دائرہ کار میں ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ابھی انسانیت کو بہت فاصلہ طے کرنا ہے۔ لیکن یہاں بھی بے رحم قانون کے کارخانے مرکزیت کے پہیوں کو بتدریج تیز تر کر رہے ہیں جو آخر کار بین الاقوامی معاشرے کے ڈھانچے کے استحکام کا باعث بنے گا اور مسائل کے تصفیہ کی تمام تر ذمہ داری قانون کے کندھوں پر رکھے گا۔

اس صورت حال کو پیدا کرنے کا تیز تر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ تمام جھگڑے آخری فیصلے کے لئے انصاف کی عالمی عدالت میں پیش کئے جائیں۔ بین الاقوامی تنظیم میں اس قسم کی تبدیلی کی یقینی طور پر بہت سے ممالک شدید مخالفت کریں گے' لیکن اگر ایسا ہو جاتا ہے تو نہ صرف سماجی ضابطہ کے غلامانہ اور فرسودہ طریقے بدل جائیں گے اور ان کی جگہ نئے ضوابط لے لیں گے' بلکہ جنگ کے مرض میں مبتلا انسانیت کو یہ یقین بھی حاصل ہو جائے گا کہ سیاسی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لئے خونریزی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔

اکتوبر 1954ء "ویژن" کراچی

www.bhutto.org

جارحیت کی تعریف

مسٹر چیئرمین!

میرے وفد نے اب تک کی جانے والی تقریروں کو نہایت توجہ سے سنا ہے۔ جارحیت کے تصور یا تحریک کی تعریف کرنے کا کام بلاشبہ بہت بڑا ہے۔ ہمیں اس نازک سوال کا سامنا خطاکاری کے امکان اور احتیاط کے جذبے سے کرنا چاہیے۔ سر فرانسس بیکن نے اپنے مضمون "جسٹنگ Truth (J) کا آغاز اس فقرے سے کیا ہے۔

"جسٹنگ" پائلٹ نے استفسار کیا سچائی کیا ہے؟ اور جواب کا انتظار نہ کر سکا۔ اگر پونٹیس پائلٹ کو اس قسم کا مسئلہ درپیش ہوتا جس کا سامنا اس کمیٹی کو ہے تو مجھے یقین ہے کہ رومن گورنر یہ سوال بھی نہ کر سکتا۔"

جنرل اسمبلی نے 31 جنوری 1952ء کو 368 ویں مکمل اجلاس میں قرارداد 599 (6) منظور کی جس میں منجملہ دوسری باتوں کے کہا گیا تھا کہ

"اس امر کے پیش نظر کہ جارحیت کے جرم کے ارتکاب کا استنباط کسی خاص معاملے اور مخصوص حالت سے ہوتا ہے" تاہم عالمی امن و سلامتی کے تحفظ اور بین الاقوامی کریمنل لاء کی مزید اصلاح کے لئے جارحیت کی تعریف ان عوامل کے سیاق و سباق میں جو اس کا باعث ہوں، ممکن بلکہ مناسب اور ضروری ہے۔

یہ قرارداد تین نتائج مرتب کرتی ہے کہ۔

www.bhutto.org

(1) - جارحیت جرم ہے۔

(2) - اس جرم کا استنباط جارحیت کے جرم کی صراحت سے تعریف کئے بغیر ہر معاملہ کے مخصوص حالات سے کیا جاسکتا ہے۔

(3) - اس کے باوجود عالمی امن و سلامتی کے تحفظ اور بین الاقوامی کریمنل لاء کی مزید اصلاح کے لئے جارحیت کی تعریف کا تعین ممکن بلکہ مناسب ہے۔

اور جیسا کہ کمیٹی خوب واقف ہے، اس مقصد کو سامنے رکھ کر جارحیت کی تعریف کے سوال کا مختلف سطحوں پر تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ تاہم یہ امر خاص طور پر قابل مشاہدہ ہے کہ جوش و خروش کی پہلی رو جو قرارداد 599 (6) کی منظوری کے وقت اٹھی تھی، بڑی حد تک مدھم اور کامل تر تجزیہ کی مظہر تھی۔ چنانچہ جنرل اسمبلی نے اپنے 408 ویں مکمل اجلاس میں قرارداد 688 (7) کو منظور کر کے اس مسئلہ کی پیچیدگیوں کو بے نقاب کیا ہے اور اس کے تفصیلی مطالعہ کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہو گئی ہے۔

اس میں منجملہ دیگر باتوں کے کہا گیا ہے کہ "اس امر کے پیش نظر کہ جنرل اسمبلی کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں اور عالمی لاء کمیشن میں جارحیت کی تعریف پر بحث نے اس مسئلہ کی پیچیدگی کو واضح کر دیا ہے اور حسب ذیل امور کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

1 - جارحیت کی مختلف اقسام۔

2 - جارحیت کی تعریف اور عالمی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے مابین تعلق۔

3 - بنی نوع انسان کے امن و سلامتی کے خلاف جرائم کے ضابطے میں جارحیت کی تعریف کی شمولیت اور جرائم کے عالمی نظام عدل کے ڈھانچہ میں اس کے نفاذ سے پیدا ہونے والا مسئلہ۔

4 - اقوام متحدہ کے مختلف شعبوں کے دائرہ اختیار پر جارحیت کی تعریف کا اثر۔

5 - کوئی اور مسئلہ جو جارحیت کی تعریف کے تعین کے سلسلہ میں اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے۔

"اس امر کے پیش نظر کہ عالمی امن و سلامتی کو فروغ دینے اور بین الاقوامی قانون کو ترقی دینے کے لئے جارحیت کی ایک عمومی اور قابل قبول تعریف کے تعین کے لئے مسلسل اور مشترکہ جدوجہد کی جائے۔ یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ پندرہ ارکان پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی قائم کی جائے اور اس خصوصی کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ۔

(الف) جنرل اسمبلی کے نویں اجلاس میں جارحیت کی تعریف یا جارحیت کے تصور کے بارے میں نظریے پر مشتمل مسودہ پیش کرے۔

(ب) جنرل اسمبلی کی قرارداد کے ذریعہ جارحیت کی کسی تعریف کو اپنانے سے پیدا ہونے والے محولہ بالا مسائل کا مطالعہ کرے۔"

اس گہری تحقیق نے بظاہر ان ناقابل تسخیر مشکلات کی نشاندہی کی تھی جن کے باعث اس دوسری قرارداد کا منظور کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ پہلی قرارداد کا لب و لہجہ پر زور تھا۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ جارحیت کی

www.bhutto.org

تعریف سے فی نفسہ عالمی امن و سلامتی کی ضمانت حاصل ہو جائے گی۔ دوسری قرارداد بین الاقوامی حالات کی حقیقتوں کے زیادہ قریب اور اس ضمن میں اگلا اقدام تھی۔ اس میں جارحیت کی تعریف اور عالمی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے مابین حقیقی تعلق تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس لئے جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے' ان کے پیشِ نظر جنرل اسمبلی نے پہلی خصوصی کمیٹی سے اس سوال پر مزید معلومات حاصل کرنے کی درخواست کی۔

پہلی خصوصی کمیٹی کے بحث مباحثہ نے ایک دوسری کمیٹی کی تشکیل کو ناگزیر بنا دیا تاکہ وہ رکن ممالک کے خیالات کو مربوط کر کے جنرل اسمبلی کے گیارہویں اجلاس میں،

1۔ ایک تفصیلی رپورٹ اور

2۔ جارحیت کی رپورٹ کا مسودہ پیش کرے۔

دوسری خصوصی کمیٹی کے غور و خوض کے لئے تین تجاویز پر مشتمل خاکہ پیش کیا گیا' اس میں منجملہ دیگر باتوں کے نیدرلینڈ کی تجویز میں کہا گیا تھا۔

"یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آیا ان مباحث کے نتیجے میں جارحیت کی تعریف کا مسودہ تیار کیا جا سکتا ہے یا نہیں اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر جارحیت کی تعریف کا مسودہ تیار کیا جائے۔"

اس سے یہ امر پوری طرح واضح ہو گیا کہ فکر و مطالعہ کے اس آخری مرحلہ پر بھی بعض مندوبین کے ذہن اس بارے میں شک و شبہ کا شکار تھے کہ جارحیت کی تعریف کا کوئی معقول جواز ہے کہ نہیں؟

اس لئے میرے وفد کی نظر میں یہ غلط ہے کہ 31 جنوری 1952ء کی جنرل اسمبلی کی قرارداد 599 (6) نے ناقابل تنسیخ طور پر طے کر دیا ہے کہ جارحیت کی تعریف کرنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر جنرل اسمبلی اس مسئلہ اور اس سے متعلقہ تمام مضمرات پر غور و خوض کیلئے خاص کمیٹی تشکیل نہ دیتی اور اس طرح خصوصی کمیٹی کی تشکیل کی علت غائی بے اثر ہو کر رہ جاتی۔

جارحیت کی تعریف کرنے کے سوال پر خصوصی کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 26 کے لگ بھگ نمائندوں کے نزدیک جارحیت کی تعریف کرنا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی' لیکن ان میں سے بعض نمائندوں نے کہا ہے کہ وہ ایک "عمومی قابلِ قبول تعریف" کو اختیار کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔ حقیقتاً اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ وہ جارحیت کی تعریف کرنے کے مخالف ہیں' کیونکہ ایک "عمومی قابلِ قبول تعریف" فی الوقت ممکن نہیں۔ مزید برآں یہ 26 نمائندے بھی ایسا گروپ تشکیل نہیں دیتے جسے رپورٹ میں "ہم خیال گروپ" کہا گیا ہے۔ یہ لوگ تعریف کے فرائض' مشمولات اور ہیئت کے بارے میں مختلف الرائے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انہیں صرف اس بنا پر ایک گروپ کہا گیا تھا کہ وہ اصولی طور پر ایک ایسے اصول پر متفق تھے جو فنی ابہام کو اپنے عروج تک پہنچا دیتا ہے۔

ان امور سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ مؤقف اختیار کرنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ اس موضوع پر

www.bhutto.org

جنرل اسمبلی کی 31 جنوری 1952ء کی قرارداد یا اس کی کسی دوسری قرارداد نے اس حد تک طرفداری کار جحان پیدا کر دیا ہے جہاں قبل از وقت فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ جارحیت کی تعریف ممکن اور ضروری ہے۔

اس سیاق و سباق میں جنرل اسمبلی کی قرارداد ناقابلِ تنسیخ اور ناقابلِ ترمیم فرمان نہیں ہے۔ یہ کسی عدالت کا آخری فیصلہ نہیں ہے' اس لئے میرے وفد کا یقین واثق ہے کہ اس امر پر مباحثہ خارج از امکان نہیں کہ آیا جارحیت کی تعریف ممکن اور ضروری ہے۔

اس مسئلہ کے لب لباب پر بحث سے قبل جناب چیئرمین صاحب مجھے ضمنی طور پر یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس مسئلہ کا سب سے زیادہ مفید پہلو یہ ہے کہ یہاں جو لوگ جمع ہیں' ان سب کے "منشا" اور "مقصد" میں ہم آہنگی ہے۔ اگر آپ مجھے تمہید کے الفاظ سے معمولی سی رعایت برتنے کی اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ وہ منتہا آئندہ نسلوں کو جارحیت کی تعدی اور ظلم سے بچانا ہے۔ ہم سب نہایت تندہی سے دائمی امن کے تحفظ کے لئے مستقل ضمانت حاصل کرنے کی مساعی میں مصروف ہیں۔ یہ عنصر نہایت اہم اور نمایاں ہے۔ یہ ایک پائیدار رابطہ ہے' یہ جذبہ اور مقصد کی وحدت ہماری امنگوں کی تکمیل کا واحد عنصر ہو گا۔

اس بحث کے پہلے دن بلجیم کے ایک ممتاز و معزز نمائندے نے جدید سائنس کی معجزانہ ترقیوں کا ذکر کیا اور اگر میں غلطی پر نہیں' تو انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ حیرت انگیز ترقی اس ناپسندیدہ حقیقت کا ثبوت ہے کہ موجودہ انسان اسی صورت میں اپنا مقصد حل کر سکتا ہے جب وہ اس کے لئے جانفشانی اور مستعدی سے کام کرے اور یہ امر معاشرتی علوم کو عالمی تحریکوں کی ترقی سے متناسب رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے ورنہ ہمارے تصورات اور اداروں کو ناکارہ ہو جانے کے خطرے کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ صحیح ہے لیکن یہ دوہری دھار والی دلیل ہے۔ اگر جدید انسان اپنے جانشین کے "عالم الاصطلاحات کے لئے" بیرونی خلا میں سپوتنک چھوڑ سکتا ہے تو وہ جارحیت کی تعریف بھی کر سکتا ہے بہرحال اگر انسان کی صناعی لامحدود ہے اور اگر اس کے وسائل اور صلاحیتوں کی کوئی انتہا نہیں تو اسے نہ صرف جارحیت کی تعریف بلکہ چھل' فریب' تخریب اور اس کے غلط استعمال کے بارے میں بھی واضح ہونا چاہئے۔ ان حالات میں جارحیت کی تعریف و توضیح حقیقی معنی میں کسی ممکنہ جارح' بیسویں صدی کے کسی چنگیز خان یا اٹیلا' ایک ممکنہ عالمی آمر کے حضور اپنی تہذیب کو پورینیم پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے کے مصداق ہے' جو یقیناً ایسے وسائل حاصل کر لے گا جو جارحیت کی تعریف کو اپنے پُرفریب اور ہولناک عزائم کی تکمیل کے لئے کانٹ چھانٹ کر مسخ کر دے۔

آیئے اب اس امر کا جائزہ لیں کہ آیا عالمی قانون کے فروغ کی موجودہ صورت میں جارحیت کی تعریف ممکن ہے۔ عالمی قانون نے قدیم یونانی شہری ریاستوں کے قدیم ترین دور سے اور نسبتاً ماضی قریب کے ہیوگو گروٹیس کے دور سے اب تک زبردست پیش قدمی کی ہے۔ ابتدائی قانون جو زیادہ تر اپنی مدد آپ

www.bhutto.org

کے اصول پر مبنی تھا' اس نے مسلمہ معیاروں کے مظہر کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس نے خود کو ایک ادارہ کی صورت دے دی ہے اور نورمبرگ میں اس نے خود کو مرکزیت کی اس حد تک منوالیا ہے کہ اس کے لئے افراد کے خلاف اختیارات حاصل کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اعلیٰ مرکزی اور مستحکم میونسپل لاء کے مقابلے میں یہ ابھی اپنے ابتدائی دور میں ہے۔ اس کے پاس اپنے تمام فیصلوں کے نفاذ کے لئے عالمی معاشرہ کی قوت اجارہ نہیں ہے۔ اس کی اثر پذیری کا تمام تر انحصار قومی حاکمیت کی جولانی پر ہے۔ 1935ء میں سان فرانسسکو کے مبارک اجتماع سے دس سال قبل مشہور عالم قانون دان ہینز کیلسن نے بین الاقوامی قانون کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی تھی' وہ اس کے بعد کی کافی پیش رفت کے باوجود آج بھی وہی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"عالمی قانون کی موجودہ کیفیت کا خاکہ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر پیش کیا جاسکتا ہے کہ بین الاقوامی مشترکہ قانون۔ جہاں تک فنی پہلو کا تعلق ہے۔ ابھی تک قانون کے ابتدائی نظام کے مرحلہ میں ہے۔ یعنی یہ اس مرحلہ میں ہے جہاں سے انفرادی ریاستوں کے قانونی نظام نے ابتدا ترقی کی ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر لامرکزیت کی کیفیت ہے۔ جیسا کہ فنی طور پر ترقی یافتہ قانونی نظام میں ہوتا ہے۔ یہاں کوئی مرکزی نظام نہیں جو ان میں قانونسازی اور قانون کے نفاذ کی تقسیم کرتا ہو۔ پورے معاشرے کے لئے مؤثر عام قوانین شعوری طور پر کسی مقننہ نے کسی صحیح اور منظم طریق سے نہیں بنائے' لیکن جیسا کہ انفرادی ریاست میں قانون کی ترویج کے آغاز میں تھا' ان قوانین نے معاشرے کے ارکان سے یعنی ان لوگوں کے عمل سے جن کا تعلق اس قانون سے ہے' ارتقا پایا ہے۔

"بین الاقوامی عمومی قانون کے ڈھانچہ میں ایسے مرکزی ٹریبونل نہیں ہیں' جن کا کام بعض مخصوص معاملات میں قانون کے عام اصولوں کو نافذ کرنا ہو۔ وہ ریاست ہی جسے کسی دوسری ریاست سے نقصان پہنچا ہو' فیصلہ کرسکتی ہے کہ آیا بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہوئی ہے؟ اگر دوسری ریاست جس پر الزام عائد ہوتا ہے' قانون شکنی سے انکار کرتی ہے تو بین الاقوامی کامن لاء میں کوئی معروضی طریقہ نہیں جس سے تنازعہ کا تصفیہ ہوسکے۔ اس طرح وہ ملک جس کے حقوق سلب کئے جاتے ہیں' اس کے خلاف جو اس کی رائے میں غلطی کا مرتکب ہوا اپنی مرضی کے مطابق جنگ یا انتقامی کارروائی جیسے اقدامات کی صورت میں جو عالمی قانون کے لئے عجیب و غریب ہوتے ہیں جوابی کارروائی کرسکتا ہے۔"

میں معترف ہوں کہ 1935ء سے عالمی قانون نے تیز رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کی ہے۔ اس کے باوجود بین الاقوامی قانون جو "میونسپل لاء" سے واضح طور پر مختلف ہے' ابھی لامرکزی قانون ہے اور دونوں قوانین کے درمیان نہایت واضح فرق ہے۔ میں عالمی عدالت انصاف کے وجود سے آگاہ ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان ملکوں کے موضوعی تحفظات سے بھی باخبر ہوں' جو اس کے دائرہ کار کو تسلیم کرتے ہیں۔ میں سلامتی کونسل کے وجود اور امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اس کی بنیادی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں لیکن منشور کے آرٹیکل 27 (3) سے بھی باخبر ہوں' جو منطقی نتائج کے تمام

www.bhutto.org

امور پر حاوی ہے۔

میرا وفد اقوام متحدہ کے چارٹر کا بے حد احترام کرتا ہے۔ اس کے باوجود میرے وفد کو یقین ہے کہ اگر حقیقت کا صحیح عکس دکھایا جائے تو اس سے اس عظیم تنظیم کی توہین نہیں ہوگی اور نہ ہی ایسا مقصود ہے۔ اس ضمن میں میرے وفد کی تائید ممالک متحدہ برطانیہ کے وزیر داخلہ کی 25 ر ستمبر 1957ء کی شاندار تقریر کے اس عالمانہ اقتباس سے ہوتی ہے' جس میں انہوں نے کہا ہے

"اس تنظیم کی کیفیت ، اس کی کامیابیوں' اس کی ناکامیوں' اس کی قوت' اس کی کمزوریوں' دنیا میں اس کے مقام اور مستقبل میں اس کی کامیابی کے بارے میں توقعات پر آزادانہ تبادلہ خیال کے لئے یہ مباحثہ مناسب موقع فراہم کرتا ہے۔

"اقوام متحدہ ایک بالاتر مملکت نہیں۔ یہ اقوام عالم پر قانون کے نفاذ کی کوئی عالمی ریاست نہیں' جنرل اسمبلی دنیا کے لئے قانون سازی کرنے والے انفرادی منتخب ارکان کی پارلیمنٹ نہیں۔ اقوام متحدہ حکومتوں کے درمیان مذاکرات کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ تنظیم اقوام کے مابین تصادم کی دھار کو کند کر سکتی ہے۔ یہ مصالحت کی حکمت عملی کے لئے کام کر سکتی ہے' اس کا رجحان اختلافات کو ختم یا محو کرنے کی طرف ہے اور اس طرح یہ حل کی تلاش میں مدد دیتی ہے۔ جنرل سیکرٹری کی رائے میں تنظیم کی کارگزاری کی تجدید چارٹر کی شقوں یا طاقت و جسارت کے کسی امتیاز کے بغیر ایک ملک ایک ووٹ کے نظام کی وجہ سے نہیں ہے۔ وہ فی الوقت بین الاقوامی زندگی کے حقائق کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں طاقتوں کا توازن ہی اس کی حدود متعین کرتا ہے جس میں عالمی تنظیم کی قوت ترقی کر سکتی ہے۔"

یہ الفاظ حقیقت کے اتنے صحیح عکاس ہیں کہ اقوام متحدہ کے مخلص ترین پجاریوں کو بھی انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اس قدر واضح سچائی کو چھپانا اقوام متحدہ اور اس کے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

اس حقیقت سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں کہ فی الوقت عالمی قانون' قومی حاکمیت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ فی الحقیقت منشور فی نفسہ ایک سیاسی آلہ ہے۔ اس لئے یہ امر ناگزیر ہے کہ جارحیت کی تعریف کے مسئلہ پر بحث کو سیاسی و قانونی' دونوں امور یعنی فوق العدل وجوہات اور موضوعی نوعیت کے فیصلے کی سمیت سے آلودہ عناصر پر محیط ہونا چاہیے۔ تنہا اور ذاتی طور پر جارحیت کی مجرد تعریف کرنے کی مساعی عملی طور پر قطعاً ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اس کوشش کو حتی الامکان معاشرتی و سیاسی اثرات سے الگ نہیں کیا جا سکتا' یہ ناگزیر طور پر سیاست کے پھندے میں الجھ جاتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہمیں جارحیت کی دو تعریفیں کرنا چاہئیں؟ ایک سیاسی اور دوسری عدالتی۔ ایک وہ۔ جس کا انحصار جوہری طاقت کی اساس پر ہو۔ دوسری تجزیاتی و معروضی تعریف۔ جو قومی حاکمیت کے تابع فرمان عالمی قانون ٹریبونل کے نازک میزان پر قائم ہو۔ اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو اس سے سیاست کو ہمیشہ کے لئے قانون پر تفوق

www.bhutto.org

حاصل ہو جائے گا اس سے بین الاقوامی قانون کے لئے حکومت خود اختیاری کے حصول کی اس جدوجہد کو تحت خطرہ لاحق ہو جائے گا جو ہم قانون کے ذریعے مستقل امن کے قیام جیسے نظام کے لئے کر رہے ہیں اور یہ مقصد ہمیں نہایت عزیز ہے۔ خیر سگالی کے خواہاں لوگوں نے اکثر و بیشتر خود مختار مملکتوں سے پُر زور اپیل کی ہے کہ وہ اپنے قانونی تنازعات عالمی عدالت انصاف کے حوالے کر دیں۔ لیکن ان اپیلوں کے باوجود ہم ان ممالک کو تنازعات کے تصفیہ کے لئے دوسرے اقدامات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اس قسم کا رویّہ خطرے یا تعجب کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ چارٹر میں فی نفسہٖ عالمی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری اقوام متحدہ کے کسی سیاسی ادارے پر ہے۔ آرٹیکل 94(2) کے تحت عالمی عدالت انصاف سیاست کے تابع ہے۔ آرٹیکل 94(2) میں کہا گیا ہے

"اگر کسی مقدمے کا کوئی فریق عدالت کے فیصلے کے مطابق اس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو نبھانے میں ناکام رہتا ہے تو دوسرا فریق سلامتی کونسل سے رجوع کر سکتا ہے، جو اگر ضروری سمجھے تو اس فیصلے کو مؤثر کرنے کے لئے اقدامات یا اس کے لئے سفارش کر سکتی ہے۔"

اپنے مؤقف کی تائید میں، میں اقوام متحدہ کے قانون پر ہینز کیلسن کے یادگار مقالات سے اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں

"تجریدی قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں جو منحرف ریاست کے خلاف عدالت کے فیصلے پر عملدرآمد کی ضمانت دیتی ہو۔ آرٹیکل 94(2) سلامتی کونسل پر منحرف ریاست کے خلاف عدالت کے فیصلوں کے نفاذ کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتا۔ عدالت کے فیصلے پر عمل نہ ہونے کی صورت میں یہ اپیل کا طریق کار بتاتا ہے اور سلامتی کونسل کے اقدام کو اس طریق کار کے نتیجے میں سلامتی کونسل پر چھوڑ دیتا ہے کہ اسے اپنی صوابدید پر دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے یا تو یہ کہ وہ سفارشات کرے یا پھر عدالت کے فیصلے کو مؤثر کرانے کے لئے ضروری اقدامات کرنے کا فیصلہ کرے۔ اس صورت میں کہ جب سلامتی کونسل سفارشات پیش کرنے کا راستہ اختیار کرے وہ فیصلے پر عمل کرنے کی اپیل کر سکتی ہے۔ لیکن سفارش کرنے میں آرٹیکل 94(2) کے تحت سلامتی کونسل عدالت کے اس فیصلے کی اطاعت کرنے کی پابند نہیں جسے متعلقہ فریق نے تسلیم نہیں کیا۔ سلامتی کونسل تنازعہ کے تصفیہ کے لئے عدالتی فیصلے سے قطعاً مختلف حل پیش کر سکتی ہے۔ اگر چارٹر کے آرٹیکل 25 کی توجیہ یوں کی جائے کہ سلامتی کونسل کی سفارشات کو نافذ کیا جانا چاہیے تو آرٹیکل 94(2) کے تحت سلامتی کونسل کو صرف اعلیٰ اتھارٹی کے پاس اپیل کرنے کا حق ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ سلامتی کونسل کی سفارشات متعلقہ فریقوں پر لاگو نہیں ہوتیں تو بھی آرٹیکل 94(2) کے تحت سلامتی کونسل اپیل کر سکتی ہے۔ آرٹیکل 94(2) کے تحت کی گئی سفارش سے انحراف کو سلامتی کونسل امن کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے آرٹیکل 39 کے تحت کونسل کی سفارش پر عمل نہ کرنے والی حکومت کے خلاف اپنی سفارش کے نفاذ کے لئے اقدام کر سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سلامتی کونسل عدالت کے فیصلے سے نفاذ کی

www.bhutto.org

بجائے اپنی سفارش کو نافذ کر سکتی ہے۔ آرٹیکل 94(2) سلامتی کونسل کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنی سفارش کو عدالتی فیصلے کی جگہ دے سکتی ہے۔ یعنی یہ کہ آرٹیکل 94(1) کے تحت عدالت کے فیصلوں پر عملدر آمد کے بارے میں قانون کو آرٹیکل 94(2) کے نفاذ سے محدود کیا جا سکتا ہے۔ آرٹیکل 94(2) کے تحت سلامتی کونسل سے رجوع کرنے کے بعد فریق متعلقہ عدالت کو کونسل کے تابع قرار دیتا ہے۔ چنانچہ چارٹر کے تحت اپنی مدد آپ (ماسوا خود حفاظتی کے مسلح حملے کے) منع ہے۔

عدالت کے فیصلہ پر عمل نہ کرنا شاید دوسری پارٹی کو دفعہ 94(2) کے تحت سلامتی کونسل سے رجوع کرنے پر مجبور کر دے۔ یہ راستہ قانونی تنازعہ کو جسے عدالت نے موجودہ قانون کے مطابق طے کیا ہے، سیاسی اصولوں کے مطابق حل کرنے کی نوعیت میں بدل دینے کے مترادف ہے۔

ان حالات میں یہ ستم ظریفی کی انتہا ہوگی کہ صرف جارحیت کی قانونی تعریف کی جائے جس کی تشریح و توضیح عدالتی ٹریبونل بھی نہیں کر سکے گا اور اگر کر بھی دی جائے تو اسے اس کے ذریعے نافذ نہیں کیا جا سکے گا۔ قانونی تعریف کو عملی افادیت اسی وقت حاصل ہوگی جب عالمی عدالت کو کسی استثنیٰ یا تحفظ کے بغیر تمام تنازعات پر خصوصی حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں۔ بہرحال عالمی برادری کو اس منزل تک پہنچنے کے لئے بہت طویل سفر طے کرنا پڑے گا۔ یہ کسی بالادست ریاست (Super State) کے لئے ایک مؤثر اقدام ہوگا۔ جسے قانونی معنی بھی پہنائے جا سکتے ہیں اور یہ محض شورشی سیاست کی زبان نہیں ہوگی۔

اس لئے اگر ہم نے موجودہ لمحے میں جارحیت کی تعریف یا تشریح کی کوشش کی تو یہ حصول مقصد کے ضمن میں ایک افسوسناک شکست ہوگی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں تعریف ناممکن ہے۔ اس کا مطلب تمام عالمی مسائل پر دوہرے معیار اور سیاست کے ذریعے قانون کی ظالمانہ قید کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ میرے وفد کو اندیشہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی موجودہ حیثیت میں جارحیت کی قانونی تعریف ناممکن ہے۔ صرف سیاسی تعریف ممکن ہے۔ بلاشبہ اسے قانونی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کی ایک سیاسی تعبیر اہمیت اور نقطہ نظر ہوگا۔

اگر میرا وفد اس امر سے اتفاق بھی کر لے کہ ضابطہ عدالت کے مفہوم میں قانونی تعریف ممکن ہے، پھر بھی ہم اس مسئلہ کے حل سے بہت دور ہیں۔ ہمیں فوری طور پر الفاظ کے ایک بحران کا سامنا پڑے گا اور ہم متعین مفہوم کی لاانتہائی جنگ میں الجھ جائیں گے۔ تعریف کی دسترس، مافیہ اور مقصد کے بارے میں اختلاف ہوگا۔ کیا اسے سختی سے آرٹیکل 51 کے مطابق ہونا چاہیے یا اس تعریف میں زیادہ جامعیت ہونی چاہیے جس میں آرٹیکل 51 میں مستعمل الفاظ "مسلح حملہ" جارحیت کی صرف ایک صورت ہی کے لئے استعمال ہوں؟ چارٹر کے آرٹیکل 39 پر جس میں جارحانہ کارروائی کا لفظ استعمال ہوا ہے، اتفاق اور اس کی وضاحت ضروری ہوگی۔ کیا "جارحانہ کارروائی" سے صرف مسلح حملہ مراد لیا جائے گا یا اس کا مطلب براہ راست یا بالواسطہ جارحیت لیا جائے گا؟ جیسا کہ روس کے مسودہ قرارداد (دستاویز 399/ایل/6/اے/سی) میں تجویز کیا گیا ہے؟ ایک جامد اور محدود تعریف، تعریف۔ کرنے کے مقصد

www.bhutto.org

کی شکست کے مترادف ہوگی اور اس کے برعکس "جارحانہ مقصد" "بالواسطہ جارحیت کا خیال" "معاشی جارحیت کا ارادہ" "نظریاتی جارحیت" اور بالواسطہ جارحیت کے دوسرے اقدامات پر مشتمل جارحیت کی مکمل تعریف ایسے بے قیاس اور بے قاعدہ حالات پیدا کر دے گی جن میں جارحیت انسانی رویّہ کا باقاعدہ اور عام فیچر بن جائے گی۔ نیز اس طرح اپنے غیر معمولی دہشت ناک، خوفناک اور ہنگامی معانی کھو بیٹھے گی۔ ایک غیر معمولی خیال سے یہ ایک قدرتی نظریئے میں بدل جائے گی۔ یہ نیم جان بیسویں صدی انتہائی ڈرامائی نظریاتی جنگ کی گرفت میں ہے۔ دنیا کے ہر حصہ میں نظریات کا تصادم ہے۔ ایسے نظریات جنہیں نہ تو آسانی سے کنٹرول کیا جاسکتا ہے اور نہ انہیں ختم کر دینے پر قدرت حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں نظریاتی جارحیت کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر نظریاتی جارحیت اس کا ایک مقصد ہو تو معمول کے مطابق حالات کو لفظ جارحیت کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال بنیادی طور پر ایک تعریف خواہ محدود ہو یا وسیع دھماکہ خیز حد تک دور رس پیچیدگیوں کی حامل اور بے انتہا خطرات سے پُر ہوگی۔

بالفرض محال اگر ایسی تعریف ممکن بھی ہو تو کیا یہ قابلِ قبول اور پسندیدہ ہوگی؟ تعریف کا فوری اثر یہ ہوگا کہ بین الاقوامی قانون کی ترقی پسندانہ ترویج رک جائے گی اور بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اس ضمن میں میرا وفد سیلون کے معزز نمائندے کے اس تبصرے کی تائید کرتا ہے جو انہوں نے بین الاقوامی قانونی کمیشن کی رپورٹ پر بحث کے دوران اپنی عالمانہ تقریر میں "لاء آف ٹارٹس" (قانون رسانی) پر کیا ہے۔

چونکہ مرکزیت کے درجے میں عظیم دو قسمی پائی جاتی ہے اس لحاظ سے میونسپل لاء کی جس شاخ کا عالمی قانون سے نفع بخش حد تک مقابلہ کیا جاسکتا ہے، وہ صرف ٹارٹس کا قانونِ ضرر رسانی ہے۔ عام بین الاقوامی قانون کی طرح لاء آف ٹارٹس بھی کسی اثر آفرین نشوونما کے مرحلہ میں ہے۔ اگر لاء آف ٹارٹس کو قبل از وقت خام حالت ہی میں مدوّن کر لیا جاتا تو اس طرح قانونی نظام کو بحیثیت مجموعی ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ غفلت کے دیوانی ہرجانہ قانون تشکیل نہ پاتا اور اپنی انتہا کو نہ پہنچتا۔ ڈونوہیو بنام سٹیونس کے مقدمہ میں لارڈ اٹکین کے تاریخی فیصلے سے نہ صرف غفلت کے ہرجانے کا دیوانی قانون بنا بلکہ ہر قسم کے معقول شک و شبہ سے بالا غیر معینہ معیار کے اوصاف کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے کا فلسفہ قانون بھی عمل میں آیا۔ اس عظیم قانون دان نے کہا ہے کہ "غفلت کی اقسام کبھی ختم نہیں ہوتیں" اور واقعتاً ایسا ہی تھا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان لوگوں کی تلافی اور مدد فوراً ممکن ہے جنہیں اپنے ساتھی شہریوں کی غفلت سے جسمانی یا مالی نقصان پہنچا ہو۔ اگر قانون ضرر رسانی کو ایک تعریف کی چہار دیواری میں مقید یا محدود کر دیا جاتا تو ہزاروں افراد کے لئے اپنے حق کے مطابق دادرسی کا حصول ممکن نہ ہوتا اور یقیناً معزز نمائندے کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ دیکھ بھال اور خبر داری کی جنرل ڈیوٹی کے اصول کو عالمی قانون کی حدود تک پھیلائے اور جیسا کہ انہوں نے بجا طور پر دلیل دی ہے اس پر اصرار کرے کہ ڈونوہیو بنام سٹیونسن میں جو اصول پیش کیا گیا ہے، وہ ہر ریاست پر اپنے عالمی رویّہ میں احتیاط و خبر داری کا فرض عائد کرتا ہے۔

www.bhutto.org

غیر تعریف شدہ قانونی اصطلاحات کے اوصاف کو ایک ممتاز مستند امریکی نے نہایت اچھے انداز میں واضح کیا ہے اور اس ضمن میں میرے وفد کے خیالات کا لب لباب یا نچوڑ پیش کرنے کے لئے غالباً یہ مفید ہوگا کہ ڈیوڈسن بنام بورڈ آف ایڈمنسٹریٹر آف دی سٹی آف نیو آرلینز کے مقدمے میں سپریم کورٹ نے "مقررہ عمل" (Due Process) کی اصطلاح کے قطعی معانی کے تعین سے پس و پیش کیا تھا اور وہی اسباب ہمیں جارحیت کی ایک تعریف کرنے سے گریز کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میں اب یہی متعلقہ پیرا پیش کرتا ہوں۔

"......اس لئے اگر اس کا تعین ممکن ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس پر حکومت کسی شخص کو قانون کے مقررہ عمل کے بغیر زندگی' آزادی یا جائیداد سے محروم کر سکتی ہے۔ اصطلاحاً یہ کہ وہ کون سی شے ہے جو اس طرح ریاست کے لئے ممنوع ہر اختیار پر حاوی ہے اور وہ کون سی شے ہے جو اس طرح ریاست کے لئے ممنوع ہر اختیار پر حاوی ہے اور وہ کون سے اختیارات ہیں جن کا استعمال ممنوع نہیں ہے' اس ضمن میں یہ عدالت یا کوئی بھی دوسری عدالت بنیادی قانون کی تشکیل میں کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ لیکن کسی ایسی تعریف کی ناکامی کے اندیشے سے قطع نظر جو فوری طور پر قابل فہم' جامع اور اطمینان بخش ہو' دانشمندی اسی میں ہے کہ مدعا و مقصد کا تعین اور اس قدر اہم ہیئت (Phase) کا اطلاق وفاقی آئین میں عدالتی اندراج و اخراج کے تدریجی عمل سے کیا جائے' جیسا کہ فیصلے کے لئے پیش کئے گئے مقدمات کا تقاضا ہو......"

اگر میونسپل لاء کے نہایت مرکزی نظام میں استخراجی تعریفوں سے بچتے ہوئے قانون کی ترقی کے دروازے کھلے رکھنا دانشمندی ہے تو عالمی قانون کے انتہائی لامرکزی نظام میں اس پالیسی پر عمل کرنا اس سے کہیں زیادہ دانشمندانہ اور سودمند ہوگا۔ کیا ہمیں اتنا ہی یقین ہے اور ہم اس قدر غیر استدلالی طور پر اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں کہ جارحیت کی اقسام ختم ہو چکی ہیں' اس لئے اس کی تعریف و تشریح کا تعین درست ہے؟"

وہ لوگ جنہوں نے قانون عام (کامن لاء) کے نظام میں پرورش پائی ہے' اپنے تجربہ سے مقررہ اصطلاحات کی جبلی کمزوریوں کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان ممالک میں بھی جہاں کامن لاء غالب ہے جدید معاشرہ کے تقاضوں نے کسی حد تک قوانین کی تدوین پر مجبور کیا ہے۔ تاہم ابھی تک ان قوانین کو جو ارتقائی عمل سے گزر رہے ہیں' مدوّن کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی' کامن لاء والے ممالک ایک قانونی ڈھانچہ میں مدوّن اور غیر مدوّن قوانین کی کارکردگی کا ایک ساتھ اور پہلو بہ پہلو جائزہ لینے کا ایک شاندار موقع مہیا کرتے ہیں۔ یہ کہنا کافی ہے کہ قوانین کی تدوین نئے نئے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل کو جن کا تعلق تشریح و توضیح سے ہو۔ بلاشبہ یہ خودکار مشین نہیں ہے جو مقررہ سکہ ڈالنے پر مطلوبہ نتائج پیدا کرتی ہے بلکہ بعض اوقات ایسے مسائل پیدا کرتی ہے جو ان سے زیادہ پیچیدہ و مشکل ہوتے ہیں جو تدوین سے قبل تھے۔

قانون ایک جبری حکم ہے' یہ قانون کا ایک ایسا وصف ہے جو زمانہ قدیم سے مسلمہ چلا آ رہا ہے' طاقت کے عنصر کے بغیر قانون بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ نظم کو برقرار رکھنے کی بجائے یہ انتشار و انارکی کا جزو بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ استفسار کیا جاتا ہے کہ آیا عالمی قانون سچا قانون ہے۔ اگر عالمی قانون میں جبر یا زبردستی کا جزو موجود ہے تو یہ واقعتاً سچا قانون ہے۔ اگر یہ فوجداری اور دیوانی جرائم کے خلاف تعزیری اور تادیبی اقدامات کر سکتا ہے تو یہ سچا قانون ہے۔ کولمبیا کے معزز نمائندے نے بجا طور پر کہا ہے "کوئی معاشرہ قانون کے بغیر اور کوئی قانون تعزیرات کے بغیر رائج نہیں ہو سکتا۔"

جو لوگ عالمی قانون کو حقیقی اور سچا قانون تصور کرتے ہیں' ان کے خیال میں عالمی قانون کی مؤثر اور مضبوط دفعہ جنگ ہے۔ دفاعی اور جارحانہ دونوں کی ہو سکتی ہے۔ اس مکتبہ فکر کے حامیوں کے خیال میں Bellum Justum جائز مقصد کے لئے جنگ کا نظریہ عالمی قانون کا لاینفک جزو ہے۔ میرا وفد اس نظریہ کی خوبیوں پر کسی خیال کا اظہار نہیں کرتا' ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم جارحیت کی تعریف اور اسے ایک بین الاقوامی جرم قرار دینا چاہتے ہیں تو ہمیں اس نظریہ اور اس کے مختلف النوع پہلوؤں کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کسی بھی وقت ماضی کی طرح ایسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے جو اس اصول کے اطلاق کی متقاضی ہو۔ منصفانہ جنگ کا نظریہ صرف دفاعی جنگ کے حق تک ہی محدود نہیں جارحانہ اجتماعی اقدام بھی سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ کسی بے اجازت جنگ کے خلاف جوابی جنگ ہی واحد مؤثر ردِعمل ہے۔ اگر جنگ ایک جرم ہے تو جوابی جنگ کی اجازت ہونی چاہیے۔ (Bellum Justum) منصفانہ جنگ کا نظریہ بے لگام اور بے قید قومی حاکمیت کے دور میں ماند پڑ گیا تھا۔ لیکن ایک بار پھر یہ بین الاقوامی قانون کے میدان میں خود کو منوا رہا ہے۔ اس کے حامی شدت سے اس کی وکالت کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مثبت نظریہ عالمی قوانین میں کئی اہم واقعات کی بنیاد بنا ہے' چنانچہ برسلز کے معاہدہ امن بجمیعت اقوام کے اقرار نامے اور معاہدہ کلوگ کی بنیاد بھی اسی پر ہے اور چارٹر کے آرٹیکل 51 میں بھی اس کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔

یہ اصول نہایت اہم پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے لیکن یہ پیچیدگیاں ذاتی دفاع کے استحقاقی اور قانونی اقدامات میں اتنی نہیں ہیں جتنی کہ اس وقت پیدا ہوتی ہیں' جب اصطلاحی معانی میں جارحیت ضروری ہو جائے یا جارحیت کو عالمی قانون کے ایک قاعدے کے طور پر ضروری سمجھا جائے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے' جن میں اپنے دفاع کے اقدامات اور قطعی جارحیت کے مابین امتیاز کی لکیر دھندلا کر رہ گئی۔ ذاتی دفاع کے حق کا قانونی استعمال اور جارحیت ایک دوسرے سے غلط ملط ہو گئے! اس کی حالیہ مثال کوریا کی جنگ ہے' جس میں ہر فریق دوسرے کو جارحیت کا ملزم گردانتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ وہ تو اپنے دفاع کے فطری حق کا استعمال کر رہا ہے۔

ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے جس میں الف ملک ب ملک پر الزام لگائے کہ وہ اس کے علاقے میں مسلح گروہوں کو منظم یا ان کی تنظیم کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے یا اس کے علاقے میں تخریبی مداخلت کا

www.bhutto.org

مرتکب ہوا ہے اور اس بہانے اپنے دفاع کے فطری حق کو استعمال کرتے ہوئے ریاست "ب" پر حملہ کر دے اور اسے زیر کر لے۔ اس قسم کی صورت میں حملہ کا شکار ملک دوسرے ملک یا ممالک سے کسی باہمی معاہدے یا عمومی عالمی قانون کے تحت اپیل کر سکتا ہے کہ وہ اس کی مدد کے لئے آئیں۔ دوسرے ممالک کی مداخلت کو فنی طور پر ملک "الف" کے خلاف جارحیت کہا جا سکتا ہے تاہم یہ مداخلت ملک "الف" کی جارحیت کے خلاف ایک منصفانہ تدبیر ہوگی۔

کولمبیا کے معزز نمائندے نے 1939ء میں پولینڈ پر جرمنی کے حملہ کو برطانیہ اور فرانس کے خلاف بالواسطہ جارحیت کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ان واقعات کے سلسلہ کی ایک توجیہ ہو سکتی ہے جو دوسری جنگ عظیم کا باعث ہوئے۔ تاہم Bellum Justum کے اصول کے محرک اور مجوز نازی جرمنی کے خلاف برطانیہ کے اعلانِ جنگ کی توجیہ کرتے ہوئے بین الاقوامی قانون کو توڑنے والے اس ملک کے خلاف اسے ایک منصفانہ جارحیت کا نام دے سکتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں کوئی ملک بھی اپنے دفاع کے حق کو مقررہ حدود سے باہر غلط طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ آرٹیکل 51 کا دوسرا حصہ غلط استعمال کے خلاف "مؤثر روک" ثابت ہوگا۔ اگر اس دلیل کو آگے بڑھایا جائے تو عملی طور پر یہ حصہ بیکار اور ناقص نظر آئے گا۔ اس قسم کے غیر یقینی حالات میں ویٹو کا حق اس کے برعکس اثر مرتب کر سکتا ہے۔ اپنے دفاع کے حق کے غلط استعمال سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں 'جنگ یا جوابی کارروائی کو روکنے کی بجائے ویٹو کا حق جنگ کو روکنے میں رکاوٹ ڈالے گا۔ بین الاقوامی قانون کی موجودہ کیفیات میں اس قسم کے غلط استعمال کے امکان کے پیش نظر اور چارٹر میں بنیادی ترمیم یا اس پر نظرثانی کئے بغیر کیا جارحیت کو ایک بین الاقوامی جرم قرار دینا قطعاً نامناسب ہوگا؟ یہ ایک ایسا جرم ہوگا جو ایسے مواقع پر جوابی جارحیت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگا جبکہ اخلاقی اور قانونی طور پر مہذب اقوام ننگے جارح کی غلط کاریوں کے خلاف انفرادی اور اجتماعی اقدام کی پابند ہوں گی۔ ایسے جارح کے خلاف جو انتہائی ڈھٹائی اور خود نمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جارحیت کو اپنے دفاع کے حق کے غلط استعمال کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کی نہایت مؤثر دفعہ کو اگر اس طرح محدود کر دیا گیا تو یہ خالی خولی معیاروں کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔

چنانچہ یہ میرے وفد کی متفقہ اور طے شدہ رائے ہے کہ اس نازک مرحلہ پر جارحیت کی تعریف نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ضروری اور پسندیدہ۔ مزید بر آں ہمیں یقین ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسی مستعد باصلاحیت اور متحرک مشینری موجود ہے جو جارحانہ اقدامات کے خلاف 'امن کے منافی دوسرے اقدامات کے خلاف امن کے بارے میں دھمکی آمیز رویے کے خلاف اور ایسے تمام تنازعات اور حالات کے خلاف جن سے عالمی امن وسلامتی کو خطرہ لاحق ہو' جارحیت کی تعریف کے بغیر مناسب اصلاح کن کارروائی کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک تعریف ایک حد تک فوری اور فیصلہ کن جوابی کارروائی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے اور حقائق کی توجیہ کی نزاکتوں پر طویل اور بے نتیجہ بحث سے سلامتی کونسل کی

www.bhutto.org

کارروائی کوماند کر سکتی ہے۔ چونکہ تعریف کے تعین کے لئے چارٹر میں زبردست ترمیم و تنسیخ ناگزیر ہوگی' اس لئے تعریف کی ضرورت و امکان پر غور کے لئے وہ موقع شاید بہتر ہو جب چارٹر پر نظر ثانی کے لئے غور و خوض کیا جائے۔

میرے وفد نے جارحیت کی تعریف کرنے کے امکان اور ضرورت کے بالمقابل اپنے خدشات کا اظہار کر دیا ہے۔ بہرحال چونکہ پاکستان غیر مسلّمہ طور پر خود کو امن کے "مقصد" کے لئے وقف کر چکا ہے اس لئے ہماری پالیسی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام مسائل کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیا جائے۔ میرا وفد پہلے سے اس بارے میں کوئی تعصبات نہیں رکھتا۔ اس اہمیت کے مسائل کو غیر استدلالی اور اصول پرستانہ انداز میں حل نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے تعریف کی راہ میں حائل واضح رکاوٹوں کو یا جو ہمیں واضح نظر آتی ہیں ان کی نشاندہی کر دی ہے۔ لیکن قانون دانوں کے اس اجتماع میں اگر کوئی ہمارے شکوک و شبہات کو دور کر سکے تو ہم اس ضمن میں پیش کردہ تجاویز کا ہمدردانہ اور معروضی جائزہ لینے کے لئے تیار ہیں۔ معاشرہ اس قسم کے سوالات پر قطعی فیصلے کے لئے ایسے ان گنت غیر مادی اشیا پر مشتمل ہے جن کے سبب اس قسم کے مسائل کا قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال اس شرط کے ساتھ میرا وفد دوٹوک الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہے کہ انسانی زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے انداز کے باوجود بعض غیر متغیر اجزا بھی ہیں۔ میرا وفد اس کمیٹی کی نوعیت اور ذمہ داری سے پوری طرح آگاہ ہے۔ گو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض مواقع پر متعدد کمیٹیوں کی شرائط حوالہ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں۔ زیر غور مسئلہ صرف قانونی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ جزواً قانونی اور جزواً سیاسی ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ اگر یہ قطعی قانونی مسئلہ ہوتا تو اس قدر پیچیدگی اور تحیّر کا باعث نہ ہوتا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ سیاسی بلکہ اقتصادی و معاشرتی مسائل کو بھی سامنے لے آیا ہے۔ بہرحال کمیٹی کے احساس و جذبات کا احترام کرتے ہوئے میرا وفد عمومی اصطلاحات میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ مسئلہ میرے ملک کے لئے بنیادی توجہ کا مسئلہ ہے۔

اگر جارحیت کی عمومی سطح پر کوئی قابل قبول تعریف ہے' اگر ہم جارحیت کی اقسام کو ختم کرنے اور لپیٹنے پر مصر ہیں تو اس تعریف میں اقتصادی جارحیت کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں روس کی قرارداد کا پیراگراف 3 (الف) اور (ج) میرے وفد کے خدشات کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اگر ہم کوئی تعریف متعین کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس تعریف میں اقتصادی جارحیت سے متعلق ایک علیحدہ آرٹیکل شامل کیا جانا چاہیے جس میں واضح اور غیر مبہم انداز میں کہا گیا ہو کہ اگر زیریں دریائی ممالک ان دریاؤں کے پانی کے حق سے محروم کر دیئے گئے جو دو یا زیادہ ممالک میں بہتے ہیں تو یہ اقتصادی جارحیت ہوگی یا بالواسطہ جارحیت کا ارتکاب ہوگا۔ میرا وفد اس مسئلہ کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔

ایک مسلح حملہ ان نقصانات کی بنا پر جو اس سے پہنچتے ہیں' ہولناک اور نفرت انگیز اقدام ہے' اس

www.bhutto.org

لئے ہر ایک اس سے اتفاق کرتا ہے کہ مسلح حملہ جارحیت ہے۔ خالص اور سیدھی سادی جارحیت۔ اگر مسلح حملے کے بغیر' طاقت کے استعمال کے بغیر' زیادہ پر فریب اور دغابازانہ ذرائع سے جان و مال کو مسلح حملہ سے بھی زیادہ تباہ کن نقصان پہنچایا جائے تو اس قسم کے ذرائع کو اسی طرح جارحیت کا ایک انداز سمجھنا چاہیے' جس طرح مسلح حملہ کو قرار دیا جاتا ہے۔

اگر آبپاشی کے پانی کی معمول کے مطابق اور ضروری سپلائی میں کوئی مداخلت ہوئی تو میرے ملک کو مکمل تباہی کے خطرے کا سامنا کرنا ہو گا۔ یہ جارحیت کی انتہائی عداوت انگیز اور تباہ کن صورت ہو گی۔ یہ ہرے بھرے مرغزاروں کو نیز زرخیز میدانوں کو تپتے ہوئے صحرا میں تبدیل کر دے گی۔ یہ وسیع پیمانے پر قحط' مایوسی اور خوف کو جنم دے گی۔ یہ فی الواقع کسی شہری حکومت کے لئے خانہ جنگی اور خونریزی پر کنٹرول کو ناممکن بنا دے گی۔ قحط و افلاس مہذب شہریوں کو آدم خوری پر مجبور کریں گے۔ یہ شرافت و اخلاق کے تمام تصورات کو تباہ کر دے گی۔ فی الواقع اس قسم کی جارحیت کا یہی نتیجہ ہو گا۔ یہ صورت حال صرف میرے ہی ملک سے مخصوص نہیں بلکہ کئی اور ملک بھی ہیں جو اپنی جغرافیائی پوزیشن اور بین الاقوامی دریا سے آبپاشی کے پانی کی فراہمی پر اقتصادی انحصار کی وجہ سے اس قسم کی جارحیت کے خطرہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔

اسی طرح سمندر سے دور واقع (غیر ساحلی) ممالک کی اقتصادی ناکہ بندی بھی اس قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے میرا وفد اس ضمن میں معزز افغان نمائندے کی تجویز کی حمایت کرے گا' بشرطیکہ جارحیت کی ایسی تعریف کی جائے جو بالعموم قابل قبول ہو۔ بشرطیکہ استحقاق کی بنیاد پر میرے ملک کے عظیم ہمسائے ہمارے فطری خدشات اور اس بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں کہ دریائی حقوق کی خلاف ورزی اگر زیادہ نہیں تو اتنی اقتصادی تباہی کا باعث ضرور ہو سکتی ہے جتنی کہ چاروں طرف خشکی سے گھرے ہوئے ملک کی اقتصادی ناکہ بندی سے ہو گی۔ میرے وفد کی نیک نیتی کا اس سے بہتر مظاہرہ نہیں ہو سکتا کہ ہم استحقاق پر مبنی حقائق کو رضاکارانہ طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

میں نے آپ کا وقت بھی زیادہ لیا ہے اور آپ کے صبر کا امتحان بھی لیکن اختتام سے قبل مجھے آپ سے ' اپنے معزز ساتھیوں سے یہ اپیل کرنا ہے کہ دائمی امن کے قیام کی ضمانت کی خاطر ضروری سیاسی توازن اور مفاہمت کے لئے مسلسل اور انتھک جدوجہد کرنی چاہئے۔ یہ ایک ایسا فرض ہے جس کے لئے ہم صرف اپنی جنگ زدہ نسل ہی کے سامنے جوابدہ نہیں بلکہ اپنی اولاد کی طرف سے بھی پابند ہیں۔

ہم اپنے چارٹر کے ذریعے صرف اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی جنگ کی تباہیوں اور خونریزیوں سے بچانے کے پابند ہیں۔ میں نے اکثر سنا ہے کہ عالمی جنگ کی صورت میں کوئی فاتح ہو گا نہ مفتوح۔ یہ بات بظاہر صحیح ہے لیکن پھر بھی اگر کسی کو مضحکہ خیز یا مصنوعی فتح حاصل ہوئی تو یہ لاشوں پر دم توڑتے اور سسکتے ہوئے شخص کی فتح ہو گی اور یہ دم توڑتی ہوئی طاقت کے لئے لمحاتی مسرت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھے گی کہ اس نے تہذیب کی مکمل تباہی' اپنے گھروں اور یونیورسٹیوں' ہمارے آرٹ اور سائنس

www.bhutto.org

کے مراکز، ہماری مساجد، مندروں اور گرجاؤں، ہمارے تاج محلوں اور ویسٹ منسٹر ایبے کی تباہی کو دیکھا ہے اور خود سسکیاں لیتے ہوئے معصوم بچوں اور مفلوج بیواؤں کے درمیان آخری سانس لے رہا ہے۔ اس لئے یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم مستقل امن کے لئے کام کریں اور ایک انگریز شاعر کے الفاظ کو صرف توقعات ہی کا نہیں بلکہ حقیقت کا جامہ پہنائیں جس نے اس دن کا تصور کیا تھا۔

"جب نوع انسانی کی پارلیمنٹ میں، دنیا کے ایک وفاق میں، جنگ کے طبل نہیں بجیں گے اور جنگ کے پرچم نہیں لہرائیں گے۔"

25 ر اکتوبر 1957ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

علاقائی سمندری حدود

جناب صدر! اس موضوع پر عام بحث کی پہلی تقریر میں سعودی عرب کے ممتاز مندوب نے قانون شہادت میں افواہ کے اصول کے استثنیٰ کو استعمال کر کے آپ کی قابلیت کو شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اگر مجھے سعودی عرب کے مشہور قانون دان کی تنقید کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بھی اس کمیشن سے مطالبہ کروں گا کہ وہ آپ کے تبحر علمی اور عظمت کا قانونی اعتراف کرے۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کیونکہ حقیقتاً میرا یہی مطلب ہے اور اس لئے نہیں کہ یہ ایسی کانفرنسوں کا غیر تحریری قانون ہے کہ تمہیدی جملوں میں خلوص اور شائستگی ہو۔ نہ ہی محض آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کیونکہ' جناب والا' میرے وفد کو آپ کی غیر جانبداری پر اس قدر اعتماد ہے کہ ہم الفاظ سے اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ یہ کہنے کے بعد میں گزارش کرتا ہوں کہ میرے وفد نے بھی برطانوی وفد کی طرح آپ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دولت مشترکہ کے رکن کی حیثیت سے پاکستان آپ کے انتخاب پر خصوصی خوشی محسوس کرتا ہے اور بطور ایک ایشیائی قوم کے ہم ایک ایشیائی انگریز کو اس کرسی پر فائز دیکھ کر بہت نازاں ہیں۔ میرا وفد وائس چیئرمین اور رپورٹیر کا بھی خیر مقدم کرتا ہے۔ آپ جیسے تین عالموں کا اجتماع ایک اچھا شگون ہے۔

میرا وفد اس متوازن اور تجرباتی طور پر تعمیری سمندری مسودہ قانون کی ستائش اور توصیف کرتا ہے۔ یہ مسودہ قانون محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس سمندری قانون کو بہتر اور ٹھوس بنانے میں کمیشن کے ہر رکن نے اپنی استعداد کے مطابق حصہ لیا ہے جس پر ہر رکن مبارکباد کا مستحق ہے۔ تاہم پروفیسر فرینکوئی خصوصی

www.bhutto.org

مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی محنت، قانونی صلاحیت اور تجربے کے بغیر یہ مسودہ قانون اتنا جامع نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ یہ ہے۔ یہ مسودہ اقوام عالم کے حقائق کی ممکنہ حد تک عکاسی کرتا ہے۔ اس میں خوش اسلوبی سے کوشش کی گئی ہے کہ جدید رجحانات اور ترقیوں کو ان قدیم اصولوں کے اشتراک سے جنہیں زمان و مکان نے ناکارہ بنا دیا تھا، مناسب معاہدہ تشکیل کیا جائے۔

تاہم میرا وفد اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہے کہ ہماری اس رپورٹ کی ستائش ہمیں اس بات کی پابند نہیں بناتی کہ ہم اس مسودہ سے حرف بحرف متفق ہوں۔ اس عام بحث کے مقصد کے پیش نظر میرا وفد اس سطح پر اپنے آپ کو جس حد تک بھی ممکن ہوا اصولوں اور پالیسیوں تک محدود رکھے گا۔ جب آرٹیکل پر تفصیلی بحث ہو گی تو میرا وفد جہاں بھی ضرورت سمجھے گا مداخلت کرے گا۔

بین الاقوامی قانونی کمیشن کی یہ رپورٹ درحقیقت بڑی ہمہ گیر ہے۔ یہ سمندر سے متعلق قانون کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اس کلی اختیارات کی حامل کانفرنس کو نو ہفتوں کے مختصر سے عرصے کے دوران بہت وسیع مضمون کا احاطہ کرنا ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی نے اس سوال کو کہ وہ ممالک جن کی سرحدیں سمندر سے نہیں ملتیں، ان کی سمندر تک کیسے رسائی ہو، ہمارے دائرہ کار میں شامل کر دیا ہے۔ متعلقہ موضوع پہلے ہی بہت پیچیدہ ہے اور اس کے لئے کانفرنس کا پورا وقت صرف ہو سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں مزید ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔

میرا وفد اس یقین کا حامل ہے کہ اگر ہمیں کامیابی سے ہمکنار ہونا ہے تو ہمیں اپنے استدلال کو اس طرح منظم کرنا ہو گا کہ ہم ان موضوعات سے جن کا رپورٹ میں تذکرہ ہے، کیسے عہدہ برآ ہوں۔ یہ بہتر بھی ہے اور تعمیری بھی کہ ہم تھوڑے سے بہت واضح نتائج حاصل کر لیں، بجائے اس کے کہ ہم پر متنازعہ مسئلہ کو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر زیر بحث لاتے رہیں۔

ہمیں ان مسائل کو حل کرنا ہے جو وسیع سمندروں کی سطح زیریں اور بالائی حصوں سے، سمندر کی وسعت کی پیمائش اور اس کی آزادی کے جائزے سے متعلق ہیں۔ مزید برآں ہمیں براعظمی سواحل اور متصلہ منطقوں کی طرف بھی توجہ کرنی ہے۔ پرامن طور پر جہازوں کے گزرنے اور مخالف جہازوں کے تعاقب سے متعلق اصولوں اور حقوق کا بھی تجزیہ کرنا ہے۔ ان پر اور سمندری قوانین کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر نہ صرف ہمیں غور کرنا ہے بلکہ اگر ممکن ہو تو ان کا تصفیہ بھی کرنا ہے۔ بلاشبہ اس کانفرنس کے فیصلے ان ممالک کے لئے جن کی سرحدیں سمندر سے ملتی ہیں، دوہری اہمیت کے حامل ہوں گے۔ بہت کچھ داؤ پر ہے اور بہت سے طاقتور مفادات اس میں شامل ہیں جو ہمیں آزادی کے ساتھ امیدوں کو پروان چڑھانے نہیں دیں گے۔ تاہم یقین اور امید ہمیں محتاط رجائیت کے ساتھ پیش قدمی پر راغب کرتے رہیں گے۔ ہم ماضی کی ناکامیوں سے آگاہ ہیں اور اس کے ساتھ موجودہ دور کے جوہری تقاضوں سے بھی پوری طرح باخبر ہیں جو ہمیں الٹی میٹم دیتے ہیں کہ یا تو اسلحہ کے قوانین کے ساتھ امن کو خوشی سے قبول کر لو یا اس دنیا کو مستقل طور پر قبرستان بنا دو۔

www.bhutto.org

ہمیں اس موضوع پر سیر حاصل قانون کی تدوین کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اس بارے میں دستاویزات کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ انٹرنیشنل لاء کمیشن نے اپنی آٹھ سالہ مسلسل محنت سے سمندروں کے بارے میں تمام قوانین کو اپنے مسودہ میں یکجا کر دیا ہے۔ دستاویزات پر مشتمل مسودہ بڑی حد تک ہمارے کام کو آسان بنادے لیکن کام کی تکمیل کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

قانون سازی کا جو طریقہ میونسپل لاء میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کا من وعن اطلاق بین الاقوامی قانون کے سیاق و سباق پر نہیں ہو سکتا۔ صرف مسلمہ اور تسلیم شدہ قوانین ہی تدوین کا موضوع بن سکتے ہیں۔ نئے قوانین 'ابتدائی اور زیر ترتیب قوانین کی تدوین نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی کوشش خود معیار اور اس معاشرے کے لئے جس میں ان کو رائج کیا جائے گا' دونوں ہی کے حق میں مضر ثابت ہوگی۔ نئے قوانین کو تدوین سے قبل پختگی کا موقع ضرور دینا چاہیے۔ صرف قدیم اور مسلمہ قوانین کی تدوین کی جاتی ہے اور نئے قوانین کو وضع کرنے کا کام ملک کی مقننہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ اگر ہم یہاں عالمی پارلیمینٹ کے قانون سازوں کی حیثیت سے اکٹھے ہوتے تو ہم نئے قانون کے قواعد مرتب کر کے اسے تحریری قانون کی شکل دیتے۔ بین الاقوامی قانون جو موجودہ صورت میں ممکنہ حد تک لامرکزیت کے حامل ہیں' ہمیں مروجہ قوانین کی تدوین کا اختیار دے سکتے ہیں اور اگر تدوین کے معنوں کو اتنی وسعت دے دی جائے تو یہ بے معنی ہو کر رہ جائیں۔ اگر ہم اس قضیہ کو درست تسلیم کرلیں تو بین الاقوامی قانون کے نئے قواعد کو' جیسا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 13 میں درج ہیں' تسلیم تو کیا جا سکتا ہے مگر ان کی تدوین نہیں کی جا سکتی۔

اس بحث کے دوران ہم نے بین الاقوامی قانون کی ترقی اور فروغ کے بارے میں بہت سے فصیح و بلیغ اور دلپسند حوالے سنے۔ وقت بلاشبہ بدل چکا ہے۔ قدیم ادارے اور اقدار اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ناقابل تسخیر مملکتیں جن کے ہاتھوں میں کمزور اقوام کی تقدیر تھی 'اب کمزور اور ضعیف ہو چکی ہیں۔ جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں وہ اب آزاد ہو گئی ہیں۔ اس آزادی نے تاریخ کا دھارا بدل دیا ہے۔ عام صورت حال پیدا کرنے کے لئے انقلابی تبدیلیاں ' انقلابی قوانین کی متقاضی ہیں۔ انسانیت کے مثالی نمونے میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان سے انکار صرف وہی کر سکتے ہیں جو روحانی اور ثقافتی طور پر بے بہرہ ہیں۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ قانون انسانی کارکردگی اور طرز عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تاہم اس کی لامتناہی فطرت کے باعث نئے قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں اور انہیں تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تک یہ مکمل طور پر فروغ پذیر نہ ہو جائیں ان کی تدوین نہیں کی جا سکتی۔

پاکستان کا تمام سمندری قوانین سے گہرا تعلق ہے۔ اس قانون کا ہر حصہ دوسرے حصہ سے اس طرح منسلک ہے کہ وہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک بن کر کل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ پاکستان کے دونوں حصے وسیع ساحل رکھتے ہیں۔ اس کی ماہی گیری ہر دو لحاظ سے یعنی اندرون ملک کھپت اور بیرون ملک برآمد کے لئے اقتصادی اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری ماہی گیری کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور اس

www.bhutto.org

کے فروغ سے نہ صرف بہت سے افراد پر جو اس پیشہ سے وابستہ ہیں بلکہ پوری قوم کی خوشحالی پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ سمندری تہہ اور زیریں علاقہ دونوں کی زیرزمین دولت جدید تکنیکی ذرائع سے تلاش کی جا رہی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سمندر ہی ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کو باہم ملاتا ہے اور قدرت کی اس وسیع قوت کے ذریعے ہم جغرافیائی طور پر ناقابل تقسیم ریاست کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ شاید اس مقصد کے پیش نظر کھلے سمندروں کی آزادی کا تصور ہمارے لئے دوسرے ممالک کی نسبت جن میں بڑی طاقتیں بھی شامل ہیں 'زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

سمندری قوانین کے دو ایسے اہم پہلو ہیں جن کو ضرور ترتیب دینا چاہیے۔ جدلی اصطلاح میں کھلے سمندروں میں آزادی کا اصولی دعویٰ اور ساحلی ملکوں کے علاقائی سمندروں پر حقوق رد دعویٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دو بنیادی اصولوں میں تصادم صرف معیار کا تصادم نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی قانون اور قومی قانون میں، ریاستوں کی آزادی اور بین الاقوامی قانون میں بھی کھلی رقابت ہے۔

ہمارا اوّلین فرض ہے کہ اس تصادم کو دور کریں۔ سمندری قانون کے اہم پہلوؤں میں سے ہر ایک اپنے اپنے حقوق و فرائض کا حامل ہے۔ علاقائی سمندر کی وسعت ساحلی ملکوں کے لئے بےحد اہم ہے۔ درحقیقت یہ ان کی آزادی کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ یہ نظریہ کم وبیش بار تھولس کے وقت سے تسلیم شدہ ہے۔ ساحلی ملکوں کے لئے علاقائی سمندر پر آزادانہ اختیار ان کی سماجی اور اقتصادی خوشحالی اور دفاع کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ حق اگرچہ اصولی ہے مگر قطعی نہیں۔ کوئی حق بھی قطعی نہیں ہوتا حتیٰ کہ ملکوں کے آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق بھی قطعی نہیں ہوتے۔ اس بحث میں علاقائی سمندری پانی کے حق کی تجدید کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے 'اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح کھلے سمندروں کی آزادی کا تصور کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھلے سمندروں کو افراتفری اور طوائف الملوکی کا اکھاڑہ بنا دے۔ کھلے سمندروں کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی امتیاز اور رکاوٹ کے بغیر ہر قوم کے لئے کھلے رہیں۔

یہ آزادی اس قدر اہم ہے کہ 1918ء میں صدر وڈرو ولسن نے اسے اپنے چودہ نکات کا پہلا نکتہ قرار دیا اور اس کی اہمیت میں اتنے سال گزر جانے کے باوجود کوئی فرق نہیں پڑا۔ صدر روزویلٹ اور وزیراعظم چرچل دونوں نے بحراوقیانوس چارٹر میں اس کا جوش و خروش سے اعادہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ آزادی سب اقوام کے لئے اہم ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے اسے قطعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کھلے سمندروں میں جہاز اپنے اپنے ملک کے پرچم لہرانے کے پابند ہوتے ہیں۔ اس طرح بحری قزاقی اور غلاموں کی تجارت بین الاقوامی دائرہ اختیار میں آتی ہے۔ ماضی قریب میں بعض ماہرین نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ متصلہ منطقوں کے اصولوں اور براعظمی ساحل کی بلا روک تحقیق کے حق سے آزادی میں مزید مداخلت کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ کوئی فرد اس مسلمہ اصول کو جھٹلا نہیں سکتا کہ نہ تو سمندروں پر ساحلی ممالک کے مکمل حقوق ہیں اور نہ ہی کھلے سمندروں کی آزادی قطعی حیثیت رکھتی ہے۔ بہرحال

www.bhutto.org

کھلے سمندروں کی آزادی اور علاقائی سمندروں پر حقوق میں مداخلت کو معقولیت کے ساتھ چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

تین میل حد کے اصول کے حق اور مخالفت میں بہت سے دلچسپ دلائل دیئے گئے ہیں۔ روایتی معیار کے حامیوں کا بڑا استدلال یہ ہے کہ تین میل کی حد بھی بین الاقوامی قانون کے تحت تسلیم شدہ ہے اور بین الاقوامی لاء کمیشن کے مسودہ قانون کی شق 3 اس نظریہ کی تصدیق کرتی ہے۔ شق 3 سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں اور اس کی جو تشریح کی گئی ہے 'ایسی ہے کہ جب تک علاقائی دعویٰ کی بنیاد بین الاقوامی قانون کے اصولوں پر نہ رکھی جائے اس کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انٹرنیشنل لاء کورٹ آف جسٹس قانون کی دفعہ 38 (1) ب اس کی حمایت کرتی ہے۔ یہ زوردار مباحث ہیں اور میرے وفد نے غور سے سنے ہیں اور ان کا مطالعہ کیا ہے۔

میرے وفد نے ان دلائل پر بھی جو مسلّم الثبوت ضوابط کے خلاف دیئے گئے ہیں' مساوی توجہ دی ہے۔ وہ جو بارہ میل تک کی سرحدوں کے طالب ہیں ان کے لئے بھی حجت بین الاقوامی قانون کے مسودہ کی شق تین ہی بنتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دفعہ 3 کی متضاد تشریحیں کی جا سکتی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ میرے وفد نے ان وفود کے نظریات کی' جو شق 3 کو یکسر نظرانداز کر کے علاقائی سمندری حدود کو سو میل تک بڑھانے کے خواہاں ہیں' ہمنوائی کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کا مؤقف یہ ہے کہ وہ ان ضوابط کی کس طرح پابندی کر سکتے ہیں جن کی ترکیب و تشکیل میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ وہ ان قدیم معیاروں کو اس بناپر قطعی طور پر مسترد کرتے ہیں کہ یہ قوانین 1703 میں تشکیل پائے تھے۔ آج کے فعال اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ان کی صحت برقرار نہیں رہ سکتی۔ ان کے مطابق تین میل حدود کا تعین اس لئے کیا گیا تھا کہ اس دور میں توپ کے گولے کی مار تین میل تک ہی ہو سکتی تھی۔ اب یہ بات قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ اس لئے اسے موجودہ دور میں حفاظت کی ضمانت نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ کھلم کھلا اور شدت سے مسلّمہ ضوابط کو مندرجہ ذیل اسباب کی بناپر مورد الزام گردانتے ہیں۔

1۔ یہ کہ جب وہ ضوابط مرتب کئے گئے تھے تو وہ سامراجی غلبہ کے زیر اثر تھے' اس لئے ان کی تشکیل میں ان کی آواز شامل نہیں۔

2۔ یہ کہ حفاظت کی خاطر تین میل کی حدود کو یکسر ترک کر دینا چاہئے۔

3۔ یہ کہ اقتصادی ضرورتوں اور حفاظت کی خاطر علاقائی سمندری حدود میں وسعت درکار ہے۔

4۔ یہ کہ علاقائی ضرورتیں اور حالات اسی کے متقاضی ہیں۔

یہ تمام دلائل انتہائی دلکش ہیں۔ لیکن میں یہ کہوں گا اور میرا مقصد محض تردید نہیں بلکہ ان کے دلائل کی چھان بین مقصود ہے کہ بعض مستند افراد کا خیال ہے کہ جب کوئی قوم نوآبادیاتی نظام کے تحت ہوتی ہے تو اس قوم کی رائے کا اظہار اس قوم کے ذریعہ اور اس قوم کی وساطت سے ہو جاتا ہے جو اس پر

www.bhutto.org

حکمرانی کرتی ہے۔ ان کا مزید خیال ہے کہ جب یہی قوم آزادی حاصل کر لیتی ہے تو پھر وہ بین الاقوامی گروہ کی نمایاں اور الگ حیثیت سے رکن بن جاتی ہے اور اس وقت کے تمام بین الاقوامی مروجہ قوانین کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ اگر وہ چند ضوابط کی مخالف ہے تو ان کی ترمیم، اصلاح اور تنسیخ کے لئے اسے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو بین الاقوامی قانون میں سمجھا گیا ہے اور یہ قوم محض اس بنا پر کہ جب یہ قوانین مرتب کیے گئے تھے، وہ بین الاقوامی گروہ کی رکن نہیں تھی انہیں یک طرفہ طور پر مسترد نہیں کر سکتی۔ اگر اس قسم کا طرز عمل قانونی طور پر مباح قرار دے دیا جائے تو بین الاقوامی قوانین کے بارے میں وسیع پیمانے پر مایوسی اور بد دلی پھیل جائے گی۔ اس لئے اسے اس بحث کا موضوع بنانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کانفرنس کے موقع پر وہ ممالک جو مذکورہ بالا نظریہ کے حامی ہیں، وہی آزاد اور خود مختار ممالک ہیں۔ دوسرے ممالک کے درمیان انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ علاقائی سمندری حدود کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اب وہ آزاد ہیں، مکمل طور پر آزاد ہیں اور شق 3 کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اپنی تشریح کے مطابق کر سکتے ہیں۔

تین میل کی سرحد کے نظریہ کے متروک ہو جانے کے بارے میں بہت سے دلائل دیئے گئے ہیں اور اس کی علت غائی یہ بتائی گئی ہے کہ توپ کے گولے کی محدود مار اب ختم ہو چکی ہے۔ جدید سائنس کی ترقی نے متعلقہ ملک کو تحفظ کے لئے علاقائی سمندروں کی حدود کو وسعت پذیر بنانے کا احساس اجاگر کر دیا ہے۔ تین میل کی حدود کا یہ نظریہ کہ یہ توپ کی مار کے فاصلے سے اخذ کیا گیا تھا، تاریخی طور پر محل نظر ہے۔ اس موضوع پر اکتوبر 1954ء میں امریکن جرنل آف انٹرنیشنل لاء نے "تین میل کی حدود کی تاریخی حقیقت" کے زیر عنوان ایک محققانہ مقالہ شائع کیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ تین میل کی حدود کی اساس در حقیقت بحری فرسخ کے اصول پر رکھی گئی تھی۔

توپ کی مار میں انیسویں صدی کے اوائل ہی میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کا تین میل کی حدود پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اگر صرف توپ کی مار کی وجہ سے اور حفاظت کی خاطر تین میل کی حد مقرر کی گئی تھی تو توپ کی مار کی وسعت علاقائی سمندری حدود کی وسعت کا بھی خود بخود باعث بننا چاہیے تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب توپ کی مار میں معتدبہ اضافہ ہو گیا تو بھی تین میل کی حد کے ضوابط ہر قسم کی تبدیلی سے محفوظ رہے۔ مزید بر آں اس سے قبل ہی جب کہ توپ کی مار تین میل تک تھی، ایسے واقعات ہوئے تھے جس کے تحت علاقائی سمندری حدود میں تین میل سے زائد توسیع کی گئی۔ مثال کے طور پر قرون وسطیٰ میں اطالوی ریاستوں نے اپنی علاقائی سمندری حدود کی اساس بیسو فریو کے نظریہ پر سو میل رکھی تھی۔ اس لئے تین میل کی حد کے ضابطہ کو اس بنا پر مذموم اور قابل مذمت نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ اب اس کی حفاظت کرنے کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ اگر تاریخی طور پر توپ کی مار اور تین میل کی حد میں معمولی سا تعلق بھی تھا تو وہ بہت عرصہ پہلے ختم ہو گیا ہوتا۔ اس لئے مؤدبانہ طور پر گزارش ہے کہ اس تعلق کو بہت زیادہ مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تاہم اگر علاقائی سمندری حدود کا واحد یا اہم مقصد صرف دفاعی تقاضا ہے تو اب

www.bhutto.org

اس بین براعظمی بلاسٹک میزائل کے دور میں دو سو میل کی حد بھی بالکل بے معنی ہوگی۔

روایتی علاقائی وسعت کی غلط زمانی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہم اس نظریہ سے کلی طور پر اتفاق کرتے ہیں کہ نئے حالات نئے قوانین کے متقاضی ہوتے ہیں۔ تاہم یہ نئے قواعد مسلمہ معیار سے پیدا ہونے چاہئیں۔ معیاروں کے سلسلہ مدارج میں عام بین الاقوامی قوانین کے ٹھوس اور قابلِ عمل معیار اس عمارت کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس بنیاد کے بغیر آپ کوئی قانونی جواز فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ بڑی خوشی سے بے کار اور دم توڑتے ہوئے اصولوں کو خارج کر دیجئے لیکن اس ترقی پسندانہ بین الاقوامی قانون کی خاطر پرانے مسلمہ قوانین اور سودمند قوانین سے محض اس لئے انحراف نہ کیجئے کہ وہ پرانے قوانین ہیں۔

جنرل اسمبلی کی چھٹی کمیٹی کے گیارہویں اجلاس میں امریکی مندوب کے الفاظ کا اعادہ شاید مفید ثابت ہو' اس لئے میں ان کا حوالہ دیتا ہوں۔

"البتہ یہ استدلال صحیح ہے کہ ہم کسی ضابطے کی محض اس لئے اندھا دھند تقلید نہیں کر سکتے کہ وہ مدت بعید سے چلا آ رہا ہے۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ ایک قانون کو محض اس لئے برقرار نہیں رکھا جا سکتا کہ وہ قدیم ہے اور نہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایک قانون کو محض اس لئے ترک کر دیا جائے کہ وہ بہت پرانا ہے۔ اس کے برعکس یہ قیاس بھی موجود ہے کہ ایک مدت سے تسلیم کیا ہوا قانون اب بھی صحت کا حامل ہو اور اس کے اتنی مدت تک برقرار رہنے کے ٹھوس وجوہ ہوں۔ دنیا کے ضوابط کی مثال اخلاقی ضوابط سے دی جا سکتی ہے جو عرصہ قدیم سے چلے آ رہے ہیں اور اس دور جدید میں بھی صحت کے حامل ہیں۔ حضرت موسیٰ کے "دس احکام" قدیم ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب وہ متروک ہو چکے ہیں۔ قرآن کریم کی ہدایات قدیم ہیں لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہو سکتی کہ آج ان کی صحت برقرار نہیں۔ البتہ اس سے میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ تین میل کے ضوابط "دس احکام" یا قرآن کریم کی ہدایات کی طرح ہیں یا ان کی نوعیت بھی وہی ہے۔ میں پُرزور طور پر مطالبہ کروں گا کہ جو لوگ قواعد میں تبدیلی کی اس بنا پر وکالت کرتے ہیں کہ وہ مدت سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں' ان ہی پر اس کا بار ثبوت ہے کہ یہ قواعد اپنی افادیت کھو چکے ہیں اور ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں خدا کے غیر متبدل قوانین کا انسان کے متبدل قوانین سے تقابل کروں' تاہم میں اس نظریے کا حامل ہوں کہ پرانے قوانین کو محض اس لئے حشو و زوائد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کہ وہ بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ حشو و زوائد کو ثابت کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو ان کی صحت کو چیلنج کرتے ہیں۔ یہ اتنی بھاری ذمہ داری ہے کہ اسے محض فرسودہ بات قرار دے کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔

علاقائی سمندر کی وسعت میں توسیع اقتصادی طور پر بھی حق بجانب ثابت کی گئی ہے۔ ماہی گیروں کے سلسلے میں پاکستانی وفد اقتصادی مسائل پر اپنے نظریات کا اظہار تیسری کمیٹی میں کرنا چاہتا ہے۔ یہاں میں

www.bhutto.org

صرف اس پر اکتفا کروں گا کہ اگر ماہی گیری کے تحفظ کی خاطر کھلے سمندر کی آزادی پر اچانک دھاوا بول دیا جائے تو اس سے مقصد پورا نہیں ہوتا بالخصوص دنیا کے اس حصے میں جو ہم سے متعلق ہے۔ اگر یہ وسعت محض بلا شرکت غیرے اکتشاف اور استفادہ کے تحت کی جائے تب نہ صرف ماہی گیری کی بقا کا مقصد تلف ہو جاتا ہے بلکہ استفادے کی تمنا بھی۔ کھلے سمندر سب کے لئے کھلے ہیں۔ ہر چھوٹی بڑی اور نئی پرانی قوم ان وسائل سے جو آزادی نے فراہم کئے ہیں' پوری طرح استفادہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ دلیل کہ یہ آزادی محض فریب ہے کیونکہ صرف بڑی بحری طاقتیں ہی حقیقی طور پر استفادہ کر سکتی ہیں' شکست خوردہ رویّہ کی علامت ہے۔ قوم کی زندگی عشروں اور نسلوں سے نہیں ماپی جا سکتی۔ وہ قوم جو اپنی معروضی طاقت پر عقیدہ اور اعتماد رکھتی ہیں وہ صدیوں تک کے لئے' اپنے مفادات پر غور و فکر کے ذریعے نظر رکھتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ ممالک جو موہنجوڈارو اور یوپیانی کی قدیم تاریخ کے ورثہ کے امین ہیں ان کے لئے پچاس یا سو سال کی کیا اہمیت ہے۔ اگر امریکہ نے کھلے سمندر کی آزادی کے مسئلہ کی اس وقت حمایت کی جب وہ اس سے پوری طرح استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اور جب وہ اس وقت کی عظیم بحری قوتوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا تو دوسری کئی کمر با حوصلہ اقوام ایسا کیوں نہیں کر سکتیں؟ امریکہ نے اس آزادی کو اس لئے تسلیم کیا تھا کہ اسے اپنی تقدیر آپ بنانے پر کامل بھروسہ تھا۔ ہم بھی اپنی عظمت پر یقین رکھتے ہیں یا ہمیں رکھنا چاہئے اور آج اس آزادی کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس وقت ہم کھلے سمندر کی آزادی سے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں پورا استفادہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت ہم کھلے سمندروں کی آزادی کے تصوّر کو تسلیم کرتے ہیں۔

بعض حلقوں میں یہ بات باعث نزاع بنی ہوئی ہے کہ علاقائی حالات مقامی حدود کی وسعت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں تاہم اس قسم کے رویئے یکسانیت کے اصول کو جو قانون کے لئے بے حد اہم ہوتے ہیں' بے نتیجہ کر دیتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی کا سب سے بڑا مقصد قانون کے سامنے برابری ہے' اصولوں پر عملدر آمد کراتا اور ہر درجہ کے لوگوں کو قانون کا یکساں طور پر پابند بناتا ہے۔ اس اعتبار سے قانون کی حکمرانی قانون کی اطاعت سے استثنیٰ کے تصوّر کو خارج کر دیتی ہے' جس کا اطلاق دوسروں پر ہوتا ہے۔ مطلق انسانی طاقت کے برعکس قانون کی حکمرانی کے تحت میرے اور آپ کے لئے الگ الگ قانون کا اطلاق نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ یہ قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی کے مترادف ہو گا۔

وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قانون کم از کم تین میل اور زیادہ سے زیادہ بارہ میل کی حد تسلیم کرتا ہے اور اس حد کے اندر علاقائی حدود کے تعیّن کی اجازت دیتا ہے' انہوں نے ان لوگوں کے دلائل کا کثیر حصہ اپنا لیا ہے جو علاقائی حدود کی لامحدود وسعت کا دعویٰ کرتے ہیں' اس لئے ان لوگوں کے دیئے ہوئے دلائل کے خلاف بھی اعتراضات جو کہ غیر محدود وسعت کے حق میں ہیں' ان لوگوں کے لئے بھی قابلِ قبول ہیں جو بارہ میل کی وسعت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے لئے بھی جو یہ دلیل دیتے ہیں کہ حد تین

www.bhutto.org

اور بارہ میل کے درمیان ہے۔ عام دلائل کے علاوہ اس خیال کے حامی یہ کہتے ہیں کہ انٹرنیشنل لاء کے مسودہ قانون کی شق 3 کم از کم تین میل اور زیادہ سے زیادہ بارہ میل کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں شق 3 کی متضاد تشریحات ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کیونکہ یہ تمام مسودے کی مرکزی شق ہے۔

تشریحات کے اصولوں کے مطابق مسودہ قانون کی تشریح "ان کے منشا کے مطابق جنہوں نے اسے بنایا ہے" ضروری ہے۔ اگر الفاظ خود ٹھوس اور واضح ہوں، تب ان الفاظ کی فطری اور عام معنوں میں کسی قسم کی تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کمیٹی کے مباحث حتیٰ کہ جنرل اسمبلی کی چھٹی کمیٹی کے گیارہویں اجلاس کے مذاکرات بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ زیر غور مسودہ جہاں تک اس کے مفہوم کا تعلق ہے پیچیدگیوں سے مملو ہے۔ میرے وفد کا یہ مقصد نہیں کہ وہ ایک ممتاز کمیٹی کے مسودہ پر تنقید و تنقیص کا فریضہ سرانجام دے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ شق 3 کی جو تشریحیں کی گئی ہیں، ان میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اس صورت میں صحیح ارادوں کے اظہار کے لئے خارجی اور تاریخی حقائق سے مدد لینا ضروری ہے۔ خارجی حقائق میں سے ریکارڈ اور مذاکرات کی کارروائی سے مدد لی جا سکتی ہے جو مسودہ سے پہلے تھیں۔ انٹرنیشنل لاء کمیشن کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1955ء میں صرف تین میل حد کا ضابطہ ہی بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور صرف اسی ضابطہ کو کمیشن نے ٹھوس اور مؤثر قرار دیا تھا اور اس کا اطلاق سب پر کیا تھا۔

دو اور ضابطوں کی تشریحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

(1) کسی لغویت یا مغائرت یا قانونی دستاویز سے ناموافقت سے پہلوتہی کرنے کا اصول اور

(2) بے موقع اور نامعقول بات کا ارادہ کرنے کے خلاف وجہ قیاس۔

اگر ہم دفعہ تین کا مطلب یہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ کم از کم تین میل اور زیادہ سے زیادہ بارہ میل حد کی اجازت دیتا ہے تو ہم ایک ایسی تشریح کو تسلیم کریں گے جو ہمیں غیر یقینی صورتحال اور افراتفری کی طرف لے جائے گی۔ وہ قانون کے منشا کے خلاف ہو گا۔ قانون کا اولین تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ یقینی حالت کو قائم کرے اور معاشرے کے لئے باضابطہ قواعد مرتب کرائے۔ اگر ہر ملک کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنے وہم و گمان سے تین اور بارہ کے درمیان گھومتا اور جھولتا رہے تو بین الاقوامی قانون غیر یقینی صورت کا شکار ہو جائے گا اور اس سے بے پناہ مشکلات پیدا ہوں گی۔ یہ طریق کار سب کے لئے مضر ثابت ہو گا۔ اس کی ناموافقت اس حقیقت سے واضح ہو جاتی ہے کہ یہ استحکام پیدا کرنے کی بجائے عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔ علاقائی حدود کی ہر زمانی تبدیلی سمندری قانون میں اہم تبدیلی کا باعث بنے گی۔ اس قسم کی تبدیلیاں، ہر لحاظ سے سمندری قوانین میں پیچیدگیوں کا سبب بنیں گی اور نتیجتاً قانون کا پورا ڈھانچہ تغیرات کی زد میں رہے گا۔ تین اور بارہ میل کی حد کے درمیان متواتر تبدیلیاں مثال کے طور پر بر اعظمی منطقوں اور کھلے سمندر کی آزادی پر اثر انداز ہوں گی اور اس کی زد ماہی گیری کے حقوق پر بھی پڑے گی، تاہم اگر متواتر

www.bhutto.org

تبدیلیوں کی اجازت نہ دی جائے اور حد اس کے درمیان رکھی جائے تو یہ ضابطہ قانون کے برعکس ہو گا کیونکہ یہ قانون کے سامنے مواقع اور مراتب کی عدم مساوات کی طرف لے جائے گا' ان لغویات اور مصائب سے پرہیز لازم ہے۔

تاہم میری مؤدبانہ درخواست ہے کہ شق 3 کی شرح کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ قانونی قضیہ کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ یہ حقائق کا کھلا بیان ہے۔ یہ حقیقت کو دوبارہ بیان کرتا ہے اور روایتی بین الاقوامی قانون کے مطابق اس کی قانونی حیثیت کے تعین کو کانفرنس کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔

پاکستان روایتی بین الاقوامی قانون کو جو تین میل کی حد کا ہے' تسلیم کرتا ہے۔ ایسا کرنے میں میرا وفد اپنے مؤقف کی اساس شق 3 پر نہیں رکھتا اور نہ ہی تین میل حد کے حامیوں کے دلائل کو بنیاد بناتا ہے۔ میرا وفد توپوں کی مار کے ضابطے کے حسن و قبح یا اس کی تاریخی اصلیت کا جائزہ لینا پسند نہیں کرتا۔ میرا وفد تین میل حد کے ضابطہ کی پابندی ایک بنیادی سبب کے تحت کرتا ہے۔ ہم اس مسئلہ کو بین الاقوامی قانون اور قومی قانونی تصادم کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ وہ جو زیادہ سے زیادہ سمندری حدود کے خواہاں ہیں' در حقیقت وہ بے جا بین الاقوامی قانون میں مداخلت اور اس کے حق کو غصب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی قانون اور سمندروں کی آزادی پر شدید حملہ کرتے ہیں جو کم سے کم سمندروں کی چوڑائی کو زیر قبضہ رکھنا چاہتے ہیں' وہ در حقیقت ملکی قوانین کے مفادات کو بین الاقوامی قانون کے تابع کرنا چاہتے ہیں۔ کھلے سمندر اختصاصی طور پر بین الاقوامی قانون کے دائرہ میں آتے ہیں جبکہ علاقائی حدود قطعی طور پر ملکی قوانین کے احاطہ میں آتی ہیں۔ بین الاقوامی قانون کو ترقی پسندانہ بنانے کے لئے میرا وفد اس کا حامی ہے کہ کم سے کم علاقائی سمندری حدود تین میل ہونی چاہئیں۔ صرف اس حد کو اقوام متحدہ نے دوستانہ طور پر قانونی حیثیت سے تسلیم کیا ہے۔ اس بارے میں ہم نے بین الاقوامی قانون کی برتری قائم کرنے کے لئے ان کا خلوصِ نیت سے اظہار کیا ہے۔ ہم دوسرے وفود کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس حد کو تسلیم کر کے بین الاقوامی قانون کو ترقی پسندانہ بنانے میں معاون ثابت ہوں۔ ہم زبردستی کی چھینا جھپٹی کی پالیسی پر یقین نہیں رکھتے۔ ماضی میں سامراجی قوتیں دوسرے ممالک پر اپنا تسلط قائم کر لیتی تھیں' اب وہ ممالک مکمل طور پر آزاد ہیں۔ اس پالیسی کی بنیادی خرابی کو جانتے ہوئے سمندروں کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی ہوس کی پیاس کو بجھانے کی پالیسی سے احتراز کرنا چاہئے۔ ہم سیاسی نو آبادیات کے نظریہ پر یقین نہیں رکھتے۔ ہم صرف وہی لیں گے جو قانونی طور پر ہمارا ہے۔ اس سے کسی چیز کے ایک انچ بھی زائد کے خواہ وہ زمین میں ہو یا فضا میں' سمندر میں ہو یا خلا میں' طلب گار نہیں۔

میرا وفد واضح طور پر اس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ہم علاقائی سمندری حدود کو تین میل سے زائد وسعت دینے کے نظریہ کے قائل نہیں۔ ہم اس اقدام پر متفق نہیں ہو سکتے جو بین الاقوامی قانون کا منہ چڑائے۔ اس سے سب کو بالعموم اور ان کو بالخصوص آگاہ ہو جانا چاہئے جو ہمارے جغرافیائی خطے میں

www.bhutto.org

واقع ہیں۔ جہاں تک متصل زون کا تعلق ہے' میرا وفد اس تجویز سے متاثر ہوا ہے کہ بارہ میل کے متصل زون کو جیسا کہ بین الاقوامی لاء کمیشن نے سفارش کی ہے' تسلیم کر لیا جائے لیکن اس ترمیم و تبدیلی کے ساتھ کہ اس میں ماہی گیری بھی شامل ہو۔ یہ تجویز اس لحاظ سے مستحسن ہے کہ اس میں متصادم نظریات کے درمیان سمجھوتے کی 'انصاف کی بنیادوں پر کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے اس تجویز پر میرا وفد نہایت ہمدردی سے غور کرے گا۔

پانامہ کے ممتاز مندوب نے تجویز پیش کی ہے کہ یہ کمیٹی ایک سب کمیٹی قائم کرے جو تاریخی خلیجوں کا جائزہ لے۔ میرے وفد نے اس پر برطانوی وفد کا اعتراض بھی سنا ہے جو خاصا وزنی ہے۔ اس کے باوجود اگر لاطینی امریکہ کے ممالک کی اکثریت ایسی سب کمیٹی کے قیام کی خواہاں ہے تو میرا وفد بھی دوستی اور دوستانہ تعلقات کی خاطر ان کی حمایت کرے گا۔

میرا وفد دنیا کو درپیش مسائل کے بارے میں بے لچک غور و فکر سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ ہم یہاں کشادہ ذہنی کے ساتھ آئے ہیں اور سننے اور سیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس موضوع پر کوئی حرف آخر نہیں کہا گیا اور بے شک ہر جواب پر غور و خوض نئے سوال کا باعث بنتا ہے' اس لئے ہم ہمیشہ اصلاح و تبدیلی کے لئے' 'اگر اصلاح و تبدیلی واقعی درکار ہے' ہر وقت تیار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لامتناہی میں سے عقل کل کسی ایک فرد یا قوم کو نہیں دی۔ ہم سب ایک دوسرے سے سیکھ سکتے ہیں اور ہم اپنے وسائل کو انسانیت کی عام بھلائی کے لئے اور سب کی خوشحالی کے لئے اکٹھا کر سکتے ہیں۔ انسانیت مصنوعی رکاوٹوں اور بے جا تعصبات کے باوجود ناقابل تقسیم ہے اور ہم ایمان اور جوش کے ساتھ ناقابلِ تقسیم انسانی قوت کے لئے جتنی جلد زیادہ سے زیادہ مسرت کے حصول کے لئے کام شروع کر دیں یہ نہ صرف پوری ناقابل تقسیم انسانیت کے لئے مفید ہے بلکہ ہر فرد کے لئے بھی جو اس عظیم کائنات کا حصہ ہے۔

17 مارچ 1958ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بین الاقوامی قانون میں دریا کے ساحلی باشندوں کے حقوق

دریا کے ساحلی باشندوں کے حقوق کے مسئلہ تک حقیقت پسندانہ طریق سے رسائی حاصل کرنے کے لئے قانونی حالت کا جائزہ مددگار ثابت ہوگا۔ بین الاقوامی قانون میں دریا کے زیریں اور بالائی ساحلی باشندوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کے بارے میں بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ کسی ساحلی باشندے کے اس حق کی نفی بین الاقوامی دریا کے پانی کو حسب مرضی نپٹانے اور دوسرے ساحلی باشندوں کے اس حق کا وجود کہ وہ اس طریق سے استفادہ کریں' اس کی تائید پر اس بین الاقوامی گروپ کے اخذ کردہ نتائج میں ملتی ہے جو اس مسئلے سے نپٹتا رہا ہے۔

انسٹیٹیوٹ ڈی ڈرائٹ انٹرنیشنل نے 1911ء کے میڈرڈ اعلان میں کہا ہے کہ کوئی حکومت ان جھیلوں یا دریاؤں کے رخ یا شکل میں تبدیلی کرنے کا حق نہیں رکھتی جو استفادہ کرنے والے ملک سے متصل یا مسلسل ہو اور اس تبدیلی کے باعث اس ملک کو نقصان پہنچتا ہو' بجز اس صورت کے کہ ملحقہ ملک سے اس کی اجازت حاصل کر لی جائے۔ پانی کے استفادہ کے سلسلے میں دوسرے ساحلی ملکوں کی مداخلت کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔

1923ء کی جنیوا کانفرنس کے آرٹیکل نمبر 4 میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ اگر کوئی ریاست اپنی آبی قوت میں ایسا اضافہ کرنا چاہے جس سے کسی اور ملحقہ ریاست کے حقوق متاثر ہو سکتے ہوں تو متعلقہ ریاستوں کو لازمی طور پر باہمی گفت و شنید کرنا ہوگی تاکہ وہ کسی ایسے معاہدے پر پہنچیں جس کے منصوبے پر عملدر آمد ہو سکے۔

www.bhutto.org

1933ء کے مونٹی ویڈیو کے اعلامیہ کے آرٹیکل نمبر 2 میں کہا گیا ہے کہ کوئی ریاست بھی دوسری ساحلی ریاست کے مشورہ کے بغیر بین الاقوامی آبی راستوں کو اپنے صنعتی اور زرعی مقاصد کے لئے تبدیل نہیں کر سکتی کیونکہ کسی قسم کی تبدیلی دوسری ریاستوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس اصول کا اطلاق آرٹیکل نمبر 4 کے تحت دریائی سلسلوں پر بھی ہوتا ہے۔

امریکہ کی عبوری بار ایسوسی ایشن نے نومبر 57ء کو بیونس آئرس کانفرنس میں مروجہ بین الاقوامی قانون کے بارے میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا ہے کہ آرٹیکل نمبر 3 کے تحت ساحلی باشندے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ ایسی تبدیلیوں سے احتراز کریں جو ممکن ہے دوسرے ساحلی باشندوں کے پانی کے استعمال کو نقصان پہنچائے۔ البتہ یہ تبدیلیاں صرف معاہدوں کے تحت یا بین الاقوامی عدالت یا ٹربیونل کے فیصلوں ہی سے عمل میں آ سکتی ہیں۔

نہ صرف مخصوص معاہدوں کی شرائط باہمی حقوق و فرائض کے اصولوں کی مظہر ہوتی ہیں بلکہ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں ساحلی باشندوں نے دلچسپی رکھنے والے ممالک کے احتجاجات کو مسترد کر دیا' دوسرے ساحلی باشندوں کے مساوی حقوق کو نظر انداز کر کے ایک بین الاقوامی دریا کو ترقی دینے کا خود کو غلط طور پر حقدار ٹھہرا لیا۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

1933ء کا برازیل۔ یوراگوئے کا معاہدہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ متعلقہ ریاست ضروری کام جاری نہیں رکھے گی جب تک دوسری ریاست سے معاہدہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا۔

ارجنٹائن۔ بولیویا پیراگوئے کا 1934ء کا معاہدہ مذکورہ بالا دریا کے پانی کے استعمال اور فروغ کے عام معاہدہ میں کئے گئے اقدامات کے تسلیم کرنے کا ذکر کرتا ہے۔

1929ء کا ڈومینی کن ری پبلک آف ہیٹی کا معاہدہ فریقین کے لئے ایک لازمی ثالثی طریق اور حدود کا تعین کرتا ہے اور انہیں بین الاقوامی دریاؤں کے پانی کے ایسے منصفانہ استعمال کا پابند بناتا ہے جس سے ایک دوسرے کی پانی کی فراہمی متاثر نہ ہو۔

1960ء کا سندھ طاس کا معاہدہ بھارت اور پاکستان کے درمیان جس میں مخصوص مقاصد کے لئے عالمی بینک بھی ایک فریق ہے' اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ بھارت نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ مشترکہ دریاؤں کے بالائی علاقے کے پانی کو تبدیل کرنے کا بلا روک ٹوک مجاز نہیں ہے۔

ان بین الاقوامی معاہدوں سے قطع نظر جن کا اوپر اختصار سے ذکر گیا ہے' ایک ملک کے اندر بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ فیڈریشن میں ریاستوں کے مابین بھی حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین دستور اور رواج کے مطابق کیا جاتا ہے۔ بالائی ساحلی باشندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زیریں ساحلی باشندوں کی رضامندی کے بغیر مشترکہ دریا کے پانی کے بہاؤ میں کسی قسم کی مداخلت کریں۔ اس قسم کے ضوابط کی بہت سی مثالیں امریکہ میں موجود ہیں۔ تاہم بھارت کی ریاستوں اور صوبوں سے' جو ہمارا ہمسایہ ملک ہے' مثالیں پیش کرنا شاید زیادہ مفید ہو' کیونکہ بھارت میں صوبوں اور ریاستوں کی ایک فیڈریشن ہے۔

www.bhutto.org

1892ء میں برطانوی ہند کے صوبہ مدراس اور ریاست میسور اپنے اپنے حقوق کے بارے میں تنازعہ کے بعد خاص ضوابط و قوانین پر متفق ہوگئے جو تیرہ دریاؤں کے پانی کے استعمال کے بارے میں طے کئے گئے تھے جن پر میسور بالائی ساحلی ریاست ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حقوق کا دعویدار تھا۔ ان قوانین میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ میسور آبپاشی کا کوئی نیا منصوبہ مدراس کی حکومت سے سابقہ گفتگو کے حوالے کے بغیر 'جو ان کے درمیان ہوئی ہے تعمیر نہیں کرے گا۔

سندھ طاس کمیشن میں جس کے سربراہ سربی گل این راؤ تھے۔ منجملہ دوسرے امور کے قانون کے حسب ذیل اصول طے کئے گئے تھے جن کا پانی کے تعلق سے ریاستوں اور صوبوں پر اطلاق ہوتا ہے۔

(1) اس قسم کے قضیوں کے تصفیہ کا نہایت قابل اطمینان حل معاہدہ کے ذریعہ ہے۔ فریقین نے ہر مسئلہ کے فنی حل کو اس طرح قبول کیا ہے جیسے وہ ایک ہی فریق ہوں اور سیاسی اور انتظامی لحاظ سے غیر منقسم ہوں۔ (میڈرڈ قوانین 1911ء اور جنیوا کانفرنس 1923ء کے آرٹیکل 4 اور 5)۔

(2) اگر ایک بار ایسا معاہدہ ہو جائے تو وہ از خود قانون کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور متعدد فریقوں کے حقوق کا اس وقت تک تحفظ کرتا ہے جب تک کوئی نیا معاہدہ تشکیل نہ پا جائے (ہالینڈ اور بلجیم کے تنازعہ پر انصاف کی مستقل بین الاقوامی عدالت کا فیصلہ)۔

(3) اگر اس قسم کا کوئی معاہدہ موجود نہیں ہے تو مستقل صوبوں اور ریاستوں کے حقوق کے حصص کو منصفانہ طور پر طے کرنا چاہیے۔ ہر ایک کو مشترک دریا سے پانی کا مناسب حصہ ملے۔

(امریکی فیصلہ)

42۔ 1941ء کے لگ بھگ ریاست پٹیالہ نے آبپاشی کے مزید ذرائع کی فراہمی کے لئے دریائے گھگر کا رخ بدلنے کا ارادہ کیا اور بند کی تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔ پنجاب نے خطرہ محسوس کیا کہ تبدیلی کا یہ عمل اس کے موجودہ آبپاشی کے نظام میں مداخلت کے مترادف ہے۔ پنجاب نے وائسرائے سے درخواست کی کہ وہ پٹیالہ سے کہیں کہ بند کو ہٹا لے۔ وائسرائے نے تسلیم کر لیا کہ پٹیالہ کے اس عمل سے زیریں ساحلی علاقوں کے باشندوں کے حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔

دریائی علاقوں میں بیراج اور ڈیموں کی تعمیر پر اعتراض کے سلسلے میں ایک مضبوط قانونی اساس اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جبکہ ان تبدیلیوں سے پانی کے استعمال کا مروجہ طریق متاثر ہوتا ہو۔ بین الاقوامی قانون میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں جن میں پانی کے مروجہ طریق کے تقدس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان معاہدوں کے علاوہ جن میں کم و بیش پانی کے مروجہ طریقوں کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے 'بہت سے معاہدوں میں ایسے تحفظات بھی دیئے گئے ہیں جن کی رو سے جوں کی توں حالت میں کسی قسم کی تبدیلی فریقین میں معاہدہ کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی۔

(پرشیا۔ نیدرلینڈ۔ 1850ء' سویڈن۔ ناروے 1905ء' جرمنی۔ لیتھوانیا 1928ء 'لیتھوانیا۔ پولینڈ 1938ء)۔

www.bhutto.org

چونکہ بین الاقوامی دریاؤں کے پانی کے استعمال کے قوانین ابھی تک منضبط نہیں ہوئے اس لئے ہمیں بین الاقوامی قانونی گروہوں مثلاً انٹرنیشنل لاء ایسوسی ایشن کے کام کو دیکھنا ہے جو اس مسئلے سے عہدہ برآ ہو چکی ہے تاکہ وہ اس جدید سوچ کا تعین کر سکے کہ اس قانون کے کیا اصول ہونے چاہئیں جن کے تابع یہ موضوع ہے اور ایسے قوانین کو جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہیں دریافت کرتی ہے۔

انٹرنیشنل لاء ایسوسی ایشن نے ایسے اصولوں کی تشکیل میں قابلِ تحسین کام سرانجام دیا ہے۔ اس ایسوسی ایشن نے اگست 1960ء میں ہمبرگ کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں باہمی ساحلی ریاستوں کے باشندوں کے تنازعات حل کرنے کے لئے چار مراحل تجویز کیے ہیں۔

(1) - اس نظریہ سے مشاورت کہ مشترکہ دریائی نظام کے مفاد کے لئے اپنے اپنے حصہ پر تصفیہ کیا جائے۔

(2) - اگر باہمی مشاورت سے کوئی معاہدہ طے نہ پا سکے تو اس صورت میں ایک کمیشن قائم کیا جائے اور مسئلہ فیصلے کے لئے کمیشن کے سپرد کر دیا جائے۔

(3) - اگر کمیشن بھی ناکام رہتا ہے تو مسئلہ ثالثوں کو بھیجا جائے۔

(4) - آخری چارہ کار کے طور پر مسئلہ انصاف کی عالمی عدالت میں پیش کر دیا جائے۔

اس قرارداد کا مقصد اس امر کو منوانا ہے کہ ایک ساحلی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی بھی بین الاقوامی دریا کے مروجہ نظام میں ایسی تبدیلی سے اجتناب کرے جو متصلہ ریاست پر اثر انداز ہوتی ہو اور اس کے حقوق پر زد پڑتی ہو' اس کے مشورے کے بغیر اس میں رد و بدل نہ کیا جائے۔

ساحلی باشندوں کے حقوق کے بارے میں قانون بڑی حد تک واضح ہے۔ اس لئے تمام امن پسند ممالک کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے تنازعات جن سے ساحلی باشندوں کے حقوق متاثر ہوں' مذاکرات سے طے کریں۔ یا ایسے معاملات میں یا کسی دوسرے حق کے بارے میں مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں بین الاقوامی قانونی تنازعات کے مسلّمہ تصفیہ شدہ اصولوں کے مطابق ثالثی کے ذریعہ طے کیے جائیں۔ اگر کوئی فریق اپنے اختلافات کو حُسنِ سلوک یا ثالثی کے ذریعے طے کرنے سے انکار کر دے تو پھر اقوامِ متحدہ کے اراکین پر یہ لازم ہے کہ وہ اختلافات کو پُرامن طور پر طے کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق طریق کار کو اختیار کریں۔ جب کسی ملک کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کمزور ہوتی ہے تو صرف اسی صورت میں وہ تنازعات کے تسلیم شدہ' مہذب اور پُرامن طریق کار کو اختیار کرنے سے ہچکچاتا ہے۔

بین الاقوامی امور کے موجودہ سیاق و سباق میں جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے' بجز جنگ کے۔ تمام ممالک کے یہ بنیادی مقاصد ہونے چاہئیں کہ وہ بین الاقوامی قانون کے استحکام کے خواہاں ہوں تاکہ بین الاقوامی امور کے اکھاڑہ سے اشتعال انگیزی اور استبدادیت رخصت ہو جائے۔

24 راپریل 1961ء

www.bhutto.org

اقوام متحدہ کے تاثرات

امن ایک ایسی صورت حال ہے جو طاقت کی عدم موجودگی سے مشخص ہوتی ہے۔ لیکن ایک منظم معاشرے میں طاقت کی مکمل عدم موجودگی انتشار اور طوائف الملوکی کا باعث بنتی ہے۔ انفرادی تعلقات میں طاقت کے استعمال کو معاشرے کے لئے مخصوص کر کے محدود کر دیا گیا ہے۔ طاقت کے استعمال پر معمولی پابندی غلط ہے۔ غلطی کے خلاف معمولی ردِعمل کے طور پر طاقت کے استعمال کی اجازت ہے اور اسے ایک قاعدہ و قانون کی حیثیت حاصل ہے۔

صرف وہی شخص یا افراد معاشرے کی روایت کے خلاف تشدد آمیز کارروائی کرنے کے مجاز ہیں جن کے ذریعہ معاشرے کا نظام چلتا ہے۔ اس طرح "سوشل آرڈر" طاقت کے استعمال کو معاشرے کا اجارہ بنا دیتا ہے اور ایسا کرنے سے اپنے ارکان کے تعلقات کو کنٹرول کر کے پُرسکون رکھتا ہے۔

ابتدائی قانونی طبقہ میں بھی صرف مخصوص افراد ہی کو مخصوص حالات میں متشددانہ اقدامات کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ فرد جس کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے' اسی کو خلاف ورزی کے مرتکب فرد کے خلاف طاقت کے استعمال کا اختیار ہوتا ہے گو قدیم اور ابتدائی دور کے قانون میں اپنی مدد آپ کا اصول کارفرما ہے' تاہم اگر مثال کے طور پر خونی انتقام کی صورت میں کوئی جابرانہ قدم اٹھایا جائے تو اسے جواز کی حیثیت حاصل ہے۔

جدید ریاست معاشرتی نظم کی انتہائی مکمل صورت ہے جس میں طاقت پر کاملاً معاشرہ کا اجارہ ہے۔ ریاست کے اندر انفرادی تعلقات میں صلح جوئی حتی الامکان اپنے انتہائی درجہ پر جا پہنچتی ہے۔

www.bhutto.org

بین الاقوامی قانون اس معنی میں ابتدائی دور کا قانون ہے کہ قانون ایک جابرانہ حکم ہے اور اسے طاقت کے مرکزی ادارے کے ذریعے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس کی نمایاں جابرانہ کیفیت اس کا اپنی مدد آپ پر انحصار ہے۔ اگرچہ سالہاسال سے بین الاقوامی قانون کو مرکزیت حاصل ہو رہی ہے پھر بھی طاقت کے استعمال پر عالمی برادری کو اجارہ حاصل نہ ہو سکا کیونکہ کوئی قانونی نظام ایسا نہیں جس کے تحت الگ الگ ریاستوں کو ایک عالمی ریاست کی صورت میں متحد کر دیا جائے اور وہ اپنی قوت کے تمام ذرائع یعنی اپنی مسلح افواج کو مجتمع کر سکیں اور انہیں عالمی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کے مطابق عالمی حکومت کی سپردگی میں دے دیں۔

اس لئے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا بین الاقوامی قانون کو واقعی سچا قانون کہا جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب معروف و عظیم قانون دان ہانس کیلسن نے میکسم گورکی کے ڈرامے "غرقاب" Sub merged کا حوالہ دیتے ہوئے دیا ہے۔ اس ڈرامے میں میکسم گورکی نے انسانیت کے ان پسے ہوئے طبقات کی تصویر کشی کی ہے جنہیں معاشرہ بے ضرورت سمجھتا ہے یعنی ایسے مرد اور عورتیں جنہیں حشرات الارض سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور جوان کے گھروں میں بکثرت ہوتے ہیں۔ میکسم گورکی نے اس ڈرامہ میں ایک آوارہ گرد پیپل اور ایک زائر لوقا کے درمیان ایک مکالمہ دیا ہے۔ پیپل لوقا سے کہتا ہے۔

سنو زائر! کیا خدا کا وجود ہے؟

اور زائر جواب دیتا ہے۔

"اگر تمہیں اس پر ایمان ہے تو خدا موجود ہے اگر ایمان نہیں تو اس کا وجود نہیں، کیونکہ وجود اسی کا ہے جس کو تم مانتے ہو"

غالباً یہ ان لوگوں کے سوال کا صحیح جواب ہے جو پوچھتے ہیں کہ آیا عالمی قانون کا حقیقتاً وجود ہے۔ اس کا وجود اسی صورت میں ہے جب ہم اس پر ایسا ہی یقین رکھتے ہوں جیسا کسی اور قانون پر۔ حتیٰ کہ مؤثر ترین قومی قانون بھی اسی صورت میں موجود ہوتا ہے یا باقی رہتا ہے جب وہ لوگ جن کا معاشرتی رویہ اس سے نظم پاتا ہے اس پر یقین رکھتے ہیں۔ جہاں تک بین الاقوامی قانون کا تعلق ہے اس کی حدود کی اثر پذیری کے بارے میں کسی شک کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ بجز اس کے کہ معاشرتی نظام ان حدود کو کہاں اور کس طرح متعین کرتا ہے۔

بین الاقوامی سوشل آرڈر ترقی پذیر عالمی قانون کو ایسے ذرائع اور وسائل مہیا کرتا ہے جن سے وہ ایک مؤثر اور مرکزی نظام کے تحت کسی بین الاقوامی مجرم کے خلاف تعزیراتی اقدام کر سکتا ہے۔

اقوام متحدہ نہ تو کوئی برتر ریاست ہے اور نہ کوئی بالاتر مملکت۔ اسے بالادستی کا اختیار حاصل نہیں تاہم اس کا وجود ممبر ممالک کی بالادستی یا سیادت میں دور رس استحقاق کا باعث بنتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ارکان نے باضابطہ طور پر حاکمیت کے بعض انتہائی اہم روایتی اختیارات سے دستبرداری اختیار کر لی ہے مثلاً

www.bhutto.org

جنگ کرنا یا جارحیت کا مرتکب ہونا۔ منشور کے آرٹیکل 2 پیراگراف 4 میں صراحت کہا گیا ہے کہ۔
" تمام ممبر ملک اپنے بین الاقوامی تعلقات میں دھمکی یا کسی ملک کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف طاقت کے استعمال یا اقوام متحدہ کے منافی رویہ اختیار کرنے سے گریز کریں گے۔ "
لہٰذا ممبر ممالک طاقت کے استعمال کی دھمکی دینے کی بجائے اپنے بین الاقوامی تنازعات پُرامن طور پر حل کرنے کے پابند ہیں' تاکہ آنے والی نسلوں کو حتی الامکان کشت و خون اور جنگ کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھا جائے۔

1945ء میں جب سان فرانسسکو کے خوبصورت شہر میں اس عالمی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی تھی' اس وقت سے اس کی اپنی اہمیت اور طاقت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔
بڑی طاقتوں کو ایسے سنگین مسائل کو جن کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے سلامتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں لانے پر مجبور کیا جاتا ہے جن سے عالمی امن اور سلامتی پر اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک تاریخی رجحان ہے جسے بین الاقوامی زندگی کے موجودہ ماحول میں پلٹنا مشکل ہو گا۔
پچھلے چند سالوں کے بحرانوں نے جن میں سویز' لبنان اور حال ہی میں کانگو کے بحران قابل ذکر ہیں' غیر یقینی انداز میں واضح کر دیا ہے کہ اقوام متحدہ کو ایسے معاملات میں اپنے مصالحتی کردار سے محروم نہیں کیا جا سکتا جو عالمی امن و سلامتی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انصاف اور بین الاقوامی قانون کے بلند اصولوں کے مطابق قوموں کے تنازعات کو پُرامن ذرائع سے حل کرنے کے لئے ایسے حالات میں اقوام متحدہ کی مداخلت انتہائی ضروری ہے۔
جنرل اسمبلی کا پندرھواں اجلاس جو حال ہی میں ختم ہوا ہے' اپنے نتائج کے اعتبار سے تاریخی ثابت ہو گا' اولاً اس لئے کہ کئی نئے ممالک بالخصوص افریقہ کے نو آزاد ممالک کو اقوام متحدہ کا رکن بنا لیا گیا ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ جنرل اسمبلی کی کارروائی میں بڑی طاقتوں اور دوسری اقوام کے کئی سربراہوں نے سرگرم حصہ لیا ہے۔
چھوٹے رکن ممالک کو سب سے زیادہ توجہ تنظیم کے فروغ اور اس کو مضبوط بنانے کی طرف دینی چاہیے تاکہ وہ ان کے لئے سلامتی کے ایک مضبوط قلعہ میں بدل جائے اور عظیم طاقتوں سے مغلوب اور ایٹمی تباہی سے خوفزدہ اور ہراساں اس دنیا میں ان کے لئے ڈھال اور روک کا کام دے۔ امریکہ اور روس شاید اقوام متحدہ کے بغیر زندہ رہ سکیں۔ میں نے شاید اس لئے کہا ہے کہ ان دو عظیم طاقتوں کا بھی اس عالمی تنظیم کی چھتری کے بغیر زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔
جہاں تک چھوٹی غیر ایٹمی مملکتوں' افریقہ اور ایشیا اور لاطینی امریکہ کی ریاستوں کا تعلق ہے' وہ یقیناً خود کو اس عالمی معاشرہ کے کسی ثالث اور محافظ کی پناہ کے بغیر طاقتور ملکوں کی سازشوں اور ہوس ملک گیری سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں جس میں چھوٹے ممالک خوف اور شک کی اس دنیا میں پُرامن صلاح مشورہ کے ضمن میں اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کرتے رہے ہیں اور اب انہوں نے یہ کردار ادا کرنا شروع کر

www.bhutto.org

دیا ہے۔

اقوامِ متحدہ میں تمام آزاد ممالک امن جیسے بلند نصب العین کے حصول کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

چھوٹی اقوام بجا طور پر یہ توقع رکھتی ہیں کہ بڑی اقوام جنہوں نے خلا کو فتح کر لیا ہے ہمیں اپنے جذبات اور خود پسندی پر غلبہ پانے کا طریقہ بتائیں گی تاکہ ہم کسی خوف کے بغیر امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔ عظیم طاقتوں کو اگر اقوامِ متحدہ میں چھوٹی طاقتوں کے دباؤ سے آزاد کر کے من مانی کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ مکمل تباہی کا سبب بن جاتیں۔

پچھلے دس سال میں واقعات کی رفتار نے واضح کر دیا ہے کہ جہاں نازک مراحل میں بڑی طاقتوں نے کشیدگی کو بڑھانے اور کم کرنے دونوں ہی صورتوں میں اقوامِ متحدہ کو نظرانداز کیا ہے، وہاں غیر محفوظ چھوٹے چھوٹے ممالک ہی تھے جنہوں نے اپنی حفاظت اور بڑی طاقتوں کی پالیسیوں میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے اس عالمی تنظیم پر زور دیا۔

عظیم تاریخی شخصیتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں جدید باب کا اضافہ کرنے 'سعادت و برکات کا سبب بننے' ابتری پھیلانے یا نفرت و ہراس پھیلانے کے لئے زمانے کی حدود پھلانگتی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم اس مضمحل اور ادھ موئی بیسویں صدی میں کسی قسم کے باب کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیران کن ایجادات نے انسان کو اپنے سیارہ کو چھوڑنے اور اس پر واپس آنے کے قابل بنا دیا ہے؟

دنیا بھر کے عوام مکمل تباہی کے دائمی خوف میں زندہ ہیں۔ چند منٹوں میں شہروں کو تباہ اور کھیتوں کو بنجر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یقین نہیں ہے کہ فی الوقت کوئی ایٹمی طاقت عمداً استحصال اور تباہی کی ایسی جنگ چھیڑ سکتی ہے جسے نہ تو تصور قبول کر سکتا ہے اور نہ ہی چنگیز خاں کا ظلم و ستم تصور میں لا سکتا ہے۔ تاہم حساب کی بھول چوک، غلطی اور اتفاقی حادثے کے ان امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جو تباہی و بربادی کے دروازے کھول سکتے ہیں۔

پندرہ سال سے بڑی طاقتیں تخفیف اسلحہ کی باتیں کرتی رہی ہیں لیکن کیا نتیجہ نکلا؟ معاہدے کے تحت فوج کا ایک ڈویژن بھی توڑا نہیں گیا اور نہ ہی کوئی ٹینک تباہ کیا گیا۔ ہاں مسلح افواج میں اور شاید اسلحہ میں کچھ تخفیف ہوئی ہے۔ لیکن یہ تخفیف کسی معاہدے کے تحت نہیں بلکہ یک طرفہ اقدام کے طور پر عمل میں آئی ہے، اس لئے ان کے یک طرفہ اضافے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تخفیف اسلحہ کے ذریعے عالمی امن کے قیام کے سلسلے میں بلا شبہ مقصد بھی اتنا اہم ہے، جتنے وسائل۔

جنرل اسمبلی کے پندرہویں اجلاس نے تخفیف اسلحہ کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے جو بلا شبہ اہم ترین مسئلہ ہے جس سے انسانیت دوچار ہے اور اگر وہ دباؤ اور کھینچا تانی نہ ہوتی جو اس عالمی "فورم" کی وجہ سے پیدا ہوئی تو ہم یقیناً کسی قسم کی پیش قدمی نہ کر سکتے تھے۔

تسلیم کہ اس سنگین مسئلہ پر کوئی عملی اور ٹھوس اقدام نہیں ہوا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اہم مسئلہ کو ہوا دینے میں جنرل اسمبلی بجائے خود ایک نقطہ ماسکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بنی نوع انسان کی بقا در اصل تخفیفِ اسلحہ اور تباہی کے درمیان ایک دوڑ ہے۔

یہ دوڑ خطرناک اور شدت اختیار کرنے والے بحران کی طرف لے جا رہی ہے اور جیسا کہ میں نے قبل ازیں کہا ہے پچھلے پندرہ سال سے عالمی راہنما اس مسئلہ پر غور و خوض کر رہے ہیں' لیکن انہوں نے دنیا کو جنگ کے خوف سے نجات دلانے کی خاطر تخفیفِ اسلحہ کی طرف رخ کرنے میں سیاسی اور اخلاقی جرأت کے فقدان کا مظاہرہ کیا۔

ہم سب پر یہ عیاں ہے کہ موجودہ فوجی توازن خطرناک ہے۔ یہاں ہم جو چھوٹے ممالک کے نمائندے ہیں' اپنے دلائل اور اخلاقی دباؤ سے پوری طرح لیس ہو کر بڑی طاقتوں کو مستقل اور مضبوط بنیادوں پر قیامِ امن کی تلاش کے لئے مجبور کر سکتے ہیں۔

ہماری اس اپیل اور مساعی کی بہترین اور مناسب جگہ جنرل اسمبلی ہے اور بلاشبہ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس طرح ہم نہ صرف ایک حق کا استعمال کر رہے ہیں' بلکہ امن کے قلعہ کو مضبوط بنانے اور تخفیفِ اسلحہ کے مقصد کے حصول کے ذریعہ ہم اقوام متحدہ کی براہ راست ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

تخفیفِ اسلحہ کو بھی امن کی طرح انسانی ذہنوں سے شروع ہونا چاہیے اور پھر بھلا تخفیفِ اسلحہ کی مساعی کا آغاز کرنے کے لئے جنرل اسمبلی سے بہتر کون سی جگہ موزوں ہو سکتی ہے جہاں ہم عظیم عالمی طاقتوں سے ہتھیار پھینکنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟ دنیا بھر کے لوگ مشرق و مغرب کی کشیدگی ختم کرنے کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کی طرف نظریں لگائے ہوئے ہیں۔

یہ ذمہ داری تمام رکن ممالک کی ہے لیکن سب سے پہلا اور اہم فرض بڑی طاقتوں پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو تباہی کی سمت لے جانے والی راہ سے روکیں۔ ہم یہ باور نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہمیں کرنا چاہیے کہ ہم ناکام رہیں گے۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں' جنرل اسمبلی کو اپنی تمام سیاسی اور اخلاقی قوت سے اس مطالبہ پر اصرار جاری رکھنا چاہئے کہ دونوں فریقوں میں مزید تبادلہ خیالات کے ذریعہ کسی مؤثر بین الاقوامی نگرانی کے تحت تخفیفِ اسلحہ پر عام اور مکمل سمجھوتہ ہو۔

تخفیفِ اسلحہ حقیقی اور مؤثر ہونا چاہئے یعنی۔ نہ کنٹرول کے بغیر تخفیفِ اسلحہ اور نہ تخفیفِ اسلحہ کے بغیر کنٹرول۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے آخری اجلاس میں یہ تجویز پیش کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا اور اس کی متفقہ طور پر تائید ہوئی کہ تخفیفِ اسلحہ کے اقتصادی نتائج کا تفصیلی جائزہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اس قسم کا جائزہ بھی لیا جائے تاکہ عام اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے لئے ہم ضروری اعتماد اور تحفظ کا احساس پیدا کر سکیں۔

www.bhutto.org

یہ حقیقت متعدد نتائج کی حامل ہے کہ دنیا نہ صرف فاصلہ کی اصطلاح میں بلکہ نظریات کے پرچار کے لحاظ سے بھی ایک ہو چکی ہے۔ ایک بات تو طے ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے لوگ زیادہ دیر تک غربت و افلاس اپنے مقدر کے طور پر تسلیم نہیں کر سکتے۔

ایک طرف تو وہ فاقہ کشی کی حدود تک پہنچ چکے ہیں اور دوسری طرف آج وہ ان لوگوں کے نظریات اور امنگوں کی یلغار کے نرغہ میں ہیں جو زیادہ ترقی یافتہ ملکوں اور ان معاشروں میں رہتے ہیں جو متمول ہیں۔ ان کے سامنے نئی راہیں کھل گئی ہیں جو ان کی دبی خواہشات کو حقیقت کا جامہ پہنا سکتی ہیں۔

سامراجی نظام اور غلبہ نے غلامی اور مایوسی کا جو دور ان پر مسلط کر رکھا تھا اس نے توقعات اور احتیاجات کے نئے دور کو جنم دیا۔

یہ صورت حال ایک مثالی موقع اور خطرے کی مظہر ہے اور اس صورت حال کو تعمیری کاموں کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر امیر و غریب کے درمیان موجود اقتصادی تفاوت تیزی سے بڑھتا رہا تو اس سے جو ہمہ گیر مایوسی جنم لے گی' وہ عالمی کشیدگی میں اضافہ کا باعث ہوگی۔ اس بحران کو محض اس لئے اہمیت حاصل ہوئی ہے کہ جنرل اسمبلی میں کم ترقی یافتہ ممالک کا انداز فکر مثبت تھا۔ جنرل اسمبلی میں دنیا بھر کی اقوام اس لئے جمع ہوتی ہیں کہ ان مسائل کو جن سے انسانیت کا مقدر وابستہ ہے' سامنے لایا جائے۔ اگر یہ مشترکہ عالمی پلیٹ فارم نہ ہوتا تو ہر قوم کا راستہ الگ ہوتا اور لوگ غربت و افلاس کے چیلنج کی شدت اور وسعت کا اندازہ نہ کر سکتے۔

جنرل اسمبلی نے تنہائی کے خول کو توڑ کر انسانیت کو اپنی بنیادی اور حقیقی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے۔ اس نے ان اہم مسائل پر عملدرآمد کی نہ سہی لیکن بحث مباحثہ اور غور و خوض کی مشینری تو مہیا کر دی ہے۔ اس نے خیال و فکر میں یکسانیت پیدا کی ہے کہ مسئلہ موجود ہے اور نہایت سنگین ہے۔ تہذیب کی پیش قدمی ہم آہنگ اور مربوط ہونی چاہیے۔

انسانیت صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکتی اگر بعض اقوام تاریخی اسباب کے تحت آگے آ جائیں اور باقی دنیا کو مایوسی' افلاس اور بیماری کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے پیچھے چھوڑ دیں۔ اس کے برعکس ایسے بے توازن جذبات نئے مسائل پیدا کرتے ہیں۔ ترقی صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ پوری انسانیت بحیثیتِ مجموعی پیش قدمی کرے۔ اگر بعض ممالک میں فی کس آمدنی دو ہزار ڈالر یا 550 ڈالر ہے تو اس سے دنیا کو کیا فائدہ جبکہ بنی نوع انسان کی اکثریت نکبت و افلاس میں زندگی بسر کرتی ہے۔ غریب ترین ممالک کی اقتصادی و صنعتی ترقی کا مرکزی مسئلہ ابھی تک معرض التوا میں ہے اور اس کی حیثیت ایک عالمگیر چیلنج کی سی نہیں ہو سکتی۔ جن کے بارے میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پچھلے پندرہ سال سے ہر سال بحث ہوتی ہے اور جو دنیا بھر کے لئے فوری توجہ کا مسئلہ بن گیا ہے۔

جنرل اسمبلی نے سامراجیت کے خاتمے کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کر کے انسانیت کی ایک اور نمایاں اور قابلِ ذکر خدمت انجام دی ہے۔ جب سے اقوامِ متحدہ کا منشور تیار ہوا ہے' تقریباً ہر سال نئے ممالک

www.bhutto.org

اقوامِ متحدہ کے ممبر بنتے ہیں۔ وہ براعظم جسے تاریک کہا جاتا تھا لیکن جس پر آج کل آزادی کی روشنی چمکتی ہے 'جنرل اسمبلی کے آخری سیشن میں ان سترہ نئے ممالک کے اضافہ کا باعث بنا ہے جو آزاد ہو چکے ہیں اور انسانیت کی خدمت کے لئے اپنی جوانی اور توانائی کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں۔

افریقی کئی نسلوں سے غلام تھے۔ آج وہ آزاد اور عالمی برادری کے معزز و محترم رکن ہیں۔ وہ اپنے عظیم ممالک کے عوام کی دانش و تدبر اپنے ساتھ لائے ہیں اور عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی مستقل امن کی مشترکہ جستجو میں شریک ہیں۔ جنرل اسمبلی جس کا آغاز چالیس سے کچھ زیادہ بنیادی ارکان سے ہوا تھا، اب 99 ارکان پر مشتمل ہے اور ان میں سے بیشتر کا تعلق ایشیا اور افریقہ کے برِاعظموں سے ہے۔

لیکن انسانیت کے دل سے خون اس وقت تک رستا رہے گا جب تک تمام لوگ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہمارے دل و دماغ کیا ان کے ساتھ نہیں ہیں جو ابھی تک آزادی اور مساوات کی جدوجہد کر رہے ہیں؟ ممکن ہے کوئی طاقت عوام کی نجات میں تاخیر کردے لیکن ایسی صورت میں قدرت اس سے اس کی گراں قیمت وصول کرتی ہے۔ جنرل اسمبلی بلاشبہ ان غیر حل شدہ مسائل پر بے حد مضطرب ہے۔ اگر اقوامِ متحدہ کی کارکردگی کا تاریک پہلو سے جائزہ لیا جائے تو شاید ان ناقابلِ حصول مقاصد' ناکام امیدوں اور تشنہ مسائل کو اس کی ناکامیوں میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن زندگی کو صرف ناکامیوں ہی سے نہیں بلکہ کامیابیوں سے بھی جانچنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ اقوامِ متحدہ بالآخر ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

ہم پُر امید ہیں اور حالیہ واقعات نے ہماری امیدوں کو مزید تقویت پہنچائی ہے کہ جنگ و جدال سے تھکا ہوا الجزائر جلد ہی اقوامِ متحدہ کا رکن بن جائے گا اور یہ واقعہ بذاتِ خود ایسا ہے جو عالمی امن کے مقصد کے لئے نہایت مفید ثابت ہو گا۔

کسی ملک یا قوم نے اتنی بہادری یا جانبازی سے آزادی کی جنگ نہیں لڑی جس کا مظاہرہ الجزائر کے محبانِ وطن نے کیا ہے اور اس بہادر قوم کو رکن بنانا عالمی ادارے کے لئے عزت و افتخار کا باعث ہو گا۔ ہم ان نئی کوششوں کے مداح ہیں جو اس انسانی مسئلہ کو پُر امن ذرائع سے حل کرنے کے لئے فریقین کی طرف سے جاری ہیں۔ تاریخ کا یہ المناک باب انشاءاللہ جلد ہی اختتام کو پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد دنیا کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ رہ جائے گا جس کے حل سے اب تک گریز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا حل برِصغیر اور ایشیا میں قیامِ امن کے لئے ناگزیر ہے۔ اگر اس مسئلہ کو حل نہ کیا گیا تو ان مہین دھاگوں کو بآسانی توڑا جا سکتا ہے جو توازنِ امن کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ہمارے پاس اس تباہی سے بچنے کے مواقع اور وسائل موجود ہیں کہ ہم تنازعہ کشمیر کو حل کر کے اپنی جائز خواہشات کی تکمیل کر لیں۔

اس تنازعہ کے حل کے بعد ہی اس برِصغیر کے نادیدہ مستقبل کی خوشحالی کا خواب پورا ہو سکے گا۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنے عوام کو اس کرہ ارض پر بہتر زندگی اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے

www.bhutto.org

کے لئے بھرپور اور متحدہ کوششیں کریں۔ کیا اس کے لئے ہم حوصلہ اور جرأت رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس وسائل ہیں' اس لئے ایشیائی عوام اور دنیا بھر کی طرف سے ہم پر اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ اس خنجر کو اپنے دل سے نکال پھینکیں اور اس تنازعہ کو حل کریں جس نے ہمارے مستقبل کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔

تمرد اور طاقت کا گھمنڈ کبھی امن کا باعث نہیں بنتا بلکہ تلوار کے استعمال پر اکساتا ہے۔ اس لئے متعلقہ فریقین اور اقوام متحدہ پر عالمی امن کے ثالث کی حیثیت سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے مخلصانہ اور موزوں کوششیں کی جائیں۔ ورنہ مقدر کی ستم ظریفی شاید ہمیں خود پیدا کردہ تباہی کی طرف دھکیل دے۔ کیا ہم اندھی ضد کو اپنے مقدر پر مسلّط کرلیں گے؟ یہ ان عظیم لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اپنے ممالک کے سربراہ ہیں اور جنہوں نے نیویارک کے عظیم اجتماع میں حصہ لیا تھا کہ وہ ثابت کریں کہ ایسا نہیں ہے اور یہ کہ ہم اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کی قراردادوں میں دیئے گئے عدل و انصاف کے ان اصولوں کے مطابق حل کر سکتے ہیں جن کے تحت انسان کو آزادانہ مرضی کے ذریعہ اپنی منزل کے تعین کا حق حاصل ہے۔

22رمئی 1961ء

www.bhutto.org

چوتھا حصہ

خارجہ پالیسی اور بیرونی معاہدوں کی سیاست

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان ...... بیرونی دنیا کی نظر میں

بیرون ملک ہماری پبلسٹی اخبارات ' ریڈیو ' ٹیلی ویژن ' فلموں اور مطبوعات جیسے مختلف ذرائع ابلاغ سے کی جاتی ہے۔ مزید برآں بیرون ملک ہمارے نمائندے مباحثوں ' سیمیناروں اور لیکچروں کا اہتمام کرتے ہیں جن کی حوصلہ افزائی ان ملکوں میں ہمارے نمائندوں کی طرف سے کی جاتی ہے۔

غیر ملکی پبلسٹی کا چونکہ خارجہ پالیسی سے گہرا تعلق ہوتا ہے' اس لئے آج کل ہم نے اندرون ملک ایسے انتظامات کر رکھے ہیں جن کے تحت وزارت خارجہ اور وزارت اطلاعات میں کامل رابطہ ہے۔

یہ امر حیران کن ہے کہ عالمی رائے عامہ کو پاکستان نے سب سے زیادہ اس دور میں متاثر کیا جب کہ مالی مشکلات کی وجہ سے ہم نے اپنے بعض بیرونی مشنوں سے پریس اتاشی واپس بلا لئے تھے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اندرون ملک ہماری کارکردگی نمایاں تھی اور پاکستان کی کامیابی کا ریکارڈ اس قدر مؤثر تھا کہ دنیا اس ابھرتی ہوئی قوم کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جس نے عزت نفس اور عزت و وقار کو دوبارہ پا لیا تھا اور جو آگے بڑھنے اور عالمی امن میں اپنا کردار ادا کرنے کا عزم کر چکی تھی۔

یہ ہمارا مسلمہ اصول ہے کہ بلند بانگ دعوؤں سے گریز کیا جائے کیونکہ کوئی تشہیر اس وقت تک مؤثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ سچائی کے قریب نہ ہو۔ حکومت اپنی کارکردگی کا ایسا مؤثر ریکارڈ تیار کرتی ہے اور محفوظ رکھتی ہے جس کا دنیا بھر میں فراخدلی سے اعتراف کیا گیا ہے۔ پبلسٹی کسی طور بھی کارکردگی کا بدل نہیں ہو سکتی اور کوئی ملک بھی بیرون ملک اپنا پرچم اتنا بلند نہیں کر سکتا جتنا اندرون ملک ہو سکتا ہے۔

ہماری خارجہ پبلسٹی کا مقصد ایسی بین الاقوامی فضا پیدا کرنے میں مدد دینا ہے جس میں پاکستان اپنے وقار

www.bhutto.org

کو برقرار رکھ سکے اور امن و سلامتی کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں ایسے دوستوں کی ضرورت ہے جنہیں ہماری سلامتی' سالمیت اور خوشحالی سے دلچسپی ہو۔

ہم ان اصولوں کی بنیاد پر مبنی اقوامِ متحدہ سے قریبی طور پر وابستہ ہیں۔ انصاف پر مبنی عالمی امن و سلامتی کے قیام و حصول اور اسے برقرار رکھنے کے لئے اس کے منشور کا حصہ ہیں۔

خارجہ پالیسی کا عمومی مقصد پاکستان کے لئے خیر سگالی کی فضا پیدا کرنا اور ان تصورات کی ترویج و اشاعت ہے جن کا پاکستان علم بردار ہے۔ مزید بر آں اس کا مقصد دوسرے ممالک سے دوستانہ اور ثقافتی تعلقات کو وسعت و فروغ دینا اور ان کے ساتھ صحیح قسم کے تعلقات قائم رکھنے میں حکومت کی مدد کرنا ہے۔

ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں خود کو حالات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی پالیسی کے طریقہ کار کو متوازن بنانے کے لئے گہری سوچ بچار کے ایک مشکل عمل سے دوچار ہونا پڑا۔ کیونکہ ماضی میں اس کا کوئی مقصد یا سمت نہ ہونے کی بنا پر ہمیں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اگر اس شعبے میں کام کرنے والے کارکن اس بات کا واضح شعور رکھتے ہوں کہ اندرون ملک ان سے کیا توقعات وابستہ کی جاتی ہیں تو انہیں مرکز سے واضح لیکن جامع اور مسلسل ہدایات ملنا نہایت ضروری ہے۔

طویل المیعاد بنیادوں پر ہماری خواہش ہے کہ ہم دنیا کے تمام بڑے ممالک کی زبانوں میں پاکستان پر ایک مستند کتاب تیار کریں جو ان ممالک میں مفت تقسیم کی جائے تاکہ بنیادی حقائق اور ہماری تحریکِ آزادی کے پس منظر میں کار فرما فلسفہ صحیح سیاق و سباق میں ان کے سامنے رکھا جا سکے۔

خارجہ پالیسی کے ان مناسب و متوازن انتظامات کے نتائج نہایت واضح ہیں اور یہ محض اتفاق نہیں کہ مصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ کی تصانیف کا انگریزی' فرانسیسی' جرمن' اطالوی' ہسپانوی اور عربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

پاکستان جو 1947ء میں ایک نامانوس نام کے ساتھ' دنیا کے نقشہ پر ابھرا تھا' آج خدا کے فضل و کرم سے اقوامِ عالم کی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کر چکا ہے۔ جیسا کہ میں نے قبل ازیں کہا ہے' پالیسی' کارکردگی کا بدل نہیں ہو سکتی بلکہ اسے ہمارے اندرون ملک سخت جدوجہد اور قربانیوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیے تاکہ بیرون ملک ہمارا وقار بلند ہو اور فروغ حاصل کرے۔ اس لئے ہماری خارجہ پالیسی کی کامیابی کا انحصار ہماری اندرون ملک کارکردگی پر ہے۔

یہ سب کچھ محض ہماری اندرون ملک کارکردگی اور ہر سطح پر ایمانداری' نیز سخت جدوجہد کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ کسی بھی میدان میں کامیابی کا کوئی مختصر راستہ نہیں ہوتا۔

نصب العین کے حصول کے لئے ہمارا اخلاص ہی ملک کے اندر اور بیرونی ملکوں میں ہمارا وقار بڑھائے گا۔ آپ اور ہم بھی بیرونی ملکوں میں پاکستانی بھائیوں کو ایک آزاد ترقی پذیر اور دور بین معاشرے کے باوقار شہریوں کی حیثیت سے سر اونچا کر کے جینے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ معاشرہ پاکستان میں جنم لے رہا ہے۔

20 اگست 1960ء انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز۔ کراچی

www.bhutto.org

خود حفاظتی کے معاہدے اور علاقائی انتظامات

14 را پریل' 1949ء کو واشنگٹن میں نیٹو (معاہدہ شمالی اوقیانوس) کی تنظیم وجود میں آئی تو سوویت یونین نے اپنے حواری ممالک اور کمیونسٹ پروپیگنڈے کی عظیم مشینری کے ذریعے اس پر دو طرفہ حملہ کر دیا اور اس تنظیم کے خلاف پورے زور و شور سے زہر اگلا جانے لگا۔ لیکن 8ر ستمبر' 1954ء کو منیلا میں امریکہ کی زیر نگرانی جنوب مشرقی ایشیا (کہ اس وقت تک اس کی کوئی شکل واضح نہ تھی) کے دفاع کے لئے نیٹو کا مثنیٰ سیٹو (معاہدہ جنوب مشرقی ایشیا) تیار کیا گیا۔

چونکہ دونوں معاہدوں کے اغراض و مقاصد یکساں ہیں' اس لئے سوویت بلاک نے سیٹو کے خلاف بھی اپنے ردِ عمل کا اظہار اسی شدت سے کیا جس شدت سے اس نے اس کے یورپی ہمزاد کے خلاف اظہار کیا تھا۔ روس کی وزارتِ خارجہ نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا۔

"سوویت حکومت منیلا کانفرنس اور جنوب مشرقی ایشیا کے دفاعی معاہدوں کو صرف ایسے اقدامات قرار دیتی ہے جو ایشیا اور مشرقِ بعید کی سلامتی اور ایشیائی اقوام کی قومی آزادی و حریت کے منافی ہیں۔ جن ممالک نے جنوب مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل میں اس نئے فوجی بلاک کی اساس رکھی ہے' وہ اپنے اس اقدام کے مکمل طور پر ذمہ دار ہوں گے جو امن کے استحکام کے منافی ہے۔"

سوویت یونین کے اس شدید ردِ عمل کے ساتھ ساتھ پنڈت نہرو بھی اپنی مخصوص خطابت کے ساتھ شعلے برسانے لگے۔ انہوں نے جارج اورویل کی کتاب "1984ء" سے وجدان حاصل کرتے ہوئے منیلا معاہدے کے بارے میں فرمایا۔

www.bhutto.org

"میرے نزدیک یہ معاہدہ دوہری بات ہے اور دوہری سوچ کے سوا کچھ نہیں"

پاکستان کو ایک دستخط کنندہ کے طور پر اس دشمنی اور نفرت سے آگاہ ہونا چاہیے جو اسے اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے اور اسے ایک بانی رکن کے طور پر اپنی حیثیت کا جائزہ لینا چاہیے۔ اپنی قسمت کسی ایک بلاک سے وابستہ کرنے کا انحصار دو بنیادی مفروضات پر ہوتا ہے۔

(1) بڑی طاقتوں کی کشمکش کے اس دور میں غیر جانبداری ناقابلِ عمل ہے۔

(2) مستقبل قریب میں کسی ایسی مساوی و ہم پایہ تیسری طاقت کے ظہور کا کوئی امکان نہیں جو توازن اقتدار قائم کر سکے۔

پاکستان کے حالیہ مواعید سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کے خالقوں نے غیر جانبدار رہنے کی اہمیت اور تیسری طاقت کے ظہور کے امکانات کو مسترد کر دیا ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کی خارجہ پالیسی پاکستان کی پالیسی سے غیر مشابہ نہیں ہے۔ امریکہ کی نام نہاد دو طرفہ بنیاد پر تعلقات کی پالیسی کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ آہنی پردے سے باہر کی تمام اقوام کو باہمی معاہدوں کے ایسے جال میں پھنسا لیا جائے کہ اگر کیمونسٹ ممالک سے جنگ کی صورت پیدا ہو جائے تو پھر یہ تمام ملک اس میں الجھ جائیں۔

لیکن کسی غیر کیمونسٹ ملک کی جارحیت کے بارے میں امریکی پالیسی مختلف ہے۔ اس صورت میں امریکہ کی خواہش ہے کہ وہ خود کو براہِ راست ملوث نہ کرے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی سعی اخلاقی دباؤ تک محدود رکھے، حالانکہ اس قسم کے واقعات اس سے کچھ زیادہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔

اس ضابطہ و اصول کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے امریکہ نے ٹرائسٹ اور کشمیر جیسے تنازعات میں خود کو زیادہ ملوث نہیں کیا جب تک یوگوسلاویہ کیمونسٹ بلاک میں شامل تھا، امریکہ نے ٹرائسٹ کے بارے میں اطالوی موقف کی حمایت کی۔ لیکن جب ٹیٹو کے سوویت یونین سے اختلافات ہو گئے تو امریکہ نے بڑی ہوشیاری سے ٹرائسٹ کو تقسیم کرنے کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ لیکن کوریا کی کہانی اس سے مختلف اور بہت عام ہے۔ اس لئے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہند چینی کے معاملے میں جنیوا کانفرنس سے پہلے جب تک فرانس اور برطانیہ نے دباؤ نہیں ڈالا تھا، امریکہ نے اس مسئلہ کو زیادہ موثر انداز میں حل کرنے کے لئے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اس طرح جب کشمیر خون میں نہا رہا تھا تو جیفرسن کے امریکہ نے انتہائی لاپروائی اور سرد مہری کا ثبوت دیا اور خود کو الگ تھلگ رکھا۔ حالانکہ کیمونسٹوں کی پہلی ہی گولی پر، خواہ وہ دنیا کے کسی خطہ میں چلتی پورے غیر کیمونسٹ ممالک کے ردِ عمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تاکہ ہمیں سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں نیز طاقتور عوامی جمہوریہ چین کے خلاف پیش قدمی کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ امریکہ نے اپنے سیٹو کے مواعید میں محولہ بالا پالیسی کی سختی سے پابندی کی ہے۔ اس کا کھلا ثبوت وہ خصوصی دفعہ ہے جو معاہدے میں شامل کی گئی ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ "ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا وفد موجودہ معاہدے پر اس مفاہمت یا سمجھوتے کے تحت دستخط کر رہا ہے کہ معاہدے کی دفعہ 4 پیراگراف ایک میں جس جارحیت یا مسلح

www.bhutto.org

حملہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا اطلاق اس کے نزدیک صرف کمیونسٹ جارحیت پر ہوتا ہے لیکن وہ یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ کسی دوسری قسم کی جارحیت یا مسلح حملہ کی صورت میں وہ دفعہ 4 کی شرائط کے مطابق معاہدے کے اراکین سے مشاورت کرے گا۔"

دفعہ 4 ہی معاہدے کی بنیاد ہے اور اس پر تفصیلی بحث بعد میں کی جائے گی۔ اس مرحلہ پر متعلقہ شرائط کا موازنہ نیٹو کی اسی طرح کی شرائط سے کیا جا رہا ہے تاکہ ہنگامی حالات میں "مشاورت" کی صحیح اہمیت کا تعین ہو سکے۔

معاہدہ منیلا کی دفعہ 4 کے پیراگراف میں کہا گیا ہے۔

"اگر فریقین میں سے کسی ایک کی رائے میں اراکین معاہدہ کے کسی علاقہ یا مملکت یا کسی ایسی ریاست یا علاقے جس پر اس دفعہ کے پیراگراف ایک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کی سالمیت یا حدود یا سیاسی آزادی پر مسلح حملہ کا خطرہ ہو' یا مسلح حملے کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے اس پر اثر پڑتا ہو' یا کسی ایسی صورتحال کا سامنا ہو جس سے اس علاقے کے امن کو خطرہ ہو تو فریقین لازمی طور پر آپس میں صلاح و مشورہ کریں گے تاکہ مشترکہ دفاع کے لئے ضروری اقدامات پر متفق ہو سکیں۔"

اس کے برعکس نیٹو کی دفعہ 4 میں کہا گیا ہے۔

"جب کسی فریق کی رائے میں کسی بھی رکن معاہدہ کی علاقائی سالمیت' سیاسی آزادی یا سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو فریقین باہمی صلاح و مشورہ کریں گے۔"

یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ دونوں دفعات غیر مشابہ نہیں ہیں' حقیقت یہ ہے کہ ایک معاہدے کی متعلقہ دفعہ دوسرے معاہدے کے لئے "بیرومیٹر" ہے۔ اس لئے ایک کا غیر مؤثر ہونا قدرتاً دوسرے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتا ہے۔ معاہدہ نیٹو کی قدر و قیمت کا اندازہ گوا کے مسئلہ میں پیدا ہوا تھا' ڈاکٹر سلازار نے دفعہ 4 پر عملدرآمد پر زور دیا لیکن تنازعہ چونکہ غیر کمیونسٹ ممالک کے درمیان تھا' اس لئے ریاست ہائے متحدہ' برطانیہ عظمیٰ اور کینیڈا نے نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے صرف بھارت کو ایک احتجاجی مراسلہ بھجوانے پر اکتفا کیا۔ چونکہ اس قسم کی احتجاجی تحریریں پنڈت نہرو یا کسی دوسرے کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں' اس لئے بھارت نے بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر دفعہ 4 کے تحت "مشاورت" کے نفشا کا منتہا یہی ہے تو پھر اس قسم کی سنجیدہ مشاورت کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اس طرح یہ دفعہ جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں' غیر مؤثر ہو کر رہ جاتی ہے۔

آزاد دنیا کے اس اجتماعی نظام کے واضح تضاد کے مقابلہ میں جو متعدد اقوام کے معاہدہ پر مبنی ہے' سوویت نظام دو طرفہ معاہدوں کے ایک طویل سلسلہ پر قائم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے نزدیک دو طرفہ کمیونسٹ معاہدوں میں کوئی خاص وصف پوشیدہ ہے۔ 13 / مارچ 1949ء کو اس نے نیٹو معاہدہ کے متوقع اراکین کو جو احتجاجی یادداشت بھجوائی تھی' اس میں اس نے سوویت معاہدوں پر مغرب کی تنقید کو پیشگی طور پر رد کرتے ہوئے کہا تھا۔

www.bhutto.org

"تمام عوامی جمہوری ممالک کے ساتھ سوویت یونین کے دوستی اور باہمی امداد کے معاہدے دوطرفہ نوعیت کے ہیں۔

یہ دلیل اس حقیقت کو نظرانداز کر دیتی ہے کہ جب سوویت یونین اور اس کے حواری ملکوں کے درمیان دوطرفہ معاہدوں کو یکجا کیا جائے تو ان سے ایک ناقابلِ شکست جال تیار ہوتا ہے جو انہی ذمہ داریوں کا حامل ہے جو متعدد اقوام کے دوطرفہ معاہدے رکن ممالک پر عائد کرتے ہیں۔"

اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق اجتماعی سلامتی کے معاہدے "ذاتی دفاع" یا "علاقائی انتظامات" کے ذیل میں آتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے منشور پر کم سے کم حسب ذیل دو قوی وجوہ کی بناء پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(1) اقوام متحدہ کے منشور کو دوسرے تمام معاہدوں اور سمجھوتوں پر برتری حاصل ہے کیونکہ اس کی دفعہ 103 میں کہا گیا ہے۔

اگر رکن ملکوں پر اقوامِ متحدہ کے موجودہ منشور اور کسی دوسرے بین الاقوامی معاہدے کے تحت عائد ہونے والی ذمہ داریاں باہم متصادم ہوں، تو اقوامِ متحدہ کے منشور کے تحت عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ترجیح اور برتری حاصل ہوگی۔

یہ شرط غیر رکن ممالک کو بھی پابند کرتی ہے کیونکہ دفعہ 2 کے پیراگراف 6 میں کہا گیا ہے۔

"یہ تنظیم اس امر کا اہتمام کرے گی کہ غیر ممبر اقوام بھی جہاں تک بین الاقوامی امن اور سلامتی کا تعلق ہے، ان اصولوں کے مطابق اقدام کریں۔"

(2) اس صورت میں کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کے منافی اجتماعی سلامتی کا کوئی نظام نہ ہو، نیٹو اور سیٹو دونوں، اقوام متحدہ کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں۔ سیٹو کے ابتدائیہ میں کہا گیا ہے۔

"اس معاہدے کے فریق، تمام فریقوں کی مساوی بالادستی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اقوامِ متحدہ کے منشور کے اصولوں اور مقاصد پر ایمان رکھتے ہیں اور تمام اقوام اور حکومتوں کے ساتھ امن سے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کے مطابق، وہ اقوام کے مساوی حقوق کی تائید کرتے ہیں.........."

مزید برآں اسی معاہدے کی دفعہ ایک میں کہا گیا ہے۔

"اس معاہدے کے ارکان، جیسا کہ اقوامِ متحدہ کے منشور میں قرار دیا گیا ہے یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی ایسے تنازعہ کو جس میں وہ ملوث ہوں، پُرامن ذرائع سے اس انداز میں حل کریں گے کہ بین الاقوامی امن، سلامتی اور انصاف کو کوئی خطرہ نہ ہو اور وہ اپنے عالمی تعلقات میں اقوامِ متحدہ کے مقاصد کے برعکس کسی دھمکی یا طاقت کے استعمال سے گریز کریں گے۔"

اس لئے بنیادی طور پر یہ ضروری ہے کہ اقوامِ متحدہ کے منشور کے "ذاتی تحفظ" سے متعلق ساتویں

باب اور علاقائی انتظامات سے متعلق آٹھویں باب کی شرائط کا جائزہ لیا جائے۔ بین الاقوامی سیاست کے وقائع اور تاریخ کی روشنی میں خود حفاظتی کے معاہدوں اور علاقائی انتظامات میں خط فاصل کو واضح کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ضمن میں بہت سی باتیں گنجلک ہو گئی ہیں اور الجھ گئی ہیں لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں خط امتیاز کھینچنے کی اشد ضرورت ہے۔ "ذاتی تحفظ" کے معنی یہ ہیں کہ اپنے حق کی حفاظت یا اس میں دوسرے کی مداخلت کو روکنے کے لئے دوسرے کے حقوق کی خلاف ورزی کرنا۔ اس حق کو ایک ایسے بین الاقوامی قانون کے تحت تسلیم کیا گیا ہے جس کی حیثیت آفاقی ہے اور جس پر کوئی معاہدہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ان گنت قانون دانوں کی رائے ہے کہ یہ ایک ایسا فطری و پیدائشی حق ہے جسے صرف معاشی طریق نے ہی جسے قانون کہتے ہیں، تسلیم نہیں کیا بلکہ اخلاقی ضوابط اور مذہب نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مثلاً اسلام ذاتی تحفظ کے حق کو صاف صاف تسلیم کرتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔ (سورہ بقر آیت 190 - 194)

"خدا کی راہ میں لڑو' ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں لیکن حد سے مت بڑھو کہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ اور انہیں قتل کرو جہاں تم انہیں پاؤ اور انہیں اس جگہ سے نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا کہ ظلم استبداد قتل سے بدتر ہے۔ مگر ان سے مسجد حرام میں مت لڑو اور جب وہ لڑیں تو انہیں قتل کر دو کہ ایمان کے دشمنوں کی یہی سزا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہتھیار ڈال دیں کہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔"

"اور ان سے اس وقت تک لڑو جب تک ظلم و استبداد ختم نہیں ہوتا۔ عدل و انصاف ایمان کی حکمرانی اور خدا کا دین قائم نہیں ہو جاتا۔ لیکن اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو پھر ان کے سوا کسی سے دشمنی نہ رکھو جو ظلم کرتے ہیں۔"

"حرمت والا مہینہ ہے بعوض حرمت والے مہینے کے اور یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں اور یہ قانون مساوات ہے۔ اگر کوئی تمہارے خلاف حد سے تجاوز کرے تو تم بھی اسی طرح اس کے خلاف زیادتی کر سکتے ہو۔ لیکن خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ان کے ساتھ ہے جو خود پر قابو رکھتے ہیں۔"

اپنی حفاظت کا حق اس قدر بنیادی ہے کہ امریکی وزیر خارجہ مسٹر کلوگ نے 1928ء کے پیرس کے معاہدے کی دفعہ ایک پر اعتراض کیا جس کا تعلق "اپنی حفاظت" کے حق کو کچھ مشروط کرنے سے تھا اور جس میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ دستخط کنندگان ایک دوسرے سے اپنے تعلقات میں قومی پالیسی کے طور پر جنگ سے دستبردار ہونے کا اعلان کریں۔

مسٹر کلوگ نے اپنے موقف پر اصرار کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہا کہ اپنی حفاظت کا حق "ہر خود مختار مملکت کا فطری حق ہے اور ہر معاہدے کا لازمی جزو ہے۔ ہر قوم کسی بھی معاہدے کی شرائط سے قطع نظر اپنی حدود کے دفاع کے لئے ہر وقت آزاد ہے اور وہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے کہ حالات "اپنی

www.bhutto.org

حفاظت" کے لئے جنگ کا راستہ اختیار کرنے کے متقاضی ہیں۔"

چونکہ ذاتی تحفظ کے حق کی توجیہ ہر قوم خود کرتی ہے اور اس میں بہت لچک ہے اس لئے اقوام متحدہ کے منشور میں دفعہ 51 کے ذریعے مسلح افواج کے استعمال کے حق کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

"موجودہ منشور میں کوئی چیز بھی اقوام متحدہ کے کسی رکن ملک پر مسلح حملہ کی صورت میں اپنی حفاظت کے انفرادی یا اجتماعی حق کو اس وقت تک محدود یا کمزور نہیں کرے گی جب تک سلامتی کونسل بین الاقوامی امن اور تحفظ کی برقراری کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھالیتی۔ اقوام متحدہ کے ارکان اپنے حق کو استعمال کرنے کے لئے جو بھی اقدام کریں' وہ ان سے سلامتی کونسل کو فوراً آگاہ کریں گے اور ان کے اقدام موجودہ منشور کے تحت کسی بھی طور پر سلامتی کونسل کے اختیارات اور فرائض پر اثرانداز نہیں ہوں گے۔ وہ جب چاہے' عالمی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے یا ان کی بحالی کے لئے ضروری کارروائی کر سکتی ہے۔"

اس طرح اس دفعہ کے تحت "مسلح حملہ" کی صورت میں اپنی حفاظت کے حق کی توثیق کی گئی ہے اور اس ضمن میں کہ یہ حملہ کسی ممبر ملک کی طرف سے ہو یا غیر ملک کی طرف سے کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔

البتہ جس ملک پر حملہ ہوا ہے' اسے اقوام متحدہ کا ممبر ہونا چاہیے۔ لیکن اگر اپنی حفاظت کا حق فطری حق ہے تو غیر ممبر ملک کو بھی اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ہرچند کہ دفعہ 51 ایک غیر ممبر ملک کی اپنی حفاظت کے ضمن میں خاموش ہے لیکن یہ بات مضحکہ خیز ہوگی' اگر یہ کہا جائے کہ اقوام متحدہ کا منشور حملہ کی صورت میں اپنی حفاظت کے قدرتی حق سے غیر ممالک کو محروم کرتا ہے۔ مزید برآں اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ایک ممبر ملک غیر ممبر ملک کے ساتھ کوئی دفاعی معاہدہ نہیں کر سکے گا۔

دفعہ 51 میں "مسلح حملہ" کی اصطلاح خصوصی توجہ کی متقاضی ہے۔ منشور میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ پھر کون ہے جو کسی خاص صورت میں اس بات کا فیصلہ یا تعین کرے گا کہ "مسلح حملہ" ہوا ہے؟ عمومی سوچ کے مطابق یہ فیصلہ وہی ملک کر سکتا ہے جس پر حملہ ہوا ہو۔ اس کے برعکس ایک ملک جو خود ہی منصف ہو اپنے داخلی امور میں کسی بیرونی طاقت کی معمولی سی مداخلت کو بھی "مسلح حملہ" قرار دے سکتا ہے۔ وہ اپنی حدود میں انقلابی گروہ کی مالی اور اخلاقی مدد کو بھی مدد کرنے والے ملک کی امداد کو "مسلح حملہ کا نام دے سکتا ہے"

لیکن دفعہ 51 کا سب سے زیادہ نمایاں اور دوررس اثر یہ ہے کہ "ویٹو" غلط بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اس دفعہ کے تحت کسی بھی ملک کو اس وقت تک اپنے دفاع کے لئے مسلح جنگ کی اجازت ہے جب تک کہ سلامتی کونسل "عالمی امن و سلامتی کے لئے ضروری اقدامات نہیں کرتی۔"

چونکہ کسی بھی ملک کو کسی پیشگی احتیاط کے بغیر اپنے دفاع کے لئے ہتھیار رکھنے کی اجازت ہے' اس

www.bhutto.org

لئے سلامتی کونسل میں کوئی بھی طاقت اپنے مخصوص مفاد کے تحت حملہ کا ہدف بننے والے ملک کی مدد کے لئے ضروری اقدام کے فیصلہ کو ویٹو کر کے کونسل کو مفلوج کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے "ویٹو" کے اس غلط استعمال کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ بیسویں صدی کا نیرو بآسانی روم کو جلا سکتا ہے جب کہ سلامتی کونسل نیویارک میں بحث مباحثہ میں الجھی رہے گی۔

دفعہ 51 جس حد تک طاقت کے محدود استعمال کی اجازت دیتی ہے وہ دفعہ 2 کے پیراگراف 4 کی استثنائی حالت ہے جس میں کہا گیا ہے۔

"تمام ارکان اپنے عالمی تعلقات میں کسی ملک کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف دھمکیوں یا طاقت کے استعمال یا کسی ایسے اقدام سے گریز کریں گے جو اقوام متحدہ کے منشور کے منافی ہو۔"

دفعہ 107 اور دفعہ 53 بھی طاقت کے استعمال کی اجازت دیتی ہیں' اس لئے وہ بھی دفعہ 2 کے پیراگراف 4 سے متصادم ہیں۔ دفعہ 107 اور دفعہ 53 پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔

اپنی حفاظت یا دفاع کے مقابلے میں "علاقائی انتظامات" کی اصطلاح عالمی سیاست کی حالیہ ایجاد ہے۔ ابتدا میں منشور میں اسے اس لئے شامل کیا گیا کہ سیاسی مواعید کے کئے گئے انتظامات اور مشہور زمانہ "منروڈاکٹرین" جیسے معاہدہ کی تقدیس کا تحفظ کیا جائے۔ جمعیت اقوام کے بارے میں امریکہ کے ابتدائی رویہ سے یہ بات واضح ہے کہ منروڈاکٹرین کے سلسلے میں امریکہ غیر معمولی طور پر حساس ہے۔ البتہ اب سیاسی توازن میں زبردست انقلاب پیدا ہو چکا ہے اور منروڈاکٹرین نئے معاہدات تلے دب کر رہ گیا ہے۔ لیکن سان فرانسسکو کے اس پرسکون دور میں بہت کم لوگ موجودہ کشیدگی کا تصور کر سکتے ہیں۔

منشور کا آٹھواں باب خصوصیت سے علاقائی انتظامات سے متعلق ہے۔ پیراگراف نمبر 1 کے آرٹیکل 52 میں کہا گیا ہے۔

"موجودہ چارٹر میں کوئی چیز ایسے علاقائی انتظامات یا ایجنسیوں کے وجود کی مانع نہیں جن کا تعلق بین الاقوامی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے سے ہو۔ بشرطیکہ اس قسم کے انتظامات یا ایجنسیاں اور ان کی سرگرمیاں اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق ہوں۔"

"علاقائی انتظامات" کی اصطلاح غیر واضح اور مبہم ہے۔ لفظی معنوں میں یہ جغرافیائی قرابت کو ظاہر کرتی ہے' اس لئے مختلف علاقائی انتظامات میں مفاد کا دائرہ یقیناً جغرافیائی قرابت تک محدود نہیں ہے اور چارٹر کی دفعہ 8 ایسی کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ بلاشبہ آرٹیکل 53 میں یہ اصطلاح کسی بھی ایسے معاہدے کے لئے استعمال کی گئی ہے جس میں بعض ممبر ممالک معاہدے کے فریقین کے جغرافیائی مقام کا لحاظ کئے بغیر دشمن ممالک کے خلاف مشترکہ کارروائی کا وعدہ کریں۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں مصری مندوب نے کہا تھا کہ "علاقائی انتظامات صرف جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہی نہیں ہیں' وہ معاشرتی اور اقتصادی تعاون کے فروغ جیسے وسیع تر مقاصد بھی پورے

www.bhutto.org

کرتے ہیں۔ "

مصر کا نقطہ نظر یہ تھا کہ علاقائی انتظامات کو اپنی روح میں مستقل نوعیت کا ہونا چاہیے۔ اس کے جواب میں امریکی مندوب نے کہا کہ " علاقائی انتظامات " کی اصطلاح کی تعریف کے سوال پر پہلے ہی کافی بحث ہو چکی ہے اور یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس ضمن میں ہمیں منشور کی عام اصطلاح پر عمل کرنا چاہیے ..... اس کی مزید تعریف و توضیح کی کوشش سے لامتناہی بحث چھڑ جائے گی اور بے حد تاخیر ہوگی۔ " علاقائی انتظامات کو کسی قدر تفوق کے ساتھ خود حفاظتی کا معاہدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آرٹیکل 53 کے تحت صریحاً تسلیم شدہ استثنیٰ بن کے آرٹیکل 51 کے تحت طاقت استعمال کرنے کی کیفیت پر محیط ہے۔

منشور کے آرٹیکل 53 میں کہا گیا ہے کہ

" 1۔ سلامتی کونسل، جہاں بھی مناسب سمجھے اپنے اختیارات کے تحت فیصلہ کے نفاذ کے لئے ایسے علاقائی انتظامات اور اداروں کو استعمال کرے گی لیکن فیصلے کے نفاذ کے لئے ان علاقائی انتظامات یا علاقائی اداروں کو دشمن ممالک کے خلاف کسی دوسرے مقصد کے لئے سلامتی کونسل کی صوابدید کے بغیر استعمال نہیں کیا جا سکے گا جن کی تعریف اس آرٹیکل کے پیراگراف 2 میں کی گئی ہے، بشرطیکہ یہ آرٹیکل 107 کے مطابق ہوں یا علاقائی انتظامات میں کسی ایسی ریاست کی طرف سے جارحانہ پالیسی کے اعادے کے خلاف ہوں، جب تک کسی متعلقہ حکومت کی درخواست میں عالمی ادارے پر یہ ذمے داری نہ ڈالی جائے کہ وہ ایسی مملکت کو مزید جارحیت سے روکے۔

2۔ " دشمن ملک " کی اصطلاح جس طرح اس آرٹیکل کے پیراگراف ایک میں استعمال کی گئی ہے، اس کا اطلاق ہر اس ملک پر ہوتا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں موجودہ چارٹر پر دستخط کرنے والے کسی بھی ملک کا دشمن تھا۔ "

ظاہری طور پر یہ آرٹیکل " سلامتی کونسل کی اجازت کے بغیر " اجرائے عمل کی اجازت " صرف دشمن ممالک کے خلاف اقدامات " کی صورت میں دیتا ہے۔ بہرحال اگر اپنا دفاع ایک جبلی و فطری حق ہے تو آرٹیکل کے تحت منظوری کا یہ ایک ایسا استثنیٰ ہے جو آرٹیکل 53 کے تحت سلامتی کونسل کی منظوری کے بغیر " اجرائے عمل " کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے اگر اس توجیہ کو تسلیم کر لیا جائے تو دراصل دو صورتوں میں علاقائی انتظامات کو آرٹیکل 53 کے تحت سلامتی کونسل کی آزمائش سے دوچار ہوئے بغیر " اجرائے عمل " کی اجازت ہے۔ واضح صورت تو دشمن ملکوں کے خلاف کارروائی کی ہے جب کہ دوسری صورت جو اس کے مفہوم میں مضمر ہے، وہ خود حفاظتی کے ضمن میں ہے۔ اگر یہ تجویز درست ہے تو پھر آرٹیکل 53، آرٹیکل 51 کی طرح ویٹو کو الٹا دیتا ہے۔

اس کے باوجود اگر صرف دشمن ممالک کے خلاف اقدام ہی کا استثنیٰ ہے تو آرٹیکل 53 ان ممالک کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے جو علاقائی انتظامات کے اہتمام صرف خود حفاظتی کے لئے کرتے ہیں۔

اس قسم کے حالات میں فریقین کے لئے لازم ہے کہ وہ کسی کارروائی سے قبل سلامتی کونسل کی

اجازت حاصل کریں۔ ایسے کسی بھی موقع پر "ویٹو" براہِ راست اثر کرتا ہے اور اس طرح وہ ضروری اقدامات کی کوشش کو ناکام بنا سکتا ہے۔ اس وقت کے علاوہ علاقائی انتظامات آرٹیکل 54 کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ۔

"سلامتی کونسل کو ان کارروائیوں سے ہر مرحلے پر پوری طرح مطلع رکھا جائے جو بین الاقوامی امن اور سلامتی کے قیام کے لئے علاقائی انتظامات یا علاقائی اداروں کے تحت کی جارہی ہوں یا زیرِ غور ہوں۔"

یہ شق علاقائی انتظامات کے ان ارکان کے لئے ناقابلِ فہم پریشانی کا سبب بن سکتی ہے جو اپنی تمام سکیموں اور اعداد و شمار کا سلامتی کونسل میں اپنے ممکنہ جارح کے سامنے انکشاف کو پسند نہیں کرتے 'اس قسم کے علاقائی معاہدے کے ایک ایسے طربیہ کھیل میں بدل جانے کا بھی امکان ہے جو صرف دشمنوں کی تفننِ طبع کا باعث ہوگا۔

مزید برآں کسی علاقائی معاہدے کا ایک رکن کسی ایسے دشمن ملک کی مدد نہیں کر سکتا' جو کہ علاقائی معاہدے کا رکن ہو اور اس پر اقوامِ متحدہ کے کسی رکن نے حملہ کیا ہو۔

جب یوگوسلاویہ روس کے زیرِ نگیں تھا تو ایسا کوئی امکان قابلِ تصور نہ تھا۔ اس دور میں سوویت یونین ٹرائسٹ کے بارے میں اٹلی کی کارروائیوں کو امن و سلامتی کے مفاد کے منافی قرار دے سکتی تھی اور چارٹر کے آرٹیکل 107 کے تحت اس کے خلاف کارروائی کر سکتی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ۔

"موجودہ منشور میں کوئی امر بھی ایسے ممالک کے بارے میں' جو دوسری جنگِ عظیم میں اور چارٹر کے دستخط کنندگان میں سے کسی کے بھی دشمن تھے' کسی بھی ایسی کارروائی کو بے ضابطہ یا باطل قرار نہیں دیتا جو جنگ کے نتیجے کے طور پر اس اقدام کی ذمہ دار حکومت نے کیا ہو۔"

اگر علاقائی معاہدے اقوامِ متحدہ کے اصولوں اور مقاصد کے تابع ہیں اور "سیٹو اور نیٹو" جیسی تنظیموں کو علاقائی معاہدے قرار دیا جائے تو یہ بات مشکوک لگتی ہے کہ آیا نیٹو ممالک ایسی صورت میں ایک رکن معاہدہ ملک اٹلی کی مدد کر سکتے تھے۔

اس لئے فیصلہ کن اور نازک سوال نیٹو اور سیٹو معاہدوں کے صحیح کردار کا تعین ہے۔ اگر یہ علاقائی معاہدے ہیں تو انہیں ان پابندیوں کو پورا کرنا چاہیے جو منشور ان پر عائد کرتا ہے۔ اگر اس کے برعکس وہ خود حفاظتی کے معاہدے ہیں تو چارٹر انہیں اصل مقاصد کی تکمیل کے لئے وسیع مواقع مہیا کرتا ہے۔

شمالی اوقیانوس کے معاہدے کی دفعہ 5 میں نہایت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ۔

"فریقین متفق ہیں کہ ان میں سے یورپ یا شمالی امریکہ میں واقع کسی ایک یا زیادہ ملکوں کے خلاف مسلح حملہ ان سب کے خلاف حملہ سمجھا جائے گا اور نتیجتاً وہ متفق ہیں کہ اگر کوئی ایسا مسلح حملہ ہوا تو ان سب میں سے ہر ایک اقوامِ متحدہ کے آرٹیکل 51 کے تحت انفرادی یا اجتماعی خود حفاظتی کے تسلیم شدہ حق کا

استعمال کرتے ہوئے شمالی اوقیانوس کے علاقہ کی سلامتی بحال اور برقرار رکھنے کے لئے انفرادی طور پر یا دوسری پارٹیوں کے ساتھ مل کر ایسے حملے کا شکار ہونے والے ملک یا ملکوں کی مدد کے لئے فی الفور ضروری اقدامات کرے گا جن میں مسلح افواج کا استعمال بھی شامل ہے۔

ایسا کوئی مسلح حملہ یا اس کے نتائج میں کئے جانے والے اقدامات سے فوری طور پر سلامتی کونسل کو آگاہ کیا جائے گا اور یہ اقدامات اس وقت ختم کر دیئے جائیں گے جب سلامتی کونسل امن کے قیام اور بحالی کے لئے ضروری اقدامات کرے گی۔ "

شمالی اوقیانوس کے معاہدے کی دفعہ 5 کا دوسرا حصہ اس حقیقت کے پیش نظر قطعاً غیر مفید ہے کہ سلامتی کونسل کو "عالمی امن اور سلامتی کے قیام و بحالی کے لئے ضروری اقدامات کو ویٹو کے ذریعے روکا جاسکتا ہے۔ "

اس لئے شمالی اوقیانوس کا معاہدہ عمداً چارٹر کے آرٹیکل 51 پر انحصار کرتا ہے اور ایسی کسی صورت کی شمولیت سے احتراز کرتا ہے جسے چارٹر کی دفعہ 53 کے مطابق معنی پہنائے جاسکیں جو معاہدہ کے ارکان کو اس امر کا پابند بناتے ہیں کہ "سلامتی کونسل" کو علاقائی معاہدوں یا علاقائی اداروں کی طرف سے عالمی امن و سلامتی کی بحالی کے لئے کئے جانے والے اقدامات سے پوری طرح باخبر رکھا جائے۔ "

آرٹیکل 54 کی گرفت سے بچنے کے لئے شمالی اوقیانوس معاہدے میں اہتمام کیا گیا ہے کہ معاہدے کی دفعہ 3 کو علاقائی معاہدوں پر چارٹر کی لگائی ہوئی پابندیوں سے باہر رکھا جائے۔ شمالی اوقیانوس کے معاہدے کے آرٹیکل 3 میں کہا گیا ہے کہ

"اس معاہدے کے مقاصد کے مؤثر حصول کے لئے فریقین فرداً فرداً یا مشترکہ طور پر مسلسل اور مؤثر اپنی مدد آپ اور باہمی امداد کے ذریعے مسلح حملہ کی انفرادی اور اجتماعی صلاحیت کو برقرار رکھیں اور فروغ دیں گے۔ "

اگر یہ شق آرٹیکل 54 سے مشروط ہوتی تو پھر یہ شمالی اوقیانوس معاہدے کے شریک ممالک کے لئے غیر مفید اور پریشان کن ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ محض ایک اتفاق نہیں ہے کہ شمالی اوقیانوس معاہدے نے عمداً چارٹر کے ساتویں باب کی حدود میں رہنے کو پسند کیا ہے اور ساتھ ہی یکساں احتیاط کے ساتھ اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ وہ آٹھویں باب کی گرفت میں نہ آئے۔

معاہدہ منیلا میں باب 7 آرٹیکل 51 یا باب آٹھ کا واضح طور پر کوئی ذکر نہیں۔ البتہ معاہدے کا آرٹیکل 4 اس کے آرٹیکل 51 کی طرف جھکاؤ کا تاثر دیتا ہے۔ شمالی اوقیانوس معاہدہ سے مقابلہ کرتے ہوئے بعض لوگ مؤخر الذکر معاہدہ کو "بے ضرر" قرار دیتے ہیں۔ تاہم معاہدے کی تمام تر قوت کا انحصار کاملاً مختلف اقوام کے سیاسی اعتقادات پر ہے۔

منیلا معاہدہ کا قطعی مخالفانہ رد عمل متعلقہ بلاکوں کے بنیادی رویہ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ بعض غیر کمیونسٹ ملک جن کا کہنا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے معاہدے کے آرٹیکل 4 کی شرائط بے ڈھنگی ہیں اور

ہنگامی حالت میں ردِ عمل کا طریقہ انتہائی تاخیر کن ہے۔

اس کے برعکس روسی مبصرین نے اس آرٹیکل کی شدید مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے تحت شرکا جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے داخلی امور میں کسی بھی وقت اور کسی بھی بہانے مداخلت کر سکتے ہیں۔

تاہم یہ بحث اس سوال پر شرح وبسط سے اظہار خیال کے بغیر نامکمل رہے گی کہ آیا سیٹو اور نیٹو علاقائی معاہدے ہیں؟ کسی خاص بات کی بالعموم دو یا زیادہ منطقی وجوہات ہو سکتی ہیں اور سیٹو جیسا معاہدہ کسی ایسے جائزے سے محفوظ نہیں ہے جو اس کے متعلق بھی ایک سے زائد معانی نہ پہنا سکے مثلاً شمالی اوقیانوس کے معاہدے کو علاقائی معاہدے کے ساتھ ساتھ خود حفاظتی کا معاہدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ برطانوی دفتر خارجہ کے قانونی مشیر سر ایرک بکٹ نے ثابت کیا ہے کہ شمالی معاہدہ اوقیانوس کا اوّلین مقصد اجتماعی خود حفاظتی ہے اس لئے وہ چارٹر کے آٹھویں باب کے تحت نہیں آتا۔

پروفیسر کیلسن نے امریکی جریدے "انٹرنیشنل لاء" میں سر ایرک بکٹ کے نظریہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا

"شمالی اوقیانوس کے معاہدے کو چارٹر کے آٹھویں باب کے معانی کی حدود میں علاقائی معاہدے قرار دینے کے امکانات سے انکار نہایت مشکل ہے۔ یہ نہایت معقول استدلال معلوم ہوتا ہے لیکن اسے واحد ممکنہ تعریف وتوضیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چونکہ چارٹر علاقائی انتظامات کے معاہدے کے تصور کو واضح نہیں کرتا اور خاص طور پر چونکہ آرٹیکل 53 میں اجتماعی خود حفاظتی کی تشریح نہیں کی گئی اس لئے یہ ناممکن نہیں کہ آرٹیکل 51 کے نفاذ کے معاہدے کو علاقائی معاہدے سے مختلف معاہدہ قرار دیا جائے اس لئے کہ چارٹر متعدد امور میں متضاد ومتصادم تشریحات کی اجازت دیتا ہے۔"

پاکستان کو معاہدہ منیلا کی تصدیق سے قبل اس کے تمام اہم نتائج کا پتہ لگا لینا چاہیے۔ پاکستان میں خواہ کتنی ہی خامیاں اور کمزوریاں کیوں نہ ہوں، کسی بین الاقوامی معاہدے سے انحراف اس کا شعار نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک معاہدے کی کئی تشریحات ہو سکتی ہوں لیکن اگر مقاصد واضح ہوں تو اس کی تشریح وتعریف کبھی مبہم نہیں ہو سکتی۔ اس کی کچھ پروا نہیں کہ اس مقدس مقولے "معاہدہ کو لازمی طور پر برقرار رکھا جائے گا" کے مخالف اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

نومبر 1954ء

"ویژن" کراچی

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان اور بیرونی معاہدے

سیٹو، سینٹو اور دولت مشترکہ

صدر ایوب کی حکومت کے آخری دو سالوں میں پاکستان کی دوطرفہ نوعیت کی خارجہ پالیسی کے بارے میں ایک مبالغہ آمیز بحران پیدا کیا گیا تھا۔ 19 / نومبر 1968ء کو سابق وزیر خارجہ میاں ارشد حسین نے اسلام آباد میں اپنی تقریر میں پاکستان کی دوطرفہ خارجہ پالیسی پر اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس خارجہ پالیسی کی وجہ سے اور پابند خارجہ پالیسی سے گریز کی بنا پر پاکستان سرد جنگ کے وسیع اثرات سے محفوظ ہے۔ ایوب خان بھی اس پر مصر رہے کہ پاکستان کے غیر ممالک کے ساتھ تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے کسی بڑی طاقت کو پاکستان سے بدظن ہونے کا جواز نہیں مل سکتا۔ ایسی کامیابی دوسری طاقتوں کی خاطر کسی ایک بڑی طاقت کے حلقہ اثر سے آزاد ہو کر ہی حاصل کی جاتی ہے۔ اس خارجہ پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان عالمی تنازعات میں ملوث ہوئے بغیر، سب ملکوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرلے۔ دفتر خارجہ کی دستاویزات اور فائلوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس دوطرفہ خارجہ پالیسی کو کس کی ہدایات پر اختیار کیا گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہماری انتظامی پالیسی کو ملک کے طاقتور مفادات کی اعانت حاصل ہے اور اس پر کھلا حملہ تکلیف دہ ہوگا، میں نے انتہائی عزم و احتیاط سے اس پیچیدہ اور کٹھن مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان نے اوپر جو دوطرفہ سیاسی اور فوجی معاہدے عائد کر رکھے تھے، ان کی روشنی میں ہماری خارجہ پالیسی کو جانچا جاتا تھا۔ ہماری خارجہ پالیسی انتہائی کٹھن کا شکار ہو چکی تھی اور اس میں فوری تبدیلی کی ضرورت تھی۔ معاشی کنسورشیم کے سلسلہ میں ہم نے جو دوطرفہ معاہدے اور پابندیاں اپنے اوپر عائد کر رکھی تھیں، وہ ہمارے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہو

www.bhutto.org

سکتی تھیں۔ میں نے اسی نکتے کو مرکز توجہ بنا کر اپنے کام کا آغاز کیا۔

کنسورشیم کے خلاف قدم اٹھانے کا موقع دسمبر 1965ء میں صدر ایوب کے یورپ اور ریاست ہائے متحدہ کے دورے کے وقت غیر متوقع طور پر پیش آ گیا۔

واشنگٹن کے سفارتخانے میں ڈنر کے موقع پر جارج وڈز سے کنسورشیم کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوا۔ مسٹر جارج وڈز کو یوجین بلیک کی جگہ عالمی بینک کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے گفتگو کے دوران اس امر پر خدشے کا اظہار کیا کہ کہیں کنسورشیم اپنے مقاصد کے سلسلہ میں بدنام تو نہیں ہو چکا؟۔ میں نے مسٹر وڈز کی بے تکلف گفتگو کو سراہا اور بحث کو کسی نتیجے تک پہنچانے کے لئے کہا کہ بحیثیت مجموعی دو طرفہ معاہدوں سے زیادہ کشادگی اور بہتر نتائج پیدا ہوتے ہیں جبکہ چو طرفہ معاہدوں سے سوائے پیچیدگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

واشنگٹن میں صدر ایوب اور صدر جانسن کی کئی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ صدر جانسن کا انداز گفتگو سخت تھا اور انہوں نے صدر ایوب کو سرزنش بھی کی۔ صدر ایوب نے اس رویئے سے بہت اثر لیا۔ جب ہم واپسی میں دو دن کے لئے بون میں ٹھہرے تو پاکستان کے کچھ سفارتی نمائندے بھارت کے ساتھ جنگ کے زمانے میں صدر ایوب کی قیادت کو سراہنے کے لئے جرمنی کے دارالحکومت میں جمع ہو گئے تھے۔ ان سفارتی نمائندوں میں بون میں پاکستان کے سفیر صدر ایوب کے بہنوئی بھی موجود تھے۔ ان ہم مزاج سفارتی نمائندوں کی خوشگوار گفتگو نے صدر ایوب کو بہت حوصلہ بخشا اور ان کا اعتماد قدرے بحال ہو گیا۔ بون سے روانگی کی رات سے پہلے صدر ایوب نے مجھے اور وزیر تجارت مسٹر غلام فاروق کو ملکی معاملات پر تبادلہ خیالات کے لئے طلب کیا۔ مسٹر غلام فاروق نے پاکستان کے وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب کی پالیسیوں پر تند و تیز اور سخت نکتہ چینی کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صدر ایوب نے اپنے وزیر خزانہ کے خلاف تنقید پر کان دھرنے کی زحمت گوارا کی۔

جب مسٹر فاروق اپنی بات ختم کر چکے تو میں نے صدر ایوب کو یاد دلایا کہ میں شروع سے ہی مسٹر شعیب کی پالیسیوں سے مشکوک رہا ہوں اور اپنے خیالات کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مسٹر شعیب کا خیال تھا کہ کنسورشیم ان کی بہت بڑی اور قابل فخر کامیابی ہے۔ میں نے صدر ایوب کو مطلع کیا کہ اس وقت ہمارے لئے ناگزیر ہو گیا ہے کہ کنسورشیم کے بارے میں اپنی پالیسیوں پر نظرثانی کریں کیونکہ عالمی بینک کے صدر نے ہی اس کی افادیت کے بارے میں شک کا اظہار کیا تھا۔ میں نے صدر ایوب کو واضح طور پر بتایا کہ ہم نے اپنے آپ کو جن چو طرفہ معاہدوں اور پابندیوں میں جکڑ لیا ہے۔ میں اس سلسلہ میں انتہائی پریشان ہوں۔

اس موضوع پر ایک بار پھر ایک اور غیر ملک میں گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ جنوری 1966ء میں جب ہم تاشقند جا رہے تھے تو ہم نے کابل میں قیام کیا۔ نجی گفتگو کے دوران سابق صدر ایوب خان نے افغانستان کی ان کاوشوں کو سراہا جن کی بدولت اس نے آج تک اپنی آزادی اور خود مختاری پر آنچ نہ

www.bhutto.org

آنے دی تھی۔ اس گفتگو کو اپنے نکتے پر لانے کے لئے میں نے صدر کو بتایا کہ افغانستان برطانوی چیرہ دستیوں اور زار روس کی ہوس ملک گیری کے درمیان پستے رہنے کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی خارجہ پالیسی کو بدلے۔ مشکلات و مصائب اور خامکاریوں کے کٹھن مراحل سے گزر کر اس نے یہ سبق حاصل کیا تھا کہ وہ دوطرفہ معاہدوں کی خارجہ پالیسی کو اپنا کر اپنی آزادی کو بحال رکھے۔

پاکستان میں واپس آکر میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر دوطرفہ اور چوطرفہ تعلقات پر ایک نوٹ قلمبند کیا۔ مجھے امید تھی کہ بون اور کابل میں جو بیج بوئے گئے تھے' وہ ایک دن ضرور نشوونما پائیں گے۔ اس نوٹ میں' میں نے تجویز کیا تھا کہ حکومت ان تمام امکانات کا جائزہ لے جن کی بدولت چوطرفہ معاہدوں اور پابندیوں سے بتدریج چھٹکارا حاصل کر کے دوطرفہ پالیسی کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کنسورشیم کے نعم البدل کے طور پر دوطرفہ معاہدوں کے ایک سلسلہ کی تجویز پیش کی۔

جب میں ایک کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد تہران سے واپس آیا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میری کوششیں بے کار نہیں گئی ہیں۔ جب میں کراچی پہنچا تو کراچی اس امیدوار کی ناکامی کے سلسلے میں بھانت بھانت کی باتوں سے گونج رہا تھا' جسے قومی اسمبلی کی ایک نشست کے جزوی انتخاب میں سابق صدر نے کراچی سے نامزد کیا تھا۔ میں نے اس صورتحال سے آگاہ کرنے کے لئے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو طلب کیا۔ جب وہ مجھے مطلوبہ معلومات سے آگاہ کر چکا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اس نئے رجحان پر کچھ روشنی ڈالوں جو دوطرفہ تعلقات کی بنیادوں پر استوار کی جا رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے یہ سوال پوچھوں کہ اس کو پوچھ گچھ کی یہ ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے۔ اس نے خود ہی مجھے بتایا کہ صدر ایوب جب پچھلی بار کراچی آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ اب پاکستان کی خارجہ پالیسی دوطرفہ تعلقات پر قائم کی جائے گی۔ چونکہ یہ سرکاری افسر لندن ہائی کمیشن میں تعینات کیا جا رہا تھا' اس لئے وہ اپنے ملک کے وزیر خارجہ سے خارجہ پالیسی کی اس نئی تبدیلی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔

کسی ملک کی خارجہ پالیسی کو اس کی غایت کے حوالے سے دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پرکھ کے لئے ان اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے' جن کے تحت خارجہ پالیسی تشکیل کی جاتی ہے۔ ان اصولوں کی حقیقت تک پہنچنا' کسی پالیسی کی ظاہری صورت سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اگر دوطرفہ معاہدے کی شرائط ریاست کے معروف اصولوں سے متصادم ہوں تو دوطرفہ معاہدوں کی حمایت اپنے آپ باطل ہو جاتی ہے' اسی طرح اگر یہ خدشہ ہو کہ چوطرفہ تعلقات ملک کے حالات اور مفادات کے معیار پر پورے نہ اتریں گے تو انہیں ختم کر دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر آر سی ڈی قسم کے چوطرفہ معاہدے کو اس دوطرفہ معاہدے پر ترجیح دی جائے گی' جو ریاست کی خودمختاری سے متصادم ہو۔ اگرچہ خارجہ پالیسی کی خوبی کا انحصار ان کے مشمولات پر ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف وجوہات و دلائل کی بنا پر دوطرفہ معاہدے قومی اور عالمی تعلقات کی بہتری کے سلسلے میں چوطرفہ تعلقات سے کہیں زیادہ بہتر اور فعال ہوتے ہیں۔

www.bhutto.org

عام انسانی احساس سے بھی یہ امر ایک حقیقت کی شکل اختیار کر جاتا ہے کہ ایک ایسا معاہدہ جس میں کئی قومیں شامل ہوں' وہ دو قوموں کی مفاہمت اور تعلقات کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک کٹھن اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ زمانے کی نئی تبدیلیوں نے ریاست کے درمیان تعلقات کو پیچیدہ بنا دیا ہے جبکہ اس سے پہلے چند ریاستیں ہوا کرتی تھیں اور ان کے درمیان بہت کم رابطہ ہوتا تھا۔ رسل ورسائل کے وسائل نے فاصلوں کو یوں ختم نہ کیا تھا' اس وقت دو طرفہ قسم کے معاہدے بڑی سلامت روی اور ایمانداری سے حالات کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔ دو یا اس سے زیادہ متحارب ریاستوں کے درمیان "طاقت کے توازن" کا نظریہ زمانہ سلف سے معروف چلا آرہا ہے۔ مگر اس نظریے کو زمانہ حال میں پختگی حاصل ہوئی ہے۔ ہینی بال کو چھوڑ کر روسی سلطنت کو اپنے کسی حریف کی ہمسری کے لئے طاقت کے توازن کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ اسی لئے بازنطینی اور ایرانی حکومتیں فوری طور پر طاقت کے توازن کی قائل تھیں اور اسی لئے بیشتر اوقات زمانہ قدیم کے طور طریقوں کے مطابق ایک دوسرے سے الجھتی رہتی تھیں۔ عربوں کی عظیم الشان حکومت کو اس وقت عروج حاصل ہوا' جب بازنطینی اور ایرانی حکومتیں زوال پذیر تھیں۔ ان اتفاقات اور حالات کی وجہ سے چو طرفہ معاہدوں کی ڈپلومیسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ چو طرفہ تعلقات کا وجود دور قدیم یا زمانہ وسطیٰ میں نہ ملتا تھا۔ یونان کی شہری ریاستیں' جو نہایت تہذیب یافتہ عالمی تعلقات کی موجد ہیں' وہ ایک ایسے ڈھانچے پر عمل کرتی تھیں جن کی بنیاد چو طرفہ تعلقات پر رکھی گئی تھی۔ طاقت کے توازن کا نظریہ قوموں کی حصولِ سرفرازی کی خواہش کا عکس ہے۔ جب تجارت اور نو آبادیات کے میدان میں برطانیہ کو دوسری یورپی قوموں سے مقابلہ کرنا پڑا تو اس نے اپنی توانائی کو توازن اقتدار کے نظریئے سے برقرار رکھا۔ مگر اجتماعی تحفظ کے ایک وسیلے کی حیثیت میں اسی نظریئے کا قدرے دیر سے ارتقاء ہوا۔ اپنی ارتقاء یافتہ صورت میں طاقت کے توازن کا اہم عصر نظریہ جسے چرچل نے دہشت کا توازن کا نام دیا ہے اور چو طرفہ تعلقات کی پالیسی۔ قوم اور ریاست کے نظام کا لازم و ملزوم بنتے ہیں۔ رسل ورسائل کے بارے میں تیز رفتار ترقی نے اس خلا کو گھٹا دیا جو مختلف حکومتوں کے درمیان تھا۔ مخالفانہ رویوں سے پیدا ہونے والی قومی خواہشات اور باہمی رشتوں نے چو طرفہ تعلقات کے لئے سازگار حالات پیدا کر دیئے ماضی کی طرح اس ڈپلومیسی کے ارتقا نے عالمی سوسائٹی میں بھی یکساں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اندرونی طور پر مربوط اور ایک دوسرے سے متصادم الحاقات کی یہ پالیسی جسے بسمارک نے جرمنی کے مقبوضات کے تحفظ کے لئے قائم کیا تھا' اسے ایک زمانے میں یورپ میں ریاستی تعلقات کے لئے ایک نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ ڈپلومیسی کی یہ شکل پہلی جنگ عظیم کا باعث بنی۔ ان کثیر خفیہ معاہدوں کے خطرات سے آگاہ ہو کر صدر وڈرو ولسن نے ان معاہدوں کی شر انگیزی کو کم کرنے کے لئے ایسے معاہدوں کی تجویز پیش کی جو کھلے عام کئے جائیں۔ اس تصور نے جو اجتماعی سطح پر اجتماعی تحفظ کے نام پر قائم ہوا تھا' بعض ایسے معاہدوں کو منسوخ کر دیا' جو عالمی امن کے لئے ضمانت کی

www.bhutto.org

حیثیت رکھتے تھے۔ انجام کار امن کا یہ تصور 'ایک ہی نسل میں مسلسل غیر استحکام سے 'بڑے پیمانے پر' ان چو طرفہ معاہدوں سے متاثر ہوا اور دنیا امن کی منزل تک پہنچنے کی بجائے دو عالمی جنگوں اور سرد جنگ کا شکار ہوئی۔ یہ نظام اتنی گھمن سے دوچار ہوا کہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں اجتماعی تحفظ کو عالمی امن کے لئے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔

امریکہ نے امن کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایسے باہمی طور پر مربوط چو طرفہ حمایت کے معاہدوں کا سلسلہ شروع کیا' جو سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین کے خلاف تھے۔ مغربی یورپ کے تحفظ کے لئے نیٹو جیسے باہمی حمایت کے ادارے کو قائم کیا گیا۔ نیٹو کے نقش قدم اور مطابقت میں مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سیٹو اور سینٹو کے ادارے قائم کئے گئے اور پاکستان ان میں شامل ہو گیا۔

پاکستان نے اپنے طور پر ان چو طرفہ معاہدوں اور پابندیوں کے بدلے میں ریاست ہائے امریکہ کے ساتھ ایک علیحدہ دو طرفہ فوجی معاہدہ کر لیا اور یوں ایشیا دو طرفہ اور چو طرفہ معاہدوں کے حوالے سے پاکستان' ریاست ہائے متحدہ کی اور اس کے حمایتیوں کی طرف سے اس سرد جنگ میں شریک ہو گیا جو سوویت یونین اور اس کے ساتھی ملکوں کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔

ہر وہ قوم جس نے چو طرفہ معاہدے کئے' بلا تخصیص فوجی اور معاشی مدد اور اعانت کے عوضانے میں فوجی معاہدے کرنے پر مجبور ہوتی رہی۔ ایسے تمام معاہدات کا بنیادی مقصد حلیف قوموں کو فوجی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرنا تھا۔ فوجی معاہدات کے اس سلسلے کے بارے میں جو ساری دنیا میں کئے جا رہے تھے۔ یہ وضاحت کی گئی کہ یہ اجتماعی دفاعی معاہدے ہیں اور اجتماعی اور انفرادی طور پر کیمونسٹوں کی جارحیت کے خلاف تحفظ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف سوویت یونین اور چین اس امر پر مصر رہے کہ مغرب کے فوجی معاہدے اس جارحیت کے آلات ہیں جن کے حوالے سے کیمونسٹ قوموں کو حصار میں لینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ نیٹو کے حوالے سے جو فوجی دباؤ پیدا کیا گیا تھا' اس کے خلاف سوویت یونین نے مشرقی یورپ کی اعانت اور مدد سے وارسا پیکٹ کی تنظیم کی تشکیل کی۔ سرد جنگ کے ان پیچ دار دائروں میں اجتماعی تحفظ کے نام پر کئے گئے چو طرفہ معاہدے عالمی تناؤ میں اضافے کا بہت بڑا سبب بن گئے۔

ایک سو سال سے زائد عرصے کی منظم فوجی صف بندی ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ میں بے کار ہو گئی اور یوں دنیا ایک بڑی آفت کے دھانے پر پہنچ گئی۔ چو طرفہ معاہدوں نے نہ تو اس تناؤ میں کمی کی اور نہ ہی جنگوں کا خاتمہ کیا۔ عالمگیر تباہی کو تو چو طرفہ فوجی معاہدوں کے جال سے نہیں روکا گیا ہے بلکہ عالمگیر تباہی اس دو طرفہ فوجی توازن کے وجود سے روکی گئی ہے جو سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ایک نئی صورتحال جو قابل تصور اتفاقات سے لبریز ہے اس وقت جنم لے گی' جب چند سالوں کے اندر اندر چین دونوں بڑی طاقتوں پر فوجی طاقت کے اعتبار سے فوقیت حاصل کر جائے گا۔ جنگ کی راہ میں رکاوٹ بننے کے سلسلے میں ان چو طرفہ فوجی معاہدوں نے خواہ کتنی کامیابی حاصل کی ہو' مگر ان معاہدوں نے دنیا کو ایک ایسے الجھاؤ کے سامنے لا کھڑا کیا ہے جسے حل کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

www.bhutto.org

عام طور پر چو طرفہ معاہدے اجتماعی فوجی تیاریوں کی ایک شکل ہوتے ہیں جنہیں کوئی بڑی طاقت کنٹرول کرتی ہے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ ایک چرواہا ایک لمبی سی لاٹھی کے ساتھ جانوروں کے گلے کو متحد رکھتا ہے اور یہ کام ہر بار آسان نہیں ہوتا۔ مستقل طور پر ضدی اور سرکش کو قابو میں لانے کے لئے جبر کے ساتھ چاپلوسی کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بڑی طاقتوں کی ڈپلومیسی دکھاوے کا یہ خوبصورت اور منقش پردہ ہوتا ہے جسے یہ طاقتیں دباؤ اور سازش کے دھاگوں سے بنتی ہیں۔ بظاہر اس سے ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ بڑی طاقتیں دوسروں کے بنیادی مفادات کا تحفظ کرتی ہیں۔ حالانکہ جونہی کسی کے اختلاف کی آواز سنائی دیتی ہے' بڑی طاقت اپنے اور اپنے حلیفوں کے پورے دباؤ سے انحراف کرنے والے کو دبا لیتی ہے۔

حلیف قوموں کو اصطلاحاً "موکل ریاستیں" کہا جاتا ہے۔ ان ریاستوں کے انفرادی مفادات بڑی طاقت کے مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ بڑی طاقت کے نقطہ نظر سے معاہدات بڑی سست رفتاری سے پروان چڑھتے ہیں لیکن دوسروں کی نگاہ میں ان کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے۔ جس وقت ان معاہدوں میں شریک ہوا جاتا ہے تو صورت حال کی پوری نزاکت کا علم نہیں ہوتا مگر جوں جوں روابط بڑھتے ہیں' طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ تعلقات کی نشوونما کے ساتھ ساتھ یا تو متصادم مقاصد کے سلسلے میں مفاہمت کرنی ضروری ہو جاتی ہے یا کسی نہ کسی حلیف ریاست کے داخلی معاملات میں کھلی کھلی مداخلت کی جانے لگتی ہے۔ اقتدار کے خواہاں ہر طرف سے میدان میں اتر آتے ہیں تاکہ حالات کو برقرار رکھا جا سکے' کسی بحران پر اختلاف یا کسی مشترکہ ذمہ داری کی تشریح غلط فہمیوں کا سبب بنتی ہے۔ جب بھی بڑی طاقت کے اثر و رسوخ پر زد آ رہی ہو' کمزور حلیف ممالک کے داخلی مسائل کو اس طرح بھڑکا دیا جاتا ہے کہ ان کے لئے بڑی طاقت پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا ضروری ہو جاتا ہے چونکہ معاہدات میں توازن اور یکسانیت مقصود ہوتی ہے اور سب قوموں کا مرتبہ بھی ایک سا نہیں ہوتا' اس لئے جب بھی مشترکہ دباؤ کم یا ختم ہو جاتا ہے تو معاہدات ڈگمگانے لگتے ہیں۔ جب ایسی صورت حال ہو تو تنگی جارحیت ہی حلیفوں کو اکٹھا رکھ سکتی ہے۔ دو دائمی خطرے ہمیشہ چو طرفہ معاہدوں کے سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ ایک خارجی طور پر۔ جو دشمن اور بد اندیش ریاستوں کی جانب سے ہوتا ہے اور دوسرا داخلی طور پر۔ جو مستقل وفاداری کا طلب گار ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے معاہدات مشکلات کا سامنا کرتے ہیں اور یا تو وہ بالجبر بحال رکھے جاتے ہیں' یا کسی تحریص و ترغیب کے حوالے سے' یا پھر دونوں صورتوں سے بیک وقت کام لیا جاتا ہے۔

ان تمام دلائل اور وجوہات کی روشنی میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ چو طرفہ تعلقات کو دو طرفہ تعلقات کی نسبت سے عمل میں لانا اور برقرار رکھنا' کہیں زیادہ مشکل عمل ہے اور اس سلسلے کا سب سے مشکل کام مختلف جغرافیائی منطقوں میں واقع ممالک کو فوجی اعتبار سے ایک رشتے میں پرونا ہے۔ یہ معاہدے اور تعلقات اسی صورت اطمینان بخش طور پر کام کر سکتے ہیں جب ایک مثبت اور ٹھوس مشترکہ خطرے کا وجود ہو اور جونہی یہ مشترکہ خطرہ ختم ہوا یا کم ہوا یا اس کے کم ہونے یا ختم ہونے کے آثار نظر آئے' ان معاہدوں اور تعلقات میں گڑبڑ پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر محرکات بیرونی اور غیر متعلق اسباب ہوں تو سیاسی اور معاشی

نوعیت کے مشترکہ معاہدے بھی پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ ایک چوطرفہ معاہدہ اسی صورت میں بہتر نتائج کا حامل ہو سکتا ہے 'اگر اسے ملک کی داخلی ترقی کی خواہش کے زیر اثر کیا گیا ہو اور اس بہانے سے بیرونی جاہ طلبی کی مقصد براری مطلوب نہ ہو اور یہ معاہدے مساوات کے اصول پر قائم ہوں اور ان کی بنیاد استحصال اور ہوس پر استوار نہ ہو تو علاقائی تعاون میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس نوعیت کے معاہدے اپنی خاصیت اور غایت کے اعتبار سے ان مشترکہ فوجی یا چوطرفہ سیاسی اور معاشی معاہدوں سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں جو خارجی طور پر کسی ریاست یا ریاستوں کے مجموعے کے خلاف تیار کئے جاتے ہیں۔

معاہدوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جو اس امر کی متقاضی ہے کہ اسے دوطرفہ اور چوطرفہ معاہدوں سے مختلف اور امتیازی قرار دیا جائے۔ ان میں وہ معاہدے شامل ہیں جو تمام ریاستوں سے کئے جا سکتے ہیں۔ جیسے اقوام متحدہ کا چارٹر۔ ایسے معاہدوں کے ذریعے مختلف مشترکہ مسائل مثلاً ساحلی علاقوں کی ملکیت کے حقوق 'منشیات کے فروغ پر کنٹرول 'عالمی پیمانے پر اسلحہ پر پابندی کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ایسے معاہدوں کی گنجائش ہماری موجودہ سوسائٹی کے حالات کے مطابق ناگزیر اور وسیع تر ہے۔

وہ کون سا ایسا اخلاقی معیار تھا جس کی وجہ سے صدر ایوب کی حکومت یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کی خارجہ پالیسی دوطرفہ معاہدات کے اعتبار سے اتنی متوازن ہے کہ وہ عالمی مناقشات سے آزاد ہے؟ پاکستانی عوام اس صورت حال کے بارے میں زیادہ فکرمند رہے ہیں کہ ان کو مثالی معیار کے مطابق بنیادی حقوق نہیں دیے گئے 'بلکہ اس ضمن میں سودے بازی کی گئی۔ انہیں اس بات کا تردد نہیں کہ ایسا کس طرح کیا گیا۔ سابقہ حکومت کا امتیاز یہ ہے کہ پاکستان نے اپنی دوطرفہ اور چوطرفہ پالیسی کے حوالے سے اپنی خود مختاری کو نظرانداز کر دیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی عالمی خارجہ پالیسی کی صورت کچھ ایسی ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک دوطرفہ اور چوطرفہ معاہدوں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں جاپان کی مثال دی جا سکتی ہے جو سیٹو یا اس قسم کے کسی اور چوطرفہ فوجی معاہدوں میں حلیف کی حیثیت نہیں رکھتا مگر جاپان اور ریاست ہائے متحدہ کا باہمی تحفظ کا دوطرفہ معاہدہ ہو چکا ہے۔

دوطرفہ معاہدے بذات خود کسی اہم اور خوش کن خوبی کے حامل نہیں ہوتے۔ ایسے معاہدے اچھے ہوں یا برے 'اس کا تمام تر انحصار میثاق کی شرائط پر ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ ایوب خاں کا یہ دعویٰ کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی دوطرفہ پالیسی کی خطیر ہے ایک بہت بڑا فریب تھا۔ پاکستان سیٹو اور سنٹو کا رکن ہے۔ دولت مشترکہ میں شامل ہے۔ کولمبو پلان میں شریک ہے اور قرضوں کے لئے کنسورشیم کا رکن ہے۔ اس قسم کے چوطرفہ معاہدوں کے جال کو شاید ہی کسی صورت میں ایک مثالی دوطرفہ کا نام دیا جا سکتا ہو۔

پاکستان کے عوام صدر ایوب کی حکومت کی متضاد باتوں سے اس حد تک آگاہ ہو چکے تھے کہ وہ حکومت کے خوبصورت اور بھڑک دار پروپیگنڈے سے قطعاً متاثر نہ ہوتے تھے۔ البتہ صدر ایوب کی لاف

زنی سے نہیں بلکہ ایوب خان کے اس رویئے سے پیدا ہوتا ہے کہ اس نے اس خارجہ پالیسی کی خطرناک الجھنوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا جس پر وہ عمل کر رہا تھا۔ سابقہ حکومت نے پریس پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ اس لئے وہ اپنی اکثر خطرناک خامیوں اور غیر ممالک سے سمجھوتوں کو عوام سے چھپانے میں کامیاب ہو گئی۔

یہ سمجھے بغیر کہ اس اصطلاح کے کیا معنی اور مطالب ہیں حکومت نے دو جماعتی خارجہ پالیسی کی اصطلاح کو اپنا لیا۔ ریاست ہائے متحدہ میں ملک کی دونوں سیاسی جماعتیں ری پبلکن اور ڈیمو کریٹ نے ایک مقصد کے تحت مشترکہ طور پر جمہوری انداز سے ایک خارجہ پالیسی کی تشکیل کی ہے' اس لئے اصطلاحاً اسے دو جماعتی خارجہ پالیسی کہا جاتا ہے۔ پاکستان میں نہ تو حزب مخالف ہی جمہوری انداز سے کام کرتی تھی اور نہ ہی کسی مشترکہ مقصد پر عوام اور حکومت کے درمیان ایسی صورت پیدا ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ صدر ایوب کی حکومت کمزور ہوئی قومی وقار کے لئے کشمیر کے مسئلے کو ایک مشترکہ مسئلہ بنایا جا سکتا تھا جیسا کہ 11 اکتوبر 1968ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں مسٹر ارشد حسین نے کہا کہ ایوب کی حکومت تنازعہ کا کوئی حل چاہتی ہے۔ کوئی سیاسی حل جو اس تنازعہ کو ختم کر سکے۔ اگر حکومت خود نہ چاہتی تو مسٹر ارشد حسین کبھی بھی یہ نہ کہتے کہ۔

"میں اپنی حکومت کی طرف سے پاکستان کے اس ارادے کی توثیق کرتا ہوں کہ پاکستان اپنے تمام تنازعات کے سلسلے میں بشمول تنازعہ کشمیر' مجموعی طور پر یا بتدریج کسی طریقہ کار سے گفتگو کے لئے تیار ہے بشرطیکہ بھارت کسی مناسب مرحلے اور مناسب طریق کار سے اس تنازعہ کے مخلصانہ حل کی تلاش کے لئے تیار ہو اور اپنے وعدے کو نبھانے پر راضی ہو۔"

حالانکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے عوام اس مسئلے کے حل کے لئے حق خود ارادیت سے کم کسی امر پر رضامند نہیں ہیں۔ ہمارے عوام سنٹو اور سیٹو سے علیحدگی اختیار کرنے کے خواہاں تھے۔ مگر ایوب خاں کی حکومت بڑی وفاداری کے ساتھ ضمیر کی آواز کی کسی چبھن کو محسوس کئے بغیر' ان تنظیموں کے ساتھ چمٹی رہی۔ عوام چاہتے تھے کہ وہ سرد جنگ سے دور رہیں۔ مگر ایوب خان نے پاکستان کو ریاست ہائے متحدہ کے ساتھ باہمی دفاع کے معاہدے میں جکڑے رکھا' حالانکہ امریکہ نے ہماری فوجی امداد کلیتاً بند کر دی تھی۔ خارجہ پالیسی کے بارے میں حکومت اور عوام کے درمیان رویوں میں جو خلیج حائل تھی۔ اسے کسی طرح بھی پاٹا نہ جا سکتا تھا۔ پاکستان کے سب چو طرفہ اور دو طرفہ فوجی معاہدے اس وقت بے کار محض ہو گئے جب ریاست ہائے متحدہ نے یک طرفہ طور پر پاکستان کی فوجی امداد بند کر دی۔ اس باہمی عمل اور مراعات کے خاتمے کے ساتھ ہی تمام معاہدے غیر حقیقی اور معطل ہو گئے۔ اگرچہ صورت حال کی تغیر پذیری کو سمجھ لیا گیا' پھر بھی عوامی فرائض سے کنارہ کشی کرتے ہوئے صدر ایوب کی حکومت نے ان معاہدوں سے دستکش ہونے سے انکار کر دیا اور اس طرح وہ راہ اختیار کی جس میں پاکستان کی سلامتی کو ذرہ بھر بھی تحفظ حاصل نہ تھا۔ یہاں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ پاکستان نے

فوجی امداد اور کشمیر کے معاملے میں سیاسی تعاون کے بدلے میں سرد جنگ کی ذمہ داریوں کو اپنے اوپر عائد کیا تھا۔ تین سال ہوئے فوجی امداد بند کر دی گئی اور سیاسی تعاون کا خاتمہ اس سے بھی پہلے کیا جا چکا تھا۔ جب اکتوبر 1959ء میں چین بھارت لڑائی ہوئی تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے کشمیر کے مسئلہ پر غیر محسوس انداز سے اپنی پالیسی تبدیل کرنی شروع کر دی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اس نقطہ نظر کی تصدیق ہر شبہے سے بالاتر اس وقت ہو گئی جب پاکستان یہ تنازعہ لے کر 1964ء میں حفاظتی کونسل گیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے پاکستان کو دیئے جانے والے فوجی آلات پر اس وقت پابندی لگا دی جب کہ پاکستان اپنے سے پانچ گنا زیادہ طاقتور ملک کی جارحیت کے خلاف اپنی بقاء کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ تین سال تک پاکستان کے لئے اسلحہ اور فاضل پرزہ جات کی خرید پر مکمل پابندی عائد کر دی اور اس حکومت کو جو تین فوجی تنظیموں کی حلیف تھی' اسے اسلحہ اور فاضل پرزہ جات کے حصول کے لئے در بدر بھٹکنا پڑا اور اسے کالے بازار اور اسلحہ کے بدنام تاجروں سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔

ان کٹھن مراحل اور نازک وقت میں بھی ایوب خان نے ملک کو غیر ممالک کے ساتھ کئے ہوئے بے جان اور بے کار معاہدوں کے بوجھ سے آزاد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس اس نے ریاست ہائے متحدہ کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ پشاور میں اپنا فوجی اڈہ جولائی 1969ء تک قائم رکھے۔ اس صورت حال اور عنایت کو یکطرفہ فوجی معاہدے کی حیثیت سے شاید وہ ممالک بھی ناقابل عمل اور ناقابل قبول سمجھتے جو نیٹو کے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلی بار سرکاری طور پر پاکستان میں امریکی سفیر نے دسمبر 1968ء کو اس صورت حال کی ایک غیر معمولی وضاحت کی۔ اس نے ایک اردو روزنامے کے نمائندے کے سوال کے جواب میں اس امر سے انکار کیا کہ ریاست ہائے متحدہ نے تحریری اور عملی طور پر سینٹو اور سیٹو کے معاہدوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ سیٹو کے معاہدہ کے بارے میں سفیر نے بتایا کہ اس معاہدے کے رکن ممالک اس امر کے پابند نہیں کہ اگر جنوبی ویت نام پر حملہ ہو تو وہ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ سیٹو کے حوالے سے امریکی سفیر نے وضاحت کی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کانگریس کی مشترکہ قرارداد کی رو سے ———

——— ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سینٹو کے علاقائی ممالک سے دوطرفہ معاہدہ کر سکتی ہے اور اگر کسی ایسے ملک کی طرف سے حملہ ہو جو عالمی کمیونزم کے زیر اثر ہو تو خاص طور پر ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے گا۔ امریکہ کے سفیر نے اس امر پر خاص طور پر زور دیا کہ اس معاہدے سے ہی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ نے تحریری یا عملی طور پر اس معاہدے کو ختم یا ترک نہیں کیا۔

یہ وضاحت حقیقی صورت حال کی تصدیق نہیں کرتی۔ قوت متخیلہ کو کوئی زحمت دیئے بغیر بھی ویت نام کی لڑائی اور پاکستان پر بھارت کی جارحیت کا واضح فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی ویت نام کبھی بھی سیٹو کا رکن نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے منیلا کانفرنس میں کوئی حصہ لیا تھا۔ اس کے باوجود سیٹو کے دائرہ اثر

www.bhutto.org

میں لانے کے لئے اسے کھینچ تان کر کے ایک "پروٹوکول سٹیٹ" کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔ 1954ء میں معاہدہ جنیوا کے تحت یہ طے پا گیا تھا کہ جنوبی اور شمالی ویت نام غیر ملکی فوجوں سے آزاد اور غیر جانبدار قرار دیئے جاتے ہیں۔ معاہدہ جنیوا 1954ء اور 1962ء کی خلاف ورزی اور تجاویز پر ایک ایسی خانہ جنگی کا آغاز ہوا جس نے عالمی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ خانہ جنگی اس لئے شروع ہوئی کہ جنوبی ویت نام نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو جنیوا کے معاہدات کا پابند کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ ایک ایسا ملک جس نے اپنے ہی کئے ہوئے معاہدے کو توڑا اور خانہ جنگی کا سبب بنا۔ ایسے ملک کو کسی مدد کا حق نہیں پہنچتا۔ اس لئے سیٹو نے اپنے رکن پاکستان سے جو بے مروتی برتی اور اس نے غیر قانونی طور پر ویت نام میں جو مداخلت کی ان میں کوئی مماثلت نہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سفیر نے اس معاہدے کی صحیح وضاحت نہیں کی' انہیں چاہیے تھا کہ وہ ان تمام معاہدوں کی کلیت کی روشنی میں غور کرتے جو پاکستان کے ساتھ کئے جا چکے ہیں۔ انہوں نے ان یقین دہانیوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جن کا یقین امریکہ کے وزیر خارجہ جان فوسٹر ڈلس نے 1957ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون کو سرکاری اعلامیے میں دلایا تھا اور اسی طرح انہوں نے اس معاہدے کو نظر انداز کر دیا' جو کینیڈی نے صدر ایوب خاں کے دورہ امریکہ کے خاتمے پر 13 جولائی 1961ء کو ایک مشترکہ اعلامیے میں کیا تھا۔

"دونوں حکومتوں کے صدر ان دو طرفہ معاہدات کے مقاصد کی تصدیق کرتے ہیں جن پر دونوں حکومتوں نے پانچ مارچ 1959ء کو دستخط کئے تھے۔ اس معاہدے میں دوسرے امور کے علاوہ اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ حکومت امریکہ اپنے قومی مفاد اور عالمی امن کے لئے ناگزیر سمجھتی ہے کہ وہ پاکستان کی آزادی اور ترقی کے مقاصد کے استحکام کے لئے پاکستان کی مدد کرے۔"

اس کے علاوہ حکومت امریکہ نے اپنے اور پاکستان کے سلسلے میں جو پابندیاں عائد کیں' ان کو مد نظر رکھتے ہوئے' امریکی سفیر کے پیشرو سفیر میکانگھی نے 31 دسمبر 1962ء کو حیدر آباد میں کہا تھا کہ امریکی حکومت تمام پیش بندیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بھارتی حکومت کو چین کے خلاف اس طرح مدد دے رہی کہ بھارت اس مدد کو پاکستان کے خلاف استعمال نہ کر سکے۔ نومبر 1962ء میں امریکی حکومت نے ایک اور یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ پاکستان پر کسی بھی غیر ملکی حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کی مدد کرے گا خواہ وہ ملک بھارت ہی کیوں نہ ہو۔ امریکی سفیر میکانگھی نے 9 نومبر 1962ء کو ایک بار پھر کراچی میں پریس کانفرنس میں کہا۔

"ریاست ہائے متحدہ نے اپنی طرف سے سرکاری طور پر پاکستانی حکومت کو یقین دلایا ہے کہ اگر بھارت کو دی جانے والی امداد کا استعمال غلط اور کسی دوسرے ملک کے خلاف کیا جائے تو امداد کو فوری طور پر بند کر دیا جائے گا اور دستوری اختیار کے عین مطابق' بھارت کی جارحیت کے خلاف' اقوام متحدہ کے تعاون یا اس کے بغیر عملی قدم اٹھایا جائے گا"

www.bhutto.org

اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے 20 نومبر 1962ء کو صدر کینیڈی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا۔

"بھارت کو دی جانے والی امداد کسی صورت میں بھی پاکستان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں پر اثر انداز نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں کمزور کرتی ہے۔ اس امر کی وضاحت ہم دونوں حکومتوں سے کر چکے ہیں۔"

اگر ان تمام معاہدوں اور مواعید کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو کسی شبہے کا شائبہ تک نہیں رہتا کہ ریاست ہائے متحدہ مثبت طور پر پاکستان کو بھارتی جارحیت کے خلاف مدد دینے پر پابند تھی۔ مگر ریاست ہائے متحدہ کا عمل اس کے بالکل الٹ تھا۔ اپنے مواعید کو پورا کرنے کے بجائے اس نے انتہا پسندانہ راہ اختیار کی اور پاکستان پر ایسی پابندیاں عائد کر دیں جن کا تمام تر فائدہ بھارت کو پہنچا تھا اور نقصان پاکستان کو۔ بھارت کا ماؤنٹین ڈویژن جو امریکی اسلحہ سے لیس تھا' اسے 1962ء کی چین بھارت کی جھڑپ کے بعد بھارت نے وسیع پیمانے پر کشمیر سیکٹر پر استعمال کیا۔ اگر سیٹو اور سنٹو کے ممالک اپنے دوسرے معاہدوں اور پابندیوں کی وجہ سے پاکستان کی مدد نہ کر سکتے تھے تو کم از کم انہیں عین جنگ کے زمانے میں اپنے حلیف ملک کے خلاف تعزیری قدم تو نہ اٹھانا چاہیے تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک اس نازک ترین سوال کا بے لاگ جائزہ نہ لیا جائے۔ درآمد و برآمد اسلحہ اس قسم کی پابندیاں کسی ملک کو کتنا نقصان پہنچا سکتی ہیں اس کا ثبوت اسرائیل کے واویلے سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے صدر ڈیگال کے اس حکم کے خلاف مچایا تھا جس کے تحت اسرائیل کے ہاتھوں فرانسیسی ہتھیاروں کی فروخت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ پاکستان کی حالت اس سے کہیں زیادہ نازک اور سنجیدہ تھی۔ اسرائیل صرف فرانسیسی اسلحہ پر ہی انحصار نہیں کرتا مگر پاکستان اس زمانے میں صرف امریکی حکومت پر ہی انحصار کرتا تھا۔ مشرق وسطیٰ میں جنگ بندی کے بعد فرانس نے اسرائیلی حکومت کی خطا کو معاف کرتے ہوئے یہ پابندی اٹھالی۔ پاکستان پر یہ پابندی اس وقت لگائی گئی' جب وہ اپنے سے پانچ گنا بڑے اور کہیں زیادہ وسائل رکھنے والے ملک کی جارحیت کا شکار ہو رہا تھا۔ پاکستان کی خاموشی کے برعکس اسرائیل کی حیثیت سامنے رکھیے جس نے فرانسیسی حکومت کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور اس کا ردِ عمل شدید تر تھا۔

یہ سب کچھ بجا اور درست کہ ہم سرد جنگ کا ایک حصہ اپنی مرضی سے بنے' اس سے بھی قطع نظر کہ ہمارے فوجی حلیفوں نے ہمیں تبادلے میں کیا کیا فائدے پہنچائے' اصل اور ٹھوس سوال جو پوچھا جانا چاہیے یہ ہے کہ صدر ایوب نے ان بے کار معاہدوں سے دستکش ہونے کا فیصلہ کیوں نہ کیا۔ آیا ایسے معاہدے نقصان دہ تھے یا سود مند' اس کا فیصلہ صرف باہمی مفادات کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے اور قومی مقاصد اور مفادات کے ترازو میں باہمی فوائد اور نقصانات کو تولا جا سکتا ہے۔ اگر باہمی سطح پر دو طرفہ تعاون کا عنصر بھی غائب ہو تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ بحیثیت مجموعی ان معاہدوں میں باہمی طور پر کوئی مفاد

www.bhutto.org

نہیں ہے اور یہ معاہدے مفاد کے بجائے نقصان کے حامل ہیں۔ اس لئے ان بے کار معاہدوں کے ساتھ منسلک رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب واضح طور پر ہمارے فوجی حلیفوں کی طرف سے ہمیں فوجی امداد کی صورت میں مدد مل رہی تھی پاکستانی عوام کی رائے ان معاہدات کے خلاف ہی تھی اور جب اس حقیقت سے پردہ اٹھ گیا کہ سیٹو اور سنٹو ہمارے فوجی حلیف ہونے کے باوجود پاکستان کے تحفظ کے لئے مددگار ثابت نہیں ہوئے' تو یہ حقیقت بھی ثابت ہو گئی کہ ان معاہدوں میں فائدے ہیں لیکن زیادہ نقصان ہے اور جب فوجی امداد بھی روک دی گئی تو پھر کوئی ایسا نازک تعلق ہی باقی نہ رہا جو ان معاہدوں کے ساتھ منسلک رہنے کا جواز فراہم کر سکے اور اس وقت کے بعد ایوب خان کی حکومت کے لئے ان معاہدوں کے خلاف ہر دلیل اور ہر جواز سامنے آ گیا تھا اور ہمارے لئے کوئی ایسی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی کہ سیٹو اور سنٹو کے ساتھ منسلک رہیں۔

دوسری حلیف قوموں کے عین برعکس' جو فوجی مدد حاصل کرتی ہیں' پاکستان کو فوجی مدد سے محروم کر کے سزا دی گئی ہے۔ اس بناء پر' جب دوسری حلیف قومیں اس حمایت سے فوائد حاصل کر رہی ہیں' پاکستان کے لئے لازمی نہیں تھا کہ محض اس لئے ان فرسودہ معاہدوں سے چمٹا رہتا کہ اس پر معاہدہ توڑنے کا الزام نہ آئے۔ پہلے ہی مقام پر سیٹو جو کہ ویت نام کے مسئلے پر ہر لحہ دوسروں کو ساتھ ملانے میں کوشاں تھا۔ اس نے پاکستان کے لئے کوئی مثبت کردار سرانجام نہیں دیا اور اس نے صورت حال کو کسی طرح سنبھالنے اور روکنے کی کوشش نہ کی۔ چین' جسے آج امریکہ اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتا ہے' سیٹو کو اسی کی مخالفت میں قائم کیا گیا ہے اور چین کا پاکستان کے بارے میں رویہ انتہائی دوستانہ ہے۔ بالکل تازہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ 20 ر اور 21 ر مئی کو سیٹو کی وزارتی سطح کی کانفرنس منعقدہ بنکاک میں امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر ولیم راجرز نے سیٹو کو مزید مستحکم بنانے کے لئے ایسی کئی مثبت تجاویز پیش کیں جن میں جاپان اور جنوبی کوریا کو بھی اس تنظیم میں شامل کرنے کی تجویز موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر یہ تنظیم کسی طرح سودمند ہے بھی تو ان ملکوں کے لئے جو فوجی امداد حاصل کر رہے ہیں اور حلیف ممالک کے ساتھ کئے گئے معاہدوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر پاکستان کے لئے اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی کیونکہ اسے اپنے ان حلیفوں سے اب کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ صرف وہی ریاستیں

اس حمایت کا بوجھ برداشت کر سکتی ہیں' جو اب بھی اپنے حلیفوں سے کسی طور فائدہ حاصل کر رہی ہیں اور صرف یہی ریاستیں یہ جواز پیش کر سکتی ہیں کہ ان معاہدوں سے علیحدہ ہونا بلاوجہ اور غیر مناسب عمل ہے۔ حالانکہ یہ معاہدے اب زوال پذیر ہیں مگر ان ممالک کو اب بھی قیمتی فوجی امداد بہم پہنچا رہے ہیں۔ مگر پاکستان جو کہ سراسر نقصان میں ہے' وہ یکطرفہ فوجی معاہدے کا جواز پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی پابندیوں کو برداشت کر سکتا ہے۔ حکومت کسی طرح بھی فعال یا مجہول رکن کی حیثیت سے اپنی رکنیت کا جواز مہیا نہیں کر سکتی جب کہ عملی طور پر یہ معاہدے پچھلے تین سال سے ختم ہو چکے ہیں۔ ان تعلقات کے انتشار اور بے

ربطی کو کانفرنسوں میں شریک ہو کر وزیر سفیر یا کسی مبصر کے حوالے سے سطحی ثابت کر کے کم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان ذرائع سے ان معاہدوں کے سچے خطرات کو ہی دور کیا جاسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر صدر ایوب کو ان معاہدوں سے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان سے پاکستان کو خطرہ لاحق تھا' بلکہ صدر ایوب کی دلچسپی اس لئے کم ہو گئی تھی کہ امریکہ کو ان معاہدوں سے زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی۔ صدر ایوب اسی انتظار میں تھے کہ کب امریکی حکومت ان معاہدوں کو ختم کرتی ہے۔ ان معاہدوں میں پاکستان کا کردار پہلی سی قدر و منزلت کا حامل نہ رہا تھا کیونکہ امریکہ کی عالمی پالیسی اب ان معاہدوں کے بارے میں اتنی فکرمند نہ رہی تھی۔ اس سے یہ مطلب لینا غلط ہو گا کہ امریکہ نے اپنے مقاصد اور مفادات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ جس وقت چیکوسلواکیہ کا مسئلہ اٹھا تو امریکی حکومت نے فوری طور پر نیٹو کو سرگرم عمل کیا۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی نازک صورتحال امریکہ کے رویئے میں تبدیلی کا جواز بن سکتی ہے کہ وہ سیٹو اور سنٹو پر غور کرے اور اس میں تبدیلی کا خواہاں ہو۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو پاکستان انتہائی نازک اور تکلیف دہ خلجان کا شکار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر ایوب خان نے ذاتی وجوہات کی بنا پر پاکستان کو اس وقت بھی ان معاہدوں سے منسلک رکھا' جب کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ ملکی تحفظ کو اپنی ذات کی حفاظت کے لئے داؤ پر لگا دینا' آمرانہ حکومت کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ سی آئی اے کا خفیہ ہاتھ کس طرح ایک ایک کر کے ایشیا اور افریقہ کی حکومتوں کی تبدیلی کا باعث بن رہا ہے ایوب خان یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے امریکی انتظامیہ مشتعل ہو جائے۔ اسی لئے ایوب خان ہر حالت میں امریکی حکومت کی خوشنودی کا خواہاں تھا۔ خوش فہمی کی بنا پر ایوب خان کو یقین تھا کہ وہ اتنا طاقتور اور مستحکم ہے کہ اپنی حیثیت کو کمزور کئے بغیر ملکی مفاد کے خلاف جانے والی پالیسی وضع کر سکتا ہے۔ اسے اس بات کی بھی خوش فہمی تھی کہ وہ جب چاہے عوامی ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے۔ ان تمام خوش فہمیوں کے باوجود اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ایک بڑی طاقت کی ناراضی مول لے اور ایسے کئی واقعات بالترتیب رونما ہوئے جن سے واضح ہو گیا کہ کس طرح عوامی امنگوں کو نظر انداز کر کے غیر ملکی طاقت کو خوش رکھنے' حمایت کی گئی۔

وقت نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ یہ معاہدے پاکستان کے لئے اس وقت بھی مضر اور نقصان دہ تھے جب پاکستان کو فوجی امداد مل رہی تھی۔ جب پاکستان اس حیلے بہانے سے سنٹو کا رکن بن گیا کہ سرد جنگ برصغیر تک آپہنچی ہے جواہر لال نہرو سیٹو کو اپنی سالمیت کا مخالف قرار دے کر کشمیر کے مسئلے پر اپنے ملک کے وعدوں سے منحرف ہو گیا۔ دوسری طرف سوویت یونین نے سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر پر ویٹو کر کے پاکستان کو سزا دی۔ سوویت یونین نے یہاں تک جانبداری اختیار کر لی کہ بھارت کے دورے کے دوران وزیر اعظم خروشیف نے سری نگر جانے کا ارادہ ظاہر کیا جو کہ متنازعہ ریاست کا دارالحکومت ہے اور یہاں سے انہوں نے دنیا پر ظاہر کیا کہ سوویت یونین جموں اور کشمیر کو بھارت کا ایک الحاقی حصہ تسلیم

www.bhutto.org

کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کو سزا دینے کے لئے سوویت یونین نے افغانستان کے اس بے بنیاد اور باطل دعوے کو مزید تقویت دی کہ پاکستان کے کچھ علاقے افغانستان کا حصہ ہیں۔ مغربی حلیفوں کے خلاف سوویت یونین کی مخالفت کو مدِنظر رکھتے ہوئے جواہر لال نہرو نے اس بڑی طاقت کے ساتھ تعلقات وسیع کئے اور اس سے انتہائی فائدہ اٹھایا جو پاکستان کے لئے نقصان دہ تھا۔ اقوامِ متحدہ اور عالمی مسائل میں ان دونوں ممالک کے تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ بھارت نے غیر جانبدارانہ ممالک پر مشتمل تیسری دنیا کی سربراہی حاصل کرلی۔ یہ تعاون صرف اہم ترین سیاسی مدد تک ہی محدود نہ تھا بلکہ معاشی اور فوجی مسائل تک محیط تھا۔ بھارت کو دی جانے والی روسی امداد میں ہر سال معتدبہ اضافہ ہوا۔ سوویت یونین نے پاکستان کو قطعی طور پر نظرانداز کردیا۔ جو اس کا نسبتاً قریبی ہمسایہ تھا اور غیر مبہم طور پر بھارت کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ ان تمام امور کی واضح طور پر اسوقت نشاندہی ہوئی جب پاکستان سیٹو کا ممبر بنا۔ اس سے بہت پہلے' ملک کی آزادی کے فوری بعد سوویت یونین نے پاکستان کے ساتھ دوستی کی خواہش کی تھی اور بھارت کے وزیراعظم کو روس آنے کی دعوت سے پہلے پاکستان کے پہلے وزیراعظم (لیاقت علی خان) کو ماسکو آنے کی دعوت دی تھی۔

پاکستان کے حلیفوں نے نہ صرف ہمسایہ کمیونسٹ ممالک کو پاکستان کا مخالف بنایا بلکہ پاکستان کا ہر غیر جانبدار ہمسایہ ملک بھی پاکستان کے بارے میں بدگمان ہوگیا تھا۔ برما جو اپنی سرحد کے چند جزیروں کی ملکیت کے سلسلے میں الجھا ہوا اپنی غیر جانبداری کو بحال کرنے میں پریشان تھا' اسے پاکستان کے سنٹو کے ممبر بن جانے سے تشویش پیدا ہوئی۔ افغانستان نے سرد جنگ میں پاکستان کے وعدوں اور کردار کو دیکھا تو اس نے اپنے بہتر مفادات کے لئے غیر جانبدار اور اشتراکی ممالک کے ساتھ روابط پیدا کرلئے۔ انڈونیشیا جو ایک تہلکہ خیز غیر جانبدار پالیسی کا حامل تھا' اس نے پاکستان کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار بھارت کے ساتھ تعلقات کے فروغ کی صورت میں کیا۔ مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستوں نے پاکستان کی سنٹو میں شمولیت کو عرب ممالک کے تحفظ کے خلاف ایک خطرہ محسوس کیا۔ اسی زمانے میں بھارت نے نیپال' سکم اور بھوٹان پر اپنی جاگیردارانہ نوعیت کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان ہمسایہ ممالک کو اپنے دوستوں میں شمار نہ کرسکے۔ اب ہمارے دو ہی ہمسایہ ممالک باقی رہ گئے تھے۔ چین اور ایران۔ بنیادی طور پر سیٹو کی تشکیل چین ہی کے خلاف تھی۔ اس لئے پاکستان کے لئے یہ ایک کٹھن کام تھا کہ وہ ایک ایسے ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرسکے جسے پاکستان کے حلیف ممالک ناپسند کرتے تھے۔ اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سوائے ایران کے' پاکستان کے تعلقات اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ غیر تسلی بخش تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کا تعلق سیٹو اور سنٹو سے تھا۔

سنٹو نے نہ صرف پاکستان کے مفادات کو شدید نقصان پہنچایا' بلکہ اگر بھارت اور چین کا تنازع پیدا نہ ہوتا تو اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک تباہی کا سبب پیدا ہوتا۔ شاید عوامی جمہوریہ چین کو مستقبل کا پہلے سے اندازہ تھا۔ بالخصوص ہمالیہ کے سرحدی علاقے کے بارے میں چین کو تنازعے کے امکانات کا

www.bhutto.org

احساس تھا۔ اسی لیئے آغاز سے ہی حکومت چین نے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پاکستان نے چین کو 1950ء میں تسلیم کر لیا تھا۔ مگر یہ قدم ایک طرح سے برطانیہ کی تقلید میں اٹھایا گیا تھا' جو اس وقت پاکستان کا پاسبان تھا۔ اسی لیئے اس عمل میں معاملے کی اہمیت اور اپنی خودمختاری کے اظہار کا بہت کم دخل تھا۔ اس کے بعد ایک بار پھر برطانیہ کی پیروی میں پاکستان نے اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت کے سلسلے میں مدد دی۔ مگر جب پاکستان اپنے نئے نگران' امریکہ کے زیر اثر آیا تو پاکستان نے اپنے رویے میں تبدیلی اختیار کر لی۔ اپنے حلیفوں کی خاطر۔ عام حالات میں' چین کو اتنی ہی اہمیت دی گئی کہ کئی بار اگر اسے مشتعل نہیں کیا گیا تو تکلیف دہ صورت حال سے ضرور دوچار کیا گیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 1957ء کے اجلاس میں شریک پاکستانی وفد کے ایک ممتاز مندوب نیم سرکاری حیثیت سے تائیوان گئے۔ یہ قدم پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے حزب مخالف کے ارکان کی تسلی کے لیئے اٹھایا گیا تھا جو جمہوری انداز سے منتخب ہوئے تھے کیونکہ اس وقت حکومت یہ ارادہ کر چکی تھی کہ وہ اپنی مسلح افواج کا ایک دستہ کوریا میں اپنے حلیفوں کی مدد کے لیئے روانہ کرے۔ ایک سمجھوتے کے تحت پاکستان کورین کمیشن کا رکن بن چکا تھا۔ اس وقت چین اور بھارت کے تعلقات بڑھ رہے تھے۔ وزیراعظم نہرو نے اس صورتحال سے پوری طرح' پاکستان کے خلاف اسی طرح فائدہ اٹھایا' جیسے وہ سنٹو کے سلسلے میں فائدہ اٹھا چکے تھے۔ نہرو نے وزیراعظم چواین لائی کو انتہائی حد تک ترغیب دی کہ وہ متنازعہ فیہ ریاست کشمیر کے صدر مقام سری نگر کا دورہ کریں۔ مگر وزیراعظم خروشیف کے عمل کے بالکل برعکس' چین کے وزیراعظم نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے باوجود کہ چین اور بھارت کے درمیان نہایت اچھے تعلقات تھے اور پاکستان اور چین کے تعلقات غیر تسلی بخش تھے' بھارت اپنے مفادات کے لیئے چین کو استعمال کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

1954ء میں بانڈونگ کانفرنس کے موقع پر چین اور پاکستان کے درمیان جو رابطہ قائم ہوا اس کے نتائج کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ اہم ملاقات' جو پاکستان اور چین کے وزرائے اعظم کے درمیان کانفرنس کے دوران ہوئی' سرکاری بیانات کے علاوہ اس کا ایک اور بھی پس منظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض دوسرے جانبدار ممالک کی طرح پاکستان نے بھی بانڈونگ کانفرنس میں مغربی مفادات کی نگہداشت کے لیئے شرکت کی اور اس مسئلے پر افریقہ اور ایشیا کے باہمی اتحاد اور اغراض و مقاصد سے کہیں زیادہ توجہ دی تھی۔ اسی طرح وزیراعظم سہروردی کے 1956ء کے دورہ چین کو بہت ہوا دی گئی ہے۔ حالانکہ نہ تو بانڈونگ کانفرنس کے رابطے سے' اور نہ ہی وزیراعظم سہروردی کے 1956ء کے دورہ چین سے ہی دونوں ممالک کے درمیان اطمینان بخش افہام و تفہیم پیدا ہوئی تھی۔ جدید زمانے میں دوروں کا تبادلہ' یا عمومی تجارتی تعلقات اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان سے باہم دگر گہرے تعلقات پیدا ہو سکیں۔ چانسلر ایڈینار نے ماسکو کا دورہ کیا تھا اور سوویت یونین اور فیڈرل ری پبلک آف جرمنی کے درمیان تجارتی تعلقات بھی قائم ہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی نہیں ہے۔

www.bhutto.org

چین کے دورے کے کچھ دیر بعد مسٹر سہروردی نے امریکہ کا دورہ کیا اور وہاں کچھ ایسے بیانات دیئے، جنہیں چین نے اپنے خلاف سمجھا جب جنرل اسمبلی میں '1960ء میں' چین کی شمولیت پر غور کیا گیا تو پاکستان نے اپنا پہلا مؤقف اختیار کیا اور چین کی شمولیت کی حمایت کی۔ مگر جب یہ مسئلہ پلینری سیشن میں پیش ہوا تو پاکستان نے امریکی اثر کے دباؤ سے اپنے مؤقف میں تبدیلی اختیار کر لی۔ 1960ء میں جب لاؤس میں صورت حال خراب ہوئی تو صدر ایوب نے بڑی گرمجوشی سے اعلان کیا کہ اگر امریکہ اس وقت سیٹو کے لیے کوئی کام تفویض کرتا ہے تو پاکستان فوجی تعاون کے لئے آمادہ ہے اور جب امریکہ سرسری طور پر ایک بٹالین بھجوانے کی درخواست پر غور کر رہا تھا تو ایوب خان وہاں پورا بریگیڈ بھیجنے کے لئے تیار تھے۔

ہم پر کس حد تک دباؤ تھا اور ہم کہاں تک پہنچ چکے تھے، اس کی سب سے بہتر شہادت، اور صدر ایوب کی انتہائی چین دشمنی کی مثال۔ اس پیشکش سے بھی مل سکتی ہے جو بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدے کی صورت میں کی گئی۔ اس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ یہ مشترکہ معاہدہ "شمال کی طرف سے خطرے" کے خلاف ہوگا۔ ایوب خان کی حکومت چین کے خلاف کہاں تک تعصب رکھتی تھی، اس کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کسی جائز اور صحیح خطرے کے نہ ہونے کے باوجود، بلاشبہ کسی وجہ اور جواز کے، ایوب خان نے بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی۔ بھارت، جو ہمارا روایتی حریف اور دشمن تھا جس نے پاکستان کے کئی علاقے اور حقوق غصب کر رکھے تھے، ان سب باتوں کی تنسیخ کرتے تھے۔ چین جیسی بڑی ہمسایہ طاقت کے ساتھ دشمنی مول لی جا رہی تھی، حالانکہ اس کے ساتھ پاکستان کا کوئی جھگڑا اور تنازعہ نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر ایوب پاکستان کی خود مختاری کو دشمن ملک بھارت کے ساتھ مل کر، چین کے خلاف، ختم کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ حالانکہ چین اور پاکستان کا بھارت کے خلاف ایک مشترکہ مقصد موجود تھا۔

چین کے متعلق پاکستان کا منفی رویہ 1962ء میں چین بھارت جھڑپ ہونے تک برقرار رہا۔ اگر ایوب خان اس جھگڑے کی صحیح نوعیت اور اسباب کو پوری طرح سمجھ لیتا اور اس وقت فیصلہ کن اقدام کرتا تو پاکستان کئی بڑے نقصانات اور تباہیوں سے بچ جاتا بلکہ اپنے جائز حقوق کو بھی منوا لیتا اور اپنے مفادات کو بھی فائدہ پہنچا سکتا تھا مگر ہوا یہ کہ حکومت نے تعطل کی راہ اختیار کی اور امریکہ کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں خوفزدہ رہنے لگی۔

پچھلے دس سالوں میں جن ممالک نے آزادی حاصل کی ہے، ان میں ایک بھی ایسا ملک نہیں ہے جس نے فوجی امداد کے بدلے میں غیر جانبداری کی راہ کا انتخاب کیا ہو۔ اگرچہ قطعی طور پر یہ ایک اتفاقیہ صورت حال نہیں ہے، تاہم پاکستان نے اپنی تمام فوجی امداد، غیر جانبداری کے تمام امکانات کو ختم کر کے حاصل کی اور سینٹو اور سیٹو کے بارے میں ہمیشہ ایک معذرت آمیز رویہ جاری رکھا۔ یہ معاہدے اس بری طرح ناکام رہے کہ ان معاہدوں کی بانی حکومت امریکہ بھی ان سے لاتعلق ہونے لگی ہے۔ حکومت امریکہ نے غیر جانبدار ممالک کے لئے ایک نئے رویے کو فروغ دیا ہے۔ ویت نام کی لڑائی کے بعد ایشیا میں امریکی

www.bhutto.org

پالیسیوں کو دوبارہ جانچا اور پرکھا جانے لگا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اب امریکہ ایک بار پھر یورپ اور مشرق وسطیٰ پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ ان تمام پابندیوں کو ذہن سے نکال کر اور جانبداری کی زنجیروں سے اپنے قدموں کو آزاد کرنے کے بجائے' ایوب حکومت نے احمقانہ طور پر ان معاہدوں کی بے عملی کا جواز پیش کرنا شروع کر دیا۔ دس سال سے زائد کا تلخ تجربہ اس حقیقت کو ظاہر کر چکا ہے کہ جانبداری کی پالیسی نے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ امریکہ نے پاکستان کو ان معاہدوں میں چین اور روس کے خلاف اپنی عالمی پالیسی کے ایک شریک کی حیثیت سے شامل کیا۔ پاکستان ان معاہدوں میں اس لئے شریک ہوا تھا کہ وہ بھارتی جارحیت کے خلاف اپنے تحفظ کے لئے فوجی امداد اور تحفظ حاصل کر سکے۔ وہ ان معاہدوں میں اس لئے شریک نہ ہوا تھا کہ اسے سوویت یونین یا چین کے خلاف کوئی دشمنی تھی۔ اس بنیادی بے قاعدگی کی وجہ سے اس نے ہر جانبدار ملک کے مقابلے میں تلخ ترین فصل کاٹی۔ پاکستان کو اپنے عملی تضاد کا تجربہ 1965ء میں بھارتی جارحیت کے دوران ہوا۔ پاکستانی عوام نے فوجی امداد کے مفاد کے باوجود اس جانبداری کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اگر پاکستانی عوام کو یہ حق دیا جاتا کہ وہ فوجی امداد سے منسلک جانبدارانہ پالیسی یا فوجی امداد سے محروم غیر جانبدار اور آزادانہ خارجہ پالیسی کا انتخاب کریں تو اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ پاکستانی عوام آزاد خارجہ پالیسی کے حق میں فیصلہ دیتے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایوب حکومت نے اس وقت بھی سیٹو اور سینٹو سے علیحدہ ہونے سے انکار کر دیا جبکہ فوجی امداد کو بند ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ ایوب خان کے آخری وزیر خارجہ مسٹر ارشد حسین نے حکومت کی پالیسی کے بارے میں' راولپنڈی میں قومی اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے 28 جون 1968ء کو یہ تسلیم کیا کہ جانبدارانہ پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔

"عالمی صورت حال میں تبدیلی کی وجہ سے یہ معاہدے خاصی حد تک اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ ان معاہدوں کے ساتھ پاکستان کی دلچسپی پر اس وقت مہر لگ گئی تھی' جب ہمارے بعض حلیف ممالک 1965ء میں بھارت کی جارحیت کے خلاف ہماری مدد کرنے میں ناکام رہے۔"

اس اعتراف کے باوجود وزیر خارجہ نے کہا۔

"بعض ارکان یہ چاہتے ہیں کہ ان معاہدوں کو چھوڑنے کا کھلا اعلان کیا جائے مگر میں یہ پسند کروں گا کہ یہ جس حالت میں ہیں' ویسے ہی رہیں۔"

اطلاعات کے مطابق مسٹر ارشد حسین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس معاملے میں حلیفوں کو "طلاق دینے" کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے وہ نقطہ نظر اور رویہ جس سے ہماری اسلامی جمہوریہ کی حکومت جانبداری اور خود مختاری' جنگ اور امن' غلامی اور آزادی کے بنیادی مسائل کو دیکھتی رہی ہے اور یوں بیگانہ انداز میں حکمرانی اور غلامی کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اگر مسٹر ارشد حسین نازک ترین مسائل کو جھوٹی اقدار کے حوالے سے کم کرنا چاہتے ہیں' اگر وہ استعاروں ہی سے بات سمجھتے ہیں' تو انہیں جان لینا

www.bhutto.org

چاہیے کہ حکومت امریکہ آج سے تین سال پہلے ہمیں طلاق دے چکی ہے اور اس طلاق کا جواز۔ امریکہ کا عدم تعاون ہی ہے۔ اس کے عین برعکس کہ اس نکاح کو ختم کر کے حق مہر کا دعویٰ کیا جاتا' ایوب خان کی حکومت نے ایک بڑی طاقت کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دی۔

ہمارے چو طرفہ معاہدوں اور تعلقات کی ایک شکل۔ دولت مشترکہ ہے۔ یہ ادارہ اب زنجیر پا بن چکا ہے۔ پاکستان ایک قومی اور بڑی طاقت کی حیثیت سے سامنے آتا اگر ہم نے یہ بے کار پابندی اپنے اوپر عائد کر کے اپنی طاقت کو ضائع نہ کیا ہوتا۔ ملک کی آزادی کے وقت دنیا میں برطانوی مفادات کے تحفظ کے لئے سلطنت برطانیہ کو دولت مشترکہ کے قالب میں منتقل کیا جا رہا تھا۔

اس انتقال کی خاطر مونٹ بیٹن کے الفاظ کے مطابق "پاکستان کو "ایک خیمہ" کی طرح قائم کیا گیا تھا اور مسلمانوں کو ان کے اپنے بہت چھوٹے ملک میں ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا گیا تھا جو قائم نہ رہ سکتا تھا۔ اور اس خیمے کو کھڑا کرنے کے لئے کئی علاقوں' نہ صرف فیروز پور اور امرتسر بلکہ گورداسپور کو۔ تقسیم کے اصولوں کو پامال کر کے بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ گورداسپور کو پاکستان سے علیحدہ کر کے برطانیہ نے بھارت کا کشمیر سے رابطہ قائم کر دیا۔ باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین لارڈ ریڈکلف نے کسی سبب کو بیان کرنے کی زحمت کئے بغیر مسلم اکثریت کا بڑا علاقہ بھارت میں مدغم کر دیا۔ انہوں نے اپنے ایوارڈ میں صرف اتنا بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

"میں خاصی مدت تک دریائے ستلج کے مشرقی علاقوں اور بیاس اور ستلج کے علاقوں کے بارے میں پس و پیش میں مبتلا رہا ہوں۔ ان علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ مگر آخر میں' میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مغربی پنجاب کے ان علاقوں سے ریاست کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا جو دریائے ستلج کے آخری اور بہت دور کے علاقے ہیں اور پھر یہ کہ ان علاقوں میں ریلوے کے وسائل منتشر حالت میں ہیں اور پانی کا نظام بھی صحیح نہیں۔ اس لئے اس وقت گنجان اور اکثریت والے علاقے سے صرف بنیادی دعویٰ کی خاطر لوگوں کو بے دخل نہ کرنا چاہیے۔"

ریلوے کی پٹڑیاں اگر منتشر حالت میں تھیں تو انہیں آئندہ درست کیا جا سکتا تھا مگر ریڈکلف ایوارڈ نے پانی کے نظام کو بحال رکھنے سے قطع نظر جو نئے مسائل اور انتشار پیدا کیا وہ آج بھی موجود ہے۔ پٹھان کوٹ کو بھارت کا حصہ بنا کر' نہ صرف مسلم اکثریت والا علاقہ بھارت کو دے دیا گیا بلکہ وہ ہیڈورکس بھی دے دیئے گئے جو اپر باری دو آب پر واقع ہیں اور جو مغربی پاکستان کی آبیاری کرتے ہیں اور پھر کوئی وجہ بیان کئے بغیر ریڈکلف ایوارڈ نے فیروز پور کا مسلم اکثریت کا علاقہ بھارت کو دیدیا' جہاں دیپالپور نہر کے ہیڈورکس واقع ہیں جو مغربی پاکستان کی وسیع اراضی کی آبپاشی کرتے ہیں جب 1948ء' 1952ء' 1958ء میں بھارت نے ان نہروں کا پانی روک لیا تو پاکستان کو بھاری نقصان پہنچا۔

تنازعہ کشمیر کی جڑیں بھی ریڈکلف ایوارڈ میں ہیں۔ لارڈ برڈووڈ نے اپنی کتاب "دو قومیں اور کشمیر"

www.bhutto.org

میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگر ریڈ کلف ایوارڈ کے فیصلے کے تحت مسلم اکثریت کا ضلع گورداسپور بھارت کو نہ دیا جاتا تو بھارت کبھی بھی کشمیر میں اپنی فوجیں اتارنے کے قابل نہ ہو سکتا اور نہ ہی انہیں وہاں رکھ سکتا۔

برطانیہ نے طاقت کا انتقال جون 1948ء کے بجائے اگست 1947ء کو اسی بنا پر کیا تاکہ بھارتی قیادت فائدے میں رہے۔ کانگریس نے بہت پہلے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ تقسیم ملک کو قبل از وقت عمل میں لانے سے پاکستان ختم ہو جائے گا۔ بھارتی رہنماؤں نے ڈومینین سٹیٹس کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جب تقسیم ملک کی تاریخ قریب آئی تو دولت مشترکہ کے رکن بننے کی رعایت بھی حاصل کر لی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس تجویز کو سراہنے پر 'وی پی مینن کے نام اپنے خط میں لکھا۔

"آپ ہی وہ پہلے آدمی تھے جس نے میرے ڈومینین سٹیٹس کے نظریئے پر پوری رضامندی کا اظہار کیا اور پھر اس کا وہ حل تلاش کیا جو میں نے خود بھی نہ سوچ رکھا تھا یعنی اقتدار کی قبل از وقت منتقلی کے موقع پر اسے قابل قبول بنانے کا حل۔

دولت مشترکہ کا مفاد اسی سے وابستہ تھا کہ پاکستان کو ایک خیمے کی طرح کھڑا کیا جاتا۔ چنانچہ آغاز ہی سے پاکستان نے بھارت کی نسبت' دولت مشترکہ میں گرمجوشی دکھائی۔ آج دولت مشترکہ زوال کے راستے پر گامزن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برطانیہ کی "وزارت امور دولت مشترکہ" کو وزارت خارجہ میں مدغم نہ کیا جاتا۔ برطانیہ یورپ میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ حالات نے اسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی "شرق سویز" کی پالیسی کو ترک کر دے۔ اس کا لازمی اثر دولت مشترکہ پر بھی پڑے گا۔ جونہی حکومت نے اپنی روایتی اور پرانی میراث کو ختم کیا' برطانیہ اپنے تعلقات کی بنا پر یورپ میں اپنا مقام حاصل کر لے گا اور دولت مشترکہ متروک ہو کر رہ جائے گی۔ دولت مشترکہ کے رنگدار تارکین وطن کے خلاف برطانیہ کے لوگوں کے جذبات بہت شدید اور خطرناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ برطانیہ کی حکومت یورپ میں اپنا مقام نہ حاصل کر سکی۔ برطانیہ اپنی استعداد کے مطابق اپنے معاہدوں پر نظرثانی کر رہا ہے۔ برطانوی حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ اب وہ اس قابل نہیں رہی کہ اپنے آپ کو دور دراز کی سرزمینوں تک پھیلا سکے۔ مگر ایوب خان کی حکومت کا آخری وقت تک اس مفروضے پر ایمان رہا کہ چو طرفہ معاہدوں اور پابندیوں سے پاکستان کو دور تک پھیلایا جا سکتا ہے۔

فرخا بیراج کا تنازعہ انصاف کی عالمی عدالت میں اس لئے نہ جا سکا کہ پاکستان دولتِ مشترکہ کا رکن تھا۔ حالانکہ دریا کے زیریں صارف کی حیثیت سے پاکستان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عالمی قانون کے تحت اپنا حق حاصل کر سکے۔ دنیا میں گنگا اور سندھ صرف دو ہی دریا نہیں ہیں' عالمی حیثیت کے کئی دریا ہیں۔ جہاں کہیں بھی زیریں صارف کے حقوق کا سوال اٹھا ہے اسے مناسب طریق کار سے حل کیا گیا ہے لیکن ایوب خان کی حکومت نے مؤثر طریق کار کو اختیار نہ کیا۔ ایک مدت تک اس مسئلے سے آنکھیں پھیر کر نقصان اٹھایا گیا۔ حتیٰ کہ بھارت اس بیراج کی تکمیل کے آخری مرحلے تک پہنچ گیا ہے۔ اگر دریائے

www.bhutto.org

گنگا کے پانی سے بھارت نے انکار کر دیا تو لاکھوں افراد لازماً فاقوں اور موت کا شکار ہو جائیں گے۔ اس مسئلے کی طرح دولت مشترکہ تنازعہ کشمیر کے حل کیلئے بھی مددگار ثابت نہیں ہو سکی۔ اگرچہ دولت مشترکہ کے ضوابط اس کی اجازت نہیں دیتے' مگر پاکستان کو خالی خوش کرنے کے لئے 1951ء اور 1964ء میں دوبار' اس تنازعے پر بحث کی گئی اور دونوں بار یہ تنازعہ جب مشترکہ اعلامیہ میں پایا گیا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ میں 1964ء میں وزیر خارجہ تھا' مگر میں نے اس وقت کوئی خوشی محسوس نہ کی بلکہ مجھے دولت مشترکہ کی بے اثری کا اور بھی احساس ہوا جہاں بہت شور ہوتا ہے مگر عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا۔ برطانوی اپنی اس ضرورت کو محسوس کر چکے ہیں کہ ہم جیسی قوموں سے اپنے جبری اثرو رسوخ کو ختم کر دیں۔ مگر ایوب خان دولت مشترکہ کے ساتھ وابستگی کو اتنا اہم خیال کرتا تھا کہ عین اس وقت جب پاکستان میں حالات قابو سے باہر ہو رہے تھے' اس نے کہیں جنوری 1969ء میں جاکر لندن میں دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا جبکہ پاکستان میں صورت حال انتہائی خطرناک رخ اختیار کر چکی تھی۔ اس نے برطانوی وزیر خارجہ مائیکل سٹورٹ کو یقین دلایا کہ وہ کانفرنس میں حصہ لے گا۔ اسے اس حقیقت کا قطعی احساس نہ تھا کہ اب عوام اس کو حکومت سے ہٹانے کے لئے آخری مرحلے پر پہنچ گئے ہیں اور وہ اسے لندن جانے کی مہلت نہ دیں گے اور نہ ہی برطانیہ جنوبی رہوڈیشیا کے بارے میں اپنی پالیسی کے لئے ایوب خان کو استعمال کر سکے گا۔ بدترین صورت حال یہ تھی کہ سابقہ صدر نے اسی وقت لندن میں کانفرنس میں شریک ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا جب برطانیہ کا وزیر خارجہ پہلی بار سرکاری طور پر راولپنڈی میں 28 ر نومبر 1968ء کو اپنے واضح کھلے بیان میں 'اقوام متحدہ کے ریزولیوشن سے انحراف کر چکا تھا' جو کشمیر اور جموں کے بارے میں منظور کیا گیا تھا۔

پاکستان اس وقت تک اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا' جب تک وہ مخالف طاقتوں میں متوازن مقام حاصل نہیں کر لیتا۔ بنیادی طور پر یہ توازن ایشیا پر مرکوز خارجہ پالیسی کے احیاء سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے ہم ایشیا کا ایک حصہ ہیں اور یہ ایک غیر متبدل اور مستقل حیثیت ہے۔ جب تک ہم مختلف مقاصد رکھنے والے' دور دراز کے علاقوں اور ملکوں کے ساتھ 'اپنے وسائل سے باہر' پابندیوں' تعلقات اور معاہدوں میں جکڑے الجھے ہوئے ہیں' اس وقت تک ہم ایشیا میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتے۔

پاکستان کے ایران اور ترکی کے ساتھ تعلقات آزادی کے زمانے سے ہی گہرے رہے ہیں۔ لیکن آر سی ڈی کہیں 1964ء میں جاکر قائم ہوئی اور اس کا وجود اس وقت عمل میں لایا گیا جب سینٹو کمزور ہو چکی تھی۔ اگر سنٹو فعال صورت میں رہتی تو اس کے اثرات آر سی ڈی کے فطری تعلقات کے فروغ اور نشوونما کی راہ میں مزاحمت کا باعث بنتے۔ جس وقت سنٹو کا طویل سایہ دور ہوا پاکستان' ایران اور ترکی کے درمیان کہیں زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔

دور دراز کے مختلف المقاصد ممالک کے ساتھ معاہدوں نے پاکستان کی صحیح شخصیت ابھرنے نہیں دی۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہمیں جو طرفہ معاہدوں سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور ایسے

www.bhutto.org

قدرتی تعلقات پیدا کرنے چاہئیں جوان شرائط پر قائم ہوں ' جو مناسب عالمی رویّوں اور اصولوں کے مطابق ہوں ' اگر ایوب خان کی حکومت ان معاہدوں کو توڑنے سے خوفزدہ تھی جو ناکارہ ہو گئے تھے تو اسے کم از کم اپنے ضمیر کی آواز کو اتنی اہمیت ضرور دینی چاہیے تھی کہ وہ دوطرفہ معاہدوں پر کاربند ہوتی اور کنسور شیم سے قطع تعلق کر لیتی۔

کنسور شیم طاقتور قوموں کے سلوک کی وضع کردہ شرطوں پر سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ سرمایہ فراہم کرتے وقت قرض خواہوں میں پہلے ہی باہمی شرائط طے ہو جاتی ہیں۔ قرضہ دینے والی قوموں اور قرضہ لینے والی ترقی پذیر قوم کے درمیان جو غیر مساوی مفاہمت ہوتی ہے اس میں جبر کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح کنسور شیم اپنے رکن ممالک کی خواہش کے مطابق منصوبوں کی تقسیم کر کے اپنی طاقت بحال رکھتا ہے اور اپنی اجتماعی سہولت اور مناسبت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کسی بھی پنج سالہ منصوبے کو رد کر سکتا ہے۔

دراصل کنسور شیم معاشی اقتدار کی ایک شکل ہے اور خارجہ پالیسی میں مداخلت کا ایک حربہ!

ایوب خان کی حکومت چوطرفہ اور دوطرفہ فوجی معاہدوں کی پابندیوں سے منسلک رہ کر پاکستان کی سلامتی کے ساتھ خطرناک کھیل کھیلتی رہی ہے جب کہ اب وہ فوجی امداد بھی نہیں مل رہی جو ان معاہدوں کا ایک جواز سمجھی جاتی تھی۔ بہرحال ہم اپنا بہت زیادہ وقت کھو چکے ہیں۔ پاکستان اپنے بنیادی مفادات کے ساتھ زیادہ دیر تک بے تعلق نہیں رہ سکتا ' ہمیں جلد از جلد ملک کو ان گنت معاہدوں اور پابندیوں سے علیحدہ کرنا چاہیے جو اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اس کا آغاز اس صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ ہم کنسور شیم کو دوطرفہ معاشی معاہدوں کے ایک سلسلے میں ڈھال دیں اور یہ راہ اختیار کریں کہ دولت مشترکہ کی صف رضا کارانہ طور پر لپیٹ دی جائے۔

ان اقدامات کے ساتھ ساتھ امریکہ کو مطلع کرنا چاہیے کہ یا تو وہ فوری طور پر پاکستان کی اس فوجی امداد کو بحال کرے ' جو 1965ء میں بند کر دی گئی تھی اور یہ امداد مؤثر انداز میں ' مساوی بنیادوں پر ' باہمی اور طے شدہ دوطرفہ فوجی معاہدوں کے مطابق دی جائے یا پھر ان معاہدوں کو ختم سمجھا جائے۔

میری رائے میں پاکستان کا حقیقی مفاد بہتر طور پر اس طرح پورا ہوتا ہے کہ بے کار معاہدوں سے چھٹکارا پا لیا جائے۔ ملک کو جانبدارانہ اور خطرناک فوجی ذمہ داریوں سے آزاد کیا جائے اور جب ایک بار یہ ہو گیا تو پاکستان کی سلامتی اور خود مختاری یقینی ہو جائے گی۔

ترجمہ..... ستار طاہر

علاقائی تعاون کی روسی تجویز

امریکہ کے سابق صدر جانسن کی یہ خواہش تھی کہ جب وہ اپنی سیاسی زندگی کو خیرباد کہیں تو ان کو ایسے مدبّر کا اعزاز حاصل ہو جس نے ویت نام کی جنگ بند کرائی اور عالمی امور میں ایشیا کو ایک نیا مقام عطا کیا۔ مگر آج جو کچھ ویت نام میں ہو رہا ہے یا ایشیا کی جو حالت ہے ' وہ صدر جانسن کے لئے کسی صورت

میں بھی باعث افتخار نہیں اور تاریخ انہیں بڑا مقام نہیں دے گی۔ ان کی بے شمار غلطیوں اور لاتعداد لغزشوں کا ازالہ اس بات سے نہیں ہو جاتا کہ اب وہ عہدہ صدارت کو خیرباد کہہ کر اپنے "گھڑ پال" پر چلے گئے ہیں، کیونکہ ان کے غلط فیصلوں سے دنیا کو بہت دکھ اٹھانے پڑے ہیں۔ امریکہ کے اس سابق صدر نے اپنے عہدے کے وسیع اختیارات سے فائدہ اٹھا کر ہمارے ملک پر بھی اپنی سیاسی شرائط ٹھونسنے کی کوشش کی تھی۔ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ پاکستان کے روز افزوں تعلقات کی وجہ سے میں بھی ان کی ناپسندیدگی کا نشانہ بنا تھا اور ویت نام کے متعلق میرے موقف نے تو ازحد خفا کر دیا تھا۔ صدر جانسن نے جس وجہ سے مجھے 1965ء میں سزا دینے کا تہیہ کیا تھا' وہی وجہ انجام کار ان کی 1968ء میں سیاسی زندگی سے علیحدگی کا باعث بنی اور پاکستان کے سابق صدر کا بھی یہی حال ہوا جو بیرونی دباؤ کے سامنے جھک گئے تھے۔ پاکستان کے عوام بدعنوان آمریت سے نفرت کی بناء پر وقت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی یہ عظیم تحریک آخر کار ایوب خان کی معزولی کا باعث بنی۔ اب انہی عوام کا فرض ہے کہ وہ قومی تعمیر نو کے عظیم فریضہ کی انجام دہی کے لئے باہم متحد ہو جائیں۔

ایوب خاں کی خارجہ پالیسی بھی اتنی تباہ کن تھی جتنی کہ ان کی داخلی حکمت عملی۔ اس ناکام آمر نے پاکستان کو اپنے ہی تیار کردہ دام میں اس طرح جکڑ دیا تھا کہ نجات کا کوئی راستہ ہی نظر نہ آتا تھا۔ 1958ء میں ان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہی ان کی وفاداریوں کے متعلق کوئی شک وشبہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ ایوب خاں یکطرفہ خارجہ پالیسی کے راستہ پر ہی گامزن رہے حتیٰ کہ 1962ء کے واقعات نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ 1960ء کے اوائل میں "یو 2" طیارے کا واقعہ پیش آیا تو ایوب خاں پریشان ہو گئے اور گھبرا کر روس کے ساتھ تیل کی تلاش کے معاہدے" پر رضامند ہو گئے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن واقعہ 1959ء میں پیش آیا تھا جبکہ عوامی جمہوریہ چین اور بھارت کے مابین سرحدی جھڑپیں شروع ہوئیں۔ ان محدود روس واقعات کے باوجود انہوں نے جانبدارانہ پالیسی بدستور باقی رکھی تا آنکہ 1962ء میں چین اور بھارت کی سرحدی جھڑپوں نے فوجی تصادم کی صورت اختیار کر لی تو روایتی خارجہ پالیسی کا طلسم ٹوٹ گیا اور انجام کار یہی واقعات پاکستان کی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا نکتہ آغاز ثابت ہوئے۔

جانبداری کی پالیسی ایوب خاں کی وضع کردہ ہو یا نہ ہو مگر اس پالیسی کی ناکامی انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ ایوب خاں اپنے مزاج کے لحاظ سے انقلابی حالات سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت سے محروم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حالات خواب پریشاں کی طرح بیت جائیں گے مگر ان حالات کا تقاضا کچھ اور ہی تھا۔ ایک قدم اٹھایا گیا تو دوسرے کی ضرورت پیش آئی اور پاکستان دوسرے سال کے عرصہ میں ہی اپنی علیحدگی ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور انجام کار "تیسری دنیا" کا ایک اہم ترین ملک بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کے سوا تمام ہمسایہ ملکوں سے تعلقات خوشگوار ہوتے گئے۔ مغربی یورپ کے ملکوں میں فرانس سے نئی مفاہمت قائم ہوئی۔ روس اور مشرقی یورپ کے ملکوں۔ خصوصاً رومانیہ کے ساتھ تعلقات

کی نوعیت نے تعمیری تعاون کی صورت اختیار کرلی۔ انڈونیشیا ماضی میں الگ تھلگ ہی رہا تھا مگر اب وہ بھارت سے دور ہوتا چلا گیا۔ سسنگو کی کمزوری سے جو خلا پیدا ہوا تھا' اس کو علاقائی تعاون برائے ترقی کے ذریعہ پُر کیا گیا۔ عرب ملکوں کے رویہ میں تو خاص طور پر قابل ذکر تبدیلی رونما ہوئی۔ لاطینی امریکہ کے متعلق عدم توجہی کی پالیسی ترک کردی گئی جبکہ عوامی چین کے ساتھ افہام و تفہیم کی فضا میں تسلی بخش رابطہ قائم ہو گیا۔ مجموعی طور پر ہماری خارجہ پالیسی میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور یہ سب کچھ نسبتاً امن و سکون کی فضا میں طے پایا۔ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ بھارت کو مدافعانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔ 1947ء سے 1962ء تک پنڈت نہرو ہی ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ مگر اب تمام باگ ڈور ان کے شاطر ہاتھوں سے چھین لی گئی۔

غیر جانبداری کے نئے حامی

صدر ایوب خاں ان تبدیلیوں کا کافی تشویش کے ساتھ مشاہدہ کرتے آرہے تھے، مگر وہ حالات کے دھارے کا رخ موڑنے سے معذور تھے۔ نہ ہی تبدیلی کے لئے عوامی خواہش کو نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ ادھر تبدیلی کے مخالف حلقے بھی نہایت طاقتور اور بااثر تھے جو اس نئی روش پر از حد طول تھے۔ ان حلقوں نے شکست نہ تسلیم کی بلکہ اپنی قوت مجتمع کرنے کے لئے وقتی طور پر پسپائی اختیار کرلی۔ ابتدا میں تو ان کو اس تبدیلی کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن جب جوش و خروش قدرے کم ہوا تو محتاط نکتہ چینی کی صورت میں مخالفت کا آغاز ہوا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ایک بڑی طاقت کے بجائے دوسری بڑی طاقت کو مسلط کرلینا درست نہ ہوگا۔ بعض لوگ جو پہلے غیر جانبداری کی مخالفت کرچکے تھے' اب غیر جانبداری کے سب سے بڑے حامی بن گئے اور جب امریکہ کی جانبداری کا مسئلہ آیا تو منافقت تکلیف دہ حد تک شدت اختیار کرگئی اور غیر جانبداری کے فوائد اس وقت سامنے لائے گئے جب خارجہ پالیسی کو مکمل جانبداری سے الگ کرنے کا کام شروع ہوچکا تھا۔ متوازن پالیسی کا مطلب ایک انتہا سے دوسری انتہا تک جانے کا لیا جانے لگا چین اور روس کی حمایت میں اگر امریکہ سے ذرا دور جانے کا نام بھی لیا جاتا تو طوفان کھڑا ہوجاتا۔ اس کا مقصد توازن کی حمایت کرنا نہ تھا بلکہ اس توازن کے خلاف خدشات کا اظہار کرنا تھا جو امریکی مفاد کو نظرانداز کرکے قائم کیا جارہا تھا۔ پاکستان کو دس سال سے زائد عرصہ تک ایک ملک کا طفیلی رکھا گیا تھا۔ مگر اب اچانک غیر جانبداری کے فوائد کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ چین کے ساتھ خوش گوار تعلقات کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں۔

جب امریکہ کے ساتھ تعلقات کو بہتر بنانے کا موقع آیا تو سابق صدر انتہائی حد تک کے لئے تیار ہوگئے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی ان ہی کا شاہکار ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ امریکہ کو پشاور میں ماورائے علاقہ حقوق دینے پر تیار ہوگئے۔ انہوں نے 1961ء میں امریکی کانگرس کو نہایت اعتماد کے ساتھ یہ یقین دلایا کہ ایشیا میں صرف پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں امریکی فوجوں

www.bhutto.org

کی آمد کو خوش آمدید کہا جائے گا بلکہ سابق صدر امریکہ کے عالمی مفادات کو تقویت پہنچانے کے لئے بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کی تجویز پر صاد کرنے اور اس طرح پاکستان کی خود مختاری کا سودا کرنے پر بھی تیار ہوگئے تھے۔ لیکن جب دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا مرحلہ آیا تو ان کو یہ خوف لاحق ہوگیا کہ یہ بڑی طاقتیں ملک پر چھا جائیں گی۔ 27 اکتوبر 1968ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے سابق صدر نے پاکستان کی ان مجبوریوں کا ذکر کیا جو ایک بڑی طاقت کے ساتھ تعلقات کے قیام کی راہ میں حائل تھیں۔

پاکستان امریکہ کا طفیلی اور پٹھو بن کر رہ گیا۔ لیکن جب عوامی چین سے دوستانہ تعلقات کی بحالی کی ضرورت پیش آئی تو ایوب خاں نے عوام کو خبردار کرنا مناسب سمجھا کہ اس ملک سے دوستی کرنے میں شدید مجبوریاں آڑے آرہی ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ قومی مفادات کے حصول کی کوشش کی مکمل کر مخالفت ناممکن ہوتی ہے چنانچہ اس مخالفت نے مختلف صورتیں اختیار کرلیں اور ابتدائی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد آزادانہ رجحانات کے خلاف وسیع پیمانے پر مہم شروع کردی گئی۔ اگر امریکہ جنگ ویت نام میں بری طرح الجھا ہوا نہ ہوتا اور یقین نہ کرلیا جاتا کہ ایوب خاں جو مغربی ملکوں کے انتہائی با اعتماد دوست تھے ' عوام کے جذبات ٹھنڈے ہوتے ہی حالات کا رخ موڑ دیں گے تو انتقامی کارروائی بہت پہلے شروع کردی گئی ہوتی۔

اس کے بعد تین اہم ترین سال یوں ہی گزر گئے۔ جوابی کارروائی دو مراحل میں مکمل کی گئی 'ابتدا میں تو سیاسی طور پر یہی بہتر خیال کیا گیا کہ الٹی میٹم سے گریز کیا جائے چنانچہ امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر جارج بال کو 1963ء میں راولپنڈی روانہ کیا گیا تاکہ باہمی اختلافات پر مصالحانہ ماحول میں تبادلہ خیال کیا جائے۔ دوسرا دور قدرے زیادہ جارحانہ تھا' اس کا آغاز جون 1965 میں ہوا جب کہ عالمی بینک کے صدر مسٹر جارج وڈز نے لندن میں ایوب خاں سے ملاقات کے دوران میں تربیلا بند اور دیگر اقتصادی امور پر تبادلہ خیال کیا تھا۔ مسٹر جارج وڈز نے ایوب خاں سے ملاقات سے قبل منصوبہ بندی کے کمیشن ڈپٹی چیئرمین مسٹر سعید حسن کو آگاہ کیا کہ امریکہ اس وقت تک پاکستان کے لئے مزید امداد پر غور نہیں کرے گا جب تک موجودہ وزیر خارجہ اپنے عہدے پر فائز ہے۔ جون 1965ء میں الجزائر میں دوسری افریشیائی کانفرنس منعقد کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تو مسٹر جارج وڈز کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور انہوں نے کھل کر خبردار کرنے کی جرأت کی۔

مسٹر وڈز کی دھمکی کے فوراً بعد ہی امریکہ نے کنسورشیم کا اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کرلیا جو جولائی 1965ء میں منعقد ہونے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی مطالبہ کردیا کہ آئندہ اجلاس سے قبل دونوں ملکوں کے سیاسی اختلافات پر بات چیت کرلی جائے۔

www.bhutto.org

۱۹۶۵ء کی جنگ

پاکستان کے اندرونی مسائل پر مداخلت میں اس کوشش کے خلاف شدید عوامی ردِ عمل ہوا تو امریکی حکومت بھی پریشان ہو گئی اور اس نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجلاس کی وجوہات بیان کرنی شروع کر دیں۔ بحران ابھی جاری تھا کہ 1965ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی۔ اس تاریخ ساز واقعہ کی تفصیل لکھنا ابھی باقی ہے۔ مگر ہمارے عوام نے اپنے وطن کے دفاع کے لئے جس قربانی ایثار اور اتحاد کا مظاہرہ کیا' برصغیر کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج نے نہ صرف حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دیا بلکہ راجستھان کے علاقہ میں دور تک جا گھسیں اور کشمیر کے متنازعہ علاقہ میں پیش قدمی کر کے اکھنور کے نواح تک جا پہنچیں۔ قومی اتحاد کے اس عظیم الشان مظاہرہ اور عوامی چین کے الٹی میٹم نے حالات کو عروج تک پہنچا دیا۔ مگر قومی مقاصد کے حصول کے بغیر ہی جنگ اچانک بند کر دی گئی۔ جنگ بندی کے اعلان پر قوم نے از حد رنج و غم کا اظہار کیا۔

جنگ بندی کے بعد تین سال تک ذہنی پریشانی محسوس کرتے رہنے کے بعد جنرل موسیٰ نے (جو بعد میں مغربی پاکستان کے گورنر بنا دیئے گئے) 25 اکتوبر 1968ء کو حیدر آباد میں اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ جنگ کے دوران میں افواج کے کمانڈر انچیف نے اس موقع پر قوم کو بتایا کہ پاکستان نے جنگ بندی صرف بین الاقوامی رائے عامہ کو خوش کرنے کے لئے قبول کی تھی۔ مگر یہ وضاحت بالکل ناقابل قبول ہے کیونکہ یہ نہ صرف حقائق کے خلاف ہے بلکہ اس مسلّمہ اصول پر بھی پوری نہیں اترتی کہ کوئی بھی قوم نام نہاد "عالمی رائے" کی خاطر اپنے قومی مفادات کو قربان نہیں کر سکتی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ "عالمی رائے" بڑی طاقتوں کی مرضی کے تابع ہے تو ایشیا اور افریقہ آج بھی سامراجی طاقتوں کے غلام ہوتے۔ درحقیقت جنگ بندی پاکستان کے مفاد کے مطابق نہیں تھی بلکہ سلامتی کونسل میں بڑی طاقتوں کے مطالبہ پر عمل میں لائی گئی تھی اور اس کا مقصد عالمی رائے عامہ کو خوش کرنا نہیں تھا' جس کی واحد نمائندگی جنرل اسمبلی کرتی ہے۔ تنازعہ کشمیر کی تاریخ میں یہ دوسرا موقع تھا کہ پاکستان نے یہ مسئلہ حل کرائے بغیر ہی سلامتی کونسل کے احکامات کے آگے سر جھکا دیا۔ جنگ بندی کے فوراً بعد ہی صدر ایوب خاں واشنگٹن کے منحوس سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں لندن میں قیام کے دوران میں انہوں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ولسن سے مشورہ کیا۔ مسٹر ولسن ہی وہ شخص تھے جنہوں نے صدر جانسن کا راستہ صاف کیا تاکہ وہ اپنی شرائط پر مصالحت کر سکیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ واشنگٹن میں ایوب خاں اور صدر جانسن کے درمیان کوئی مفاہمت قرار پا گئی تھی۔ اس موقع پر جاری کردہ سرکاری اعلان میں باہمی اختلافات کو تسلیم کر کے ان کو کم کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ اس وقت پاکستان نے باہمی افہام و تفہیم کے جس جذبہ کا مظاہرہ کیا اس سے خوش ہو کر صدر جانسن اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ پاکستان اور چین کے دوستانہ تعلقات پر کوئی اعتراض نہ کیا

www.bhutto.org

جائے بشرطیکہ پاکستان ان تعلقات کو بڑھاتے وقت امریکہ کے اہم مفادات کو نظر انداز نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی صدر جانسن نے اس بات پر بھی زور دیا کہ پاک بھارت تعلقات غیر مشروط طور پر بہتر بنانے کے لئے دوبارہ کوشش شروع کی جائے۔ صدر جانسن نے یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ امریکہ اس قدر اثر و رسوخ کا مالک نہیں کہ وہ بھارت کو کشمیر سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کر سکے۔ مسئلہ کشمیر حل کئے بغیر بھارت سے تعلقات بہتر بنانے پر زور دینے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ پاکستان اور چین کے باہمی تعلقات پر اثر ڈالا جائے یعنی چین کے متعلق پالیسی میں تبدیلی کا براہ راست مطالبہ کرنے کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔ مگر اس کا نتیجہ امریکہ کی مرضی کے عین مطابق نکلا' وہ طریقہ یہ تھا کہ پاکستان کے مفادات کے خلاف اور خود عوامی چین کے فوائد کے برعکس پاک بھارت تعلقات بہتر بنانے پر بار بار زور دیا گیا کیونکہ پاکستان کے مفادات کے مطابق یا پاکستان و بھارت کے لئے یکساں طور پر مفید مصالحت سے کسی دوسرے ملک کو غلط فہمی ہو سکتی تھی لیکن اصل مقصد تو یہ تھا کہ پاکستان کے مفاد کے خلاف بھارت کو فائدہ پہنچے اور اس کے ساتھ ہی چین کے خلاف امریکہ کی عالمی پالیسی کو تقویت پہنچے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خود چین کو بھی از حد تشویش ہے۔

واشنگٹن میں اپنے کئے گئے وعدے کے مطابق ایوب خاں نے تاشقند میں بھارتی وزیر اعظم آنجہانی مسٹر لال بہادر شاستری سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات روس کے زیر اہتمام ہوئی اور اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ سترہ روزہ جنگ کے اثرات ختم کئے جائیں اور پاک بھارت مفاہمت کو فروغ دیا جائے۔ تاشقند کانفرنس میں پاکستان کی پوزیشن بھارت سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ ہم تاشقند کمزور حیثیت سے نہیں گئے تھے جیسا کہ بعد ازاں اس ملاقات کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے۔ پاکستان نے نہ صرف لاہور کے محاذ پر بھارت کے حملے کا منہ توڑ جواب دیا تھا اور بھارتی فوجوں کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا تھا بلکہ پاکستان کی مسلح افواج بھارت اور مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں دور تک جا گھسی تھیں۔ اس وقت بھارت بالکل یکہ و تنہا رہ گیا تھا اور چین کے الٹی میٹم نے تو اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ بھارت میں خوراک کا از حد توڑا تھا اور اس کے کئی صوبوں میں قحط کا خطرہ تھا۔ اس کی اقتصادی حالت بڑی ہی نازک تھی۔ ناگا اور میزو حریت پسند اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

تاشقند..... کیا کھویا کیا پایا

یہ تھے وہ عیاں حقائق جنہوں نے بھارت کو جنگ بندی کی درخواست کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور انہی حالات کی بناء پر وزیر اعظم شاستری اس بڑی طاقت کی پیشکش قبول کرنے پر تیار ہو گئے تھے جو جنگ تک اس موقف پر قائم رہی تھی کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان نے ایک جائز موقف کی حمایت میں تاشقند جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی اور اس کو چین کے الٹی میٹم اور عالمی رائے عامہ کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اندرون ملک اقتصادی حالت بھی از حد مستحکم تھی۔ یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ پاکستان مفاہمت کے لئے نہایت مستحکم پوزیشن میں تھا مگر تاشقند میں کیا ہوا؟ بھارت اپنے وزیر اعظم سے

www.bhutto.org

محروم ہو گیا مگر پاکستان کو اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا۔

اگر ان تمام قربانیوں کا مقصد امریکہ کے ساتھ خصوصی تعلقات بحال کرنا تھا تو بھی متعدد ناکامیوں کا پے در پے سامنا کرنا پڑا۔ فوجی معاہدوں کے متعلق امریکہ کا رویہ بدل گیا۔ غیر جانبداری کی وقعت بڑھ گئی ہے۔ فنون جنگ اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے عالمی دفاعی حکمت عملی کو مختلف معنی عطا کر دیتے ہیں۔ ویت نام ایک مرکزی مسئلہ بن گیا ہے اور اس تنازعے نے یہ امر ناگزیر بنا دیا ہے کہ ایشیائی ملکوں کے لئے فوجی اور اقتصادی امداد کے مسئلہ کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔

اب عالمی حالات نے جو رخ اختیار کیا ہے' اس کی وجہ سے ماضی کی طرف مراجعت کا امکان بھی خارج از بحث ہے۔ امریکہ نے اپنی مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے آخر کار یہ تسلیم کر لیا کہ اب پاک بھارت تعلقات میں اچانک اور فوری تبدیلی ناممکن ہے اور نیا نظریہ یہ تھا کہ پاکستان کو رفتہ رفتہ دوسری سمت اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے اور اس مقصد کے لئے پاک چین تعلقات بالکل ختم کرنے کی بجائے پاک بھارت تعاون پر زور دیا جائے۔

یہ تھے وہ حالات جب سابق وزیر خزانہ مسٹر محمد شعیب اپریل 1966ء میں واشنگٹن کے دورہ کے بعد پاک بھارت کے تعاون کے متعلق چند ٹھوس تجاویز لے کر واپس آئے۔ اب یہ ظاہر ہو گیا کہ جون 1966ء کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی نے مدافعانہ صورت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ تک خصوصاً امریکی سفیر مسٹر لاک کے دور سفارت میں حکومت امریکہ اپنی تجاویز پر شدت سے زور دیتی رہی اور اس کو کچھ کامیابی بھی ہوئی اور چین کے ساتھ میل جول میں نمایاں کمی آ گئی۔ 1967ء کے موسم بہار میں عالمی بینک کے صدر مسٹر جارج وڈز جب پاکستان کے مختصر دورے پر آئے تو انہوں نے اس امر پر خفگی کا اظہار کیا کہ دریائے گنگا کے متعلق بھارت سے تعاون کی بات کچھ آگے نہیں بڑھ سکی۔ ایوب خاں نے بھی راولپنڈی میں ایک تقریر کے دوران میں اپنے وزیر خارجہ کو اس بات پر مورد الزام ٹھہرایا کہ امریکہ کے ساتھ تعلقات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ منگلا بند کے افتتاح کے موقع پر بھی ایک تقریر میں ایوب خاں نے افتتاحی تقریب میں شامل مغربی طاقتوں کے نمائندوں کی سہولت کی خاطر یہ تجویز پیش کی کہ اگر قومیں اپنے باہمی تنازعات طے نہ کر سکیں تو ان کے لئے یہ بہتر ہو گا کہ وہ غیر حل شدہ تنازعات کو نظر انداز کر کے دوسرے شعبوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں۔ اس کے فوراً بعد ہی سابق صدر نے مسئلہ کشمیر کے متعلق ثالثی کی تجویز پیش کر دی اور بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے مشروط معاہدہ پر بھی تیار ہو گئے۔

نومبر 1968ء میں برطانوی وزیر خارجہ پاکستان کے مختصر دورے پر آئے تو پالیسی میں اس تبدیلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے کشمیر میں رائے شماری کو بھی خارج از امکان قرار دے دیا۔ اس کے ایک ماہ بعد 17 ر دسمبر کو امریکی سفیر بینجمن اوہلرٹ نے کشمیر کے متعلق اپنی حکومت کے موقف کی توجیہہ یوں کی۔

"امریکہ مسئلہ کشمیر کے حل کی خاطر جو کردار ادا کر سکتا ہے' ایسا کردار ادا کرنے کے لئے امریکہ کو لامحالہ دباؤ سے کام لینا پڑے گا جو خود ہمارے یا طرفین کے لئے سیاسی اور اخلاقی طور پر نا قابلِ قبول ہو گا"

جب سے امریکہ نے عالمی امور میں الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کو خیر باد کہا ہے' اس کی خارجہ پالیسی کا محور صرف یہ یقین رہا ہے کہ قومی مقاصد کے حصول کی خاطر دباؤ اور مداخلت ہی بہترین ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صدر جانسن جنہوں نے مسٹر اوبلرٹ کو پاکستان میں سفیر مقرر کیا تھا' دوسرے ملکوں کے داخلی امور میں مداخلت کے لئے بدنامی کی حد تک مشہور رہے تھے۔ انہوں نے جمہوریہ ڈومینیکا میں بھی کوئی شرم یا جھجک محسوس کئے بغیر یہی حربہ استعمال کیا۔ ویت نام میں جب ان کی مداخلت اس جنگ زدہ ملک میں پانچ لاکھ امریکی فوجوں کی موجودگی کا باعث بنی اور کون نہیں جانتا کہ برصغیر کے متعلق امریکہ کی پالیسی بھی اسی کلیہ کا شاخسانہ ہے۔ جانسن حکومت نے پاکستان پر انتہائی ناخوشگوار قسم کے دباؤ کے حربے استعمال کئے' اس لئے ایسے ملک کے سفیر کی جانب سے اس نوعیت کے خیال کا اظہار کوئی نئی بات نہ تھی۔ مروجہ پالیسی سے روگردانی صرف بھارت کو خوش کرنے کی خاطر کی گئی تھی اور اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کشمیر پر بھارت کے غیر قانونی قبضہ میں مداخلت امریکہ کا درد سر نہیں۔

پچھلے چار سال میں تبدیلیاں

یہ ہے پاک بھارت مسائل کے متعلق امریکہ کا نقطہ نظر جبکہ روس کا رویہ جوں کا توں برقرار ہے اور اس کے متعلق ہر شخص آگاہ ہے۔ رہا چین کا سوال' ہو سکتا ہے کہ پاک چین تعلقات اب بھی خوشگوار ہوں مگر میرے خیال میں اتنے گہرے اور خوشگوار نہیں جتنے کہ 1965ء میں تھے۔ اس کے برعکس عرب ملکوں کے ساتھ بھارت کے تعلقات اتنے ہی خوشگوار ہیں جتنے کہ پاکستان کے۔ مغربی یورپ کے ملکوں کے طرز عمل کا انحصار امریکہ کے رویہ پر ہے۔ اب رہا فرانس کا مسئلہ تو صدر ڈیگال کے دور میں دوسری بات تھی' اب ڈیگال کو چھٹی ہو گئی ہے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں کا رویہ روس کی مرضی کے تابع ہے۔ ماضی میں رومانیہ نے قدرے آزادانہ رویہ اختیار کیا مگر چیکوسلواکیہ کے سانحہ کے بعد رومانیہ کے لئے الگ اور جداگانہ آواز بلند کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یوگوسلاویہ واحد یورپی ملک ہے جس نے 1965ء کے تصادم میں بھارت کی حمایت کی تھی اور اب بھی وہ اپنے موقف پر بدستور قائم ہے اور غالباً اسی طرح قائم رہے گا۔ افریقہ اور لاطینی امریکہ دور واقع ہیں۔ مگر بھارت ان ملکوں میں بھی زیادہ سرگرم عمل ہے۔ بعض افریقی ملکوں میں تو وہ ایک مضبوط اقتصادی پالیسی بروئے کار لا رہا ہے۔ 1968ء کے موسم سرما میں بھارتی وزیر اعظم لاطینی امریکہ کے متعدد ملکوں کے دورہ پر بھی گئی تھیں جس کے نتیجہ میں بھارت نے ان ممالک میں اپنے سفارت خانوں میں توسیع کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ایشیا میں بھی بھارت جاپان کے ساتھ اپنے تعلقات نہایت تیزی کے ساتھ بڑھا رہا ہے' یہی حال انڈونیشیا کا ہے۔ جون 1969ء میں بھارتی وزیر اعظم نے ان دونوں ملکوں کا بھی دورہ کیا تاکہ باہمی تعاون کو مزید وسعت دی جائے۔ سیٹو کے رکن ممالک خصوصاً آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر امریکہ کے اثر کو مدِنظر رکھنا بھی ضروری ہے' جب کہ ملائیشیا کو یہ فخر حاصل ہے کہ

وہ 1965ء کی جنگ میں جارحیت کے مرتکب بھارت کی برابر حمایت کرنے والا واحد ایشیائی ملک تھا اور اب بھی وہ بھارت کی طرف ہی جھکا ہوا ہے۔ برما اب تک تو غیر جانبدار رہا ہے مگر حال ہی میں اس کے بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر ہو گئے ہیں۔ ایران اور ترکیہ گو پاکستان کے ساتھ گہرے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں مگر بھارت اور ایران کے تعلقات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔

یہاں یہ بتانا غیر ضروری نہ ہو گا کہ 25 دسمبر 1968ء کو کراچی میں علاقائی تعاون برائے ترقی کے رکن ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی مگر 31 دسمبر کو ہی یہ اعلان سننے میں آیا کہ ایرانی بحریہ کے جہاز خیر سگالی کے دورہ پر بھارت پہنچ گئے ہیں۔ اسی روز یہ معاہدہ بھی طے پایا کہ بھارت ایران میں فولاد کے پہلے کارخانے میں کام کرنے والے پانچ سو ماہروں کو ضروری تربیت دے گا۔ اس اعلان کے بعد یہ بھی سننے میں آیا کہ شاہ ایران 2 جنوری 1969ء کو بھارت کا دورہ کریں گے۔ چنانچہ شاہ نے دہلی پہنچ کر بھارتی صدر کو بتایا...... "ہمیں مکمل یقین ہے کہ بھارت اور ایران کے صدیوں پرانے تعلقات دوبارہ بحال ہوں گے اور اس طرح دونوں کے باہمی تعاون کو فروغ ملے گا جو ایشیا بلکہ تمام دنیا میں استحکام و ترقی کا باعث ہو گا"۔ بھارت اور ایران اپنے باہمی تعلقات کو فروغ دینے کے لئے وزارتی مشینری بھی قائم کر چکے ہیں جس کی صورت علاقائی تعاون برائے ترقی جیسی ہی ہو گی اور اس کے تحت دونوں ملکوں کے وزرا کی ملاقات ہر چھ ماہ بعد ہو گی۔ اس نوعیت کی پہلی ملاقات 22 جون 1969ء کو تہران میں ہوئی جس کے بعد جاری کردہ مشترکہ اعلان میں باہمی اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کا عہد بھی کیا گیا تھا۔

ترکیہ کے وزیر خارجہ بھی 1967ء میں دورہ خیر سگالی پر بھارت تشریف لے گئے تھے۔ وطن واپس پہنچنے پر جب اخباری نمائندوں نے ان سے پوچھا کہ آیا اس دورے سے پاکستان اور ترکیہ کے تعلقات تو متاثر نہیں ہوں گے تو وزیر خارجہ نے (توقع کے مطابق فوری تردید کرنے کی بجائے) اس سوال پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہوتا۔ مگر یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ پاکستانی وزیر خارجہ یونان کے دورہ خیر سگالی پر جائیں تو لازماً ترکیہ میں اس دورہ کے متعلق گہری دلچسپی کا اظہار کیا جائے گا۔

پاکستان نے آزادانہ خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی جو جدوجہد کی ہے اس کا ایک خوشگوار ثمر یہ ہے کہ افغانستان کے ساتھ ہمارے تعلقات خوشگوار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر ایوب خاں کے دور میں ہی باہمی گرمجوشی میں کمی محسوس ہونے لگی۔ وزارت خارجہ کے سیکرٹری نے 30 دسمبر 1968ء کو راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ 1966ء کے بعد دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات اچانک خراب ہونے لگے تھے۔ گو باہمی مفادات کے حامل دو ہمسایہ ملکوں کے تعلقات اچانک نہیں بگڑ جاتے اور دونوں کے باہمی مسائل بھی حال ہی کی پیداوار نہیں کہ اچانک ہی تعلقات خراب کرنے کا باعث بن جائیں۔

www.bhutto.org

پاکستان نے جب اپنی خارجہ پالیسی میں دفاعی روش اختیار کی تو قدرتاً دوسروں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ بنیادی تبدیلی نہ صرف دشمنوں بلکہ دوستوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ دونوں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ صرف غیر متعلقہ ممالک بے تعلق رہتے ہیں مگر متعلقہ ملک۔ دوست یا دشمن۔ اپنی پالیسی میں اپنے مفاد کے مطابق ردوبدل کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ تبدیلی دونوں کے لئے امتحان کا باعث بن جاتی ہے۔ ایوب خاں کی نیم دلی اور ادھورے کاموں نے متعدد لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ 1962ء میں جو اہم ترین موقع ہمیں ملا' اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاسکا۔ ایوب خاں نے نیم دلی کے ساتھ تاریخ سے ٹکر لی تھی مگر تھوڑی تبدیلی اور پھر پسپائی اختیار کر کے انہوں نے قومی مفادات کو سخت نقصان پہنچایا۔ عوام کی طرف سے تبدیلی کے لئے جو دباؤ ڈالا گیا' ایوب خاں اس کو تو نظر انداز نہ کر سکے مگر اس کے ساتھ ہی وہ اس بیرونی دباؤ کا مقابلہ بھی نہ کر سکے جو تبدیلی کو روکنے کے لئے ڈالا جا رہا تھا۔

ایوب خاں 1962ء کے بھارت چین تنازعہ سے فائدہ اٹھا کر مروجہ پالیسی کو خیرباد کہنے کی ہمت نہ کر سکے بلکہ اس موقع پر بھارت سے مصالحت کر کے اس روایتی پالیسی کو مستحکم بنانے کا باعث بن گئے۔ کیا ان کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ چین بھارت تنازعہ کے عروج کے موقع پر بھارت سے سلسلہ جنبانی شروع کی جائے؟ ابتدائی غلطی یہی تھی کہ انہوں نے مغربی طاقتوں کو ممنون احسان بنانے کے لئے بھارت کو چین کی طرف متوجہ ہونے کا مکمل موقع فراہم کر دیا۔ اس وقت جو بات چیت ہوئی' اس کا مقصد مسئلہ کشمیر کو حل کرنا نہیں تھا بلکہ بھارت کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع دینا تھا۔ اگر وہ بھارت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے خواہاں نہیں تھے تو بھارت کے ہاتھ مضبوط بنانے کی بجائے کم از کم ہوشیاری سے کام لے کر الگ تھلگ تو رہ سکتے تھے۔ مگر اس ابتدائی غلطی سے پاکستان نے ایک بہترین موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ اب اگر مسئلہ کشمیر کا حل دور نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ خارجہ پالیسی تبدیل ہو چکی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تبدیلی مناسب موقع پر نہ کی گئی اور جب تبدیلی کی گئی تو موضوع کی بجائے طرز کو تبدیل کرنا ہی کافی سمجھا گیا اور یہ تبدیلی بھی نہایت محدود سی تھی۔ پھر یہ تبدیلی خواہ کتنی اور جیسی بھی کی گئی' یہ صرف اس وقت تک مفید رہی جب تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ اس تبدیلی سے چین کے خلاف پاک بھارت اتحاد کی کوشش کا تو سدِباب ہو گیا اور ہو سکتا ہے کہ اس معمولی تبدیلی کے نتیجے میں فوجی امداد بھی بند ہو جاتی مگر پاکستان اپنی خود مختاری برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

مغربی امداد بھی علاقائی حدود کے دفاع کی خاطر حاصل کی جاتی ہے نہ کہ اپنے علاقے کو ہاتھ سے کھو دینے کے لئے۔ بھارت کے ساتھ سترہ روزہ جنگ سے اس فوجی امداد کے خطرات بھی کھل کر سامنے آ گئے جو کسی ملک کے مخصوص مفادات کے سوا کسی اور مقصد کے لئے دی جاتی ہے۔ اگر یہ امداد بھارت کے خلاف استعمال کے لئے نہیں ملی تھی تو یہ امداد چین اور روس کی طرف سے خطرہ۔ اگر خطرہ موجود تھا۔ کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی ناکافی تھی۔ یہ بھی باور کیا جاتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر امریکہ انتہائی حربوں کے ساتھ مداخلت کرے گا۔ یہ انتہائی حربے کس حد تک بروئے کار لائے جائیں گے؟ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے

www.bhutto.org

اور پھر پاکستان کے عوام کو یہ باور کرانا بھی بھونڈا مذاق ہوگا کہ ان کا ملک ایٹمی تحفظ کے ذریعے بچایا جائے گا۔ فوجی امداد کا اصل مقصد تو روس اور چین کے حملے کا دفاع تھا نہ کہ بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرنا پہلی صورت میں تو یہ امداد از حد کم ہے دوسری صورت میں اس کا استعمال ہی ناممکن ہوگا۔

دس سال سے زائد عرصہ تک امریکہ کھلے دل سے پاکستان کو اقتصادی امداد دیتا رہا۔ ابتدا میں تو یہ امداد گرانٹ کی صورت میں ملتی رہی۔ پھر اس کی جگہ قرضوں نے لے لی اور اب یہ امداد باسود قرضوں کے طور پر ملتی ہے حتیٰ کہ اب ان قرضوں کا بار تشویش ناک حد تک بڑھ گیا ہے اور اب ان کی مالیت تین ارب ڈالر سے بھی زائد ہے مگر ان قرضوں اور عطیات کے باوجود بھی پاکستان کا شمار دنیا کے غریب ترین ملکوں میں ہوتا ہے بلکہ یہاں ابھی تک صنعتی ڈھانچے کی بنیاد بھی نہیں رکھی جا سکی۔ درحقیقت پاکستان کو اقتصادی امداد نہیں بلکہ ایسا اقتصادی نظام درکار ہے جو پسماندہ ممالک کی ضروریات کے عین مطابق ہو۔ ایسی تبدیلی کے بغیر اقتصادی امداد صرف عارضی سہارا ثابت ہوتی رہے گی جبکہ ضرورت غیر ملکی امداد پر کلی انحصار کم کرنے کی ہے جب تک پاکستان کو پی۔ ایل۔ 480 پروگرام کے تحت بھاری امداد ملتی رہی، ہم اپنی خوراک کی ضرورت پوری کرنے سے بھی قاصر رہے لیکن جونہی اس امداد میں کمی ہوگئی قوم کے جوش و جذبے نے ملک کو خوراک کے معاملے میں خود کفالت کی حد تک پہنچا دیا۔

خارجہ پالیسی میں تبدیلی کے بغیر بھی آئندہ غیر ملکی امداد کم ہو جائے گی۔ واضح وجوہات موجود ہیں۔ امریکہ کی عالمی ضروریات اپنی جگہ ہیں، مگر امریکی عوام بھی دنیا بھر کو اقتصادی امداد دینے کی اس طویل پالیسی سے اکتا چکے ہیں۔ اندرونی حالات نے بھی امریکی حکومت کی توجہ اپنی جانب مبذول کر رکھی ہے، توازن ادائیگی کا خسارہ بڑھتا جا رہا ہے۔ جنگ ویت نام کے بھاری اخراجات، معاہدوں کی اہمیت میں کمی، افریقہ میں نئے نئے ملکوں کی آزادی کا اعلان اور لاطینی امریکہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت۔ یہ تمام مسائل ایسے ہیں جو امریکہ کے لئے ازحد اہمیت اختیار کر چکے ہیں اور اس کے لئے پاکستان جیسے ممالک کی امداد جتنے ہی اہم ہیں۔ آئزن ہاور کے دور کی پالیسیاں اب ترک کی جا رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو کچھ چند سال بعد ہونے والا تھا، قدرے قبل سامنے آ گیا ہے۔ مگر اس سارے چکر کا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان اپنی خود مختاری کو محفوظ رکھتے ہوئے خود کفالت کی منزل کے قریب جا پہنچا۔

روس سے تعلقات

امریکہ کی خارجہ پالیسی میں جو دور رس تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، صدر ایوب ان کی اہمیت کا اندازہ کرنے میں بھی ناکام رہے اور نہ ہی وہ روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کی ضرورت کا احساس کر سکے۔ ایسے معاملات طے کرتے وقت یہ امر بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ پاکستان بھی ایک عظیم ملک ہے۔ اس کی آبادی دس کروڑ سے بھی اوپر ہے اور مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا دونوں میں اس کی دفاعی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ روس نے ایک ہمسایہ ملک کی حیثیت سے پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی اہمیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ ان دونوں کی باہمی سرد مہری کی کوئی بنیادی وجہ موجود نہیں بلکہ وجہ صرف

www.bhutto.org

پاکستان کی جانبداری تھی۔ اب روس پاکستان کے معاملات میں جو دلچسپی لینے لگا ہے' اس کی اہم ترین اور غالباً واحد وجہ پاکستان اور چین کے باہمی تعلقات میں اضافہ ہے۔ امریکہ کی طرح روس نے بھی برِ صغیر میں سردھڑکی بازی لگا رکھی ہے۔ چین اور روس کا باہمی تنازعہ بڑھ کر سرحدی جھڑپوں تک جا پہنچا ہے۔ ہمارے علاقے میں دفاعی اہمیت کی سڑکوں کی تعمیر اور کشمیر کی سرحد کے ساتھ واقع سنکیانگ کی اہمیت کو روس کبھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ان حقائق کی روشنی میں پاکستان کے متعلق روس کے رویے کی تبدیلی کی وجہ بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاک بھارت تعلقات کی روشنی میں اس تبدیلی کو پرکھا اور سمجھا جائے اور بغور جائزہ لینے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہ تبدیلی کافی نہیں کیونکہ مسئلہ کشمیر کے متعلق روس کا مؤقف بنیادی طور پر جوں کا توں ہے۔ اب جب کہ بھارت۔ چین کے معاملہ میں۔ بہت کم غیر جانبدار ہے روس زیادہ احتیاط کے ساتھ کام لے گا مگر اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ وہ پاکستان میں اپنے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھا کر پاکستان و بھارت کے مابین غیر مشروط مفاہمت کرانے کی کوشش کرے۔

روس نے پاکستان کو فوجی امداد دینے کا جو فیصلہ کیا تھا' ایوب خاں نے بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ اس فیصلہ کا مقصد پاکستان و بھارت کے مابین مفاہمت کرانا تھا۔ اگر پاکستان کو اسلحہ ملتا ہے تو بھارت کا مفاد اسی میں ہے کہ یہ اسلحہ چین کی بجائے روس سے آئے۔ اگر دونوں اسلحہ مہیا کریں تو بھی بھارت کا فائدہ اس بات میں ہے کہ اس میں روس کی شرکت اور قدرے کنٹرول برقرار رہے۔ یعنی بھارت کا مفاد اسی میں ہے کہ پاکستان اپنی فوجی ضروریات کے لئے چین کی بجائے روس پر انحصار کرے اور پھر بھارت کو ملنے والی روسی فوجی امداد کے مقابلے میں پاکستان کو ملنے والی امداد نہ ہونے کے برابر ہی رہے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اسی کلیہ کی بنا پر امریکہ بھی دونوں ملکوں کو فوجی امداد دینا شروع کر دے۔ ویت نام میں جنگ ختم ہونے کے بعد بے شمار فوجی سازوسامان فاضل ہو جائے گا اور یہ اسلحہ امریکہ واپس نہیں لے جائے گا۔ کیونکہ امریکہ کی معیشت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ وہاں فاضل اسلحہ کے انبار لگ جائیں۔ یہ اسلحہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے حوالے کیا جائے گا اور اس کے سب سے بڑے حقدار پاکستان اور بھارت ہی ہوں گے۔

چین کی اہمیت

بھارت نے پاکستان کے متعلق اپنا رویہ تبدیل کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی فوجوں میں نہایت تیزی کے ساتھ توسیع کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ پرانے نظریات بھی زندہ کئے جا رہے ہیں کہ ہمسایوں سے سلوک کا بہترین طریقہ طاقت کا استعمال ہے۔ بھارتی حکومت نے حال ہی میں یہ مؤقف بھی اختیار کیا ہے کہ پاکستان آزاد کشمیر کا علاقہ بھارت کے حوالے کر دے۔ ادھر پاکستان اس فوجی طاقت کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بھارت نہایت تیزی کے ساتھ حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ پاکستان کو اپنی تیاری

www.bhutto.org

کے ساتھ کسی ایسے ملک کی سفارتی اور سیاسی امداد بھی حاصل کرنا ہوگی جس کا مفاد مشترک ہو۔ ایسی صورت میں صرف چین ہی ایسا ملک نظر آتا ہے جو نہ صرف پاکستان کا ہمسایہ ہے بلکہ بھارتی توسیع پسندی کے مقابلے میں پاکستان کا ہم خیال بھی۔ یہ ایک بنیادی اور عیاں حقیقت ہے اور بہتر ہوگا کہ دباؤ اور وقت کی رفتار سے اس کو دھندلانہ ہونے دیا جائے۔

چین کے ساتھ بہتر تعلقات اس قدر ناگزیر ہو چکے تھے کہ ایوب خاں بھی کھلم کھلا ان کو ختم کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پاکستان اور چین کے قریب آ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ پرانے تعلقات بحال کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور نہ ہی بھارت کی خود سری پاک بھارت مفاہمت کی کوشش کو کامیاب ہونے دے گی۔ اپنے دور حکومت کے آخری دنوں میں ایوب خاں نے ایک مکمل قابل عمل خارجہ پالیسی کو نظرانداز کر دینے کی غلطی کا احساس کر لیا تھا اور انجام کار اسی نتیجے پر پہنچے کہ 1963ء سے 1965ء تک کے درمیانی عرصے میں جو خارجہ پالیسی وضع کی گئی تھی اس کا متبادل حاصل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ بہت سے دروازوں پر دستک دینے کے بعد انہوں نے صبح کے بھولے کی طرح چین کا رخ کیا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نئے نظریات پرانی روایات کی جگہ لیتے رہے ہیں۔ ایشیا میں رونما ہونے والی تبدیلیاں چین کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کو بھی متاثر کر سکتی ہیں۔ جنگ ویت نام کے بعد امریکہ ایشیا میں زیادہ تر اپنی بحری قوت پر ہی تکیہ کرے گا۔ جاپان اور آسٹریلیا کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط بنائے گا اور ایسی پالیسی اختیار کرنے سے گریز کرے گا جو اس کی افرادی قوت کو ایشیا کی وسیع سرزمین پر کھینچ لائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں امریکہ پاک چین دوستی کو قابل اعتراض ہی نہ سمجھے۔ اگر امریکہ ذرا کھل کر بات کرے تو نکسن حکومت پاک چین تعلقات کی نوعیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے۔ اگر ایوب خاں امریکہ اور چین کے ساتھ دوطرفہ تعلقات صحیح طور پر برقرار رکھتے تو آج مسئلہ ویت نام کے حل کی بات چیت پیرس کے بجائے پاکستان میں ہو رہی ہوتی۔

مستقبل کی فکر

اب وقت ایسا ہے کہ پاکستان مستقبل کی فکر کرے۔ نیا دور شروع ہو چکا ہے جو بیک وقت مسرت و خوف سے بھرپور ہے۔ قوموں کی قسمتوں کے ذمہ دار لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بھی اس حقیقت کو بخوبی جان لیں۔ گو ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں امریکہ اپنی ایشیائی پالیسی دوبارہ مرتب کرے گا اور مستقبل میں کوئی بھی امریکی صدر جلدبازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی نئی ذمہ داری نہیں مول لے گا۔

ایک زمانے میں یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ امریکہ نئی عالمی جنگ کا خطرہ مول لے گا مگر روس کے ساتھ مفاہمت پر تیار نہیں ہوگا۔ تقریباً دس سال تک ان دونوں عالمی طاقتوں کے تعلقات ازحد کشیدہ رہے مگر اب دونوں طاقتیں بلقائے باہم کے تحت باہمی تعاون کو مضبوط بنا رہی ہیں۔ اگر یورپ میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایشیا اس تبدیلی سے محروم رہے۔ جنگ ویت نام ختم ہو جائے اور عوامی چین ایسا دور مار میزائل تیار کرے جو امریکہ کے مغربی ساحل کو نشانہ بنا سکے اور اس طرح چین کی فوجی طاقت امریکہ

www.bhutto.org

کے برابر ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ امریکہ چین کے متعلق اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو جائے۔

امریکہ کی عالمی پالیسی میں یورپ کو اولین مقام حاصل ہے۔ لیکن یورپ میں امریکی مفاد کا ٹکراؤ چین سے نہیں بلکہ روس کے ساتھ ہے۔ پچھلے سال چیکوسلواکیہ کے واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ یورپ میں باہمی افہام و تفہیم کی اب کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اس علاقہ میں نہ تو امریکہ اور نہ ہی روس ایک دوسرے کو رعایت دے سکتے ہیں۔ چنانچہ بظاہر یورپ میں روس و امریکہ کے مابین بقائے باہم اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکی ہے اور یہی وجہ صدر نکسن کے جنوب مشرقی ایشیا کے دورہ کے بعد ایک کمیونسٹ ملک کے دارالحکومت میں وارد ہونے کا جواز بنی تھی۔

یورپ کے بعد مشرق وسطیٰ کا علاقہ آتا ہے جس کی دفاعی اور فوجی اہمیت مسلمہ ہے اور جو تیل کے بھاری ذخائر کی وجہ سے تمام دنیا کی توجہ کا مرکز ہے۔ یہاں بھی امریکہ اور روس کے مفادات باہم متصادم ہیں۔ روسی بحری بیڑے کو بحیرہ روم میں داخلہ کی اجازت مل چکی ہے اور وہ جنوبی یورپ میں امریکی بحری قوت سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔ اس میں ان دونوں قوتوں کا کسی وقت بھی تصادم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی طرح مشرق وسطیٰ میں بھی چین کی بجائے امریکہ اور روس ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قتل و غارت کے شوق کے سامان کے لئے مواد ایشیا اور یورپ کی نسبت مشرق وسطیٰ میں زیادہ ہو سکتا ہے لیکن جس طرح چیکوسلواکیہ میں روسی مداخلت کا مقصد یورپی حالات کو اپنے لئے بگاڑنے کی بجائے مستحکم بنانا تھا' اسی طرح ایشیا میں بھی جنگ ویت نام میں اس وقت شروع ہوئی جب چین کی مداخلت یقینی تھی مگر دس سال گزرنے کے بعد بھی چین کو اس جنگ میں الجھایا نہیں جا سکا جبکہ مشرق وسطیٰ کی چھ روزہ جنگ نے روس اور امریکہ کا تصادم ناگزیر بنا دیا تھا۔

جب دو بڑی طاقتوں کے مابین دوسری قوموں کی قیمت پر کوئی مفاہمت طے پاتی ہے تو اسے "مجموعی سودابازی" کا نام دیا جاتا ہے۔ مشرق وسطیٰ ایسے معاہدوں کے لئے نہایت موزوں اور سازگار ماحول مہیا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے حصول کی خاطر مغربی ایشیا میں روس کو قدرے رعایت دینے پر آمادہ ہو جائے اور اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ امریکہ عرب ممالک کی قیمت پر مشرق وسطیٰ میں کوئی رعایت حاصل کر لے اور وہ چین کی ابھرتی ہوئی طاقت کے مقابلہ کے لئے روس سے کوئی سمجھوتہ کر لے۔ اب ویت نام کی جنگ ختم ہونے تک مشرق وسطیٰ کی صورت حال مستحکم نہ ہو سکی تو روس اور امریکہ کے تعلقات بگڑنے کا واضح امکان موجود ہے۔ ان حالات میں امریکہ اور چین کے درمیان بامقصد بات چیت کے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔

یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورت حال میں جامد نظریات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بڑی طاقتیں اپنے انفرادی اور عالمی مفادات کے حصول کی خاطر متبادل ذرائع بھی بروئے کار لاتی رہتی ہیں۔ چین اور روس کے تیزی کے ساتھ بگڑتے ہوئے تعلقات کی روشنی میں ان میں مفاہمت مشکل ہی نظر آتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ روس امریکہ کی جانب زیادہ جھک جائے مگر یہ حقیقت بھی

www.bhutto.org

اپنی جگہ موجود ہے کہ دونوں بڑی طاقتیں اپنے مخصوص سماجی نظام کو متاثر کئے بغیر مفاہمت کی راہ پر زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ اب امریکہ کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ چین کو مزید ہراساں کرنے کے لئے روس سے تعلقات مزید مستحکم بنالے یا روس چین تنازعہ سے الگ ہو کر فائدہ حاصل کرے۔ یہی حال چین کا ہے۔ یا تو وہ روس سے تعلقات دوبارہ بہتر بنا سکتا ہے یا پھر امریکہ کے قریب آ سکتا ہے۔ تیسرا راستہ یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرح روس اور امریکہ دونوں کے خلاف بر سرِ پیکار رہے۔

ایشیا کے حالات پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ عوامی چین اگر چاہے تو ایشیا پر ایک نظریہ مسلط کر سکتا ہے۔ اگر امریکہ اور مغربی یورپ میں "منرو نظریہ" کی گنجائش ہے یا مشرقی یورپ میں "برژنیف نظریہ" رواج پا سکتا ہے تو یہ نظریہ بھی خارج از امکان نہیں کہ آئندہ ایشیا میں "ماؤزے تنگ نظریہ" راہ پا جائے اور اگر تینوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں تو ایسی مفاہمت بھی طے پا سکتی ہے۔

حلقۂ اثر کا جدید مفہوم

جدید معنی کی رُو سے حلقۂ اثر کا مطلب کسی سلطنت یا حکومت کا قیام نہیں لیا جاتا اور نہ ہی اس کا مطلب کسی بڑی طاقت کا مکمل کنٹرول ہوتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی مخصوص خطہ میں کسی مخصوص بڑی طاقت کی مخالفت کی گنجائش ختم کر دی جاتی ہے اور اس میں بڑی طاقت کے مخصوص مفادات کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی ہو سکتی مگر یہ حلقۂ اثر ظلم و استحصال کی بناء پر قائم کردہ غیر منصفانہ بالادستی کے خلاف جدوجہد کو ختم نہیں کر سکتا۔ آزادی کے لئے دی جانے والی قربانیوں کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب ہر قسم کی بالادستی ختم ہو جاتی ہے چیکوسلواکیہ میں حریت پسندی کی لہر رائیگاں نہیں گئی۔ مغربی یورپ میں بھی لوگ تبدیلی کے لئے کوشش کرتے رہیں گے۔ لاطینی امریکہ کے ملکوں میں فوجی حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ آج اگر چی گویرا بولیویا میں کسی گمنام قبر میں سویا پڑا ہے تو کوئی پرانا آمر بھی لاطینی امریکہ کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مشرق وسطیٰ میں ناصر سے وابستہ تمام توقعات تو پوری نہیں ہو سکیں مگر ماضی کا ظالمانہ سماجی نظام اب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہے۔ مستقبل قریب میں

جس بات کا امکان واضح طور پر نظر آ رہا ہے وہ امریکہ اور چین کے قریب آنے کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ بات خارج از امکان قرار دی جا سکتی ہے۔ امریکہ اور روس ان امکانات کی روشنی میں اپنے باہمی تعلقات میں ردوبدل کر لیں گے۔

اس نقشے پر پاکستان کس طرح پورا اتر سکتا ہے؟ اس کا انحصار جزوی طور پر تو بھارت کے رویّہ پر ہے مگر زیادہ تر پاکستان کی اس اہلیت پر ہے کہ وہ اپنے اندرونی مسائل پر کس طرح قابو پاتا ہے اور اپنی آئندہ پالیسی کس طرح مرتب کرتا ہے؟ یہاں اس امر کا اعادہ غیر ضروری نہ ہو گا کہ پاکستان کا مفاد چین سے دوستانہ تعلقات خوشگوار رکھنے میں ہی ہے۔ اس حقیقت سے انکار بھی ناممکن ہے کہ روس اور امریکہ کا کوئی معاہدہ ہوا تو وہ بھارتی مفادات کے مطابق ہو گا اور پاکستان کے لئے سخت مشکلات کا باعث ثابت ہو گا۔

www.bhutto.org

اس لئے پاکستان کے لئے یہ قطعی غیر مناسب ہو گا کہ وہ چین کے خلاف بین الاقوامی یا علاقائی معاہدوں میں شامل ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے معاہدہ کو دو بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہو مگر اس میں شمولیت سے وہ چین سے براہ راست متصادم ہو گا۔ یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ عوامی چین ہمیشہ کے لئے خطرے میں نہیں گھرا رہے گا۔ اگر آئندہ پانچ سال تک نہیں تو دس سال تک ضرور چین فوجی اعتبار سے مغربی طاقتوں کا ہم پلہ ہو جائے گا اور ایشیا میں ناقابلِ شکست حیثیت کا مالک ہو گا۔ بھارت پاکستان دشمنی کی وجہ سے دوسری طاقتوں کا تعاون حاصل کر کے چین کے گرد حصار باندھنے کی کوشش کرے گا۔ ان حالات میں اگر پاکستان صرف بڑی طاقتوں کے کہنے پر بھارت سے غیر فطری مفاہمت کرے تو یہ بات اپنی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہو گی۔ اس وقت جو بات غیر مفید نظر آ رہی ہے' وہ آنے والے سالوں میں پاکستان کے لئے از حد مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

پاکستان کے تدبّر کا امتحان

ان حقائق کی روشنی میں اب پاکستان کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے چین کے خلاف صف آرا کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا ردّ عمل کیا ہو گا؟ یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ جون 69ء میں روس نے ایشیائی ملکوں کے مشترکہ دفاعی اتحاد کی تجویز پیش کی تھی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر روس نے ابتدائی طور پر ایران' افغانستان' بھارت اور پاکستان کے مابین علاقائی تعاون کو فروغ دینے پر زور دیا ہے۔ اب لفظ "علاقائی تعاون" کے بھی خاص معنی لئے جاتے ہیں اور یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ در حقیقت اس لفظ کے لبادہ میں بڑی طاقتیں اپنے عالمی عزائم پورے کرتی ہیں۔ مغربی ایشیا کے ملکوں میں علاقائی تعاون کے قیام کی یہ تازہ ترین کوشش پاکستان کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ روس کی طرف سے پیش کردہ اور امریکہ کی طرف سے تائید شدہ اس تجویز کو معمولی نہیں سمجھا جا سکتا۔ شدید گرمی کے موسم میں غیر ملکی شخصیتوں کے پے در پے دوروں کا مطلب بھی اس روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ صرف دو ماہ میں ایرانی رہنما دو مرتبہ پاکستان آ چکے ہیں۔ ایرانی وزیر خارجہ نے تو مجوزہ علاقائی تعاون کی کھل کر حمایت کی تھی۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آیا پاک بھارت تنازعات کی موجودگی میں ایسا تعاون ممکن ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایسا تعاون تو ان تنازعات کو رفع کرنے میں معاون ثابت ہو گا۔ مگر ہم پاکستانیوں کو ایسے تنازعات کا جو تلخ تجربہ ہو چکا ہے' وہ آسانی کے ساتھ فراموش کرنا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ یہ مؤقف تو بھارت کے مؤقف کے عین مطابق ہے۔ پنڈت نہرو نے بھی کشمیر کے متعلق ایک مرتبہ ایک ایسا ہی مؤقف اختیار کیا تھا مگر قائد اعظمؒ نے اسے دھوکا اور فریب قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ اگر پاکستان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساتھی ملکوں کی مشکلات کا احساس کرے تو کم از کم ہم بھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہماری ان مشکلات کو بھی مدِ نظر رکھا جائے' جو ہماری آزادی و سالمیت کے خلاف سازش کے مترادف ہیں۔ ان دو ماہ میں وزیر خارجہ ترکیہ نے بھی اپنے دورہ سے قدر افزائی کی ہے۔ آپ نے بھی علاقائی تعاون کی حمایت کی مگر قدرے محتاط انداز میں۔

www.bhutto.org

امریکی وزیر خارجہ جون کے ماہ میں وارد ہوئے۔ چند ہفتے بعد روسی وزیر اعظم تشریف لائے۔ جون کے آخری ایام میں وزارت خارجہ پاکستان کے سیکرٹری حکومت افغانستان سے مشورہ کے لئے کابل پہنچ گئے۔ ان دوروں کو معمول کے مطابق ظاہر کرنے کے لئے وزیر خارجہ تونس۔ یہ ملک امریکہ کا قریبی دوست ہے۔ عین اس وقت پاکستان پہنچے جب ایران و ترکیہ کے وزیر خارجہ دورہ پر آئے ہوئے تھے۔ ان کے فوراً بعد ہی بھارتی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر کیول سنگھ اسلام آباد میں وارد ہوئے۔ انہوں نے اقتصادی تعاون کی پانچ ملکی کانفرنس کابل میں منعقد کرنے کی نہایت زور شور کے ساتھ حمایت کی۔ مگر پاک بھارت تنازعات کے متعلق بھارت کا وہی مشہور موقف دہرایا کہ اختلافات رفع کرنے سے قبل باہمی خیر سگالی کی فضا پیدا کرنا ضروری ہے۔ ان کے بعد امریکہ کے صدر بھی پاکستان تشریف لائے تھے۔

ہر غیر ملکی رہنما کے دورہ کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے اور یہ مقصد اب زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ مسٹر نکسن کے ایشیائی دورہ کا مقصد جنگ ویت نام کے بعد ایشیا میں امریکی پالیسی کا تعین کرنے کے لئے حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اگر امریکی فوجیں ویت نام خالی کرالیں اور ایشیا میں امریکی فوجوں کی مزید موجودگی ضروری محسوس نہ کی جائے تو امریکہ کے لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ ایشیائی تحفظ کے روسی منصوبہ میں دلچسپی لے۔ روزنامہ "آبزرور" کے نامہ نگار مقیم واشنگٹن کے مطابق صدر نکسن کے مشیروں کا خیال ہے کہ نئی دہلی کا دورہ ضروری نہیں تھا مگر پاکستان کا دورہ سیاسی طور پر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھارت اپنی اہمیت کھو چکا ہے اور پاکستان فوراً ہی اہم ملک بن گیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ روسی تجویز کے مطابق بھارت کی نسبت پاکستان کو آمادہ کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ امریکی صدر پاکستان کو خوش کرنے کی خاص طور پر کوشش کریں۔

روس اور چین میں تصادم

تعجب تو اس بات کا ہے کہ روس ایسے اتحاد کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہا ہے جو مارکس اور لینن کے فلسفہ کے بالکل برعکس اور روس کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے۔ ماضی میں روس فوجی معاہدوں کی مخالفت کرتا رہا ہے' افغانستان نے ایسے معاہدوں میں شمولیت سے انکار کیا تو روس نے اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر اب روس چاہتا ہے کہ افغانستان ایسے اتحاد کو فروغ دینے کا باعث بنے' حالانکہ گزشتہ بیس سال سے روس مشترکہ دفاعی معاہدوں کے مغربی نظام کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی واضح مثال وہ یادداشت ہے جو 31 مارچ 1949ء کو معاہدہ اوقیانوس کے رکن ملکوں کو بھیجی گئی یا روس کے سابق وزیر خارجہ مسٹر وشنسکی کی وہ تقریر جو انہوں نے 23 ستمبر 1949ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں کی تھی۔

روس کی جنوب مشرقی سرحد پر چین و روس کی فوجوں میں مسلح جھڑپیں روزمرہ کا معمول بنتی جا رہی ہیں۔ گزشتہ مارچ کے دوران میں دریائے اسوری کے جزیرہ چن پاؤ میں شدید جھڑپیں ہوئیں۔ پھر سنکیانگ کی سرحد اور نیفا میں بھارت نے بھی چین سے ٹکر لینے کی کوشش کی' تھی چنانچہ روسی تجویز صرف بھارت

www.bhutto.org

کے لئے ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے جبکہ پاکستان اور افغانستان کا چین کے ساتھ کوئی سرحدی تنازعہ موجود نہیں ہے کیونکہ دونوں ممالک چین کے ساتھ اپنی سرحدوں کا تعین بہت عرصہ پہلے کر چکے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان، ایران اور افغانستان کے لئے چین کے خلاف کسی معاہدہ میں شمولیت کس طرح مفید ثابت ہو سکتی ہے، صرف بھارت نے پاکستان اور چین کے ساتھ سرحدی تنازعات ابھی تک طے نہیں کئے مگر چین نے اپنے مفادات سے دستبردار ہونے کی بجائے 1962ء میں بھارت کی دوستی کو بھی خیرباد کہہ دیا۔

اب پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کرے اور بین الاقوامی حالات میں تبدیلی کا انتظار کرے۔ ایسی تبدیلی ضرور آئے گی اور اس کے آنے میں زیادہ دیر بھی نہیں۔ فوری مسائل خواہ کچھ بھی ہوں مگر ایشیا کا آئندہ راستہ چین کی مرضی کے خلاف متعین نہیں کیا جا سکتا۔ بصورت دیگر بے مثال قتل و خون اور افراتفری کا خطرہ اپنی جگہ موجود رہے گا۔ جن لوگوں نے پاکستان کی باگ ڈور سنبھالی ہے، ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ مشکلات کا دور بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ ہمیں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے رہنا چاہیے خواہ ہم اس میدان میں اکیلے ہی کیوں نہ رہ جائیں۔ مستقبل نہایت تابناک ہے بشرطیکہ ہم دباؤ کے سامنے سر نہ جھکا دیں۔ پاکستان عرصہ سے تکالیف اٹھا رہا ہے مگر یہ تکالیف اب ختم ہونے والی ہیں۔

جولائی 1969ء

www.bhutto.org

مشروط امداد

تقریباً چھ ہفتہ بعد میں وطن واپس آیا ہوں۔ اس عرصہ میں میں ایران، ترکی، فرانس، برطانیہ، کینیڈا، امریکہ، جاپان اور فلسطین گیا۔ بدقسمتی سے اقوامِ متحدہ میں کام کی زیادتی کی وجہ سے میں کیوبا جانے سے قاصر رہا۔

میرا وہاں جانے کا مقصد یہ تھا کہ مجھے دو اہم ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونا تھا جس میں سے ایک یہ تھی کہ پاکستان اور جن ممالک کا میں نے دورہ کیا ہے، ان کے درمیان تجارت کو فروغ دیا جائے۔ دوسری یہ کہ اقوامِ متحدہ کے چودھویں اجلاس کے لئے پاکستانی وفد کی قیادت کروں۔ بہرحال میں جہاں بھی گیا پاکستان کے نظریہ اور اقتصادیات کو تفصیلی طور پر واضح کرنے کا ہر موقع میں نے استعمال کیا۔

پاکستان میں جو کام کیا جارہا ہے، اس کے لئے مجھے خیر سگالی اور حوصلہ افزائی کے جذبات ملے ہیں۔ جن ممالک میں گیا، میں نے وہاں کی حکومتوں کو اور خصوصیت سے امریکہ اور کینیڈا کو دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی کامیاب عملدر آمد کے بارے میں متاثر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ ہمارے اندازے کے مطابق ہمیں توقع ہے کہ ہم اپنے منصوبے کی حدوں کی اس نازک جست گاہ تک پہنچ جائیں گے کہ وہاں سے ہم اس رکاوٹی ٹیلے کو عبور کر جائیں۔

میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ ہماری ترقی کا انحصار ہمارے منصوبے کے مقاصد کی تکمیل پر ہے جس کے بعد ہی ہم زیادہ خود کفیل اور خود اعتماد ہو جائیں گے۔ اس کم سے کم معیار تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنی تیزروی جاری رکھنی پڑے گی۔ میں نے انہیں واضح طور پر بتادیا کہ ہم جامد کھڑے رہنا نہیں

www.bhutto.org

چاہتے۔ منصوبے کی تکمیل کی طرف ہماری جدوجہد کا ابھی پہلا ہی قدم ہے۔

میں نے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اس امر پر بھی بحث کی کہ ہم نے بیرونی سرمایہ کاری کو زبردست اہمیت دی ہے۔ میں نے انہیں مطلع کیا کہ ہم نے بیرونی سرمایہ کاری کے لئے سازگار فضا بنائی ہے۔ یہ مستعد اور باہمت افراد کے لئے کھلا موقع ہے کہ وہ ہماری مساعی میں ریاست کو اسلامی سماجی انصاف کے پس منظر پر مبنی مثالی ریاست بنانے کے لئے شریک ہوں۔

پہلے میں ایران رکا اور وہاں اپنے قیام کے دوران میں ایران کے وزیر امورِ تجارت سے ملا۔ ان سے تجارت کے فروغ کے سوال اور دوستی اور تجارت کے طے شدہ سمجھوتے کے مسودے پر گفتگو کی اور مجھے مسرت ہے کہ یہ سمجھوتہ اب طے پا چکا ہے۔

ترکی میں، میں نے تجارت کے فروغ کے امکانات کا جائزہ لیا۔ میری تجاویز وزارت تجارت کے زیرِ غور ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں آگے بڑھایا جائے گا۔

اسی طرح فرانس میں، میں نے کوشش کی ہے کہ ہماری تجارت میں مزید انحطاط نہ پیدا ہو اور اس سلسلہ میں ہمارے تجارتی تعلقات کو فروغ دینے کیلئے نئے ذرائع تلاش کئے جائیں۔

برطانیہ میں، میں ڈنڈی میں تھا اس لئے میری بات چیت کا موضوع پٹ سن ہی رہا اور یہ بہت اہم بھی ہے کیونکہ برطانیہ میں ہماری برآمدات میں ساٹھ فیصد پٹ سن شامل ہے۔

اس کے بعد میں کینیڈا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ کینیڈا میں ہماری تجارت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی رپورٹ وزارت امورِ تجارت کو پیش کی ہے۔ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں جلد ہی پتہ چل جائے گا۔

کینیڈا میں اعلیٰ افسران سے تجارتی امور اور کولمبو پلان کے تحت دی گئی امداد کے مسئلہ پر بات چیت کی، چونکہ یہاں تجارت خالصتاً نجی ہاتھوں میں ہے، اس لئے میں بڑے بڑے صنعتکاروں سے ملا تاکہ انہیں اضافے پر آمادہ کروں، میری یہ گفتگو نہایت سودمند ثابت ہوئی۔

ٹورنٹو سے میں نیویارک گیا جہاں میں نے قومی اسمبلی میں اپنے وفد کی قیادت کی۔ اپنے نیویارک کے دوران قیام میں مجھے اپنا وقت اقوامِ متحدہ کے لئے اور امریکہ میں تجارتی امور کے فروغ کے لئے تقسیم کرنا پڑا۔ میں وہاں بڑے بڑے صنعتکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں سے ملا اور ان لوگوں سے بھی رابطہ قائم کیا جن کے پاکستان سے تجارتی رابطے ہیں۔ میری گفتگو ان سب صنعتکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں سے بڑی نفع بخش رہی۔ میں بوسٹن بھی گیا کیونکہ ہماری کچھ برآمدات وہاں بھی جاتی ہیں۔

میں واشنگٹن دو مرتبہ گیا اور وہاں ان افسروں، صنعتکاروں اور تجارت پیشہ افراد سے ملا جو پاکستانی اقتصادیات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میں نے سرکاری افسروں سے تجارتی اشیا کی فراہمی پر بات چیت کی۔

12 ر کتوبر کو میں نے حکومت پاکستان کی طرف سے امریکہ کے ساتھ تجارت اور دوستی کے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے۔ امید ہے کہ اس سمجھوتے کی بنا پر ملک میں بیرونی سرمایہ کاری تیزی سے آگے بڑھے گی۔

www.bhutto.org

اس کے بعد میں ویسٹ کوسٹ گیا اور وہاں تجارتی امور کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لیا۔

امریکہ میں موجودہ رجحانات کا ایک پہلو میں خصوصیت سے آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس کے پاکستان پر بڑے اہم اثرات مرتب ہوں گے۔ اس رجحان کی عکاسی امریکی امداد کے استعمال پر عائد کردہ پابندیوں سے ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ اس نعرے میں آ جاتا ہے Buy America (امریکی اشیاء خریدو) یہ D.L.F. قرضوں کی شرط بن چکی ہے اور اسے انتظامیہ کے حکام کی بھی تائید بطور ایک اہم اقدام حاصل ہے۔ اس کے باوجود ملک میں اس رائج پالیسی سے انحراف کی ضرورت پر رائے مختلف ہے۔

ابھی یہ پیش گوئی قبل از وقت ہوگی کہ "بائی امریکہ" پالیسی کہاں تک اور کس حد تک قابلِ نفاذ ہوگی۔ امداد حاصل کرنے والی ایک قوم کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ کچھ معیوب بات ہوگی کہ ہم اس پالیسی کی ضرورت اور منطق پر نکتہ چینی کریں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے اثرات ہماری جیسی ترقی پذیر اور امداد لینے والی اقوام سے متعلق ضرور ہیں۔

اس مرحلہ پر میں آپ سے صرف اس امر کا تذکرہ کروں گا کہ اس پالیسی کا مکمل طور پر نفاذ بین الاقوامی تجارت پر نمایاں پابندیاں عائد کرے گا اور یہ اجتماعی مفادات کے منافی بھی ہوگا جیسا کہ (Gatt) نے خیال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس تبدیلی کا وقت ناموزوں ہے جیسا کہ دوسرے علاقوں میں آزادانہ تجارت کے لئے ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان حالات کے تحت اس کے اثرات اور زیادہ شدید ہوں گے۔ علاوہ ازیں یہ امداد کے مقاصد کے خلاف بھی ہے کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ڈالر کا علاقہ جس حد تک ممکن ہو پھیلایا جائے۔ اس کے اثرات ترقی پذیر ممالک پر تیزی سے ظاہر ہوئے ہیں۔ میں ان واضح اقتصادی نتائج کی طرف جو سب پر واضح ہیں' توجہ مبذول کراتا ہوں۔

امریکہ کے بعد میں جاپان اور فلپائن گیا اور دونوں ملکوں میں 'میں نے متعلقہ حکام پر واضح کیا کہ حکومت پاکستان ملک کی اقتصادی ترقی کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے۔ جاپان میں 'میں نے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے اہم نکات پر زور دیا اور اس کے نفاذ کے لئے جاپان کے تعاون اور امداد کے امکانات کا جائزہ لیا۔

فلپائن میں 'میں نے حکام سے اپنی تجارت کے فروغ کے طریقوں اور ان تصفیہ طلب امور پر جو اس ملک کے ساتھ تجارتی معاہدے کی راہ میں حائل ہیں 'گفت و شنید کی۔ مجھے امید ہے کہ ان مباحث کے نتیجہ میں ہم بہت جلد فلپائن کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ تمام مذاکرات بہت مفید ثابت ہوئے لیکن آج ہمیں پیداوار کے بحران کا سامنا ہے۔ ہماری برآمدی منڈیاں لامحدود ہیں 'لیکن پیداوار میں کمی کے باعث ہم عالمی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ حکومت برآمدات کو بڑھانے کے لئے تمام ممکنہ طریقے بروئے کار لا رہی ہے۔ یہ تمام مساعی بیکار ثابت ہوں گی اگر ہم بیرونی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق اپنی پیداوار بڑھانے میں ناکام رہے۔

یہ ایک پریشان کن حالت ہے۔ میں امید کر رہا تھا کہ 1951ء کے برآمدی اعداد و شمار تک ہم

www.bhutto.org

ضرور پہنچ جائیں گے لیکن پیداوار میں جمود کے نتیجے میں ہم اس کے لگ بھگ بھی نہ پہنچ سکیں گے۔ مثال کے طور پر کپاس میں اندرون ملک کھپت بڑھ جانے کے نتیجے میں ہماری کپاس کی برآمد افسوسناک حد تک کم ہو گئی ہے' ہم اپنے مطلوبہ ہدف تک کیسے پہنچیں گے؟

فلپائن کی آبادی دو کروڑ بائیس لاکھ کے قریب ہے اور یہ ملک اپنی صرف دو بڑی برآمدی اشیا ناریل اور شکر کی برآمد سے 2ء5 بلین روپے کماتا ہے۔ ہانگ کانگ کی چھوٹی سی نو آبادی جس کی آبادی تیس لاکھ ہے' وہ سالانہ دو بلین حاصل کر لیتا ہے' بنیادی طور پر جاپان ایک ایسا ملک ہے' جو محض خام مال کی حیثیت تبدیل کر کے اسے صنعتی پیداوار کی شکل دیتا ہے' لیکن اس کی برآمدی آمدن سترہ بلین روپے ہے۔ اگر ایشیائی ممالک انہیں مسائل کے ساتھ جو ہمیں درپیش ہیں' اتنے زیادہ اعداد و شمار تک پہنچ سکتے ہیں تو ہمارے پیچھے رہ جانے کا کوئی مناسب جواز نہیں۔

میں یورپین ممالک کے اعداد و شمار پیش نہیں کروں گا کیونکہ ان کا تقابل ہمارے حق میں مفید نہیں ہوگا۔ جب تک ہم پیداوار میں اضافہ نہیں کرتے اور پیداواری بحران پر قابو نہیں پاتے ہم حقیقی معنوں میں ترقی نہیں کر سکیں گے۔ ہماری برآمد کی ضرورت بدیہی ہے۔ ورنہ حکومت برآمدات کو بڑھانے کے لئے اتنی آزادانہ اور دور رس مراعات نہ دیتی۔

اقوام متحدہ میں' میں نے نمایاں اصلاح دیکھی ہے۔ پاکستان کی واضح اور مستقل خارجہ پالیسی موجودہ کشیدگی کے ضمن میں زیادہ توجہ اور عزت حاصل کر رہی ہے۔ ملک میں مضبوط اور مستقل حکومت کے قیام کی وجہ سے یہ پالیسی اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔

اقوام متحدہ کے اس اجلاس میں زیادہ تر توجہ دو غیر تصفیہ شدہ امور کی طرف رہی ہے۔ اولاً روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشیف کی عمومی اور مکمل تخفیف اسلحہ کی تجاویز کے باب میں جو انہوں نے 17 ستمبر 1959ء کو اقوام متحدہ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے پیش کیں۔ ثانیاً الجیریا کے مسئلہ پر۔ مسٹر خروشیف کی تجویز پر میں نے سیاسی کمیٹی میں اپنی نیویارک میں آمد کے چار یوم بعد بیان دیا تھا۔ الجیریا کا مسئلہ ابھی تک زیر بحث ہے' اس پر اور کشمیر کے مسئلہ پر میں اپنے نظریات صدر اور وزیر خارجہ کو پیش کروں گا۔

چونکہ ہمارے مسئلہ کی جڑ بنیادی اشیا کی قیمتوں میں کمی اور اتار چڑھاؤ ہے اس لئے میں نے اسمبلی کی اقتصادی کمیٹی میں 11 نومبر کو بیان دیا تھا اور اس موضوع پر ایک گشتی مراسلہ بھی بھیجا تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ بہت سے اہم ملکوں نے اس گشتی مراسلہ کی بھرپور تائید کی ہے۔

ہماری بہترین مساعی کے باوجود بین الاقوامی تجارت کے بعض اہم پہلو ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم تنہا کچھ نہیں کر سکتے۔ ان میں سے سب سے اہم تجارتی شرائط کا انحطاط ہے۔ بنیادی اشیا کی عالمی قیمتیں خطرناک شرح سے متواتر کم ہو رہی ہیں جبکہ واضح تقابل میں تجارتی شرائط کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ 49-1948ء کے سو کی اساس کے مقابلے میں تجارتی شرائط کا اشاریہ 1959ء کے اوائل میں گر کر 6ء50 رہ گیا۔ پاکستان کے لئے جو اپنے زر مبادلہ کا 70 فیصد بنیادی اشیا کی برآمد سے کماتا

ہے' یہ انحطاط تباہ کن ہے۔ حقیقتاً اس کا مطلب یہ ہوا کہ اتنی ہی برآمدات سے ہم درآمد کی صرف نصف اشیاء خرید سکتے ہیں۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اپنی درآمدات کو کم کر دیں جن میں لازمی درآمدات بھی شامل ہیں۔

دس سال قبل ہم اپنے ترقیاتی کاموں کے لئے بھاری سازوسامان اپنی آمدنی سے خرید سکتے تھے' لیکن اب ہمارے لئے یہ ناممکن ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں جو بیرونی امداد ملتی ہے' وہ بھی برآمدی اشیا کی قیمتوں میں کمی کے خسارے کے مقابلے میں کم ہے۔ اشیا تیار کرنے والے ممالک اور بنیادی پیداواری ممالک کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ یورپ اور امریکہ جہاں دنیا کی صرف تیس فیصد آبادی بستی ہے' وہ کل قومی آمدنیوں کا 80 فیصد سمیٹ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایشیا اور افریقہ جو دنیا کی آبادی کا 60 فیصد ہیں' اپنی آمدنی کے صرف سترہ فیصد کے لئے مشقت کرتے ہیں۔ کثرت اور غربت کی یہ انتہا ممکن ہے نئی بات نہ ہو لیکن اب اس سمٹتی ہوئی دنیا میں اس نے واضح اور شدید صورت اختیار کر لی ہے۔ اس واضح فرق نے امیر اور غریب دونوں کو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس لئے عالمی قیمتوں میں استحکام کی ضرورت اتنی ہی واضح ہے جتنی لازمی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ قرارداد جنرل اسمبلی میں پیش کی ہے کہ ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو بنیادی اشیا کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی کے اسباب کا جائزہ لے۔

فلپائن کے اخباری نمائندوں نے جو میری پریس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے' مجھے اطلاع دی کہ میری قرارداد دوسری کمیٹی نے قبول کر لی ہے۔ یہ بڑی طمانیت بخش بات ہے کیونکہ قیمتوں کے استحکام کے بغیر بنیادی اشیا پیدا کرنے والے ملکوں اور صنعتی ممالک کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارت کا امکان موہوم ہے۔ اسی طرح ترقی پذیر ممالک میں ترقیاتی کوشش کی کامیابی کی پیش گوئی بھی مایوس کن اور موہوم ثابت ہوگی۔

30 نومبر 1959ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

کیا غیر ملکی امداد خیرات ہے؟

اقتصادی امداد دوسری جنگِ عظیم کے بعد نمود پذیر ہوئی ہے۔ یورپ کی راکھ پر امریکہ کی بے پناہ اقتصادی امداد کے ذریعے ایک نئی صنعتی طاقت پیدا کر دی گئی تھی اور امریکہ جنگ میں ملوث ضرور تھا لیکن تباہی سے محفوظ رہا تھا۔

یورپ کی تعمیرِ نو کا مقصد محض اتنا نہ تھا کہ تباہ شدہ ملکوں کے کھنڈرات پر نئے چرچ اور فنونِ لطیفہ کے نئے ادارے تعمیر کئے جائیں جتنا کہ یورپ کو کمیونزم کی وہیل کے منہ میں جانے سے بچانا تھا۔ اگر مغربی یورپ کمیونزم کے زیرِ اثر آجاتا تو برّاعظم امریکہ کی طرف اس کی پیش قدمی اتنی ہی یقینی ہوتی جتنی کہ اس ٹڈی دَل کی ہوتی ہے جو صحرائے عرب سے ہوتا ہوا برّاعظم پاک و ہند اور وسطی چین میں داخل ہو جاتا ہے۔

امداد کا ایک مخصوص مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد خیرات نہیں ہوتا بلکہ یہ تو باہمی خود حفاظتی ہے۔ دوسروں کو استبدادیت سے بچانا خود اپنی حفاظت ہے۔ تعمیرِ نو کے بعد یورپ سے کمیونزم کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ غالباً ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی امداد اس سے بھی زیادہ ضروری ہے تاکہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھ سکیں۔

بلاشبہ دوسری جنگِ عظیم میں یورپ کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن ایشیا اور افریقہ کو ایسے مسائل کا سامنا رہا ہے جو جنگوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کچھ ایشیائی ممالک بھی پچھلی جنگ میں روندے گئے تھے لیکن جنگ کی تباہ کاریوں سے ایشیا اور افریقہ کو جو مادی نقصان اٹھانا پڑا تھا، اس سے بھی بدتر وہ مستقل غربت ہے جو دو براعظموں کے لوگ نسلاً برداشت کرتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ ایشیا اور غربت ایک

www.bhutto.org

دوسرے کے مترادف بن گئے۔ ہماری زمینیں زرخیز ہیں لیکن ہمارے عوام غریب ہیں۔ بیماری ہمارا ورثہ ہے اور بچوں کی آہ وبکا ایشیائی آواز ہے۔ مراعات یافتہ طبقے کے مہین پردے کے پیچھے غمگین انسانیت کا مصیبت زدہ سمندر ہے۔ کیا یہ پہلے سے مقدر شدہ قانون اور ایشیا کا ناقابل تغیر مقدر ہے؟

اس بات میں شبہ کی گنجائش ہے کہ بنی نوع انسان کا اجتماعی ضمیر طویل عرصے تک ایسے حالات زندگی کو برداشت کرتا رہے گا۔ ایشیائی قیادت کا نعرہ دائمی اجتماعی افلاس کے دھبّے کو دھونا ہے۔ اس عظیم ترین چیلنج پر قابو پانے کے لئے ہر شخص کو کمربستہ ہو جانا چاہیے۔ انفرادی سطح پر تمام تر ممکن قربانیاں مسائل کو چھو تک نہیں سکتیں۔ صدیوں تک غیر ایشیائی لوگوں نے ایشیائی محنت پر گزارہ کیا اور غریب سے امیر ہو گئے۔ "سورج سے محروم، ریشم سے محروم اور گرم مسالوں سے محروم بحر اوقیانوس کے معاشرے" کی مشرق کی دولت کو ہڑپ کر جانے کی بے پناہ ہوس نے ہمیں کنگال کر دیا ہے۔ یہ مسئلہ ان کا بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا ہے۔ انہیں کم از کم جزوی طور پر ایشیا کو وہ سب کچھ واپس کر دینا چاہیے جو اس کی ملکیت تھا۔

غیر ملکی امداد معقول اور افادی وجوہات کی بناء پر دی جاتی ہے۔ جو حکومتیں دوسرے ملکوں کو امداد دیتی رہی ہیں، وہ اس پالیسی کی قدر و قیمت اور ضرورت کو سمجھتی ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ امداد جدید دور کی حکمت عملی کی ایک ناگزیر خصوصیت ہے، وہ اپنے عوام سے ضروری قربانیوں کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہیں تاکہ انہیں مزید قربانیاں نہ دینی پڑیں۔ یہ حکومتیں وقتاً فوقتاً اپنے عوام کے سامنے امداد کے فلسفے اور اسے جاری رکھنے کی ضرورت کی وضاحت کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو امداد کو خیرات کہنے پر مصر ہیں۔

امداد پانے والے ملک امداد پا کر ممنون ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں وہ اس کا ضرورت سے زیادہ لحاظ بھی کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے وہ لوگ جو امداد کو خیرات کہتے ہیں مسئلے کے اس پہلو پر کم ہی توجہ کرتے ہیں۔ یہ بات کسی قوم کی، خواہ وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو، عزت نفس کے خلاف ہے کہ وہ دولت مند اقوام کے دروازوں پر ہاتھ میں کشکول گدائی لئے ہوئے پھرتی رہے۔ بلاشبہ اگر امداد کا یہی واحد تصور ہوتا اور کوئی دو طرفہ مفاد نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ کوئی قوم طویل عرصہ تک اس قسم کے حالات کو برداشت کرتی۔

20 اگست 1961ء کو پاکستان ٹائمز میں ایک امریکی اٹارنی کا خط شائع ہوا تھا جس میں اس نے کہا تھا۔

"آپ کے صدر ہمارے خزانے سے مزید خیرات حاصل کرنے کے لئے یہاں آئے، اس کا لازمی نتیجہ ہمارے عوام پر مزید ٹیکسوں کی صورت میں نمودار ہو گا جو پہلے ہی بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ آپ کے ملک کو پہلے ہی پچاس کروڑ ڈالر دیئے جا چکے ہیں۔ اب ہمارے ہاں بہت سے لوگ بیروزگار ہیں اور وہ بھوک و فلاکت کا شکار ہیں اور بہت سے لوگ اپنے گھروں سے اس لئے محروم ہو رہے ہیں کہ وہ ان کی قیمت کی ادائیگی جاری نہیں رکھ سکتے۔

www.bhutto.org

خیال ہے کہ یہ ابتر حالات مزید خراب ہوں گے۔ یہاں کے متعدد بیروزگار لوگوں کی ضرورت کے پیشِ نظر میں آپ کے عوام سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اس بات کا احساس کریں کہ یہاں کے زیادہ تر شہری اتنے امیر نہیں ہیں جتنے کہ ہمارے ٹیکسوں پر پلنے والے نمائندے نظر آتے ہیں اور میں آپ کے عوام سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے عوام کی خاطر اس ملک سے خیرات کی درخواست کرتے وقت احتیاط سے کام لیں۔ "

اس خط کا ہمارے بہت سے محبِ وطن شہریوں نے موزوں طور پر جواب دیا۔ ان ہی احساسات نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کے لئے اکسایا ہے۔

تمام دنیا کے عوام مناسب رہائش، تحفظ، آزادی اور ایک مقصد کا شعور چاہتے ہیں نیز اس مقصد کو اپنانے میں احساسِ شمولیت چاہتے ہیں۔ یہ وہ بنیادی مقاصد ہیں جن کو اپنانے کے لئے انسان ہمیشہ سے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ معاشرے میں جس حد تک یہ ضروریات پوری کی جاتی ہیں، وہ اس معاشرے کی ترقی کا پیمانہ ہے۔ تمام ضروریات مکمل طور پر کہیں بھی پوری نہیں کی گئیں۔ دنیا کے بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں ابھی تک بنیادی ضروریات مہیا نہیں کی گئیں۔ جہاں خوراک، لباس، مکان، صحت اور تعلیم کی سہولتیں نایاب ہیں۔

تقریباً اچانک ہی ترقی پذیر ممالک کے عوام نے غربت، بیماری اور جہالت کے متعلق کچھ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ذرائع مواصلات کی ترقی، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے باہم بڑھتے ہوئے روابط اور افکار کے اثر نے ان لوگوں کے دلوں میں نئی آرزوئیں پیدا کر دی ہیں۔ حتیٰ کہ آزادی کی تحریکیں بھی معاشی بہتری کی خواہش کے ساتھ مربوط ہو گئی تھیں۔ آزادی اور عالم غربت کے قابلِ اصلاح ہونے کے احساس نے ایشیائی لوگوں کے تخیّل کو متحرک کر دیا ہے۔

ایسی دنیا جس میں اہم سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی نے غربت، بیماری اور کمر توڑ مشقت کا مادی جواز نہیں چھوڑا اس میں زندگی کے حالات کو بہتر بنانا ہمارے وقت کا عظیم ترین چیلنج ہے۔ یہ ہنگامہ خیز بیداری بیک وقت خطرے اور امید سے پُر ہے۔

ابھی تک اس چیلنج کا خاطر خواہ طور پر مقابلہ نہیں کیا گیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور کم آمدنی کے منحوس چکر کی گرفت، کم بچتیں، سست رفتار سرمایہ کاری اور ترقی کی کمی کی موجودگی میں ترقی پذیر ممالک محسوس کرتے ہیں کہ غربت، غربت کو جنم دیتی ہے۔ غریب اور امیر کے درمیان عدم مساوات شدید ہوتی جاری ہے، حالانکہ غربت اور دولت کی کثرت زیادہ دیر تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتی۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ترقی کی کوششوں کا ایک بڑا حصہ متعلقہ افراد کی طرف سے ہونا چاہیے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر پچھلے تین سال میں پاکستان میں انقلابی اصلاحات نافذ کی گئی ہیں۔ اصلاحات اراضی نے پیداوار بڑھانے کے لئے نئے ولولے پیدا کیے ہیں اور سیاسی طاقت کی معاشی و معاشرتی بنیادوں کو وسعت دی ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ سیاسی اور معاشرتی اعتماد پھیلانے اور اس طرح جمہوری نظام

حکومت کی روح کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس بات کا بلاتوقف اعتراف کر لینا چاہیے کہ غیر ملکی امداد کے بغیر دوسرے منصوبے کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔ بیرونی سرمایہ ہی اندرونی سرمائے کے مؤثر استعمال کے لئے عمل انگیز ذریعہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ قبل از سرمایہ کاری سرگرمیوں مثلاً تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی فراہمی، رابطہ کی سڑکوں اور ذرائع رسل و رسائل کی تعمیر اور تحقیق پر صرف ہو گا۔ یہ وہ سرگرمیاں ہیں جو معیشت کا بنیادی ڈھانچہ بناتی ہیں اور اسے پیداواری سرمایہ کاری کے لئے تیار کرتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی سرمایہ کاری محاصل پیدا نہیں کرتی اور زیادہ شرح سود والے قرضے امدادی رقوم کا قابل عمل بدل نہیں ہو سکتے۔

ہم احتیاج کے اس بحران پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ یہ محض حماقت نہیں تھی کہ حکومت نے فالتو زمینیں بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا۔ ان کسانوں کو جو ایشیائی غربت کا مجسمہ اور ہمارے عہد کے چیلنج کی علامت ہیں۔ لیکن قومی سطح پر ہماری اصلاحات بین الاقوامی مسئلہ کا حتمی حل فراہم نہیں کر سکتیں، ہمیں باہر سے مدد کی ضرورت ہے، محض ہمدردی ہی کافی نہیں۔

آج کل بہت کم لوگ کالبرٹ کے بتائے ہوئے اس تجارتی نقطہ نظر کی حمایت کریں گے جس کی رُو سے اگر صنعتی پیداوار کے گر مملکت سے باہر چلے جائیں تو یہ امر قومی خوشحالی کے حق میں مضر ثابت ہو گا۔ پس ماندہ ملکوں کی صنعتی ترقی بین الاقوامی تجارت اور دنیا کی خوشحالی میں اضافہ کا باعث ہو گی۔ تجربہ سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ جو ممالک صنعتی اشیا بہتر طور پر پیدا کرتے ہیں وہ دوسرے ممالک کی اشیا کے بہترین گاہک بھی ہوتے ہیں۔ کسی ملک کے اندر بین الاقوامی برادری کی طرح گاہکوں کی خوشحالی کے ساتھ ساتھ کاروبار بڑھتا ہے۔

جس طرح کسی کمیونسٹ ملک کی طاقت اور ترقی دوسرے کمیونسٹ ممالک کے لئے قوت کا سرچشمہ ہوتی ہے، اسی طرح آزاد دنیا کی اقتصادی خوشحالی بھی باہمی فائدے کا وسیلہ ہو گی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور یورپ کی دوسری سامراجی طاقتوں کی معاشی عظمت نے بڑی حد تک امریکی معیشت کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ موجودہ دور میں امریکی دولت اور طاقت ان تمام قوموں کے لئے بے حد قوت اور طاقت کا وسیلہ ہے جنہیں آزاد دنیا کہا جاتا ہے اور اس کی معیشت اسی طرح ناقابل تقسیم ہے جس طرح کمیونسٹ ممالک کی معیشت۔ امریکہ میں بدحالی کے اتنے ہی فوری معاشی نتائج برآمد ہوتے ہیں جتنا کہ اس کا معاشی استحکام "آزاد دنیا" کی دوسری قوموں پر اثر کرتا ہے۔

یہاں یہ مستقل سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ اور یورپ ایشیائی غربت کا ازالہ کیوں کریں؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ دنیا کو جارح بین الاقوامی کمیونزم کا شکار ہونے سے بچایا جائے؟

اس ذمہ داری کی جڑیں ماضی قریب کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ یورپ میں امارت ہے اور ایشیا و افریقہ میں غربت۔ اگر ایشیا اور افریقہ کی دولت کی لوٹ مار نہ کی جاتی تو یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا یورپ اپنی

www.bhutto.org

خوشحالی کی معراج کو پہنچ سکتا۔ سامراجیت کا دور مرچکا ہے لیکن اس کے مابعد اثرات ابھی تک ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ سامراجیت کی تاریخ ایک طرف لوٹ مار ہے جو حکومت کی مداخلت سے آزاد حیثیت کے نام پر کی گئی۔

ہم ماضی کو اس لئے یاد کرتے ہیں تاکہ جو لوگ مستقبل کے لئے نئی منصوبہ بندی کرتے ہیں وہ ماضی کے بارے میں کچھ جان سکیں۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام امن اور تحفظ سڑکوں اور ریلوے نیز کچھ تعلیم اور صحت کا دور لے کر آیا۔ مگر ہماری معیشت کا تمام ڈھانچہ غیر ملکی معیشت کو سہارا دینے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نیز تعلیم اور انتظامیہ محض غیر ملکی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے منظم کئے گئے تھے۔

جو غلطیاں ماضی میں سرزد ہوئیں ان کا ازالہ ہنگامہ خیز حال میں کرنا پڑے گا۔ ہمارے عوام کے دوش پر جو بار گراں ہے وہ ہمارا اپنا پیدا کردہ نہیں۔ وہ خدمات جو ترقی یافتہ ممالک انجام دیتے ہیں' وہ اس سلسلہ میں بہت بڑا عنصر ثابت ہوں گے کہ کس قدر بوجھ سے کتنی جلدی نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

غیر ملکی امداد بڑی حد تک تلافیِ مافات ہے۔ یہ گویا ایشیا کے عوام کو اس دولت کے ایک حصہ کی واپسی ہے جو بے لگام سامراجیت کے دور میں ان سے چھین لی گئی تھی۔ لہٰذا مغرب کی طرف سے ایشیا اور افریقہ کے عوام کو وسیع پیمانے پر اقتصادی امداد دینے کی معقول اخلاقی وجوہات ہیں۔ ترقی پذیر ممالک کے تعلق سے جنہیں وہ اس سے پہلے لوٹتے رہے ہیں' صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک کی اخلاقی ذمہ داری کے موضوع پر صدر سوئیکارنو کا ایک بیان دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"یہ کہا گیا ہے کہ مغرب میں وجود پذیر ہونے والے تمام منصوبے ماضی میں ہونے والی برائیوں کا حال میں نقد ادائیگی کے ذریعہ ازالہ کرنے کی محض ایک کوشش ہیں جب کہ ان سے مستقبل میں مزید منافع کی امید بھی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ماضی کے گناہوں کے لئے حال کا نقد کفارہ ادا کرنا ہے جس سے مستقبل میں بخشش کی امید کی جاتی ہے۔"

سامراجی استحصال کے طریقہ کار نے مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کی ہیں۔

برصغیر ہند کے معاملے میں 1757ء اور 1815 کے درمیانی عہد میں اس علاقے سے انگلستان کو دولت کا وسیع پیمانہ پر یک طرفہ انتقال دیکھنے میں آیا۔ "آرمی" (Orme) نے اپنی کتاب "ہندوستان میں برطانوی قوم کے فوجی معاملات کی تاریخ" میں ان خراجوں کے بارے میں لکھا ہے جو برطانیہ نے جنگِ پلاسی کے بعد اکٹھے کئے۔

"برطانوی قوم نے اس سے قبل کبھی ایک وقت میں نقد رقوم کی شکل میں اس قدر مالِ غنیمت حاصل نہیں کیا تھا' کیونکہ یہ سکہ رائج الوقت میں 800000 پونڈ بنتا تھا۔ صحیح یا جھوٹ موٹ کی مشکلات کی وجہ سے 9 ر اگست تک اس سے زیادہ نہ مل سکا جب کہ رائے دولاب نے سولہ لاکھ پچپن ہزار تین سو اٹھاون روپے ادا کئے اور اسی مہینے کی 30 کو اس نے پندرہ لاکھ ننانوے ہزار سات سو چھتیس روپے کی مالیت کا سونا' جواہرات اور نقدی پیش کی۔ ان تینوں ادائیگیوں کی مالیت 10765737 روپے بنتی تھی۔"

www.bhutto.org

لارڈ کلائیو نے کئی سال بعد بتایا کہ اس فاضل ابتدائی خراج کی کل رقم جو تقریباً چالیس لاکھ پونڈ تھی (موجودہ شرح کے حساب سے چار کروڑ پونڈ) ایک خزانے سے دوسرے خزانے میں منتقل کی جارہی تھی۔ باہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرکاری اور نجی ادائیگیوں کے ذریعے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جو منتقلی کی گئی جنگ پلاسی کا براہ راست اور فوری نتیجہ تھا۔

اس ابتدائی خراج کے بعد ملک کو سنگدلانہ اور مسلسل طور پر لوٹنے کا عمل شروع ہو گیا۔ سردار پانیکر نے اس دور کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو "ڈاکوؤں کی ریاست" سے تشبیہ دی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی بے تحاشہ بدعنوانیوں کو ختم کرنے کے لئے لارڈ کلائیو نے ان کے نجی تجارت کے حق کو قانونی تحفظ دے دیا" اگرچہ وہ اس کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ اب ہر ایک افسر اپنے مرتبے کے مطابق نہایت سلیقے کے ساتھ اپنا "مناسب" حصہ پانے لگا۔ ایک کرنل 7000 پونڈ سالانہ (آج کل کی کرنسی میں ستر ہزار پونڈ سالانہ) ایک میجر 2000 پونڈ گویا بیس ہزار پونڈ سالانہ پاتا تھا۔ نقد مال غنیمت یا محض فتح کے بعد لوٹ مار کا حصہ مقامی فوجی کمانڈروں کے لئے ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کے ساتھ جنگیں چھیڑنے کا زبردست محرک تھا۔ بیگمات اودھ سے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کا روپیہ بٹورنا اس قسم کی بہت سی رسوائے زمانہ مثالوں میں سے ہے۔

اگرچہ یہ لوٹ مار ڈرامائی تھی اور اسی لئے تاریخی طور پر بدنام ہے لیکن سرمائے کے اس بہاؤ کا جو ہندوستان سے برطانیہ کو بلا روک ٹوک ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکومتی اختیارات سنبھالنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا' کوئی تقابل نہ تھا۔ اس بہاؤ کے طریقوں کی صورت مختلف تھی۔

اپنے قیام کے بعد ہی کمپنی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اسے برصغیر کے ساتھ ادائیگی کے وسائل بھیج کر تجارت کرنی پڑے گی جسے وہ "سرمایہ کاری" کا نام دیتی تھی اور جس سے نہ صرف خریداری ہی کرنا تھی بلکہ ہندوستانی کپڑا بننے والوں کے لئے کپاس اور ریشم کی پیداوار میں روپیہ بھی لگاتا تھا۔ یہ "سرمایہ کاری" بڑی حد تک قیمتی دھاتوں پر مشتمل ہوتی تھی کیونکہ بہت کم ایسی اشیا تھیں جو ہندوستان میں فروخت ہو سکتی تھیں۔ سالانہ "سرمایہ کاری" کے سلسلے میں سونے اور چاندی کی یہی وہ برآمد تھی جس نے کمپنی کو اس تجارتی تنقید کا ہدف بنا دیا تھا کہ وہ محض تعیشات کی درآمد کے لئے برطانیہ کو اس کے قیمتی دھاتوں کے ذخائر سے نکاس کے ذریعہ محروم کر رہی تھی۔ بنگال کی فتح کے بعد کمپنی نے سرمایہ کاری بالکل ختم کر دی۔ دوسرے الفاظ میں مغلوب ملک اپنی اشیا کے بدلے میں کچھ بھی حاصل نہ کرتا تھا۔ صرف نجی کپڑا بننے والوں کو ادائیگی کی جاتی تھی لیکن جو روپیہ ان کو دیا جاتا تھا' وہ برطانیہ سے آنے کی بجائے ٹیکسوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کی پہلی صورت زمین کا مالیہ اور ملک کے نمک پر ٹیکس تھا۔ برطانیہ کے لئے برآمدات کی ادائیگی برصغیر کو خود کرنا پڑتی تھی۔

یہ استحصال کی بدترین شکل ہے اور بغیر صلے کے اس دولت اور سرمائے کے بہاؤ کی مکمل وسعت کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو سالہا سال یہ سال جاری رہا۔ پروفیسر ہولڈن فربر اپنی کتاب "جان کمپنی ایٹ ورک" میں بیرونی جہاز کے ملک میں آنے اور باہر جانے کے سمندری سفروں میں سامان کی تفصیلات بیان کرتا

www.bhutto.org

ہے۔ یہ وہی جہاز ہے جس میں وارن ہیسٹنگز 1785ء میں انگلینڈ واپس لوٹا۔ سیر گنگن ہندوستان کو مختلف نوع کی اشیا مثلاً سکے' تانبا' لوہا' اونی کپڑے اور جہازوں کا سامان جن کی مالیت ستائیس ہزار تین سو پونڈ تھی لے کر گیا تھا' وہ ہندوستان سے سوتی مصنوعات' سوتی دھاگہ' نیل' سرخ لکڑی' ریشم اور شورہ جن کی مالیت ایک لاکھ انیس ہزار تین سو چار پونڈ بنتی تھی' واپس لے گیا تھا۔ جیسا کہ پروفیسر کہتا ہے اگر اس کا سفر معمول کے مطابق تھا تو صریحاً اس سفر میں تقریباً نوے ہزار پونڈ مالیت کی اشیا بلا معاوضہ برطانیہ منتقل کر رہا تھا۔ پیچیدہ اعداد و شمار کے بعد صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 1783ء سے 1793ء کے درمیانی عرصے میں' جس پر وہ اپنی تحقیقات مرکوز کرتا ہے 'تقریباً بیس لاکھ پونڈ (جو آج کل 2 کروڑ بنتے ہیں) ہر سال بلا معاوضہ منتقل کیا جاتا تھا۔ فریر کے اعداد و شمار کو سٹریچی حیران کن حد تک "کم" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اعداد و شمار بڑی حد تک قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ ایک اور محقق ولیم ڈگبی نے اپنی کتاب "انگریزی عہد اور خوشحال ہندوستان" میں حساب لگایا ہے کہ 1757ء سے 1815ء تک برصغیر سے ہتھیایا جانے والا اخراج یا بہاؤ جو بلا معاوضہ تھا' اس کی اوسط ہر سال ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ بنتی تھی (جو موجودہ دور کے مطابق 18 کروڑ پونڈ تھی)

ان رقوم کی بڑی مقدار کے قطع نظر ان بلا معاوضہ انتقالاتِ دولت پر جو بھاری معاشی خرچ برصغیر کو برداشت کرنا پڑتا تھا' اس کی بھی چھان بین کی ضرورت ہے۔ 1770ء کا قحط بنگال برطانوی فتح کا پہلا نتیجہ تھا' اگرچہ یہ بدترین نہیں تھا۔ ہاتھ کی کھڈی سے کپڑا بننے والے لنکاشائر کی مشینی کھڈیوں کے ہاتھوں ختم ہو گئے۔ بنگال کی فتح کے تقریباً اسی سال بعد ایک مصلح گورنر جنرل لارڈ ولیم کیونڈش بینٹنک نے رپورٹ لکھی کہ "سوتی کپڑا بننے والے جولاہوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کی دھوپ میں سوکھ رہی ہیں۔"

اس کے برعکس برطانیہ کو جو اہم اقتصادی فوائد حاصل ہوئے' وہ بڑے ہی نمایاں تھے۔ ہندوستانی مورخین نے رومیش چندر دت کے' جو آئی سی ایس میں تقرر کئے جانے والے پہلے ہندوستانیوں میں سے تھا' ابتدائی کام کے بعد اس نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے کہ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے آخری دنوں میں ہندوستان کے استحصال سے حاصل شدہ سرمائے نے برطانیہ میں اہم عصر صنعتی انقلاب کے لئے ابتدائی سرمایہ فراہم کرنے میں اہم حصہ لیا۔ مسٹر جان سٹریچی نے جو بعد از جنگ کی لیبر حکومت کے سابق وزیر جنگ ہیں' اپنی جدید ترین کتاب "قلمرو کا خاتمہ" (The End of Empire) میں جو 1959ء میں شائع ہوئی' اس خیال کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"اگرچہ ہندوستان سے دولت کا سرمایہ زمانہ بہاؤ کسی لحاظ سے بھی برطانیہ کی ابتدائی صنعت کاری میں سب سے بڑا عنصر نہیں تھا' پھر بھی اس نے حقیقی کردار ادا کیا۔ آج کل کی رفتارِ ترقی کے مقابلے میں یہ عمل سست رفتار تھا جو ایک صدی سے بھی زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا تھا۔ تاہم اٹھارویں صدی کے وسط میں ایک نازک موقع پر اسے بلا معاوضہ درآمدات کی قوتِ محرکہ نصیب ہو گئی۔"

www.bhutto.org

انیسویں صدی میں صنعتی سرمائے کے ذریعے ہندوستان کے استحصال کی ممتاز صورتوں میں سے بلاواسطہ لوٹ کھسوٹ کی پرانی شکلوں کا جاری رہنا بھی خارج نہیں تھا جنہیں مزید آگے بڑھایا گیا اور ساتھ ہی ان کی صورت تبدیل کی گئی۔

"خراج" جسے انیسویں صدی کے وسط تک بھی سرکاری ترجمان کھلم کھلا یہی نام دیتے تھے' یا انگلستان کے لئے کروڑوں پونڈ کی دولت کا براہِ راست انتقال' دونوں ہی "خانگی اخراجات" کے سرکاری دعوے کے تحت اور ساتھ ہی نجی ترسیلِ زر جن کے بدلے ہندوستانی سلطنت کو کوئی شے نہ ملتی تھی' یہ سارا عمل انیسویں صدی کے دوران تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جاری رہا اور تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔ بیسویں صدی میں یہ تجارت میں مقابلتاً کمی کے ساتھ ساتھ اور تیز رفتاری سے بڑھتا گیا۔

برِّصغیر میں برطانوی سرمایہ کاری کا مرکزی نکتہ سرکاری قرضہ تھا۔ برطانوی حکومت کے ہاتھوں میں سرکاری قرضہ اٹھارہ سالوں میں دگنا ہو گیا۔ یعنی سات کروڑ پونڈ سے چودہ کروڑ پونڈ ہو گیا۔ 1900ء تک یہ بائیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ تک پہنچ چکا تھا۔ 1913ء تک اس کی کل میزان ستائیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ ہو گئی۔ 1936ء تک اکہتر کروڑ نوے لاکھ پونڈ جسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ 458 کروڑ روپے (34 کروڑ 35 لاکھ پونڈ) ہندوستان کے قرضے کے تھے اور 37 کروڑ 60 لاکھ پونڈ برطانوی قرضے کے تھے۔ اس طرح برطانیہ کی براہِ راست حکمرانی کی تین چوتھائی صدی میں قرضے بڑھ کر دس گنا سے بھی زیادہ ہو گئے۔

زیادہ تر قرضہ سلطنت ہندوستان پر محصولات عائد کرنے کے نظام کے تحت ہر ممکن خرچ وصول کر کے پیدا کیا گیا جو کسی بعید ز قیاس اور دور دراز طریقے سے بھی ہندوستان اور برطانیہ کے ساتھ متعلق ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ لندن میں ترکی کے سلطان کے استقبال کے اخراجات پورے کرنے یا چین اور ایران میں سفارت خانوں کی دیکھ بھال کے لئے حبشہ کی جنگ کے لئے اور بحیرہ روم میں جنگی جہازوں کے اخراجات کا ایک حصہ پورا کرنے کے اخراجات بھی ہندوستان کے کھاتے میں ڈال دیئے گئے۔

1914ء سے 1918ء تک انگلستان نے اپنے ہندوستانی اخراجات میں پچپن کروڑ روپے کا اضافہ کر دیا۔ اس سامراجی قرضے کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے ترانوے کروڑ روپے خرچ کئے جو فوج' شہری انتظامیہ اور قرضے کے اداروں کے کل مصارف مالیتی ایک ارب تراسی کروڑ چالیس لاکھ روپے میں سے تھے۔

برِّصغیر میں برطانوی ٹیکس سامراجی اخراجات کے حساب سے بڑھتے چلے گئے۔ 1850ء اور 1870ء کے درمیان ٹیکس پچاس فیصد بڑھ گئے۔ کل ٹیکس جو برطانوی حکومت نے ہندوستان پر لگائے وہ 1857ء اور 76-1875ء کے درمیان تین کروڑ ساٹھ لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ کر پانچ کروڑ دس لاکھ پاؤنڈ ہو گئے۔ اسی مدت میں برطانوی ساہوکاروں کو ادا کئے جانے والے باضمانت سودی اخراجات اٹھانوے لاکھ اٹھانوے ہزار چھ سو تراسی پونڈ سے بڑھ کر ایک کروڑ چونتیس لاکھ سڑسٹھ ہزار سات سو تریسٹھ

www.bhutto.org

پونڈ ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ تجارت پرچم کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ محکوم قوموں کے ساتھ تجارت کا فائدہ اور بے پناہ منافع اس وجہ سے ہے "کیونکہ مہنگا بیچنا اور سستا خریدنا ممکن ہے" مسٹر سٹریچی نے اپنی کتاب The End of Empire میں اس مسئلہ کی چھان بین کی ہے۔ بے شمار اعداد و شمار کے ذریعے مسٹر سٹریچی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ مفروضہ کہ نو آبادیوں کے ساتھ اشیا اور ملازمتوں کا تبادلہ غیر منصفانہ طریقے سے ممکن ہے، درست نہیں، کیونکہ اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونے کے بعد برطانیہ کی شرائط تجارت حقیقتاً برطانیہ ہی کے حق میں بہتر ثابت ہوئیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو فوائد بیرونی تجارت کے میدان میں سامراجی ملک بٹور لیتا ہے، وہ اس سادہ خیال کی بہ نسبت بہت پیچیدہ ہوتے ہیں جو "سستا خریدو اور مہنگا بیچو" کا اصول ظاہر کرتا ہے۔ محکوم تجارتی منڈیوں کی ملکیت کے نتیجے میں صنعتیں قائم کرنا نیز پیشوں اور تجارت کا قیام ممکن ہوتا ہے جو دوسری صورت میں نہ تو ممکن ہوتے ہیں اور نہ ہی سود مند، ان صنعتوں، پیشوں اور تجارت سے حاصل ہونے والے فوائد اور آمدنی ملک کی ٹھوس قومی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

انیسویں صدی میں برطانیہ میں تجارتی اشیا اور ہتھیار بنانے والے صنعتکاروں کا ہندوستان میں برطانیہ کی سلطنت سے فوری رابطہ تھا۔ جیمز ایس مل نے برطانوی سلطنت ہند کے بارے میں کہا ہے "یہ اونچے طبقہ کے لوگوں کے لئے بیرون ملک مفاد کا ایک وسیع نظام ہے۔" مقبوضہ نو آبادیات کی وجہ سے ان صنعتوں کا جاری رہنا بھی ممکن ہو گیا ہے جو کم خرچ اشیا پیدا نہیں کر سکتیں اور جو اس کے علاوہ آزاد تجارت اور مقابلے کی تیز ہواؤں کی وجہ سے جڑ سے اکھڑ سکتی تھیں۔

تجارتی شرائط کے سلسلے میں بھی یہ باور کرنا مشکل ہے کہ 1945ء کے بعد برطانوی تجارتی شرائط کے اعداد و شمار مکمل صورت حال سامنے لاتے ہیں۔ رومی سلطنت کے عہد سے لے کر بلکہ اس سے بھی پہلے سیاسی غلبہ کو ہر طرح کی تجارت کے لئے استعمال کیا جاتا رہا جو انتہائی غیر منصفانہ تجارتی شرائط پر مبنی امر تھا۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر اوقات فوائد محض کمزور قوموں کو بین الاقوامی تجارت کے معمول کے مطابق بروئے کار لانے میں مداخلت کرنے سے روک کر حاصل کئے جاتے ہیں، کھلم کھلا استحصالی طریقوں سے نہیں۔ ان فوائد کا حساب کون کر سکتا ہے جو برطانیہ نے ہندوستانی منڈی پر طویل عرصے تک قبضہ کر کے در آمدات کے مقابلے میں اپنی بر آمدات کے ذریعہ حاصل کئے۔

اس موضوع پر ایک مستند مصنف "ہابسن" (Hobson) نے سامراجیت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا باعث وہ بے پناہ منافع ہے جو نو آبادیاتی سرمایہ کاری سے حاصل ہوتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے نو آبادیاتی سرمایہ کاری کو نو آبادیات سے سامراجی ملک کے لئے دولت منتقل کرنے کا مؤثر حربہ کہا جا سکتا ہے۔

ہم خود، ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سرمایہ حاصل کرنے کی سخت کوشش

www.bhutto.org

میں مصروف ہیں۔ پھر ہم بھلا غیر ملکی سرمایہ کاری کو سامراجی استحصال کا حربہ کہہ کر اس کی کس طرح عیب جوئی کر سکتے ہیں؟ اس بات کی تشریح اس تفاوت میں تلاش کرنی پڑے گی جو اپنے زیرِ نگیں علاقوں پر مسلط سامراجی طاقت کی نو آبادیاتی سرمایہ کاریوں اور خالص گفت و شنید کی بنیاد پر حاصل کردہ بیرونی سرمایہ کاری میں پایا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک بھی زیادہ ترقی پسندانہ پالیسی وضع کرنے کی کوششیں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں مثلاً لارڈ مارلے نے جو اس وقت سیکرٹری آف سٹیٹ تھے 'یعنی وزیر خارجہ' اپنے مشہور مراسلے "مالئے کی ضرورت نہیں" میں جو 29 ر جولائی 1910ء کو لکھا گیا تھا" یورپی تاجروں کا یہ نقطہ نظر اپنایا اور صوبوں میں علیحدہ شعبہ ہائے صنعت قائم کرنے کی نفی کر دی۔ انہوں نے اس خیال کی بھی حوصلہ شکنی کی کہ ابتدائی بنیادی صنعتیں قائم کی جانی چاہئیں یا یہ کہ مدراس کی حکومت (جو زیرِ بحث تھی) تجارتی پیداوار کی ذمہ داری قبول کرے اور اس کی جگہ صرف تعلیمی کام اور اطلاعات کی بہم رسانی کی منظوری دی۔ انتظامی ایجنسیوں نے بھی سرمائے کو صنعتوں میں استعمال کرنے کی بجائے تجارتی مقاصد کی جانب موڑنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان کی پیداواری صنعتوں کی وسیع پیمانہ پر تباہی کے جو اثرات ملک کی معیشت پر پڑے ان کا اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں دستی کھڈیوں سے کپڑا بننے والوں کی تباہی کے ساتھ ساتھ نئی مشینی صنعت کو فروغ ہوا۔ لیکن ہندوستان میں لاکھوں کاریگروں اور ہنرمندوں کی تباہی کے ساتھ ساتھ صنعت کو نئی صورتوں کا کوئی متبادل انتظام نہیں کیا گیا۔

اس بات کو برطانوی سرمائے کی ہندوستان کو برآمد کہنا حقیقت کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ مجموعی طور پر اس تمام عرصے میں برطانیہ سے ہندوستان کو سرمایہ کی برآمد ہندوستان سے انگلستان کو کئی گنا زیادہ خراج کی مخالف ترسیل کی صورت میں کہیں زیادہ توازن قائم کر چکی تھی اور یہ صورت حال اس وقت بھی تھی جب سرمایہ کاری کی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ برطانوی سرمایہ جو ہندوستان میں لگایا جاتا تھا' درحقیقت وہ سرمایہ ہوا کرتا تھا جو پہلے ہی ہندوستانی عوام کو لوٹ کھسوٹ کر ہندوستان ہی میں اکٹھا کر لیا جاتا تھا جس پر اس کے بعد انہیں سود اور منافع ادا کرنا پڑتا تھا۔

اس طرح کی "غیر ملکی" سرمایہ کاری اور "نو آبادیاتی" سرمایہ کاری کے درمیانی فرق جاننے کے لئے بہت زیادہ تخیل کی ضرورت نہیں۔ ایک کا مقصد ترقی ہے' دوسرے کا استحصال۔ جو مسئلہ بہت نازک ہے' وہ سرمایہ کاری کا منافع ملک سے باہر لے جانا نہیں بلکہ یہ معاشی ترقی کی حدود اور جہد کو مسخ کرنا اور جان بوجھ کر اقتصادی ترقی کی رفتار کو سست کرنا ہے۔ آج کل ہندوستان اور پاکستان کی صنعتی پس ماندگی' ہندوستان اور برطانوی حکومت کی شاہ خرچیوں کا نتیجہ اور برطانیہ کو پہنچنے والے فوائد اور اس کے تجارتی مفادات کا پیمانہ ہے۔

ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ آج کل کے پس ماندہ یا محض دوسروں کی امداد پر انحصار

www.bhutto.org

کرنے والے ممالک کی اقتصادی ترقی کے لئے جو سرمایہ درکار ہے' اس کا اس کل دولت اور سرمائے کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا جو گزشتہ سالہاسال میں ان کی جیبوں سے نکالا جا چکا ہے۔

پاکستان کو بھی ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے پس ماندہ ممالک کی طرح غیر ملکی امداد کی شدید ضرورت ہے۔ ایک غیر جانبدار مُبصر پال موفمین نے جو اقوام متحدہ کے خصوصی فنڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں' پس ماندہ ملکوں کی سرمایہ کاری کی ضرورتوں کا حال ہی میں ان الفاظ میں تجزیہ کیا۔

"اس مسئلے کے پہلو رونگٹے کھڑے کر دینے والے ہیں۔ اقوام متحدہ کی ممبر 82 قوموں میں سے کم سے کم 60 کو کم ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ایک ارب سے بھی زیادہ لوگ ان ملکوں میں رہتے ہیں۔ ان کی آمدنی 1971ء میں ممکنہ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق 120 ڈالر فی کس کے لگ بھگ تھی۔ ان میں سے کئی ملکوں میں یہ اس سے بھی کم ہے۔ اس کے برعکس میں یہ بتا سکتا ہوں کہ زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں اوسط آمدنی 800 ڈالر فی کس ہے اور بعض ملکوں میں تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔"

کم ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی میں اضافے کی موجودہ رفتار تقریباً تین فیصد سالانہ ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بعض ملکوں میں یہ تین فیصد سالانہ سے بھی زیادہ ہے اور دوسروں میں اس سے کم ہے۔ ان اعداد کے مقابلے میں ہمیں آبادی کے اضافے کے اعداد و شمار بھی پیش نظر رکھنے چاہئیں جو لگ بھگ دو فیصد سالانہ ہیں۔ اس طرح گویا ان ملکوں کی قومی آمدنی میں کل اضافہ ایک فیصد سالانہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذاتی معیار زندگی میں اصل اضافہ تقریباً 92ء 1 ڈالر فی کس ہے۔ اضافے کی یہ رفتار کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں۔ یہ اضافہ بہت ہی سست بلکہ خطرناک حد تک سست ہے۔"

مسٹر ہافمین کا یہ تخمینہ یقینی طور پر معقول ہے۔ اقوام متحدہ کے ایک مطالعہ کے مطابق اگر پس ماندہ علاقوں میں معاشی ترقی کی ابتدائی رفتار کو تیز تر کرنا مقصود ہو تو آٹھ سے دس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری ضروری ہے۔ بہر صورت یہ بتانے کے لئے چنداں زور دینے کی ضرورت نہیں کہ غیر ملکی امداد کی موجودہ رفتار دنیا کے پس ماندہ علاقوں کی معاشی ترقی کی خاطر خواہ رفتار کے لئے کافی نہیں۔ اگر ہم ایک سو ملکوں اور علاقوں میں جن کی آبادی ڈیڑھ ارب ہے' تین ارب ڈالر سالانہ کی رقم تقسیم کر کے اس کا مقابلہ مغربی یورپ کے چند ملکوں میں 30 ماہ کے اندر 13 ارب ڈالر کی امداد کی تقسیم کے ساتھ کریں اور مارشل پلان کے تحت صرف 24 کروڑ لوگوں کی بحالی کے لئے امداد کے حقیقی بہاؤ کی مدت کو بھی ذہن میں رکھیں تو پس ماندہ ملکوں کی مدد کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کا ناکافی ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

بین الاقوامی سرمایہ کاری میں معقول سطح کی برقراری کے مسئلہ کی پیچیدگیاں پچھلے چند سال میں ابتدائی ضرورت کی اشیا کی قیمتوں کے اشاریئے میں کمی اور اس کے نتیجے میں پس ماندہ ملکوں سے تجارت کی شرائط میں تبدیلی سے ظاہر ہو گئی ہیں۔ بنیادی اشیا کی قیمتوں کے اشاریئے میں کمی نے پس ماندہ ملکوں کی برآمدی آمدنی کو وسط 1957ء سے وسط 1958ء تک سات سے آٹھ فیصد تک کم کر دیا ہے۔ یہ کمی جو کارخانوں کی بنائی ہوئی اشیا کی درآمدی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ واقع ہوئی ہے' پسماندہ ملکوں کی

www.bhutto.org

در آمدی صلاحیت میں قومی نقصان کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ان ملکوں کے سرکاری سونے اور زرِ مبادلہ کے ذخائر کے چھٹے حصے یا بین الاقوامی بینک برائے تعمیر نو اور ترقی کے 57-1956ء کی شرح سے دیئے ہوئے چھ سال تک کے قرضوں کے برابر ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب ہو گا کہ پاکستان کے معاملے میں کل مالی امداد جو ہم نے مختلف ذرائع سے ابھی تک حاصل کی ہے، وہ اس کل نقصان کے برابر ہے جسے ہم نے اپنی بنیادی اشیا کی قیمتوں میں کمی کی وجہ سے برداشت کیا ہے۔

یہاں یہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک آج ہم دیکھ سکتے ہیں مستقبل میں بھی موجودہ صورت حال کی بہتری کے امکانات نظر نہیں آتے۔ تمام رجحانات سے پتہ چلتا ہے کہ صنعتی ممالک میں بنائی ہوئی اشیا کی قیمتیں چڑھتی رہیں گی جس کی بڑی وجہ اجرتوں میں اضافہ اور دوسرے معاشرتی فوائد ہیں اور متبادل اشیا کی تیاری بھی جاری رہے گی، بنیادی اشیا کی طلب کم ہو جائے گی نیز پس ماندہ ملکوں کی تیار شدہ اشیاء کی طلب جسے وہ اپنی آبادی میں اضافے کے مطابق بنیادی اشیا کی پیداوار اور صنعتی اشیا کے لئے چاہتے ہیں، ان کی قیمت بھی بڑھتی رہے گی۔ دباؤ کی ان صورتوں کا نتیجہ یہی ہو گا کہ پس ماندہ ملکوں کے عوام کے معیارِ زندگی اور صنعتی ممالک کے عوام کے درمیان فرق بڑھتا جائے گا۔ ان نتائج کی سنگینی کو اس جائزے کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے کہ آج بھی پس ماندہ ملکوں میں ایک ارب اسی کروڑ لوگوں میں سے ایک ارب چھتیس کروڑ بیس لاکھ باشندوں کی فی کس آمدنی آٹھ ڈالر ماہانہ ہے اور اس کے مقابلے میں اعلیٰ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں یہ آمدنی 9 ڈالر روزانہ ہے۔

کم خوش نصیب قوموں کے لئے دنیا کی امیر قوموں کی اقتصادی امداد کے اخلاقی فرض کو جان سٹریچی نے اپنی کتاب "اختتامِ سلطنت" میں نہایت ہی موثر طریق سے لکھا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل پیراگراف سے ظاہر ہے۔

"سامراجیت سے اجتناب ہی کافی نہیں ہے۔ شکم سیری کے بعد ان کروڑوں مظلوم اور مصیبت زدہ مردوں اور عورتوں سے پیٹھ پھیر لینا جن پر کبھی ہم نے حکومت کی تھی، اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا کہ ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکمرانی کی کوششیں جاری رکھنا۔ سامراجیت کی متضاد صورت، خوشحال، صاف ستھرے اور مطمئن ننھے منے انگلستان کے کنج تنہائی میں پناہ لینا نہیں ہے۔ اگر ہم مستقبل میں بھی اتنے ہی عظیم بننا چاہتے جتنے ماضی میں تھے تو ہمیں وہاں بھی محنت اور خدمت کرنی چاہیے جہاں کبھی ہم نے حکومت کی تھی اور جن کی ہم نے راہنمائی کی تھی۔"

غالباً ایشیا کی غربت تمام کی تمام نو آبادیاتی نظام کی پیدا کردہ نہیں۔ شاید معاشرے کے کسی بھی نظام سے غربت کی مکمل بیخ کنی ممکن نہیں لیکن جہاں کہیں یہ غربت اس قدر وسیع اور مکمل ہے، جتنی کہ ایشیا اور افریقہ میں ہے، اس میں کمی کرنا بھی معمولی کارنامہ نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم باقی دنیا میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہیں۔ بات یہ نہیں کہ ہمارے خیال کے مطابق امریکہ کی سڑکوں پر سونا چڑھا ہوا

www.bhutto.org

ہے" اور اس کے باشندے ہیروں کے بٹن والے فلمی ستارے یا تیل کے کروڑ پتی تاجر ہیں۔ کسی دوسرے ملک کی طرح امریکہ بھی فلاکت اور بیروزگاری کے مسائل سے دوچار ہے۔ امریکہ اور یورپ کو غربت کے بغیر دیکھنے کی توقع ایسی ہی ہے جیسے ایشیا میں صرف ہیرے اور فقیر ہی دیکھنے کی توقع کی جائے۔ ہم نے ہارلم کی ابتر حالت اور میکسویل سٹریٹ کی گندی بستیاں دیکھی ہیں۔ لیکن ایشیا کی بے ہنگم غربت کا مقابلہ نیویارک کی گندی بستیوں یا لاس اینجلس کے پچھواڑے سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر امریکہ اور یورپ کی تمام غریب بستیاں اکٹھی بھی کر لی جائیں تب بھی ایشیا کی غربت ان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

غربت کی مکمل وسعت کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو اس ماحول میں پروان چڑھے ہوں اور جو "کتوں کے ساتھ سوتے اور مکھیوں کے ساتھ جاگتے ہیں"۔ ہم اپنی غربت کا اندازہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب ہم اپنے ماحول سے باہر نکلیں یا دوسرے اسے بیان کریں۔ جس شخص نے پہلے پہل مجھے غربت کے معانی سمجھائے وہ ایک انگریز تھا اور آکسفورڈ میں کلاسیکی ادب کا عالم تھا۔ اس کا نام ویریر ایلون تھا۔ اسے ہمارے دور کے بہترین نثر نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے اور علم الانسان پر اس کی تصنیف کو "انسان" کے موضوع پر جدید عظیم تصانیف میں شمار کیا گیا ہے۔ ویریر ایلون نے کہا ہے۔

"ہندوستان میں ہم غربت سے اس قدر مانوس ہیں کہ ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن ایک خاندان روتا ہوا ہمارے پاس آیا کیونکہ ان کی جھگی اور سارا اثاث البیت آگ سے تباہ ہو گیا تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کتنی رقم کی ضرورت ہے تو انھوں نے کہا "چار روپے" جو بریو نیو ورلڈ (The Brave New World) کی ایک جلد کی قیمت تھی۔"

یہ ہے غربت!

"ایک مرتبہ بستر ریاست میں ایک ماریا (قدیم باشندہ) کو موت کی سزا دی گئی۔ پھانسی دینے سے قبل اس سے پوچھا گیا کہ اس کی آخری خواہش کیا ہے؟ کوئی دل پسند کھانا؟ اس نے کچھ چپاتیاں اور مچھلی کا ایسا شوربہ مانگا جو شہری طریق سے تیار کیا گیا ہو۔ یہ اسے مہیا کر دیا گیا تو اس نے اس میں سے آدھا بڑی رغبت سے کھایا اور باقی ماندہ کو ایک پتے میں لپیٹ کر جیلر کو دیا اور اس سے کہا کہ اس کا چھوٹا سا لڑکا جیل کے دروازے کے باہر کھڑا انتظار کر رہا ہے۔ لڑکے نے کبھی ایسی لذیذ چیز نہیں چکھی تھی لیکن اب اسے یہ ملنی چاہیے۔"

"'غربت' کا مطلب یہ ہے کہ عین اس وقت جب بچے پروان چڑھنے لگیں آپ کے بچوں کو آپ سے چھین لیا جائے۔ آپ کی بیوی کو جلدی بوڑھا ہوتے دیکھنے اور آپ کی ماں کی پیٹھ کو زندگی کے بوجھ تلے جھکتا دیکھنے کا نام غربت ہے۔ کسی گستاخ افسر کے سامنے بے بس ہو جانے یا پھر کسی استحصال کنندہ اور دھوکے باز کے سامنے غیر مسلح کھڑے ہونے کا نام غربت ہے۔"

www.bhutto.org

"غربت 'انصاف کی عدالت کے دروازے پر گھٹنوں کھڑا رہنے اور پھر اندر جانے کی اجازت نہ ملنے کا نام ہے۔ یہ افسروں کو بہرے اور امیر لوگوں کو اندھے پانے کا نام ہے۔"

میں نے بچوں کو بھونے ہوئے چوہے جیسی ناکافی غذا پر لڑتے دیکھا ہے۔

"میں نے بوڑھی عورتوں کو ساگو دانے کو بیزاری سے کوٹتے اور تھکتے دیکھا ہے تاکہ وہ اس سے ایک طرح کا آٹا بنا سکیں۔ میں نے آدمیوں کو درخت پر چڑھتے دیکھا ہے تاکہ وہ سرخ چیونٹیاں پکڑ کر انہیں مرچوں کی جگہ استعمال کر سکیں۔"

"غربت 'بھوک 'مایوسی 'سوگ اور بے اثری کا نام ہے۔ اس میں کسی قسم کا حُسن نہیں"۔

کوئی موت اتنی ذلت آمیز نہیں جتنی غربت کے ذریعے واقع ہوتی ہے۔ ہم ایشیائی اور افریقیوں نے ہر غروب آفتاب کے دم توڑنے کا ایسا ہی منظر دیکھا ہے۔ 1943ء کے قحط میں فاقہ کشی کے سادہ اور کم خرچ طریقے سے ہمارے 35 لاکھ لوگوں کی جانیں تلف ہو گئیں۔

قحط کے وقت میں پندرہ سال کا لڑکا تھا اور اس المیے کے پورے مضمرات سمجھنے سے قاصر تھا اس کے باوجود اس المیے نے میرے ذہن پر انمٹ نقش چھوڑا ہے۔ میں نے اس بارے میں جتنا زیادہ پڑھا اور اس کے نتائج سے جتنا باخبر ہوتا گیا' غربت کی تکلیفوں سے میرا دل اتنا ہی آزردہ اور غمگین ہوتا گیا۔

ڈی۔ ایف کراکا نے اپنی کتاب "میں نے آنسو بہائے ہیں" میں قحط کی ان الفاظ میں واضح تصویر کشی کی ہے۔

"بنگال میں گیدڑ اور کتے ایسے انسانی جسموں پر حملہ کرتے دیکھے گئے جن میں زندگی کی رمق ابھی باقی تھی۔

ہزاروں بھوکے اور مفلس' اس عہد کی المناک ترین بھوک کا مقابلہ کرنے کے لئے خوراک کی تلاش میں نہ صرف اپنے عزیز واقربا کو چھوڑ کر چلے گئے بلکہ انہوں نے اپنا مال و اسباب بیچ دیا تھا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے بچے تک بیچ دیئے تھے۔

بنگال میں دبلے' پتلے اور بھوکے لوگ اکھڑے ہوئے سانسوں اور اپنے تھکاوٹ سے چور جسموں کو محض ایک پیالہ چاول کی تلاش میں سینکڑوں میل تک گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔

گاؤں میں کوئی شخص بھی انہیں رات کی خاموشی میں کراہتے ہوئے سن سکتا تھا۔

بچوں کی آہ و بکا سے فضا معمور ہوتی تھی۔ وہ چاول کی پیچ کے لئے چلاتے تھے۔

کلکتہ کے بازاروں میں ایسے انسانی جسم پڑے تھے جن کی ہڈیوں پر کھال کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بھوک سے بلبلاتے تھے' یہاں تک کہ بیہوش ہو جاتے تھے۔ جب بدبو ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو انہیں اٹھا کر دور پھینک دیا جاتا۔

لوگ روٹی کے ریزوں کے لئے کوڑے کرکٹ کو کریدتے رہتے۔ اسی صوبہ بنگال میں ایک جگہ ایک

بچہ اپنی مردہ ماں کی چھاتی سے دودھ پینے کی کوشش کرتا دیکھا گیا تھا۔ کتے اس لئے سوکھ گئے تھے کہ کوڑے کے ڈھیروں پر آدمی نے ان کے لئے ایک ٹکڑا بھی نہ چھوڑا تھا۔

یہ ہے بھوک ....

یہ ہے غریبی..................

ہمیں بھوک اور غربت کم کرنے کے لئے امداد کی ضرورت ہے۔ اس دور کی اخلاقیات یہ اجازت نہیں دے گی کہ ہمیں ایسے سنگین بحران کے موقع پر جو تاریخ کے آغاز سے آدمی کو درپیش نہیں ہوا تھا' امداد سے محروم کر دیا جائے۔

ہم نے ابھی اپنے بچوں کی کلکاریاں سننی شروع کی ہیں۔ ہمارے عوام ابھی ابھی تو یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کا گھر فٹ پاتھ نہیں۔ ہم نے اپنے کسانوں کے چہروں پر تبسم اور بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں اُمید کی چمک دیکھنا شروع کی ہے۔

جب یورپ پر کوئی آفت آتی ہے تو امیر دنیا اس تکلیف کو ذاتی طور پر محسوس کرنے لگتی ہے۔ جب ایشیا کراہتا ہے تو اس قسم کا جذبہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ یورپ کی گلیوں میں ایک فاقہ زدہ بچہ شدید جذبات پیدا کر دیتا ہے لیکن ایشیائی گلیوں میں ایسے سینکڑوں بچے وہ فلاکت زدہ چھوکرے ہیں جو ایشیائی طرز زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔ یورپ کے لئے امداد بے پناہ تھی' ایشیا کے لئے امداد ہر سطح پر کاٹ کاٹ کر اور جھجک جھجک کر دی جاتی ہے' حالانکہ دو تہائی انسان ایشیا میں بستے ہیں۔

اگر یورپ کے ایک شہر کے مستقبل کی تکمیل کی طرف حیاتیاتی ارتقا کے دو ارب سال داؤ پر لگائے جا سکتے ہیں تو پھر یہ بات فطری طور پر متوقع کیوں نہیں کہ انسانیت کے شگوفے کے تحفظ کے لئے بین الاقوامی جہاد شروع کیا جائے۔ اگر ایک شہر کا مستقبل نظرانداز نہیں ہو سکتا تو پھر بھلا تہذیب کے مرکز کا مستقبل کس طرح نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ؟

امداد بڑھانے کے لئے معاشی اور اخلاقی وجوہات سے کہیں زیادہ ضروری اور معقول سیاسی اور حکمت عملی کے وہ انتظامات ہیں جنہیں فراموش کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ اتنے واضح اور ٹھوس ہیں کہ سب ہی کو صاف نظر آتے ہیں۔ غیر ملکی امداد کے پیچھے خواہ کوئی بھی قوتِ محرکہ ہو' ایک بات صاف ظاہر ہے کہ امداد خیرات ہرگز نہیں۔

ایشیا کے حالات اور اس کے سنگین مسائل کے منبع کو جانتے ہوئے صدر پاکستان نے امریکی کانگریس کو بتایا۔

"جو مدد آپ ہمیں وقتاً فوقتاً دیتے رہے ہیں ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہم آپ کی دوستی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ...... امریکی اخبارات پڑھتے ہوئے کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غیر ملکی امداد سخت تنقید کا شکار ہے۔ اس پر شدید حملے ہوتے ہیں۔

میں اس کی وجہ سمجھتا ہوں۔ یہ وہ نعرہ ہے جس سے ووٹ نہیں ملتے' اس کے لئے کوئی خاص لابی بھی

نہیں۔ دراصل روپے ہاتھ سے دینا آسان بات بھی نہیں لیکن میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو محض اپنا دوست جان کر ہم آپ پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔

اگر ہم نے اس رقم کا صحیح استعمال کیا تو میرا خیال ہے کہ یہ رقم آپ کو کسی نہ کسی شکل میں واپس مل جائے گی۔ ممکن ہے کہ امریکی لوگ اس کہانی سے تنگ آ چکے ہوں لیکن میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ بہتر ہے آپ اکتائیں نہیں۔

ہم اس وقت اپنی بیداری کے انتہائی اہم صفحات رقم کر رہے ہیں اور ہم اس وقت تک دم نہیں لیں گے جب تک ہم "ہر آنکھ سے بہنے والا ہر آنسو خشک کرنے" کی ممکن سعی نہیں کر چکتے۔

اگر کسی مشترک خطرے کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنا ہے تو اسے اپنی اس روح اور قالب میں بھی متحد کیا جانا چاہیے جس میں ہر ایک کی آزادی کے مختلف معانی نہ ہوں۔ اگر کسی مقصد کے معیار دوہرے ہوں تو یہ مقصد سراب جیسی حقیقت کا حامل ہو گا۔

27 / اکتوبر 1961ء

www.bhutto.org

پاکستان اور روس کے مابین تیل کا معاہدہ

4 مارچ 1961ء کو پاکستان اور روس کے مابین تیل کی تلاش کے جس معاہدے پر دستخط ہوئے ہیں' یوں معلوم ہوتا ہے کہ پورے پاکستان میں اور شاید کسی حد تک بیرون ملک بھی اس سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ دلچسپی قابلِ فہم ہے کیونکہ تیل ترقی پذیر معیشت کے ایک بنیادی عنصر کی تشکیل کرتا ہے یا کم از کم تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ یہ عالمی منڈی کی ایک اہم شریان ہے' اس قدر اہم کہ اس کی تقسیم' ملکیت اور قیمت کے تعین سے نہایت دور رس پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اب یہ بات پورے طور پر واضح ہو چکی ہے کہ حکومت پاکستان عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے اور دس کروڑ افراد کی اس سرزمین کی خوشحالی اور استحکام کے لئے پاکستان کو ایک مضبوط اور سائنٹفک اقتصادی ڈھانچے پر ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ ملک کو معاشی طور پر اس وقت تک ترقی نہیں دی جا سکتی جب تک اس کے ظاہری اور خفیہ تمام وسائل سے مجتمع کرنے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ حکومت نے اپنی قوتیں ہنگامی بنیادوں پر حرکت میں لانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس سمت میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا ہے کہ اپریل 1960ء میں ایندھن' بجلی اور قدرتی وسائل کی الگ وزارت قائم کی گئی۔ اس وزارت کو دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ معدنیات کی دریافت کا فریضہ بھی سونپا گیا ہے اور اس میں تیل کو اولین ترجیح حاصل ہے۔

اس وزارت نے ملک میں تیل کی صورت حال کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور معلوم کیا کہ حکومت نے ان ملکی کمپنیوں کے ساتھ جنہیں ملک میں تیل کے لئے کھدائی کے لائسنس بھی جاری کئے گئے ہیں

مشترکہ انتظامات کے تحت تیل کی تلاش کے لئے اپنے حصے کے طور پر 11 کروڑ 45 لاکھ روپے (جن میں ٹیکسوں کی مراعات شامل نہیں) خرچ کئے ہیں۔ اگر اس مد پر خرچ ہونے والی بھاری رقوم کو دیکھا جائے تو نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے 'قدرتی گیس کثیر مقدار میں دریافت ہوئی ہے لیکن اسے بذات خود ملک کی اقتصادی سطح کو بلند کرنے کی جدوجہد میں اہم امدادی عنصر کی حیثیت کبھی نہیں دی گئی۔

گیس کی دریافت مفید ہے 'مگر یہ تیل کی تلاش کے دوران میں دریافت ہوئی ہے۔ علیٰ ہذالقیاس جہاں تک تیل کا تعلق ہے 'ابھی تک ہماری تمام مساعی کے باوجود نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ جس امر نے فضا کو مزید غیر امید افزا بنا یا وہ پاکستان میں مصروف کار کمپنیوں کا خیال تھا کہ پاکستان میں تیل نکلنے کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

اس جمود کو توڑنا ناگزیر تھا۔ یہ وقت تھا جب پاکستان میں تیل کی دریافت کی آخری کوشش کے لئے مقابلے کی فضا پیدا کرنے اور رفتار کو تیز تر کرنے کی ضرورت تھی۔ پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تیل کی پٹی پر واقع ہے۔ اگر پاکستان میں تیل نہ ملا تو یہ قدرت کی بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی۔ عام آدمیوں اور بعض ماہرین کے نزدیک ہمارے ملک میں تیل موجود ہے لیکن اب تک ہم اسے دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب صرف یہی راستہ رہ گیا ہے کہ مقابلہ کرایا جائے۔ صرف مقابلے کے بعد ہی حکومت مطمئن ہو سکتی ہے کہ تیل کی تلاش کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے لیکن ہر جگہ اور ہر ذریعہ اور ہر علم 'ہر عمل اور طریق کار سے تلاش کے باوجود ہم ابھی تک تیل حاصل نہیں کر پائے۔ اس کے بعد ہمیں یہ اطمینان ہوگا کہ ہم نے اس گراں قدر اور کار آمد جنس کی تلاش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جب کہ ہر سال ہمارے قیمتی زر مبادلہ کا ایک بڑا حصہ خرچ ہو جاتا ہے اور ترقیاتی منصوبوں کی رفتار میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس خرچ میں اضافہ ناگزیر ہے۔

مشکل سے کمائے ہوئے اور قیمتی زر مبادلہ کو بچانے اور ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کی خواہش کا یہ پس منظر ہے جس کے تحت روس کے ساتھ تیل کی تلاش کا معاہدہ کیا گیا ہے۔

تیل کی تلاش کے سلسلے میں روس نے 1959ء میں پاکستان کو مدد کی پیشکش کی تھی اور اگست 1960ء میں حکومت نے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ستمبر 1960ء میں روسی ماہرین کے ایک وفد نے ہماری تیل کی ضروریات کا اندازہ لگانے کے لئے پاکستان کا دورہ کیا۔ پاکستانی ماہرین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کا جائزہ لینے اور بحث مباحثہ کے بعد روسی ٹیم نے تیل کی تلاش کے لئے ایک پروگرام کی سفارش کی جس کے لئے سرمایہ طویل المیعاد قرضوں کے ذریعہ روس مہیا کرے گا اور جس پر عملدر آمد بھی روسی ماہرین کی مدد سے ہوگا۔

12 دسمبر 1960ء کو حکومت پاکستان نے تیل کی تلاش کے معاہدہ کے لئے مذاکرات کی خاطر میری قیادت میں ایک وفد روس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے روز 13 دسمبر کو وفد ماسکو جانے کے لئے دہلی

www.bhutto.org

روانہ ہوگیا۔ ہمیں وہاں بتایا گیا کہ ہمارے طیارے میں ایک دن کی تاخیر ہوگئی ہے۔ نئی دہلی میں سوویت یونین کے سفیر اور ان کی اہلیہ نے وفد کو ظہرانہ دیا۔

ہم نے دہلی سے 16 ر دسمبر کو پرواز کی اور ماسکو اترنے سے پہلے ہمیں تاشقند میں اترنا تھا لیکن تاشقند میں موسم اس قدر خراب تھا کہ طیارے کو حفاظت سے اتارنا ممکن نہ تھا۔ چونکہ ہمیں سمرقند کا دورہ بھی کرنا تھا اس لئے روسی حکام نے ہمارے اس دورے کو اس تاریخی شہر کی طرف موڑ دیا۔ یہ ان کی طرف سے ہمارے لئے خیرسگالی کا خوش آئند مظاہرہ تھا۔ کیونکہ عام طور پر وہ غیر ملکی طیاروں کو سمرقند کے فوجی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت نہیں دیا کرتے۔

ہم نے سمرقند میں ایک ناقابلِ فراموش دن گزارا۔ اس کے مشہور اور تاریخی مقامات اور مساجد کو دیکھا۔ تیمور اعظم اور وہاں کے جانشینوں کے اس حصار میں اسلامی فنِ تعمیر اور ثقافت کی شان و شوکت اس قدر نمایاں تھی کہ اس سے ہم بہت متاثر ہوئے۔ یہ احساس ہمارے لئے باعثِ فخر تھا کہ ہم اسی تاریخ، نسل اور مذہب کا حصہ ہیں اگرچہ وقت اور سیاسی اور طبعی تبدیلی نے ہمیں الگ الگ کر رکھا ہے۔ بلند پہاڑوں، مختلف زبانوں اور نظریات کے باوجود جو ماضی کے سمرقند اور حال کے پاکستان میں حائل ہیں، ہم ایک غیر مرئی مگر دائمی رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس موجودہ خلیج کے باوجود جو کسی گہری مماثلت ہے اس سے اسلامی ورثہ کے عظیم اور دائمی ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ دوسرے روز ہم بذریعہ موٹر کار تاشقند روانہ ہوگئے۔ راستے میں ہم نے اس عظیم شہر کے گردوپیش زرعی فارم دیکھے اور ان فارموں میں جو چہل پہل اور سرگرمیاں جاری تھیں، ان سے ہم بہت متاثر ہوئے۔

تاشقند میں ہمارا پرجوش استقبال ہوا اور ہمیں کئی اعلیٰ حکام اور متعدد مسلم رہنماؤں سے ملایا گیا۔ ہم نے تاشقند کی مشہور جامع مسجد میں نماز بھی ادا کی۔

ہم 19 ر دسمبر کو ماسکو پہنچے۔ ہوائی اڈے پر ہمارا استقبال کرنے والوں میں روس کے دوسرے اعلیٰ حکام کے علاوہ روس کے بیرونی تجارت اور ارضیات کے وزیر اور روس میں پاکستانی سفیر بھی شامل تھے۔

رسمی مذاکرات 20 ر دسمبر کو کریملن میں شروع ہوئے۔ سوویت حکام سے یہ ہمارا پہلا رابطہ تھا۔ بلاشبہ یہ ہمارے لئے ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ بات چیت انتہائی دوستانہ ماحول میں آگے بڑھی اور 31 ر دسمبر کو مجھے کریملن کے ایک استقبالیہ میں مدعو کیا گیا جہاں میں نکیتا خروشیف سے دوبارہ ملا۔ ان سے میری پہلی ملاقات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہوئی تھی۔ وزیر اعظم نہایت ہی خوشگوار موڈ میں تھے اور انہوں نے کئی جام تجویز کئے۔ اس استقبالیہ میں روس کے کئی اہم رہنماؤں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس سے قبل ہم مذاکرات کے سلسلے میں نائب وزیر اعظم سے بھی ملتے رہے اور ہم نے انہیں بہت زیادہ پرجوش اور پرتپاک پایا۔

ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کر خروشیف سے بات کرنے کا ایک اور موقع ملا مگر یہ بات چیت صرف تیل کے مذاکرات تک محدود رہی۔ ماسکو میں ہمارے وفد نے جن دوسری سماجی تقریبات میں شرکت

www.bhutto.org

کی، ان میں ایک مشہور بیلے رقص کی محفل، پاکستانی سفیر کا استقبالیہ اور نائب روسی وزیراعظم مسٹر سمکویان کا عشائیہ قابلِ ذکر ہیں۔

ہم نے معاہدہ کو قطعی صورت راولپنڈی میں دی تھی۔ معاہدہ تیل کے تحت منجملہ اور چیزوں کے روس پاکستان کو بارہ کروڑ روبل کا ایک قرضہ دے گا جو بارہ سال کے عرصے میں واپس کیا جائے گا۔ سوویت یونین تجربہ کار ماہرین بھی مہیا کرے گی اور قرضہ کا 75 فیصد سازو سامان کی صورت میں ہوگا جو تیل کی تلاش میں تکمیل کے بعد پاکستان کو مل جائے گا۔ معاہدہ کے تحت پاکستانی ماہرین کو بھی تربیت دی جائے گی۔

اپنی نوعیت کے لحاظ سے پاکستان اور روس میں یہ پہلا معاہدہ ہے جو نہایت ہی محتاط اور طویل مذاکرات کے بعد خلوص اور خیر سگالی کے ماحول میں طے پایا۔ یہ معاہدہ دورِ حاضر کی اس روح کا ایک مظاہرہ ہے جو سیاسی تعصبات اور نسل و نظریہ کے امتیازات سے بالاتر ہو کر انسانیت کی باہمی بہبود کے لئے وسیع تر عالمی تعاون کا تقاضا کرتی ہے۔

23 مارچ 1961ء

www.bhutto.org

تخفیف اسلحہ کے مسائل

یہ دنیا پرانی نسل سے زیادہ آپ کی ہے' اس لئے آپ پر لازم ہے کہ ان مسائل پر گہری نظر رکھیں جن کا دنیا کو آج سامنا ہے۔

تمام عالمی رہنما اس پر متفق ہیں کہ تخفیفِ اسلحہ کا مسئلہ ' جس کا آج ہمیں سامنا ہے ' نہایت اہم مسئلہ ہے۔ مسٹر خروشیف نے اسے سوالوں کا سوال اور مسئلوں کا مسئلہ قرار دیا ہے۔ نوعِ انسانی کو تخفیفِ اسلحہ یا تباہی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ ایٹمی جنگ 'بعض کی بر عکس رائے کے باوجود نوعِ انسانی کو ختم کر دے گی۔

17 اقوام کی کانفرنس میں جو ان دنوں جنیوا میں ہو رہی ہے' اسلحہ کی ہر آن بڑھتی ہوئی دوڑ کو روکنے کے امکانات تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس وقت روسی بلاک اور مغربی دنیا کے درمیان خطرناک سائنسی توازن ہے۔ ہر فریق کی صلاحیت پر یہ ایک ناگہانی بوجھ ہے کہ وہ دوسرے فریق سے تباہ کن ہتھیاروں کی' جن کی تباہ کرنے والی طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے' تیاری کے شدید مقابلے میں دوسرے فریق کے ہم پلہ رہے۔ اس بارے میں کسی ایک فریق کی فنی سبقت اس توازن کو تباہ کر دے گی اور دنیا کو آخری تباہی کے پاتال میں پھینک دے گی۔

گزشتہ چند ہفتوں سے ہم یہ پڑھ رہے ہیں کہ روس عوامی تباہی کے ایسے خطرناک ہتھیاروں کے تجربات میں کامیاب ہو گیا ہے۔ جیسے 70 میگاٹن ہائیڈروجن بم اور ایسے زمینی راکٹ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے سامنے ایٹمی میزائل کا دفاعی نظام اور اچانک حملے کے خلاف دفاع کے تمام انتظامات

www.bhutto.org

بیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ بھی اس سے غافل نہیں ہے' اس نے حال ہی میں ایک نئے انٹرکانٹی نینٹل بیلیسٹک میزائل کا تجربہ کیا ہے جس کی مار غیر محدود ہے اور جس کے ذریعے ایٹمی ہتھیاروں کو دنیا کے کسی کونے میں بھی پھینکا جاسکتا ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتیں انتہائی کوشش کر رہی ہیں کہ وہ بیرونی خلا اور سیاروں پر اس لئے تعاقب حاصل کرلیں تاکہ دوسری طاقت پر اس کو فوجی غلبہ حاصل ہو جائے۔ ان سے کم تر فوجی طاقتیں بھی ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری کے لئے فنی اور سائنسی معلومات حاصل کر رہی ہیں۔ آئندہ پانچ سالوں میں تقریباً درجن بھر یا اس سے زائد نئی ایٹمی طاقتوں کا ظہور ہو جائے گا اور اس سے ایٹمی جنگ کا خطرہ مزید بڑھ جائے گا۔

تخفیفِ اسلحہ اور عالمی امن کے قیام کا مسئلہ روز بروز خطرناک اور بے قابو ہوتا جارہا ہے۔

اسی تخفیف کے سایہ تلے 17 اقوام ایک عام اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے امکانات کا جائزہ لے رہی ہیں جس کے بارے میں سب سے پہلے مسٹر خروشیف نے 1959ء میں مطالبہ کیا تھا۔ اس مقصد کے حصول کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟ تقریباً پچھلے بیس برسوں میں باری باری سے تخفیفِ اسلحہ کے کلی یا جزوی مقصد کے حصول کے بارے میں تمام مباحث بے سود ثابت ہوئے ہیں۔ کسی معاہدہ پر پہنچنے کی تمام مساعی' نگرانی اور کنٹرول کی چٹان سے ٹکرا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ نعرہ یہ رہا ہے۔ کنٹرول کے بغیر تخفیفِ اسلحہ ممکن نہیں' اور تخفیفِ اسلحہ کے بغیر کوئی کنٹرول نہیں ہو سکتا' البتہ تخفیفِ اسلحہ کنٹرول کے تحت ممکن ہے۔

مشرق و مغرب کے درمیان پندرہ سالہ مذاکرات کے باوجود دونوں فریقوں کے لئے بین الاقوامی کنٹرول اور نگرانی کے تحت تخفیفِ اسلحہ کے کم سے کم اقدامات کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔

ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات کے مسئلہ کو لیجئے۔ روسی بلاک اور فوجی طاقتوں کے سائنس دان اس امر پر متفق ہیں کہ ایسا انتظام وضع کرنا ممکن ہے جو خلائے بسیط' بیرونی خلا' زیرِ آب اور زیرِ زمین ایٹمی تجربوں کا پتہ چلا سکے' ماسوائے ان کے جو انتہائی مخصوص حالتوں کے تحت نہایت گہرائی میں کئے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود کسی معاہدہ پر نہیں پہنچا جاسکا۔ امریکہ' برطانیہ اور روس کے مابین ساڑھے تین سال سے زائد عرصہ تک مذاکرات کے باوجود بین الاقوامی نگرانی اور کنٹرول کے تحت ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات پر مکمل پابندی کا معاہدہ طے نہیں پاسکا۔

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان مذاکرات حالیہ جنیوا کانفرنس کی ایک ذیلی کمیٹی کے تحت شروع ہوگئے ہیں۔

وقت ایک بار پھر مسائل کا جوہر ثابت ہو رہا ہے۔

امریکہ نے دنیا پر واضح کر دیا ہے کہ اگر اپریل 1962ء کے آخر تک تجربات پر پابندی کا معاہدہ طے نہ پائے تو پھر وہ دوبارہ خلائے بسیط میں ایٹمی تجربات شروع کر دے گا کیونکہ یہ روس کے خلاف اس کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں جس نے پچھلے تین سالوں سے زائد عرصے میں باضابطہ التوا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلسل تجربات کر کے امریکہ پر سبقت حاصل کرلی ہے۔

www.bhutto.org

یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کے سب سے کم پیچیدہ مسائل تک جیسے بین الاقوامی معائنہ اور نگرانی میں جوہری ہتھیاروں کی تیاری پر پابندی عائد کرنے کی تمام کوششوں کی خلاف ورزی کی جائے۔

ہو سکتا ہے کہ دنیا کے عوام مشترکہ اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے حالیہ جنیوا مذاکرات کو مایوسی اور شک کی نظروں سے دیکھیں' تاہم اس کے حل کی اتنی فوری ضرورت ہے اور ناکامی کے نتائج اتنے مہلک نکلیں گے کہ تشکک اور مایوسی کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی جانی چاہیے کہ ہم یونانی المیہ کے ایک کورس کا سا کردار اپنا لیں جس میں تاریکی اور تباہی کی دیویاں سنگدلی سے انسان کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی تھیں۔

تخفیفِ اسلحہ کے بارے میں پندرہ سالہ مذاکرات بالکل بے سود نہیں رہے۔ گذشتہ سال روس اور امریکہ چند عام اصولوں پر متفق ہو گئے تھے اور اب اس ڈھانچہ کے اندر عام اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے معاہدہ کے بارے میں مذاکرات کریں گے۔ اگرچہ اس ضابطہ بندی میں بہت سے مشترکہ امور پر اتفاق ہو چکا ہے لیکن دونوں طاقتوں کے درمیان ان میں سے بعض اصولوں کی تشریحات میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ان میں بنیادی عدم اتفاق نگرانی اور تصدیق کے سوال پر ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ نہ صرف متفقہ امور کی' جن کا تخفیفِ اسلحہ کے معاہدہ پر اطلاق ہوتا ہے' تصدیق کی جائے بلکہ ان امور کی بھی لازمی تصدیق ہونی چاہیے جو متفقہ امور کے بعد فریقین کے پاس بچ جاتے ہیں۔ روس پہلے امر سے اتفاق کرتا ہے اور دوسرے سے عدم اتفاق۔ یہ تخفیفِ اسلحہ کا انتہائی پیچیدہ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔

دونوں فریقوں کے درمیان دوسرا بنیادی اختلاف خفیہ ایٹمی ہتھیاروں کے ذخائر کی دریافت کے سلسلے میں فنی مشکلات سے متعلق ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی موجودہ مقدار اور آئندہ پیداوار کے بارے میں تو یہ قطعی ممکن ہے کہ ان کا معائنہ اور نگرانی کی جا سکے لیکن ایسا کوئی محفوظ نظام نہیں ہے جس کے تحت کسی ایک یا دوسرے فریق کے خفیہ ایٹمی ہتھیاروں کا پتہ چلایا جا سکے۔ یہ فنی معاملہ ہے جس کی وجہ سے ایٹمی ہتھیاروں اور پابندی کا مسئلہ 1955ء سے جمود کا شکار ہے۔ تاہم یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اسلحہ کی تیاری پر پابندی عائد کرنے کے سلسلے میں حال ہی میں کوئی ایسی پیش رفت ہوئی ہے جس سے چھپے ہوئے ذخائر کا پتہ چلانے کے لئے معائنے کے طریقوں میں غلطی کا امکان گھٹ کر اس حد تک پہنچ جائے کہ اس میں جو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے' اسے لازمی تخفیفِ اسلحہ کے بارے میں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

ایٹمی تخفیفِ اسلحہ کے امکانات یعنی تھرمو نیوکلیر اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ایٹمی ہتھیاروں مثلاً ہائیڈروجن اور ایٹم بم اور ان کو استعمال کرنے کے ذرائع جیسے راکٹ اور میزائل وغیرہ کا مکمل خاتمہ فوری طور پر ممکن دکھائی نہیں دیتا۔

میرے خیال میں جنیوا کانفرنس کے لئے یہ امر زیادہ تعمیری ہوگا کہ وہ تخفیفِ اسلحہ کے معاہدہ کے ان پہلوؤں پر سمجھوتہ کرانے تک خود کو محدود رکھے جو مؤثر کنٹرول کے لئے ضروری ہیں اور پھر ان کے فوری

www.bhutto.org

نفاذ کی کارروائی کرے۔ 18 اکتوبر 1960ء کو جنرل اسمبلی کی سیاسی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے میں نے مغربی طاقتوں اور روس کے تخفیفِ اسلحہ کے منصوبوں کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد فوری نفاذ کے لئے موثر بین الاقوامی کنٹرول کے تحت تخفیفِ اسلحہ کے مندرجہ ذیل جزوی اقدامات تجویز کئے تھے جو عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے پروگرام کے لاینفک جزو کے طور پر تھے۔

1۔ وسیع پیمانے پر تباہ کن ہتھیار لے جانے والی گاڑیوں کو خلا میں بھیجنے یا بالائی فضا میں انہیں رکھنے کی ممانعت۔

2۔ اسلحہ سازی کے مقاصد کے لئے انتشار پذیر مواد کی پیداوار کا خاتمہ اور سابقہ پیداوار میں سے ایسے مواد کی طے شدہ مقدار کو غیر اسلحی مقاصد کے لئے استعمال کرنا۔

3۔ میزائل پھینکنے کی تجویز ہو تو قبل از قبل اس کی اطلاع دی جانی چاہیے تاکہ اتفاقیہ طور پر یا غلطی سے جنگ چھڑ جانے کے خطرے کو کم کیا جا سکے۔

4۔ اچانک حملے کے خلاف بہتر تحفظ مہیا کرنے کے لئے مناسب اقدامات کرنا جو ایسے حملے سے دنیا کو محفوظ رکھنے کی خاطر ابتدائی قدم ہو۔

5۔ جوہری ہتھیاروں کے وسیع پھیلاؤ کی ممانعت جس کا مطلب یہ ہے کہ جوہری طاقتوں کی طرف سے غیر جوہری طاقتوں کو ایٹمی ہتھیار منتقل نہ کئے جائیں اور غیر ایٹمی طاقتیں ایسے ہتھیار حاصل کرنے یا بنانے سے اجتناب کریں۔

6۔ مسلح افواج اور روایتی ہتھیاروں میں خاطر خواہ کمی جو بین الاقوامی معائنے اور کنٹرول کے تحت دونوں فریقوں کے درمیان سمجھوتے کی بنیاد پر عمل میں آئے۔ امریکہ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ روس اور امریکہ کی مسلح افواج میں کمی کی جائے اور تخفیفِ اسلحہ کے ابتدائی مرحلے میں ہر ایک کی تعداد 27 لاکھ ہو۔ روس نے اصرار کیا کہ یہ کمی سترہ لاکھ تک ہونی چاہیے' مفاہمت کے لئے میں نے 21 لاکھ کی تجویز پیش کی۔

روس اور امریکہ دونوں نے موجودہ تخفیفِ اسلحہ کی جنیوا کانفرنس کے سامنے اپنے تخفیفِ اسلحہ کے پہلے منصوبوں کی ترمیم شدہ صورتیں پیش کی ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ امریکہ ابتدائی مراحل میں دو سال پہلے کی نسبت اب تخفیفِ اسلحہ میں کافی سے زیادہ کمی پر رضامند ہو گیا ہے۔ پچھلے ستمبر میں ابتدائی مرحلے کے طور پر روس اور امریکہ اپنی اپنی مسلح افواج کی 21 لاکھ کی تعداد پر رضامند ہو گئے تھے اور اسی تناسب سے روایتی ہتھیاروں میں کمی پر بھی ان کا اتفاق ہو گیا تھا جس کے بعد مسلح افواج اور ہتھیاروں میں مزید کمی کی جانی تھی۔ نیا امریکی منصوبہ بھی تخفیفِ اسلحہ کے پروگرام کے ابتدائی مرحلہ میں ایٹمی ہتھیار پھینکنے والے آلات اور بڑے بڑے روایتی ہتھیاروں میں تیس فیصد کمی کی تجویز کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلحہ سازی کے مقاصد کے لئے ایٹمی مواد کی مزید پیداوار کو مکمل طور پر ختم کرنے اور دونوں فریقوں کی جانب سے اسلحہ سازی کے قابل یورینیم 235 کی پچاس ہزار کلوگرام مقدار کو غیر اسلحی

www.bhutto.org

مقاصد کی طرف منتقل کرنے کی بھی تجویز پیش کرتا ہے۔

ماضی کے امریکی منصوبوں میں اضافے کے باوجود امریکی اور روسی تجاویز کے درمیان فاصلہ ابھی تک خاصا وسیع ہے۔

ایسی صورت حال کے پیش نظر میں متعلقہ طاقتوں کی توجہ کے لئے یہ اعادہ کرتا ہوں کہ وہ تخفیفِ اسلحہ کے محدود سمجھوتے پر پہنچنے کے کام کو انجام دینے کی کوشش کریں جس کا ذکر میں نے 18ر اکتوبر 1960ء کو پہلی مرتبہ کیا تھا اور جس کو آج میں پھر دہراتا ہوں۔ یہ ابتدائی اقدامات فوری طور پر نافذ کئے جا سکتے ہیں۔ وقت نے اس طرز فکر کے حق میں دلائل کی قوت کو کسی طرح بھی کمزور نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس کی وجہ سے ترجیحی بنیادوں پر جزوی تخفیفِ اسلحہ سے نپٹنے کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے نفاذ کو اس وقت تک التوا میں رکھا جائے جب تک کہ عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کے لئے بین الاقوامی معاہدے کے بارے میں مفاہمت نہیں ہو جاتی۔

ایک اور عنصر جو اس محدود طرز فکر کے حق میں دلیل کو تقویت دیتا ہے وہ جنیوا کانفرنس میں عوامی جمہوریہ چین کی عدم شمولیت ہے۔ چین ایک عظیم طاقت ہے اور اس عظیم ہمسایہ ملک کی شرکت اور اس کی تخفیفِ اسلحہ کی سکیم کو قبول کئے بغیر عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کی تکمیل کا مقصد ناممکن ہے۔ اس امکان کی عدم موجودگی میں تخفیفِ اسلحہ کے مسئلہ کے بارے میں واحد حقیقت پسندانہ طرز عمل یہ ہے کہ پہلے تخفیفِ اسلحہ کے ان ابتدائی اقدامات کو نافذ کیا جائے جن کا ذکر میں نے کیا ہے۔

ایک اور مسئلہ جو بڑی طاقتوں کی تعداد میں مزید اضافے کا بھی ہے۔ بہت سے ممالک ایٹمی ہتھیاروں کے لئے جوہری مواد تیار کرنے میں بڑے زور و شور سے مصروف ہیں تاکہ وہ اپنے آپ کو ایٹمی کلب میں شامل کر سکیں۔ ہم اسے سنگین نتائج کی حامل صورت حال ہی کہہ سکتے ہیں جو بالآخر دنیا کے مختلف خطوں میں توازن برباد کرنے پر منتج ہوگی اور نتیجتاً تناؤ اور امن کے لئے خطرات کو زیادہ سنگین کر دے گی۔

جنیوا کانفرنس میں دنیا کے دو عظیم فوجی گروہوں یعنی نیٹو اور معاہدہ وارسا کے ممالک جن میں دونوں طرف پانچ پانچ ملک ہیں' ان کے نمائندوں کی تعداد یکساں ہے۔ ان دس کے علاوہ آٹھ غیر جانبدار ملک ہیں جو لاطینی امریکہ' ایشیا' یورپ اور افریقہ سے منتخب کئے گئے ہیں۔ پاکستان اس نمائندگی کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی دکھ کے ساتھ اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ کانفرنس کی تشکیل میں دنیا کے بعض حصوں اور خصوصاً جنوبی ایشیا کے فوجی حقائق کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ تخفیفِ اسلحہ کے مذاکرات کو تخفیفِ اسلحہ کے عمل کے ہر مرحلہ پر مشرق اور مغرب کی بین الاقوامی سطح میں فوجی طاقت کے درمیان توازن کو برقرار رکھنے کی راہ تلاش کرنا ہی نہیں بلکہ انہیں ہر خطے کے فوجی طور پر اہم ممالک کے درمیان طاقت کے توازن کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو جنیوا کانفرنس کی رکنیت دنیا کے فوجی طور پر اہم علاقوں کی نمائندگی نہیں کرتی اور اس کے نتیجہ میں اس کی تشکیل دنیا کے بعض خطوں کے حقائق کی

پوری طرح عکاسی نہیں کرتی۔

دوسرے بین الاقوامی مسائل کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے میں تخفیفِ اسلحہ کے ایک اور پہلو کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

چند دن پہلے 1960ء میں جنرل اسمبلی کی طرف سے دس قوموں کے ماہرین کے ایک گروپ نے جو تخفیف کے معاشی اور معاشرتی مضمرات کا مطالعہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس موضوع پر ایک رپورٹ پیش کی۔ اسمبلی کی جانب سے اس گروپ کا قیام 1960ء کے جنرل اسمبلی کے پندرھویں اجلاس میں میری ہی تحریک کا نتیجہ تھا۔ پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے 18 اکتوبر کو سیاسی کمیٹی کے سامنے اپنے بیان میں میں نے تخفیفِ اسلحہ کے معاشی اور معاشرتی مضمرات کا مطالعہ کرنے کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی۔

اس بات کے علاوہ کہ فوجی اخراجات میں تخفیف کی ملکوں کی داخلی اقتصادیات اور بین الاقوامی معاشی روابط میں تبدیلیوں کو جنم دے سکتی ہے، دوسرے یکساں اہمیت کی وجوہ بھی تھیں کہ تخفیفِ اسلحہ کے معاشی اور معاشرتی مضمرات کا سائنسی تجزیہ کیوں ضروری اور لازمی ہے۔ قوموں میں وسیع پیمانے پر یہ خوف موجود تھا کہ ہتھیاروں کی دوڑ کا خاتمہ کہیں بین الاقوامی اقتصادی بحران میں نہ بدل جائے۔ اگر ہتھیاروں کی دوڑ کے خلاف جہاد میں دنیا بھر کے عوام کی مکمل حمایت کو بروئے عمل لانا تھا تو پھر اس نوع کے خوف کو دور کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ ماہرین کے مطالعہ سے متعلق پاکستان کی قرارداد کو جنرل اسمبلی نے کسی بھی منفی ووٹ کے بغیر پاس کر دیا۔

اس دائرہ عمل کے مطابق جو پاکستان کی قرارداد میں ماہرین کے گروپ کے لئے تجویز کیا گیا تھا، ماہرین کے گروپ نے متفقہ طور پر یہ نتیجہ پیش کیا کہ "عمومی اور مکمل تخفیفِ اسلحہ" کا حصول تمام انسانیت کے لئے لامحدود رحمت کا باعث ہوگا۔ اس نے اپنی تحقیقات میں یہ بھی درج کیا ہے کہ اسلحی معیشت کی طرف سے پُرامن معیشت کی طرف مراجعت کے تمام مسائل اور مشکلات کا مقابلہ مناسب قومی اور بین الاقوامی اقدامات سے کیا جا سکتا ہے۔

گروپ کی یہ تحقیق بھی ہے کہ غالباً پسماندہ ملکوں کی تجارت پر بھی تخفیفِ اسلحہ کا اچھا اثر پڑے گا، ان کی معاشی ترقی کی رفتار بڑھے گی اور غیر مسلح دنیا میں ترقی یافتہ قوموں کی طرف سے وسیع پیمانہ پر امداد بھی ملے گی۔ حکومتیں اپنے عوام کی تعلیم، صحت، بہبود، معاشرتی تحفظ اور ثقافتی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دیا کریں گی۔

دس قوموں کے ماہرین کے گروپ کی رپورٹ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے کیونکہ پاکستان، جنرل اسمبلی کے پندرھویں اجلاس میں اپنی تعمیری تجویز کے نتیجہ کے طور پر جائز اطمینان محسوس کر سکتا ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کے علاوہ دنیا کو درپیش بڑے بڑے مسائل میں، دم توڑتا ہوا نوآبادیاتی نظام بھی شامل

www.bhutto.org

ہے۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں ایشیا اور افریقہ میں نئی قوموں کے ظہور نے دنیا کی تاریخ میں بہت ہی اہم نئی طاقت کو جنم دیا ہے۔ اب انسانی معاملات کو تمام نسلوں اور قوموں کو مل جل کر اور برابری کی بنیاد پر سلجھانا چاہیے۔ نو آبادیاتی نظام کا دور اپنی ہمسفر غلامی اور ایک قوم کی دوسری قوم پر برتری کی برائیوں کے ساتھ تاریخ کے اندھیرے غاروں میں جا چکا ہے۔ بہر حال ایشیا اور افریقہ کے کچھ باقی ماندہ علاقوں میں نو آبادیاتی تسلط کے اثرات باقی ہیں' جہاں قومی آزادی کے لئے شدید قسم کی جدوجہد جاری ہے۔ ایک سابقہ نو آبادیاتی ملک کی حیثیت میں' پاکستان افریقہ اور ایشیا کی تمام قوموں کے حق خود اختیاری اور آزادی کی جدوجہد کے ساتھ ہمدردی جاری رکھے گا۔

نو آبادیاتی تسلط کے خلاف سات سال کی سرفروشانہ جدوجہد کے بعد الجزائر میں جنگ بندی آزادی کی جنگ کا نکتۂ عروج نظر آتی ہے جو تاریخ میں منفرد ہے۔ شجاعت اور قربانی کے ہر معیار کی رو سے الجزائر کے عوام دنیا کی عظیم ترین قوموں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں۔ ہمیں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جن خصوصیات کی وجہ سے وہ جنگ کے میدان میں مشہور ہوئے ہیں' وہ انہیں اپنی قومی زندگی کی پُرامن تعمیر نو کے کام میں بھی ممتاز کریں گی۔

پاکستان چونکہ اسلامی استحکام اور اخوت کے شعور سے پیدا ہوا ہے اس لئے ہم اسلامی دنیا کی قسمت کے نشیب و فراز کے بارے میں مستقل تشویش کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ بات ہمارے نئے آئین میں ایک اصول کی حیثیت سے شامل کی گئی ہے کہ "مسلمان ملکوں کے درمیان اتحاد کے رشتے برقرار رکھے جانے چاہئیں اور ان کو فروغ دینا چاہیے۔"

اسلامی دنیا کا اتحاد روحانی بھی ہے اور جذباتی بھی۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم مسلم عوام کے درمیان سالمیت کے شعور کو مضبوط بنائیں اور ان کی قومی خود مختاری' آزادی اور تحفظ کو محفوظ کرنے کے لئے ان میں گہرا بین الاقوامی تعاون پیدا کریں۔ گزشتہ چودہ سال سے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے یعنی عرب ممالک کی قومی خود مختاری' آزادی اور تحفظ کو اسرائیلی ریاست کے قیام سے خطرہ لاحق رہا ہے جو اقوام متحدہ کے منشور میں مندرج بین الاقوامی قانون کے اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ اسرائیل کی طرف سے جنرل اسمبلی کی قرار دادوں اور منشور کے قانون کی خلاف ورزیاں دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ جارح ملک اب ایک اور جارحیت کا ارتکاب کرنے والا ہے اور دریائے اردن کے حیات بخش پانیوں کا رخ موڑ کر گردونواح کے ملکوں میں رہنے والے لاکھوں عربوں کو ان کی روزی کے حق سے محروم کرنے کو ہے۔ سلامتی کونسل کا جس کی گرفت میں موجودہ صورت حال ہے یہ ناگزیر فرض ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے منشور کے تحت ایسے تمام اقدامات کرے جن سے اسرائیلی جارحیت کی تجدید کو روکا جا سکے اور بین الاقوامی امن کی خلاف ورزیوں کو ختم کیا جا سکے۔

اب میں اس خطرناک شعلے کی طرف آتا ہوں جو ممکن ہے وہ الاؤ روشن کرے جسے اس علاقے کی حدود تک محدود رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ میں بھارت کے کشمیر پر بزور قبضہ کا حوالہ دیتا ہوں جو امن

www.bhutto.org

کے لئے سنگین خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان امن کا خواہاں ہے لیکن کشمیر کے عوام کی حق خود ارادیت کے مقصد کی جانب پیش قدمی کو سنگینوں سے روکنا قابلِ مذمت جارحیت ہے۔ کشمیر کے عوام کی ڈوگرہ راج کے خلاف عام بغاوت برِصغیر میں آزادی کے طلوع سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی۔ کشمیر کے عظیم عوام کی اس جدوجہد کی رہنمائی جنگ آزادی کے دوسرے سپاہیوں کے علاوہ شیخ عبداللہ نے بھی کی تھی۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ بھارت کا موجودہ وزیر اعظم بھی کشمیر کی آزادی کی تحریک کا زبردست موید تھا۔ توسیع پسندی کی ہوس آزادی کے مقصد پر غالب آ گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بین الاقوامی اخلاق کے تمام معیار مسترد کر دیے گئے اور وہاں کے عوام کی منشا کے خلاف ریاست جموں اور کشمیر پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہ جموں اور کشمیر کا وہی ڈوگرہ مہاراجہ ہے جس نے آزادی کے وقت پاکستان کے ساتھ جوں کے توں معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ یہ جموں اور کشمیر کا وہی ڈوگرہ مہاراجہ ہے جو اس وقت ریاست سے فرار ہو گیا جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا۔ یہ جموں اور کشمیر کا وہی ڈوگرہ مہاراجہ ہے جس نے بھاگتے ہوئے ایک دستاویز پر دستخط کیے اور ریاست بھارت کے حوالے کر دی۔ یہ فریب سے پُر الحاق بین الاقوامی تعلقات کی اخلاقیات پر سب سے زیادہ اخلاق سوز اثر کا حامل ہے۔ بین الاقوامی رائے عامہ نے قدرتی طور پر بھارت کی دوغلی پالیسی کی شدید مذمت کی۔ بھارت نے دنیا کے ساتھ یہ عہد کرنے ہی میں عافیت سمجھی کہ الحاق جموں اور کشمیر کے عوام کے فیصلے کے تابع ہے۔ پاکستان صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ منشا معلوم کیا جائے جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کشمیر کے چینتالیس لاکھ عوام کو ان کے خداداد حقِ خود ارادیت سے محروم نہیں کرنا چاہیے اور نہ انہیں اس حق سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کو احساس کرنا چاہیے کہ ہو سکتا ہے کشمیر ان سنگین مسائل میں سے ایک ہو جو اس بین الاقوامی ادارے کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ یہ سچ ہے کہ ہم امن کے بغیر نہ زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ ترقی کر سکتے ہیں لیکن کشمیر کا مسئلہ حل کیے بغیر بھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

30 مارچ 1962ء

www.bhutto.org

پاک چین سرحدی معاہدہ

میں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے نام بھارت کا وہ احتجاجی مراسلہ دیکھا ہے جس میں اس نے الزام لگایا ہے کہ "عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ معاہدہ کر کے حکومت پاکستان نے سلامتی کونسل کی 17 ر جنوری 1948ء کی قرارداد اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی 13 ر اگست 1949ء کی قرارداد کی بنیاد کو نہ صرف اپنی حمایت میں بلکہ ایک دوسرے جارح کے حق میں یک طرفہ طور پر بدل دیا ہے"۔
چونکہ یہ الزام تراشی پاکستان کے خلاف ایک منظم اور مسلسل پروپیگنڈہ کی مہم کی کڑی معلوم ہوتی ہے اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ریکارڈ کو صحیح کیا جائے۔

اس سے قبل کہ میں اس الزام اور دوسرے الزامات کا جواب دوں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ بھارتی خط کا لب ولہجہ انتہائی تیز اور اشتعال انگیز ہے' اور اس مشترکہ اپیل کی روح کے منافی ہے جو سردار سورن سنگھ اور میں نے 29 ر دسمبر 1962ء کو جاری کی تھی کہ کشمیر کے مذاکرات کو عادلانہ اور منصفانہ نتیجہ پر پہنچانے کے لئے مناسب ماحول کی برقراری کی خاطر دونوں ممالک کے لیڈر اور سرکاری حکام نیز اخبارات باہم ایسے حملوں اور پروپیگنڈے سے گریز کریں گے جن سے پاکستان اور بھارت میں عدم مفاہمت کی فضا پیدا ہونے کا امکان ہو

بھارت موجودہ کشمیر مذاکرات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ پاکستان اور چین کے درمیان حقیقی سرحد کے تعین اور نشاندہی کا معاہدہ اصولی طور پر پہلے ہی طے پا چکا تھا۔

www.bhutto.org

سردار سورن سنگھ اور میری مشترکہ اپیل اس کے بعد شائع ہوئی اور اس حقیقت کا اعلان دنیا کے سامنے اس سے قبل ہی کیا جا چکا تھا۔ اس لئے بالواسطہ طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ بھارت کم از کم اس وقت تک جب تک کہ مسئلہ کشمیر پر براہِ راست بات چیت جاری ہے پاک چین سرحدی معاہدے کو کسی طور بھی پروپیگنڈے کے حملوں یا مسئلہ کشمیر کے بارے میں ہنگامہ پسندانہ رویہ کے لئے استعمال نہیں کرے گا۔ سلامتی کونسل کے نام بھارتی خط اور بیانات نیز پروپیگنڈہ مواد کا لہجہ جو بھارتی حکومت نے سرحدی معاہدے کے خلاف اختیار کیا ہے' کشمیر مذاکرات کی فضا کو مکدر بنانے کی ایک سوچی سمجھی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس مہم نے مجھے کشمیر مذاکرات کے نتیجہ کے بارے میں تذبذب میں ڈال دیا ہے۔

پاکستان کے خلاف جارحیت کا الزام' بھارت' گذشتہ پندرہ سال سے اتنی بار دہرا چکا ہے کہ اب وہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس خط میں بھی اس الزام کو سر اوون ڈیکس کے ایک ضمنی قول کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جو سلامتی کونسل میں بار بار لگایا گیا ہے اور سلامتی کونسل نے ہمیشہ اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ بار بار کی خفت اور اپنے ان اعمال کے باوجود بھارت نے اس نام نہاد خود راستی کا ڈوپ دھار رکھا جو بین الاقوامی برادری کی نظر میں ان اخلاقی اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے جن کا بھارت ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ہے۔

اب میں سلامتی کونسل کے صدر کے نام بھارتی مکتوب میں لگائے گئے پہلے الزام کی طرف آتا ہوں کہ "2 مارچ 1963ء کے پاک چین سرحدی معاہدے کے تحت پاکستان اور چین نے جموں اور کشمیر میں بھارتی علاقے کو غیر قانونی طور پر بانٹ لیا ہے اور بھارتی علاقے کی نام نہاد حاکمیت کو بھارت کی سلامتی اور علاقائی سالمیت کے خلاف زک پہنچائی گئی ہے"۔

میرے لئے اس واضح حقیقت کا بیان ضروری نہیں ہے کہ جموں اور کشمیر کا علاقہ کسی طرح بھی بھارت کا حصہ نہیں ہے۔ جموں اور کشمیر کا علاقہ وہاں کے باشندوں کی ملکیت ہے۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے مستقبل کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں کے مطابق اقوامِ متحدہ کی غیر جانبدرانہ نگرانی میں استصواب رائے سے ہونا چاہئے کہ آیا انہیں پاکستان سے الحاق کرنا چاہئے یا بھارت سے۔ پاکستان اور بھارت دونوں ان قراردادوں کے پابند ہیں۔ کسی ایک فریق کا جموں اور کشمیر پر اپنے اقتدار کا دعویٰ کرنا انتہائی شرمناک ہے۔ اس دعوے کو جس سے سلامتی کونسل پوری طرح آگاہ ہے اقوامِ متحدہ کے عظیم ادارے نے کبھی قبول نہیں کیا۔

پاک چین سرحدی معاہدہ چینی علاقے سنکیانگ اور اس سے ملحقہ علاقوں (جن کا تحفظ پاکستان کی ذمہ داری ہے) کے درمیان موجودہ سرحدوں کا تعین اور نشاندہی کی متفقہ مفاہمت پر مشتمل ہے اور معاہدے میں متعلقہ علاقے کی براہِ راست یا بالواسطہ تقسیم کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ معاہدے کا مقصد ایشیا کے اس حساس ترین علاقے کے امن و امان کی ضمانت دینا اور اس طرح عالمی امن و سلامتی کو مستحکم کرنا ہے۔

سلامتی کونسل کے صدر کے نام بھارتی مکتوب میں دوسرا الزام یہ ہے کہ "پاک چین سرحدی معاہدہ

www.bhutto.org

17 جنوری 1948ء کی سلامتی کونسل کی قرارداد کے منافی ہے" ۔ یہ الزام بے بنیاد ہے۔ اس قرارداد میں بھارت اور پاکستان پر صورت حالات کو بہتر بنانے کے لئے زور دیا گیا ہے۔ اس غلط فہمی سے بچنے کے لئے جو امن شکنی کا باعث ہو بیرونی طاقتوں سے عبوری بنیادوں پر سرحدوں کا تعین اور حد بندی کا معاہدہ واضح طور پر حالات کو بہتر بنانے کا اقدام ہے نہ کہ حالات کو بدتر کرنے کا۔ 17 جنوری 1948ء کی قرارداد میں دونوں حکومتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ کونسل کو "صورتحال میں معمولی سی مادی تبدیلی کی اطلاع دیں اور اس پر کونسل سے مشورہ کریں" ۔ پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین معاہدہ جموں و کشمیر کے مسئلہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا اور اس سے موجودہ حیثیت میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں ہوتا۔

جموں و کشمیر میں کسی بھی تبدیلی کا پاکستان کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا' بلکہ یہ بھارت ہے جس نے اس کی "جوں کی توں" حیثیت کو بدل دیا ہے۔ گذشتہ چار برس میں بھارت نے ریاست کے اندر اپنی مسلح افواج اور سامان جنگ میں اضافہ کیا ہے۔ یہ نہ صرف سلامتی کونسل کی 17 جنوری 1948ء کی قرارداد کے خلاف ہے بلکہ اقوام متحدہ کے کمیشن 13 اگست 1948ء کے بھی منافی ہے جس میں فوجوں کے انخلاء پر زور دیا گیا ہے تاکہ استصواب رائے کرایا جا سکے۔

لہٰذا بھارت کا پاکستان پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی کا الزام نہایت ناواجب ہے۔ میں اس ضمن میں بھارت کی طرف سے ان قراردادوں کی کچھ اور خلاف ورزیوں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔

1..... بھارتی آئین میں بھارت کی مسلمہ عالمی ذمہ داریوں کے صریحاً منافی' کشمیر کو بھارت کی ایک ریاست قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح بھارت اقوام متحدہ کے قانون اور عالمی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا مجرم ہے۔

2..... بھارت نے کشمیر کے مستبد راجہ کے دستخط شدہ لیکن پُر فریب اور غیر قانونی معاہدہ الحاق کو قانونی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ جب مہاراجہ نے اس پر دستخط کئے تھے اس سے قبل طویل عرصے سے استبداد کے شکار کشمیری عوام ایک کامیاب بغاوت کے ذریعے اس کا تختہ الٹ چکے تھے۔

3..... بھارت نے سلامتی کونسل کی 30 مارچ 1951ء کی قرارداد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 1951ء میں ایک نام نہاد آئین ساز اسمبلی قائم کر دی اور اس غیر قانونی ادارے کے لئے انتخابات جس انداز میں کرائے گئے وہ اتنا معروف ہے کہ اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔

4..... بھارت نے 1952ء میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے منافی کشمیر کو انتظامی طور پر بھارت میں ضم کرنے کے اقدامات کئے اس سال ایک معاہدہ پر جو معاہدہ دہلی کہلاتا ہے دستخط کئے گئے جو بچے کھچے اختیارات ' قوانین شہریت ' بنیادی حقوق ' جموں و کشمیر سے متعلق بھارتی سپریم کورٹ کے اختیارات ' بھارتی آئین کے ہنگامی ضوابط کے نفاذ اور ریاست کی سربراہی جیسے امور پر محیط تھا۔

5.... بھارت نے مئی 1954ء میں ایک خصوصی صدارتی حکم کے نفاذ کے ذریعہ کشمیر پر اپنی گرفت مزید سخت کر لی جس کی رو سے بھارتی یونین کی حدود میں توسیع کی گئی۔ اسی آرڈر کے تحت ریاستی شہریوں کی تعریف میں ترمیم کر کے اس کی بنیادوں کو وسیع کیا گیا تاکہ ان تمام افراد کو ریاستی شہری قرار دیا جا سکے جو وہاں غیر منقولہ جائیداد حاصل کر چکے تھے۔ اس کا مدعا ریاست میں مسلم اکثریت کو گھٹانا تھا جو پہلے ہی جموں میں قتل عام سے متاثر ہو چکی تھی۔

6..... اپریل 1954ء میں بھارت اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان کسٹم کی پابندیاں ختم کر دی گئیں۔

7..... انکم ٹیکس، کسٹمز اور ایکسائز ڈیوٹی سے متعلق انڈین ٹیکسیشن لاز کی مقبوضہ کشمیر تک توسیع کر دی گئی۔

8..... کشمیر کا بھارت میں مالی ادغام جو ایک سال قبل شروع ہوا تھا، 1955ء میں مکمل ہو گیا اور بھارتی آڈیٹر جنرل کو مقبوضہ جموں و کشمیر میں بھی وہی اختیارات حاصل ہو گئے جو دوسری بھارتی ریاستوں میں اسے حاصل تھے۔

9..... اپریل 1955ء میں بھارتی آئین کی دوسری دفعات بھی مقبوضہ کشمیر پر عائد کر دی گئیں۔

10..... نومبر 1956ء میں بھارتی نے 26 ر جنوری 1957ء تک کشمیر کو پورے طور پر بھارت میں ضم کرنے کے یک طرفہ اقدامات شروع کر دیئے حالانکہ یہ ان یقین دہانیوں کے قطعاً منافی تھے جو بھارت نے سلامتی کونسل کو کرائی تھیں۔ نیز اس ضمن میں بھارت نے سلامتی کونسل کی 30 مارچ 1951ء کی قرارداد کو بھی پوری طرح نظرانداز کر دیا۔ اس موقع پر سلامتی کونسل نے 24 جنوری 1957ء کو ایک نئی قرارداد منظور کی جس میں 30 مارچ 1951ء کی قرارداد کی توثیق کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

"آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس، کی جنرل کانفرنس کی سفارش کے مطابق منعقدہ کا اجلاس بلانا یا اسمبلی کا کوئی ایسا اقدام جو وہ پوری ریاست یا اس کے کسی حصہ کے مستقبل کا تعین کرنے یا الحاق کے بارے میں ہو یا جس کا امکان ہو یا متعلقہ فریقین میں کسی کی طرف سے اسمبلی کے اقدام کی حمایت میں کوئی کارروائی سلامتی کونسل کے اعلان کردہ اصول کے مطابق ریاست کے بارے میں مؤثر نہیں ہوگی۔

11 ... 23 ر اپریل 1957ء کو بھارت نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ جب اس نے ریاست جموں و کشمیر کو ناردرن زون کونسل آف آرگنائزیشن آف انڈیا کی رکنیت کے دائرے میں شامل کر لیا۔

میں نے بھارت کی طرف سے سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کمیشن کی قرارداد کی ان سوچی سمجھی مسلسل خلاف ورزیوں کا تذکرہ مسئلہ کشمیر پر ریکارڈ کو درست رکھنے اور بھارت کے الزام اور غلط استدلال کو بے نقاب کرنے کے لئے کیا ہے کہ یہ پاکستان ہے جو ان قراردادوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

سلامتی کونسل کے صدر کے نام بھارتی وفد کے خط کا مقصد اقوام متحدہ کمیشن کی 13 ر اگست 1949ء کی قرارداد کے پارٹ 2 پیراگراف 1۔ اے کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے پاکستان کو یک

طرفہ اور غیر مشروط طور پر جموں و کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کا ذمّہ دار قرار دیتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ بھارتی خط میں پارٹ 2 کے دوسرے پیراگرافوں کو کیوں نظرانداز کیا گیا۔ بھارتی وفد اخفائے حقیقت اور ایماء کذب کا مجرم ہے۔ مابعد کے پیراگراف اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ پاکستان پر ریاست جموں و کشمیر سے فوج کے انخلا کی ذمّہ داری اس وقت تک عائد نہیں ہوتی جب تک کہ دونوں ملک نہ صرف پاکستانی افواج کے انخلا بلکہ بھارتی مسلح افواج کے بڑے حصہ کے انخلا سے متعلق کوئی معاہدہ امن طے نہیں کرتے کیونکہ دونوں فوجوں کا انخلا ساتھ ساتھ ہو گا۔

فوجوں کے انخلا کے طریق کار کے بارے میں دو طرفہ ذمّہ داریوں کو گڈمڈ کرنے کے لئے بھارت گزشتہ پندرہ سال سے کوشاں ہے تاکہ دنیا کو باور کرا دے کہ فوجوں کا انخلا ایک طرفہ طور پر صرف پاکستان کی ذمّہ داری ہے۔ 13 ر اگست 1948ء کی قرارداد کے پارٹ 2 کے متعلق ایک توضیحی سوال اور اقوام متحدہ کمیشن برائے پاک وہند نے حکومت پاکستان سے اس کی جو تشریح کی اُس کے بعد ریاست جموں و کشمیر سے مسلح افواج کے انخلاء کے بارے میں دونوں فریقوں کی طرف سے یقین دہانی کی دو طرفہ نوعیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔

میں ایک بار پھر یہ کہوں گا کہ پاکستان ابھی اور یہیں بھارت کے ساتھ معاہدہ امن کرنے کے لئے تیار ہے۔ تاکہ اقوام متحدہ کمیشن کی قرارداد 13 ر اگست 1948ء کے پارٹ 2 کی روح کے مطابق پاکستانی افواج اور بھارتی مسلح افواج کے بڑے حصے کا انخلا ساتھ ساتھ عمل میں آسکے۔

میں نے گہری دلچسپی سے یہ بات نوٹ کی ہے کہ آخر کار بھارت نے بین الاقوامی معاہدے سے متعلق اقوام متحدہ کی قرارداد 5 ر جنوری 1949ء کی دہائی دی ہے جو پاکستان اور بھارت دونوں کو جموں و کشمیر سے فوجوں کے انخلا کا پابند کرتی ہے تاکہ ریاست کے پاکستان یا بھارت سے الحاق کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کرایا جا سکے۔ یہ بھارت کی ان بے فائدہ کوششوں سے ایک خوشگوار رخصت ہے جو بھارتی نمائندے اور رہنما سلامتی کونسل میں اور اِدھر اُدھر یہ تاثر دینے کے لئے کرتے رہتے ہیں کہ اقوام متحدہ کمیشن کی قراردادیں موثر نہیں رہیں۔ اس طرح پاکستان کا یہ مضبوط موقف صحیح ثابت ہو گیا کہ قراردادیں موثر اور قابل عمل ہیں۔ ان کے تحت جو ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ جاری و ساری ہیں۔

ابھی حال ہی میں یعنی 1962ء میں جب سلامتی کونسل میں مسئلہ کشمیر زیر بحث آیا تھا تو پاکستانی نمائندے نے بھارت کے اس الزام کو کہ پاکستان ان قراردادوں پر عمل کرنے سے گریز کر رہا ہے رد کرتے ہوئے پیش کش کی تھی کہ۔

"پاکستان ہر اس طریق کار سے پوری طرح متفق ہے جو ان باتوں کے تعین کے لئے تجویز کیا جائے کہ۔

(الف) اقوام متحدہ کمیشن برائے پاکستان و بھارت کی قراردادوں کے تحت فریقین کی ذمّہ داریاں کیا

www.bhutto.org

ہیں۔

(ب) ان قراردادوں پر کہاں تک عمل در آمد ہوا ہے۔

(ج) کیا کوئی فریق اپنی ذمّہ داریوں سے گریز کرنے کا مرتکب ہوا ہے۔

(د) ہر فریق کو عمل در آمد کی طرف پیش قدمی کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

اگر (ج) بالا کے تعیّن سے یعنی یہ کہ فریقین میں سے کون اپنی ذمّہ داری نبھانے سے قاصر رہا ہے۔ یہ معلوم ہوا کہ اس ضمن میں پاکستان سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو پاکستان جتنی جلدی ممکن ہوا پوری تیزی سے اپنی کوتاہی کا تدارک کرے گا تاکہ قرارداد کو مکمل طور پر عملی جامہ پہنانے کا راستہ کھل جائے۔ میں سلامتی کونسل کو حکومت پاکستان کی طرف سے اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔ مجھے امید اور بھروسہ ہے کہ بھارت بھی اس سے اتفاق کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

ہم آج بھی اس پیش کش پر قائم ہیں لیکن بھارت اسے قبول کیوں نہیں کرتا؟ کیا وہ کسی غیر جانبدار اور بے تعلق تیسرے فریق کے فیصلے سے خائف ہے؟

آخر میں یہ کہ سلامتی کونسل کے صدر کے نام بھارتی وفد کے خط میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مرحوم پرنس علی خاں کے 30 دسمبر 1959ء اور 25 مارچ 1960ء کے خطوط کا حوالہ دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاک چین معاہدہ حکومت پاکستان کے ان دو خطوط میں بیان کردہ موقف کے بالکل برعکس ہے۔ میں سلامتی کونسل اور عالمی رائے عامہ کو بھارتی وفد کی طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کی شدید مذمت کرتا ہوں جبکہ پاک چین سرحدی معاہدہ کی دفعہ 6 میں واضح کر دیا گیا ہے کہ پاکستان اور چین کے مابین یہ معاہدہ عبوری نوعیّت کا ہے اور تنازعہ کشمیر کے حل کے بعد جو مقتدر اتھارٹی جموں و کشمیر میں قائم ہوگی وہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ مذاکرات کرے گی تاکہ موجودہ معاہدہ کی جگہ رسمی سرحدی معاہدہ لے سکے۔ اس طرح پاک چین سرحدی معاہدہ حکومت پاکستان کے اس موقف کے عین مطابق ہے جو سلامتی کونسل کے صدر کے نام مذکورہ بالا خطوط میں پاکستان کے مستقبل مندوب نے اختیار کیا تھا۔

مجھے اس کی مزید وضاحت کرنے دیجئے کہ حکومت پاکستان نے لداخ کی سرحد پر چین اور بھارت کے تنازعہ کے سیاق و سباق میں 3 دسمبر 1959ء کے خط میں جو موقف اختیار کیا اس اہم نقطہ کو اس خط کے پیراگراف 5 میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

"تاہم میری حکومت اپنی ذمّہ داری کے پیش نظر سلامتی کونسل میں یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جب تک کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق کشمیر کے مستقبل کا تعیّن غیر جانبدارانہ طور پر نہیں کیا جاتا' بھارت اور چین کے موجودہ تنازعہ یا کسی آئندہ تنازعہ میں فریقین کا موقف یا تصفیہ جموں و کشمیر کے علاقے کی معیشت پر اثر انداز نہیں ہوگا یا محولا بالا پیراگراف 3 میں مذکورہ قراردادوں کے مطابق ریاست جموں و کشمیر میں استصواب رائے اور وہاں سے فوجوں کے انخلاء پر لاگو نہیں ہوگا۔ یعنی سلامتی کونسل کے

www.bhutto.org

21 اپریل 1948ء، 30 مارچ 1951ء، 24 جنوری 1957ء کی قرار دادوں اور اقوام متحدہ کمیشن برائے پاک وہند کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قرار دادوں میں دیئے گئے ان فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہو گا جنہیں پاکستان اور بھارت دونوں نے منظور کیا ہوا ہے اور دونوں حکومتیں اپنے بار بار کے اعلانات کے مطابق جن کی پابند ہیں۔

حکومت پاکستان نے 1959ء کے موقف کے تحت ہی پاک چین سرحدی معاہدے میں آرٹیکل 6 کو شامل کیا ہے۔ یہ معاہدہ بھارت کا جو بھی وقتی مفاد ہو اس کا مکمل طور پر تحفظ کرتا ہے کیونکہ بھارت کو اقوام متحدہ کے کمیشن کے مطابق ان دو ملکوں میں سے ایک کی حیثیت حاصل ہے جن سے حق خود ارادیت پر جب بھی عملدر آمد ہو۔ جموں وکشمیر کے عوام اقوام متحدہ کی زیر نگرانی آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے کے بعد الحاق کریں گے۔

سرحدی معاہدہ جموں وکشمیر کے علاقے کی حیثیت کو قطعاً متاثر نہیں کرتا۔ اس سے جموں وکشمیر سے فوجوں کے انخلاء کی ضرورت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس میں ذرہ بھر بھی عوام کے حق خود اختیاری سے انحراف نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ حکومت پاکستان کے اس موقف کے عین مطابق ہے جو پاکستان کے مستقل مندوب نے سلامتی کونسل کے صدر کے نام اپنے 3 دسمبر 1959ء اور 25 مارچ 1960ء کے مراسلات میں بیان کیا تھا۔

یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ بھارت اسے اس کے برعکس کیسے قرار دیتا ہے۔ اور میں سلامتی کونسل کے صدر کے نام لکھے گئے بھارتی مراسلہ کی اس عبارت کو بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ "معاہدہ کو عبوری تو کہا گیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی یہ تصدیق وتوثیق کا تابع نہیں" کسی بین الاقوامی معاہدے کی توثیق وتصدیق ضروری ہوتی ہے یا نہیں، اس کا تعلق متعلقہ فریقین کی سہولت اور ان کے انفرادی آئینی طریق کار کے مطابق ہوتا ہے۔ چنانچہ توثیق وتصدیق کا معاہدوں اور قرار دادوں کی عبوری یا مستقبل نوعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

آخر میں بھارتی مراسلہ میں کہا گیا ہے۔

"یہ واضح نہیں کہ پاکستان نے کتنا بھارتی علاقہ غیر قانونی طور پر چین کے حوالے کیا ہے۔ تاہم کہا جاتا ہے کہ یہ رقبہ دو ہزار مربع میل سے کم نہیں"۔ چند دن قبل بھارتی پارلیمنٹ میں ایک ذمہ دارانہ بیان کے ذریعے پاکستان پر الزام لگایا گیا کہ "پاکستان نے جموں وکشمیر کا تیرہ ہزار مربع میل علاقہ چین کے حوالے کر دیا ہے"۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بھارت جب کسی قسم کی پروپیگنڈہ مہم چلاتا ہے تو وہ حقائق کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دو متضاد بیانات اس کا کھلا ثبوت ہیں۔ حقائق یہ ہیں کہ پاکستان نے ایک مربع انچ علاقہ بھی چین کو نہیں دیا۔ بلکہ اس نے ساڑھے سات سو مربع میل کا علاقہ حاصل کر لیا ہے جو چین کے قبضے اور کنٹرول میں تھا۔

میں اس مرحلے پر بھارت کے اس دعویٰ کے جواز کے بارے میں کچھ کہنے سے احتراز کروں گا جو اس

www.bhutto.org

نے درہ قراقرم کی اس مقام تک سرحد بندی کے بارے میں کیا ہے جہاں افغانستان پاک اور چین 'تینوں کی سرحدیں ملتی ہیں اور یہی وہ سیکٹر ہے جس کا پاک چین سرحدی معاہدے میں تعین کیا گیا ہے۔ میرے علم میں بھارتی وزارت خارجہ کے "ایکسٹرنل پبلسٹی ڈویژن" کا ایک کتابچہ "پاک چین سرحدی معاہدہ۔ چند حقائق" بھی لایا گیا ہے جو 16 مارچ 1963ء کو شائع ہوا ہے۔ یہی وہ تاریخ ہے جب اس بھارتی وفد نے سلامتی کونسل کے صدر کو اپنا مراسلہ بھجوایا تھا اور اس میں اس بحث کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ بھارتی دعاوی کی حقیقت کا پول کھولے گی اور ان بے جواز نتائج کا مؤثر جواب دے گی جو بھارتی حکومت نے پاک چین سرحداتی معاہدے سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے پاس بھارتی الزامات کو رد کرنے کے لئے کافی مواد موجود ہے اور ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ پاک چین معاہدہ منصفانہ نوعیت کا ہے 'نیز احترام اور ایک دوسرے کے تاریخی حقوق اور دو قومی مفادات کو تسلیم کرنے کی بنیادوں پر عمل میں آیا ہے۔ ہمیں اس بات پر اطمینان ہے کہ گو بھارتی حکومت اسے تسلیم نہیں کرتی لیکن باقی دنیا نے اس معاہدے کو منصفانہ 'نیز ایشیا اور دنیا کے امن کے لئے ایک عظیم خدمت قرار دیا ہے۔

26 مارچ 1963ء

www.bhutto.org

اقوام متحدہ اور عالمی امن

حالیہ برسوں میں جنرل اسمبلی جو اقوامِ متحدہ کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور جس میں تمام رکن ممالک کو خود مختاری کی بنا پر مساوی نمائندگی حاصل ہے اس کے اکثر اجلاس مشرق و مغرب کے شدید اختلافات اور بحرانوں کے گھٹاٹوپ اندھیروں تلے ہوئے ہیں۔ 1961ء میں کانگو کے بحران نے جنرل اسمبلی کو ہلا کر رکھ دیا تھا جس میں افریقہ کے قلب میں، روس اور مغربی دنیا کے درمیان براہِ راست مسلح تصادم کے خطرے سے دنیا کی تباہی کا احتمال پیدا ہو گیا تھا۔

1962ء میں امریکہ اور روس جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے تھے اور دنیا تباہی کے کنارے آ گئی تھی۔

صدر کینیڈی اور مسٹر خروشیف پاتال میں جھانک کر واپس لوٹ آئے۔ بقائے باہمی کے امکان یا عدم امکان کے نظریاتی جھگڑوں کا لحاظ کئے بغیر وہ بطور مدبر اور انسان کے یہ عزم کر چکے تھے کہ وہ جھگڑوں کا فیصلہ تلوار کی ثالثی سے نہیں کریں گے۔ وہ ایٹمی جنگ نہیں چاہتے۔ صداقت کے اس لمحہ میں ہر ایک نے یہ جان لیا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنی شرائط دوسرے پر نہیں ٹھونسے گا۔ دونوں نے محسوس کر لیا ہے کہ دونوں طاقتور ترین مملکتوں کو جن کی تقدیر کے وہ رہنما ہیں، اپنی طاقت کی حدود کو ضرور پہچاننا چاہئے۔

اس سال جنرل اسمبلی کا اجلاس (گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں) کم تر عالمی کشیدگی کی فضا میں بلکہ خیر سگالی کے ایسے ماحول میں ہوا جو کہ فضا، خلا اور زیرِ آب ایٹمی تجربوں پر پابندی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔

www.bhutto.org

ممتاز مدبر جو اپنے اپنے ملک کے وفد کی جنرل اسمبلی کے اٹھارہویں اجلاس میں قیادت کر رہے تھے۔ سب نے یک زبان ہو کر مستقبل کے اس امن کے بارے میں امید اور اعتماد کا اظہار کیا جس کے ماضی میں امکانات بہت کم تھے۔

صدر کینیڈی اور وزیر خارجہ گرومیکو نے صورتحال کو مزید بہتر بنانے کے لئے ٹھوس اور تعمیری تجاویز پیش کی ہیں۔ اس جذبہ نے ان کے عام مسائل حل کرنے میں ہمت بندھائی اور مکمل تخفیف اسلحہ اور مدار میں تباہ کن ہتھیار نہ رکھنے کے معاہدہ تک رہنمائی کی۔

میری حکومت کا یہ ٹھوس موقف ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے زیر زمین تجربے اور پھیلاؤ کو روکنے کے لئے بین الاقوامی ذمہ داری اور نگرانی کے تحت جلد سے جلد ایک معاہدہ عمل میں لایا جائے۔ تجربات پر پابندی کا معاہدہ اگرچہ خوش آئند ہے اور اس سے لوگوں کے اذہان سے ایٹمی جنگ کا خوف دور ہو رہا ہے' لیکن یہ ایک فریب بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

ماضی میں پاکستان تخفیف اسلحہ کے ابتدائی اقدامات کے بارے میں تعمیری تجاویز پیش کر چکا ہے۔ ہمیں اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مشرق اور مغرب کے درمیان موجودہ توازن کو کم از کم دونوں طرف کی مسلح افواج کی تعداد اور ان کے روایتی اسلحہ کے بارے میں افواج اور اسلحہ کے واضح طور پر کمتر سطح پر کیوں نہ رکھا جائے۔

اس دنیا میں سرد جنگ کشیدگی کی تنہا منظر نہیں ہے اور نہ ایٹمی اسلحہ کی دوڑ ہی اسلحہ کی دوڑ ہے۔ افریقہ میں استعماریت نے موت کی سنسنی پھیلا رکھی ہے اور نسلی تفوق کے جھوٹے نظریہ کے مسلسل تعاقب نے خوف اور نفرت کی چنگاری کو سلگا رکھا ہے۔ کیریبین (امریکہ کے جنوبی جزائر) میں جس نے گزشتہ سال دنیا کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا تھا ابھی تک امن قائم نہیں ہوا بلکہ صرف ایک عارضی معاہدہ ہے۔ لیکن ایشیا میں جس کی تاریخ طوفانوں سے بھرپور ہے یہ امن غالباً سب سے کم محفوظ شے ہے۔ یہ وسیع و عریض برا عظم جس پر اس کرہ ارض کی نصف سے زائد مخلوق آباد ہے ایسی مسلسل ہنگامہ آرائی اور ہلچل کا منظر پیش کر رہا ہے جو نوع انسانی کا مقدر بدل سکتی ہے۔

کیا یہ وقت اس سب سے بڑے برا عظم کی صورتحال کا نئے سرے سے جائزہ لینے اور ایسی تدبیر وضع کرنے کا نہیں ہے جو اس کی جوں کی توں پالیسیوں سے بلند ہو کر دیکھے اور لوگوں کے حق خود ارادیت سے مطابقت رکھتی ہو! ایشیا کی حد سے بڑھتی ہوئی آبادی کی صلاح و فلاح اور امن عالم کی خاطر یہ لازم ہے کہ ان جھگڑوں کا جنہوں نے ایشیا کی اقوام کو تقسیم کر رکھا ہے حل تلاش کیا جائے۔ پچھلے ایک سال سے زائد عرصہ سے بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات مزید خراب ہو گئے ہیں اس کی وجہ آسام اور تری پورہ کی ریاستوں سے دس ہزار بھارتی مسلمانوں کا اخراج ہے' جنہیں زبردستی مشرقی پاکستان میں دھکیل دیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر دونوں حکومتوں کے درمیان سفارتی سطح پر گفت و شنید ہو رہی ہے۔ ہماری یہ بھرپور کوشش ہے کہ یہ مسئلہ قانون اور انصاف کے اصولوں کے مطابق طے پا جائے۔

www.bhutto.org

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اپنے تمام ہمسایہ ممالک سے کسی استثنیٰ کے بغیر پُرامن اور دوستانہ ماحول میں رہا جائے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ ہمارے اختلافات ہیں۔ بیشتر کے ساتھ ہم اپنے تعلقات بہتر بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم نے برما، ایران اور چین کے ساتھ اپنے سرحدی تنازعات کو دوستانہ ماحول میں طے کر کے ان سے سرحدی معاہدات کر لئے ہیں۔ صرف بھارت واحد استثنیٰ کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔

پاکستان، بھارتی عوام کے بارے میں کوئی مذموم ارادہ نہیں رکھتا۔ پاکستانی اور بھارتی عوام تقریباً ایک ہزار سال تک مشترکہ تاریخ کے امین رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں ایک دوسرے پر مختلف طریقوں سے اثرانداز ہوتے رہے ہیں۔ یہ حقائق ہماری آگہی میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہمسایوں کے بارے میں ہماری پالیسی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ہم اپنے تمام باہمی اختلافات کے معقول سمجھوتے کے ذریعہ جن میں کشمیر کا تنازعہ سرفہرست ہے، منصفانہ اور آبرومندانہ پُرامن بقائے باہمی کی اساس تلاش کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ مستعد رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کی عمومی رائے یہ ہے کہ اگر جنگ اور تشدد ختم ہو جائے تو بین الاقوامی تنازعات کو پُرامن طریقوں سے طے کرنے کے راستے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں۔ تغیر اور تصادم کے دور سے گزر رہی ہے۔ اس میں قوموں کے درمیان تنازعات ہیں۔ تغلب کے خلاف جدوجہد ہے، نسلی امتیاز کے پیدا کردہ مسائل ہیں اور قوموں کے درمیان اقتصادی عدم مساوات ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ان خیالات کے تلخ ورثے نو آبادیاتی نظام کے قطعی طور پر معدوم ہونے سے مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔ افریقہ کے نو آزاد ممالک میں آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمام نسلوں کے افراد باہمی احترام اور مشترکہ مفاد کے لئے مل کر کام کرتے ہیں۔ صرف جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے مسئلہ کو سرکاری پالیسی کی بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔ اس بدقسمت ملک کے حکمران آنکھ رکھتے ہوئے بھی حقائق سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں دنیا کی اپیلوں کو نہیں سنتے اور تاریخ کی پیش قدمی سے قطع تعلق کرتے ہوئے اس کی راہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنوبی افریقہ، افریقہ کی امید بن سکتا تھا مگر اس کے حکمرانوں نے اس کو ساری دنیا کے لئے باعثِ شرم بنا دیا ہے۔

جنوبی افریقہ کے عوام کے مفادات چاہے یہ عوام گورے ہوں یا کالے یا بھورے، اور افریقہ اور دنیا کا امن اور سکون اس بات کے متقاضی ہیں کہ جنوبی افریقہ کی غیر انسانی پالیسیوں کی روک تھام کے لئے مؤثر اقدامات کر کے اسے تباہی سے بچایا جائے۔

آج تمام دنیا میں نو آبادیاتی نظام کی جگہ قوموں کے درمیان مساوات اور باہم احترام پر مبنی تعلقات لے رہے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام تحلیل کے عمل میں ہیں اور تمام امن پسند اور حریت پسند ممالک کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عمل کو تیز تر کر دیں۔ پاکستان کوشش کر رہا ہے اور امید رکھتا ہے کہ افریقہ، ایشیا اور دوسرے ممالک جو ابھی تک نو آبادیاتی نظام کے چنگل میں ہیں وہ جلد ہی اقوام متحدہ کی مدد سے آزادی سے ہم کنار ہو

www.bhutto.org

جائیں گے۔

ہمارا یہ کامل یقین ہے کہ اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد کا کوئی اتنا مخالف نہیں ہے جتنا کہ نو آبادیاتی نظام کا جاری رہنا' جس کا کہ کشمیر ایک اہم حصہ ہے۔

اس ضمن میں مجھے جنرل اسمبلی کو متوجہ کرنے کا موقع ملا کہ وہ اس تاریخی واقعہ کو جو اس سال مئی میں ہوا ہے ملحوظ رکھے۔ عدیس ابابا میں بتیس افریقی ممالک کے سربراہ اکٹھے ہوئے اور انہوں نے کامل جذبۂ اتحاد سے یہ عہد کیا کہ وہ افریقہ کے باقی ماندہ محکوم علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے مؤثر اقدام کریں گے۔ کانفرنس نے افریقی اتحاد کے منشور کو منظور کیا اور ایک مشاورتی مشینری قائم کی ہے۔ پاکستان' افریقہ کے سیاسی اتحاد کی خواہش اور متحدہ افریقی قوم کے شعور کے اس واقعہ کا خیر مقدم کرتا ہے۔ قدیم دور کے ایک مؤرخ نے کہا ہے کہ افریقہ سے ہمیشہ کوئی نئی چیز ظاہر ہوتی ہے۔ ایشیا جو ابھی تک اس قسم کے براعظمی شعور سے عاری ہے افریقی عوام کے ہمارے لئے ایسی مثال قائم کرنے پر ان کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

چند روز قبل دنیا کو افریقی استحکام کا ایک اور زندہ ثبوت اس وقت ملا جب شاہ حسن اور صدر بن بیلا' صدر کیٹا کی نیک مساعی سے الجزائر اور مراکش کے درمیان جنگ بندی پر رضامند ہو گئے اور اپنے سرحدی تنازعات کو پُرامن طور پر حل کرنے کے لئے بات چیت پر آمادگی ظاہر کی۔ ایشیا کے لئے یہ ایک شاندار اور قابلِ تقلید مثال ہے۔ ہماری دلی تمنّا اور دعا ہے کہ آزاد افریقہ کی' براعظمی اتحاد کی طرف پیش قدمی کی رفتار تیز ہو جائے۔

آٹھ سال قبل بنڈونگ کے خوبصورت شہر میں ایشیا اور افریقہ کے 29 خود مختار ممالک کے نمائندے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کو صدر سوئیکارنو نے "انسانیت کی تاریخ میں نام نہاد رنگ دار نسلوں کی پہلی بین الاقوامی براعظمی کانفرنس" کہا تھا۔ بنڈونگ کانفرنس نے بین الاقوامی رہنمائی کے دس اصول وضع کئے جن میں نو آبادیاتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں رہنما اصول شامل تھے۔ 1956ء کے بعد بیس سے زائد ممالک آزادی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اپنے امتیازی تجربات کے ساتھ نو آزاد ممالک ان مسائل کے حل میں جو افریقہ اور ایشیا کو درپیش ہیں نمایاں کردار سرانجام دیں گے۔ پرانے تنازعات ابھی تصفیہ طلب ہیں اور نئے پیدا ہو رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں دوسری افریشیائی کانفرنس بلانے کا وقت آگیا ہے تاکہ پہلی کانفرنس کے فیصلوں کا جائزہ اور ایفاء نہ ہونے والے عہدوں پر نظرثانی کر کے انہیں حیاتِ نو بخشی جائے۔ ہم کسی شک و شبہ کے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری بنڈونگ کانفرنس عالمی امن کو تقویت پہنچانے میں ناکام ثابت نہیں ہوگی۔

دولت کی اس نامنصفانہ تقسیم کا ایک بڑا سبب نو آبادیاتی نظام رہا ہے جو ایک قوم کی دوسری قوم کے مقابلے میں سیاسی محکومی' معاشی بدحالی اور اخلاقی تنزل کے لئے منظم کیا گیا ہے۔

www.bhutto.org

تقریباً سبھی ترقی پذیر ممالک خام مال یا زرعی اجناس پیدا کرتے ہیں جنہیں اپنی اقتصادی ترقی اور ضروری اشیاء کی درآمد کے لئے ان کی برآمد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

صنعتی ممالک اور زرعی اجناس اور خام مال پیدا کرنے والے ممالک کے درمیان تجارت کے فروغ اور تجارتی شرائط کو بہتر بنانے کی فوری ضرورت ہے۔

آئندہ سال جنیوا میں بین الاقوامی تجارت و ترقی پر جو کانفرنس منعقد ہو رہی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے کی طرف نمایاں توجہ دے گی۔ اس کی کامیابی کا انحصار صنعتی ممالک کے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ اختیار کردہ برتاؤ پر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اجارہ دارانہ رجحانات اور ان گروہوں کے دباؤ پر جو فوری نفع سے بالا ہو کر دیکھ ہی نہیں سکتے ذاتی مفاد کا واضح رویہ غالب آئے گا۔

اقوامِ متحدہ کی کوتاہیوں پر اکثر تنقید کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کو بھی مایوسی ہوئی ہے تاہم کانگو اور مغربی ایریان میں اقوامِ متحدہ کے کردار کو دیکھتے ہوئے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ تنظیم جاندار ہے اور عالمی امن میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہے؟

یہ عالمی تنظیم عالمی قیادت اور ایک یا دوسری برتر طاقت کے دوسرے تمام ملکوں پر غلبے کے متبادل کے طور پر قائم کی گئی تھی۔ یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ اقوامِ متحدہ کے عہد میں خود مختار ملک کسی عظیم طاقت کی قوت کے بل بوتے پر مسلط ہونے والے کے سامنے جھک جائیں یا دنیا کے نقشہ کا فیصلہ مخصوص نظریات یا ضابطہ ہائے حیات کے تصادم سے ہو۔ جب ہم قلیل المدت مقاصد سے نبرد آزما ہو رہے ہوں تو ہمیں اس حتمی مقصد کو ذہن میں رکھنا چاہئے جس کی طرف اقوامِ متحدہ کو بڑھنا ہے۔ بشرطیکہ انسانیت کو خودکشی سے بچانا مقصود ہو اور اسے انسان کے اس عظیم مقدر کے وعدے کا احساس دلانے کی اجازت دی جائے جو قرآن کریم کے نزدیک انسان کے زمین پر بطور خدا کے نائب ہونے میں مضمر ہے۔

21 نومبر 1963ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

دوطرفہ تعلقات

(سرکاری یادداشتوں سے اقتباسات)

پاکستان نے اب تک اس زبردست حقیقت کو جسے سوویت یونین کہتے ہیں اور جو اس کے سر کی طرف نکلا ہوا ہے نظرانداز کرنا پسند کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس عظیم طاقت کے ساتھ جنگجویانہ پالیسی اختیار کی. ...... اس نے سوویت یونین سے رابطہ قائم کرنے سے انکار کیا اور بعض اوقات اس ملک کو خطرناک اشتعال دلایا' مثال کے طور پر اس نے یوٹو کو سوویت یونین کے اندر جاسوسی کرنے کی غرض سے اپنے علاقے سے پرواز کرنے کی اجازت دی۔ پاکستان نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو مستقل سہولتیں مہیا کیں تاکہ وہ سوویت یونین کے بارے میں ٹوہ لگائے۔ اس یک طرفہ خارجہ پالیسی کو اور آگے بڑھاتے میں پاکستان نے اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ سوویت یونین سے کوئی مستحکم ثقافتی اور تجارتی رابطے قائم کرے۔ فنی نوعیت کے سوویت لٹریچر کی اشاعت کو بھی روکا گیا۔ دنیا تو رفتہ رفتہ بدل چکی تھی اور سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی ان تبدیلیوں کی مناسبت سے ردّ و بدل کر لیا تھا لیکن پاکستان اپنی جگہ ثابت قدم رہا اور زمانے کے ارتقا کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ذمہ داری نہیں تھی کی جو تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں ان کے متعلق پاکستان کو بتائے۔

پاکستان کے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ اتنی ہی ثابت قدمی سے بندھے رہنے سے 'جتنی وہ ان تبدیلیوں سے پہلے تھا' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مفادات کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ 1965ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران بھی 'جب مغربی ممالک نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کو

www.bhutto.org

فوجی سازوسامان بھیجنے پر پابندی لگادی تھی' ہندوستانی لیڈروں نے سوویت یونین کو زبردست خراج تحسین پیش کیا کہ اس نے ہندوستان پر ایسی ہی کوئی پابندی عائد نہیں کی اور جنگ کے آغاز سے پہلے سوویت یونین اور ہندوستان کے درمیان ہونے والے معاہدوں کے مطابق ہندوستان کو فوجی سازوسامان سپلائی کرتا رہا۔ جنگ کے دوران' جبکہ ان کے بازو میں مسٹر ڈین رسک کھڑے مسکرا رہے تھے' سوویت وزیر خارجہ مسٹر گرومیکو نے نیویارک میں کہا۔ "سوویت یونین ہندوستان کا پرجوش ترین دوست ہے۔" سلامتی کونسل کے نازک مباحث کے وقت' جن کے نتیجے میں 20 ستمبر کی قرارداد منظور ہوئی' ہر ہر قدم پر سوویت یونین نے ہندوستان کی حمایت کی۔

ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے اچھے تعلقات اس لئے رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک بڑی طاقت اور بااثر ملک ہے۔ ایسا ملک جس سے تعلقات رکھنا ضروری ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہمارے تعلقات' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے کی گئی کسی خاص پہل پر مبنی نہیں ہیں' خواہ وہ تعلقات دو طرفہ یا کثیر طرفہ ہوں' بلکہ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قوت اور پوزیشن پر مبنی ہیں۔ اسی طرح چین سے بھی ہمارے اچھے تعلقات اس وجہ سے نہیں کہ چین نے جنگ ستمبر کے دوران ہندوستان کو الٹی میٹم دیا تھا۔ چین سے ہمارے تعلقات اس الٹی میٹم سے پہلے ہی سے اچھے تھے۔ چین سے ہمارے تعلقات' اس کی طرف سے کی گئی کسی خاص پہل کی وجہ سے نہیں بلکہ جغرافیہ' تاریخ اور سیاست کی ٹھوس حقیقتوں کی وجہ سے استوار ہوئے۔ اگر بڑی طاقتوں سے اچھے تعلقات ہر ایک پہل' خواہ وہ حق میں ہو یا نہ ہو' پر مبنی ہوں تو مملکتی تعلقات میں کوئی تسلسل یا تیقن نہ ہو اور نہ مملکتوں کے درمیان تعلق کی راہ متعین کرنے والے منطقی قواعد ہوں۔ لہٰذا ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی خاص پہل سے بے نیاز ہو کر سوویت یونین سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔ ..... اس سے ہمارے تعلقات کے لئے وسیع امکانات اور کہیں زیادہ حرکت پذیری پیدا ہوگی۔

ہمارے لئے یہ ضروری اور اہم ہے کہ سوویت یونین سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔ یہ کام کسی خاص پہل کے محدود سیاق و سباق کے مقابلہ میں سوویت یونین کی طرف سے کی گئی کسی اہم پہل سے بے نیاز ہو کر کرنا چاہئے۔

اپریل 1966ء

صدر اس بات سے واقف ہیں کہ پچھلے کچھ عرصے سے میں نے کثیر طرفہ ذمہ داریوں کے مقابلہ میں غیر ممالک کے ساتھ دو طرفہ تعلقات قائم کرنے کے فوائد کے حق میں دلائل دیئے ہیں تاکہ ہماری خارجہ پالیسی کے لئے وسعت خیال اور منطق مہیا ہو۔

بیس سال سے زیادہ عرصے تک' بین الاقوامی صورت حال پر کثیر طرفہ پابندیاں غالب رہیں۔ اب صورت حال پھر بدل رہی ہے۔ نئے عوامل نمودار ہوئے ہیں اور موجودہ حالات اس بات کا تقاضا

کرتے ہیں کہ دوطرفہ ڈپلومیسی پر بھرپور زور دیا جائے۔

جو مملکت، کسی ایسے کثیر طرفہ دفاعی انتظام کی پابند ہو، جو اس کے اپنے قومی مفادات سے پوری طرح مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ کثیر طرفہ آویزشوں کے خطرے سے دوچار ہونے کے علاوہ بہت سی مشکلات سے دوچار ہوتی ہیں۔ ایسے کثیر طرفہ انتظامات کی بہت سی برائیوں میں سے ایک برائی یہ ہے کہ ریل اس طرح بنی ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ چلنے والے کی رفتار سے چلے جس کا نتیجہ مفادات کے تصادم اور خصوصی مصلحتوں کے پیش نظر بے تاثیری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں کوئی مملکت اتنی تیز رفتاری سے چلنا چاہے کہ ریل کے سارے ڈبے پٹری سے اتر جائیں۔ دوسرے الفاظ میں ایسی روانی کی بنیاد پر جو ایک کثیر طرفہ انتظام کے اندر ہر مملکت کی امنگوں کے مطابق ہو، دائمی طور پر چلنا مشکل ہے۔

اگر دوطرفہ تعلقات کی شرائط روح کے اعتبار سے، کسی مسلکہ انتظام کے تحت کثیر طرفہ پابندیوں کی شکل اختیار کرلیں تو وہ بھی کثیر طرفہ ذمہ داریوں کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مملکت کسی بڑی طاقت سے یہ وعدہ کرلے کہ اگر وہ بڑی طاقت کسی جنگ میں ملوث ہوگی تو وہ بھی جنگ کرے گی تو یہ درحقیقت ایک کثیر طرفہ ذمہ داری کی صورت ہوگی۔ ایسا اس لئے ہوگا کہ ممکن ہے متعلقہ بڑی طاقت کی بھی دوسری مملکتوں کے ساتھ ایسی ہی دوطرفہ اور کثیر طرفہ ذمہ داریاں ہوں۔ اس طرح ردعمل کا ایک سلسلہ شروع ہوجائے گا اور دوطرفہ پابندیاں، کثیر طرفہ ذمہ داری میں تبدیل ہوجائیں گی۔

ایک خالص دوطرفہ معاہدہ بھی شرکاء کے آزادیٔ عمل کو محدود کرسکتا ہے بشرطیکہ معاہدے کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ دوسری مملکت کی سلامتی کے خلاف پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر، ایسے حالات میں، یہ شرکاء کو ایسی پوزیشن میں ڈال دے گا جس میں وہ تیسرے ملک کے ساتھ، جس کے اہم مفادات کے خلاف وہ پہلے ہی دوطرفہ معاہدہ کرچکے ہیں، اپنے دوطرفہ تعلقات قائم کرنے کے سلسلہ میں خود کو نہایت محدود پائیں گے۔

یکساں اور صاف ستھرے دوطرفہ تعلقات کے لئے ایک ناگزیر اولین شرط، غیر جانبداری کی اصلیت ہے۔ تعلقات، دو متعلقہ طاقتوں کے مشترکہ قومی مفادات تک محدود ہونے چاہئیں اور انہیں اپنے اپنے مفادات سے آگے کسی ایسی چیز کا اپنے آپ کو پابند نہیں کرنا چاہئے جو ایک تیسرے ملک کے مفادات کے خلاف پڑتی ہو۔

30 مئی 1966

دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے وقت سے دنیا میں ایک نئی سیاسی صورت حال پیدا ہوئی ہے جو شاید اس وجہ سے کہ بالکل عیاں ہے، بعض اوقات اپنے صحیح تناظر میں نہیں دیکھی جاتی اور انسانی معاملات کے چلنے پر اس کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھا نہیں جاتا۔

انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے پہلے نصف میں کسی ملک کے خارجہ امور چلانے کا روایتی طریقہ یہ تھا کہ بڑی طاقتوں کے گروپوں کے درمیان نسبتاً چھوٹی قوموں کی اعانت سے طاقت کا توازن برقرار رکھنے

کی غرض سے علاقائی معاہدہ کیا جائے۔ طاقت کا نہایت ہی نازک توازن قائم کر کے ہی امن برقرار رکھا گیا تھا۔ درحقیقت امن میں خلل صرف اسی وقت پڑا جب کسی خاص وقت میں طاقت کا توازن ایک یا دوسرے گروپ کے حق میں ہو گیا۔ ان دنوں ''نسبتاً چھوٹی قومیں مختلف قسم کی سیاسی ترتیب اور یکجائی کر کے بڑی طاقتوں کی پالیسی اور صف بندی پر اثرانداز ہو سکتی تھیں۔

عالمی طاقتوں کے ظہور کے ساتھ آج یہ ساری چیزیں بدل گئی ہیں' کیونکہ یہ عالمی طاقتیں مستند مفہوم میں بڑی طاقتوں کے اوصاف رکھنے کے علاوہ' زیادہ بڑی اور بہت زیادہ طاقتور ہیں اور ساری دنیا میں قوموں کی تقدیر متعین کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہیں۔ ان طاقتوں کے ظہور سے گزشتہ بیس سال میں انسانی اور مملکتی امور چلانے کا پورا تصور بنیادی طور پر بدل گیا ہے۔ نسبتاً چھوٹی قوموں کے لئے اور اس زمرے میں ساری ترقی پذیر قومیں آتی ہیں۔ بڑی طاقتوں سے اپنے تعلق کا تعین کرنے اور اپنے قومی مفادات کو فروغ دینے کا کام زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہو گیا ہے۔ جو چھوٹی قوم ' نئے قواعد کو نہیں سمجھتی ' اس کا انجام لازماً مایوسی ' احساس بے بسی ' علیحدگی و تنہائی اور شاید آخر کار فنا ہو گا۔ ہمیں اس بات کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ ہم اس نئی صورت حال میں اپنے معاملات کس طرح چلائیں۔

آج نسبتاً چھوٹی قوموں کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنے معاملات کس طرح پر چلائیں کہ ان کے بنیادی مفادات محفوظ رہیں۔ ان کی علاقائی سالمیت برقرار رہے اور انہیں بڑی طاقتوں نیز نسبتاً چھوٹی قوموں کے ساتھ اپنے تعلقات کے معاملہ میں بدستور آزادی حاصل رہے۔ ظاہر ہے کہ نابرابر قوتوں کے درمیان برابری حاصل کرنا ممکن نہیں۔ ایسی صورت حال میں ' کوئی شخص زیادہ سے زیادہ رواداری اور شاید مفاہمت کے تعلق کی توقع رکھ سکتا ہے لیکن حقیقی برابری کی کبھی توقع نہیں کر سکتا۔ بڑی طاقتوں اور نسبتاً چھوٹے ملکوں کے درمیان تعلق فی نفسہٖ نابرابر ہے۔ جس میں بڑی طاقتیں ' برابر تو کیا ' کافی مقدار میں بدلہ دیئے بغیر بہت سے فوائد زبردستی حاصل کر سکتی ہیں۔ کسی کمزور تر قوم کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ وہ انصاف کے نام پر یا اپنے مقصد کی سچائی کی بنا پر کسی طاقت کو اپنے نقطہ نظر کی ہمنوائی کرنے پر مجبور کرے یا اسے اپنے زیر اثر لائے۔ آخری تجزیئے میں مقصد کی سچائی نہیں بلکہ بڑی طاقتوں کے بے مہر عالمی مفادات ان کی پالیسی کا تعین کرتے ہیں۔ یہ مفادات ' ایسی نابرابر قوتوں کے درمیان کسی کھلی اور لامتناہی محاذ آرائی میں یقیناً غالب رہیں گے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نسبتاً چھوٹی قوموں کو بڑی طاقتوں کے احکام کی فرمانبرداری سے پابندی کرنی چاہئے اور مادی فوائد اور اقتصادی خوش حالی کے وعدے کے عوض اپنی آزادی قربان کر دینی چاہئے ؟ اس کا جواب ایک زوردار ''نہیں'' ہے۔ نسبتاً چھوٹی قوموں کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنے معاملات کو ہوشیاری سے چلا کر اپنی آزادی برقرار رکھیں اور بڑی طاقتوں نیز نسبتاً چھوٹی قوموں سے اپنے تعلقات میں لچک پیدا کریں۔ کسی نسبتاً چھوٹی قوم کے لئے یہ بات خلاف مصلحت اور شائد خطرناک ہو گی کہ وہ دوسری بڑی طاقتوں کو چھوڑ کر ایک طاقت کے مجموعی مفادات سے خود کو پورے طور پر منسلک کر

لے۔ بعض اوقات ممکن ہے کہ کسی نسبتاً چھوٹی قوم کے لئے یہ ضروری ہو کہ وہ کسی ایک عالمی طاقت سے اور زیادہ قریب ہو جائے لیکن اس صورت میں بھی اس کے لئے یہ ناممکن نہیں ہے کہ دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ باعزت دوطرفہ تعلقات کی بنیاد پر معمول کے مطابق تعلقات برقرار رکھے۔ کسی چھوٹی مملکت کے لئے یہ اعلیٰ درجے کی حماقت ہو گی کہ کسی دوسری بڑی طاقت کے بل بوتے پر یا کسی عالمی طاقت کے خلاف اشتعال کی پالیسی اختیار کرے۔

کسی بڑی طاقت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نسبتاً چھوٹی مملکت کے مطالبہ پر اپنے عالمی مقاصد تبدیل کر دے گی' ایک تصوری بات ہو گی۔ کسی کمزور مملکت کے لئے یہ توقع رکھنا غیر حقیقت پسندانہ بات ہو گی کہ وہ کسی بڑی طاقت سے معمول کے مطابق تعلقات قائم کرنے پر رضامند ہوئے بغیر' اسے اپنے نقطۂ نظر کا ہمنوا بنا لے گی۔ چونکہ تعلق نابرابر ہے اس لئے نسبتاً چھوٹی مملکت کے لئے یہ دانشمندی کی بات ہو گی کہ وہ متنازعہ نکتہ کو اس واضح اور قطعی مفاہمت پر الگ کر دے کہ کوئی فریق اس خاص مسئلہ پر دوسرے فریق پر اثرانداز نہیں ہو گا۔ ایسی خاموش مفاہمت پر ایک نارمل اور منطقی ربط ضبط قائم کیا جا سکتا۔ ایسی مفاہمت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسے ان بڑی طاقتوں سے بہتر تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں جو اس کے نقطہ نظر کی حمایت کرتی ہیں۔ ایسی مفاہمت ایسے تعلقات کے مدارج پیدا کرتی ہے جو قابل توضیح' یکساں اور منطقی اور غلط تشریحات سے آزاد ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وقار ختم ہو گیا یا عزت گھٹ گئی۔ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ نسبتاً چھوٹی طاقت اپنے وقار' مفادات اور پوزیشن پر مصالحت کرنے پر رضامند نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں کی طرف سے یہ معاہدہ ہے کہ وہ ایسے نکتہ میں جس پر بنیادی اختلاف ہے' مداخلت نہیں کریں گے یا ایک دوسرے کی پوزیشن پر اثرانداز نہیں ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معمول کے مطابق تعلقات قائم کرنے کے لئے کوئی قیمتی چیز زبردستی نہیں لی جا رہی ہے۔ یہ صرف براہ راست معاملہ کرتے سے ایک خاص مسئلہ کو الگ کرتی ہے۔ یہ صرف ایک نابرابر محاذ آرائی سے اس شرط پر گریز کرتی ہے کہ اختلاف کے اہم نکتہ پر ایک فریق دوسرے فریق پر اثرانداز نہیں ہو گا۔ ایسی مفاہمت متعلقہ مملکت کو اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے سے نہیں روکتی اور نہ ہی اس بات سے روکتی ہے کہ جب کبھی موزوں مواقع پیدا ہوں تو اختلافات پر جاندار مکالمہ ہو۔

معاملہ کی سادہ حقیقت یہ ہے کہ اخیر میں کسی بڑی طاقت کو دھوکہ یا جھکہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے یہ بہتر ہو گا کہ ایک حقیقت پسندانہ اور متوازن رویہ اختیار کیا جائے اور داخلی خطوط کی بجائے سائنسی خطوط پر پالیسی وضع کی جائے۔

متعلقہ مملکت کے مقاصد کے دوسرے ذرائع سے حصول کے بہتر امکانات ہوں گے۔ دوسرے ذرائع یہ ہیں کہ ایک طرف ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی نسبتاً چھوٹی قوموں .... جنہیں اب ہم تیسری دنیا کہتے ہیں' کی اجتماعی آواز اور باہمی اتفاق سے بالواسطہ دباؤ ڈالا جائے اور دوسری طرف بڑی طاقتوں نیز حاشیہ پر کی ان بڑی طاقتوں سے' جن سے ان کے مفادات مطابقت رکھتے ہوں' سفارتی دباؤ ڈلوایا جائے۔

اساسی تدبیر یہ ہونی چاہئے کہ ان بڑی طاقتوں سے' جن کے ساتھ بنیادی مفادات میں اختلاف ہو' براہ راست محاذ آرائی سے بچا جائے۔

لہٰذا نسبتاً چھوٹی مملکتوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ساری بڑی طاقتوں کے ساتھ' ان کی پوزیشنوں کا لحاظ کیے بغیر' اپنے متصادم مفادات پر مکالمہ جاری رکھیں اور سارے یا کچھ نہیں کی تنگ یک بُعدی بنیاد پر ملوث ہوئے بغیر ان پر بالواسطہ اثر انداز ہونے کی غرض سے اپنے وسائل کے اندر سب کچھ کریں۔

متنازعہ نکتہ کو ہٹانے کے بعد' زیر بحث ساری بڑی طاقتوں کے ساتھ' متنازعہ مسئلہ کے سوا سارے معاملات پر معمول کے مطابق اور دوستانہ تعلقات ہوسکتے ہیں۔ اس سے زیر بحث مملکت اس قابل ہوگی کہ وہ ان بڑی طاقتوں کے ساتھ' جن سے اس کے مفادات مطابقت رکھتے ہوں' مزید خوشگوار تعلقات قائم کرے۔ ایسی صورت میں وہ بڑی طاقت جس کے مفادات سے ٹکراؤ ہوتا ہو' ان بڑی طاقتوں سے جن سے اس کے مفادات مطابقت رکھتے ہوں' اس مملکت کے مزید خوشگوار تعلقات پر اعتراض نہیں کر سکتی۔

کم طاقتور قوموں کے لئے تیسری دنیا کا استحکام اتنا اہم ہے کہ بڑی طاقتیں اس چیز کے ظہور سے کوئی خاص راحت محسوس نہیں کرتیں۔ اس وقت یہ استحکام اتنا مضبوط نہیں ہے کہ اسے بڑی طاقتوں کے خلاف ایک مؤثر لیور کے طور پر استعمال کیا جائے۔

یہ بات صاف طور پر سمجھی جائے گی کہ ہماری خارجہ پالیسی کی پوری بنیاد یہ ہے کہ ان ملکوں سے تعلقات مستحکم کریں جو ہماری حمایت کرتے ہیں اور ان ملکوں کے ساتھ جھگڑے کے نکتے علیحدہ کر دیں جو یا تو غیر جانبدار یا ہمارے مخالف ہیں۔

لہٰذا عالمی صورت حال کی قوت متحرکہ اور وقار کے پیش نظر یہ مناسب ہے کہ چھوٹی طاقتیں اپنے قومی مقاصد کے حصول کے لئے جھگڑے کے معاملات کو جدا کرنے کی کوشش کریں اور اپنے بدلتے ہوئے مقاصد کی لہروں اور نیرنگیوں کے ساتھ بڑی طاقتوں کے ساتھ براہ راست تصادم نہ کریں۔

نظریہ تعلیل کا اطلاق امور خارجہ پر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا قانون ٹارٹ پر۔ مملکتی تعلقات کے چلن میں ایک سرگرم باہم تعلق اور باہمی اثر ہوتا ہے۔ صاف ستھری اور قابل تعریف خارجہ پالیسی دوسری مملکتوں کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے برخلاف مصلحت اور بد دیانتی پر مبنی پالیسی' دوسرے دوست ملکوں کے ساتھ تعلقات میں کسی مملکت کی نیک نامی پر ناخوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ اگر پاکستان کی پالیسیاں یکساں' اخلاقی اور ارفع قسم کی رہیں تو ایسے رویہ اور طور طریقے سے دوسری مملکتوں کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

اس طرح پاکستان کے لئے یہ ممکن العمل اور بلاشبہ مناسب ہے کہ وہ دونوں عظیم طاقتوں اور نیم عظیم طاقتوں سے مکمل طور پر قابل فہم درجہ بندی کی بنیاد پر لیکن دباؤ اور کھچاؤ کے بغیر دو طرفہ تعلقات برقرار رکھے۔ دو طرفہ تعلقات کو مفید بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ یکساں ہوں اور دوسرے ملکوں سے

www.bhutto.org

تعلقات پر اثر انداز نہ ہوں........... دو طرفہ تعلقات کی شرائط کسی طور پر بھی متناقض نہ ہوں اور نہ ہی وہ دوسری عظیم مملکتوں کے ساتھ دو طرفہ تعلقات کی حد اور امکان کو ختم کر دیں۔

15 اپریل 1966ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان اور نیوکلیائی افزودگی

نیوکلیائی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کے روکنے کے لئے غیر ایٹمی ممالک کی کانفرنس کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد کا دفاع کرتے ہوئے وزیر خارجہ مسٹر پیرزادہ نے کئی جواب طلب باتیں کہہ دی ہیں۔

مسٹر پیرزادہ نے اپنے بیان میں مختلف ڈھنگ سے تین مقامات پر اس قرارداد کو ملنے والی "وسیع حمایت" پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ فی الحقیقت جس قرارداد پر برطانیہ کے علاوہ تمام ایٹمی طاقتوں سمیت 56 ممالک رائے دینے سے احتراز کریں اسے "وسیع حمایت" کی حامل قرارداد نہیں کہا جا سکتا۔

اقوام متحدہ کے طریقہ کار سے باخبر اشخاص سمجھتے ہیں کہ ایسی صورتوں میں رائے دہی سے احتراز کو قرارداد کی مہذب مخالفت پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس قرارداد کو ملنے والی حمایت کو ایک زیادہ تیکھی کسوٹی پر بھی پرکھا جا سکتا ہے۔

روزنامہ "ڈان" کے نمائندہ مقیم نیویارک کے مطابق حال ہی میں اس کانفرنس کے لئے جو تیاری کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اس میں یورپ کے غیر جانبدار ممالک مثلاً آسٹریا اور سویڈن نے بھی شرکت سے انکار کر دیا ہے۔

ہم ان ممالک کے رویے پر بھروسہ کرتے ہوئے نچنت نہیں رہ سکتے جو اپنے ہمسایہ ممالک کی طرف سے نیوکلیائی خطرے سے محفوظ ہیں اور جن کے لئے نیوکلیائی قیامت بہت دور کی کہانی معلوم ہونی چاہئے۔

پاکستان کا معاملہ قطعی مختلف ہے کیونکہ ہمارے لئے نیوکلیائی خطرہ بہت حقیقی ہے اور رگِ جاں سے بھی قریب معلوم ہوتا ہے۔

اصل اہمیت غیر ایٹمی ممالک کی حمایت کو نہیں بلکہ ایٹمی طاقتوں کے رویّے کو حاصل ہے۔ ایٹمی طاقتوں کا رویّہ اور عمل نیوکلیائی افزودگی کے لئے فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔

برطانیہ کے استثنیٰ کے ساتھ ' چین نے سمجھ میں آنے والے اسباب کی بنا پر اس قرارداد کی حمایت کی۔ دیگر تمام ایٹمی طاقتوں نے قرارداد پر رائے دینے سے احتراز کیا۔ چین جو پانچویں ایٹمی قوت اور اقوامِ متحدہ کے دائرے سے باہر ہے ' بارہا نیوکلیائی افزودگی پر پابندیوں کو ایٹمی اجارہ داری کا ذریعہ قرار دے کر اس کی مذمت کر چکا ہے۔

ہمارے اپنے خطے میں بھارت مبینہ طور پر ایٹمی طاقت بننے کے بہت قریب ہے۔ اس قرارداد کے حوالے سے بھارت واحد ملک ہے جس کا رویّہ پاکستان کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ بھارت نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔ چنانچہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کسی عمیق تفکر کی ضرورت نہیں کہ پاکستان کی حد تک ' اس قرارداد کے لئے ایٹمی "کنگالوں" کی حمایت بے معنی ہے۔

فی الحقیقت ' برطانیہ کے علاوہ دیگر ایٹمی طاقتوں اور بھارت کی طرف سے ' قرارداد کی مخالفت کے باعث اس سفارتی مشق کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ فیصلہ کن اہمیت کی حامل طاقتوں کی بے اعتنائی کے باعث اس قرارداد کو ادھر ادھر سے ' ہر غیر اہم حلقے سے ملنے والی "وسیع حمایت" بے معنی ہو کر رہ گئی۔

مسٹر پیرزادہ نے دلیل دی ہے کہ یہ قرارداد محض ایک کانفرنس بلانے کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے ذریعے پاکستان کو کسی سمجھوتے کا پابند نہیں کیا گیا۔ اقوامِ متحدہ میں جموں و کشمیر پر مسٹر کرشنا مینن کی طویل طویل تقاریر کے دعاوی کے علی الرغم کسی قرارداد کی منظوری کا مفہوم اتفاق رائے ہی لیا جاتا ہے۔ چلئے ' ہم ایک لمحے کے لئے مسٹر پیرزادہ اور مسٹر مینن سے اتفاق کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اس خاص معاملے میں قرارداد سمجھوتے کا مفہوم نہیں رکھتی۔ اس کے باوجود اس کانفرنس کا مقصد ایک سمجھوتے کا خاکہ لئے ہوئے ہے جس کے لئے پاکستان نے خود کو پابند کر لیا ہے جبکہ بھارت نے ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کی۔

اطلاعات کے مطابق اصل کانفرنس تقریباً دو سال کے عرصے میں منعقد ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ اجتماع منعقد ہوگا غالباً بھارتی ایٹمی دھماکے کے باعث برِصغیر کا افق تابکاری کے بادلوں کی لپیٹ میں ہوگا۔ ایسے گھمبیر حالات میں پاکستان نیوکلیائی افزودگی پر پابندی کے معاہدے پر گفت و شنید میں مشغول ہوگا۔

مسٹر پیرزادہ نے قرارداد کا دفاع کرتے ہوئے اس تقریر کا حوالہ دیا ہے جو میں نے جنرل اسمبلی میں کی تھی۔ مسٹر پیرزادہ کے مطابق ' میں نے جنوری 1965ء میں جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس سارے مسئلے پر تفصیلی غور و فکر کے لئے ایک بین الاقوامی کانفرنس بلائی

www.bhutto.org

جائے جس میں ان ممالک سمیت، جو اقوام متحدہ کے رکن نہیں ہیں یا جنہیں اقوام متحدہ میں نمائندگی حاصل نہیں ہے، تمام ممالک کو شریک کیا جائے۔ یہ کانفرنس، ایسے سخت اقدامات تجویز کرے جن کے ذریعے غیر ایٹمی ممالک کو نیوکلیائی ہتھیار تیار کرنے یا حاصل کرنے سے روکا جاسکے۔

مسٹر پیرزادہ کی قانون کے شعبے سے طویل وابستگی کے پیش نظر، ان کے لئے تمام ممالک کا احاطہ کرنے والی میری تجویز اور حالیہ محدود قرارداد کا بنیادی فرق سمجھنا دشوار نہیں ہونا چاہئے۔ میری تجویز کا عملی حصہ دنیا کے تمام ممالک کی شرکت پر محیط ہے۔ ایٹمی افزودگی کو روکنے کی صلاحیت رکھنے والی طاقتوں سمیت، دنیا کے تمام ممالک کی کانفرنس اور ایٹمی ہتھیاروں کو روکنے کی استطاعت سے بے بہرہ ممالک کے اجتماع میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اس معاملے کی کنہ یہ ہے کہ نیوکلیائی افزودگی کی تحدید کی صلاحیت صرف ایٹمی طاقتوں کے پاس ہے۔ چنانچہ ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر پابندی، نیوکلیائی افزودگی کی تحدید اور بالآخر تمام نیوکلیائی ہتھیاروں کے خاتمے کے ضمن میں بین الاقوامی معاہدے کی اصل ذمہ داری نیوکلیائی طاقتوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نیوکلیائی افزودگی کی تحدید کے معاہدے میں تمام نیوکلیائی طاقتوں کی شرکت کا مطالبہ کیا تھا۔

اس حقیقت کا اعادہ بے جانہ ہوگا کہ صرف موجودہ نیوکلیائی طاقتیں ہی مؤثر طور پر نیوکلیائی افزودگی کی تحدید پر قادر ہیں۔ دوسری صورت میں ماضی کی طرف نیوکلیائی ہتھیاروں کی تعداد بدستور بڑھتی رہے گی۔ اگر نیوکلیائی افزودگی کی تحدید کے اصول کی حمایت کریں اور دوسری طرف نیوکلیائی صلاحیت کے حصول میں اسرائیل اور بھارت کی سرگرم حمایت کریں تو اس ساری مشق کا مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔

اگر پاکستان میری 1965ء والی تجویز کے مطابق نیوکلائی طاقتوں سمیت تمام ملکوں کی کانفرنس بلانے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے حقیقی معنوں میں اطمینان بخش صورتحال کہا جاسکتا تھا۔ اگر ہمیں توصیفی کلمات ہی ادا کرنا ہیں تو موجودہ مشق کو بے مقصد کامیابی کہا جاسکتا ہے۔ سفارتی رکھ رکھاؤ سے قطع نظر مجوزہ قرارداد کو صرف ایسے ممالک سے پذیرائی مل سکے گی جن کے لئے حقیقی معنوں میں نیوکلیائی خطرے کا کوئی وجود نہیں یا پھر ایسے ممالک اس قرارداد پر بغلیں بجائیں گے جو نیوکلیائی اجارہ داری کے لئے نیوکلیائی افزودگی کی تحدید چاہتے ہیں۔

پاکستان کو غیر معمولی مشکل کا سامنا ہے۔ اگر کوئی قرارداد بھارت کو نیوکلیائی صلاحیت کے حصول سے باز نہیں رکھتی لیکن اس اہم ترین شعبے میں ہماری آزادیٔ عمل پر بندشیں عائد کرتی ہے تو اس قرارداد پر ہماری طمانیت شک و شبہ سے بالا نہیں کہی جاسکتی۔

کمیتی اعتبار سے، پاکستان کے لئے ہندوستان کا مقابلہ کرنا ہمیشہ دشوار ہوگا تاہم کیفیتی اعتبار سے ہم نے ماضی میں ایک توازن حاصل کیا تھا اور ہمیں اپنی بقا کے لئے مستقبل میں اس توازن کو برقرار رکھنا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وزیر خارجہ اور ایٹمی توانائی کے نگرانی وزیر کی حیثیت سے میں نے کچھ عرصہ قبل قوم کو خبردار

www.bhutto.org

کہا تھا کہ اگر بھارت نے نیوکلیائی صلاحیت حاصل کر لی تھی تو پاکستان کو بھی بھارت کے نقش قدم پر چلنا پڑے گا خواہ اس کے لئے ہمیں گھاس ہی کیوں نہ کھانا پڑے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ میری طرف سے اس قرارداد کی مخالفت قومی مفاد اور سلامتی کے منافی نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ تنقید قومی مفاد میں ہے اور اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے۔ جنوری 1965ء میں میری تقریر اور میرے موجودہ طرز عمل میں کوئی تضاد نہیں۔

تاریخ کے کسی مناسب سنگِ میل پر وقت سفاک اور غیر جانبدار منصفِ وقت اپنے لب کھولے گا اور بغیر کسی شک و شبہے کے اپنا فیصلہ سنائے گا۔

29 دسمبر 1966ء۔ لاڑکانہ

www.bhutto.org

پاک چین دوستی کی سیاسی بنیادیں

1962ء سے چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات پہلے کی نسبت بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اس کے باعث امریکہ میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں کیونکہ اس نے ان تعلقات کے جواز کو بہت توڑ مروڑ کر دیکھا ہے۔ پاک چین تعلقات محض اس بات پر منحصر نہیں کہ ان دونوں ملکوں کے بھارت کے ساتھ اختلافات ہیں۔ یہ بات اہم ہونے کے باوجود' اس جواز کا صرف ایک جز ہے۔ چین پاکستان کا ہمسایہ ہے اور ہمارے لئے لازم ہے کہ اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور برابری کی بنیاد پر خوشگوار تعلقات قائم رکھیں۔ دونوں ملکوں میں کسی طرح کے علاقائی یا دوسرے جھگڑے بھی نہیں ہیں جو اختلاف کو ہوا دیں۔ جب سے چین میں انقلاب آیا ہے اس کے قائدین نے پاکستان کے ساتھ معروف تعلقات قائم کرنے کی مخلصانہ کوششیں کی ہیں۔ بنڈونگ کانفرنس کے دوران وزیر اعظم چواین لائی نے پاکستان کے وزیر اعظم کو یقین دلایا تھا کہ چین پاکستان کے ساتھ خوشگوار تعلقات کا خواہش مند ہے۔ یہ بات پاکستان کے لئے معیوب ہوتی کہ وہ ایک طاقتور ہمسایہ ملک کی جانب سے بڑھتے ہوئے دوستی کے ہاتھ کو جھٹک دیتا ۔ چین کو ایشیا میں جو مقتدر مقام حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا' پاکستان ایک ایشیائی مملکت ہے جس کا مقدر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوسری ایشیائی مملکتوں سے وابستہ ہے اور پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے تاکہ ایشیائی اتحاد کو تقویت ملے۔ افریشیائی اقوام کی جمعیت کے ارکان کی حیثیت سے ہمارے ملکوں کا مشترکہ مفاد ہے کہ افریشیائی استحکام کو فروغ دیں.......... اور

www.bhutto.org

اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھیں۔ چین اور پاکستان دونوں اقتصادی طور پر پسماندہ ہیں اور ان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے ملکوں سے تعاون چاہیں تاکہ بین الاقوامی طور پر بہتر تجارتی شرائط پر لین دین کر سکیں اور پسماندہ اقوام کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں، ترقی یافتہ اقوام سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکیں۔ شروع ہی سے چین نے تقسیم فلسطین کے مسئلے پر نہایت منصفانہ موقف اختیار کر رکھا ہے اور اسرائیل کے برخلاف عربوں کی حمایت کر رہا ہے۔ یہ حمایت وہ پاکستان کے موقف سے ہم آہنگ ہے اور یہ بات اس وقت فیصلہ کن انداز میں سامنے آگئی جب 1967ء میں اسرائیل نے عرب ممالک پر دھاوا بولا اور چین نے ڈٹ کر عربوں کا ساتھ دیا۔ پاکستان اور دیگر افریشیائی مملکتوں کی طرح چین نے بھی جنوبی افریقہ اور جنوبی روڈیشیا کی نسلی پالیسی اور حد بندی کی شدید مذمت کی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کی واشگاف تائید کی ہے 'اور یہ ایک بات' دوسری سب باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو' پاکستان کے لئے ایسی کشش رکھتی ہے کہ وہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو دل و جان سے خوش آمدید کہے۔

ایک پسماندہ ملک کے طور پر پاکستان کی فطری خواہش ہوگی کہ اقوام متحدہ کی اصلاح ہو تاکہ کمزور اقوام کے مفادات کے تحفظ کا سامان کیا جا سکے۔ لیکن یہ بات اس وقت تک ناقابل تصور ہے جب تک اس میں عوامی جمہوریہ چین کو شامل نہیں کیا جاتا جو ایک ایسی عظیم طاقت ہے کہ سلامتی کونسل اس کے بغیر نامکمل ہے۔ امریکہ اور روس جیسی عالمی طاقتیں یہ کوشش کر رہی ہیں کہ بھارت اور پاکستان جیسے ممالک اپنی اپنی جگہ فوجوں میں خطرناک حد تک کمی کر دیں۔ مگر یہ عالمی طاقتیں ایٹمی ہتھیاروں کی اجارہ داری کو جوں کا توں رکھنا چاہتی ہیں۔ اس کے بجائے اقوام متحدہ کو بین الاقوامی سطح پر اسلحے کی مکمل اور عمومی تخفیف کا اہتمام کرنا چاہئے جس سے تباہی کا خطرہ ٹل جائے۔ اگر امن کے لئے ضروری ہے کہ دنیا غیر مسلح ہو جائے اور بین الاقوامی سطح پر تخفیف اسلحہ کی دیانتدارانہ کوششوں کی حوصلہ افزائی مقصود ہے تو تخفیف اسلحہ کی گفت و شنید میں چین کی شرکت ناگزیر ہے۔ ستر کروڑ عوام کی اس قوم کے قبضے میں ایٹمی ہتھیار بھی ہیں۔ اسکا تعاون حاصل کئے بغیر مکمل تخفیف اسلحہ کی کشتی کبھی پار نہیں لگ سکتی۔ ان تمام واشگاف حقائق کی روشنی میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ چین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات کا محرک مثبت عوامل ہیں نہ کہ کسی دوسرے ملک .... بھارت .... کی مخالفت میں کام آنے والے وقتی ٹوٹکے۔

ایک ہوائی یہ اڑائی گئی ہے کہ پاکستان اور چین کے اساسی نظریئے باہم متضاد ہیں لہٰذا دونوں کے درمیان دوستی کا پائیدار رشتہ جاری و ساری نہیں رہ سکتا۔ یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ چین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات چونکہ داخلی نوعیت کے ہیں اس لئے وہ وقت کی مار نہیں سہ سکیں گے۔ یہ دلائل نہایت بودے ہیں۔ مملکتوں کا تعلق مملکتوں سے ہوتا ہے' ان کے سماجی نظاموں یا اساسی نظریوں سے نہیں ہوتا۔ اگر اس طرح کی بودی دلیل کو اس کی منطقی انتہا تک لے جائیں تو پاکستان کو صرف مسلمان مملکتوں سے رابطہ رکھنا چاہئے اور بقیہ دنیا سے کنارہ کش ہو جانا چاہئے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک

www.bhutto.org

سیاسی طاقت کے اعتبار سے اسلام نے دوسروں کی نسبت عیسائی مملکتوں کے ہاتھوں کہیں زیادہ زک اٹھائی ہے۔ یہ عیسائی دنیا ہی تھی جس نے اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کا محاذ کھولا اور یہ عیسائی اقوام ہی تھیں جنھوں نے صدیوں تک قریب قریب تمام مسلم مملکتوں کو سامراج کے شکنجے میں کس کر ان کے سماجی اور اخلاقی تار و پود کو اس حد تک درہم برہم کر دیا کہ دنیائے اسلام ابھی تک اس جان لیوا صدمے سے پوری طرح سنبھل نہیں پائی۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی نے کہا ہے

> "کیمونزم کے چرچے سے صدیوں پہلے ہمارے آباؤ اجداد کے نزدیک اسلام ہی ساری خرابی کی جڑ تھا۔ چھٹی صدی کی بات ہے 'اہل مغرب کے دل میں اسلام کے نام سے اسی طرح کا ہیجان (ہسٹریا) ابھرتا تھا جیسا آج بیسویں صدی میں کیمونزم کا نام سن کر ابھرتا ہے اس کی وجہ بنیادی طور پر ایک ہی تھی۔ کیمونزم کی طرح اسلام بھی ایک " مغرب دشمن " تحریک کے طور پر سامنے آیا تھا جسے دین مغرب (عیسائیت) کی ایک بدلتی شکل گردانا جاتا تھا اور کیمونزم کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی ایک روحانی تلوار تھی جس سے پناہ لینے کے لئے مغرب کے مادی اسلحہ خانے میں کوئی ڈھال نہ تھی۔"

چین سے مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق نہیں کہ جس طرح عیسائیوں نے غرناطہ پر قبضہ کر لیا تھا اسی طرح وہ ہمارے کسی شہر پر پنجے گاڑ دے گا یا عیسائیوں کی طرح مسلمان مملکتوں سے بیت المقدس ہتھیا لے گا۔ ہمارے تعلقات بنڈونگ کانفرنس میں طے شدہ اصولوں پر اور عدم مداخلت کے تصور پر مبنی ہیں۔ اسلام کے صحیفوں میں کہیں نہیں لکھا کہ اگر غیر اسلامی مملکتوں کے ساتھ دوستی کو فروغ دیا گیا تو اس سے ہمارے تشخص یا امتیاز پر کوئی حرف آجائے گا۔

پاکستان کے عوام ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے تک مغربی استبداد کا شکار رہے ہیں۔ اس کے باوجود پاکستان نے تمام مغربی مملکتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ خصوصی تعلقات بنائے ہیں ان گہرے روابط نے پاکستان کے عوام کی دینی قدروں کو واغدار نہیں کیا۔ اس تکلیف دہ حقیقت کے باوجود کہ مغربی طاقتوں نے طاقت کے بل پر ہمارے معاملات میں دخل اندازی کی روش جاری رکھی 'وطن عزیز نے اپنے اسلامی کردار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر پاکستان کا سیاسی اور سماجی ڈھانچا مغربی ثقافت اور تہذیب کے تھپیڑے سہہ سکتا ہے تو یہ کسی دوسرے نظریئے کے مقابلے میں بھی استقامت کا مظاہرہ کر سکتا ہے' خاص طور پر ایک ایسے ملک سے تو اسے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا جس نے نہ تو کبھی ہم پر اپنے نظریات ٹھونسے ہیں اور نہ کبھی ہمارے معاملات میں ٹانگ اڑائی ہے۔ جب روس اور امریکہ کے تعلقات مخاصمانہ تھے تو روس کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوششوں کی آج ہی کی طرح شدید مخالفت کی گئی تھی اور جب ان دو بڑی طاقتوں کے تعلقات بہتر ہوئے تو اس وقت کہیں جا

www.bhutto.org

کر یہ مخالفت نرم پڑ گئی تھی۔ جب امریکہ اور چین کے تعلقات بھی حقیقت پسندانہ رخ اختیار کریں گے تو چین کے ساتھ پاکستان کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں امریکہ کا رویہ نرم پڑ جائے گا۔ اگر پاکستان آج چین کے خلاف کوئی اشتعال انگیز اقدام کر گزرتا ہے تو اسے اس وقت نہایت خجالت اٹھانی پڑے گی جب امریکہ اور چین کے تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔ ہم اسی طرح پیچھے رہ جائیں گے جیسے روس کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کے سلسلے میں ہم بھارت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اگر اس طرح قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان واقع ہو جائے گا۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ پاکستان چین کے ساتھ نہ صرف دوستانہ تعلقات کو استوار کرتا چلا جائے بلکہ ان تعلقات میں رخنہ اندازی کی ہر کوشش کو ناکام بنا دے۔ امریکہ کی عالمی روش سے یہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بالآخر چین سے تعلقات قائم کرنا چاہے گا۔ اگر یہ بات نہ ہو تب بھی پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی اپنے ضمیر دارانہ مفادات کی بنیاد پر استوار کرنی چاہئے اور بڑی طاقتوں کی ہنگامی عالمی ضروریات سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔

ترجمہ: محمد حنیف رامے۔ 1969ء

www.bhutto.org

آر۔ سی۔ ڈی چیلنج اور جواب

ازمیر کانفرنس ایران ترکی اور پاکستان کے لیڈروں کے لئے ان اُمور پر تبادلۂ خیالات کا بہترین موقع فراہم کرے گی، جو اس سال کے دوران مختلف مقامات پر زیر بحث آتے رہے ہیں۔ ان ملکوں کے تعلقات اتنے واضح پُرجوش اور دوستانہ ہیں کہ اس میں کسی قسم کا تعصب کار فرما نہیں۔ ہم اپنے سارے سیاسی فوجی' معاشی گردوپیش کا جائزہ لے کر ان پر نظر ثانی کرتے رہے ہیں۔ یہ سروے جاری ہے تاہم عالمی حقائق کے پیش نظر ازمیر کانفرنس سے کوئی ڈرامائی یا زبردست نتائج کا خیال دل میں نہیں لایا جا سکتا۔ تہران میں تینوں ملکوں کے وزرائے تجارت میں جو مذاکرات ہوئے ہیں ان کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم آج میں صرف کل کی کانفرنس کے ہی بارے میں کوئی غور نہیں کر رہا۔ میں کوئی منطق یا فلسفہ لے کر ازمیر نہیں جا سکتا تاکہ واپس آکر ڈپلومیسی کی نئی راہوں پر عمل کروں۔ میں اس کانفرنس میں اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو پیش کرنے نہیں' تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ میرے خیالات فوری امکان تک محدود نہیں بلکہ تاریخ کے دھاروں کی روشنی میں ان ملکوں کے تعلقات کو آگے بڑھانے میں مرکوز ہوں گے۔ اس عہد ساز دور میں اقوام عالم ایک چوراہے پر کھڑی ہیں۔ میں اپنے احساسات کو چھپا نہیں سکتا' میری خواہش ہے کہ میں اپنے خیالات اپنے ہم وطنوں کے آگے پیش کر دوں۔

ایران' پاکستان اور ترکی کی تہذیب ایک ہے۔ ان کی ثقافتوں پر ایک مشترکہ مذہب کی چھاپ ہے۔

www.bhutto.org

ان کا تاریخی پس منظر ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ ان کی زبانیں گواہ ہیں کہ ان کے خیالات بھی یکساں ہیں۔ ان کے آرٹ اور ادب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان کے معاشرے کی قدریں ایک جیسی ہیں در اصل ان کے تہذیب و تمدن کی ہم آہنگی' اس ہم آہنگی سے کہیں زیادہ ہے جس کا مغربی قومیں اپنے بارے میں فخریہ دعویٰ کرتی ہیں۔ یہ ثقافتی بھائی چارہ بعض تاریخی' معاشی اور سیاسی اسباب کی بنا پر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ مغربی یورپ کے ملکوں کے برعکس ہم میں سے کسی بھی دو ملکوں نے کسی بھی ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کی۔ ماضی قریب کی ایسی کوئی تلخ یادیں نہیں جنہیں بھولنے کی ضرورت ہو اور نہ ہی ہماری ترقی پذیر معیشتوں پر کوئی رقابت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی ایسی چپقلش جو صنعتی ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے تحفظ کے مسائل اور سلامتی کی ضرورتیں یکساں ہیں۔ کیونکہ ہمیں ایک ہی قسم کے حقیقی یا ممکنہ چیلنج کا سامنا ہے' اور آخری بات یہ کہ آج بہت سے لوگوں کو یاد ہو گا کہ تینوں ملک جارحیت کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ترکی پر پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں حملہ ہوا۔ اس کے بڑے حصے پر قبضہ کیا گیا اور 1974ء میں ناقابل برداشت حد تک دباؤ ڈالا گیا۔ ایران پر بھی دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد حملہ ہوا' اور اس کے کئی علاقوں پر غیر ملکی قبضہ ہوا۔

پاکستان کو 1947ء سے تین بار جنگوں میں گھسیٹا گیا جس کی امداد غیر ملکی طاقتوں نے کی اور آخر کار اس کا مشرقی بازو اس سے کٹ گیا۔ ان تمام عوامل نے ان تینوں ملکوں میں عوامی سطح پر ایک برادرانہ جذبہ پیدا کر دیا ہے اور یہ ہم آہنگی آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے' ان کی ایک سمت خود بخود طے ہو گئی ہے۔ کیا اب یہ تینوں ملکوں کی قیادت کا اخلاقی فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے عوام کے برادرانہ جذبات کو اتنا مربوط کر دیں کہ وہ آج کے دور کے ہر دباؤ کا مل کر مقابلہ کر سکیں؟ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا اور علاقائی اتحادوں کی بدلتی نوعیت میں ہمارا کیا مقام ہے؟

اب ہم ایسے عہد میں داخل ہو گئے ہیں جبکہ 1950ء اور 1960ء سے مختلف اصطلاحیں استعمال ہونے لگی ہیں۔ بھرپور ایٹمی جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہی (Super Power) سوپر پاورز کے تعلقات 1950ء کی دہائی میں سرد جنگ کے بجائے بقائے باہمی کی طرف لوٹنے اور اب 70ء کی دہائی میں اس کو (De tente) یعنی باہمی مفاہمت اور صلح جوئی کا نام دیا گیا ہے۔ (De tente) خاصا ٹیڑھا مسئلہ ہے "سپر پاورز" کے معاملے میں تین عناصر نمایاں ہیں۔ تعاون' مسابقت اور تصادم۔ مستقل یا عارضی ہر عنصر بدلتی ہوئی صورت حال میں سامنے آتا ہے لیکن بین الاقوامی امور کے وسیع تر میدان میں (Detente) دنیا کے بیشتر ملکوں کے کسی کام کا نہیں۔ اگر اس کا مقصد صرف فوجی شعبے میں مسابقت کو کنٹرول کرنا ہو اور سیاسی طور پر محتاط رہا جائے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کرے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں بحران نہ پیدا کئے جا سکیں اور پھر ان سے "سپر پاورز" کے حق میں کام لیا جائے اور نہ ہی سپر پاورز کے حلقہ بگوشوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ چھوٹے ملکوں کو اپنی ہم نوائی پر مجبور نہ کیا جائے۔ لیکن چونکہ اب تک ایسا نہیں ہوا ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس پُر آشوب دور میں کسی کا پلڑا

www.bhutto.org

بھاری ہے اور کسی کا کمزور۔ کہیں علیحدگی ہے کہیں کسی پر مکمل انحصار، کہیں بقائے باہمی ہے تو کہیں محاذ آرائی۔ اس نئے (Detente) کو ہر قسم کے معنی پہنائے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے بین الاقوامی تعلقات پر طاقت کے مراکز کا اچھا اثر پڑے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بعض ان علاقائی طاقتوں کو بھی دوسروں پر اقتدار جمانے کا شوق چرائے جو ایٹمی طاقتوں اور سپر پاورز جیسی احتیاط کی پابند نہیں۔ نتیجہ یہ کہ استحکام اور انتشار میں بال برابر کا ہی فرق رہ جاتا ہے۔ اس لائن کو پار کر کے کوئی بھی فوج گردی کی شوقین علاقائی طاقت جس کو یقین ہو کہ اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی، توازن کو تباہ کر سکتی ہے۔ ایک دفعہ کسی نے نہ پوچھا تو یہ طاقت جب چاہے گی ہمسایہ ممالک پر چڑھ دوڑے گی۔ خود اپنی مرضی سے یا کسی کے کہنے پر۔

آج کے دور کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ امن و سکون کی بہت پتلی سی سطح کے نیچے کشیدگی اور کشاکش دکھائی دے رہی ہے۔ (ہیلسنکی) (Helsinki) کانفرنس نے یورپ میں ان علاقوں کی نشاندہی کر دی ہے جن پر سب متفق ہیں لیکن اس کانفرنس کے فوراً بعد ہی اس کی مختلف حلقوں میں مختلف تاویلات شروع کر دیں۔ ہر کوئی اپنے لئے زیادہ سے زیادہ زیر اثر علاقوں کی باتیں کرنے لگا۔ بہرحال دوسرے علاقوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ان میں تصادم ہو یا جوابی حملے یا باہمی افہام و تفہیم ہو یا سپر پاورز کا متوازی اقتدار و اثر۔

خود یورپ کی صورت حال . بالکل واضح نہیں۔ جہاں کسی وقت بھی نامعلوم جگہ پر بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ طے یہ ہے کہ روس اور مشرقی یورپ کے تعلقات قدرتی یعنی دوستانہ ہوں گے۔ مگر یہاں بھی اختلافات ابھرتے رہتے ہیں۔ مغربی حلقہ اثر کے ( ) ممالک میں سے بعض میں کمیونسٹ برابر اپنے حصے کی طاقت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ ایک امریکن مدبر سابق نائب وزیر خارجہ نے کہا کہ یہ تحریک جاری رہے گی۔ دوسری طرف امریکی وزیر خارجہ نے اس صورت حال کو ناقابل برداشت قرار دیا ہے کیونکہ اس طرح ( ) کے استحکام اور ممبر ملکوں کے مشترکہ دفاع پر برا اثر پڑے گا انہوں نے کہا کہ یورپ میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کا امریکی وعدہ گو اصول اور جغرافیائی حقائق پر تھا لیکن نئی صورت میں وہ اخلاقی جواز ختم ہو جائے گا جو تیس سال سے موجود رہا ہے۔ امریکی وزیر خارجہ نے کہا کہ اس طرح "میثاق اوقیانوس" میں نقطہ انقلاب کا آغاز ہو جائے گا۔ اس میثاق پر بحیرہ روم کے خطے میں جو اثرات پڑ رہے ہیں انہیں بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے خطوں کی تو کیا بات ہو خود یورپ، جو سب سے پختہ کار اور بالغ نظر خطہ ارض سمجھا جاتا ہے وہاں ایسے سوالات پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں سوجھتا۔ مشرق وسطیٰ بدستور دنیا کی شدید ترین کشیدگی کا علاقہ بنا ہوا ہے۔ اس کا تجزیہ کرنے کے لئے یہی کہہ دینا کافی نہیں کہ وہاں قیام امن کی کوششیں سست پڑ گئی ہیں بلکہ وہاں پر دوسرے بھی بہت سے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں مصر کی صورت حال پر مغرب کا ردِعمل، لبنان کی طویل خانہ جنگی، صحرا کا جھگڑا، اسرائیل کی طرف سے ایٹمی خطرہ اور خود عربوں سے نااتفاقی شامل ہیں۔ عرب اتحاد میں جو کمزوری پیدا ہو گئی ہے اس پر میں

www.bhutto.org

بہت تشویش کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ اگر اسرائیل خطرے کے باوجود عرب متحد نہ ہوئے تو پوری تیسری دنیا کا مستقبل تاریک ہو گا۔ امن کے توازن کو شدید ترین نقصان پہنچے گا۔ تاریکی چھا جائے گی۔ لہٰذا مشرقِ وسطیٰ ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری سنجیدگی اور حقیقت پسندی سے غور کر کے اس سے نمٹنا ہو گا۔ ویت نام کی جنگ کے بعد مشرقی ایشیا ایسا خطہ ہے جہاں بعض طاقتیں مکمل تبدیلی جلد یا بدیر لا سکتی ہیں وہاں ایک تیسری کیمونسٹ طاقت ابھرنے کے علاوہ کچھ ایسے عوامل بھی ہیں جنہیں ایک خطے تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ خطہ چین اور جاپان کے جنوب کا علاقہ ہے اور جنوبی ایشیائی برصغیر تک پھیلا ہوا ہے۔

افریقہ میں بھی ابھی تک حالت ڈانواں ڈول ہے۔ جنوبی افریقہ میں سفید فاموں کے بچے کھچے حکمران اب تک موجود ہیں۔ وہ ایٹمی طاقت بننا چاہتے ہیں قوم پرست اور تحریکِ آزادی کے افریقیوں کے وسائل محدود ہیں اس لئے انگولا کی طرح غیر ملکی مداخلت کی ضرورت پڑی۔ افریقی ممالک مشترکہ مقاصد پر باہم متفق نہیں ہو سکے۔ افریقی ادارہ آپس کے اختلافات ختم نہیں کرا سکتا۔ بالکل ایسے جس طرح عرب ادارہ عربوں کے اختلافات ختم نہیں کرا سکا۔ واضح رہے کہ افریقہ کی صورت حال میں بہت گڑبڑ پائی جاتی ہے۔ لاطینی امریکہ پر نظر ڈالیں تو وہاں بعض لوگوں کے کہنے پر حکومتیں مسلط کی جاتی ہیں اور بر سر اقتدار لائی جاتی ہیں۔ ایسے علاقے میں دوسرے کے ساتھ تعلقات بھلا کیسے متعین کئے جا سکتے ہیں۔ یہ دور ایسا نہیں کہ جس میں کالے اور سفید کی صرف باتیں کی جائیں اس میں اخلاقیات کی خانہ بندی نہیں ہو سکتی۔ اس میں لچک کی ضرورت ہے یہ تبدیلیوں کا دور ہے۔ روزمرہ تبدیلیوں کی رعایت سے متحرک قومیں اپنی پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائیں۔ حرکت میں برکت ہے ایک ریاست دوسری کے ساتھ اپنی دوستی ختم نہیں کرتی بشرطیکہ یہ تیسری مملکت کے ساتھ تعلقات میں لچک رکھتی ہو۔

ایران، پاکستان اور ترکی کی بدلتی ہوئی سیاسی اور فوجی حقیقتوں کے پیشِ نظر بہت ضرورت محسوس ہو گی کہ ہم ان پالیسیوں پر نظر ثانی کریں جن پر ہم اب تک عمل پیرا رہے ہیں۔ وقت ہمیشہ ہمارے لئے سازگار اور ٹھہرا ہوا نہیں رہے گا اگر ہم نے آنے والے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے وسائل کو زیادہ سے زیادہ یکجا کرنے کی کوشش کا وقت ضائع کر دیا تو وقت ہمارے قومی ورثوں اور امنگوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا اگر ہمارے وسائل منتشر رہے تو پھر ہم ایک خیال کو ٹھوس حقیقت نہیں بنا سکتے۔ شاعری کو سیاست میں نہیں بدل سکتے اور رومانس کو حقیقت میں تبدیل نہیں کر سکیں گے۔ میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ یہ ایک عظیم نقصان ہو گا۔ ناقابلِ تلافی نقصان۔ یہ نقصان ہمارے اور دوسری قوموں کے لئے ہی نہیں ہو گا بلکہ ساری دنیا میں امن و ترقی کی طاقتوں کا نقصان ہو گا۔ ایسی صورت میں یہ کرنا ہو گا کہ ہر ملک کو انفرادی سطح پر عالمی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے تعلقات کو از سرنو متعین کرنا ہو گا۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہی نہیں بلکہ وسیع تر سطح پر۔

ہم سینٹو (Cento) اور آر سی ڈی میں شامل رہے ہیں۔ ہم ایسی رتھ پر سوار رہے ہیں جسے تین گھوڑے کھینچتے رہے ہیں۔ لیکن چلتے رہے دو پہیوں پر۔ گزشتہ ربع صدی کی سیاسی معاشی اور فوجی زمین

www.bhutto.org

پر دونوں پہیوں میں سے کوئی بھی پوری طرح حرکت میں نہیں آیا۔ ان اداروں کی قدرتی صلاحیت کا جائزہ لے کر بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ یہ کہنا کسی پر حرف گیری کرنا نہیں ہے کہ سینٹو کا ادارہ کبھی ایران، ترکی اور پاکستان کا اجماع ثابت نہ تھا۔ گو اس سے ہمارے تین ملکوں کو باہمی رابطہ قائم کرنے کا اچھا موقع ملا تاہم اس کی بنیادیں ان عالمی حالات میں پیوست تھیں جو یکسر بدل چکے تھے۔ اس لئے اس کی ناکارکردگی بھی ظاہر ہے۔ ایک علاقائی ممبر پر دو مرتبہ حملے ہوئے مگر یہ ادارہ کوئی مدد نہ کر سکا اور جیسا کہ ہزمیجسٹی شہنشاہ ایران نے کہا کہ غیر ملکی فوجوں نے بین الاقوامی سرحدیں پار کر لیں اور سینٹو کا ادارہ محض دیکھتا رہا اس ادارے کی سب سے بڑی خرابی یہ رہی ہے کہ اس کے غیر علاقائی ممبروں نے کبھی علاقائی ممبروں کی اہمیت، ان کے مسائل اور ضروریات کو نہ سمجھا اور بحرانی حالات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے سوچا نہیں کہ اس کے دُور رَس اثرات کیا ہوں گے۔ ان غیر علاقائی ممبروں کی پالیسی علاقائی ممبر ممالک کی ضروریات کو سمجھنے سے یکسر ناکام رہی۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس پر جھگڑنا بے کار ہے۔

علاقائی اور غیر علاقائی ممبروں کے انداز فکر کے فرق کو مشاورتی ذریعے سے دور کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ متعلقہ مشینری بہت سست گام ہے اور اس کے تحت کسی ہنگامی حالت میں کوئی فوری کارروائی نہیں ہو سکتی۔ سینٹو کی ساخت کے اس نقص کے علاوہ حقیقت اور بھی اہم ہے جبکہ فوجی صورتحال بہت بدل چکی ہے، اس قسم کا ادارہ اور بے اثر ہو گیا ہے۔

تینوں ملکوں کے درمیان دوسرا ادارہ جاتی رابطہ آر سی ڈی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ادارہ بھی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ گذشتہ بارہ سال سے یعنی جب سے آر سی ڈی کا ادارہ قائم ہوا ہے اس کے مقاصد اور پروگراموں میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے یہ ادارہ آگے بڑھنے کی بجائے ابھی تک اپنے خول ہی میں ہے۔ ذمے دار لوگوں کو اگر بتایا جائے کہ آر سی ڈی کے مقاصد کیا تھے، امکانات کیا تھے اور کام کیا ہوا تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ اس ناکامی کا باعث کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم اس کے سیکرٹریٹ کو دوش نہیں دے سکتے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم سنجیدگی کے ساتھ علاقائی تعاون اور ترقی پر یقین رکھتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر کیا ہم سیاسی عزم کے ساتھ اس کو بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں؟

ہمارے دور کی زبردست تاریخی تبدیلیوں کا تقاضا ہے کہ سینٹو اور آر سی ڈی کے لئے نیا انداز فکر پیدا کریں۔ بہت سے مسائل کا آج یا کل سامنا کرنا ہو گا۔ سیٹو اور سینٹو کو ڈاکٹر کسنجر نے 1962ء میں وقتی قرار دیا تھا۔ اس کے بعد عالمی حالات نے دو قومی اداروں کے ڈھانچوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ نئے دور کے نئے تقاضوں کو سامنے رکھ کر سوچنا ہو گا۔ عالمی صورتحال فعالیت ہے۔ (Detente) کے الٹ پھیر، نیٹو (Neto) کی اپنی داخلی صورت حال۔ غرضیکہ تمام تبدیلیاں نئے انداز فکر کی متقاضی ہیں۔ اس نکتہ نظر کو پہلے سے کئے گئے دو طرفہ معاہدات کو نقصان پہنچائے بغیر اپنایا جا سکتا ہے۔ ان کو ختم کرنے سے انتشار پھیلے گا۔ جبکہ ضرورت اتفاق اور اتحاد کی ہے، اپنے فائدے کے لئے اور دنیا کے اپنے بہتر عزائم ثابت کرنے کے لئے پاکستان، ایران اور ترکی کو موثر اتحاد اور مضبوط نظام تعاون قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا ان

www.bhutto.org

ہمسایہ ملکوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا جو ہمارے ہم مذہب ہیں۔ ان کے مقاصد اور ان کی امنگیں ہمارے ہی جیسی ہیں اس سے کسی حلقے میں شک وشبہ پیدا نہیں ہو گا۔ اگر ہو گا تو وہ تو پہلے بھی تھا۔ مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں اس بارے میں جو شکوک تھے وہ پہلے ہی دور ہو چکے ہیں۔ اب تبدیل شدہ حالات میں آر سی ڈی بہت بڑے پیمانے پر تخلیقی تعمیری کام کر سکتی ہے۔ ان تینوں ملکوں کو اب کسی نئے میثاق کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ایسے ادارے کی ہے جو وقت کے تقاضوں کا جواب ثابت ہو اور علاقے کی سلامتی اور استحکام کا ضامن ہو۔ ترقی کی رفتار کو تیز تر کر سکے۔ یہاں انتشار پھیلا تو ایک سے زیادہ بر اعظم اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے اپنے آپ پر خود بھروسہ کرنا اور خود صلاحیت اس کام کے لئے بہت ضروری ہے۔ ہمیں دوسری طاقتوں پر انحصار کرنے کی پرانی عادت بھی ترک کرنی ہو گی۔ اپنی ضرورتیں خود پورا کرنے کے قابل بننے کی ضرورت ہے۔ غیر ممالک نے نازک وقت پر ضروری اشیا کی فراہمی بند کر کے ہمیں بہت مصائب میں گرفتار کیا ہے۔ ہمیں ان تجربات سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ ایک دوسرے پر انحصار کرنا ہمارے وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ "سپر پاورز" تک جن کے وسائل لامحدود ہیں' باہمی سلامتی اور معاشی انتظامات کے سمجھوتے کرتی ہیں۔ اس خطے کے لئے تو یہ اور بھی ضروری ہے' جس کے دفاع کو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ دوست ملک ایک دوسرے کی صنعتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ چودہ کروڑ آبادی کا ہمارا خطہ جو تین ملکوں پر مشتمل ہے ایک دوسرے کے ہاں سرمایہ لگا کر 'فنی سہولتیں بہم پہنچا کر' مشترکہ صنعتی منصوبوں کے ذریعے ایک انقلاب لا سکتا ہے ہر ملک کی ضرورت اس باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مغربی یورپ دو سپر پاورز کے درمیان توازن رکھنے کے لئے طاقت کا مرکز بننا چاہتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ معیشت کے اعتبار سے مغربی یورپ کے ممالک ایک سطح پر ہیں لیکن ترقی کے اس فرق نے انہیں معاشی طور پر مربوط ہونے اور سیاست میں اپنی پالیسیوں کو ہم آہنگ کرنے سے نہیں روکا۔

ایک اور اہم نکتہ ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس وقت غیر وابستہ ملکوں کی تعداد بیاسی ہے۔ اس میں ہر طرح کے ملک ہیں۔ اپنے اختلافات کے باوجود یہ ممالک عالمی سطح پر جمع ہو کر ہم آہنگی کے ساتھ اپنا تشخص اور مسائل پیش کرتے ہیں۔ اب اس گروپ نے سلامتی' سیاسی اور فوجی تعاون اور ہر ملک میں آزادی اور ہر جگہ آزادی کی تحریکوں کا موقف اختیار کیا ہے۔ اگر غیر وابستہ ملکوں یعنی بھان متی کے کنبے جیسے گروپ نے سیاسی اور نیم فوجی تعاون کی باتیں شروع کر دی ہیں تو اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا کہ ہم تینوں ملک جو ایک لائن میں ہیں' سرحدیں ملتی ہیں' کوئی باہمی جھگڑے نہیں' ہم مل کر وقت کے بحرانوں کا مقابلہ نہ کر سکیں؟ ہم کل از میر جا رہے ہیں۔ غیر وابستہ ملکوں کا جلسہ کولمبو میں یکم اگست سے ہو گا۔ وہ کوئی دنیا کو ہلا کر نہیں رکھ دیں گے۔ لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ پہلے اسی گروپ نے فوجی معاہدوں اور فوجی مہموں کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ اس نے دنیا کے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ وہ امن کا پیغامبر ہے اور بین الاقوامی کشیدگیاں ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اب ان میں سے بعض ایک دوسرے کو فوجی امداد دینا چاہتے ہیں یعنی عدم

www.bhutto.org

وابستگی کے بالکل برعکس اور دنیا کے کسی بھی حصے میں آزادی دلوانے کے لئے جانے کو تیار ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس میں اقوام متحدہ کا منشور آڑے نہیں آتا۔ عالمی قانون اور اقوام متحدہ کے منشور کے خلاف یہ ممالک دنیا کے پولیس مین (Policeman) بننا چاہتے ہیں۔ جو ملک بڑی طاقتوں کی مداخلت کے خلاف تھے، وہ خود مداخلت کر کے بڑی طاقت کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کولمبو میں انہیں خطوط پر ایک منشور منظور کر لیا جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا ہوا تو یہ نہ صرف غیر وابستہ ملکوں کے مفاد کے خلاف ہو گا بلکہ عدم وابستگی کے اصول کی دھجیاں بکھیر کر اس کا مذاق اڑائے گا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں کچھ خدشات یا عزائم ہیں۔ دیکھئے وہ ان کا جواب کس طرح دیتے ہیں۔

ہمارے تینوں ملکوں کے وسائل ایسے ہیں کہ تینوں ایک دوسرے کے وسائل کو کام میں لا سکتے ہیں۔ ایسا شاید ہی دنیا کے کسی اور خطے میں ہو۔ اگر ہم فوجی معاملات سے ہٹ کر اپنے معاشی وسائل کو ساتھ ملا کر اپنے کام میں لائیں تو کسی کو مشتعل نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ ڈلس (Dulles) کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ ہم عہد کریں کہ اپنی مشترکہ ثقافت کا دفاع کریں گے۔ معاشی' سیاسی' نظریاتی اور فوجی سطح پر ہر قسم کے چیلنج کا جواب دیں گے تو اس میں کیا جرم ہے؟ جی نہیں ہمارے دوست اس قسم کے انتظام کا خیر مقدم کریں گے۔ یہ ہمارے عوام کا عزم ہو گا۔ قابل احترام عزم و عہد۔

میں اس ادارے یا انجمن کے مستقبل کے بارے میں جو تصور رکھتا ہوں وہ فوجی اعتبار کی سوچ پر مبنی نہیں ہے۔ اس کا تعلق آج کی دنیا کے تقاضوں اور ضرورتوں سے ہے۔ اگر بین الاقوامی بساط سیاست پر سیاسی سماجی اور نفسیاتی عناصر کو ان کے مناسب مقام پر نہ رکھا جائے تو فوجی اسلحہ کا اصول بھی اس چیلنج کا صحیح جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہمارے دور کے خطرات کو دور کر سکتا ہے۔ "اتحاد ثلاثہ" کو نئی وسعتیں اور گہرائی بخشنے کے لئے ہمارے حقائق کو سامنے رکھ کر ان کا حقیقت پسندانہ اور موثر جواب تلاش کرنا ہو گا۔ میرا یقین ہے کہ نفسیاتی' سیاسی ضروریات کی تکمیل کے بغیر اسلحہ کی فراوانی بھی وہ توازن قائم نہ کر سکے گی جو قوموں کو زندہ اور طاقتور رکھنے کے لئے بہت ضروری ہوا کرتا ہے۔ آخری بات یہ کہ ہم پاکستان میں اس وسیع تر مسلم قومیت کے والا و شیدا ہیں جس کا علامہ اقبالؒ نے بارہا اپنے کلام میں ذکر کیا ہے۔ یہ مسلم قومیت عام قوم پرستی کے منافی نہیں ہے۔ آزاد و خود مختار مملکت کے تصور کے بھی خلاف نہیں۔ بلکہ یہ ان کو اور زیادہ تقویت پہنچاتی ہے۔ آج کی دنیا میں کوئی ملک ہر اعتبار سے خود کو خود کفیل نہیں کہہ سکتا اور مسلمان ملکوں کو تو ایک دوسرے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ انہوں نے گذشتہ دو تین صدیوں میں زبردست مصائب برداشت کئے ہیں اور کیونکہ ان کے مستقبل اور ان کی نجات کا راز ہی ان کے اتحاد میں مضمر ہے۔ اس اتحاد کی طرف ان تینوں ملکوں کے اتحاد ثلاثہ سے اچھی ابتدا ہو سکتی ہے۔ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی اتحاد کا وہ وسیع تر تصور ہے جو میری سوچ اور دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔

19 ر اپریل 1976ء۔ کراچی

www.bhutto.org

www.bhutto.org

دوطرفہ تعلقات کا نظریہ

نئی سمتیں

دوطرفہ بنیاد پر تعلقات ' پاکستان کی خارجہ حکمت عملی کا وہ رہنما اصول ہے جو ایک نظریے کی حیثیت سے کسی الجھاؤ یا پیچیدگی کا شکار نہیں۔ بڑی طاقتوں میں سے ہر ایک کے ساتھ دوطرفہ بنیاد پر ہمارے تعلقات کی استواری کا تصور یہ ہے کہ ایک طاقت کے ساتھ اپنے اتحاد کی نفی کئے بغیر دوسری طاقت کے ساتھ تعاون کے شعبوں کا تعین کیا جائے۔ اس طرح داخلی طور پر وجود میں آنے والی یکساں روی اور مربوط حکمت عملی کے لئے نہ تو کسی جواز کی ضرورت ہے اور نہ ہی اخلاقی طور پر کسی بہانہ سازی کی گنجائش۔ دنیا میں معمول یہی رہا ہے کہ جب کوئی سے دو ملک خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے آپس میں تعلقات قائم کرتے ہیں تو ان تعلقات کی بنیاد باہمی مفادات کے مشترکہ ادراک پر رکھی جاتی ہے چنانچہ موجودہ متلاطم دور کی حقیقتوں اور دباؤ سے ہٹ کر سوچا جائے تو دوطرفہ تعلقات کا تصور یقیناً کوئی نئی اختراع نہیں ہے۔ تاہم کسی ملک کے خارجہ تعلقات میں اس اصول کو سمودینے کے تجربے میں ایک خاص ارتقا کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس نظریہ کے ایسے اہم مضمرات اور منطقی نتائج سامنے آتے ہیں، جنہیں میرے مشاہدے کے مطابق اکثر واضح طور پر نہیں دیکھا گیا۔ چونکہ میں 1958ء سے حکومت میں رہ کر اس تجربے سے متعلق رہا ہوں اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ مضمرات محض عارضی دلچسپی کے نہیں، بلکہ اس سے زیادہ اہم ہیں۔ جب کوئی نظریہ نعرہ بن جاتا ہے تو اس نظریہ کے اصل استدلال یا اس کے منطقی لوازمات دھندلے ہو جانے کا رجحان رکھتے ہیں اور یوں اس نظریہ کی دھار کند ہو جاتی ہے اور اس کے مفہوم کی باریکیاں گہنا جاتی

www.bhutto.org

ہیں۔ دو طرفہ تعلقات کے نظریہ کو اس کے سیاق و سباق میں سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان عالمی تبدیلیوں پر نظر ڈالیں جو قیام پاکستان کے وقت سے پہلے اس کے ابتدائی دور اور بعد ازاں رونما ہوئیں اور یہ جائزہ لیں کہ پاکستان اور تیسری دنیا کے دوسرے ملکوں نے ان عالمی تبدیلیوں کے ساتھ کس طرح مطابقت پیدا کی۔ اس جائزہ سے پہلے ایک واضح حقیقت کا بیان ضروری ہے اگر یہ سمجھا جائے کہ دو طرفہ تعلقات کسی ملک کے بیرونی تعلقات کے تمام تر شعبے کو احاطہ کرتے ہیں تو اس نظریہ کے واضح ترین نقوش بھی دھندلے ہی رہیں گے عصر حاضر کے عالمی نظم کی ایک خصوصیت وہ اجتماعی وفاداریاں اور ان کے تحت عائد ہونے والی ذمہ داریاں ہیں، جنہیں خود مختار ممالک بخوشی قبول کرتے ہیں خواہ وہ ذمہ داریاں کسی بھی درجے کی ہوں۔ کسی ملک کی اقوام متحدہ کی رکنیت اور اقوام متحدہ کے اس چارٹر سے اعلان وفاداری جواب قومی آزادی کا نشان ہے اس ملک کے لئے تعمیری انداز میں ایک کثیر المملکتی تعلق سے وابستگی ہے اس طرح رابطے کی ذرا نچلی سطح اور نسبتاً محدود دائرہ کار میں مملکتوں کی دوسری انجمنیں موجود ہیں، جو کسی دباؤ یا جبر کے بغیر بنائی گئی ہیں۔ عام طور پر ان کی بنیاد تاریخی پس منظر، روحانی یا ثقافتی تعلق، جغرافیائی قربت یا باہمی اقتصادی مفادات پر ہے۔

اسلامی کانفرنس میں پاکستان کی رکنیت ایران اور ترکی کے ساتھ روابط اور گہوارہ اسلام کی حیثیت سے سعودی عرب سے اس کے رشتے ہمارے خارجہ تعلقات کا خاصا اہم جزو ہیں علاوہ ازیں غیروں کی محکومی سے نجات، لوٹ کھسوٹ اور بالادستی کا خاتمہ ایسے نصب العین ہیں جنہیں پاکستان نظریاتی طور پر کسی طرح خیرباد نہیں کہہ سکتا دنیائے عرب کا مسئلہ، نسلی امتیاز یا بچے کھچے نو آبادیاتی نظام کے خلاف افریقہ کی جدوجہد اور ایک منصفانہ عالمی اقتصادی نظام کے قیام میں تیسری دنیا کی عام دلچسپی ایسے عوامل ہیں جو بین الاقوامی مسائل پر ہمارے رجحانات کو لامحالہ متاثر کرتے ہیں۔ اور اس حد تک ہمارے خارجہ تعلقات کی ہیئت بھی متعین کرتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا مسلمہ حقیقت اور دو طرفہ تعلقات کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ بلاشبہ جہاں تک ان تمام عوامل کی بنیاد ان تسلیم شدہ قابل تحسین اصولوں پر ہے دو طرفہ تعلقات کے نظریہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ان اصولوں میں کسی ردوبدل کے لئے دلیل بنائی جاسکے۔ دو طرفہ تعلقات کے بہانے اصولوں سے دستبرداری تو کجا اگر انحراف بھی کیا جائے تو پھر یہ نظریہ محض موقع پرستی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اس سلسلے میں میں سمجھتا ہوں کہ ہماری مملکت جیسی طاقت رکھنے والی مملکتوں کے لئے درست انداز یہی ہو سکتا ہے کہ وہ باوقار ہو۔ اگر کوئی ملک اصولوں کا سہارا ترک کر کے اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے تو پھر ناممکن ہے کہ اس کے لئے عزت و وقار کا کوئی شائبہ تک باقی رہے میں نے اپنے ملک کی حکمت عملی کے کارپردازوں کے لئے اسی عنصر کو اپنی پالیسی کا ایک جزو بنایا ہے کہ بڑی طاقتوں کے دباؤ کے مقابلے میں ایک ترقی پذیر ملک کی واحد قوت اصولوں کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی اور غیر متعین حالات میں بھی ان اصولوں کی صحیح تعبیر و تشکیل کی صلاحیت میں مضمر ہے۔ یہ بات عملی تجربے سے غلط ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی عظیم طاقت بحیثیت ایک عظیم

طاقت کے کسی اصول سے محض اس لئے ہمیشہ انکاری رہے کہ خود اس نے اس اصول کی پاسداری کا کبھی وعدہ نہیں کیا تھا۔ آج کے دور میں جب کہ بین الاقوامی مسائل پوری نوع انسانی کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ کوئی ملک ایسی حکمت عملی اختیار کرے جو تسلیم شدہ اصولوں کے بر خلاف ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جن اچھوتے تاریخی حالات نے جنم لیا، سیاسی مبصرین اس پر دفتر کے دفتر سیاہ کر چکے ہیں یا تاریخ کا یہی وہ منفرد دور تھا جب ہم بھی آزادی سے ہمکنار ہوئے تاریخ کے تمام گذشتہ ادوار کے مقابلے میں اس نئے دور کی سب سے اہم خصوصیت دو عالمی طاقتوں کا وجود میں آنا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت روس دونوں باہم متضاد نظریات سے وابستہ دونوں اپنے نظریات کے عالمگیر تسلط کے لئے کوشاں، دونوں دنیا کے دوسرے ملکوں میں نہ صرف اپنے نظریات کا پرچار بلکہ عملی مفاد کی کوششوں میں مصروف اور اس طرح اپنے اپنے ڈھب کے عالمی نظام کے قیام کے لئے نبرد آزما تھے۔

تاریخ انسانی میں عالمگیر شہنشاہیت کوئی نیا تجربہ نہیں تاہم دور شہنشاہیت میں بھی ایک بڑی طاقت کا تسلط کسی ایک علاقہ تک محدود ہوتا تھا۔ اور مذہبی جواز کے باوجود دوسری بڑی طاقت کے مفادات میں دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ تاریخ کی سب سے وسیع شہنشاہیت سلطنت برطانیہ کے بارے میں بھی یہ حقیقت ہے کہ اسے فرانس، اسپین، پرتگال، اور اس کے بعد زار کے دور کے روس، جرمنی اور جاپان کے شہنشاہی عزائم سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور اس کے نتیجے میں سلطنت برطانیہ پر ایک نازک دور وہ بھی آیا جب اسے خود اپنی جغرافیائی حدوں کو معین کرنا پڑا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی توسیعی صلاحیتوں پر کوئی قدغن عائد کر دی تھی بلکہ یہ قدم دوسری استعماری طاقتوں کے توسیعی اقدامات پر مکمل رضامندی کے تحت اٹھایا گیا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد کے دور میں پورے کرۂ ارض پر تسلّط کے لئے دو بڑی طاقتوں نے زور آزمائی شروع کی اور ایسا کرنے میں دونوں طاقتیں نظریہ تجارت، سفارت اور دوسروں کے ذریعہ جنگوں کی سطح پر دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں۔ دنیا میں پہلے کسی بڑی طاقت کے پاس کبھی اتنے اثاثے نہ ہوں گے جن اثاثوں کی مالک یہ دو طاقتیں تھیں۔ وسعت کے اعتبار سے دونوں ملک اپنی اپنی جگہ تقریباً بر اعظم کے برابر تھے دونوں کے مادی مسائل اس قدر تھے جتنے پہلے کبھی کسی کے پاس نہ تھے ٹیکنالوجی کے میدان میں دونوں اعلیٰ ترین معیار کے کوشاں تھے اور دونوں اپنے اپنے نظریہ کی سچائی کے دعویدار چونکہ یہ دونوں طاقتیں بظاہر شہنشاہیت کے اس روایتی تصوّر کی مخالف تھیں جس کے تحت کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر براہ راست اور مستقل فوجی قبضے کے ذریعہ یا اس کے حکمرانوں کو بزور مجبور کر کے ان کے علاقوں پر آہنی تسلط قائم کرتا ہے لہٰذا ان کی باہم محاذ آرائی کا میدان بھی مختلف تھا ان کا مقصد روایتی لحاظ سے پوری دنیا کو محکوم بنانا نہ تھا بلکہ ان گنت طاقتور وسائل کے ذریعہ اقوام عالم کے مقدر کو اپنا تابع کرنا تھا۔ ان وسائل میں بعض نظروں کے سامنے تھے اور بعض پوشیدہ اور انہیں بروئے کار لانے میں اگر ایک طرف دوسرے معاشروں میں طبقاتی مفادات کو استعمال کیا جاتا تھا تو دوسری جانب ابلاغ عامہ کے انتہائی موثر ذرائع کی مدد لی جا رہی تھی۔ عالمگیر تسلّط کے لئے دو طاقتوں کے اس مقابلے میں جس نے سرد

جنگ کی صورت اختیار کرلی، تاریخ عالم میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

اس صورت حال کا سب سے واشگاف پہلو یہ تھا کہ دنیا دو محوروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ یہ تقسیم اگر حتمی اور قطعی ہوتی تو خارجہ تعلقات کے ضمن میں دنیا کی بیشتر ترقی پذیر قوموں اور بعض بظاہر بڑی طاقتوں کے اختیارات بھی ایک یا دوسرے دھڑے سے وابستگی تک محدود ہو کر رہ جاتے۔ ان کے سامنے صرف دو ہی راستے ہوتے۔ کسی ایک طاقت کے حاشیہ بردار بنو یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دو یا مقابلے پر آؤ۔ ہتھیار پھینکو یا جنگ لڑو۔ ان کے لئے بین الاقوامی روابط میں کوئی آزادی نہ ہوتی اور یوں ایسے ممالک کے لئے اپنی آزادی وخود مختاری کو اس کے مکمل مفہوم میں برقرار رکھنے کے امکانات بھی کم ہو جاتے۔

تاہم قدرت کے بھید نرالے ہیں اور تاریخ انہی اسرار کے مظاہرے سے آراستہ ہے۔ چنانچہ تاریخ کا وہ عمل جس کی بدولت یہ دو عالمی طاقتیں وجود میں آئیں۔

اس تاریخی عمل نے ان قوتوں کو بھی جنم دیا جنہوں نے ان دو عظیم طاقتوں کے دائرہ اثر کو نہ صرف محدود کر دیا بلکہ عالمی تسلط کی راہیں بھی مسدود کر دیں ان حالات میں تین واقعات رونما ہوئے جنہوں نے نوع انسان کو ایک نئی جہت دی اور دنیا کو گھٹ کر مر جانے سے بچا لیا۔ ان واقعات کا باہمی ربط محض اتفاقی نہیں ان واقعات کی سرسری تاریخ وار ترتیب یوں ہے کہ پہلے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا پھر چین کو آزادی حاصل ہوئی اور مغرب کے نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا اگر یہ واقعات نہ ہوتے تو سرد جنگ کی نیم مذہبی قسمیں دنیا پر ایک خوفناک سادگی مسلط کر دیتیں اور بین الاقوامی امور میں بنی نوع انسان تنوع سے محروم ہو جاتا تاہم ان تینوں عوامل سے متعلق تمام پیچیدہ امور کو حقیقت میں کئی برس کے بعد واضح طور پر دیکھا گیا اس دور میں جب کہ سرد جنگ اپنی تمام تر زہر افشانیوں کے ساتھ پورے عروج پر تھی وہ ملک جو نہ یبنینسٹ سوشلزم سے ملحق تھے اور نہ ہی مغرب کے مسیحی تمدن کا ایک حصہ تھے ان کے سامنے فوری سوال یہ تھا کہ وہ اپنی آزادی، خود مختاری اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لئے آخر کس حکمت عملی کو اختیار کریں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آخر وہ اپنے اختیارات کیسے برقرار رکھ سکیں گے وہ اپنی اس آزادی کا کیسے تحفظ کریں گے، جن کے تحت وہ عظیم طاقتوں کے علاوہ دوسرے ملکوں سے بھی تعلقات استوار کر سکیں۔ ان کے لئے اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج وہ مثالی اصول بھی باعث تسکین نہ تھے جن کے تحت ملکوں کی خود مختاری کو مساوی قرار دیا گیا ہے لیکن عالمی طاقت اور کسی چھوٹے ملک کا باہمی تعلق، حقیقت میں دو ملکوں میں مساوی سطح کا تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صورت میں ایک ملک دوسرے ملک کو کوئی قابل ذکر فائدہ پہنچائے بغیر اس سے کئی گنا زیادہ فوائد حاصل کر لیتا اور خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ عالمی محاذ آرائی میں مصروف ہو سوال یہ تھا کہ کیا ایک چھوٹے ملک کے لئے کسی عظیم طاقت کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا معیار یہی رہ گیا تھا کہ وہ مزارعہ بن کر رہے۔

بالآخر ایشیا اور افریقہ کی بیشتر اقوام اور خاص طور پر نو آزاد ملکوں نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے وہ قدم اٹھایا جو باوقار بھی تھا اور ان کے عہد کا تقاضا بھی۔ انہوں نے اپنے لئے غیر جانبداری کا راستہ تجویز

www.bhutto.org

کیا ان میں سے اکثر ملکوں کے لئے یہی طریقہ ممکن تھا جس کے تحت وہ اپنی قومیت کو منوا سکتے۔ اپنے تشخص کا تحفظ کر سکتے۔ تمام چھوٹے بڑے ملکوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے اپنی پالیسیوں کو لچکدار رکھ سکتے۔ ایک بڑی طاقت کے جنگی مفادات سے مکمل وابستگی اور دوسری بڑی کے مفادات سے ٹکراؤ کے عمل سے بچ سکتے اور یوں ایک غیر متوازی دنیا کو کسی حد تک توازن فراہم کر سکتے۔ مجموعی طور پر غیر جانبداری کی حیثیت ایک توازن پیدا کرنے والی قوت رہی ہے جیسا کہ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ملک اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اس پالیسی کو ان خوبیوں کی بنا پر تسلیم بھی کیا گیا جو ابتدا میں اس سے وابستہ تھیں اور یہی وہ پالیسی تھی جس پر عظیم طاقتوں کی باہمی رقابتوں کے مقابلے میں عمل پیرا ہونے کا اخلاقی جواز تھا اور جو عملی طور پر موثر بھی تھیں۔ تاہم یہ پالیسی بھی خالی از علت نہ رہی اور یہ خرابی غیر جانبدار ملکوں کے گروپ کی قیادت پر فائز ہونے یا بزعم خود قیادت کے دعویداران ایک یا دو ملکوں نے پیدا کی ہے جنھوں نے اپنے جارحانہ قومی مقاصد کے حصول کے لئے غیر جانبداری کو اپنی ڈپلومیسی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ جب قیادت کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں چلی جائے تو غیر جانبداری مسخ ہو جاتی ہے اور اس کے نظریہ کی وہ قوت بھی زائل ہو جاتی ہے جو بلاشبہ اس سے وابستہ ملکوں کی تعداد اور ان کے خلوص کے سبب اسے حاصل ہوئی تھی۔ اگر یہ نظریہ اپنے اصل مفہوم اور مقصد سے محروم کر دیا جائے تو پھر اسے بعض طاقتوں کی قومی شان و شکوہ میں اضافہ کا ذریعہ، بعض طاقتوں کی جانب سے سیاسی بالادستی کی توسیع اور اپنے حلقہ اثر سے رقیبوں کے خاتمے کے لئے ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی قیادت کی بدولت غیر جانبداری کی تحریک پر تضادات کا شکار ہونے کے اعتراض کے موقع پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جونہی غیر جانبدار ممالک ایک یا ایک سے زیادہ ایسے ملک کی قیادت میں اپنی پالیسیاں وضع کرنے لگیں جو خود ایک عظیم طاقت بظاہر عظیم کا درجہ حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہو تو وہیں غیر جانبدار ممالک جانبدار بن جاتے ہیں اور دنیا کی ناہمواریوں، الجھنوں اور بین الاقوامی تعلقات کی غیر متوازن اور غیر مساوی بنیادوں کے خاتمے کے لئے جو غیر جانبداری اختیار کی گئی تھی اس کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ مقام مسرت ہے کہ اس حقیقت کا غیر جانبدار ممالک کو احساس ہوتا جارہا ہے۔

عالمی امور کے ارتقاء میں غیر جانبداری کے اصول کا اضافہ یقیناً پنڈت جواہر لعل نہرو کا ایک تاریخی کارنامہ ہے تاہم بھارت کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر اگر وہ تیسری دنیا کے ان ملکوں کو جو مجبور کرنے والے اسباب کی بنا پر کسی ایک بڑی طاقت کے اتحادی بن گئے تھے سخت تنقید کا نشانہ بنانے سے احتراز کرتے اور غیر جانبداری کی تحریک پر اپنے اس رجحان کی چھاپ نہ لگاتے تو یہ تحریک قیام امن کے لئے بہت دیرپا اثرات کی حامل ہوتی۔ یہی رجحان اس افسوسناک حقیقت کا پیش خیمہ بنا کہ خود ہندوستان اپنے ہمسایہ پاکستان کے ساتھ ایک بڑے بین الاقوامی تنازعہ میں ملوث ہوا اور اس تنازعہ سے متعلق اقوام متحدہ کی قراردادوں کو رد کرنے کے لئے اس نے ایک عظیم طاقت کی نہ صرف پوری سرگرمی سے مدد حاصل کی بلکہ اس مدد پر پورا بھروسہ بھی کیا۔ یہ درست ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد کے حصول یا اس کے فیصلوں پر

www.bhutto.org

عملدر آمد کے لئے کسی عظیم طاقت سے مدد لی جائے تو غیر جانبداری کا اصول باطل نہیں ہو جاتا لیکن اس کے برعکس اگر اقوام متحدہ کے مقاصد کو ناکام بنانے کے لئے مدد لی جائے تو غیر جانبداری یقیناً ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں میں اختصار کے ساتھ صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا کہ بھارت نے پہلے چین کے ساتھ مسلح محاذ آرائی کی ابتداء کی اور چند برس بعد اس نے روس کے ساتھ ایک فوجی نوعیت کا معاہدہ کر لیا ظاہر ہے کہ جب غیر جانبداری کا نظریہ ایسے ہاتھوں میں ہو گا تو نہ اس کی کوئی شکل رہے گی اور نہ ہی مفہوم۔

کسی بھی ملک کی جانب سے کسی مخالف ملک کو ڈرانے دھمکانے اور پریشان کرتے رہنے کا رجحان بین الاقوامی تعلقات کو زنگ آلود کر دیتا ہے لیکن غیر جانبدار ملکوں میں اس رجحان نے نہ صرف غیر جانبداری کے تصور کا حلیہ بگاڑ دیا ہے بلکہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں کا یہ گروہ کسی اجتماعی قوت کا تاثر دینے میں بھی ناکام رہا ہے۔ یہ رجحان خواہ بھارت کی جانب سے پاکستان کو برادری سے باہر کرنے کی کوشش کی صورت میں ظاہر ہو، یا بعض عرب ملکوں کے ساتھ صدر ناصر کے دور کے مصر کی وہ کدورت ہو جو 1955ء کی بنڈونگ کانفرنس میں نمایاں ہوئی تھی۔ ایک تاریخی مرحلے کے دوران غیر جانبداری کی تحریک کے تصور کی کشش اور معقولیت کو نقصان پہنچانے والے عوامل میں ایک اور رویہ بھی شامل تھا جو تمام غیر جانبدار ملکوں کا نہیں بلکہ صرف ایک ملک کا تھا جو ایک عظیم طاقت کو دوسری عظیم طاقت کے خلاف اس آرزو میں استعمال کرتا رہا کہ اس طرح دو عالمی طاقتوں کے درمیان ایک ناگزیر دلال بن کر خود اس کی حیثیت میں اضافہ ہو گا اور وہ خود بھی ایک بڑی طاقت کا کردار ادا کرتا رہے گا۔ اس رویہ کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ اس کے بیچ میں پڑے بغیر دونوں عالمی طاقتوں کے درمیان نہ کبھی مذاکرات ہوں گے اور نہ کسی وتیانت کی نوبت آئے گی۔ یہ امر قابل غور ہے اور یہ آج کی بات نہیں بلکہ 1963ء کی بات ہے جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں صدر ٹیٹو نے اپنی تقریر میں تبدیل شدہ بین الاقوامی صورتحال کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ بین الاقوامی تعلقات میں نئے مثبت رجحانات کے باعث غیر جانبداری کی اصطلاح اب قدرے فرسودہ ہو کر رہ گئی ہے"۔

مجھے یقین ہے کہ غیر جانبداری کے صحیح نظریئے کو اب بھی فرسودگی اور منفی رجحانات سے بچایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ غیر جانبدار ملکوں کا گروپ توسیع پسندی کے قومی مقاصد کو ٹھکرا دے اور اپنی ترتیب و تشکیل کے بارے میں بعض سوالوں کا منطقی اور منصفانہ جواز فراہم کرے۔ اس طرح یہ گروہ اپنے اصل ابتدائی دائرہ کار کی حدوں کا پھر سے تعین کر سکے گا۔ جو کسی ایسے بیچ بچاؤ کا کردار ادا کرنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ جو تیسری دنیا کے ملکوں میں تفرقہ ڈال کر ان کی محدود اجتماعی قوت کو بھی پارہ پارہ کر سکتا ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آخر اس گروپ میں شمولیت کا اصول کیا ہے؟ کیا غیر جانبداری سے مراد یہ ہے کہ مشرقی ملکوں کے ساتھ تو دو طرفہ بنیاد پر فوجی سمجھوتہ ہو سکتا ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کے ملک مغربی ملکوں کے ساتھ دفاعی سمجھوتے نہیں کر سکتے؟ اس سلسلے میں کثیر الملکتی معاہدوں اور دو طرفہ سمجھوتوں کے فرق کی بنیاد پر جو معیار مقرر کیا گیا ہے وہ بھی محض فریب ہے۔ اس لئے کہ دونوں سمجھوتے ایک ہی طرح عالمی

www.bhutto.org

طاقتوں کی باہم آویزش کے تانے بانے کا حصہ بھی بن سکتے ہیں۔ اور پھر ظاہر ہے کہ نظریاتی رجحانات سیاسی نظاموں اور اقتصادی حالات میں تنوع اور اختلافات کے باوجود غیر جانبداری کی تحریک کو متحد کرنے والی واحد قوت رکن ممالک کا وہ مشترکہ تجربہ ہے جو انہیں نو آبادیاتی غلبے کے دور میں حاصل ہوا۔ پھر ان ملکوں کو گروپ سے علیحدہ رکھنے کا کیا جواز رہ جاتا ہے جو خود بھی نو آبادیاتی دور کے تلخ تجربے سے گزرے ہیں اور آج دوسروں کی طرح عالمی اقتصادیات کی ناانصافیوں کے خاتمے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوئم یہ کہ غیر جانبداری کی تحریک کے اس دائرہ کار میں یہ تاثر شامل تھا کہ گروپ دونوں عالمی طاقتوں سے مساوی فاصلہ قائم رکھے گا۔ اور غیر جانبداری کو ہمسایہ ملکوں کے خلاف گروہی دباؤ کے طور پر استعمال کرنے سے واضح طور پر احتراز کرے گا۔ لیکن جب ایک ملک ایک عالمی طاقت کے ساتھ بہت قریبی تعلق قائم کرتا ہے اور اس کے باوجود غیر جانبداری کا دعویٰ بھی کرتا ہے تاکہ ایک ہمسایہ ملک پر سیاسی بالادستی قائم کرنے کے لئے اسے بہتر مواقع میسر آسکیں تو غیر جانبداری کے نقاب میں جانبداری نظر آتی ہے ایسا عمل غیر جانبداری کے تصوّر اور عملی اظہار دونوں سے ہے۔ اگر غیر جانبداری کو دوبارہ بڑی قدر و قیمت کی تحریک بننا ہے تو اسے اپنی شاندار نیک نامی کو بحال ' اپنے مقاصد کی از سر نو تصریح اور اپنی ترجیحات کا از سر نو تعین کرنا پڑے گا۔

بین الاقوامی امور اب ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں ' جہاں غیر جانبداری کا حلقہ صرف چند بلند مرتبہ پروہتوں اور ان کے چیلوں تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کو اس حلقہ سے دور رکھا گیا تو عالمی حالات کا اصل مسئلہ دھندلا کر رہ جائے گا اور یہ مسئلہ ہے ' جغرافیائی محل وقوع کے قطع نظر استحصال کرنے والے اور استحصال کا شکار ہونے والے کے درمیان فرق کا بڑی طاقتوں سے اتحاد کا نہ صرف مذہب اور نظریات کا یہ فرق بجائے خود کوئی سیاسی اختراع نہیں اور نہ ہی اسے کسی ملک کی مخصوص قومی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اس مسئلہ کا تقاضا ہے کہ تیسری دنیا اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جو آج تک منتشر رہی ہیں، ایک نکتہ پر مجتمع ہو۔ یہ اتحاد دولت مند ملکوں کے ساتھ ٹکرانے کے لئے نہیں بلکہ ناانصافیوں کے خاتمے کے لئے اور کسی خاص نظام کی تباہی کیلئے نہیں بلکہ موجودہ غیر منصفانہ توازن کی اصلاح کے ذریعے ایک نئے اقتصادی نظام کی تعمیر کے لئے ہوگا۔ ایسی کوئی تحریک دھڑے بندی یا حکمت عملی جو اس عظیم منصفانہ نصب العین کے لئے تیسری دنیا کے اتحاد میں رکاوٹ بنے گی، وہ اس الزام سے ہرگز محفوظ نہ ہوگی کہ اس نے تنگ ترذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے' تاریخی عوامل کو نظر انداز کیا اور وقت کے چیلنج کا حقیقت پسندی لیکن تعمیری انداز میں جواب دینے کے لئے جو قوتیں آگے بڑھیں ' ان کے راستے مسدود کئے یہی عوامل ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں نے حال ہی میں ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ممالک کی ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد کرنے کی اپیل کی ہے مجھے یقین ہے کہ تیسری دنیا کے اس جامع فورم کو غیر جانبداری کے تصور کے منافی نہیں بلکہ اس کی توسیع اور ارتقا سمجھا جائے گا۔

www.bhutto.org

میں نے اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان طے پانے والے ان سمجھوتوں اور معاہدوں کے لئے معذرت خواہ ہوں' جن کا مقصد باہمی دفاع اور دونوں ملکوں میں تعاون ہے اس لئے کہ یہ سمجھوتے فی نفسہ پاکستان کے اپنے مفادات سے ہمیشہ ہم آہنگ رہے ہیں۔ ان پر کسی پوشیدہ مقصد کا ذلت آمیز داغ نہیں اور نہ ہی یہ معاہدے کسی ملک کے جائز مفادات کے خلاف کئے گئے۔ اور چونکہ یہ معاہدے پاکستان کے مقاصد سے ہماری وفاداری میں مخل ہوتے ہیں۔ اس لئے پاکستان کے لئے قطعاً لازمی نہیں کہ وہ ان سمجھوتوں سے محض اس لئے علیحدگی اختیار کرے کہ اسے تیسری دنیا کا رکن بننے کی سند فراہم ہو جائے اور تیسری دنیا کے عظیم مقاصد کے پرچار کرنے کا کردار ادا کر سکے۔ حقیقت میں یہ سند تو اس قوم کے طبعی وجود کا ایک انتہائی اہم جزو ہے جو اس عظیم الشان جدوجہد کے بعد معرضِ وجود میں آئی' جس کی پشت پر ہزار سالہ تاریخ کی قوت موجود تھی۔

وہ قوم جو ایشیا کے عین قلب میں آباد ہے' وہ لوگ جو اپنی شخصیت کے اعتبار سے مستند ایشیائی ہیں' وہ ملک جو چین اور سوویت یونین کے نزدیک ترین واقع ہے' اور وہ معاشرہ جس کی ثقافت اور تہذیبی ورثے مشرق وسطیٰ کے ساتھ مشترک ہیں' اگر کچھ عرصہ تک یہ حقائق نظروں سے اوجھل رہے تو اس کی وجہ مغرب کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ ایک جانب سے اس سمجھوتے کی کیا توضیح پیش کی گئی یا دوسری جانب اسے کیونکر سمجھا گیا' نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایک عرصہ تک پاکستان اپنے عالمی ماحول اور افریقی ایشیائی صورت حال سے مطابقت پیدا نہ کر سکا۔ یہ تاثر پھیلایا گیا کہ پاکستان اپنی جغرافیائی حقیقت کو فراموش کرنا چاہتا ہے' اپنے تشخص کو جھٹلا رہا ہے اور اس میں اپنے طویل المدت مفادات کو نظر انداز کر کے اپنی آزادی انتخاب کا سودا کر لیا ہے جس کے بغیر آزادی محض تصوراتی داستان بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر میں نے اپنے ملک کے خارجہ امور میں واقعی کسی بات کی کوشش کی ہے تو اس کوشش کا مقصد نہ صرف اس تاثر کو زائل کرنا تھا بلکہ اپنی خارجہ حکمت عملی جس میں لوگوں کی قومی امنگوں کو شامل نہ کیا گیا ہو اور جس میں تاریخی عمل کے شعور کا عکس نہ ملے وہ حکمت عملی غیر مستند اور ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ اپنے خارجہ تعلقات کے ڈھانچے میں اس جہت کی گہرائی کو شامل کرنے کی کوشش کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ اگر ایشیا' افریقہ یا لاطینی امریکہ کا کوئی ملک مشرق یا مغرب سے کوئی سمجھوتہ کر لے تو در حقیقت یہ سمجھوتہ تیسری دنیا کی مشترکہ قدروں اور مقاصد کے خلاف نہیں پڑتا۔ یہ سمجھوتہ اس وقت خلاف پڑے گا جب امتیاز برتا جائے اور باہمی گرم جوشی کا فقدان ہو۔

میں یہاں 1950 کے عشرے کے ان حالات وواقعات کا تجزیہ نہیں کروں گا جو پاکستان کے لئے بعض معاہدوں میں الجھنے کا سبب بنے یہ واقعات جس قدر غیر معمولی تھے اتنے ہی ہمارے قومی مفادات کے لئے نقصان دہ بھی ہیں' ان حضرات کے ساتھ پورے انصاف سے کام لیتے ہوئے جو اس وقت قومی معاملات کو سنبھالے ہوئے تھے میں یہ کہوں گا کہ ان معاہدوں کے لئے واحد قوت محرکہ پاکستان کی سلامتی

www.bhutto.org

کے تحفظ کی کوشش تھی۔ اس دور کے قابل ذکر نو آزاد ملکوں میں پاکستان وہ واحد ملک تھا جسے اپنے قیام کے ساتھ ہی ابھی صرف دو ماہ گزرے تھے جب بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے جو کہ مبالغہ آرائی کے ہرگز عادی نہ تھے بڑے دکھ کے ساتھ "ایک بہت منظم اور مربوط" خفیہ منصوبے کا ذکر کیا جس کا مقصد پاکستان کو اس طرح مجبور کرنا تھا کہ وہ "اپنی غلطیوں پر نادم اور پشیمان بنیے کی مانند دوبارہ انڈین یونین میں شامل ہو جائے" اور اس مقصد کے حصول کے لئے "نو آزاد ملک کو بالکل مفلوج" کر دینے کا منصوبہ تھا قائد اعظم نے اس منصوبہ کا ذکر 24 اکتوبر 47ء کو کیا اور اس کے تین دن بعد ہندوستان نے کشمیر میں اپنی فوجیں اتار دیں تاکہ پاکستان کے ساتھ ریاست کے جائز الحاق کو رد کیا جا سکے لہٰذا یہ بات قطعاً حیران کن نہیں ہے کہ پاکستان کو اپنے ابتدائی ایام میں سب سے اہم مسئلہ جو درپیش تھا وہ اس کی سلامتی کا مسئلہ تھا یہ وہ دور تھا جب پاکستان کے لئے امریکہ کے سوا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا جہاں سے نہ صرف اس قدر فوجی مدد مل سکتی جتنی اور کسی ملک سے ممکن نہ تھی بلکہ اس کے علاوہ کافی اور فراخ دلانہ اقتصادی امداد کی توقع بھی تھی اور پھر پاکستان کو امریکہ کے ساتھ مستقل ڈائیلاگ کی جو اضافی سہولت ملی اسے دیکھتے ہوئے امریکہ اور پاکستان کے اتحاد کو کسی طور بھی غیر قدرتی نہیں کہا جا سکتا۔

اگرچہ ان تمام عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس ضمن میں اگر ان تضادات کا ذکر نہ کیا جائے جو پاکستان اپنے خارجہ امور کی انجام دہی میں مسلسل برتتا رہا ہے تو یہ تاریخ کو جھٹلانے کے مترادف ہو گا اس سلسلے میں چند مثالیں بہت برمحل ہونگی۔

پاکستان ان ملکوں میں سے ایک تھا جنہیں عوامی جمہوریہ چین کو اس کے قیام کے فوراً بعد تسلیم کر لیا اس کے باوجود صرف چند برس بعد جب کہ پاکستان اپنے گذشتہ موقف پر بھی قائم تھا وہ اقوام متحدہ میں چین کی جائز اور تسلیم شدہ حکومت کی براہ راست نمائندگی کے خلاف مسلسل ووٹ دیتا رہا۔

1956ء میں ایسے حالات میں جب پاکستان کے ایک وزیر اعظم چین کا پہلی بار دورہ کر چکے تھے اور خود چین کے وزیر اعظم آنجہانی چو این لائی پاکستان کا دورہ کر رہے تھے پاکستان نے پھر اقوام متحدہ سے عوامی جمہوریہ چین کے نمائندوں کو باہر رکھنے کی تحریک کی حمایت کی۔ پھر ستمبر، اکتوبر 1958ء میں جب تائیوان کے مسئلہ پر جنگ کا خطرہ پیدا ہوا تو پاکستان حد سے ہی گزر گیا اور ان عقائد کو جو خود عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کر لینے میں مضمر تھے فراموش کرتے ہوئے اس موقع پر چین کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ فارموسا پر اختیار اعلیٰ کی قانونی پوزیشن واضح نہیں ہے۔

2 جون 1949ء کو سوویت یونین نے وزیر اعظم پاکستان کو دورہ ماسکو کی دعوت دی، یہ دعوت قبول کر لی گئی۔ اور اس کا عام اعلان بھی ہوا لیکن جب روس نے یہ تجویز پیش کی کہ وزیر اعظم کے دورے سے پہلے دونوں ملکوں کے مابین سفیروں کا تبادلہ ہو جائے تو پاکستان میں سرکاری طور پر یہ بتایا گیا کہ فوری طور پر سفیروں کا تبادلہ کراچی میں "اشخاص کی قلت" کے سبب ممکن نہیں، یوں جب کہ ماسکو کے دعوت نامے کو حقیقتاً ٹھکرایا جا چکا تھا کچھ ہی عرصہ واشنگٹن سے دعوت موصول ہوئی جو بظاہر فکر مابعد ہی تھا

www.bhutto.org

تاہم اسے فوراً قبول کر لیا گیا۔ اپریل 1950ء میں سوویت یونین کے دورے کی دعوت کو داخل دفتر کر دیا گیا جو پندرہ سال کے بعد کہیں جا کر عمل پذیر ہوئی جب پاکستان میں کئی حکومتیں بدلیں اور بین الاقوامی صورت میں خاصی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

یہ تضادات صرف عالمی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات ہی میں نمایاں نہیں ہوئے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے اسلام کے بارے میں اس کا نظریہ کیا تھا ایک جانب قومی قیادت یہ دعویٰ کرتی تھی کہ " پاکستان اسلام کا قلعہ ہے " دوسری جانب پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم نے مسلم ممالک کا حوالہ دیتے ہوئے وہ نادر روزگار فیصلہ دیا " کہ صفر جمع صفر کا حاصل بھی صفر "

ایک طرف پاکستانی قیادت 1947ء میں فلسطین کے ٹکڑے ہونے کے خلاف احتجاجی مہم میں شریک تھی اور عربوں کے مقاصد کی مستقل حمایت میں مظاہرے کئے جا رہے تھے لیکن دوسری طرف جب 1956ء میں نہر سویز کا تاریخی مسئلہ سامنے آیا تو پاکستان نے اس مسئلے پر متزلزل اور متذبذب حکمت عملی اختیار کی۔

یہ اس طرز فکر کی چند نمایاں مثالیں ہیں جس کے مطابق پاکستان کی خارجہ پالیسی چلتی رہی اور جس سے مجھے ایوب خان کی صدارت میں اس موضوع پر ہونے والے پہلے جلسے میں سابقہ پڑا اور ان میں سے کسی ایک کا بھی تعلق سلامتی اور تحفظ کے بارے میں ہماری جائز تشویش سے نہیں ہو سکتا۔ پھر اس سلسلے میں کچھ دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے۔ مثلاً بین الاقوامی امور میں پاکستان کی نا تجربہ کاری ایک حقیقت تھی اب اس بات کی توقع کوئی مینڈری ہی کر سکتا تھا کہ بڈبیر میں امریکہ کو دیکھ بھال کے ایک فوجی اڈے کی فراہمی ہندوستان کو مجبور کر دے گی کہ وہ کشمیر کو واپس " اگل دے "۔ یہی وہ فوجی اڈہ تھا جس کا 1960ء میں یو ٹو کے مشہور واقعہ میں بہت زیادہ ذکر کیا گیا اور جس سے مشتعل ہو کر آنجہانی مسٹر خروشیف نے یہ کھلی دھمکی دی تھی کہ سوویت افواج پشاور کا صفایا کر دے گی ایک امریکی سینیٹر نے جو اس فوجی اڈے کے دورے پر آیا تھا اپنے ہمراہ ایک پاکستانی افسر سے پوچھا کہ پاکستان نے اس اڈے کا کتنا معاوضہ وصول کیا۔

پاکستانی افسر کا جواب سننے کے بعد امریکی سینیٹر نے کہا " تم پاکستانی نرے کاٹھ کے الو ہو۔ اس سے کہیں کم تر اہمیت کے اڈوں کے لئے کروڑوں ڈالر ادا کئے جاتے ہیں "۔ اس درجہ سادہ لوحی کے علاوہ اس وقت کی قومی قیادت میں دیانت کی بھی کمی تھی جس نے اپنے آپ کو نوکر شاہی اور سرمایہ داروں کے ایک محدود طبقہ کے مفادات سے وابستہ کر رکھا تھا اور یوں اس قیادت کا عوام کی خواہشات اور امنگوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ 1961ء میں لاؤس میں لڑنے کے لئے پاکستانی افواج کی پیشکش ہمیں 1951 کی یاد دلاتی ہے جب کوریا میں فوجیں بھیجنے کے بارے میں پاکستان کی دبی دبی خواہش پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی۔ یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ملک کے حکمرانوں کے نزدیک ہمارے سپاہیوں کی حیثیت محض توپوں کے ایندھن سے زیادہ نہیں تھی۔ اس قسم کا حکمران طبقہ جو خود تاریخی صورت حال کو سمجھنے سے قاصر ہو وہ ایک طرف نفسیاتی طور پر اپنی اہمیت جتانے کا خوگر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی با آسانی یہ بھی تصور کر لیتا ہے کہ

دوسرا فریق بھی اس کی طرح سادہ لوح ہو گا۔ چنانچہ اس پس منظر میں جناب ایوب خاں کے اس بلند وبانگ وعدے کو سمجھا جا سکتا ہے جو انہوں نے 1961 میں امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب وہ دن آئے گا جب پاکستان ایشیا کا واحد ملک ہو گا جو امریکہ کا ساتھ دے گا۔ پاکستان کا حکمران طبقہ مفہوم و معنی کے اثرات کو سوچے سمجھے بغیر اس بات پر حیرت کا اظہار کرنے کا عادی ہو گیا تھا کہ آخر افریقی ایشیائی ملکوں کی برادری میں ہوتے ہوئے پاکستان کو سیاسی قرنطینہ میں کیوں دھکیل دیا گیا۔

انہی حالات میں سب سے بڑی حماقت اکتوبر نومبر 1959 میں سرزد ہوئی یہ وہ دور تھا جب ریاست جموں و کشمیر میں لداخ کے علاقے کے بارے میں چین اور بھارت کے تنازعہ کی اطلاعات پہلے ہی موصول ہو چکی تھیں۔ تاہم 23 اکتوبر 1959 کو صدر ایوب خان نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے شمال کی جانب سے سنگین خطرے کا بست تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ تبت کی سرحد پر رونما ہونے والے واقعات برصغیر کو فوجی لحاظ سے غیر محفوظ بنا دیں گے۔ انہوں نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا کہ بھارت اور پاکستان مل کر اس خطرے کا مقابلہ کریں۔

اس کے بعد 3 نومبر کو انہوں نے ایئرپورٹ پر لداخ میں چین کی تازہ یلغار کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا کہ یہ " بھارت کا مسئلہ ہے " نومبر کی خبروں کے مطابق انہوں نے پھر یہ کہا کہ " تبت پر چین کا قبضہ شمال کی جانب سے ایک سنگین خطرے " کا اشارہ ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ اس زمانے میں بھی جب بھارت اور چین کی دوستی پورے عروج پر تھی چین نے بھارت کے تمام تر ناز و نخروں کے باوجود جموں و کشمیر پر بھارتی دعووں کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس زمانہ میں ملک کے خارجہ امور کی ذمہ داری میرے پاس نہیں تھی میں اس وقت جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے نیویارک میں تھا اور جب یہ اطلاعات وہاں پہنچیں تو مجھے آنے والے خطرے کا احساس ہوا صرف یہی نہ تھا کہ حکومت پاکستان کا سربراہ بھارت کو مشترکہ دفاع کی دعوت دے رہا تھا جس کے بارے میں کوئی بین الاقوامی امور سے قطعاً نابلد شخص ہی یہ توقع کر سکتا تھا اس دعوت کو قبول کیا جا سکتا تھا یا اسی جذبے سے اس کا جواب دیا جاتا، یہ بات بجائے خود کچھ کم باعث ذلت نہ تھی لیکن اس میں جو اصل خطرہ پنہاں تھا وہ یہ تھا کہ اس طرح پاکستان چین کو دشمنی کی دعوت دے رہا تھا اس کے علاوہ کشمیر پر بھارت کے اس دعوے کو منظوری بھی عطا کر رہا تھا، جس دعوے کو پاکستان گذشتہ تمام برسوں کے دوران چیلنج کرتا رہا اور جسے اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس طرح امریکہ کے ساتھ اتحاد کے بارے میں پاکستان کی اپنی توضیح ہمارے دور رس قومی مفادات کو مجروح کر رہی تھی۔

یہ سوچتے ہوئے کہ حکومت کو اس کے ایک ایسے موقف سے ہٹانا اس قدر مشکل ہو گا جو خود اپنے آپ کو جھٹلانے بلکہ خودکشی کے مترادف تھا اس وقت کے مروجہ فلسفہ پر کھلے الفاظ میں براہ راست تنقید سے کیونکہ بچاؤ کیا جائے گا اور اس موقف سے جو ہمارا ملک اختیار کر چکا تھا اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے کس قدر مہارت درکار ہو گی یہ سب کچھ سوچ لینے اور اخباری رپورٹوں کے مطالعوں کے فوراً بعد میں نے

www.bhutto.org

ایوب خان کو ایک خط ارسال کیا۔

11 نومبر 1959 کے اس مکتوب میں میں نے انہیں یاد دلایا کہ "ہم جو بیانات دے چکے ہیں" اور جس طرح ہم اپنے "مکمل رجحان" کا اظہار کر چکے ہیں اس کے بعد ان کے بھی ہمارے بارے میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے برعکس کشمیر کے اس حصہ پر بھارت کے اختیارات کو تسلیم کر لیا ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور بھارت کشمیر میں اپنی فوجوں کی تعداد میں جس قدر چاہے اضافہ کر سکتا ہے پھر میں نے ایک ایسے با اختیار اور مستند اعلان کی تجویز پیش کی جو سلامتی کونسل کے نام ایک مکتوب کی شکل میں بھیجا جا سکتا تھا جس کے ذریعے پاکستان کو ان خطرات سے محفوظ کیا جا سکے۔ میں نے انہیں یہ بھی لکھا کہ ممکن ہے کہ چین کا رد عمل پاکستان کی جانب سے ایسے کسی بیان پر مخالفانہ نہ ہو جس میں لداخ کے بارے میں بھارت کے موقف کی اصل بنیاد کو چیلنج کیا گیا ہو۔ میں نے اس مراسلے کی ایک کاپی وزیر خارجہ جناب منظور قادر کو ارسال کی اور انہیں مشورہ دیا کہ ہمیں "اس پورے مسئلے کا گہرائی تک تجزیہ کرنا چاہئے اور کشمیر کے بارے میں بھارت اور چین کے مابین پیدا ہونے والی صورت حال کو اس طرح پھیلنے اور بڑھنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے جو ہمارے اپنے مفادات کے منافی ہو۔"

صدر ایوب خان نے جان لیا کہ اگر جموں و کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کے بارے میں یہ تاثر بھی پیدا ہوا کہ انہوں نے اس موقف کو کمزور کر دیا ہے تو ملک کے لوگ انہیں ہرگز ہرگز معاف نہیں کریں گے چنانچہ میرا خط وصول کرنے کے فوراً بعد انہوں نے اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کی اور 23 نومبر کو یہ بیان دیا کہ پاکستان لداخ کے بارے میں بھارت اور چین کے کسی سمجھوتے کو تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ یہ علاقہ پاکستان اور بھارت کے درمیان متنازع فیصلہ ہے۔ اور جیسا کہ میں نے تجویز کیا تھا انہوں نے اقوام متحدہ میں ہمارے مستقل نمائندے کو یہ اختیار بھی دیا کہ وہ سلامتی کونسل کے صدر کے نام ایک مراسلہ لکھے۔ اس مراسلے میں پاکستان کے موقف کو تحفظ دیتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا کہ "جب تک غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوتا اس وقت تک بھارت اور چین کے مابین موجودہ تنازعے میں کسی بھی فریق کی جانب سے اختیار کیا جانے والا موقف یا کوئی سمجھوتہ یا مستقبل میں اسی قسم کا کوئی اور تنازعہ ریاست جموں و کشمیر کی جغرافیائی حیثیت کو متاثر نہیں کرے گا اور نہ ہی ریاست سے فوجوں کے انخلاء اور حق خود اختیاری کے حتمی فیصلوں سے روگردانی کی جا سکے گی، اس مراسلے میں مزید براں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ صرف جموں و کشمیر کے عوام ہی اپنی آزادی اور اختیار اعلیٰ کے حصول کے بعد اس بات کے مجاز ہوں گے کہ وہ ریاست کی سرحدوں کے بارے میں کسی غیر ملکی طاقت کے ساتھ سمجھوتے کو موثر رہنے دیں یا رد کر دیں اگرچہ بات صرف جموں و کشمیر کے سوال تک محدود تھی تاہم یہ پہلا موقع تھا جب پاکستان نے ایک اچانک پیدا ہونے والی صورتحال میں اپنے قومی موقف پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ استقامت ایک بڑی طاقت کے ساتھ ہمارے اتحاد کی مصلحتوں کے خلاف تھی

www.bhutto.org

جیسا کہ میرا اپنا خیال تھا کہ اس قسم کے طرز عمل میں ایسی کوئی چیز مضمر نہ تھی جو اس اتحاد کو ختم تو کیا اسے کمزور بھی کر سکتی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ سمجھوتے کے چھوٹے فریق کے قومی مفادات پامال نہ ہوں اور اس طرح حقیقت پسندی اور مفادات کا عنصر شامل ہو جانے سے اتحاد کو مزید تقویت حاصل ہو۔ اگر کوئی اتحاد چھوٹے فریق کے مفادات کی پامالی کا سبب بن جائے تو اس کی حیثیت کھنچاؤ اور کشیدگی کے سلسلہ میں ایک کڑی سے زیادہ نہیں جو کسی بھی فریق کے لئے سود مند نہیں ہو سکتی البتہ اتحاد میں اس وقت پختگی پیدا ہو جاتی ہے جب ایک حلیف کو اپنے مفادات کے مناسب تحفظ اور ترویج کے لئے یقین دہانی کی ضرورت ہو اور اسے یہ یقین دہانی فراہم ہو جائے۔

ایک برس بعد 14 اکتوبر 1960ء کو میں نے اقوام متحدہ میں چین کی نمائندگی کے سوال پر پاکستان کے ووٹ کے بارے میں وزیر خارجہ منظور وقار کو ایک مراسلہ تحریر کیا کہ چین کے خلاف یہ ووٹ بڑی لغویات تھی اور اس کے سبب پاکستان کو ان قوموں میں نیک نامی حاصل نہیں ہو رہی تھی جو سرد جنگ سے لاتعلق تھیں میں نے لکھا کہ اگر ہم مسئلے کی اصلیت کے مطابق حقائق کو تسلیم کرنے کا موقف اختیار کریں تو میں نہیں سمجھتا کہ بعض دوسرے ملکوں کے مقابلے میں (ناروے اور ڈنمارک) جنہوں نے امریکہ کے خلاف ووٹ دیا تھا آخر پاکستان کو ایک مضبوط اتحادی کیوں نہیں سمجھا جائے گا اس کے نتیجہ میں نومبر 1960ء میں کابینہ میں اس پر تبادلہ خیالات ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ میں چین کی جائز نمائندگی کی حمایت کی جائے۔ اب یہ باتیں تاریخ کا حصہ ہیں کہ چین کے ساتھ روابط قائم کرنے کے لئے ان چھوٹے چھوٹے ابتدائی اقدامات سے بعد میں کتنے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ پہلے ایک سرحدی مسئلے پر بات چیت شروع ہوئی اور اس کے نتیجے میں چین کے ساتھ ایک سمجھوتہ ہوا اور یوں پاکستان اور اس کے عظیم ہمسایہ کے درمیان بھائی چارے اور قریبی دوستی کے دور کا آغاز ہوا۔ چین سے اپنے روابط کے قیام کے ساتھ ساتھ میں سوویت یونین سے ڈائیلاگ شروع کرنے کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا چنانچہ اکتوبر 1960 میں اقوام متحدہ سے واپسی کے فوراً بعد میں نے ایندھن اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے ماسکو جانے کا ارادہ ظاہر کیا تاکہ پاکستان میں تیل اور معدنی وسائل کی تلاش کے لئے روس کے تعاون کے امکانات پر غور کیا جا سکے۔

ہماری اپنی حکومت نے اس میدان میں میرے لئے دشواریاں پیدا کیں ایوب خان کی کابینہ کے بعض با اثر ارکان نے انہیں مشورہ دیا کہ یہ دورہ "قطعاً غیر مناسب" ہوگا۔ جب لگاتار بحث و تمحیص کے بعد یہ مزاحمت ختم ہوئی تو میرے وفد کے ایک قریبی رکن نے جو دہلی گئے تھے یہ اطلاع دی کہ وہ بیمار پڑے ہوئے ہیں میرے ایک اور اہم مشیر کو یہ تاکید کی گئی کہ وہ میرے ساتھ ماسکو میں چند دن سے زیادہ قیام نہ کریں پھر دونوں ملکوں کے درمیان طے پانے والے سمجھوتہ پر دستخطوں سے ایک دن پہلے مجھے واپس پہنچنے کی ہدایت کی گئی اور یوں بالآخر کراچی میں میں نے اور روس کے سفیر نے اس سمجھوتے پر دستخط کئے۔ 1960 میں میں نے جس کوشش کا آغاز کیا تھا اس کے ذریعہ رفتہ رفتہ دونوں ملکوں کے درمیان

www.bhutto.org

دوستانہ اور مفید تعلقات کی راہیں ہموار ہو سکتی تھیں، لیکن ایک جانب پاکستان کے سابق حکمران کی کور نگاہی اور روس کے بارے میں ان کا رویہ تھا تو دوسری طرف ہمارے علاقے میں بھارتی مفادات کے ساتھ روسی مفادات کی قریبی وابستگی کے لئے سوویت حکمت عملی کا افسوسناک رجحان اس راہ میں حائل رہا۔ میں اس موقع پر 1960ء اور 1966ء کے درمیان رونما ہونے والے ان تمام بین الاقوامی واقعات کا تذکرہ ضروری نہیں سمجھتا جن میں پاکستان براہ راست ملوث رہا۔ اس زمانہ میں خاص طور سے 1963ء تا 1964ء اور ستمبر 1965ء کی جنگ کے زمانہ تک پاکستان اس صلاحیت کے حصول کے لئے کوشاں رہا جس کے ذریعہ وہ عالمی صورت حال کے محرکات کو محسوس کر سکتا اور بڑی طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی اس نہج کو ترک کر سکتا جو تنگ نظری یک رخی اور سب کچھ یا کچھ بھی نہیں کی بنیادوں پر قائم تھیں۔ 1962ء میں برصغیر کا دورہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کسنجر نے کہا تھا کہ پاکستان
یعنی معاہدوں کے مرض میں مبتلا ہے۔ ان کا کہنا عالمی صورتحال کے گہرے مشاہدے پر مبنی تھا اور اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک ایسی قومی پالیسی جو عملاً صرف ایک مقررہ رخ پر متحرک ہو نہ اس قوم کے لئے کوئی اثاثہ ثابت ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے حلیفوں کے لئے لہٰذا خود اپنے فائدے کے لئے اپنے علاقے میں توازن کی بحالی کے عظیم تر مفادات میں پاکستان نے اپنے سفارتی رابطوں کو چین اور روس کے ساتھ سرگرم عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان دونوں ملکوں کے ساتھ اگرچہ روابط تھے لیکن ان میں دوستانہ سرگرمی بہت کم رونما ہوئی تھی 1962ء میں بھارت اور چین کے جھگڑے کے دوران پاکستان میں بعض مخصوص مفادات کے ایسے نمائندے موجود تھے جو چاہتے تھے کہ امریکی اسلحہ کو پاکستان کے راستے بھارت پہنچانے کی اجازت دے دی جائے اب اس قسم کے مفادات اور منصوبوں کو ناکام بنانے کا وقت آن پہنچا تھا۔

تاہم اس راہ میں جو حالات و واقعات رکاوٹ بنے ان کے دو رخ تھے اول امریکہ میں چین دشمنی کے آسیب میں مبتلا لنڈن جانسن کی انتظامیہ کا پاکستان پر زبردست دباؤ جس میں امریکہ پاکستان کی پالیسی میں تبدیلی چاہتا تھا۔ چین کے بارے میں ہر قدم کو امریکی انتظامیہ جس شک و شبہ سے دیکھتی تھی اس کی انتہا یہ تھی کہ اس نے اگست 1963 میں ڈھاکہ ایئرپورٹ کے لئے 43 لاکھ ڈالر کا قرض محض اس لئے معطل کر دیا کہ پاکستان نے چین کے ساتھ شہری ہوابازی کے ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپریل 1965 میں ایوب خان کو امریکہ کے لئے دی گئی دعوت کی تنسیخ جولائی 1965 میں پاکستان کو امداد دینے والے کنسورشیم کے اجلاس کا التواء 1965 میں پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستان کو اسلحہ کی فراہمی پر پابندی جو بھارت کے خلاف نہیں بلکہ براہ راست پاکستان کے مفادات کے خلاف تھی سولہ ستمبر 1965ء کو چین کو انتباہ کیا کہ وہ پاکستان کی مدد نہ کرے یہ تمام اقدامات چین کے ساتھ ڈائیلاگ اور دوستی کی پالیسی کی مخالفت میں تھے۔ ہماری راہ میں حائل حالات و واقعات کا دوسرا رخ اگرچہ پہلے واقعات کے متوازی تھا لیکن دونوں کا منبع تقریباً ایک ہی تھا۔ یہ دوسرا رخ تھا 1965 کی پاک

www.bhutto.org

بھارت جنگ میں روس کا رویہ اور جنوری 1966 میں اعلان تاشقند کا اجراء حالات وواقعات کے ان سلسلوں میں سے کوئی ایک بھی پاکستان کی خارجہ حکمت عملی میں کسی الجھاؤ کا سبب نہیں بن سکتا تھا بشرطیکہ ملک کی قیادت بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کے قابل ہوتی اور عارضی ناکامیوں کے باوجود تحمل اور استقامت کا ثبوت دیتی اور پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ آئندہ برسوں میں عالمی صورت حال میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے مطابق خود امریکہ نے چین کے بارے میں پاکستان کی پالیسی کے درست ہونے کا ثبوت فراہم کیا لیکن حیف کہ پاکستان کی جنتا کی نالائقی کے سبب ملک کو اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ 1965ء66 کا ذکر ہے جب میں نے صدر جانسن کے وزیر خارجہ مسٹر رسک تک یہ بات پہنچائی کہ پاکستان چین اور امریکہ کے درمیان ایک پل کا کام دے سکتا ہے پھر جب انقرہ میں ڈین رسک کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران ہم نے اس امکان کا جائزہ لیا تو ایوب خان خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں اس معاملہ میں اپنی انگلیاں نہیں جلانی چاہئیں۔

دوسری جانب سے پہلی بار یہ تجویز پیش ہونے کے بعد پانچ انتہائی اہم اور تباہ کن سال بیت گئے اور 1971ء میں جب ہم اپنی انگلیوں کے علاوہ بہت کچھ جلا بیٹھے تو یحییٰ خان کی حکومت نے پاکستان کے راستے پیکنگ کے خفیہ مشن پر ڈاکٹر کسنجر کی پرواز کے انتظامات کئے چین اور امریکہ کے درمیان براہ راست ڈائیلاگ کا آغاز پاکستان کے لئے بجائے خود بہت پرمسرت موقع تھا پیکنگ میں وزیر اعظم چو این لائی نے ڈاکٹر کسنجر سے کہا تھا اس پل کو فراموش مت کر دینا جس پر گزر کر آپ یہاں تک پہنچے ہیں لیکن پاکستان کی جانب سے یہ بدلتے ہوئے حالات بھی مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی اور بھارت کے ساتھ سرحدوں پر کھنچاؤ کے سیاق وسباق میں گم ہو کر رہ گئے اس نئی صورت نے جس قسم کی خیال آرائیوں کو ہوا دی ان سے با آسانی محفوظ رہا جا سکتا تھا بشرطیکہ روس کو مطمئن کرنے کے لئے متوازی راستے اختیار کئے جاتے چنانچہ اصل واقعات کے پیش نظر میں راولپنڈی کے راستے ڈاکٹر کسنجر کے پیکنگ کے دھماکہ خیز سفر کا فوری نتیجہ روس بھارت سمجھوتے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سمجھوتے کا مسودہ گذشتہ تین برس سے زیر غور تھا جس پر اگست 1971ء میں دستخط ہوئے اس سمجھوتہ کے بل بوتے پر بھارت نے نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان پر فوجی چڑھائی کر دی پاکستان اور چین کے باہمی تعلقات مذکورہ حالات کے شدید دباؤ کے علاوہ بھی ہر قسم کے گرم وسرد حالات میں ہمیشہ مستحکم رہے ہیں۔ ان تعلقات کی اصل قوت دونوں فریقوں کا خلوص ہے لیکن دوطرفہ تعلقات کے تصور کی اصلی روح یہ ہے کہ پرخلوص باہمی تعلق دو دلوں کا معاملہ بن کر نہ رہ جائے جس میں احتیاط کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور جو دونوں طرف بوجھ بن جاتا ہے۔

کچھ برس پہلے 1966ء میں اعلان تاشقند کے بعد ایوب خان نے محض ظاہرداری کے لئے بعض کوششیں بھی کیں اور سوویت یونین کی مصالحت پر اس کی تعریف کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے یہ قدم اگرچہ چین اور روس کے ساتھ دوستانہ تعلق کی ضرورت کے احساس کے تحت اٹھایا تھا لیکن وہ اس بنیادی اصول کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ دوطرفہ تعلقات کا تصور دو ملکوں کے مجموعی اور مسلسل باہمی تعلقات

کے حاصل کل سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا انحصار کسی ایک واقعہ پر نہیں ہوتا۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے نقطہ نظر کو سرکاری یادداشتوں میں اس طرح بیان کیا تھا کہ بڑی طاقتوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے لئے ہمیں ہر واقعہ اور ہر اقدام پر بھروسہ نہیں کر لینا چاہئے، خواہ وہ ہمارے حق میں ہو یا اس کے برعکس کیونکہ اس طرح ملک کے تعلقات میں کوئی تسلسل ہو گا اور نہ وہ یقینی ہوں گے۔ لیکن اس قسم کے ماحول میں جہاں بین الاقوامی مسائل کے بارے میں پورا رویہ ہی متلون مزاجی کا حامل ہو وہاں اس قسم کی عرض داشتوں پر کون کان دھرتا ہے۔ یہاں میں چاہتا ہوں کہ اپنی ذات سے متعلق یہ حقیقت بھی بتا دوں کہ پاکستان کی پالیسی میں وقوع پذیر تبدیلی کو دیکھتے ہوئے اور جان لینے کے بعد کہ دوطرفہ تعلقات کے تصور کے بارے میں میری تمام تر وضاحتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوا میں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے 1966ء میں استعفیٰ دے دیا۔

پچھلے چند برسوں کے دوران بعض عالمی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور اپنے تاریخی پس منظر میں ان کی اہمیت ان تین واقعات جیسی ہی ہے جن کا میں نے ابتداء میں ذکر کیا تھا۔ یعنی اقوام متحدہ کا قیام، نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ اور عوامی جمہوریہ چین کے عالمی نقشے پر ابھر آنا۔ حالیہ برسوں کے اہم واقعات مختصراً یہ ہیں اول نہ صرف تیسری دنیا بلکہ مغربی اور سوشلسٹ ملکوں میں قوم پرستی کا احیاء، دوئم یورپ، جاپان، سوشلسٹ دنیا اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں حالیہ مشکلات کے باوجود اقتصادی خوشحالی کے حصول میں کامیابی جس کے باعث طاقت کے محور بکھر گئے ہیں۔ سوئم ایٹمی قوت کے میدان میں مساوی سطح پر آنے کے بعد امریکہ اور روس کے درمیان وتیانت کی پالیسی ان تمام واقعات نے ایک ایسی معروض عالمی صورتحال کو جنم دیا ہے جس میں دوطرفہ تعلقات کے نظریہ پر عمل درآمد کے لئے نہ صرف زمین پہلے سے زیادہ ہموار ہے بلکہ اب صرف دوطرفہ تعلقات کا نظریہ ہی وہ میدان رہ گیا ہے جس پر ایک ترقی پذیر قوم بڑی طاقتوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ اس دور میں جہاں تک پاکستان کے تجربے کا تعلق ہے تو 1971ء کے تباہ کن واقعات کے بعد اس نے دوبارہ زندگی حاصل کی ہے اور اسی احیاء کے باعث میں ان اصولوں کے اجزائے ترکیبی پر بحث کر رہا ہوں، جن اصولوں کو میں ایک قابل عمل خارجہ حکمت عملی سمجھتا ہوں۔ مستقل بنیادوں پر صاف ستھرے دوطرفہ تعلقات کے قیام کے لئے ایک بنیادی شرط غیر جانب داری کا عنصر ہے۔ وہ اس لحاظ سے کہ ایسے تعلقات متعلقہ ملکوں کے مشترکہ قومی مفادات کے دائرے میں محدود ہوتے ہیں اور ان حدود سے اس طرح تجاوز نہیں کیا جا سکتا کہ تیسرے ملک کے مفادات مجروح ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے ملک اور ایک عالمی طاقت کے درمیان ایسی صورت میں دوطرفہ تعلقات کیسے قائم رہ سکتے ہیں، جب کسی چھوٹے ملک کے قومی مفادات کسی خاص صورت حال میں عالمی طاقت کے مضافیاتی مفادات اور فوجی تدابیر سے متصادم ہوں اس کا جواب یہ ہے کہ متعلقہ بڑی طاقت کے ساتھ براہ راست گفت و شنید کے ذریعے نقطہ اختلاف کو الگ تھلگ کر کے ایک قابل عمل مساوی توازن دریافت کیا جائے ظاہر ہے کہ متصادم مفادات کو دوسرے مشترکہ مفادات سے علیحدہ کرنے کے لئے دونوں کو کسی

www.bhutto.org

لاگ لپیٹ کے بغیر کشادہ دلی اور ایک دوسرے کے لئے مساوی جذبات سے کام لیناہو گا۔ اور یوں نقطہ اختلاف کو براہ راست اور بے مقصد تصادم سے زیادہ سے زیادہ دور رکھ کر چھوٹا ملک اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کی آزادی برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہ کام وہ عالمی رائے عامہ کی اخلاقی حمایت حاصل کر کے کر سکتا ہے ۔ جو متعلقہ بڑی طاقت کو اس بات پر مائل کر سکتی ہے کہ وہ اپنے ہی آزادانہ مفاد میں اپنی پوزیشن تبدیل کرے۔

اس قسم کے تعلقات میں ایک طرح کی درجہ بندی یا حفظ مراتب کا عنصر بھی کم از کم دباؤ اور کشیدگی کے ساتھ شامل ہوتا ہے اس درجہ بندی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ایک ملک اہم بین الاقوامی مسائل پر جن میں براہ راست ملوث ہو اصولوں کی بنیاد پر کیا موقف اختیار کرتا ہے اور ان اصولوں کی بنا پر دوسروں کی نظروں میں اس کا وقار کتنا ہے اگر ایک ملک اس امداد اور تعاون کو نظرانداز کر کے جو اسے ایک بڑی طاقت سے حاصل ہوا ہو اس کے ساتھ ویسے ہی خوشگوار اور راست بازی کے تعلقات استوار کرے جیسے تعلقات اس دوسری طاقت کے ساتھ ہوں جس نے امداد اور تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا ہو تو ایسے ملک کا کوئی وقار نہیں رہتا اور وہ اپنا بھرم کھو بیٹھتا ہے جب کوئی ملک مختلف شعبوں میں باہمی تعاون کے لئے یہ شرط عائد نہیں کرتا کہ متنازعہ مسائل پر ضرور اس کی حمایت کی جائے تو دوسرے الفاظ میں وہ یہ اعلان بھی نہیں کرتا کہ ایسی حمایت کا بین المملکتی تعلقات کی قربت ان میں گرم جوشی اور ان کی گہرائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ دوطرفہ تعلقات کے اجزائے ترکیبی میں دونوں فریقوں کا باہم سلوک و معاملات میں مساویانہ طرز عمل ایک لازمی جزو ہے۔ جب ایک چھوٹا ملک کسی بڑی طاقت کے ساتھ اپنے تعلقات میں استقامت کا خواہاں ہوتا ہے جب وہ ایک ملک کے ساتھ اپنے تعلقات کو کسی دوسرے ملک کے ساتھ قائم شدہ تعلقات کی حدود اور وسعت میں خلل انداز نہیں ہونے دیتا اور جب وہ بڑی طاقتوں کی باہم آویزش سے طے شدہ جانب داری سے احتراز کرتا ہے تو پھر دوسری جانب سے بھی اسی قسم کے مساویانہ طرز عمل کی توقع کرتا ہے بین المملکتی تعلقات میں کسی پالیسی کی پابندی ایک طرفہ نہیں ہو سکتی۔ دوطرفہ تعلقات میں یہ کوئی انصاف نہیں کہ چھوٹا ملک تو اپنے آپ پر قانون نفس کشی نافذ کرے اور دوسرا فریق جواباً اس قسم کا کوئی قدم نہ اٹھائے۔ اس قسم کے تعلقات میں بعض اساسی اصولوں پر دونوں ملکوں کے مابین سمجھوتہ لازمی ہے ورنہ چھوٹے ملک کی حیثیت محض ایک قابل رحم طفیلی کی رہ جائے گی اور دوطرفہ تعلقات کا نظریہ اپنی اصلیت گنوا کر ایک مسلک جانبداری کی حیثیت اختیار کرے گا دو ملکوں کے درمیان مساویانہ باہمی طرز عمل کی کم سے کم ناقابل تخفیف مثال یہ ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے کی علاقائی حدود اور خود مختاری کا احترام کیا جائے اور ایک دوسرے کے داخلی معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے۔ یہ اصول کسی وضاحت کے محتاج نہیں اور دنیا میں ایسے بہت کم ممالک ہوں گے جو ان اصولوں کو تسلیم نہیں کرتے جو اقوام متحدہ کے چارٹر میں بھی موجود ہیں اور بنڈونگ کانفرنس (1955ء) کے عالمی امن و تعاون کے اعلان کے علاوہ دیگر بین الاقوامی ضابطوں میں کئی مقامات پر ان اصولوں کا اعادہ کیا گیا ہے۔

لیکن دنیا میں ایسے چند ملک موجود ہیں جنہوں نے ان اصولوں کی توثیق نہیں کی ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ آخر دو ملک اس وقت تک آپس میں کسی قسم کے تعلقات کیسے قائم کر سکتے ہیں جب تک وہ ایک دوسرے کی جغرافیائی سرحدوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کی خود مختاری کا احترام نہیں کرتے اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کی پابندی قبول نہیں کرتے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ دوطرفہ تعلقات میں ان ذمہ داریوں کا بوجھ چھوٹے ملک کی نسبت بڑی طاقت پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ چھوٹے ملک کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بڑی طاقت کی جغرافیائی سرحدوں پر معترض ہو یا اس کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرے۔ ہو سکتا ہے کہ بڑی طاقت بھی بجائے خود اس قسم کی کارروائی نہ کرے۔ لیکن وہ ایسی صورتحال میں خاموش رہ کر ایسی کارروائیوں کی حوصلہ افزائی کر سکتی جس سے چھوٹے ملک کے علاقائی استحکام یا اپنے خود طے کرنے کے حق کے بارے میں شک وشبہ پیدا ہوتا ہو یہ چھوٹے ملک کے لئے باہمی تعلقات سے ان مسائل کو علیحدہ کرنا جن پر دونوں ملکوں کے نقطہ نظر میں اختلاف ہو۔

اور انہیں اس حد تک پھیلنے سے روکنا کہ وہ ان شعبوں پر اثر انداز نہ ہونے لگیں جہاں باہمی مفاہمت موجود ہو ایک بات ہے لیکن ایسے بنیادی معاملات میں جن کا تعلق علاقائی استحکام یا سیاسی آزادی سے ہو سر تسلیم خم کر دینا یا طمانچے کے لئے دوسرا گال حاضر کر دینا یکسر جدا چیز ہے کوئی ملک ایسی مخالف طاقتوں کے ساتھ دوطرفہ تعلقات پر فخر نہیں کر سکتا جن کی پالیسیاں اس کے لئے اپنے بنیادی مفادات سے متصادم ہوں۔ اس کے علاوہ غیر مساوی بین الاقوامی حیثیت کے دو ملکوں کے درمیان دوطرفہ تعلقات میں" جو دو وہی لو" قسم کی مساوات ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ایک ملک کا بین الاقوامی دائرہ اثر زیادہ وسیع ہے اور وہ کہیں زیادہ قوت پر اختیار رکھتا ہے لہٰذا دوسرے ملک کے دوستانہ تعاون کے مقابلے میں اسے زیادہ قوی ملک کو اپنی جانب سے کچھ زیادہ حصہ دینا پڑے گا ایسا ہر قدم جس کا مقصد اس حصہ کی ادائیگی کو روکنا ہو' ایک بچے تلے جوابی اقدام کو دعوت دے گا ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تعلقات ختم نہ ہوں لیکن اس کے لازمی نتائج ضرور بر آمد ہوں گے اور پھر تعلقات کا انداز بھی مختلف ہو گا۔ اس وقت ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوطرفہ تعلقات کے نظریہ پر قائم خارجہ حکمت عملی میں ایک بڑی طاقت اور ایک ترقی پذیر قوم کا معاہدہ برقرار رہ سکتا ہے؟

اس کا جواب اثبات میں ہے تاہم یہ سوال پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے اگر بڑی طاقتوں کی ان سال ہا سال کی کوششوں کو نظرانداز کر دیا جائے جن کی پشت پر عالمی رائے عامہ کے مشوروں اور اپیلوں کا شدید دباؤ بھی رہا ہے چونکہ بڑی طاقتوں کی ان تمام کوششوں کا مقصد عالمی طاقتوں کے درمیان آویزش کا کوئی عملی تصفیہ دریافت کرنا تھا اور چونکہ ان طاقتوں کے درمیان اچانک جنگ چھڑ جانے کا خطرہ جس کا نتیجہ دنیا کی مکمل تباہی ہوتا' اب حقیقت سے دوچار ہوتا جا رہا ہے اس لئے عالمی جنگ کے خطرے کے مفروضے پر کسی بڑی طاقت کے ساتھ دفاعی سمجھوتے میں شامل کسی نئے دوسرے ملک کے لئے ایسی کوئی فوری اور ناگزیر

www.bhutto.org

وجہ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنی تمام تر سفارتی کوششوں اور سمجھوتوں کو تعاون اور امن کے لئے وقف کر دے۔ یہ حقیقت حال ہر ملک پر صادق آتی ہے خواہ وہ دوطرفہ تعلقات کا ذریعہ اختیار کرے یا نہ کرے اس کے علاوہ بھی بین الاقوامی صورت حال میں بعض ایسی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں جو فریقین کے لئے مساوی طور پر فوجی معاہدوں کی تعریف پر اثر انداز ہوتی ہیں 15 برس پہلے بین البراعظمی بیلسٹک میزائل کی ایجاد نے جنگی حکمت عملی میں تبدیلیاں پیدا کیں اور اس کے نتیجہ میں محیط دفاعی انتظامات کا قدیم تصور بھی بدل گیا اور یوں ان فوجی معاہدوں کی اہمیت بھی ختم ہو گئی جو اس تصور سے ہم آہنگ تھے ان بدلے ہوئے حالات میں فوجی معاہدوں کو وجود میں لانے والے یا مختلف ملکوں کو ملا کر انہیں مکمل طاقت کے یونٹوں میں تبدیل کرنے والے عالمی طاقتوں کے محرکات کا نقشہ بھی لامحالہ زبردست تبدیلیوں سے دوچار ہوا ہے دوطرفہ تعلقات کا نظریہ اس تبدیلی کا محرک نہیں بلکہ اس کی پیداوار ہے دوطرفہ تعلقات کا نظریہ فوجی معاہدوں کے ساتھ بے جوڑ نہیں ہے اور اس دعوے کو اس واضح حقیقت سے تقویت حاصل ہوتی ہے کہ فوجی معاہدے کسی بھی فریق کو تمام شعبوں میں دوٹوک احکامات کا پابند نہیں کرتے یہ معاہدے چھوٹے ملک کو ایسے تنگ اور دشوار راستے کا پابند نہیں کرتے جس سے انحراف کی اسے اجازت نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو ڈپلومیسی اپنے اخلاقی پہلو اور نصب العین سے عاری ہو جائے گی لہٰذا دونوں حلیفوں کے لئے اپنے اپنے قومی مفادات کے مطابق ڈپلومیسی پر عملدرآمد کے لئے بہت کافی گنجائش موجود ہے غیر معمولی اور پریشان کن صورت احوال کو برداشت کرنے یا اس سے نپٹنے کے لئے ایک معاہدہ میں دونوں فریقوں کے مفادات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تاہم ایسی صورت میں بھی ایک دوسرے کے لئے مصالحت اور مفاہمت کی گنجائش مساوی سطح پر نہیں ہو سکتی۔ ایک عظیم طاقت کے بنیادی مفادات کا تحفظ تو اس کی اپنی عظمت کے ذریعہ ہی ہو جاتا ہے جبکہ وہ چھوٹا ملک جو معاہدے میں اس کا حلیف ہے اس کے مفادات معاہدہ نہ ہونے کی صورت میں خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ اگرچہ چھوٹا ملک اپنے گہرے جذبات فراموش کئے جانے پر خاموشی اختیار کرلے اور تابع فرمان کی حیثیت قبول بھی کرلے تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تغیر پذیر بین الاقوامی حالات میں بڑی طاقت کسی مرحلہ پر یہ فیصلہ کرلے کہ معاہدہ فرسودہ اور ناقابل عمل ہو چکا ہے اس سے دو نتائج نکلتے ہیں اول یہ کہ دوطرفہ تعلقات کا نظریہ کسی بھی لحاظ سے بڑی طاقتوں کے ساتھ دفاعی معاہدوں کو رد نہیں کرتا دوئم یہ کہ دوطرفہ تعلقات کے موقف اور کسی معاہدہ سے وابستگی کا امتزاج کر دینے سے بین الاقوامی امور میں عملی دشواریاں پیدا ہوتی رہیں۔ یہ دشواریاں ان حالات میں بڑھ جاتی ہیں جہاں ایک خاص معاہدہ کا نظام یا تنظیم جو اپنے ارکان کے درمیان دوطرفہ معاہدوں یا مفاہمت سے الگ تھلگ ہو اس لگاؤ اور قوت سے محروم ہو جائے جو ایک مختلف تاریخی صورت حال میں اس کے لئے متعین کی گئی ہو۔ دوطرفہ تعلقات کے نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ اول تو ایک معاہدے کے ان اصولوں کو مضبوطی سے تھام لیا جائے جو عالمی حالات میں رونما ہونے والے تمام تر تغیرات میں بھی اپنی معنویت اور افادیت سے محروم نہ ہوں اور ان اصولوں کے تحت عاید ہونے والی ذمہ داریوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ طرز عمل کے جذبہ سے پورا کیا جائے دوئم

www.bhutto.org

یہ کہ معاہدہ کا وہ حصہ جسے یہ اصول احاطہ نہیں کرتے اسے علیحدہ کر دیا جائے اور اس سلسلے میں ملک کے اپنے اختیارات کو بروئے عمل لایا جائے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عمل کا انحصار کس بات پر ہے؟ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایک ملک کا بنیادی محرک اس کا اپنا قومی مفاد ہوتا ہے لیکن جب کوئی بین الاقوامی مسئلہ اس مفاد سے تصادم ہو کر بے یقینی یا شک وشبہ کی ایسی فضا قائم کر دے جس میں وہ قومی مفاد بجائے خود متنازعہ فیہ بن جائے تو پھر انصاف کے لئے واحد معیار اس مسئلہ کا اصل حسن وقبح رہ جاتا ہے مجھے معلوم ہے کہ تنازعہ کا ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ تنازعہ کی تمام باتیں اس کے حق میں ہیں تاہم میرا دعویٰ ہے کہ یہ کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی بنا پر مایوس ہو کر اس پیمانے ہی کو رد کر دیا جائے مسائل وواقعات کو ان کے اپنے محاسن وعیوب کی روشنی میں پرکھنے کے لئے ہمارے سامنے حقیقی اور عملی معیار موجود ہیں۔ (الف) بین الاقوامی قانون کے تسلیم شدہ اصول (ب) اقوام متحدہ کی قراردادیں (ج) میثاق کے تحت عائد ذمہ داریاں (د) تنازعہ کے بارے میں ایک فریق کے موجود نقطہ نظر کا اس کے گذشتہ اعلانات اور بیانات اور ملتے جلتے تنازعوں کے بارے میں دوسرے ملکوں کے تسلیم شدہ موقف سے اختلاف یا مطابقت (ہ) اور جب دوسرے کسی معیار کے تحت کوئی واضح فیصلہ نہ ہو سکے تو تنازعہ کے تصفیہ کے لئے علاقائی سطح پر قائم کی جانے والی مشینری کی سفارشات ان اصولوں پر اقوام متحدہ کے فلسفہ قانون میں بالتفصیل بحث کی جا چکی ہے۔ لہذا ان کی مزید وضاحت ضروری نہیں یہ درست ہے کہ بہت سے معاملات میں عالمی تنظیم کی کوششیں لاحاصل رہی ہیں یہ بھی درست ہے کہ اس ادارے کے موثر ہونے کے بارے میں دنیا کے اعتماد کو بڑا دھچکا لگا ہے تاہم اقوام متحدہ کی بے بضاعتی بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ بین الاقوامی تنازعوں کے تصفیہ کے لئے تنازعہ کے اپنے حسن وقبح کے سوا کوئی اور اصول اختیار کیا جائے اگر اقوام متحدہ کی سفارشات اور فیصلے کسی بین الاقوامی صورتحال کو مقصد کی سچائی سے ہم آہنگ نہ کر سکیں تب یہ نصب العین عوامی تحریکوں اور تاریخی عوامل کے بروئے کار آنے سے حاصل ہو جاتا ہے اگرچہ اس کے لئے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اقوام متحدہ سرگرم عمل ہو یا نہ ہو بین الاقوامی امور کو صرف ان کے اپنے حسن وقبح کے خطوط پر چلایا جا سکتا ہے۔ طاقت کی سیاست کسی حقیقت کو توڑ مروڑ سکتی ہے ارتقاء کی رفتار کو سست کر سکتی ہے لیکن آج کا دور بھی جس میں کشمیر اور فلسطین کی حوصلہ شکن مثالیں ہیں یہ بات قطعی طور پر ثابت نہیں کر سکا ہے کہ طاقت کی سیاست کی دروغ بافیاں بالآخر تار عنکبوت ثابت نہیں ہوں گی پاکستان کے موجودہ مسائل کی دو مختلف مثالیں اس ضمن میں مناسب نظر آتی ہیں اول ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کے بارے میں بھارت کے ساتھ ہمارا تنازعہ اس مسئلہ پر ہم ایک موقف پر قائم ہیں اور ایسا کوئی موقف اختیار نہیں کریں گے جو تنازعہ کے اپنے حسن وقبح کی حقیقی معیار سے مطابقت نہ رکھتا ہو دوسرا مسئلہ جو اتنا تکلیف دہ نہیں اور نہ ہی تنازعہ کشمیر کی طرح طویل ہے وہ ہے پاکستان کے لئے "ہیوی واٹر" کی سہولتیں اور ایٹمی ری پراسیسنگ پلانٹ کے حصول کا مسئلہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کی اس ضرورت کو امریکہ کے بعض عناصر نے یکسر غلط طور پر سمجھا ہے۔

www.bhutto.org

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ان عناصر کی مخالفت ایٹمی طاقتوں کے دائرہ سے باہر ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ پر گہری تشویش کے سبب ہے پاکستان بھی اس تشویش میں شامل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ پر پاکستان کے اندیشوں کا سبب اس مسئلہ پر کسی بھی حلقہ کی انتہائی ہمدردانہ رائے سے زیادہ وزنی ہے۔ ہم رضاکارانہ طور پر باربار اور بہت واضح الفاظ میں یقین دہانیاں کرا چکے ہیں کہ ہمارے ایٹمی پروگرام کے مقاصد پرامن ہیں مبادا یہ سمجھا جاتا کہ یہ سب کچھ محض زبانی وعدے ہیں ہم نے اس منصوبے کے ہر ایک مرحلہ پر ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی کے عائد کردہ آہنی تحفظات کو قبول کر لیا بلکہ ہم اس سے بھی دو قدم آگے گئے اور ری پراسیسنگ پلانٹ فراہم کرنے والے ملک فرانس کی وہ انتہائی کڑی شرائط بھی منظور کر لیں جو ایٹمی سامان برآمد کرنے والے سات ملکوں کے اختیار کردہ رہنما اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اس پلانٹ کی سپلائی کے لئے ہونے والے معاہدے کے ساتھ بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے بورڈ آف گورنرز کی اتفاق رائے کی منظوری سے سہ طرفہ تحفظات کا معاہدہ ہوا تھا۔ ہم پہلے بھی کناڈا اور وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ساتھ ایک ایٹمی ری ایکٹر اور ایک چھوٹے ہیوی واٹر پلانٹ کے استعمال کے سلسلے میں تمام مناسب احتیاطی تقاضوں کو پورا کر چکے ہیں۔ اپنے ایٹمی منصوبوں کے صرف اور صرف پرامن استعمال کے بارے میں ہمارے وعدے کی سچائی میں ان سے بڑھ کر اور کیا دلیل پیش کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا اپنے پرامن ایٹمی پلانٹ میں پاکستان کا آگے بڑھنا ایٹمی اسلحہ کے پھیلاؤ کے حوالے سے کوئی خاص واقعہ نہیں اس کے باوجود اسے ایک غیر معمولی واقعہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جب کہ اسرائیل جنوبی افریقہ اور بھارت کے بے قید اور بے لگام ایٹمی پروگرام معمول کے مطابق قرار دیئے جاتے ہیں یہ بھی مسئلہ کو اس کے حقیقی حسن و قبح پر پرکھنے کے اصولوں کا حشر اور اس کے ذمہ دار ہیں جو خود ان اصولوں کے علمبردار بنتے ہیں اور بظاہر ان سے روگردانی پسند نہیں کرتے۔ بھارت پہلے ہی عین ہماری سرحد پر ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے اب اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس نے متعدد ایٹمی دھماکے کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔

بھارت کی موجودہ ایٹمی صلاحیت جس خام مواد اور ٹیکنالوجی سے تعمیر ہوتی ہے وہ اس میں کینیڈا سے ملنے والے ری ایکٹر اور امریکہ کے فراہم کردہ "ہیوی واٹر" سے حاصل کی ہے اور یہ دونوں سہولتیں بھارت کو ضروری تحفظات کے بغیر فراہم کر دی گئی تھیں کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں جانبداری یا امتیازی سلوک نہیں برتا گیا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی طاقتوں کی ایٹمی اجارہ داری کو عالمی توازن اور امن کے مفادات میں منصفانہ طور پر استعمال کیا جا رہا ہے نہ صرف پاکستان بلکہ وہ تمام ملک جو ایٹمی ہتھیاروں کے مالک نہیں اس ضمن میں کسی یقین دہانی کا بڑی خوش دلی سے خیر مقدم کریں گے۔

اگر ایک ترقی پذیر قوم بڑی طاقتوں کے مابین کسی تنازعہ کے جاری رہنے یا اس سے شدت اختیار کر لینے سے وابستہ مفادات کو واضح طور پر ترک کر دیتی ہے تو اس سے بڑی طاقتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے

www.bhutto.org

کہ وہ بھی غیر متوازن علاقائی حالات کو خاموشی کے ساتھ درست قرار دینے یا انہیں مزید خراب کرنے کی پالیسی اختیار نہ کریں صرف اسی طرح بڑی طاقت اور ترقی پذیر ملکوں کے مابین دوطرفہ تعلقات باہم کشیدگی سے پاک رہ سکتے ہیں صرف اسی طرح اصولوں کا ڈھانچہ مستحکم ہو سکتا ہے جس میں رہتے ہوئے ایک ملک کسی بڑی طاقت پر بوجھ بنے بغیر اپنی شراکتوں کو نقصان پہنچائے بغیر اور اپنی ذمہ داریوں کو روکے بغیر خارجہ معاملات میں اپنے مقاصد کے لئے کوشاں ہو سکتا ہے دوطرفہ تعلقات کا نظریہ کسی نمود و نمائش کے بغیر یہ ڈھانچہ فراہم کرتا ہے خواہ افراد کا معاملہ ہو یا ملکوں کا کوئی ایسا ضابطہ کار بہرحال ممکن نہیں جو تمام تغیر پذیر حالات اور مستقبل میں کسی بھی وقت اچانک رونما ہونے والے واقعات کو احاطہ کر سکے لہٰذا پیچیدہ مسائل کے حل کے لئے کسی بنیاد کی ضرورت ہو تو کسی حد تک ہمیں کسی نہ کسی عالمگیر سچائی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔" تم انہیں ان کے پھلوں سے پہچان لو گے"

دوطرفہ تعلقات کا نظریہ اختیار کرنے سے پہلے پاکستان کی خارجہ پالیسی ایک طرف اپنے بدترین دور میں تلون مزاجی کا شکار تھی تو دوسری طرف ایک بھولی بسری نظریاتی اساس پر سود مندانہ حقیقت پسندی کا پیوند' دوطرفہ تعلقات کے اصول کو اختیار کر لینے کے بعد پاکستان اپنے سفینہ کو ان ناقابل اعتبار ساحلوں کے پوشیدہ خطرات اور منجدھار کی طغیانیوں سے صحیح سالم نکال لایا ہے جو آج پیچیدہ دور میں ان تمام ملکوں کی راہ کا مقدر ہے جن کی جغرافیائی حیثیت عالمی سیاست کی بساط پر کسی خاص اہمیت کی حامل ہیں دوطرفہ تعلقات کا نظریہ اس بحر متلاطم میں وہ سمت نما ہے جو منزل کی طرف سفینہ کا رخ متعین کرتا ہے اور پھر اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ اصول اختیار کر لینے سے پاکستان کو بین الاقوامی معاملات میں امانت و دیانتداری کے بارے میں اسلام کے احکامات پر حتی الامکان عمل پیرا ہونے میں مدد ملی ہے یہ احکامات ابدی ہیں۔

1976

پانچواں حصہ

پاک بھارت تعلقات اور کشمیر

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان کی تباہی کے لئے نہرو پلان

ذوالفقار علی بھٹو کی ایک انتہائی خفیہ فائل

زیرِ نظر مضمون پنڈت نہرو کی وفات کے بعد جناب بھٹو نے لکھا تھا' اس وقت جناب بھٹو پاکستان کے وزیرِ خارجہ تھے۔ اسٹیٹ بنک پریس نے اس کی پانچ سو کاپیاں تیار کی تھیں۔ تاکہ پاکستانی سفارت خانوں اور متعلقہ شعبوں کو دی جاسکیں۔

جواہر لال نہرو کی موت' بھارت کے لئے ایک مہلک صدمہ ثابت ہوئی ہے۔ اس ملک کا مقدر اور مستقبل۔ اب مرکز گریز قوتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ مردہ نہرو کی یاد کب تک اس کے ہم وطنوں کو بھانت بھانت کی بولیوں والے بھارت کو زندہ رکھنے کے جذبے سے سرشار رکھے گی۔ بھارت جو پیہم متصادم تضادات کی وسیع اور پُر اسرار زمین ہے اور ایک نہایت ہی مہین رشتے میں منسلک ہے۔

بھارت کے اتحاد کے لئے خطرہ۔ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود بھارت۔ بھارت کا اتحاد۔ دھرتی سے اور اس کے فطری ناطوں سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس وحدت نے بالا بالا برہمنیت سے۔ یا بادشاہت سے جنم لیا ہے۔ یہ وحدت ابھی تک بھارت کی پیچ در پیچ زندگی کی مختلف تہوں سے مکمل طور پر نہیں گزری ہے۔ وحدت کے تصور کے سامنے جھکاؤ۔ اکثر اوقات غیر رضا کارانہ رہا ہے' یا اس کا حصول مخالف تسلط یا پھر مضبوط شخصیتوں کی قوت کے بل بوتے پر ہوا ہے۔ اس لئے بھارت کی وحدت غیر حقیقی بھی ہے اور سطحی بھی۔ اسے نہایت نازک انداز میں برقرار رکھا گیا ہے تاہم اپنی تمام تر کمزوری کے باوجود' یہ ابھی تک قائم ہے۔

www.bhutto.org

بنیادی تضادات اور مستقل خطرات کے باوجود بھارت کی وحدت دریائے گنگا کی طرح بل کھاتی ہوئی دھیرے دھیرے اور خالص بھارتی انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔

قدیم ہند کو گپتا خاندان نے جوڑ رکھا تھا۔ اشوک کے عہد میں بھارت ایک شاندار وحدت سے گزرا۔ اس کی موت کے ساتھ ملک ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ اس کے بعد مغل داخل ہو گئے اور انہوں نے بھارت پر فولادی بازوؤں سے حکومت کی۔ بالآخران پر جب زوال آیا تو بھارت میں بے شمار شگاف پڑ گئے۔ ان ٹوٹی ہوئی کرچیوں کو ایک بار پھر انگریزوں نے اٹھایا اور ان میں پیوند لگائے۔ تاج برطانیہ نے اپنی اقلیم کوہ ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلا دیا۔ اور جب برطانیہ نے اپنی بساط سمیٹی تو یہ برصغیر حتمی طور پر بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔

اس تقسیم سے بھی بھارت کے تضادات دور نہ ہو سکے تمام گہرے اختلافات تقسیم کو بھی برداشت کر گئے۔ بھارت میں تقسیم ہونے کی خصوصیت ' آپس میں متصادم مذاہب ' اس کی علاقائیت ' اس کے مختلف لہجے اور زبانیں ' اس کا فرسودہ ذات پات کا نظام اور اس کے توہمات۔ آزاد بھارت کی وحدت کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے۔ گاندھی کی روحانی اور تقدس مآب شخصیت۔ بھارت کے افق کے ساتھ ساتھ ابھری کہ وہ انتشار کے زخم کا علاج کر سکے لیکن اس سے پیشتر کہ وہ اپنا یہ عظیم مشن شروع کرتا وہ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ گاندھی نے بھارت کے دیرینہ امراض اپنے جانشین نہرو کے لئے ترکے میں چھوڑے۔

نہرو کے لئے سب سے مشکل اور ہمت طلب مرحلہ بھی بھارت کی وحدت کو قائم رکھنے کا ڈھونگ رچانا تھا۔ سترہ برس تک انہوں نے مسلک اختلافات کی بیخ کنی اور آزاد بھارت کی بنیادیں پختہ کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کی۔ نہرو بھارت کی وحدت کا تانا بانا تیار کرنے والے سب سے زیادہ نمایاں پارچہ باف تھے۔

جدید بھارت کی وحدت کے معمار کی حیثیت سے نہرو کو ان تمام خطرات کا احساس تھا۔ جن سے انہیں دوچار ہونا تھا۔ یونان کے قدیم معماروں کی طرح انہیں وحدت کا دیو پیکر مجسمہ ان گنت ستونوں پر تعمیر کرنا تھا۔ اس عمارت کے زیادہ اہم ستونوں میں یہ بھی شامل تھے۔

(1) نہرو کی اپنی شخصیت

(2) لادینی جمہوریت

(3) کانگریس

(4) مختلف پانچسالہ منصوبوں کی شکل میں سماجی اور اقتصادی مقاصد۔

(5) خارجہ پالیسی

پنڈت جواہر لال نہرو کی سحر انگیز شخصیت بھارت کے عوام کو بھا لے گئی۔ انہوں نے بڑے بڑے اجتماعوں کو بے خود کر دینے کا مظاہرہ کیا۔ وہ انہیں سننے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں کھنچے چلے آتے۔ نہرو

بھارتی جنتا کے لئے افیون کی طرح تھے۔ انہوں نے جنتا کو مخمور کیا کہ وہ مکمل طور پر مطیع ہو گئے۔ بھارتی عوام اَن گنت سادہ لوح دیہاتی اور بے نام شہری باشندے نہرو سے پرستش کی حد تک محبت کرتے تھے۔ وہ ہجوموں کو مسحور کرتے، پھر ان کی عقیدت سے اپنی قوت اخذ کرتے۔

نہرو نے بھارتی عوام کو اپنی آواز پر جمع کرنے کے لئے کئی پلیٹ فارم استعمال کیئے۔ ایک انقلابی کی حیثیت سے اپنے آغاز سے ہی اور اپنی ہنگامہ ساز زندگی کے آخر تک انہوں نے بھارت کے طول و عرض میں دور دراز دیہات تک سفر کیا۔ اور عوام الناس کو اپنے فلسفے اور اپنے طرز زندگی میں ڈھالنے کے لئے زور خطابت دکھایا عام آدمی کو نہرو پر اعتماد تھا۔ اسی اعتماد سے نہرو نے اپنا ایک عظیم رہنما اور نجات دہندہ کی حیثیت سے تصور اُستوار کیا۔ یہ اعتماد اس حد تک جا پہنچا تھا کہ وہ اس سے سفید کو سیاہ منوا سکتے تھے۔

نہرو نوجوانوں کا آئیڈیل تھے، بھارت کے نوجوان نے نہرو میں اپنے عہد کا تحرک دیکھا۔ دانشوروں کے نزدیک وہ ایسے بے نظیر بہادر تھے۔ جس نے بھارت کی آزادی جیتنے کے لئے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں قدامت پسندوں کو نہرو ماضی اور حال کے درمیان، روایت اور انقلاب کے درمیان ایک انمٹ رشتہ محسوس ہوتا تھا۔ غیر ملکی اس سے مسحور ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل سمجھتے تھے۔ ہارورڈ اور کیمبرج کے پس منظر کے باعث نہرو نفیس ترین مغربی ذہنوں کے ساتھ ایک تازہ ربط اُستوار کرنے کی اہلیت بھی رکھتے تھے۔ اور نہرو چونکہ مغربی طرز کو خیرباد کہہ کر گاندھی کے قدموں میں جا بیٹھے۔ انہوں نے ایشیائی خوشبو سے اپنے ذہن کو اس حد تک ضرور مہکا لیا کہ وہ غیر ملکیوں کے دلوں کو رام کر سکتے تھے۔

بہت سے عقیدوں اور ذہنوں کے لوگ، بوڑھے، جوان، اکھڑ دیہاتی، شہروں کے مہذب باشندے، ہندو اور مسلمان، پارسی اور عیسائی جس نقطے پر آملتے تھے۔ اس کا نام نہرو تھا۔

نہرو کو اپنی اس حیثیت کی طاقت کا بخوبی علم تھا حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی طویل تاریخ میں بہت کم لوگوں نے اپنی طاقت کو یوں مکمل طور پر استعمال کیا۔ جیسے جواہر لال نہرو نے کیا۔ نہرو نے اپنے زیادہ تر انتہائی مشکل۔ داخلی اور خارجی مسائل کو خاموش اور بے زبان عوام سے اپیل کر کے حل کر لیا۔ نہرو نے اپنا تسلط بلاشرکت غیرے جمانے کے لئے اپنی مطلق طاقت کا کسی حد کے بغیر استعمال کیا۔

پیدائشی طور پر نہرو ایک اونچے گھر کے ہندو تھے لیکن اپنے الہ آباد کے گھر میں اس نوجوان برہمن کو اپنے باقی خاندان کی طرح۔ مسلم تہذیب و تمدن کے مقناطیسی اثر سے واسطہ پڑا۔ ان کے نقطہ نظر میں لادینیت آنے کا سبب بھی یہی مسلم اثرات تھے۔ نہرو نے مسلم فلسفے تاریخ اور اسلام بطور مذہب کو مجموعی طور پر کبھی پسند نہیں کیا۔ نہرو کو اسلام کے جس حصے نے متاثر کیا وہ اسلام کی انقلابی روح تھی اور نہ اس کی نشاۃ ثانیہ واقعہ یہ ہے کہ نہرو کو اسلام کی قوت سے بے حد نفرت تھی انہیں اس میں پاکستان کے جراثیم نظر آتے تھے۔ کیونکہ یہ اسلام کی متحرک خصوصیات ہی تھیں، جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں قیام پاکستان کے لئے بہادرانہ جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا۔ نہرو اس کے برعکس مسلم تہذیب کی ان قریب

www.bhutto.org

المرگ روایات سے متاثر ہوئے جو یوپی کی ڈوبتی ہوئی ثقافت میں نظر آتی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی ہم آہنگی۔ مسلم تہذیب کے مسکین اور عاجزانہ عناصر سے پائی۔ یہ وہی عناصر تھے' جنہوں نے بھارت کے بعض مسلمانوں کو ہندوؤں کا تسلط ماننے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔

پیدائش' ماحول اور تعلیم نے نہرو کو سوچ اور عمل دونوں میں لادین بنا دیا۔ لادینیت سے نہرو کے لگاؤ کی طاقت یا کمزوری' جو کچھ بھی ہو وہ پیہم متصادم ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک واحد اتصال پذیر ربط تھے۔ تُند خُو ذات پرست ہندو انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتے لیکن کسی تلخی کے بغیر۔ بھارت کے بعض مسلمان بھی ان پر اعتماد کرتے تھے۔ لیکن مکمل بھروسہ نہیں۔ پنڈت نہرو نے ہندو مسلم معمے کو یوں طے کر لیا کہ ہندو مفادات کو بھارتی مفادات سے ہم آہنگ کر دیا۔ نہرو کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں مترادف تھے۔ اس طرح انہوں نے اکثریت کی مرضی کے جمہوری اصول کے نام پر مسلم مفادات کو کچل دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا رویہ اختیار کر کے نہرو فرقہ واریت کی اپنی اندرونی خواہش کو انتہائی مؤثر اور سلجھے ہوئے انداز سے دھوکہ دے رہے تھے۔

نہرو ایک ہمہ پہلو شخصیت رکھتے تھے' وہ اعلیٰ ذوق کے متمدن شخص تھے' اور فنونِ لطیفہ سے معقول لگاؤ بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے تھیٹر کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی اور ہم عصر فنون اور ادب کی سرپرستی کی' ایک وُسعت پذیر تمدن کے ذریعے انہوں نے بھارت کی وحدت کو حاصل کرنا چاہا۔ یہ خراج بھی انہیں پیش کیا جانا چاہئے کہ امورِ مملکت میں انتہائی مصروفیت کے باوجود انہوں نے فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لئے خاصا وقت وقف کیا اور شہریوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو لادینی نقطہ نظر پھیلانے کی مشق میں مصروف ہو گیا۔

پنڈت نہرو۔ اپنے تمام تر مصنوعی انکسار کے ساتھ ایک خود پسند انسان تھے۔ انہیں بہت ہی کم لوگ اپنے ہم پلہ نظر آتے تھے۔ افراد سے ان کے تعلقات حقیقت پسندانہ بھی تھے اور مصنوعی بھی۔ اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بھی بعض نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھے۔ ان پر جو مسلم تمدن کا اثر تھا' وہ انہیں رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے قریب لے آیا وہ ان دونوں کی قدر بھی کرتے تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ وہ تحریک آزادی کے دنوں میں ان کے بہت قریبی رفیق تھے اور آزادی کے بعد کے تمام مصائب میں بھی نہرو نے ان کا ساتھ دیا۔ نہرو نے بااثر ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ ہمیشہ کچھ احتیاط سے معاملہ رکھا۔ پٹیل کی طاقت کو جانتے ہوئے نہرو نے کبھی اس سے جھگڑا مول نہیں لیا۔ انہوں نے پٹیل کے اثر کو گھٹانے میں کامیابی اس طرح حاصل کی کہ حریت پسند قوتوں کو پوری آزادی دی کہ وہ اس گجراتی لیڈر کو ایک مجسم رجعت پسند کے نام سے پکاریں۔ ٹنڈن (پرشوتم داس ٹنڈن۔ کانگرس کے سابق صدر) کے معاملے میں نہرو نے قدیم طریقے اختیار نہیں کئے۔ بلکہ اس سے براہ راست تصادم لیا در حقیقت ٹنڈن کو ہمیشہ ہمیشہ کی خاطر نکالنے کے لئے نہرو نے خود بحران پیدا کیا۔ اس طرح انہوں نے کانگریس کو ایک نظم و ضبط کا احساس بھی دیا' جس نے بھارت کو متحد رکھا۔

پنڈت نہرو کا کرشنا مینن سے تعلق خصوصی ذکر کا محتاج ہے۔ کئی برس تک نہرو کرشنا مینن کی

www.bhutto.org

شخصیت کے اسیر رہے۔ کرشنا مینن نے محض اپنی ذہانت کے زور پر پنڈت نہرو کی سوچ کو قابو کیئے رکھا۔ دونوں شخصیتوں کی دلچسپیاں اور نکتہ نظر کئی معاملوں میں مشترک تھا۔ دونوں دانشور تھے اور آزاد خیال مکتب فکر میں پرورش پائی تھی' وہ بورژوا اقدروں سے نفرت اور سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے دونوں نے کشمیر کو واہمہ بنا دیا۔ دونوں پاکستان سے نفرت کرتے تھے۔ کرشنا مینن بھارتی کابینہ کا واحد رکن تھا جسے عالمی امور پر گرفت حاصل تھی۔ واحد رکن تھا جو نہرو ہمسری کی بنیاد پر گفتگو کر سکتا تھا۔ یہ مضبوط رشتے تھے۔ جنہیں کرشنا مینن نے پوری طرح استعمال کیا۔ کرشنا مینن سے مسٹر نہرو کے روابط کی بنیاد رومانیت میں نظر آتی ہے۔ مینن کا بھارت میں کوئی رشتے دار نہ تھے۔ مینن نے زندگی کا بیشتر حصہ برطانیہ میں گزارا' وہ بھارت میں بغیر کسی گہرے تعلق کے لوٹا۔ کرشنا مینن بھارت کے کسی بھی زبان میں بات نہیں کرتا تھا' اور اس کا ذہن عوام سے بہت دور تھا۔ نہرو کی طویل سرپرستی کے باعث کرشنا مینن نے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ کانگریس پارٹی کی اعلیٰ سطح کرشنا مینن سے حسد کرنے لگی اور اسے الگ تھلگ کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن نہرو نے اس کا ساتھ دیا۔ اور اس کی حمایت کی لیکن جب بین الاقوامی واقعات اور مسلح تصادم کا سامنا کرنا پڑا تو نہرو نے بے دلی سے کرشنا سے اپنا دھیان اٹھالیا۔ اور اسے رخصت کر دیا۔ لیکن مینن کے بھارتی کابینہ سے نکل جانے پر بھی اس نے نہرو پر اپنا خاصہ اگرچہ کمزور اثر ڈالے رکھا۔

پنڈت نہرو کے افراد سے تعلقات کے ضمن میں' ان کے سول سروس اور مسلح افواج سے تعلقات کا مشاہدہ بھی ضروری ہے۔ پنڈت نہرو مسلح افواج کے علاوہ ہر جگہ اتحاد کی طاقت کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ فوج سے ان کے تعلقات میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ غیر فطری اور ناگوار رخنہ رہا۔ نہرو کی شخصیت ویسے بڑی من موہنی تھی لیکن فوج کی موجودگی میں ان کا چہرہ تن جاتا اور رویہ سخت ہو جاتا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اپنی فوج کو ان گنت قوموں پر مشتمل رکھا' اور انہیں بہت دور رکھا۔

اپنے وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن اور اپنے کمانڈر انچیف جنرل کو بنارا تھمیہ کے جھگڑے میں انہوں نے اس جھگڑے کو صلح جو انداز میں حل کرنے کی بجائے جنرل کو سزا دینا ضروری خیال کیا۔ انہوں نے کمانڈر انچیف کی ذلت آمیز رخصت کے اسباب پیدا کیئے اور پھر اس جھگڑے سے اپنے مفادات کی تکمیل کی۔ اس طرح اپنے زعم میں انہوں نے شہری حکام کی بالادستی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ بتا کر کہ بھارت کی تقدیر ان کے نرم اور شریف ہاتھوں میں ہے۔ عملی طور پر یہ ظاہر کیا کہ انہیں ملک پر مکمل گرفت حاصل ہے۔

1962ء کے بھارت چین تنازعے میں انہیں مسلح افواج کے خلاف اپنے تعصب کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اپنی تمام نفاست کے باوجود وہ اس قدر غصے والے تھے کہ اپنی پسند یا ناپسند کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ وہ چوٹ بھی لگا سکتے تھے' اور دل کو موہ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی مسلح افواج کو بری طرح چوٹ لگائی اور پھر بڑے پیار سے اس کی قیمت ادا کی۔ فوجی طاقت میں ان کے عدم اعتماد نے بھارت کو جھکنے پر مجبور

www.bhutto.org

کر دیا۔ نہرو تمام ذہانت اور صلاحیتوں کے باوجود مسلح افواج کے کردار کو سمجھنے میں غلط رہے۔ انہیں نظرانداز کر کے وہ اپنے ملک کو تباہی کے کنارے لے آئے۔ ایسی صورت حال میں جہاں بھارت اب بھی اپنے زخم سہلا رہا ہے ڈپلومیسی پر کاملاً اور دفاع پر نا کافی بھروسہ کرتے ہوئے نہرو نے اپنی تباہی کو دعوت دی اور ملک کو ایک مہیب خطرے سے دوچار کر دیا۔ واضح طور پر "عظیم نہرو" اپنے ملک کا دفاع کرنے میں ناکام رہا اور ایک قائد کی بنیادی ذمہ داری کو سنبھالنے میں پورا نہ اتر سکا۔ تاریخ کو نہرو کے تصور سے یہ داغ دھونے میں مشکل ضرور پیش آئے گی۔

اب ذرا موازنہ کرتے ہوئے دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ نہرو کی مضبوط بنیادوں والی سول سروس کے ساتھ ہم آہنگی زیادہ حقیقت پسندانہ تھی۔ انڈین سول سروس اور مستقل سروس کے دوسرے ڈھانچے تمام برطانوی ساخت کے تربیت یافتہ تھے۔ عوامی زندگی کی طرف ان کا رویہ متکبرانہ اور الگ تھلگ رہنے کا تھا۔ وہ اپنی ماوراء حقیقتوں کے تصورات میں کھوئے رہتے تھے۔ اپنے طبقے کا تصور رکھنے والے بیوروکریٹس کے اس کلب نے اپنے چارٹر کی بنیاد اس یقین پر رکھی کہ برطانوی راج ان کی ذہانت اور اہلیت کی بناء پر قائم رہا تھا۔ آزادی کے موقع پر سول سروس اور خاص طور پر آئی سی ایس کو یقین تھا کہ وہ اپنے گندمی "صاحبوں" کو اپنے گورے آقاؤں کی نسبت زیادہ مضبوطی سے قابو میں رکھ سکیں گے۔ بھارت کی آزادی حاصل ہوتے ہی، ان کی اقتدار کی بھوک فوری طور پر بری طرح چمک اٹھی۔ نہرو کے پہلے مثبت اقدامات میں سے اس طاقتور طبقے کو زمین پر واپس لاتا تھا۔ وہ ان کے کسی فریب کے شکار نہ ہوئے، ان کی شان و شوکت کرکٹ کے گیند کی نسبت کچھ زیادہ تیزی سے ہی ختم ہو گئی۔ مسلح افواج کو سیاست سے الگ رکھنے کے اصول پر نہرو نے اس کو بھی کسی شک و شبہ کے بغیر واضح کر دیا کہ وہ سول سروس کی طرف سے بھارت کی سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ نہرو نے سول سروس کے بڑے بڑے ستونوں پر سیزر کے انداز میں ایسی گرفت کی کہ انہوں نے جلد ہی اپنی روایتوں اور ذہنیت کو تبدیل کر لیا۔ نہرو نے ان کا جائزہ لیا اور پھر انہیں ان کی حیثیت کا احساس دلایا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ سول سروس نے اپنی توقعات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دیا اور ان کو اپنی حقیقی ذمہ داریوں کے دائرے میں محدود کر لیا۔ یہ سخت رویہ اختیار کرنے کے باعث نہرو نے عوامی زندگی کا وقار پیدا کیا اور جمہوریت کے آثر پھیلائے۔ سول سروس کی طرف نہرو کا رویہ انتہائی کامیاب رہا جتنا کہ مسلح افواج کی طرف ان کا رویہ ناکام رہا۔

نہرو نے لادینی جمہوریت کا ناقوس بہت زور سے بجایا۔ لیکن بھارتی ذہن میں یہ عقیدہ پیدا کرنے کی جان توڑ کوششوں کے باوجود، لادینی جمہوریت کو ہمیشہ خطرات درپیش رہے۔ طرز زندگی کے اعتبار سے اس روش کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی کہ یہ بھارت کی سیاست کا تسلیم شدہ حصہ بن سکتی۔ اس کا مستقبل بہت مخدوش ہے۔ بھارت کی دھرتی سے طبعی طور پر متصادم ہونے کے باعث لادینیت بھارت کی نئی زندگی کی بہاریں پھول بن کر نہیں کھل سکا۔ لادینیت اور جمہوریت دونوں بھارت کے لئے اجنبی ہیں۔

ذات پات اور الگ تھلگ رہنے والے ہندو تمدن کے کٹر طبقے سے ان کی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ نہرو نے ان نظریات کے لئے ڈھال کا تاثر اپنی زندگی سے دیا۔ لیکن ان سے ان کا اپنا لگاؤ بھی قطعی طور پر نظریاتی نہیں تھا۔ یہ کہنا کوئی کج فکری نہ ہو گا کہ اس کی لادینیت کا سبب اس کا کشمیر کے بارے میں رویہ تھا' نہرو نے کشمیر پر بھارت کے سفاکانہ تسلط کو برقرار رکھنے کے لئے لادینیت کا زور و شور سے پرچار کیا۔

نہرو' جمہوری اصولوں کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے آزاد بھارت کو ایک جدید آئین' اور قابل عمل سیاسی ادارے دیئے۔ گاندھی نے آزادی کے بعد کانگریس پارٹی کو توڑ دینے کی ہدایت کی تھی' لیکن اس پر عمل کرنے کے برعکس نہرو نے بھارت کے طول و عرض میں کانگریس کو مضبوط طور پر منظم کیا۔ نہرو نے دانشوروں کو تنقید کی ترغیب دی' پریس کو آزادی تحریر دی اور شہزادوں اور سیاست دانوں کو سازشوں کی آزادی دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے مفلوک الحال کروڑوں ہم وطنوں کو تین مرتبہ ووٹ ڈالنے کا موقع دیا جمہوریت کی تاریخ میں یہ الیکشن یادگار ہیں۔ یہ ویسے چھوٹے کارنامے نہیں ہیں۔ تاہم اپنی تحریکِ آزادی کے دوران خود تنقیدی کے موڈ میں نہرو نے اپنے عوام کو خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ بھارت طبعی طور پر کھلی جمہوریت کے قابل نہیں تھا۔ اور جب موقع ملا کہ وہ تباہ کر دے' یا تعمیر کر دے' تو نہرو نے بھارت کو جمہوریت کی ایک مؤثر طرز دی' اگرچہ اس کا تانابانا مضبوط نہ کر سکا۔ انہوں نے کانگریس پارٹی اور بھارتی قوم پر اپنے ذاتی وقار سے حکمرانی کی۔ وہ کسی حقیقی اور مؤثر اپوزیشن کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور بہت کم لوگوں کو اپنا ہمسر خیال کرتا تھا۔ جب وہ حکومت میں تھا' تو وہ ڈکٹیٹر زیادہ اور جمہوریت پسند کم تھا۔ لیکن اس نے جمہوریت کے سوانگ کو قابل تعریف مہارت سے رچائے رکھا۔ ورنہ وہ کشمیر کو یوں تسلط میں نہیں رکھ سکتا تھا سکھوں کے علیحدہ صوبے کے عوامی مطالبے کو اس بے دردی سے نہیں دبا سکتا تھا۔ ناگاؤں کی حق خود ارادیت کی جدوجہد کو کچل نہیں سکتا تھا' اور عوام کی منتخب کردہ صوبائی حکومتوں کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نہرو کے غیر جمہوری اقدامات میں سے چند ایک ہیں۔ فہرست تکلیف دہ حد تک طویل ہے۔ یہ حقیقت کہ لادینی جمہوریت کا مستقبل سخت خطرے میں ہے' ظاہر کر سکتی ہے کہ نہرو کے دور میں بھارت میں اس کو روبہ عمل لانا کتنا سطحی تھا۔ اگر نہرو کی ہدایت میں بھارتی عوام لادینیت کو قبول کر لیتے تو پندرہ برس میں پانچ سو سے زیادہ بار مسلم اقلیت کا خون نہ بہایا گیا ہوتا۔ اس کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی بھارت نے فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ کا خوفناک قتل عام دیکھا۔ نہرو کے لادین بھارت میں ہی راشٹریہ سیوک سنگھ اور جن سنگھ نے بھارت کی سیاسی زندگی میں اپنے بھدے سر اٹھائے۔ فرقہ واریت پر یقینی طور پر نہرو کی اپنی کانگریس پارٹی کے اہم لیڈروں نے بھی عمل کیا۔

نہرو بلاشبہ' لادینیت اور جمہوریت کی طرف راغب تھے' لیکن یہ لگاؤ' کچھ زیادہ مبالغے کے ساتھ بیان کیا گیا' یہ نظریاتی اور عقیدتی لگاؤ ہونے کے بجائے بنیادی طور پر ایک سیاسی حربہ تھا' جب اس کے موازنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ نہرو کا لادینی جمہوریت کا ستون کمزور بنیادوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے مختصراً ذکر کیا گیا ہے بھارت کی وحدت کا ایک بڑا ستون کانگریس پارٹی تھا۔ نہرو ایک

www.bhutto.org

بلند معیار کا مجاہد آزادی تھا۔ وہ نجات کی جدوجہد میں بھارت میں واپسی کے فوراً بعد ہی کود پڑا تھا۔ اس جدوجہد کی قیادت ان دنوں انڈین نیشنل کانگریس کے ہاتھوں میں تھی۔ نہرو اس تحریک میں ایسے جذبے کے ساتھ شامل ہوئے' جو اور کسی میں نہ تھا۔ لاکھوں بھارتی کانگریس کے اس بڑے قافلے کا حصہ بن گئے جس کی سالار گاندھی کی بیمار شخصیت تھی۔ نہرو کی جوانی' تیز ذہانت اور متمدن اطوار نے کانگریس اور تحریک آزادی کو رنگ اور جان بخشی' نہرو اپنے دل میں آزادی کا شعلہ اوائل سے ہی لئے چل رہے تھے۔ اس شعلے کی چنگاری آخری دم تک ان کے ساتھ رہی۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران سارا عرصہ نہرو بہت تیز رہے۔ بے شمار نشیب و فراز اور ناکامیوں سے ان کے قدم متزلزل نہیں ہوئے۔ جنگ کو جاری رکھنے کے لئے نہرو کے عزم نے اپنے ہم وطنوں کو قربانی کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچا دیا۔ 40 برس سے زیادہ عرصے تک نہرو نے کانگریس پارٹی کی پُرجوش لگاؤ سے خدمت کی وہ کانگریس کو بھارت کے بلند ترین مقاصد کیلئے کامیاب وسیلہ بنانے والے چند بانیوں میں سے تھے۔ آزادی کی دھن میں کانگریس نے بھارت کو متحد کیا۔ جدوجہد آزادی کی علامت کے طور پر اس آمر نے آزادی کے بعد اتحاد کو مضبوط کیا۔ جب چند برس بعد آزادی کی جنگ جیت لی گئی تو کانگریس نے اپنی عظمت کا بیشتر حصہ بھی کھو دیا۔ یہ غلط راستوں پر چل پڑی' لیکن نہرو نے اس تنظیم سے اپنا اعتماد پھر بھی نہ ختم کیا۔ وہ اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اس کی خدمت میں مصروف رہے اور اس کی کئی پیش پا افتادہ پالیسیوں کو محو بھی کیا۔ اکثر اوقات نہرو کو شاباشیوں کے ذریعے کانگریس کو اوپر کھینچنا پڑتا اور اس کی قائدانہ صلاحیت بحال کرنی پڑتی۔ کانگریس بھارتی پارٹیوں کی ماں تھی۔ نہرو نے بھارت کی سیاسی زندگی میں اور پارٹیوں کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن رہی ہیں۔ وہ اپنی حیثیت کو مستحکم بنانے کے لئے انہیں وجود دیتے رہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان میں سے بعض کو اپنی تنظیم میں ہڑپ کر لیتے۔ انہوں نے ان کے علیحدہ رہنے کو ہی ترجیح دی۔ بعض اوقات وہ اختلافی نظریات کے پراپیگنڈے کی بھی حوصلہ افزائی کر دیتے' صرف اس لئے کہ وہ جو پالیسی نافذ نہیں کرنا چاہتے' ان کے لئے اپنی نااہلی ظاہر کر سکیں۔ وہ پالیسیاں جو ان پر داخلی یا خارجی دباؤ کے تحت تھوپی جاتی تھیں۔ انہوں نے اس ترکیب سے اپنا کام کئی بار نکالا جب پنڈت نہرو نے یہ تھیوری پیش کی کہ کشمیر کے مسئلے کے حل کا مطلب ہو گا۔ بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی تباہی۔ اس کے ساتھ ساتھ نہرو نے متعصب ہندو تنظیموں اور ان کے لیڈروں کو یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ اپنے اپنے مقاصد کے لئے راستہ ہموار کرتے رہیں جہاں ان کے مقاصد اور نہرو کے کشمیر سے وابستہ دیرپا مفادات بھی ہم آہنگ ہو جائیں۔ اس کے خدشات قابل یقین ظاہر نہ ہوتے۔ اگر ان کے ساتھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے تشدد کے واقعات نہ ہوتے۔ حتیٰ کہ نہرو نے کانگریس کے اندر بھی مختلف گروہوں کو آپس میں متصادم ہونے دیا۔ جب اسے ضرورت ہوتی کہ اس کی پالیسیاں دائیں بازو کی طرف جھکیں' تو وہ صنعت کاروں اور صاحب وسیلہ افراد کی حوصلہ افزائی کرنے لگتا۔ جب وہ بائیں بازو کی طرف جھکنا ضروری خیال کرتا تو وہ ترقی پسندوں اور بائیں بازو والوں کو آگے لے آتا۔ اس طرح اس نے

حتمی اختیارات کی عنان سنبھالنے کی کوشش کی۔

اتحاد کا ایک کم ڈرامائی اور زیادہ دیرپا عنصر نہرو کی اقتصادی پالیسی تھا۔ بھارت کے وزیراعظم کی حیثیت سے نہرو پلاننگ کمیشن" کا سربراہ بھی تھا اور اپنے ملک کو اس نے تین پانچ سالہ منصوبے بھی دیئے' نہرو نے ایک قدیم طرز معیشت کو جدید ترقی پسندانہ مملکت میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی سخت محنت کی۔

نہرو کی اقتصادی پالیسیاں' فلاحی مملکت کے تصور پر مبنی تھیں۔ جذباتی طور پر وہ سوشلسٹ تھا۔ لیکن اس کے دور میں سرمایہ داری پروان چڑھی۔ نہرو ایک شاطر سیاست دان کی حیثیت سے سیاست کو اس قدر اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اس میں سے معیشت کی اہمیت کم کر دی۔ اس کی سیاسی فکر سوشلسٹ فلسفوں سے نزدیک تھی اور اسی قرب نے نہرو میں سوشلسٹ اقدار کی سوسائٹی پر مبنی ایک مبہم اور رومانی طرز زندگی کا تصور پیدا کیا۔ وہ چونکہ اقتصادیات کا عالم نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اپنے " ماہرین " کو اجازت دی کہ وہ اس کے احساسات کی اس طرح رہنمائی کریں کہ بھارت کو پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کے غیر عقلی امتزاج پر مبنی ایک جزوی طور پر الجھا ہوا اقتصادی نظام دیا جائے۔

اگرچہ نہرو غربت کی موجودگی سے بہت پریشان تھے' لیکن انہوں نے اس کے مقابلے کے لئے سست اور صبر والا راستہ اختیار کیا۔ سمجھوتوں اور دلائل کا راستہ۔ دوسرے اسباب کے علاوہ ان وجوہات کی بنا پر اپنی مکمل گرفت کے 17 برس میں نہرو بھارت کی بیل گاڑی کے دَور کی معیشت میں انقلاب لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ان تمام ظاہری مجبوریوں کے باوجود بھارت کی معیشت کچھ نہ کچھ آگے ضرور بڑھی۔ ایک منظم مزدور قوت ابھری ملک بھر میں نئے کارخانوں کا ظہور ہوا' فولاد اور کوئلہ کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ بھاری اور درمیانی صنعتوں نے عام پیداوار میں اپنا حصہ ادا کرنا شروع کیا' گھریلو صنعتیں بھی چمکیں' دیہات تک بجلی اور مواصلات کے ذرائع پہنچ گئے۔ آبپاشی کے لئے بند اور نہریں بھی بنائی گئیں۔ ایک اقتصادی ابھار تھا جس نے ملک کو قریب تر کر دیا۔ نہرو نے ملک کو پیوند لگانے کے لئے اقتصادیات کی مضبوط کشش استعمال کی۔ اس نے صوبوں کو ایک دوسرے کے سہارے کا محتاج بنانے کی شعوری کوششیں کیں۔ اس کے اقتصادی منصوبے اس طرح سوچے گئے تھے کہ ہر ایک کو اب بھٹی میں ڈالا جا سکتا تھا۔ مرکب یونٹوں میں اقتصادی خود مختاری کے فروغ کے لئے کوئی کوشش نہ کی گئی بلکہ صوبائی خود کفالت کو ہر قدم پر کچلا گیا۔ اور صوبوں کی آپس میں محتاجی کی ہر طرف سے حوصلہ افزائی کی گئی۔

خارجی امور پنڈت نہرو کا قلعہ تھے۔ اس میں انہوں نے خطرناک مہارت حاصل کر لی۔ خارجہ پالیسی بنانے والے مدبّر کی حیثیت سے وہ جدت کا متلاشی' جارح اور باریک بیں تھا۔ اس نے اپنی خارجہ پالیسی کی بنیادیں عقلی اور اخلاقی اساس پر کھڑی کرنے کا دعویٰ کیا۔ حقیقت میں اگر سائنسی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے تو نہرو کی خارجہ پالیسی بھی اس کی اندرونی پالیسی کی طرح خیر و شر سے مادر انجیر مجتمع تھیں اس نے یہاں بھی اپنی تضاداتی خوبیوں کو اسی بے تکلفانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی جس طرح اس

www.bhutto.org

نے اندرونی معاملات میں کیا تھا۔ اس نے آگ اور پانی کو ایک جگہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک ایسی حیثیت کو پہنچا کہ وہ بالکل بے نقاب ہو گیا۔

نہرو نے بھارت کو اوپر سے تو بہت بلند کیا لیکن نیچے سے بالکل کھوکھلا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنے ملک کو جمہوری ادارے دیئے لیکن اس نے رہے سہے ذات پات کے نظام اور فرقہ وارانہ تصادم کا ایک خوفناک ترکہ چھوڑا۔ بین الاقوامی طور پر اس نے بھارت کو غیر جانبداری کا چولا پہنایا۔ مغرب اور مشرق کے درمیان دلالی کا کردار ادا کرنے والے کی حیثیت سے۔ لیکن بالآخر نتیجے میں اس نے بھارت کو بے یارومددگار "تنہا" چھوڑ دیا' ہمسائے اس پر بھروسہ نہیں کرتے' اور اب وہ افریقہ اور ایشیا کے پیش منظر میں ایک دیو سے معمولی حیثیت پر آ گیا ہے۔ نہرو کی خارجہ پالیسی کو دو نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ سنہری دَور تھا جو 10 برس سے زیادہ عرصے تک موجود رہا۔ 1946ء سے جب نئی دہلی میں ایشین کانفرنس منعقد ہوئی' اس وقت سے لے کر 1960ء کے کچھ برس بعد تک' یہ برس عظیم کامیابیوں کے تھے' جس کے دوران ایشیا اور افریقہ کی نئی قوموں کو ایک صف میں لانے کے لئے نہرو نے غیر جانبداری کے نظریئے کی سرپرستی کی۔ نہرو نے غیر جانبداری کو ایک وقار اور عالمی اپیل بخشی۔ شروع شروع میں آزادی کے کچھ عرصے بعد تک نہرو نے عوام اور قوموں کو غیر جانبداری کی طرف موڑنے میں خاصی دقتیں محسوس کیں۔ لیکن بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'ایشیا و افریقہ میں زیادہ سے زیادہ خود مختار ملکوں کے نقشہ پر ابھرنے سے' اور ایٹمی طاقتوں کے باہمی تباہی کے خوف سے آپس میں متصادم نہ ہوسکنے اور کمیونزم کی دنیا میں گہری شیرازہ بندی' کے باعث غیر جانبداری کی رنگارنگ اقدار ظاہری طور پر نمایاں ہو گئیں۔

یہ دَور جب اقوام متحدہ میں بڑی طاقتیں' چھوٹی قوموں کا دل جیتنے کے لئے کوشش کرتی رہیں۔ نہرو نے ڈپلومیسی کی ممکنہ قوت کو گرفت میں لینے میں تیزی دکھائی اس نے انتہائی محنت سے اسے بھارت اور اپنے عزائم کے لئے دفاعی لائن کے طور پر استعمال کیا۔ پنڈت نہرو نے اپنی خارجہ پالیسی کو استعمال کیا۔ بھارت کو متحد کرنے کے لئے اور اپنے ہم وطنوں کو وقار اور عزت نفس دینے کے لئے باہر بھارت کی ساکھ بین الاقوامی طور پر بڑھی۔ قومی فخر کا احساس بھارت بھر میں پھیل گیا۔ ایشیا اور افریقہ کی دنیا میں پھر اس نے ایک تیز رفتار تحریک چلائی۔ بنڈونگ یا بلغراد کہیں بھی' نہرو راستے کی نشاندہی کرتے اور ایشیا اور افریقہ اس کے پیچھے چل پڑتے۔ مشرق و مغرب ادب سے سنتے۔ بنڈونگ میں آنجہانی نہرو نے پنچ شیلا کے ارتقا میں اپنا کردار ادا کیا۔ چین' انڈونیشیا اور مصر کے اشتراک سے بھارت افریشیائی رہنماؤں کی اس تاریخی کانفرنس میں صف اوّل میں کھڑا تھا۔

اقوام متحدہ میں بھارت نے ترقی پذیر قوموں کی قیادت سنبھال لی۔ بھارت نے کئی نازک مباحثوں کو ایک رخ اور راستہ دیا۔ امن و جنگ کے مسئلوں میں نہرو کی حکومت کا کردار عام طور پر فیصلہ کن رہا۔ نہرو نے تخفیفِ اسلحہ کے مذاکرات میں ایک کردار ادا کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں امن بحال کرنے اور کوریا

www.bhutto.org

کی صلح میں بھی اس کا کردار نمایاں تھا۔ نہرو نے کانگو میں امن کے لئے اقدامات میں حصہ لیا اور اسی طرح سوئز میں کش مکشوں کی آگ کو سرد کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تبت کی صورت حال' ہنگری کی بغاوت میں بھی اس کا کردار خاصا موثر رہا۔ اقوام متحدہ بھارت کا سٹیج بن گیا' نہرو نے اپنے آپ کو ایک مرکزی شخصیت کے طور پر پیش کیا۔ تمام اہم بین الاقوامی کانفرنسوں اور ذمہ داریوں میں بھارت کے لئے یقیناً ایک مقام ہوتا تھا۔ بھارت کی حیثیت اتنی اہم تھی کہ کوئی بین الاقوامی اجتماع بھارت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھارت کی آواز عزت اور توجہ سے سنی جاتی تھی۔ نہرو کی زوردار وکالت نے بھارت کو عظمت کا ایک خصوصی احساس بخشا۔ ایک وقار جو اس کی بنیادی حیثیت سے کہیں بڑھ کر تھا۔ بھارت کی حقیقی حیثیت سے متناسب نہ تھا۔ بھارت کی انا بت بلند ہو گئی۔

عالمی تعلقات کے ایک دانش مند طالب علم کی حیثیت سے نہرو نے روس سے بھی سود بخش تعلقات اُستوار کیئے۔ اس نے بھارت کو اس ملک کے نزدیک لانے کے لئے اس وقت سوچا جب اکثر قومیں کمیونسٹ ممالک کے ساتھ دُور کے تعلق رکھنے میں خطرہ سمجھتی تھیں پنڈت نہرو کو اس قسم کا کوئی اندیشہ لاحق نہ تھا۔ اس کے پاس تاریخ کا اتنا وافر علم ضرور تھا جس کی روشنی میں وہ ارتقاء پذیر قوموں کے روز افزوں اثر کا پیش از وقت اندازہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انقلاب کے شعلے بھی بھڑک سکیں گے۔ اس لئے وہ بین الاقوامی اشتراکیت کے انقلابی خمیر سے دہشت زدہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کے تسخیرِ عالم کے مجاہدانہ نظریات سے اسے کوئی خطرہ تھا۔ دس برس سے زیادہ گزر گئے' مسٹر نہرو نے کہا تھا۔ "کمیونزم کا وقت گزر چکا" یہ مشاہدہ اس وقت پیش کیا گیا جب کمیونزم کا اتحاد اور انقلابی قوت اپنے زوروں پر تھی۔ پنڈت نہرو کے روس سے تعلقات جبلی جراحتوں سے ماورا تھے۔ بلکہ اس سے بھارت کو سود بخش مقام ملا اور مغرب و مشرق کے درمیان بھارت کو فیصلہ کن حیثیت مل گئی۔ وہ ایک ایسا مدبّر' اور پروہت بن گیا' جس کی بات مخالف قوتوں میں سنجیدگی سے سنی جاتی' اور جس کے مشورے پر غور بھی کیا جاتا تھا۔ روس' مشرقی یورپ سے معقول اور حقیقت پسندانہ تعلقات قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر کے پنڈت نہرو نے ہم عصر ڈپلومیسی کی دنیا میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔

پنڈت نہرو کو تدبّر کی یہ سبقت بھی حاصل ہے کہ اس نے مختلف النسل اور مختلف البراعظمی اقوام کی دولت مشترکہ کے اچھے نتائج کو پیش از وقت محسوس کیا۔ بھارت کو دولت مشترکہ میں رکھنے کے فیصلے پر نہرو کی مخالفت سے زیادہ تعریف کی جا رہی ہے۔ حالانکہ دولت مشترکہ میں بھارت کو رکھنے کا سب سے بڑا سبب اس ادارے میں پاکستان کی موجودگی ہے دولت مشترکہ کے اندر رہ کر نہرو نے بھارت اور پاکستان کے تنازعات اور بالخصوص کشمیر کے تنازعے پر بات چیت کو غیر جانبدارانہ رخ دینے کی کوششیں کیں۔ اگر پاکستان کا معاملہ ہوتا تو نہرو آزادی حاصل کرتے ہی دولت مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیتا۔ اس ادارے کے لئے جھکاؤ اسے مجبوراً اپنے قومی اسباب کی بنا پر کرنا پڑا تھا۔

واقعات نے بھی مسٹر نہرو کی خفیہ طور پر مدد کی۔ چین اور روس کا تصادم بھی اس سے بہتر وقت پر

www.bhutto.org

نہیں ہو سکتا تھا۔ روس اور مغرب کے درمیان کشمکش کا خاتمہ بھی مسٹر نہرو کے لئے نہایت ہی اچھے لمحے پر ہوا۔ اس پر خوشگوار مواقع کی بارش ہو گئی۔ بعض معاملوں میں اس نے بین الاقوامی حالات کا بری طرح غلط اندازہ لگایا۔ اس نے عوامی جمہوریہ چین سے مسلک ٹکر لی اور پھر بھارتی فوج کی تباہ کن شکست اور بھارتی عوام کی مایوسی دیکھی۔ پاکستان کے خلاف اس کی مستقل معاندانہ پالیسی بھی اسی طرح کی فاش غلطی تھی۔

جس طرح بھارت کی خارجہ پالیسیوں میں عقل اور تدبر کم تھا' اس لئے اسے اپنے کسی بھی ہمسائے سے اپنے اختلافات کم کرنا مشکل در مشکل ہوتا گیا۔ بھارت کے لئے رفتہ رفتہ یہ دشوار تر ہوتا گیا کہ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ باہمی مفاہمت اور تعاون کی فضا میں بات چیت کر سکے۔ بھارت نے اپنے تنازعات کو خالص بھارتی شرطوں پر حل کرنے کی سوچی۔ اپنے ہمسایوں کے سلسلے میں اچھے تعلقات کی قدریں بھارت کی لغت سے محو ہو گئیں۔ بھارت نے اپنے آپ کو ایک ایسی بڑی طاقت سمجھا کہ جسے اس جنگی جنون میں مبتلا دنیا میں کوئی بہت بڑا فرض سونپا گیا اور جس میں ہمسایوں کے جائز مفادات کو بھی دبا دینا اور اپنے ساتھ رہنے والے پڑوسیوں کے ساتھ مسائل سلجھانے کے لئے بیٹھنا اس کے رتبے سے کمتر ہے۔

نہرو امن کا ذکر نہایت جذباتی انداز میں کرتے تھے' لیکن اپنے ملک اور ہمسایوں کے درمیان موجود تنازعات کے حل کے راستے میں خود کوہ ہمالیہ سے بھی بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ اس نے پاکستان' چین اور سیلون سے اپنے اختلافات ختم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے برما سے سرحدی تنازعہ ختم کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی اس نے نیپال کے اندرونی معاملات میں غیر معمولی شرانگیزی کا مظاہرہ کیا۔ انڈونیشیا اور بھارت کے درمیان نفرت کی دیوار کھینچی' یہ اکیلا آدمی ایشیا کے ایک ارب 40 کروڑ انسانوں کے درمیان دوری کا ذمہ دار تھا۔

نہرو کا بنیادی موضوع پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانا تھا۔ وہ اس نئی مملکت کا سب سے بدتر دشمن تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد پاکستان کو تنہا کرنا اور پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنا بنا لیا تھا۔ اپنی پیہم کوششوں سے اس نے اس ملک کا ایک مذہبی رجعت پسند ریاست کی حیثیت سے تصور نہیں کیا۔ اس کی اس انتہائی نفرت نے اس کے برعکس پاکستان کے موقف کو بے اندازہ تقویت پہنچائی۔ آزادی سے پہلے مسلم لیگ سے اس کے غیر مصالحانہ رویئے کے باعث ہی' مسلمانوں کو اپنی صفیں منظم کرنے اور کانگریس کے ہاتھوں سے پاکستان چھیننے کا موقع ملا۔ آزادی کے بعد نہرو کی پاکستان کو تنہا کرنے اور نقصان پہنچانے کی کوششوں کے جواب میں پاکستان کے عوام نے اپنے سیاسی اور اقتصادی مسائل پر قابو پانے کی روز و شب تگ و دو کی۔ پاکستان کے خلاف نہرو کی اقتصادی اور سیاسی جنگ ہی دراصل ابتدائی طور پر پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی طور پر قابل عمل ہونے کی ذمہ دار ہے۔ اس رویئے سے اس ملک کو بے پناہ طاقت اور مدافعت کا جذبہ ملا۔ اگر نہرو کشمیر کو ہڑپ نہ کرتا مغربی اور مشرقی پاکستان کے خلاف اپنی فوجیں صف آراء نہ کرتا۔ اقتصادی رکاوٹیں کھڑی نہ کرتا۔ پاکستان کی زندگی یعنی دریاؤں کے راستے نہ

www.bhutto.org

روکتا' تو پاکستان کو آزادی کے بعد درپیش مسائل کے حل میں بڑی دقتیں پیش آتیں۔ اب اگر پاکستان کو سیاسی استحکام اور کسی حد تک۔ اقتصادی توانائی ملی ہے تو یہ نہرو کے چیلنج کا جواب ہے۔ پاکستان نے نہایت جرأت سے مدافعت کی ہے اور جب کہ بھارت اپنے بین الاقوامی وقار کی بلندیوں پر تھا اس وقت پاکستان تن تنہا بھارت کی ہولناکیوں کے فریب اور دوغلے پن کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری ادا کرتا تھا۔ برسوں تک پاکستان بھارت کے ہمسایوں کا ڈنکرک بنا رہا۔ اس نے تن تنہا بھارت اور اسکی ذات پات کی بوسیدہ اور فرسودہ تہذیب کو میکانگ سے ہندوکش تک بڑھنے سے روکا۔ پاکستان کو تباہ کرنے کی بجائے نہرو کے ردعمل میں پاکستانی عوام نے بے مثال اتحاد قائم کر لیا۔ اب نہرو کے تمام آفاقی دعوے بکھر گئے ہیں اور پاکستان کا وقار اور تصور دنیا بھر میں زیادہ درخشاں ہو رہا ہے ایشیا اور افریقہ بین الاقوامی تعلقات میں پاکستان کے کردار کا احترام کرنے لگے ہیں۔ اپنے تمام ہمسایوں سے پاکستان کے تعلقات انتہائی احترام اور اعتماد کے ہیں۔ پاکستان نے بھارت کے علاوہ اپنے تمام ہمسایوں سے اپنے تنازعات طے کر لئے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین سے مسلح تصادم میں الجھ کر غیر جانبداری کے مصنف نہرو نے جانبدار ممالک کے ساتھ بنیادی سمجھوتہ کیا اور اپنی موت کے وقت وہ بھارت کی خارجہ پالیسی کو انتہائی تذبذب میں چھوڑ کر گیا۔ اس نے اسے یتیمی کی حالت میں چھوڑا' جانبدار ہے اور نہ غیر جانبدار۔ اس نے اپنی عظیم مملکت کو کھلے بازار میں دونوں ہاتھوں میں گداگری کے کشکول لئے چھوڑا۔ تضادات کا معمار۔ جو مخالف عناصر کے بل بوتے پر آگے بڑھا' آخری مرتبہ منوں کا سا کرتب دکھا کر اپنے ملک کو ایک ناقابل حل تضاد میں اُلجھا گیا۔ آج نہرو کی خارجہ پالیسی اپنی عمیق ترین پستی میں ہے اور نہرو نے اپنے بستر مرگ سے اس کی سسکتی ہوئی شام کا نظارہ کیا تھا۔ چین سے مسلح تصادم میں الجھ کر اور پھر اس وُسعت کو مبالغہ آمیزی دے کر نہرو نے اپنے ملک کو انتہائی مایوسی کے عالم میں چھوڑ دیا اگر وہ اپنے حواس مجتمع رکھتا اور اوسان خطا نہ کرتا۔ تو وہ اپنی دوستی' اور قوموں میں اسے عزت بخشنے والی پالیسی کو چھوڑے بغیر چین سے سرحدی تنازعہ طے کر سکتا تھا۔

اس طرح چین بھارت تصادم سے شروع ہونے والی بھارتی خارجہ پالیسی ذہنی انتشار کا شکار اور اعتماد تدبّر سے محروم ہے۔ یہ پہلے دَور کا بالکل الٹ ہے۔ برسوں تک نہرو نے بھارت کے عوام کے سامنے چند بندھے ٹکے اصولوں کا پرچار کیا۔ نو آبادیاتی نظام اور عالمی کشیدگی کی بنا پر مغربی ممالک کو مطعون کیا۔ لیکن جب ایسے واقعات پیش آئے' جن کا مقابلہ کرنے کی اس قیادت کو اہلیت نہ تھی تو بھارت کے عوام کو اچانک نئے اصولوں کی اچھائیاں بتائی گئیں۔ جو اُن اصولوں سے قطعی مختلف تھے' جو اس سے پہلے بھارت کی عظمت کا راز بتائے گئے تھے۔ چین بھارت کا عظیم اور دوست ہمسایہ گزشتہ دس برس سے جس کے بھارت سے مشترکہ مفادات اور اتحاد کے دیرپا رشتے تھے' اسے اچانک بھارت کا سب سے بدتر دشمن بنا کر پیش کیا گیا۔ غیر جانبداری جو انصاف پر مبنی عالمی امن کے لئے واحد جواب تھا۔ اس پر انتہائی پریشان کن اور غیر مبہم نتائج کے باوجود سمجھوتہ کر لیا گیا۔ بھارت کی خارجہ پالیسی فلک بوس نظریات سے گر کر تنگ نظر موقع پرستی کی پستیوں میں جا گری۔ تضادات نے ہر قدم پر ظاہر ہوتا اور بھارت کو

www.bhutto.org

مایوسیوں کے دائرے میں سمیٹنا شروع کر دیا۔ ایک ایسی حقیقت، جو بھارت جیسی چالیس کروڑ پر مشتمل قوم کے لئے تصور بھی نہیں کی جا سکتی۔ بھارت جس نے خود ایک عظیم طاقت کا کردار۔ مغرب یا مشرق کے اثرات سے آزاد ہو کر ادا کیا تھا۔ اب روس اور امریکہ دونوں کے رحم و کرم پر ہے۔ قوموں کے قائد کی حیثیت سے بھارت اپنے آپ کو اب غلام کی حیثیت میں گرا ہوا دیکھ رہا ہے وہ بڑی طاقتیں جو برسوں تک ہر بڑے بین الاقوامی مسئلے پر بھارت کی حمایت حاصل کرنے کی خواہش مند ہوتی تھیں ' اب انہوں نے بھارت کو گردن سے پکڑ رکھا ہے۔ بھارت اب بلاشبہ بین الاقوامی حیثیت کی آخری پستی میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ماضی سے جب اس کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ انتہائی تکلیف دہ اور المناک حیثیت لگتی ہے کبھی بھارت افروایشین کانفرنس کی تحریک کے علمبرداروں میں ہوتا تھا۔ اور وہ اب اس کانفرنس میں ڈر اور ہچکچاہٹ کے ساتھ پہنچتا ہے۔ سترہ برس سے کم کے عرصے میں بھارت نے اپنا دائرہ مکمل کر لیا ہے۔ اور بین الاقوامی معاملات میں اپنا اثر و رسوخ ختم کر لیا ہے۔ اچانک وہ بڑھاپے کی منزل کو پہنچ گیا ہے۔

نہرو نے اپنا اثر اچھائی اور برائی دونوں کے لئے استعمال کیا۔ وہ بین الاقوامی بھی تھا اور ایک غیر مصالحانہ قوم پرست بھی۔ وہ دنیا کو ہتھیار گرا دینے اور بھائی چارہ اور امن سے رہنے کی تبلیغ کرتا تھا۔ لیکن اپنی موت سے پہلے اس نے بھارت کو جنگجو اور لڑاکا بنا دیا۔ اور اپنے تمام ہمسایوں کے ساتھ تنازعات طے کرنے سے انکار کر دیا۔

واقعات کا اجتماع۔ نہرو پر اس قدر بوجھ بن کر گرا کہ آخر کار وہ اس کے تلے دب گیا۔ چین سے ایک مہلک تصادم ' پاکستان سے مستقل چپقلش' اندرونی صورت حال کی خرابی ' آزاد خارجہ پالیسی پر سودے بازی شیخ عبداللہ کی رہائی ' پاکستان میں شیخ کا دورہ ' اور اس کا یہ اعلان کہ صدر پاکستان بھارت میں جا کر بھارتی لیڈروں سے مسئلہ کشمیر پر بات کرنے کو تیار ہیں۔ یہ سب کچھ بوڑھے اور بیمار نہرو کے لئے بہت زیادہ تھا۔

نہرو خود ایک تضاد تھا۔ اس نے تضادات کے تضاد۔ بھارت سے جنم لیا اور اس لئے نہرو بھارت تھا۔ اپنے گہرے جذبات کے ساتھ پنڈت نہرو نے بھارت کو متحد کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا۔ خود تضادات کا شکار ہونے کے سبب اس نے باہم متصادم عناصر کو خیر و شر دونوں کے لئے استعمال کیا۔ اس کی زمانے نے یہ بات محسوس نہ ہونے دی کہ وہ بنیادی طور پر ایک دوسرے کی مخالفت قوتوں کو آخر کار بھارت کی تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایسی بگھی کی عنان تھام رکھی تھی جسے بہت سے گھوڑے مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ پنڈت نہرو نے اپنی مرضی کے نتائج کے حصول کے لئے مختلف انتہاؤں کو اکٹھے کر دیا۔ سیاست جس کا وہ ماہر تھا۔ کسی اصول سے اس کی وابستگی لینن یا بسمارک کی طرح کبھی مکمل نہ ہوئی ہر مکتب فکر کے لوگ اس کے بوڑھے درخت تلے بیٹھے شاستری جیسے اعتدال پسند کرشنا مینن جیسے ترقی پسند ' ڈیسائی جیسے قدامت پسند بھی۔ ایسی مختلف اور متضاد ذہانتوں کے اجتماع نے بھارت کو واضح اور صاف نقطہ نظر مقصد سے ترقی نہ کرنے دی۔ نہرو کی تمام کوششوں ' اور اس کی مستقل تگ و دو کے باوجود

بھارت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

نہرو کے بارے میں تب آخری فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟ کسی فیصلہ کے لئے ابھی بہت جلدی ہے لیکن تاریخ کی متحرک انگلی نے بہت سی سطریں پہلے ہی لکھ دی ہیں۔ نہرو عام حالات کی پیداوار نہیں تھے جواہر لال نہرو جیسے آدمی ایسے حالات میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب نظام کائنات دگرگوں ہوتا ہے۔ وہ افق پر ایک مرتبہ ہی پہنچتے ہیں۔ وہ غیر معمولی واقعات اور محرکات کے ایک خاص قسم کے امتزاج کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نہرو ایک انتہائی مشکل وقت میں ابھرا' جب ہم اپنی تقدیر کے چورستے پر تھے۔ یہ ان انتہائی بلند شخصیتوں کا زمانہ تھا۔ جنہوں نے ہمیں آزادی لے کر دی۔ نہرو اس انقلابی عہد کا حصہ تھے' جس نے گاندھی' قائداعظم' سبھاش چندر بوس اور مولانا محمد علی جوہر کو پیدا کیا۔ وہ اس مبارک ترین کا حصہ تھا۔ جو بھارت کے دل کے ساتھ ساتھ رینگتی رہی۔ نہرو کا طلسم ٹوٹ چکا۔ عوام کو مبہوت کر دینے والا اثر ختم ہو چکا۔ بھارت کے دیرپا اتحاد اور عظمت کی چابی کسی ایک مرد واحد کے سپرد نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی جلا دی گئی ہے۔

www.bhutto.org

جموں و کشمیر

اساسی دستاویز

پاکستانی عوام متنازعہ کشمیر کی کربناک تاریخ سے پوری طرح واقف ہیں۔ اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ کیسے پیدا ہوا اور گزشتہ 20 سال کے عرصے میں سے اسے کن سنگین مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔

تمام دنیا جانتی ہے کہ کس مکاری سے اقتدار کو چھوڑ کر بھاگتے ہوئے ایک جابر حاکم کی ایک جنبش قلم سے جموں و کشمیر کے عوام کو ان کے پیدائشی حق خود اختیاری سے محروم کر دیا گیا تھا۔ دنیا کو یہ بھی معلوم ہے کہ بھارت کی غاصب حکومت نے طاقت کے بل بوتے پر کشمیر پر قبضہ کرنے کے بعد روز روشن میں کشمیری عوام اور اقوام عالم کے روبرو یہ وعدہ کیا تھا کہ ریاست کے عوام کو حق خود اختیاری استعمال کرنے کا حق دیا جائے گا۔

گزشتہ 20 سال کے عرصے میں بھارتی وعدوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ لیکن جموں و کشمیر کے عوام میں اپنا پیدائشی حق استعمال کرنے کا عزم اور کشمیریوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لئے پاکستانی عوام حمایت اور استحکام میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان، تاریخ اور جغرافیہ کے اعتبار کشمیری عوام پاکستان کے ساتھ نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک ہیں اور بھارت کی کوئی بھی عیارانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی آزادی پر ڈاکہ ڈال سکتی۔ چاہے ان کی راہ میں کتنی ہی

www.bhutto.org

رکاوٹیں کھڑی کیوں نہ کی جائیں اور انہیں دبانے کے لئے انتھک کوششیں کیوں نہ کی جائیں۔ جموں و کشمیر کے عوام پاکستان کی میں شامل ہو کر رہیں گے۔ یہ پاکستانی عوام کا ایمان اور پارٹی کا اعلیٰ ترین مشن ہے۔

اس مشن کو پارٹی کی تمام اندرونی اور بیرونی ذمہ داریوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جموں و کشمیر کے عوام کا مستقبل پاکستان کے اپنے مستقبل کا ایک حصہ ہے۔ اس ریاست کے لوگ پاکستان کا ایسے ہی حصہ ہیں جیسے پنجاب، بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں رہنے والے لوگ اور بھارت سے آنے والے مہاجرین ہیں۔ پاکستان کشمیر کے بغیر ایسے ہی ادھورا ہے جیسے ایک جسم سر کے بغیر ہوتا ہے۔ بیس سال تک کشمیر کے نہتے عوام نے بھارتی قبضے کے خلاف جدوجہد کی ہے۔ انکی جدوجہد آزادی پاکستان کو مکمل کرنے کی جدوجہد ہے۔ کشمیری عوام سے کئے گئے وعدہ کو پورا کرانے کے مقابلے میں پاکستان میں اور کوئی کام اس سے اہم نہیں ہو سکتا اور کوئی دوسرا فرض افضل نہیں ہو سکتا۔ اس ذمہ داری سے پہلوتہی پاکستان کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

بھارت نے ریاست کو غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور وہ انسانیت کی مجموعی احساس، ضمیر اور عالمی رائے عامہ کا مذاق اڑا رہا ہے۔ بھارت یہ سب کچھ اس لئے نہیں کر رہا کہ اسے علاقائی ہوس ہے۔ اس تمام کاروائی سے بھارت کا مقصد دو قوموں کے نظریئے کی جو پاکستان کی بنیاد ہے نفی کرنا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے پاکستان نے ایک عرصے تک اقوام متحدہ اور بڑی طاقتوں پر انحصار کیا ہے۔ اقوام متحدہ کی مداخلت ہمیں کسی ایسے حل کے قریب نہیں لائی ہے جو حق خود اختیاری پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس یہ محض ایک سراب ہے اور بے عملی کی پردہ پوشی ہے۔ اسی طرح بڑی طاقتوں کی مداخلت نے اس تنازعہ کے لئے انصاف کی راہیں ہموار کرنے کے بجائے پیچیدگیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ نہ اقوام متحدہ اور نہ ہی بڑی طاقتیں کشمیر کے ستم زدہ عوام کو امن کے راستے دکھائیں گی بلکہ اس شدید ناانصافی کو ختم کرنے کی تمام تر ذمہ داری پاکستان اور کشمیر کے عوام پر عائد ہوئی ہے۔

20 سال گزر گئے ہیں لیکن اس جدوجہد میں مزید طویل عرصہ درکار ہو گا اور آخری فتح حاصل کرنے تک مزید قربانیاں دینی پڑیں گی۔ چاہے اس کے لئے کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں، مشکلات کا سامنا کرنا پڑے اور یہ جدوجہد کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو جائے اس بات میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بالآخر آخری فتح کشمیری عوام اور پاکستان ہی کو حاصل ہو گی کیونکہ جس مقصد کی سربلندی کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں وہ حق و انصاف اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہے۔ قوم اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے آگے قدم بڑھانے کو تیار ہے۔

پاکستان سچائی کو جنس بازار نہیں بنا سکتا۔ اس کے عوام اپنے عقیدوں کا سودا نہیں کر سکتے۔ ہم ایک سچے موقف سے دستبردار نہیں ہو سکتے اور پائیدار اصولوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔

www.bhutto.org

اگر عوام میں سے کچھ لوگ جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں اور جن کے کچھ اپنے ذاتی مفاد بھی وابستہ ہیں اس مسئلہ کو بنیادی ذمہ داری سمجھنے کی بجائے اپنی ذات کیلئے ہَوّا خیال کرنے لگے ہیں تو دنیا کو جان لینا چاہیے کہ پاکستانی عوام ان کے خوف وہراس میں شریک نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اپنی جدوجہد کو آخر تک چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور بین الاقوامی طاقتوں کی سیاسی مداخلت یا طاقت کے اثرات انہیں خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ پاکستان کے لوگ کبھی شکست تسلیم نہیں کریں گے اور اگر برسراقتدار لوگوں میں سے کچھ افراد نے حالات کے دباؤ یا خوف کے تحت جھکنے کی کوشش بھی کی تو عوام اسے کبھی برداشت نہیں کریں گے۔

پاکستان اس مسئلہ کا پرامن حل چاہتا ہے اور یہ حل خود اختیاری پر مبنی ہونا چاہیے۔ ہم طاقت کا استعمال کئے بغیر ان وعدوں کو پورا ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں جو جموں کشمیر کے لوگوں سے کئے گئے تھے لیکن جنگ کا خوف جنگ سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ پاکستان جنگ کی تباہ کاریوں اور خون خرابے سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں دو مرتبہ بڑے پیمانے پر جنگ اور اس کے خون خرابے کا مشاہدہ کیا ہے ہم پوری سنجیدگی سے یہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ اور تصادم نہیں چاہتے ہم امن چاہتے ہیں لیکن ہم کشمیر کے سودے پر امن نہیں خرید سکتے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تصادم سے بچنے کی خاطر اور امن کی امید میں پاکستان نے بہت سے علاقے بھارت کے حوالے کر دیئے ہیں اور وہ ابھی تک ہمیں دھوکے میں رکھے ہوئے ہے۔ گزشتہ 20 سال کے عرصہ میں یہ رویّہ اختیار کرنے کے باوجود پاکستان دو مرتبہ میدانِ کارزار بن چکا ہے اور یہاں کے عوام جنگ کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جنگ کی غیر موجودگی میں پاکستان کے لوگ امن سے ہمکنار نہیں ہوئے۔ امن کی شرائط جن کے لئے ہم بہت خواہش رکھتے ہیں اپنے حقوق سے دستبرداری کی بجائے حقوق کی حفاظت کرنے سے حاصل ہوں گی۔

گورداسپور، فیروزپور، امرتسر کے کچھ حصوں، آسام اور حیدر آباد سے واپس ہٹنے میں اس لئے مصلحت سمجھی گئی تھی کہ بھارت نے اپنی بھری ہوئی توپوں کا رخ پاکستان کی طرف موڑ رکھا تھا۔ باوجودیکہ ہم اپنے کچھ علاقوں سے دستبردار ہو گئے، بھارت کی توپیں اب بھی پاکستان پر نشانہ لگائے ہوئے ہیں۔ اگر اسی غلط قسم کی منطق کے تحت ہم کشمیر یا اس کے کسی ایک حصے سے امن خریدنے کی امید میں واپس ہٹ جاتے ہیں تو ہماری نا امیدی کی انتہا آتی ہی ہو گی جس طرح زندگی کے بعد موت کا سامنا کرنے میں ہوتی ہے۔ بھارت کشمیر نہیں چاہتا بلکہ کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے سے انکار کر کے پاکستان کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ پاکستان کا بنیادی نظریہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے، اگر پاکستان مسلم اکثریت کے علاقے کو بھارت کا حصہ بننے کے اصول کو تسلیم کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے بھارت کشمیر پر اپنا شکنجہ مضبوط تر کرتا چلا جا رہا ہے۔ بغیر کسی شک وشبہ کے بھارت کو یہ واضح کر لینا چاہیے کہ پاکستان مزید مراعات دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہمیں یہ لائحہ عمل اختیار کرنا ہی ہو گا اور بہتر یہی ہے کہ ہم اس تنازعہ پر ہی یہ رویّہ اختیار کر لیں۔ ہمیں اپنے حقوق کے اس آخری قلعے کی حفاظت کے لئے اپنے پرچم کو اور عزم کو بلند رکھنا چاہیے۔

بھارت کھوکھلے بیانات یا اقوام متحدہ کی قراردادوں سے پاکستان کے اس عزم کو نہیں سمجھے گا۔ اس کو سمجھانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم اس پر واضح کر دیں کہ ہم جموں و کشمیر میں انصاف کی پاسبانی کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ بھارت ہمارے موڈ، نقل و حرکت، ہماری تیاری، جرأت کے مظاہرے، عوام کے جذبے اور راہنماؤں کے رویے سے ہماری نیت اور عزم کا اندازہ کرے گا۔ ایسی فضا پیدا کی جانی چاہئے۔ یہ فضا ایسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے اگر ہم سر جھکانے کی بجائے سینہ تان کر ہر مقابلے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب وقت ہے کہ ہم بھارت کے وفاقی بجٹ کے اعداد و شمار اور اس کی جنگی تیاریوں کو بار بار بیان کر کے پاکستانی عوام کو خوفزدہ کرنے سے باز آجائیں۔ ہمیں گھٹنوں کے بل ہو کر امن کی درخواستیں کر کے پاکستانی عوام اور جموں و کشمیر کے حوصلے جو جدوجہد آزادی میں مصروف ہیں، کم نہیں کرنے چاہئیں۔ بھارت مناسب موقع کی تلاش میں ہے اور وہ پاکستان پر ضرور حملہ کرے گا۔ بھارت پاکستان کی طرف سے امن کی تجاویز اور بامقصد مذاکرات کی پیش کش کے پیش نظر ہتھیار ڈالے گا اور نہ ہی وہ غیر ملکی طاقتوں کی اپیل پر اپنے وفاعی اخراجات میں کمی کرے گا۔ وہ اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی مہم جاری رکھے گا۔

ہمیں باتیں کرنے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔ بھارت اپنی روایتی پالیسیوں کے رخ کو تبدیل کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے تعصب کی جڑیں صدیوں پیچھے جنم لیتی ہیں اور اگر خدانخواستہ وہ کشمیر کو ہڑپ کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو وہ اسی پر اکتفا نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک وہ پاکستان کو ختم نہیں کر دیتا۔

کیا برصغیر کی ہزاروں سال پرانی تاریخ پاکستان کے لوگوں کو یہ سبق نہیں سکھلاتی کہ بھارت الفاظ پر کبھی دھیان نہیں دھرے گا؟ بھارت منو کے الفاظ کا پیروکار ہے جو ہماری کتابوں سے راہنمائی حاصل نہیں کرے گا بلکہ اس کا قائد کوٹلیہ ہے۔ ہتھیار بند بھارت کا جواب پاکستان کے مسلح ہونے میں ہے۔ تم اس بات کی کوشش مت کرو کہ بھارت کو ہتھیار نہ دیئے جائیں کیونکہ یہ تمہارا فرض نہیں ہے کہ تم عادی جارح کو غیر مسلح کرو اس کی بجائے تم اپنے عوام کو بندوقیں دو جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کا جواب یہی ہے کہ پوری قوم اپنے وطن اور حقوق کی حفاظت کے لئے تیار ہو۔ جب پوری قوم مسلح ہو تو اس صورت میں تباہی ضرور ہو سکتی ہے مگر شکست کبھی نہیں ہو سکتی۔ ویت نام کی جنگ سے یہی سبق ملتا ہے۔ اگر ہم ان کی بہادری سے سبق حاصل نہیں کرتے تو پھر ہم کبھی سبق حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے خدا کے نام پر بھارتی قوت اور اسکے حجم اور اس کے اثرات کے بارے میں باتیں کرنا چھوڑ دو۔ قوم کو تیار کرو تاکہ وہ فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اگر ویت نام کے بہادر عوام اپنی جدوجہد کو اسی منطق پر آزماتے اور حالات کو جوں کا توں تسلیم کر لیتے تو وہ بھی اپنے دفاع میں ایک گولی چلائے بغیر دنیا کی طاقتور ترین قوم کے آگے ہتھیار ڈال دیتے۔ لیکن یہ سبق ویت نام کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ سبق رومنوں کے زمانے سے لے کر اب تک تاریخ کا ہے۔

www.bhutto.org

اگر انصاف اور دھاندلی' جابر و مجبور کے درمیان فیصلہ طاقت کے بل بوتے پر ہی ہوتا تو آج دنیا میں رومن حکمرانی کرتے نظر آتے لیکن تاریخ ہمیں اس سے مختلف سبق دیتی ہے۔ کسی ملک پر قبضہ ہمیشہ قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قوموں کی آزادی سلب نہیں کی جا سکتی۔ جارحیت کو ہمیشہ کے لئے کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی۔ بہر حال ناجائز دباؤ ختم ہو کر ہی رہتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آج پوری دنیا زنجیروں میں جکڑی ہوتی اور موجودہ تہذیب کا جو اپنی پوری تابانی کے ساتھ دنیا میں قائم ہے کوئی وجود نہ ہوتا اور دنیا ایک قید خانے کی صورت اختیار کر جاتی۔ دنیا کی ابتداء سے لے کر اب تک محکوم حاکموں اور جابروں کے خلاف جدوجہد کرتے چلے آئے ہیں۔ اس جدوجہد کی بدولت انسانیت نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ ہمیشہ کمزوروں نے انصاف اور برابری کے نام پر طاقتور پر فتح پائی ہے۔

اگر ہتھیاروں کی برتری پر سب کچھ منحصر ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی جنگ آزادی نہ لڑی جاتی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ نہتے عوام نے اپنے خالی ہاتھوں کی مدد سے طاقتور حملہ آوروں کو شکست دی ہے اور چھوٹی قوموں نے ناقابلِ تسخیر فوجوں کے مقابلے میں آزادی حاصل کی۔ جموں و کشمیر کے عوام تاریخ کے اس دھارے سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ تہذیب کے رخ کی نفی کریں۔ بھارت وہ پہلا حملہ آور نہیں ہو سکتا جو اپنی تباہی کے انجام سے بچ سکے۔ بھارت دنیا کی ان تمام طاقتور سلطنتوں سے زیادہ طاقتور نہیں ہے جن کے قلعے ماضی میں مسمار ہو چکے ہیں۔ جموں و کشمیر کے عوام نے خدا اور اس کے آدمیوں کے خلاف کوئی ایسا جرم نہیں کیا ہے کہ وہ ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ بھارت کی ذات پات سے متاثر بیمار سوسائٹی کو پیغمبروں کی کون سی دعائیں حاصل ہیں کہ وہ ہمیشہ فاتح کے روپ میں قائم رہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ بھارت طاقتور اور ناقابل شکست ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ کمزور اور بزدل ہو گئے ہیں۔ اسی خوف کی بنا پر کہا گیا ہے کہ کشمیر پاکستان کے لئے ہے اور پاکستان کشمیر کے لئے نہیں ہے اور یہ ہم کشمیر کے لئے پاکستان کے وجود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ یہ عجیب و غریب دلائل خود مختاری کے ابتدائی فوائد کے بھی خلاف ہیں۔ یہی وہ منطق ہے جو بتدریج پاکستان کی جدوجہد کو کمزور کرنے کا باعث بنے گی۔ کیا یہ فراموش کیا جا چکا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی مادرِ وطن کے ایک ایک انچ کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہیں اور یہ ملک کے کسی ایک حصے پر حملہ پورے ملک پر حملے کے برابر ہے۔

اس دلیل کی قوت اسی صورت حاوی ہو سکتی ہے اگر ہم پاکستان کو قسطوں میں دوسروں کے حوالے کر دینے کے لئے تیار ہو گئے ہوں۔ حقوق کی حفاظت کی خاطر قوموں نے دوسرے لوگوں کے لئے جنگیں لڑی ہیں۔ عظیم جنگیں انسانی حقوق کی حفاظت اور جارح کو ختم کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔

اگر دنیا میں ایسی قومیں موجود ہیں جو دوسروں کے حقوق کے لئے لڑنے کے لئے تیار ہیں تو ہمیں

www.bhutto.org

کم از کم اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے جنگ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ آؤ ہم عہد کریں کہ ہم ان دلائل کو نہیں سنیں گے جن سے حملہ آوروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور جن سے ہمارے عوام کی رسوائی ہوتی ہے۔

جموں و کشمیر کے تنازعہ کا حق خود اختیاری کی بنیاد پر حل ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی اور کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب ہم اس تنازعہ کے حل کے بارے میں لچک دار زبان استعمال ہوتے سنتے ہیں تو ہمیں تشویش ہوتی ہے قدم بہ قدم ہم نے حق خود اختیاری کا موقف چھوڑ کر بامقصد مذاکرات کا ذکر شروع کر دیا ہے۔

اس مسئلہ کا باعزت حل حق خود اختیاری کے استعمال میں ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ جموں و کشمیر کسی جاگیردار کا ٹکڑا نہیں ہے کہ اس پر تجارتی سطح پر بات چیت کی جائے اگر ایک دفعہ ہم حق خود اختیاری کے اصول سے دستبردار ہو جاتے ہیں تو ہم اس اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں جو جنگ کے تمام ہتھیاروں سے زیادہ اہم ہے۔ یہ سوال غیر لچکدار ہونے کا نہیں ہے بلکہ سفیرانہ زبان سے دھوکہ کھاجانے کا ہے۔ پاکستان کو اس سلسلے میں کوئی رعایت نہیں روا رکھنی چاہئے یہ بھارت ہے جو حملہ آور ہے یہ بھارت ہی ہے جس نے جموں و کشمیر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ پاکستان کے لئے نہیں کہ وہ معقول رویہ اختیار کرے۔ یہ بھارت ہے جس نے غیر معقول رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ پاکستان کے لئے نہیں کہ وہ اپنے رویے میں لچک پیدا کرے۔ یہ بھارت ہے جس نے غیر لچک دار رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ جب یہ کہا گیا تھا کہ ہم ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کے لئے تیار ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم لفظوں کے لغوی معنوں کے پیش نظر جسمانی طور پر ایک ہزار سال تک جنگ جاری رکھیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی حالت میں حق خود اختیاری کے اصول پر سودہ بازی نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا عزم کبھی کمزور نہیں پڑے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کبھی ناجائز دباؤ برداشت نہیں کریں گے۔

یہ بہتر ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہ ہو، بجائے اس کے کہ ہم اس کا غیر منصفانہ حل قبول کر لیں۔ اس مسئلہ کا غیر منصفانہ حل غیر صورتحال سے بدتر ہے۔ آخری حل کے لئے ضروری ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ہو۔ اسی وجہ سے ہمارے اندر اتنا صبر اور حوصلہ ہونا چاہئے کہ ہم منصفانہ حل تلاش ہونے تک انتظار کر سکیں۔ ہمیں حوصلہ نہیں چھوڑنا چاہئے ہمیں دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں باہوش رہنا چاہئے اور مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہئے۔ آئندہ بھی مناسب مواقع آئیں گے جس طرح ماضی میں آتے رہے ہیں۔ پاکستان تین مرتبہ اس مسئلہ کے باعزت حل کے قریب آ گیا تھا۔ 1948ء میں ہم سری نگر کے قرب وجوار میں تھے 1962ء میں بھارت و چین کے درمیان تصادم میں دوسرا موقع تھا۔ 1965ء میں پاکستان جموں و کشمیر کو آزاد کرانے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔

اگر گزشتہ 20 سال کے عرصے میں تین مختلف مواقع پر پاکستان اپنے حقوق حاصل کرنے کے

www.bhutto.org

قریب تر ہو گیا تھا تو اس امر کا بہت زیادہ امکان ہے کہ آئندہ بھی ایسے مواقع پیدا ہوں گے۔ ہمیں اس موقع کا انتظار کرنا چاہئے اور مخالفت کی پالیسی پر کار بند رہنا چاہئے۔

تمام دنیا میں بہت سے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ بھارت میں بھی کئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ وقت کا دھارا ہماری موافقت میں ہے۔ ہمیں جلدی میں کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ بھارتی توپوں کو دیکھ کر کانپنا نہیں چاہئے۔ یہ بات پاکستانی عوام کے خمیر میں شامل نہیں ہے کہ وہ کانپیں' عوام تیار ہیں اور اب یہ قیادت پر ہے کہ وہ عوام کو ان کے آخری مقصد سے ہمکنار کرے۔ یہ جنگ کرنے کا مطالبہ نہیں ہے یہ مطالبہ انصاف کا تقاضا کرتا ہے۔ ہم امن کے خواہاں ہیں لیکن ہمیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے اور اپنی قوم کو سفارتی بلیک میل کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے۔

بھارت کے ساتھ میل جول کے سلسلے میں گزشتہ ایک ہزار سال کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ آئندہ ایک ہزار سال کی تاریخ بھی ہمارے سامنے ہوگی۔ ہمارا مستقبل اتنا ہی درخشندہ ہو گا جتنا کہ ہمارا ماضی تھا، بشرطیکہ ہم اپنے ایمان کو پرکھنا اور اس سے قوت حاصل کرنا جان جائیں۔ اگر ہم اپنے نظریۂ حیات اور وعدوں پر کار بند ہو جائیں تو ہم کامیاب ہو جائیں گے اور جموں و کشمیر کے لوگ پاکستانی عوام کے ساتھ خونی رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔

اگر ہم نے اپنے ماضی کی تاریخ سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کیا تو ہم صرف جموں و کشمیر کو ہی نہیں چھوڑ دیں گے بلکہ پوری قوم کیلئے بدنامی کا باعث بنیں گے اور ملک کو خطرے سے دوچار کر دیں گے۔

یہ پارٹی کا عہد ہے کہ وہ عزت کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گی اور جموں و کشمیر کو آزاد کرانے کے عہد سے کبھی نہیں پھرے گی۔ نتائج سے بے نیاز ہو کر پارٹی خدا اور انسان سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے گی۔

1967ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

کشمیر آزاد ہو کر رہے گا

بھارت کے وزیر خارجہ مسٹر ویشن سنگھ نے یہ کہہ کر مسٹر کرشنا مینن والی رٹ لگائی ہے کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر اگر بات چیت ہو سکتی ہے محض اس سلسلے میں کہ آزاد کشمیر بھارت کو لوٹا دیا جائے۔

ہم اس رویے سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہمیں علم ہے کہ بھارت کب اس رویے کو اپناتا ہے۔ لیکن کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ پاکستان پچھلے پانچ ماہ کے دوران ایک عظیم ہیجان میں سے گزرا ہے لیکن اس سے پاکستان کمزور نہیں ہوا۔ اس کے برعکس پاکستان کے عوام کو اپنے حقوق کا جتنا شدید احساس آج ہے اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ آج انہیں اپنی صلاحیت پر کہیں زیادہ اعتماد ہے کہ وہ ظلم اور استبداد کو...... خواہ وہ پاکستان کے اندر ہو یا کشمیر میں...... شکست دے سکتے ہیں۔

اگر بھارتی توسیع پسندوں نے موجودہ صورتحال کا غلط اندازہ کرتے ہوئے آزاد کشمیر کے علاقے پر پیش قدمی کرکے جنگ بازی کا راستہ اختیار کیا تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی بہادر فوجوں کے ساتھ مل جل کر بھارتی حملہ آوروں کو نہ صرف آزاد کشمیر سے بلکہ اسی ہلے میں مقبوضہ کشمیر سے نکال باہر کریں گے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بھارت اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کو تیار نہیں اور یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بھارتی حکومت بھارت کے کروڑوں عوام کے مصائب میں اضافہ کرتی جارہی ہے حالانکہ پاکستانی عوام کو ان کے خلاف کوئی کینہ نہیں۔ 1962ء کی طرح بھارت نے آج ایک مرتبہ اپنے قریب ترین ہمسایوں...... چین اور پاکستان...... کے خلاف اشتعال انگیز رویہ اختیار کر لیا ہے۔ عوامی

www.bhutto.org

جمہوریہ چین نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اگر بھارت نے توسیع پسندانہ عزائم نے اسے سرحدوں پر فوج کشی کی راہ دکھائی تو مار مار کر بھارت کا بھرکس نکال دیا جائے گا۔ بھارتیوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر اس نے پاکستانی علاقے پر، جس میں آزاد کشمیر بھی شامل ہے، جارحیت کا ارتکاب کیا تو پاکستان اس سے یہی سلوک کرنے پر قادر نہیں ہو گا۔

1965ء کی جنگ ستمبر کوئی تاریخ قدیمہ کی بات نہیں کہ اس کی یاد دہانی کرائی جائے۔ جب پاکستانی افواج نے بھارت کی جنگی مشین کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کے لئے اب بھی اسی طرح زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک یہ مسئلہ صرف اور صرف حق خود ارادیت کی بنیاد پر حل نہیں ہو جاتا۔ اگر بھارتی حکومت نے جنگ بازی کے نشے میں اس راہ پر ایک قدم بھی اٹھایا جس پر گامزن ہونے کا سردیش سنگھ نے اشارہ کیا ہے تو پورے برصغیر پاک و ہند میں آگ بھڑک اٹھے گی۔

ایک معنی خیز لیکن قابل فہم بات یہ ہے کہ رجعت پسند عناصر نے اپنے ان ہم وطنوں کے خلاف تو زہریلے پراپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی ہے جنہوں نے قائد اعظمؒ کے نظریے کا پرچم اٹھا رکھا ہے لیکن کشمیر اور بیت المقدس کے بارے میں ان عناصر نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ ان کی خاموشی اسلام کی مجاہدانہ روح سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ البتہ بعض غیر ملکی مقاصد سے ضرور ہم آہنگ ہے۔ بہرحال جموں و کشمیر کا مسئلہ ان فرسودہ اور لاوارث عناصر پر منحصر نہیں جو بھارت کی وسعت پذیر جنگی مشین سے بے حوصلہ ہو چکے ہیں بلکہ اس کا انحصار جیسا کہ تاریخ میں ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے عوام کے عزم پر ہے جو استحصال اور استبداد کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ پاکستانی عوام نے قائد اعظمؒ کے جھنڈے تلے اسی کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی کا مظاہرہ پچھلے دنوں پاکستانی عوام نے ایک بدعنوان اور خانہ ساز حکومت کے ظلم و ستم کے خلاف کیا تھا اور اسی کا مظاہرہ ایک مرتبہ پھر اس ملک کے خلاف کیا جائے گا جسے ہماری اس حکومت نے مشترکہ دفاع کی پیش کش کی تھی جسے عوام نے اپنے پیروں تلے کچل کر رکھ دیا ہے۔ میں بھارتی نیتاؤں کی زبان خوب سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی میری زبان سمجھتے ہیں۔ میں انہیں متنبہ کرتا ہوں کہ شرافت سے کام لیں اور بین الاقوامی اصولوں کو ملحوظ رکھیں ورنہ "مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا جائے گا"۔

1969ء

www.bhutto.org

اعلان تاشقند

خواجہ شہاب الدین کو مناظرے کا چیلنج

15 ر فروری 1967ء کو خواجہ شہاب الدین نے پاک روس تعلقات کے بارے میں پریس کلب ڈھاکہ میں جو تقریر کی تھی اسے پڑھ کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ گذشتہ ایک برس سے اعلانِ تاشقند کے بارے میں قوم میں جو نازک بحث جاری ہے وہ سب پر عیاں ہے اور اب اس کے بارے میں کسی حیران کن انکشاف کی گنجائش باقی نہیں۔ حکومت اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ ازبکستان کی مٹی پر جو نقوش قدم ثبت ہوئے تھے ان کو نہایت اہتمام کے ساتھ محو کیا جائے اور اس سلسلے میں خواجہ شہاب الدین کی ضرورت سے زیادہ بعد از وقت تقریر کا مطلب بالکل عیاں ہے۔ میرے گرد شکنجہ کسا جا رہا ہے۔ میرے ضلع کے بوڑھے اور از کار رفتہ سیاست دان میرے خلاف شرپسندانہ دروغ بافیاں کر کے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میرے ضلع کے لوگ بڑی دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ لیکن میں ہراساں کرنے کی ان کوششوں سے خائف نہیں ہو سکتا۔ میں ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتا رہوں گا کیونکہ میں نے اپنے عوام کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ خواجہ شہاب الدین کی تقریر بھی ان واقعات کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد میری مخالفت ہے۔

فی الحال میں شرپسندوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کر کے صرف ان امور پر اظہار خیال کروں گا جو قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ خواجہ شہاب الدین نے اپنی تقریر میں بعض قومی اور بین الاقوامی مسائل

www.bhutto.org

چھیڑرہے ہیں۔ اگر حکومت کی عقل و دانش نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ اس مسئلے کے داخلی اور خارجی مضمرات کو نظر انداز کر کے موجودہ مسائل کے انبار کو فراموش کر دے اور اس لاش کی پھر سے چیرپھاڑ شروع کرے تو میں انشاء اللہ سب سے پہلے میدان میں اتروں گا اور سب سے آخر میں نکلوں گا۔

اگر خواجہ صاحب نے آخر کار مارک اینٹونی کا سوانگ رچانے اور بروٹس کی تلاش شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں بروٹس نہیں بن سکتا کیونکہ میں نے کسی سیزر کو قتل نہیں کیا ہے۔ اگر تاشقند میں میرے کردار کو ہی زیر بحث لانا ہے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔ خواجہ صاحب کی تقریر کا موضوع اگر پاک روس تعلقات تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر جو چیز سوار تھی وہ تاشقند میں میرا کردار تھا۔

انہوں نے اپنی تقریر کا بڑا حصہ میرے کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے پر صرف کیا۔ خواجہ صاحب کیونکہ اقتدار کی ڈھال کے پیچھے محفوظ ہیں لہٰذا وہ حق و صداقت کے اصولوں کو جس طرح چاہیں پامال کر سکتے ہیں۔ پریس کیونکہ اب حکومت کے اشاروں پر ناچتا ہے لہٰذا پریس کے ایک بڑے طبقے نے ان کی تقریر کو نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ ان کی تمام تقریر مقصد سے بالکل عاری اور بد ذوقی کا نمونہ ہے۔

ایک عام شہری کی حیثیت سے مجھے جس قدر آزادی ہے اس کی حدود میں رہتے ہوئے میں حق و صداقت کے نام پر اپنا نقطہ نظر پیش کروں گا۔ لیکن اس سے قبل ضروری ہے کہ پاک روس تعلقات کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے۔ کیونکہ ان تعلقات کے بارے میں خواجہ صاحب نے میری ذات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اس سلسلے میں اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ اس لئے ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے میرے لئے کوئی دوسرا راستہ چھوڑا ہی نہیں۔

صدارتی نظام میں یہ تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ کسی پالیسی کا بانی ہے۔ لہٰذا میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ میں اس سلسلے میں پالیسی کی ابتدا کرنے والوں میں ہوں۔ پاکستان اور روس کے خوشگوار تعلقات کا آغاز اس وقت ہوا جب ایندھن اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے میں نے روس کے ساتھ تیل کی تلاش کے بارے میں سمجھوتہ کرنے کے لئے روس کا دورہ کیا۔ یہ دورہ اس وقت کیا گیا تھا جب یوٹو کا حادثہ ابھی ابھی ہوا تھا اور دونوں ملکوں کے تعلقات کے اس باب میں پہلا بامقصد صفحہ تحریر کرنے میں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خواجہ صاحب نے اس سلسلے میں 1965ء کو افضلیت دی ہے۔ اگر خواجہ صاحب اسی سال کو سب سے زیادہ اہم قرار دینے پر تلے ہوئے تو میں ان کی خدمت میں عرض کر دوں کہ اس سال بھی میں نے روس کے تین دورے کئے اور اسی سال جنوری میں روسی رہنماؤں سے اہم بات چیت کی جس کا پاک روس تعلقات پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہت قبل جب میں وزیر تجارت تھا تو میں نے مارشل لاء حکومت کی اس خارجہ پالیسی کا از نو جائزہ لینے پر زور دیا تھا جو اس نے 1958ء میں مرتب کی تھی اور اس امر پر اصرار کیا تھا کہ روس اور چین کے ساتھ تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی کی جائے۔ مجھے یہ معلوم کر کے کافی اطمینان ہوا ہے

www.bhutto.org

کہ 9 سال بعد خواجہ صاحب کو اس امر کا احساس ہو گیا ہے کہ مشرقی ممالک کے ساتھ ہماری دوستی مغربی ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ لیکن جس بات سے مجھے حیرت ہوئی ہے وہ ان کا غیر ذمہ دارانہ لہجہ ہے۔ خواجہ شہاب الدین خواہ واقعات کو کسی رنگ میں دیکھیں، مجھے یقین ہے کہ اہلِ پاکستان خود اس بات کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ پاک روس تعلقات کے سلسلے میں میں نے کیا کردار ادا کیا۔ جو بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ بھارت کے جارحانہ حملے کی مخالفت اور مسئلہ کشمیر پر بھارت کے رویے کی مذمت سے پاک روس تعلقات پر کس طرح کا اثر پڑا ہے۔

اب میں خواجہ شہاب الدین کی تقریر کے اس حصے سے بحث کرتا ہوں جو ناقابلِ بیان حد تک اخلاقی اصولوں کے منافی ہے۔ وزیر اطلاعات نے جھوٹ اور نیم صداقتوں کا جو تانا بانا تیار کیا ہے اس کا جواب تین طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔

1 ... خاموشی اختیار کی جائے اور ان زہر آلود بیانات کو نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ وقت کے ساتھ یہ عمارت از خود منہدم ہو جائے گی۔

2 ... اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور بیان کے مقابلے میں جوابی بیان اور شہادت کے جواب میں جوابی شہادتیں پیش کی جائیں۔

3 ... خواجہ صاحب یا ان کے رفیق کار کا جو اپنے معاونوں کی فوج سے مسلّح ہوں عوام کے سامنے علانیہ مقابلہ کیا جائے اور ان کے ساتھ باقاعدہ مناظرہ کیا جائے۔

وزیر اطلاعات نے چونکہ اپنی تقریر میں شہادتوں اور قانون کا ذکر کیا ہے لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ تیسرا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کے لئے لازم ہو گا کہ نکات کا تعیّن کیا جائے جن میں یہ نکات ضرور شامل ہوں گے۔

1 ... روس نے تاشقند کانفرنس کی جو دعوت دی تھی اس کے بارے میں میرا تجزیہ۔

2 ... تاشقند میں میرا کردار، اہم مسائل اور خاص طور پر بھارت کی اس کوشش کے سلسلے میں میرا ردِّ عمل کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو جائے۔ میرے نظریات اور یہ بات کہ کیا بات چیت کرنے والوں میں میں ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا؟

3 ... پاکستان اور بھارت کے وفود کے درمیان وزارتی سطح پر جو بات چیت ہوئی تھی اس میں بھارتی وفد کے ساتھ کیا بات چیت کی گئی تھی۔

4 ... جب میں نے پاکستان ہائی کمشنر کو یہ کہا تھا کہ مسودہ بھارتی وفد کو واپس کر دیں اس وقت میں نے پاکستانی ہائی کمشنر کو کیا ہدایات دی تھیں؟

5 جب اعلان کا مسودہ مجھے بھیجا گیا تو میں نے روسی وزیر خارجہ سے کیا کہا تھا؟

6 وفود کے رہنماؤں نے معاونوں کے بغیر جو ملاقاتیں کی تھیں ان کی تعداد کیا تھی۔

7 ... ان ملاقاتوں میں جو بات چیت ہوئی اس کے بارے میں شہادتیں۔

www.bhutto.org

8...... اہم ترین امور کے بارے میں روسی اور پاکستانی وفود کے درمیان بات چیت۔

9 آیا وزیر اطلاعات کا یہ کہنا جائز ہے کہ جن ارکان کو اعلان سے اتفاق نہیں تھا انہیں کانفرنس کے بعد علانیہ اپنے اختلافات کا اظہار کرنا چاہیے تھا؟

10...... کابینہ سے میری علیحدگی کی کیا وجہ تھی۔ کیا مجھے اعلان تاشقند کے فوراً بعد علیحدہ ہو جانا چاہیے تھا اور اگر میں ایسا کرتا تو اس سے کس کو فائدہ پہنچتا۔ کیا اس سلسلے میں ہر شخص کو قومی مفاد کو پیشِ نظر نہیں رکھنا چاہیے تھا؟

جنگ بندی سے اعلانِ تاشقند تک اور اس کے بعد اس اعلان کے نتائج کا سائنسی جائزہ لینے کے لئے جن نکات پر بحث کی ضرورت ہے یہ ان میں سے چند ایک ہیں۔ بدقسمتی سے خواجہ شہاب الدین ایک ایسے مسئلے کا جس کا تاریخ پر گہرا اثر مرتب ہو گا نہایت سرسری انداز میں ذکر کر رہے ہیں۔ شاید انہوں نے واقعات سے لاعلمی کی بنا پر ایسا کیا ہے۔ کیونکہ تمام کانفرنس کے دوران انہوں نے کانفرنس میں کوئی اہم حصہ نہیں لیا۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب وہ مشرقی پاکستان سے متعلقہ امور مثلاً پانی اور مسلمانوں کے اخراج جیسے مسائل پر خاموش رہے تو مجھے مجبوراً ان پر نکتہ چینی کرنی پڑی۔ ان کے سیکرٹری اطلاعات جو تمام واقعات کی ڈائری ان کے لئے تیار کرتے ہیں انہوں نے میری یہ بات بھی ڈائری میں لکھ رکھی ہے۔

وزیر اطلاعات نے بعض الفاظ یہ کہہ کر بیان کئے ہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ میرے منہ سے نکلے ہوئے کلمات ہیں۔ ان کی یہ بات سراسر غلط اور جھوٹ ہے کہ تمام کانفرنس میں انہوں نے میرے ساتھ گہرا ربط قائم رکھا۔ اگر خواجہ صاحب چاہتے ہیں کہ میں حرفِ صداقت زبان پر نہ لاؤں تو انہیں چاہیے کہ وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کریں۔ اگر یہ کھیل انہی قواعد کے مطابق کھیلا جانا ہے اور پہلوانوں کو اکھاڑے میں اترنا ہی ہے تو پھر مجھے بھی اس امر کی اجازت ہونی چاہیے کہ میں ان نامور شخصیتوں کے بیانات کے حوالے دوں جو کانفرنس میں شریک تھے اور جن میں صرف پاکستانی اصحاب ہی نہیں روسی وفد کے ارکان بھی شامل ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خواجہ صاحب کانفرنس کا ٹیپ ریکارڈ کس طرح بن گئے ہیں۔ جب کہ وہ نمونیہ اور برونکائٹس کی وجہ سے صاحبِ فراش تھے اور تمام وفد کی واپسی کے بعد بھی تاشقند میں ہی رکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

خواجہ صاحب نے ایک جگہ اپنی کانفرنس میں کہا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں میری شہادت کے بارے میں یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کی کوئی قانونی وقعت نہیں ہے اور میں نے مسٹر بھٹو کے بارے میں ایک ایسی رائے قائم کر لی ہو جو ان کے اصلی رویے سے مختلف ہو"۔

اگر خواجہ صاحب دستاویزی شہادتوں کو ہی اہمیت دیتے ہیں اور کوئی قانونی فیصلہ چاہتے ہیں تو پھر حکومت کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ تمام ایسی شہادتیں اور دستاویزات عوام کے سامنے پیش کرے جن سے عوام حقیقت کا خود اندازہ کر سکیں۔ آیئے ہم سب اپنا کردار عوام کے سامنے پیش کر دیں اور انہیں بطور خود فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کریں۔ عوام خود فیصلہ کریں گے کہ میرا رویہ کیا تھا۔ میں اداس تھا کہ

خوش۔ خواجہ صاحب کو خود اس بات کا اعتراف کرنا پڑا ہے اور اپنے سابقہ بیانات کی تردید کرنی پڑی ہے کہ اس وقت میں اداس تھا اور جس وقت اعلان پر دستخط ہو رہے تھے اس وقت میں تالیاں بجانے والوں میں شامل نہیں تھا جناب وزیر اطلاعات میرے اضمحلال کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے نمونیہ اور سینے کی تکلیف تھی۔

خواجہ شہاب الدین نے یہ بھی کہا ہے کہ لاہور اور پاکستان کے بعض دوسرے علاقوں میں ایجی ٹیشن نے میرے فیصلے کو متاثر کیا ہے۔ یہ ایک بڑا ظالمانہ طنز ہے ایک شخص جو جنگ کے نازک دور سے گزرا ہو اور اس نے اپنے عوام کے بہترین جذبات کی ترجمانی کی ہو وہ قوم کے جذبات سے کس طرح غافل رہ سکتا ہے۔ اگر عوام ہتھیار ڈالنے کے موڈ میں ہوتے تو میں ایک ہزار سال تک جنگ جاری رکھنے کے عزم کا کس طرح اعلان کرتا؟ خواجہ صاحب کا یہ کہنا نہایت غلط ہے کہ میں یہ دیکھ کر اعلانِ تاشقند کا مخالف ہو گیا ہوں کہ عوام اس سے خوش نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو اعلانِ تاشقند پر دستخطوں کے وقت اداس کیوں تھا میں نے تالیاں کیوں نہیں بجائیں جیسا کہ خود خواجہ صاحب نے کہا ہے؟

خواجہ صاحب نے مجھ پر اعتراض بھی کیا ہے کہ اگر مجھے اعلانِ تاشقند سے اتفاق نہیں تھا یا میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا گیا تو میں حکومت سے علیحدہ کیوں نہیں ہو گیا خواجہ صاحب یہ سوال کرتے ہوئے یہ بات بھول گئے ہیں کہ یہ وہ دور تھا جب عوام نے بھارت کے خلاف اپنی بہادرانہ جدوجہد ابھی ابھی ختم کی تھی اور ملک ایک نہایت نازک دور سے گزر رہا تھا۔ اگر میں اس وقت جب یہ بحران اپنی معراج پر تھا اور میں ایک باہر کے ملک میں تھا یہ اقدام کرتا تو ایک بہت بڑا قومی بحران پیدا ہو جاتا۔

خواجہ صاحب جن کے دل میں اب حق و صداقت کا کوئی احترام باقی نہیں رہا ہے' یہ بھی کہا ہے کہ اعلانِ تاشقند کے بعد میں تقریباً چھ ماہ تک اس لئے حکومت کے ساتھ شامل رہا کہ میں ملک بھر میں نوجوانوں کے لیڈر اور ہیرو کی حیثیت سے عوام کے سامنے جا سکوں۔ میرے نزدیک نوجوان طبقے کا لیڈر ہونا اور ان کی حمایت سے ایک نئی راہ تلاش کرنا فخر کا باعث ہے۔ لیکن جہاں تک ہیرو بننے کا تعلق ہے میں نے اس کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ صدارتی نظام میں ایسا کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔

میں حکومت میں محض اس لئے شامل رہا کہ میں چاہتا تھا کہ طاقِ نسیان کی زینت بننے سے پہلے میں قوم کے زخموں پر مرہم رکھ سکوں۔ میں بنیادی اصولوں کے بارے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ مجھے وزارت سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ خواجہ صاحب کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ میں نے علیحدگی کی راہ کیوں اختیار کی اور انہوں نے کابینہ کے ساتھ وابستہ رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

ہم انہیں پسند کریں یا ناپسند یہ حقیقت ہے کہ اعلانِ تاشقند نے پاکستان کے ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والے داغ لگا دیئے ہیں۔ ان کا جنگ کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے جس روز سے وزارت چھوڑی ہے میں اس نازک مسئلے کے بارے میں خاموش رہا ہوں۔ لیکن اب میں خود کو بولنے میں

www.bhutto.org

نسبتاً آزاد محسوس کرتا ہوں اور شاید خواجہ صاحب کی تقریر کا مقصد بھی یہی ہے۔

میں خواجہ صاحب یا کسی دوسرے وزیر کے ساتھ اس مسئلے پر بحث اور مناظرے کے لئے تیار ہوں ' اگر وہ چاہیں تو سب مل کر آجائیں اور اپنا تمام سازوسامان اور معاون و مددگار بھی ساتھ لے آئیں۔ میں ان کے مقابلے میں تنہا کھڑا ہو سکتا ہوں۔ آیئے قوم کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیں۔

آیئے اس سلسلے میں مساوات اور برابری کے اصول پر مناظرہ کرلیں۔ ہنگامی حالات اور دوسرے قوانین جو اظہارِ حق کی راہ میں حائل ہیں ختم کر دیئے جائیں۔ قانون صرف حکومت کے لئے ختم نہ کئے جائیں بلکہ ان کو میری راہ میں بھی حائل نہ ہونے دیا جائے۔ دفعہ 144 ہٹا دی جائے تاکہ لوگ مل کے طول و عرض میں جمع ہو کر اس مناظرے کو سن سکیں اور تمام بحث اخباروں ' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر غیر جانبداری سے نشر کی جائے۔ رازداری کا پردہ اٹھا کر سچائی کی روشنی کو عوام تک پہنچنے دیجئے۔ اگر سچائی کے بیان کی راہ میں کوئی چیز حائل ہوگی تو اس تمام مناظرے کا مقصد فوت ہو جائے گا کیونکہ اس کے ساتھ دس کروڑ عوام کا مستقبل وابستہ ہے۔

جناب وزیر اطلاعات ' یا تو آپ اپنے تمام سازوسامان کے ساتھ میدان میں آجایئے اور ایک عاجز شہری کے ساتھ مساویانہ بنیادوں پر بحث کیجئے۔ یا پھر اس کو اپنے تیروں کو نشانہ بنانا چھوڑ دیجئے۔ کیونکہ یہ عام شہری تو پہلے ہی مستبدانہ قوانین اور دفعہ 144 کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور پریس بھی جس کا بڑا طبقہ وزارتِ اطلاعات کا محکوم ہے اس کے حق میں نہیں ہے۔

فروری 1967ء

www.bhutto.org

تاشقند کی کہانی

قومی تاریخ کا ایک دردناک باب

اعلانِ تاشقند مملکت خداداد پاکستان کی مختصر تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ میں نے اس اندوہناک واقعہ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ آئندہ ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔ اس دستاویز کے ضمن میں میرا زاویہ نگاہ قومی اور اثباتی ہے۔ درحقیقت وطن عزیز کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھی میرا زاویہ نگاہ ہمیشہ یہی رہا اور میں نے ٹھوس قومی خدمات سرانجام دیں۔ پاکستان اقوام عالم سے کٹا ہوا تھا۔ میں نے ملک کو ایک مضبوط' معرکہ خیز اور بامقصد خارجہ پالیسی دی اور بعد ازاں ایوب خان کی آمریت کے خلاف ایک عظیم تحریک چلا کر قوم کو شخصی حکومت کی غلامی سے نجات دلائی۔ میں نے اسلامی مساوات اور اخوت کا پیغام ہم وطنوں کے دلوں میں اتار دیا ہے۔ اور ملک کے کونے کونے تک پہنچا دیا ہے۔ میں نہ صرف منفی سیاست سے خود اجتناب کرتا ہوں بلکہ ایسی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے تمام عناصر کے خلاف جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں تنگ نظری سے بھی احتراز کرتا ہوں اور قومی مفاد کو اپنے فکر و عمل میں اولیت کا درجہ دیتا ہوں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے ساتھ میں ملک کے بنیادی مسائل کو دیکھتا ہوں اور قدرتی طور پر اعلانِ تاشقند کے بارے میں بھی میرا رویہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

اعلان تاشقند کو بھارت و پاکستان جنگ' جنگ بندی اور کشمیر سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے تنازعہ کشمیر کے مستقبل' پاکستان کی خارجہ پالیسی اور ہندوستان سے کسی حد تک بڑی طاقتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر جب تک اعلانِ تاشقند منسوخ یا پاکستان اس سے

www.bhutto.org

بے تعلق نہیں ہو جاتا۔ یہ ہمارے بین الاقوامی مسائل سے متعلق ہے اور جب تک یہ ہمارے بین الاقوامی مسائل سے متعلق ہے۔ تب تک اس کا مکمل تجزیہ نہیں ہو سکتا اور اس کے مضمرات پر پورا تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں معاملے کو پُراسرار بنانے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ صرف ایک عملی وقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ البتہ جوں جوں وقت گزرے گا۔ اس اعلان کے بارے میں مزید تبصرہ کیا جا سکے گا۔ تاریخ کا یہی عمل ہے۔ تاریخ اس لحاظ سے آگے بڑھتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کوئی راز بھی راز نہیں رہتا۔ دوسری جنگِ عظیم کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح ایک ایک تفصیل واضح ہوتی چلی گئی۔ اب چونکہ اعلان پر ایوب خان اور پنڈت لال بہادر شاستری کے دستخط ہوئے چار سال گزر چکے ہیں اس لئے میں قومی مفادات کو خطرے میں ڈالے بغیر کچھ تفصیلات بتا سکتا ہوں۔

1966ء میں جب میں نے وزارت خارجہ کے منصب کو چھوڑا میں اس اعلان کے بارے میں ایک لفظ کہنے سے بھی انکار کرتا رہا۔ لیکن اب جب کہ چار سال بیت چکے ہیں۔ اور بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں اور یکم جنوری 1970ء سے سیاسی سرگرمیاں بحال ہو گئی ہیں۔ تو میں نے اس کے بارے میں بتدریج ضروری باتیں قوم کو بتانا شروع کیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اعلان کی اچھائیوں اور برائیوں کا اندازہ جنگ بندی کے موقع پر پاکستان کی پوزیشن کو پیشِ نگاہ رکھے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تو پاکستان نے گھٹنے ٹیک دیئے ہوتے۔ اہلِ پاکستان ہمت ہار بیٹھے ہوتے۔ یا فوجی اعتبار سے ہمیں شکست ہو گئی ہوتی تو اعلانِ تاشقند کو ان بنیادوں پر پرکھا جائے گا۔ لیکن اگر صورتحال اس سے مختلف تھی اور مسلّمہ طور پر مختلف تھی تو اسے مختلف بنیادوں پر جانچنا ہو گا۔

زمانہ جنگ کے دوران میں ملک کا وزیر خارجہ تھا۔ میری یہ حتمی رائے تھی اور اب بھی ہے کہ جنگ بندی قبول کرنے میں ملک کا فائدہ نہیں تھا۔ ہندوستان کی جارحانہ یلغار روک دی گئی تھی۔ ہماری فوجیں اکھنور کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ اور ہندوستان کی تقریباً چھ ڈویژن فوج کا محاصرہ کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ ہماری فضائیہ کو فضا پر مکمل قابو حاصل تھا۔ لاہور پر قبضہ کرنا ہندوستان کا سب سے بڑا مقصد تھا جس کے حصول میں وہ بری طرح ناکام ہو چکا تھا ہندوستان کا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا اور اس کی معیشت بالخصوص خوراک کی صورتحال ابتر ہو چکی تھی اور عوامی جمہوریہ چین کے الٹی میٹم نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ادھر پاکستان کی مسلح افواج زبردست جوابی حملہ شروع کرنے کے لئے تیار تھیں۔ سلامتی کونسل نے 22 ستمبر 1965ء کو جو قرارداد منظور کی۔ اس میں چار بڑی طاقتوں سمیت کونسل کے تمام ارکان نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کہ اقوامِ متحدہ مسئلہ کشمیر کو حل کرانے کی سعی کرے گی۔ بار بار یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ تمام بڑی طاقتیں اس وعدے کی پابندی کریں گی۔ عالمی رائے عامہ ہمارے حق میں تھی اور تمام ممالک ہمارے موقف کو مبنی بر انصاف سمجھتے تھے۔ ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی نگاہ میں پاکستان نجات دہندہ اور ہندوستان غاصب تھا۔ اس سیاق سباق میں پاکستان اور ہندوستان سوویت یونین کے ایماء پر تاشقند میں ملے۔ متحارب قوموں کے نمائندوں کی ملاقات کی تحریک گو روس نے کی تھی۔ مگر اسے امریکہ کی بھرپور

www.bhutto.org

تائید حاصل تھی۔ دسمبر 1965ء میں جب ایوب خان واشنگٹن گئے تو صدر جانسن نے انھیں تاشقند میں کانفرنس سے متعلق روس کی تجویز قبول کرنے کی ترغیب دی اور کہا کہ روس کی اس تجویز کو امریکہ کی تائید حاصل ہے۔ قبل ازیں سلامتی کونسل میں بھی امریکہ اور روس نے جنگ بندی منوانے کے لیئے تعاون کیا تھا۔

تاشقند کانفرنس میں ہندوستانی وفد سے بات چیت کا آغاز میں نے کیا۔ ان مذاکرات کے دوران میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں نے مشترکہ طور پر ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو حق خودارادیت دینے کا عہد کر رکھا ہے اور جب تک یہ عہد پورا نہیں کیا جاتا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر نہیں ہو سکتے۔ اس تنازعہ پر دو جنگیں ہو چکی ہیں اور اب ہندوستان کو اپنا عہد نبھانے کی ضرورت کا احساس کرنا چاہیے۔ بات چیت کی ان چند نشستوں کے بعد ایوب خان نے غالباً ہمارے میزبانوں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مذاکرات کی ذمہ داری خود سنبھال لی۔ وہ علیحدگی میں شاستری سے طویل ملاقاتیں کرتے تھے اور آخر میں ہمیں مختصراً بتادیا کرتے تھے کہ انہوں نے ہندوستانی وزیراعظم سے کیا باتیں کی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ گفتگو کے مافیہ کو کس حد تک چھپاتے تھے۔ البتہ میں نے یہ تاثر لیا..... کہ وہ شاستری سے اپنی بات چیت کی ساری تفصیل سے ہمیں آگاہ نہیں کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایوب خان شاستری کا جوڑ نہیں ہیں۔

ہندوستانی وفد شاستری اور ایوب خان کی خصوصی ملاقاتوں کے سلسلے پر بہت خوش تھا اور بات چیت سے میرے علیحدہ کر دیئے جانے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ تاہم ان مشکلات کے باوجود جب میرے علم میں بعض سنگین باتیں آئیں اور کم از کم تین نازک مرحلوں پر میں نے مداخلت کی۔ پہلا موقع وہ تھا جب ایوب خان مجوزہ اعلان کی ایک شق کے مسودے پر رضامند ہو گئے تھے جو اگر منظور کر لی جاتی تو پاکستان کے لئے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہے۔ ایک روسی کلچرل شو میں وقفہ ہوا تو ایوب خان مجھے ایک جانب لے گئے اور مختصر طور پر مجھے اس شق پر شاستری سے اپنے سمجھوتے کا خلاصہ بتایا۔ میں نے ایوب خان کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے یہ شق منظور کر لی تو پاکستان کے لئے تباہ کن ہوگی۔ میں نے اس شق کے مضمرات سے ان کو آگاہ کیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ نے اس ضمن میں شاستری کو کوئی تحریر بھی دی ہے۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا جب انہیں اس شق کے مضمرات کی سنگینی کا احساس ہوا تو وہ کہنے لگے آپ روسی وزیر خارجہ کو مطلع کر دیں کہ اس شق پر ایوب خان اور شاستری کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا۔

شو کے اختتام پر میں نے روسی وزیر خارجہ سے درخواست کی کہ آپ ذرا مجھ سے مل لیں۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں بتایا کہ مذکورہ نکتہ پر ایوب خان کو شاستری سے اتفاق نہیں ہے۔ اگلی صبح روس کے وزیر خارجہ نہایت برہمی کے عالم میں مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ شاستری اور ایوب خان میں تو اس شق پر سمجھوتہ ہو چکا ہے اور شق کا مسودہ جسے ایوب خان نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ شاستری نے ان کو دکھایا ہے۔ میں نے وزیر موصوف پر واضح کیا کہ کوئی بھی سمجھوتہ جو پاکستان کے مفادات کی قیمت پر ہو

www.bhutto.org

گا۔ میں اس کی مخالفت کروں گا ہر چند کہ ایوب خان تحریری طور پر اس شق سے اتفاق کا اظہار کر چکے تھے۔ میری مداخلت کے سبب وہ مسودہ سے خارج کر دی گئی۔ اور وقت بتائے گا کہ میری اس مداخلت سے پاکستان کو کتنا عظیم فائدہ ہوا۔

دوسرا موقع میرا خیال ہے چھ یا سات جنوری کو پیدا ہوا جب روسی وفد کی قیام گاہ پر مسٹر کوسیگن اور ایوب خان کے درمیان دونوں روسی اور پاکستانی وفدوں کے چیدہ چیدہ ارکان کی موجودگی میں مذاکرات ہوئے اور میں نے مداخلت کر کے پاکستان کو بحث کے ایک نازک موڑ سے صحیح سلامت نکالا۔

تیسرا موقع وہ تھا جب روسی وفد کا تیار کردہ مسودہ دکھایا گیا تو میں نے اسے کلیتاً رد کر دیا۔ پاکستانی وفد کو مسودے کی تین نقلیں بھیجی گئیں۔ ایک ہمیں اپنے تبصرے کے ساتھ ہندوستانی وفد کو اور دوسری اپنے تبصرے کے ساتھ روسی وفد کو واپس کرنی تھی اور تیسری ہمارے اپنے استعمال کے لئے تھی۔ میں نے ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر میاں ارشد حسین کو جو بعد ازاں میرے جانشیں بھی ہوئے مسودے کی ایک نقل دے کر ہندوستانی وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کے پاس بھیجا اور ان کو ہدایت کی کہ وہ سردار صاحب کو بتا آئیں کہ ہم اس غیر مساوی مسودے پر تبصرہ کی غرض سے ایک لفظ بھی کہنا نہیں چاہتے۔ پھر میں نے روس میں پاکستان کے سفیر مسٹر اقبال اطہر کو بھی یہی ہدایت دے کر روسی وفد کے پاس بھیجا۔ وفد نے مسودے کے بارے میں میرا دو ٹوک رویہ دیکھ کر اس میں کچھ رد و بدل کی۔ لیکن یہ ترمیمیں بھی میرے نزدیک تسلی بخش نہیں تھیں۔

روسی وفد نے ایوب خان کو شاستری سے مزید گفت و شنید کے لئے یہ مسودہ بطور ورکنگ پیپر قبول کرنے پر آمادہ کر لیا اور انہیں مطلع کیا گیا کہ بات چیت کے دوران اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک صاحب مسٹر کوسیگن کی امداد کی ضرورت محسوس کریں تو روسی وزیر اعظم اعانت کریں گے۔ جب ایوب خان اعلان کا آخری مسودہ پاکستانی وفد کے پاس لائے تو انہوں نے ہمیں بتایا "میں اس میں طریق کار سے متعلق یا غیر بنیادی ترمیموں (Procedural or other Unsubstantive Changes) پر تو غور کر سکوں گا۔ لیکن بنیادی تبدیلیاں قبول نہیں کروں گا کیونکہ میں اس کے بارے میں زبان دے چکا ہوں "میں نے ایوب خان کو بتایا کہ مجوزہ اعلان کی اہم شقیں بنیادی ترمیم و اضافہ کی متقاضی ہیں۔ اس پر ایوب خان نے دو ٹوک الفاظ میں واضح کیا کہ سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے سمجھوتہ کرنا ان کی ذمہ داری ہے اور صرف وہی عوام کے سامنے جواب دہ ہیں انہوں نے عدم تعاون کی شکایت بھی کی اور انتباہ کیا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے مابین امن بحال کرنے کے مشن میں اب کوئی مداخلت یا مزاحمت برداشت نہیں کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمیں اپنی کوششیں ان کی ہدایات کی تعمیل تک محدود رکھنی چاہئے اور یہ کہ متعلقہ نکات طے پا چکے ہیں۔

ایک اور موقع پر جب صدر ایوب ' ہندوستانی وزیر اعظم سے مذاکرات کی ایک نشست ختم کر کے واپس آئے تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ شاستری نہایت کمزور پوزیشن میں ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کے

www.bhutto.org

عوام نے اسے کشمیر کے مسئلہ پر سودے بازی کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایوب خان چونکہ مضبوط تر پوزیشن میں ہیں۔ اس لئے وہ سمجھوتہ کرنے کی بصیرت اور دانائی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ یہ سن کر میں نے صدر ایوب کو یاد دلایا کہ اگر ہندوستان کے عوام نے شاستری کو کشمیر کے سوال پر سودے بازی کرنے کا کوئی اختیار نہیں دیا تو آپ پر بھی کشمیر کے معاملے میں سمجھوتہ کا کوئی اختیار نامہ آسمان سے نازل نہیں ہوا۔

جس روز سمجھوتہ ہوا اس سے ایک رات پہلے پاکستانی وفد نے مسٹر کوسیگن کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا۔ ضیافت کے دوران میں نے اصل سوالات کو دوبارہ اٹھانے اور مجوزہ اعلان کے مسودے میں اصلاح کرانے کی ایک دیوانہ وار کوشش کی لیکن مختصر سی بات چیت کے بعد ایوب خان غصہ میں آ گئے اور کوسیگن اور دوسرے روسی مہمانوں کی موجودگی میں اردو میں کہنے لگے۔ "تم کیا کر رہے ہو۔ کیا تم ایک اور جنگ چاہتے ہو۔ بات ختم ہو گئی ہے۔ تم کیا رٹ لگائے جا رہے ہو۔ اب بس بھی کرو"۔

جب اعلانِ تاشقند پر دستخطوں کی رسم ادا کی جا رہی تھی تو میں درد و غم اور بے بسی و مایوسی کے عالم میں ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے کامرانی کے چمن کو اجڑتے دیکھا۔ مجھے اپنے عوام کی بیش بہا قربانیاں رائیگاں جانے کا قلق تھا اور میں کشمیریوں کے لا متناہی مصائب پر رنجیدہ تھا میں نے تن تنہا "عظیم آمر" کی ستم رانیوں کا مقابلہ کیا یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب کی طرح تھا مجھے وفد کے ان ارکان کی اخلاقی حالت پر بھی تعجب تھا جو مجھ سے کچھ اور ایوب خان سے کچھ کہتے تھے۔

اعلانِ تاشقند کے بعد روسی حکومت نے پاکستان اور ہندوستان کے وفدوں کے اعزاز میں ایک پُر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔ ہندوستانی شاداں تھے۔ شاستری پھولے نہیں سماتے تھے۔ پستہ قد بھارتی وزیر اعظم کے چہرے پر کامیابی کا غرور نمایاں تھا لوگ کھاتے پیتے رہے اور میں ایک کونے میں بیٹھا سگار پیتا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں چھوڑتے اس ڈراؤنے سپنے پر غور کرتا رہا جو وطن سے دور دن کے اجالے میں میں نے دیکھا تھا۔ مسٹر کوسیگن میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ تھام کر کہنے لگے اٹھیئے۔ مسٹر شاستری آپ سے ملاقات کے لئے بیتاب ہیں۔ وہ کشاں کشاں شاستری کے پاس لے گئے۔ شاستری نے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ کہنے لگے گو ہمارا آپ کا اختلاف رہا ہے۔ لیکن ہم آپ کی عزت کرتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات میں آج ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے آپ کو بھی اب تعاون کرنا چاہئے کیوں کہ آپ کے صدر سے جو میری مفاہمت ہوئی ہے۔ وہ اس اعلان (اعلانِ تاشقند) سے بھی زیادہ اہم ہے۔ میں نے شاستری کو بتایا کہ میری قوم کی طرف سے مجھ پر جو فرض عائد ہوتا ہے میں وہ فرض ادا کرتا رہوں گا۔

علی الصبح ہمیں اطلاع ملی کہ شاستری انتقال کر گئے۔ ایوب خان ہم سے پہلے ہندوستانی وفد کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے تھے۔ ہم وہاں گئے تو انہیں سردار سورن سنگھ اور مسٹر چون سے مصروفِ گفتگو پایا۔ ہندوستانی وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر جھا بار بار کہہ رہے تھے۔ شاستری جی کی اچانک موت بہت بڑا

www.bhutto.org

المیہ ہے۔ آنجہانی اور صدر ایوب کے درمیان ایسی مفاہمت ہو گئی تھی جو اعلانِ تاشقند سے بھی اہم تر تھی۔ اب ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا پُر کرنا دشوار نظر آتا ہے۔ ہوائی اڈے پر ایوب خان نے شاستری کی ارتھی کو کندھا دیا جب مجھے بھی ارتھی کو کندھا دینے کے لئے کہا گیا تو میں نے جواب دیا کہ کسی غیر مسلم کے تابوت کو کندھا دینا مسلمانوں کی روایات کے مطابق نہیں اور پھر میں کسی ایسے شخص کے تابوت کو کندھا کیسے دے سکتا ہوں جس نے حال ہی میں میرے وطن کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا۔ تاشقند سے مسٹر غلام فاروق ارتھی کے ساتھ دہلی گئے اور شاستری کے کریا کرم میں شریک ہوئے پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اصولاً مجھے دہلی جانا چاہئے تھا۔ لیکن ہمیں اطلاع ملی کہ ہندوستانی حکمران ہندوستان میں میری حفاظت کے خاطر خواہ انتظامات کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے بھارتی وزیراعظم کی آخری رسومات میں شرکت کے لئے کوئی دوسرا آدمی بہتر رہے گا۔

تاشقند کانفرنس پر مامور پاکستان سمیت تمام ملکوں کے اخباری نمائندوں کو معلوم تھا کہ اعلانِ تاشقند جوں جوں صورت پذیر ہوا میں اس کی مخالفت کرتا رہا۔ انہوں نے میرے رول پر طویل مضامین اور رپورٹیں لکھیں۔ اب ساری دنیا کو علم ہو چکا ہے کہ میں اسی اعلان کا مخالف تھا اور میں نے پاکستان کو اس سے بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ پاکستان آکر میں فوراً لاڑکانہ چلا گیا اور مسلسل تین ہفتے وہاں مقیم رہا۔ ایوب خان لاڑکانہ آئے اور اصرار کیا کہ بحران کے خاتمے اور پاکستان کی سرزمین سے غیر ملکی افواج کے انخلا تک میں وزارت کا کام جاری رکھوں۔ میں نے اعلانِ تاشقند سے پہلے بھی استعفیٰ دیا تھا۔ میں نے اعلانِ تاشقند کے بعد بھی استعفیٰ دیا۔ لیکن مجھے نسبتاً بہتر حالات پیدا ہونے تک انتظار کرنا پڑا۔ قومی مفاد اسی میں تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایوب خان اور شاستری میں کوئی خفیہ معاہدہ بھی ہوا تھا اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وزیراعظم شاستری اور مسٹر جھا جو یہ کہتے پائے گئے کہ ایوب خان سے ان کی جو مفاہمت ہوئی ہے وہ اعلانِ تاشقند سے بھی اہم تر ہے تو اس کا مطلب کیا تھا؟ البتہ اس ضمن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اعلانِ تاشقند بہرحال بہت برا ثابت ہوا۔ اور اس سلسلے میں اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اعلانِ تاشقند کے بعد جب میں نے مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں لے جانے اور عالمی ادارہ کو اس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی تو ایوب خان نے میرے ارادوں کی پُرزور مخالفت کی اور وہ اپنے اقتدار کا آفتاب غروب ہونے تک اس کے لئے تیار نہ ہوئے پھر منگلا بند کے افتتاح کے موقع پر انہوں نے جو تقریر کی اس پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ ایوب خان نے اس تقریر میں کہا تھا کہ اگر قومیں اپنے جھگڑے مٹا نہیں سکتیں تو انہیں ایسے جھگڑے بالائے طاق رکھ کر دوسرے میدانوں میں تعاون کرنا چاہئے۔

پاکستان واپس آکر جب ایوب خان نے اعلانِ تاشقند کے خلاف عوامی تحریک کو ابھرتے دیکھا تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بیرونی دباؤ قبول کر کے کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ٹھہرے ہیں۔

1969ء

www.bhutto.org

چھٹا حصہ

ایوب حکومت کے ساتھ ساتھ

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان کے دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی اساس

کسی قوم کی اقتصادی ترقی کا طویل المیعاد منصوبہ اس کی مثالی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تصور کے پس منظر میں اس کے اقتصادی نصب العین کے خدوخال کی نشاندہی کرتا ہے۔

پاکستان کے دوسرے پانچ سالہ منصوبے پر عمل در آمد شروع ہونے والا ہے۔ اس منصوبے کا حقیقت پسندانہ اور تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قوم کے سیاسی شعور اور اخلاقی اقدار و نظریات کو ذہن نشین کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ان نظریات واقدار اور اقتصادی نصب العین میں کیا رشتہ ہے۔ اس خاص منصوبے کی خصوصیات اس وقت تک متعین نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ اس نظام زندگی کا جواز مہیا نہ ہو جو اس منصوبے کی بنیاد ہے اور جس کی تشکیل اس منصوبے کی مزید غرض وغایت ہے۔

اگر ہم پیداوار کے مثالی طریقوں کو اشتراکی نقطہ نظر سے دیکھیں گے تو ہم اس منصوبے پر صاد نہیں کر سکیں گے۔ نہ ہی یہ منصوبہ ملکیت اور تقسیم کے سوشلسٹ اصولوں پر پورا اترے گا۔ علاوہ ازیں یہ منصوبہ مکمل آزادانہ معیشت کے اصولوں سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

مندرجہ بالا تینوں نظریوں کے حامی ہمارے نقطہ نظر سے اختلاف کریں گے اس لئے میں یہ کہوں گا کہ پاکستان کی اقتصادی منصوبہ بندی کا تجزیہ حکومت کی ترقیاتی پالیسی کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر یہ منصوبہ حقیقت پسندانہ صحیح اور اہم معلوم نہیں ہو سکتا۔

اقتصادی ترقی کی جہت، رفتار، تنظیم محنت اور ترقی کے مختلف مراحل میں ترجیحات کا تعین قومی امنگوں اور آرزوؤں کے پس منظر میں ہی کیا جاسکتا ہے اور قومی امنگوں میں اقتصادی خود کفالتی کی خواہش

www.bhutto.org

کے علاوہ آزادیِ خیال، پیشہ اور سکونت کے انتخاب کی آزادی بھی شامل ہے۔

جب انسان کی مختلف امنگوں کو تعمیری افعال کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے تو یہ افعال مقاصد کے تصادم کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر مقصد دوسرے مقصد سے ترجیح کا طالب ہوتا ہے۔ لوگ مختلف اقدار و نظریات کے سلسلے میں مختلف امنگوں کے دباؤ کے تحت جس شدت سے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی مختلف درجوں کا ہوتا ہے۔

اقتصادی منصوبہ بندی اور اقتصادی مقاصد کا تعین کرنے والا تمام انسانی افعال میں صرف اقتصادی عوامل کو کارفرما دیکھتا ہے۔ مذہب پرست انسانی افعال کو مشیت الٰہی پر محمول کرتا ہے۔ آزاد معیشت پر یقین رکھنے والا فرد کی اقتصادی زندگی کو ہر طرح کی مداخلت سے پاک تصور کرتا ہے۔ گویا ہر فرد کی سوچ کسی نہ کسی نظریہ، یقین یا تصور کی تابع ہوتی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ہم ایسی زندگی گزاریں جو اس کے نظام اقدار پر مبنی ہو اور اس کے تصورِ معیشت سے مطابقت رکھے۔

ہمارے خیال میں ہمارا دوسرا پانچ سالہ منصوبہ نہایت حقیقت پسندانہ اساس رکھتا ہے۔ میں اس اساس کے عناصر کی وضاحت کرتا ہوں۔

اس ضمن میں جو پہلی اور اہم بات زیادہ قابلِ غور ہے، وہ ہے انسان کی آزادی کا لازمی اعتراف۔ انسان ہر اس قدر کے خلاف ردِ عمل ظاہر کرتا ہے جو اس کی آزادی پر اثر انداز ہو۔ دوسرے منصوبہ کی اساس اسی اعتراف پر ہے۔ اس منصوبہ میں سرمایہ کاری کی جن ضرورتوں کا حساب لگایا گیا ہے، ان کے لئے در کار سرمایہ کا 56 فیصد نجی بچتوں کی بنیاد پر اکٹھا ہوگا۔

اس منصوبہ میں افراد کو ان کی صلاحیت اور اہلیت کے مطابق کام کرنے کی اجازت دینے کی اہمیت کا اعتراف و احساس ہے۔ حکومت کی خواہش ہے کہ لوگوں پر کوئی سخت اقتصادی یا سماجی نظام عائد کرنے کی بجائے عوام کی اکثریت کو اپنی مرضی سے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

یہاں اس نظام کے حق میں کچھ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ہماری معیشت جزوی طور پر آزاد معیشت ہے اور یہ اس وقت تک آزاد رہے گی جب تک لوگ اس کا ڈھانچہ بدلنا نہ چاہیں گے۔ یہ امر شک و شبہ سے بالا ہے کہ جس معاشرے کی حیثیت آزاد معیشت کے اصولوں پر استوار ہو وہاں شخصیت اور صلاحیتوں کے فطری فروغ اور ترقی کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں اور افراد کو ترقی کے لئے تہذیب کے ثمرات میسر ہوتے ہیں۔

کارل مارکس نے بہرحال اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ آزاد معیشت اور صنعتی معاشرے میں دولت لازماً چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے اور کارکن طبقہ زبوں حال ہو جاتا ہے۔ بالآخر طبقاتی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ لیکن تمام ملکوں کی اقتصادی تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ امریکہ اس کی بہترین مثال ہے۔ امریکہ میں اقتصادی عمل کے نتیجہ میں ذرائع پیداوار بڑی بڑی کارپوریشنوں کی تحویل میں چلے گئے۔ ان کارپوریشنوں پر چند افراد کا قبضہ نہیں ہے بلکہ لاکھوں افراد ان کے مالک ہیں۔

www.bhutto.org

اس نظام سے حاصل ہونے والے فوائد اتنے واضح اور معروف ہیں کہ یہاں انہیں بیان کرنا ضروری نہیں۔ ان فوائد نے امریکہ کو ساری دنیا کے لئے قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ پاکستان امریکہ کے اقتصادی امور سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ ترقی کے ان ہی خطوط پر چلے۔

ہمارے دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی اساس میں موجود عناصر میں سے دوسرا عنصر سرکاری شعبہ کی ضرورت اور ذمّہ داری ہے۔ واپڈا اور صنعتی ترقیاتی کارپوریشن ایسے ادارے انتظامی اور اقتصادی ماہرین نے تیار کئے ہیں اور یہ ادارے حکومت کی مرضی اور پشت پناہی سے بہت جلد بہتر نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ نجی سرمایہ کار اپنے محدود وسائل کے باعث جلد بہتر نتائج نہیں دکھا سکتا۔ پاکستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں اس طرح کے باوسائل اداروں کا قیام قومی تعمیر نو کے کام میں نجی شعبہ کی مساعی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے اداروں کو اپنی سرگرمیاں متعینہ دائروں میں محدود رکھنی چاہئیں اور نجی شعبہ کو یہ موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنی کارکردگی دکھائے اور باقی ماندہ خلا کو پُر کرے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو نجی سرمایہ کار بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر سکتا ہے، وہ بڑے صنعتی یا زراعتی منصوبے شروع نہ کرے۔ اس کے برعکس ایسے سرمایہ کاروں کو ہر سہولت فراہم کی جائے گی۔ سرکاری شعبہ کی طرف سے منصوبہ بندی کے تحت وسیع پیمانے پر ترقیاتی کارروائی قطعی طور پر آزاد معیشت کے تصوّر سے متصادم ہے۔ لیکن کوئی نظام بھی مکمل طور پر آزاد اور غیر محدود نہیں ہے بلکہ آزادانہ سرمایہ کاری اور پابند سرمایہ کاری کا ایک خوشگوار امتزاج وجود میں آ چکا ہے اور یہی طریقہ عرصہ سے مروّج ہے۔

اس بنا پر ہمارے دوسرے پانچ سالہ منصوبہ جیسے منصوبے نجی اور سرکاری شعبوں کی ضرورتوں کو یکجا کرتے ہیں۔ سرِدست جزوی سرکاری اور جزوی نجی سرمایہ کاری ہی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔ اس طرح سرمایہ رکھنے والے نجی سرمایہ کاروں کو قومی پیداوار میں حصہ لینے کا موقع ملتا ہے اور حکومت بھی سرکاری شعبوں کے ذریعے اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی تیسری خصوصیت زراعت کی ترقی پر زور ہے۔ بالخصوص سرکاری شعبوں میں صنعتی ترقی پر زور کسی حد تک کم کر کے زراعت کو ترجیح دی گئی ہے۔ بھاری اور درمیانی صنعتوں پر زور کم کر کے زراعت کو اہمیت دینے کے مسئلہ پر خاصی تنقید ہوئی ہے جو دیانتداری پر مبنی ہے۔ اس تنقید کی وجہ ترجیحات کی تقدیم و تاخیر ہے۔ منصوبہ میں تمام بیرونی اور اندرونی کمزوریوں کا خیال رکھا گیا ہے اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ صنعت اور زراعت کو ہر وقت یکساں اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

زراعت کو ترجیح دیتے وقت بہت سوچ بچار اور بحث و تمحیص ہوئی تھی۔ پاکستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک کے لئے خوراک میں خود کفالتی لازمی ہے۔ اس کے بغیر اس کی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اشیائے خوردنی کی مسلسل درآمد سے نہ صرف زرِ مبادلہ ضائع ہوتا ہے بلکہ دوسرے ملکوں پر انحصار میں اضافہ ہوتا ہے۔ زرِ مبادلہ کے بغیر ملکی معیشت کی ترقی ممکن نہیں۔

مکمل طور پر صنعتی ملکوں کی صورتحال مختلف ہے۔ بعض مغربی ممالک خوراک میں خود کفیل نہیں

www.bhutto.org

لیکن وہ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ہیں' اس لئے خطرات سے محفوظ ہیں۔ ان کی خوراک کی قلت ان کی کمزوری نہیں ہے کیونکہ وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے جوابی اقدامات کر سکتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں ابھی اس قسم کی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس سے مغربی ممالک بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں زراعت کی ترقی پر خاص توجہ دینی ہوگی۔

ہمیں نہ صرف زرعی پیداوار بڑھانی ہے بلکہ سیلاب اور بیماریوں سے پہنچنے والے نقصانات سے بچنے کا بھی انتظام کرنا ہے۔ ہم خوراک میں خود کفیل ہو سکتے ہیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم زراعتی ترقی اور پیداوار کے لئے درکار صحیح طریقے اختیار کریں۔ ہمیں تمام قوتیں اسی میدان میں صرف کرنی چاہئیں۔ ہمیں سیم و تھور زدہ زمین کو دوبارہ قابلِ کاشت بنانا ہو گا۔ بنجر زمینوں کے وسیع قطعات بندوں اور نہروں کی تعمیر کے ذریعہ زرخیز بنانے ہوں گے۔

زراعت کے میدان میں قابلِ ذکر نتائج حاصل کرنے کے لئے اسے ایک صنعت کا درجہ دینا ہو گا۔ صنعتوں کو جو مراعات دی گئی ہیں جیسے ٹیکسوں میں چھوٹ وغیرہ وہ زراعت کو بھی دینی چاہئیں۔ اگر صنعت کے میدان میں زیادہ پیداوار کا محرک منافع ہے تو زراعت کے میدان میں یہ محرک کیوں نہیں بن سکتا؟ ملک کو زرعی لحاظ سے خود کفیل بنانا ضروری ہے اور ایسا کرنے کے لئے کاشت کاروں کو پُرکشش ترغیب دینا لازمی ہے۔

یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ہماری اسی فیصد آبادی کا انحصار زراعت پر ہے۔ زراعت کی ترقی کا مقصد آبادی کی اکثریت کی ترقی ہے۔ پاکستان صنعت کی ترقی کے لئے محدود وسائل رکھتا ہے اسے ایشیا کا ڈنمارک بننے کی کوشش کرنی چاہئے نہ کہ ایشیا کا جرمنی۔ ایک جرمن مؤرخ نے ایک بار کہا تھا۔

"اگر خدا فولاد کا بنا ہوا ہے تو میں اس پر ایمان لاتا ہوں"۔ ہمارے ہاں لوہا' فولاد' تانبا' کوئلہ اور دوسری دھاتیں کہاں ہیں؟ جب تک ہمیں تیل دستیاب نہیں ہوتا' ہماری کپاس ہمارا فولاد ہے اور ہماری پٹ سن ہمارا تیل۔ ہم چراگاہوں کے باشندے ہیں اور ہمیں اس پر فخر کرنا چاہئے۔ زراعت ہی ہماری بنیاد ہے اور ہمیں اس پر انحصار کرنا چاہئے۔ ہم نے اسے طویل عرصہ تک نظرانداز کئے رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صنعت کی توسیع روک دی جائے' بلکہ صنعت کو وسعت دینے کی کوششیں تیز تر کر دینی چاہئیں۔

تاہم زراعت کو ضروری ترجیح ملنی چاہئے۔ ہم زرعی خام مال ہی سے قیمتی زرِ مبادلہ حاصل کرتے رہے ہیں اور زرِ مبادلہ کے بغیر نہ صنعتی ترقی ممکن ہے نہ زرعی۔ کیونکہ زراعت کے میدان میں جلد انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے اور زراعت ہی ہماری بڑی صنعت ہے۔ اس طرح ہم زیادہ زرِ مبادلہ کما سکتے ہیں لہٰذا زراعت کی ترقی پر زور دینے میں زیادہ فائدہ ہے۔

یہ لازمی امر ہے کہ نجی شعبہ ایسی صنعتوں پر توجہ دے جو زراعت کے لئے ضروری ہیں۔ نجی سرمایہ کاروں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ زرعی آلات تیار کریں اور انجینئرنگ کے کام کی گنجائش پیدا کریں

www.bhutto.org

اس طرح وہ ان اشیاء کی طلب اور سروسوں میں اضافہ کر سکتے ہیں کیونکہ زراعت ان اہم اقدامات کی مدد سے ترقی کرتی ہے جن کا دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں احساس اور اعتراف موجود ہے۔

زراعت پر بھی اتنی ہی خصوصی توجہ دی جانی چاہئے جتنی رہائشی مسئلہ اور سماجی بہبود پر دی جاتی ہے۔ خوراک، رہائش اور مناسب لباس انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں اور جدید سہولتوں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ان ضرورتوں کی تکمیل لازمی ہے۔ زراعت کی ترقی سے عام آدمی کو سستے داموں زیادہ سے زیادہ خوراک مل سکے گی۔ اس کی رہائشی ضرورتوں پر بھی مناسب توجہ دی جا رہی ہے۔ ولیج ایڈ اور قومی ترقیاتی تنظیم کے ذریعے سماجی بہبود کا کام تکمیل پائے گا۔

نئے پانچ سالہ منصوبے کا چوتھا پہلو ٹیکسوں کی رقم کی مد میں ایک ارب روپے کا اضافہ ہے۔ منصوبے میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اضافی ٹیکس ان لوگوں پر عائد ہو گا جو اسے ادا کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔

اس وقت تک زراعت کو نظرانداز کر کے صنعت کو پُرکشش مراعات دی جاتی رہی ہیں۔ اگرچہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور اس کے زرمبادلہ کا نوے فیصد حصہ زرعی پیداوار ہی کے عوض ملتا ہے۔ لیکن اس بنیادی صنعت کو بری طرح نظرانداز کیا گیا ہے۔ زراعت کی قیمت پر صنعت کو غیر محدود عرصے تک تحفظات اور امداد دیتے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ٹیکسوں کی مد میں ایک ارب روپے کا اضافہ کر دینے سے صنعتی ترقی پر برا اثر نہیں پڑ سکتا اگر ٹیکسوں کا بوجھ صنعتی سیکٹر پر ڈال دیا جائے۔

ٹیکسوں میں فیصد اضافہ سے صنعتی ترقی لازمی طور پر متاثر نہیں ہوتی۔ اس دور میں بڑی صنعتیں کارپوریشنوں کی ملکیت ہیں۔ کارپوریشن کے قانونی لحاظ سے وہی حقوق و فرائض ہوتے ہیں جو فرد واحد کے ہوتے ہیں۔ فرد واحد کارپوریشن کی شکل اختیار کر کے نسبتاً زیادہ دولت جمع کر لیتا ہے۔ مجموعی آمدنوں پر ستر اسی فیصد ٹیکس عائد کرنے کے باوجود، جو کروڑوں اربوں روپے تک پہنچ جاتا ہے منافع کی کشش ختم نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر تیل کمپنیوں کے ڈائریکٹروں اور دوسرے عملے کو بڑی بڑی تنخواہیں ملتی ہیں۔ صنعتی ترقی کی کوئی حتمی حد نہیں ہے۔ صنعتوں کو اندرون ملک اور بیرون ملک منڈیاں میسر ہوتی ہیں۔ اس کی آمدنی میں اسی کی ترقی کے تناسب سے اضافہ ہوتا ہے۔

زراعت کے شعبے میں اس نوع کے حالات نہیں ہوتے۔ زراعت کے میدان میں سرمایہ کاری محدود ہوتی ہے۔ زراعت کو سیلاب، کیڑوں مکوڑوں سیم اور تھور وغیرہ کے خطرات لاحق رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں پندرہ بیس سال بعد زراعت کو معمول کے اقتصادی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو زراعت کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ اس کے برعکس صنعت کو صرف ہڑتالیوں کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ صنعتی پیداوار اور اس کی فروخت اور منافع روزانہ کے لین دین کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ صنعت کار پیداوار کو مانگ سے ہم آہنگ کر کے ہڑتالوں سے ہونے والے نقصان کو پورا کر سکتا ہے، لیکن جب کاشت کار پر آفت آتی ہے تو اسے فصل کے اگلے موسم سے پہلے سنبھلنے کی کوشش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

محدود آمدنیوں پر انکم ٹیکس کی شرح میں اضافہ سے ترقی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ان تمام کوائف

www.bhutto.org

اور مشکلات کے باوجود صنعت کی طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ ٹیکسوں کا بوجھ زراعت پر ڈالا جائے۔

زرِ مبادلہ کی فراخدلانہ بیرونی امداد زیادہ بیرونی امداد اور قرضوں کی توقع دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی اساس کا پانچواں پہلو ہے۔ آسانی سے دستیاب ہونے والے زرِ مبادلہ کی ضرورت محتاجِ بیان نہیں۔ میں اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت سے اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے منصوبے کے متاثر ہونے کا امکان ہے۔ اب میں جو کچھ کہوں گا وہ بظاہر اس مضمون کی اصل روح سے ہٹ کر ہوگا لیکن بیرونی قرضوں اور امداد اور ان کے حصول کے طریقِ کار کا احتیاط سے تجزیہ ایک لازمی امر ہے تاکہ صحیح صورتحال واضح ہو سکے۔

اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے پاس زرِ مبادلہ کے حصول کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ ہم جن چیزوں کے عوض زرِ مبادلہ حاصل کرتے ہیں وہ ہیں پٹ سن 'کپاس 'اون 'چمڑہ' کھالیں اور اونی قسم کی چائے' اور یہ تمام کی تمام بنیادی اشیاء ہیں۔ ان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ہم اپنا نوے فیصد زرِ مبادلہ انہی سے حاصل کرتے ہیں۔ ہماری صنعتی ترقی کی بنیاد دو خام اشیاء پر ہے یعنی پٹ سن اور کپاس۔ بونس سکیم کے تمام مصنوعات اور نیم تیار مصنوعات سے دس ماہ کے عرصہ میں جو زرِ مبادلہ حاصل ہوا ہے وہ صرف چالیس کروڑ روپے کا ہے۔ یہ صورت حال اگرچہ اچھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی غیر تسلی بخش ہے۔

دوسرے منصوبے میں زرِ مبادلہ کو قلو پطرہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ زرِ مبادلہ کے حصول کا باعث بنے نہ کہ زرِ مبادلہ کا محتاج۔ اوپر جن بنیادی اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کو مشکلات درپیش ہیں۔ پٹ سن کی مانگ میں عرصہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوا اور منڈیوں میں پٹ سن کی جگہ' کاغذ کے تھیلے لے رہے ہیں۔ کپاس سے متعلق مشکلات کا ذکر یہاں لاحاصل ہے۔ اس وقت امریکہ اعلیٰ درجہ کی روئی کی پچاس لاکھ گانٹھیں برآمد کرنے کا ارادہ کر سکتا ہے اور اس برآمدی پروگرام کو امدادی برآمدی پروگرام بنایا گیا ہے۔ مقابلہ بڑا سخت ہے ہمیں نہ صرف اندرونی مجبوریاں درپیش ہیں بلکہ بیرونی بھی ہیں۔

ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادی ترقی کی اہم ترین ضرورت معقول سرمایہ کاری کی فراہمی ہے۔ اندرونی بچتوں کی شرح بہت کم ہے جو تھوڑی بہت بچتیں ہیں وہ آبادی میں بے تحاشہ اضافہ کی نذر ہو رہی ہیں۔ ہماری مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہمارے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیں بین الاقوامی امداد کے علاوہ زرِ مبادلہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم زرِ مبادلہ بھی کما سکتے ہیں جب ہمیں اپنی پیداوار کی معقول قیمت ملے۔ صرف اس صورت میں ہم اپنی ترقی میں خود حصہ لے سکتے ہیں۔ اپنی استعداد بڑھانے کا انحصار زرِ مبادلہ پر ہے۔ یہ امر تشویشناک ہے کہ گذشتہ سالوں میں ہمارے زرِ مبادلہ کی آمدنی میں بہت کمی واقع ہوئی ہے۔

58-1957ء میں بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں کمی واقع ہونے سے ترقی پذیر ملکوں کے زرِ مبادلہ

www.bhutto.org

کی آمدنی میں 8 فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ گویا ایک سال میں انہیں جو نقصان پہنچا ہے وہ بین الاقوامی بنک برائے تعمیر نو و ترقی کی طرف سے 57-1956ء کی سطح پر چھ سال میں ملنے والے قرضوں کے برابر ہے۔ اب تک ہمیں مختلف ذرائع سے جو امداد ملی ہے وہ اس نقصان کا نصف ہے جو بنیادی اشیاء کی قیمتیں کم ہونے سے ہوا ہے۔ اسوقت ہماری بنیادی اشیاء کی قوت خرید 49-1948ء کے مقابلے میں پچاس فیصد ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ بڑا تکلیف دہ اور مایوس کن ہے اس لئے ہمیں حالات کے تقاضوں کے مطابق فوری طور پر عہدہ بر آ ہونا ہے۔

پاکستان نے اسی مقصد کے تحت بڑی کامیابی سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چودھویں اجلاس میں اس مفہوم کی قرارداد پیش کی کہ ماہرین کی ایک کمیٹی بنیادی خام مال پیدا کرنے والے ملکوں کے مشورے سے ایک ایسا نظام قائم کرنے کا جائزہ لے جس سے بنیادی خام مال کی قیمتوں میں کمی سے ہونے والا خسارہ پورا ہو سکے۔ اگر اس سامان کی قیمتوں میں کمی کا سلسلہ جاری رہا اور مصنوعات کی قیمتیں بھی بڑھتی رہیں تو دوسرے منصوبے کے مقاصد کا حصول اور بھی مشکل ہو جائے گا۔

زر مبادلہ پیدا کرنے کی ہماری مشکلات کے ماسوا ہمیں ان پریشان کن رجحانات کے بارے میں بھی کچھ سوچنا پڑے گا جو بیرونی ملکوں سے قرضوں اور امداد کے حصول سے متعلق ہیں۔ ہماری خارجہ پالیسی چونکہ واضح، مستقل اور اخلاقی طور پر صحیح ہے اس لئے بہت سے ملک ہمیں امداد دینے سے انکار کر رہے ہیں۔

"غیر جانبدار ممالک" دونوں ملکوں سے وابستگی کی بنا پر تمام ذرائع سے امداد حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ ہمارے ذرائع محدود ہیں اور اب یہ محدود ذرائع بھی ہم پر ایسی پابندیاں عائد کر رہے ہیں جو پہلے نہیں تھیں۔ جب یورپ میں مارشل پلان کا نفاذ ہوا تو امداد پانے والے ملکوں پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی اور کم سے کم وقت میں ان کی معیشت کو بحال کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی تھی۔

اس طرح اس وقت سابق صدر "ٹرومین" کا "نکتہ چار" پروگرام بھی مارشل پلان کے اصولوں پر مبنی تھا۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہماری ترقی کے اس نازک مرحلہ میں امریکہ قرضے کے استعمال میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہتا ہے۔ خوشحال یورپی ملکوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ امریکہ کی پالیسی کے نتیجہ میں امداد میں واقع ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لئے آگے بڑھیں۔

مغربی یورپ اور جاپان ایسا کریں گے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات بھی غیر یقینی ہے کہ امریکہ کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی میں یورپی ملکوں کو شریک کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کر رہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں یا اس کا مقصد کچھ اور ہے۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ مسٹر ڈگلس ڈلس نے جو اقتصادی امور کے انچارج بھی ہیں، حال ہی میں یورپ کا دورہ کیا ہے تاکہ وہ یورپی ممالک کو یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ پاکستان جیسے ملکوں کی حقیقت یہ ہے کہ آئندہ بیس سالوں میں امنگوں کی بیداری اور توقعات میں اضافہ کے انقلاب کی آمد ہے اور کئی "نئے جاپان" پیدا کرنے کے لئے صنعتی ترقی

www.bhutto.org

کی منازل طے کرنے کا عمل ہے۔ ایشیا بے عملی کی کیفیت سے نکل چکا ہے اور جمود توڑ چکا ہے۔ اب اس براعظم کے لوگ سرگرم عمل ہیں اور بہتر زندگی کی آرزو رکھتے ہیں۔

تقریباً تمام سرکردہ مدبر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایشیا امنگوں اور آرزوؤں کی موجودہ اقتصادی بیداری کے انقلاب کی زد میں ہے۔ امریکہ اور یورپ کی دولت یکجا ہو کر ان توقعات کو پوری کر سکتی ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وسائل یکجا ہو کر اس انقلاب کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ناکافی ہوں گے بلکہ یہ ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دنیا کے آدھے امیر ملکوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ تعاون اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس ذمہ داری میں یورپ بھی شریک نہ ہو یا جب تک امریکہ بھی یورپ کو اس ذمہ داری میں شرکت پر مجبور کرنے کے لئے محفوظ پالیسیاں اختیار نہ کرے۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ نصف دنیا میں دولت و امارت کے تیز رفتار اجتماع نے اسے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ غریب ملکوں کی امداد کرے مزید برآں مصارف زندگی کم کرنے کی ضرورت کا تقاضہ یہ ہے کہ اپنے سے کم ترقی یافتہ ملکوں سے سستے خام مال کی درآمد میں اضافہ کریں لیکن اس کے برعکس بیرونی سرمایہ کاری خاص طور پر یورپ سرمایہ کی برآمد سے یہ کہہ کر نظریں چرا رہا ہے کہ خود ان کے اپنے ممالک میں اس سرمائے کی ضرورت ہے۔ امیر ملک اپنی درآمدات کم کر رہے ہیں اور کم ترقی یافتہ ملکوں میں سرمایہ کاری میں کمی کر رہے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں بالخصوص امریکہ میں اقتصادی امور کی حد تک رجحان یہ رہا ہے کہ افراط زر پر قابو پانے کے لئے مالیاتی پالیسی کو سخت کر دیا جائے اور پھر اس پالیسی سے متاثر ہونے والے ملکوں کی امداد کے لئے پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ قیمتیں کم رکھنے کے لئے صنعتی ترقی کی رفتار پر کنٹرول عائد کرنا ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی قیمتوں کو اونچی سطح پر رکھنے کے لئے زرعی یا سوتی کپڑے کی برآمدات پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ اس صورت حال کو "نامعقولات کا پہلا مرحلہ" کہا گیا ہے۔

لندن کے جریدہ اکانومسٹ نے 12 دسمبر 1959ء کی اشاعت میں اس مرحلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یورپی مشترکہ منڈی کے چھ ملکوں میں سیاسی اتحاد کی خواہش کے نتیجہ میں آزاد علاقائی تجارت کا فروغ ایک ایسا امر تھا جس سے ساری دنیا میں آزاد تجارت کو صحیح سمت ملنی چاہیے تھی۔ آزاد تجارت کے علاقے اسی طرح پھیلتے ہیں جس طرح خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ باقی ماندہ یورپ میں اس صورت حال کا ردّ عمل آزاد روش کی صورت میں سامنے آیا ہے اور آزاد تجارت کا سات قومی آزاد تجارتی علاقہ اب قائم ہو چکا ہے اور بڑے کاروبار کے متعلق نقطہ نظر میں انقلابی تبدیلی آ رہی ہے۔

"کچھ عرصہ پہلے یہ صورت تھی کہ جو برطانوی بزنس مین تجارت کے بورڈ سے رجوع کرتا وہ اپنی صنعت کے تحفظ کا طالب ہوتا تھا۔ اب وہ آزاد تجارت پر زور دیتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ فرانس میں جرمن جن نسبتاً کم برآمدی ٹیکسوں کے ساتھ اشیاء فروخت کریں گے تو اس کے مال کی مانگ لازماً متاثر ہو

www.bhutto.org

گی۔ اس طرح جرمن بزنس مین ڈاکٹر ایرہرڈ سے ملے گا' وہ اسکینڈے نیویا میں برطانوی تاجروں کی طرف سے مقابلے کے بارے میں ایسے ہی اندیشوں کا اظہار کرے گا۔

"یہ فرض کرنا معقول بات ہوگی کہ امریکہ میں بھی آزاد تجارت کے بارے میں ایسے ہی رجحانات پیدا ہوں گے مگر اندیشہ یہ ہے کہ شاید یہ ابتدائی ردِ عمل الٹ ہو۔ اگر یورپی ممالک ایک دوسرے کے خلاف ٹیرف کی پابندیاں نرم کر دیں تو شاید امریکہ ان پابندیوں کو اور سخت بنا دے اور ترجیحی سلوک کے خلاف اپنے ملک میں صنعتوں کو تحفظ دینے کی تدابیر کرے۔

"یہ نظریہ کہ یہ منطقی امر ہے کہ بڑھتے ہوئے مقابلے کے ردِ عمل کے طور پر درآمدات پر ٹیکس میں اضافہ کر کے اپنی برآمدات کا معاملہ ٹھیک کیا جائے اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب سرمایہ دار ملکوں میں بے روزگاری عام تھی اور جب قیمتوں میں اضافہ کا مسئلہ موجود نہ تھا۔

"اب امریکہ اور یورپ کے لئے بہترین اقدام یہ ہوگا کہ وہ اپنی سالانہ امدادی رقوم کسی ایسی وسیع مرکزی تنظیم کے سپرد کریں جو ان رقوم کو ضرورت کے وقت پسماندہ ملکوں میں لچکدار بنیادوں پر تقسیم کر سکے۔ بلاشبہ کچھ رقوم سرمایہ کاری کے بعض خاص منصوبوں کے لئے مخصوص کی جائیں گی۔ لیکن ایسی تنظیم کا بنیادی کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ زرِ مبادلہ کی ضرورت رکھنے والے ترقی پذیر ملکوں کی مدد کرے بشرطیکہ ان ملکوں میں زرِ مبادلہ کی کمی کی وجہ ان کی اندرونی پالیسیاں نہ ہوں۔

"موجودہ حدِ فاصل کی نوعیت یہی ہے۔

مسٹر ڈلن کے چھان بین کے دورے کا مثالی نتیجہ منصوبوں کی تشکیل ہوگا۔

(الف) ایشیا اور افریقہ میں امریکی و یورپی امداد کو لچکدار بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لئے ایک نئے مرکزی فنڈ کا قیام (جس کا انتظام اس فنڈ کے منتظمین کے پاس ہو)۔

(ب) شرح محاصل میں تخفیف کے عمل کا دائرہ وسیع کیا جائے جیسے ان دنوں دو مغربی یورپی گروہوں میں کیا جا رہا ہے اور جس طرح ساری دنیا کے ساتھ 'یورپ اور امریکہ کی تجارت میں کوٹہ اور شرح محاصل کی پابندیاں نرم کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح اس کو بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ اور وسیع کیا جائے (اگرچہ ابتدا میں یہ عمل تیز رفتار نہ ہوگا)۔

"اس وقت جو مواقع موجود ہیں اگر ان سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا گیا اور امریکہ نے امداد دینے میں یک طرفہ کمی کر دی تو اس سے نقصان دہ نتائج برآمد ہوں گے"۔

حالات کی اس پیش رفت میں زرِ مبادلہ کمانا یا ان گنجلک حالات میں بیرونی امداد نچوڑنا کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں ہے بلکہ چیئرمین منصوبہ بندی کمیشن کے الفاظ میں یہ ایک کمر توڑنے والی کوشش ہے۔ امداد کے حصول کی ایسی غیر یقینی صورتحال اور زرِ مبادلہ کمانے کے سلسلے میں اپنی استعداد کی کمی کے پیش نظر جو منصوبہ بھی مرتب کیا جائے لازمی طور پر سیدھا سادہ اور معقول ہونا چاہئے۔ تاہم اس کے ہلکے پھلکے ہونے کی صورت میں بھی اس پر عمل درآمد کے لئے زرِ مبادلہ کے حاصل ہونے کی کوئی یقینی ضمانت نہیں ہے۔ ممکن

www.bhutto.org

ہے اس پر عمل درآمد کے دوران ایسے عناصر ابھر آئیں جو ہمارے قابو سے باہر ہوں اور جو ہمارے اندازوں کو غلط ثابت کر دیں۔

پاکستان کے دوسرے پانچ سالہ منصوبوں کی اساس کا جائزہ لینے اور زرِ مبادلہ کے مسئلہ کی وضاحت کرنے کے بعد ہمیں اس کا بھی جائزہ لینا چاہئے کہ اس منصوبے کا بنیادی مقصد کیا ہے۔ اس کا مقصد یقیناً یہ نہیں ہے کہ چارہ زیادہ پیدا کیا جائے یا چند سرکاری افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ ملک کے ایک حصے میں رہنے کے عادی ہو جائیں۔

بنیادی مقصد قومی آمدن میں اضافہ کرنا ہے مگر یہ بنیادی مقصد کیوں ہونا چاہئے؟ یہ بنیادی مقصد اس لئے ہے کہ ملک اور عوام کے تعلق کے یہ ہمارے فرائض میں داخل ہے کہ۔

1.....فی کس آمدن بڑھائیں۔

2.....عام آدمی کی قوتِ خرید میں اضافہ کریں۔

3.....عام آدمی کی سرمایہ کاری کی قوت بڑھائیں۔

4.....عام آدمی کی بچت کی استعداد بڑھائیں۔

ان قوتوں کے ملغم سے ایک عام آدمی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقتصادی ترقی کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ وہ قومی سرمایہ کاری میں حصہ لینے کے قابل ہو جائے گا اور صاحبِ جائیداد بن جائے گا۔ اس طرح ملکی معیشت کی بنیاد زیادہ وسیع ہو جائے گی۔ ملک کے زرعی اور صنعتی اداروں سے زیادہ سے زیادہ پاکستانیوں کا مفاد وابستہ ہو گا۔ منصوبہ کا مقصد قومی آمدن بڑھانا ہے نہ کہ اس میں کمی کرنا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ موجودہ رفتار کو تیز کر دیا جائے۔

تمام ملکوں میں اور ہر نظام میں بعض جغرافیائی اقتصادی اور تاریخی عوامل کے باعث کچھ خطے دوسروں سے زیادہ خوشحال ہو جاتے ہیں۔ امریکہ میں بھی ایسا ہی ہے اور روس میں بھی۔ ہمیں ملک کے کم ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی پر اپنی توجہ مرکوز کر دینی چاہئے۔ لیکن یہ کام ترقی یافتہ علاقوں کی ترقی روکے بغیر ہو سکتا ہے۔ کم ترقی یافتہ علاقوں کی ضروریات کا جائزہ پوری ہمدردی سے لینا چاہئے اور ان کی ترقی میں ہر ممکن مدد دینی چاہئے۔ لیکن ملک کے وسیع تر مفاد کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے وسائل کو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

ترقی کی مقامی ضروریات کی تکمیل کے لئے ویلیج ایڈ اور اسی نوع کی دوسری ایجنسیوں سے مدد لی گئی ہے۔ جن کا مقصد عوام کو اپنی مدد آپ پر ابھارنا اور جہاں کہیں بھی ضرورت ہو مالی امداد اور ماہرانہ مشورہ حاصل کرنا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اس نوع کی امداد فراخدلانہ طور پر کم ترقی یافتہ علاقوں کو زیادہ خوشحال علاقوں کے مقابلے میں ویلیج ایڈ کی بھرپور سرگرمیوں کے ذریعے کی جائے

یہ منصوبہ بحیثیت مجموعی حقیقت پسندانہ ہے کیونکہ یہ مقامی حالات سے ہم آہنگ ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہے۔ خرچ کی استعداد کا انحصار کمائی کی استعداد پر ہے۔ سرمایہ کاری کی قوت کا انحصار وسائل کو ترقی

www.bhutto.org

دینے اور کام میں لانے پر ہے۔ ہم اپنے کمانے کی استعداد بڑھا کر مصارف کی استعداد و بڑھائیں گے۔
ماضی میں منزلِ مقصود کا شعور مفقود تھا۔ حصولِ منزل کے لئے جوش و جذبہ نہیں تھا' اس لئے یقینی کامیابیوں کے باوجود ہماری رفتار بہت سست تھی۔ منزلِ مقصود سے آگاہی' صحیح سمت' جوش و جذبہ اور استحکام کی موجودگی میں بعض اوقات یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ پاکستان جیسے ملک میں اقتصادی ترقی کی رفتار ایک حد سے تیز نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے وسائل محدود ہیں اور معیشت کا انحصار بیرونی ذرائع پر ہے۔ اگر ہم بجٹ میں توازن اور تناسب کو پیشِ نظر رکھیں تو ہم انتشار کا شکار ہو جائیں گے۔ ظاہری اور واضح تحدیدات کے باوجود تیز رفتار ترقی کا سودا لازمی طور پر افراطِ زر پر منتج ہو گا اور افراطِ زر اپنی تمام لعنتوں کے ساتھ آئے گا۔

23 مارچ 1960ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ہمارا صدر اور انقلاب

اس حقیقت کا ادراک کئے بغیر پاکستانی انقلاب کی صحیح پرکھ ممکن نہیں کہ یہ انقلاب تاریخ کے دیگر انقلابوں سے مختلف تھا۔ اس انقلاب کی تخصیص محض اس کی پُرامن نوعیت نہیں کیونکہ تاریخ میں کئی ایسے انقلاب برپا ہوئے ہیں جو مکمل طور پر پُرامن تھے۔ البتہ پاکستانی انقلاب کچھ واقعی اہم پہلوؤں کے اعتبار سے دوسرے انقلابوں سے مختلف ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ کہ دیگر انقلابی قائدین کے برعکس پاکستانی انقلاب کے قائد' فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تبدیلی کے بندھے ٹکے خیالات کے ساتھ برسرِاقتدار نہیں آئے۔ بلاشبہ انقلاب برپا کرتے وقت اصلاحات کی نوعیت کے بارے میں ان کے بنیادی تصورات موجود تھے لیکن یہ ایسے متعصبانہ اور موضوعی تصورات نہیں تھے جنہیں قوم پر مسلط کیا جاتا تھا۔ وہ یہ احساس لے کر ایوانِ اقتدار میں داخل ہوئے کہ ملک کو کئی جہتوں میں اصلاحات کی شدت سے ضرورت ہے اور وہ اصلاحِ احوال کے لئے درکار عزمِ مصمم سے لیس تھے۔ اصلاحات کی ٹھیک ٹھیک نوعیت' دائرہ کار اور طریقہ کار کے بارے میں انہوں نے موضوعی نوعیت کے گھڑے گھڑائے تصورات ٹھونسنے کی بجائے ماہرین کے کمیشن مقرر کئے اور انہیں اپنے متعلقہ شعبوں کے مسائل کی چھان بین کے بعد تجاویز تیار کرنے کا فریضہ سونپا۔ یہ طریقہ کار ان کی دانشمندی کا آئینہ دار ہے۔ اصلاحات کے ضمن میں صدر کی یہ حکمت عملی ان کی سوچ' اصلاح و ترقی کے لئے ان کے عزم اور سماجی تبدیلی کے لئے اختیار کردہ طریقہ کار کی عکاسی کرتی ہے۔

www.bhutto.org

بیمار ماضی سے چھٹکارا

ایوب کے انقلاب نے قتل وغارت گری کا راستہ اپنائے بغیر ماضی قریب کے شرمناک قومی ماحول کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ اڑھائی برس کی قلیل مدت میں معاشی ' سیاسی اور سماجی اداروں کو خردمند اور سائنسی خطوط پر استوار کر دیا گیا ہے۔ تاہم ان عظیم کارناموں سے بھی اہم وہ تبدیلی ہے جو قوم کی اقدار میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ ہر خود مختار قوم کو داخلی وقار اور عزت نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم ہمارے ملک کو قومی یک جہتی کے لئے ان عوامل کی اور بھی شدید ضرورت ہے کیونکہ جغرافیائی طور پر ہمارے ملک کے دونوں حصے ایک دوسرے سے ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہیں اور درمیان میں اجنبی سرزمین حائل ہے۔ بد قسمتی سے ملک کو بڑھتی ہوئی مایوسی اور قنوطیت کی صورت میں مکمل شکست وریخت کا مہلک ترین خطرہ درپیش تھا۔ قریب تھا کہ تاریخ اسلام میں ایک بار پھر گریناڈا کا سانحہ دہرایا جائے۔ ان موذی امراض کے ہاتھوں جسدِ قوم خطرناک رفتار سے گھل رہا تھا۔ اگر انقلاب برپا نہ ہوتا تو قومی منافرت ناقابلِ تلافی حدوں کو چھو چکی ہوتی۔ مایوسی اور نا امیدی سے احساسِ زیاں پیدا ہوتا ہے اور قوم کی عزت نفس اور وقار جاتا رہتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت عوام میں نئی حیثیت اور منزل مقصود پر پہنچنے کا ولولہ فراواں تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے قومی تفاخر اور عزت نفس کا احساس ٹپکا پڑ رہا تھا اور شاید یہی احساس شدید بحرانوں کے دوران قومی یک جہتی کا ضامن رہا۔ بایں ہمہ بارہ برس کے عرصے میں بے یقینیوں کے تسلسل ' حکومتوں میں آئے روز کے ردوبدل ' سیاسی رہنماؤں کی طرف سے عوام کے اعتماد کی پامالی ' نظریاتی دیوالیہ پن ' عوام میں بیدار کی گئی امیدوں کی شکست ' مفاد پرست سیاسی جماعتوں اور مفاد پرست ٹولوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش ' اور اداروں کے عدم استحکام کے باعث قومی منظر تلخ سے تلخ تر ہوتا چلا گیا۔ عوام کے گوناگوں مصائب و آلام نے مایوسی اور نا امیدی کے جڑواں عفریتوں کو جنم دیا۔ عوامی ولولے ماند پڑنے لگے ' ان کا اعتماد متزلزل ہو کر رہ گیا اور قومی عزت نفس رہن رکھا گیا۔ چنانچہ انقلاب کو ناگزیر بنانے والے عوامل میں سیاسی و معاشی افراتفری سے بھی زیادہ سماجی وروحانی انحطاط کو دخل تھا۔

انسان دوست رویہ

ہر انقلاب ایک خاص حد تک اپنے قائد کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ غالباً یہی بنیادی وجہ ہے کہ پاکستان کے انقلاب کو "مہربان انقلاب" کہا جا سکتا ہے۔ انقلاب کی اس نوعیت اور اثرات میں صدر کے اس رویے کو گہرا دخل ہے جو انہوں نے مختلف مسائل کے ضمن میں اپنایا ہے۔ انھوں نے ہر طرح کے حالات میں وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں جانے کی بجائے اہم مسائل پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں ہر طرح کے معاملات سے نمٹتے ہوئے انسان دوستی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اپنے دل ودماغ میں کینے کو جگہ نہیں دیتے چنانچہ انہوں نے انقلاب کے وقار کو سربلند کیا ہے۔ ان کی سوچ اور عمل

میں انتقامی جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ انقلاب کسی کی ذات کے خلاف نہیں بلکہ عظمت انسانی کی پائیدار اقدار اور اعلیٰ اصولوں کے فروغ کی غرض سے برپا کیا گیا تھا۔ ان کے اس رویے سے انقلاب کو ایک مثبت رخ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا ہے۔

انقلاب کے اثرات کا صحیح تعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم انقلاب سے قبل پائے جانے والے حالات کا ایک مختصر سا جائزہ لیں۔ پاکستان کی تخلیق ایک خاص قومی مقصد کی تکمیل تھی لیکن حصولِ پاکستان کے بعد کسی قومی مقصد کا وجود نہ رہا یا کم از کم کسی قومی مقصد کی موجودگی اپنا آپ تسلیم کروانے میں ناکام رہی۔ کسی واضح نظریئے اور دوٹوک قومی مقاصد کے فقدان کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کے حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ انقلاب کے بعد سے صدر نے عوام کو قومی مقاصد اور سمت کا نئے سرے سے احساس دینے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے قومیت کے تصور اور قومی یک جہتی کی بنیادوں کو استحکام دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ اس میں کامیابی کے لئے ان مخاصم اور طاقتور رجحانات پر قابو پانا ضروری تھا جنہیں ایک عرصے سے پنپنے اور اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مشترکہ مذہب اور جدوجہدِ آزادی کی مشترکہ تاریخ کے باوجود کسی قومی مقصد کی عدم موجودگی میں ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان اتحاد اور عمل کے لئے اشد ضروری عوامل نشوونما نہیں پا سکے تھے۔ چنانچہ قومی یک جہتی کے احساس کی بیداری اور قومی اعتماد میں معتدبہ اضافے کو صدر کے اہم ترین کارناموں میں شمار کرنا چاہئے۔

ترجیحات میں تبدیلی

صدر نے قومی زندگی میں شعوری طور پر افراد کی بجائے اداروں کو ترجیح دینے کا عمل شروع کیا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی راج کے دنوں سے پسندیدہ افراد کے ہاتھ مضبوط کر کے انہیں ایسے مضبوط ستونوں کی حیثیت دینا حکومتی پالیسی کا جزولازم رہا ہے جن پر حکومت کی حمایت کے لئے اعتماد کیا جا سکے۔ انقلاب سے قبل پاکستان میں برسرِ اقتدار آنے والی حکومتوں نے اس حکمت عملی کو یکسر رد نہیں کیا۔ اس حکمت عملی کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ تھا کہ ہمارا سیاسی نظام قباحت کا شکار ہو گیا۔ سیاست کا رخ 'مسائل کی بجائے افراد کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طے پاتا تھا۔ سیاسی جماعتیں واضح مسائل پر حقیقی اختلاف رائے کی بجائے شخصی رنجشوں کی آئینہ دار تھیں۔ باشعور رائے عامہ جس کے بغیر کسی سیاسی نظام کو جمہوریت کا نام دینا اس اصطلاح سے مذاق کے مترادف ہوتا ہے' سرے سے موجود نہیں تھی۔ صدر نے افراد کی بجائے اداروں اور مسائل کو اہمیت دینے کا عمل شروع کیا ہے۔ انہوں نے ایسے ادارے قائم کئے ہیں جو افراد کی بجائے سیاسی نظام کی بنیادوں کا کام کریں گے۔ یہ امر مستقبل میں سیاسی نظام کے استحکام کی پائیدار ضمانت فراہم کرے گا۔ سیاسی استحکام کے لئے کئے جانے والے اقدامات میں گاؤں کو معاشرے کی بنیادی اکائی کے طور پر تسلیم کرنا غالباً اہم ترین اقدام ہے۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ گاؤں اصلاح و ترقی قوم کی مجموعی اصلاح و ترقی

www.bhutto.org

کا رخ متعین کرے گی۔ اس حکمت عملی میں ابھرنے والا ایک خوش آئند رجحان یہ ہے کہ گاؤں کی ترقی میں اپنی مدد آپ کے اصولوں پر زور دیا جا رہا ہے۔

نچلی سطح سے جمہوریت

اب منطقی طور پر بنیادی جمہوریت کا موضوع سامنے آتا ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو بنیادی جمہوریتوں کے نظام کو ایشیا میں جمہوریت کا پہلا حقیقی تجربہ سمجھتے ہیں۔ ایشیائی ممالک میں خواندگی کی شرح نہایت کم ہے ' منظم رائے عامہ کا کوئی وجود نہیں ' واضح سیاسی سوالات اٹھانے کی روایت نہیں ہے ' مراعات یافتہ جاگیردار طبقہ انتخابات کی صورت میں آزادانہ انتخاب کا راستہ روک سکتا ہے۔ چنانچہ اس خطے میں رائے دہندگان اور اقتدار کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کئے بغیر جمہوریت اپنے حقیقی معنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر قانون سازوں اور ان لوگوں کے درمیان حائل پردے اٹھانے کی ضرورت ہے جن کے لئے قانون مدوّن کیا جاتا ہے۔ نچلی سطح پر جمہوریت متعارف کروائے بغیر..... دوسرے لفظوں میں معاشرے کی بنیادی اکائی یعنی گاؤں سے براہ راست رابطہ پیدا کئے بغیر..... سیاسی نظام کی مستحکم بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ نچلی سطح پر جمہوریت کو ترجیح دینے سے بنیادی اکائیوں تک انتقال اقتدار کا دروازہ وا ہوا ہے ' نچلی سطح پر اقتدار کے استعمال کی تربیت کے باعث پاکستان میں بنیادی جمہوریتوں کو ایشیا میں جمہوریت کا پہلا حقیقی تجربہ کہا جاتا ہے۔

آئین کمیشن

کسی انقلاب کو اس کے حتمی مقاصد کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے اور موجودہ حکومت کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ایک مستحکم جمہوری نظام کے قیام کو اپنا حتمی مقصد قرار دے رکھا ہے ' یہ مفروضہ غلط سیاسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ کسی نظام کو صرف اسی صورت میں جمہوری قرار دیا جا سکتا ہے اگر وہ مغربی اصطلاحات پر پورا اترتا ہو۔ کوئی جمہوری نظام صرف اسی صورت میں معنویت کا حامل ہو سکتا ہے اگر وہ متعلقہ معاشرے کی سوجھ بوجھ ' مزاج اور روایات سے مطابقت رکھتا ہو اور عوام کے مناسب حال ہو۔ اسی طرح کسی آئین کو اعلیٰ ترین قانون کا درجہ اور تقدس حاصل کرنے کے لئے عوام کی امنگوں اور اجتماعی شعور سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے نیز اسے قومی یک جہتی کی ضمانت دینی چاہئے۔ انہی مقتضیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صدر نے ایک آئین کمیشن مقرر کیا جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ سابقہ آئین کی ناکامی کی وجوہات کا مکمل تجزیہ کر کے ایسی سفارشات پیش کرے جن سے مستقبل میں ماضی کے تلخ تجربات کے اعادے کا امکان ختم کیا جا سکے۔

تعلیم کے فقدان کو کسی قوم کے مسائل کی جڑ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح تعلیم یافتہ رائے عامہ کے بغیر کوئی سیاسی نظام حقیقی معنوں میں جمہوری ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اسی طرح ملک میں تعلیم کی نوعیت

www.bhutto.org

اور خواندگی کی شرح قومی زندگی کے تمام شعبوں میں کارکردگی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے برطانوی حکومت نے اپنے مخصوص مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں جو تعلیمی نظام قائم کیا تھا وہ ایک آزاد قوم کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد پاکستان کو ورثے میں یہی نظام ملا اور اس کی اقدار، مقاصد اور افادیت کا تجزیہ کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ انقلاب کے بعد صدر نے ایک کمیشن مقرر کر کے اسے نظامِ تعلیم کا مکمل جائزہ لینے اور ایک ایسے نظامِ تعلیم کی تشکیل کے لئے سفارشات پیش کرنے کی ہدایت کی جو ہمارے قومی مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور ایک آزاد اور ترقی پذیر معاشرے کے طور پر قومی ضروریات کا احاطہ کر سکے۔

زرعی اصلاحات

زرعی اصلاحات کا احاطہ کئے بغیر پاکستان میں انقلاب برپا کرنے کی کوئی بھی کوشش محض حکومت کی تبدیلی پر محمول کی جاتی۔ صدر نے جرأت اور پیش بینی سے کام لے کر اس مسئلے پر ایک کمیشن کا تقرر کیا۔ اس کمیشن کی سفارشات کے نتیجے میں ایک ایسی سمت میں اصلاحات کا آغاز کیا گیا جہاں گذشتہ برسوں میں تبدیلی احوال کی ہر کوشش کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ زرعی اراضی کی ملکیت کی حد کا تعین اصل مسئلہ نہیں تھا بلکہ اصل اہمیت اس سوال کو حاصل تھی کہ کیا کسی حدِ ملکیت کا نفاذ ممکن ہو سکے گا یا نہیں۔ دولت کی تقسیم حقیقی جمہوریت معاشرے کی تخلیق میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے لہٰذا زرعی اصلاحات کے باعث ملک کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی پر دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

معاشی مفلوک الحالی کا غیر مختتم سلسلہ

انقلاب سے قبل ملک کی معاشی حالت سنگین بحران سے دوچار ہو چکی تھی۔ معاشی حالات میں مزید انحطاط کی روک تھام اور معاشی استحکام کے حصول کے لئے اصلاحی نوعیت کے جرأتمندانہ اور بنیادی اقدامات کی ضرورت تھی۔ عبوری اقدامات کے علاوہ طویل المدت منصوبہ بندی عمل میں لائی گئی۔ ایک ترقی پذیر قوم کے طور پر پاکستان معاشی بدحالی اور افلاس کے کٹھن چکر کا شکار تھا۔ اس معاشی تصور کے مطابق کم قومی آمدنی کے نتیجے میں قومی بچتوں کی شرح نیچے گرتی ہے چنانچہ سرمایہ کاری میں کمی واقع ہوتی ہے جو قومی آمدنی میں مزید خسارے پر منتج ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں غربت کا یہ غیر مختتم سلسلہ سرمائے کی ناقابلِ ذکر تشکیل کے مسئلے کا بنیادی سبب ہے۔ اس کٹھن چکر سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ سرمائے کو بیک وقت مختلف النوع صنعتوں میں اس طرح کھپایا جائے کہ رسد خود طلب کو تخلیق کرے اور ایک صنعت دوسری صنعت کی پیداوار کی طلب کی آئینہ دار ہو۔ اس عمل کا حتمی نتیجہ معاشی ترقی کی صورت میں برآمد ہوگا اور معیشت اس راہ پر گامزن ہو سکے گی جہاں خود انحصاری اور خود کفالت کی منزل زیادہ دور نہیں رہتی۔ چونکہ پہلے پانچ سالہ منصوبے پر عمل درآمد کی کوئی مؤثر کوشش نہیں کی گئی تھی لہٰذا دوسرا پانچ سالہ منصوبہ درحقیقت اپنی نوعیت کا پہلا منصوبہ تھا۔ دوسرا پانچ سالہ منصوبہ اقتصادی منصوبہ

www.bhutto.org

بندی کے کسی بھی پیمانے پر پورا اترتا ہے۔ اس میں مقاصد کے مجمل بیان کے بعد ان مقاصد کے حصول کا لائحہ عمل ترتیب دیا گیا ہے۔ منصوبے کے لئے درکار معاشی وسائل کی فراہمی کی ذمہ داری حقیقت پسندانہ طور پر نجی اور سرکاری شعبے میں تقسیم کی گئی ہے اسی طرح ترجیحات کے اعتبار سے معیشت کے مختلف حصوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ منصوبے میں زراعت' پانی' توانائی' صنعتوں' ذرائع نقل و حمل اور تعلیم کے شعبوں کو مناسب اہمیت دی گئی ہے علاوہ ازیں حکومت نے سیم و تھور کے مسئلے پر قابو پانے کے لئے ایک اہم اور جرأتمندانہ منصوبہ تیار کیا ہے۔ بجلی کی فراہمی سے متعلقہ سوالات کا جائزہ لینے کے لئے توانائی کمیشن کا تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔ پاکستان میں تیل اور گیس کی تلاش کے لئے سوویت یونین کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کئے گئے ہیں جو پاکستان کے تمام وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے حکومت کے پختہ عزم اور بصیرت کی غمازی کرتا ہے۔ حکومت ایٹمی توانائی کی اہمیت سے مکمل طور پر آگاہ ہے اور روز بروز اس شعبے پر زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ ایکسپورٹ بونس سکیم کامیابی سے متعارف کروائی گئی ہے اور اس کے نتیجے میں ادائیگیوں کے توازن کے ضمن میں پاکستان کی صورتحال قابلِ ذکر طور پر بہتر ہوئی ہے۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ دوسرے پانچ سالہ منصوبے کی مدّت کے دوران اس منصوبے کو جاری رکھا جائے گا۔

حکومت کی طرف سے نافذ کردہ اصلاحات کے سلسلے میں قانونی اصلاحات کا ذکر بھی ضروری ہے۔

ان اصلاحات کا مقصد انصاف تک عام آدمی کی رسائی کو ممکن بنانا اور قانونی طریقہ کار کو سہل بنانا ہے۔

پاکستان کا جغرافیہ ایک مستقل اور پرخطر مسئلہ ہے۔ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان بھارتی سرزمین کی موجودگی سے گوناگوں مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ قائداعظمؒ کے دورِ حکومت کے بعد سے دونوں بازوؤں کے درمیان جذباتی سطح پر قومی اتحاد کی بہترین فضا پیدا کرنے کا سہرا صدر کے سر بندھتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کو جائز طور پر زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے اور پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان اشتراک کے پہلوؤں اور رابطے کے مواقع کو ہر ممکن فروغ دیا جا رہا ہے۔

خارجہ تعلقات کی نئی جہت

اب ہم خارجہ امور کے اہم شعبے کی طرف آتے ہیں۔ بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات میں صدر نے دو قابلِ تعریف اوصاف کا مظاہرہ کیا ہے۔ اوّل' انہوں نے پنڈت نہرو کے ساتھ رابطہ کرنے میں پہل کاری سے کام لیا۔ دوم' انہوں نے دونوں ممالک کے درمیان تصفیہ طلب معاملات کو پُرامن اور منصفانہ طریقے سے حل کرنے پر مسلسل رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ چیدہ چیدہ واقعات کے ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سندھ طاس کے معاہدے پر دستخط کر کے پانیوں کی تقسیم کا مسئلہ حل کیا' سرحدی تنازعات طے کئے اور گذشتہ ستمبر میں پنڈت نہرو کے ساتھ گفت و شنید کے دوران بھارت سے یہ تسلیم کروالیا کہ کشمیر ایک "حل طلب مسئلہ" ہے۔

صدر کی طرف سے مختلف ممالک کے دوروں سے قابلِ تحسین نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ متحدہ عرب

www.bhutto.org

امارات کے ساتھ دوستانہ اور معمول کے تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انڈونیشیا کے ساتھ دوستانہ تعلقات بحال ہوئے ہیں۔ برما کے ساتھ تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی ہے۔ یوگوسلاویہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے علاوہ اقتصادی امداد کی پیش کش بھی موصول ہوئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے غیر جانبداری کی علمبردار قوموں پر واضح کر دیا ہے کہ دفاعی معاہدوں میں ہماری شرکت ان قوموں کے ساتھ ہماری دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ان کامیابیوں کو غیر اہم نہیں گردانا جا سکتا۔ قابلِ ذکر اہمیت کا حامل ایک اور واقعہ سوویت یونین کے ساتھ تیل کی تلاش کا معاہدہ ہے۔ امورِ خارجہ میں اہم ترین پہلو صدر کا یہ اعلان ہے کہ ہم کسی قوم کے لئے مخاصمت کے جذبات نہیں رکھتے اور یہ کہ پاکستان تمام حلقوں سے اعانت قبول کرنے پر تیار ہے بشرطیکہ اس امداد کو مشروط نہ کیا جائے۔ جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے، ہماری پالیسی اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی جغرافیائی سلامتی کے خلاف کسی خطرے کو برداشت نہ کرنے کے اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔

دلنواز شخصیت

شخصی نوعیت کا ایک مختصر حوالہ دیئے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں سمجھا جا سکے گا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی نامور شخصیت نے ایک بار اپنے بارے میں کہا تھا "کاش عوام یہ جان سکتے کہ میری تنہائی کس قدر جاں گسل ہے" عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مشاہیر کی کوئی ذاتی زندگی نہیں ہوتی۔ یہ تاثر خوفناک حد تک غلط اور بلا جواز ہے۔ ایک ہموار اور توانا شخصی زندگی کے بغیر عوامی ذمہ داریوں سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے صدر صاحب وسیع تر اہمیت کے معاملات میں جس انسان دوستی اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہیں اس میں ان کی خوشگوار اور مطمئن شخصی زندگی کو بھی دخل ہے۔ خواہ اس کی اہمیت کسی قدر کم ہی کیوں نہ ہو۔

صدر صاحب کامل درجے کے گھریلو شخص ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی کامیابیوں پر مسرور ہوتے ہیں خواہ یہ کامیابیاں کھیل کے میدان میں ہوں یا کمرہ جماعت میں۔ اپنے نواسوں اور نواسیوں پر حد درجہ التفات کرتے ہیں۔ ان کے بچے نہایت نفیس اطوار کے مالک ہیں۔ قابلِ تعریف حد تک مہذب اور پریشان خیالی سے کوسوں دور۔

اگر محض یہ کہا جائے کہ صدر کھیلوں کے دلدادہ نہیں تو شاید کھیلوں سے ان کے شغف کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر قسم کے کھیلوں سے محبت ہے۔ جانوروں کے شکار کی نسبت انہیں پرندوں کا شکار زیادہ مرغوب ہے۔ غالب ڈیرو کی شکار گاہ میں انہیں شکار پر آمادہ کرنے کی کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی لیکن پرندوں کے شکار پر انہیں آمادہ کرنے کے لئے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صدر صاحب ہوا میں بلند تر پرواز کرتے پرندوں کو نشانہ بنانے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ پرندوں کو پاس سے گزر نے دیتے ہیں اور پھر ذرا سا گھوم کر جو بندوق داغتے ہیں تو نشانہ

www.bhutto.org

خطا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ تیتر کی نسبت مرغابی کے شکار سے خاص رغبت رکھتے ہیں اگرچہ شکار ہونے والے پرندوں کی تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو تیتر اور چکور کو نشانہ بنانے میں بھی ان کی مشاقی یکساں طور قابلِ تعریف ہے۔

دیو قامت انسان

صدر کی شخصیت متاثر کن ہے۔ وہ دیگر انسانوں کے درمیان ایستادہ ہوں تو دیو قامت نظر آتے ہیں۔ وہ ملک میں ہوں یا بیرون ملک معاشی اور سیاسی معاملات پر سنجیدہ گفتگو میں مشغول ہوں یا سڑک کے کنارے عام پاکستانی دیہاتیوں سے گپ شپ کر رہے ہوں وہ اپنی شخصیت کے کارن محفل پر حاوی ہو جاتے ہیں اور شریکِ بزم افراد پر گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ وہ نکلتے ہوئے قد کے چوڑے چکلے اور رعنا جوان ہیں۔ ان کی شخصیت اس قدر وجیہہ ہے کہ بلاشبہ انہیں کسی رورعایت کے بغیر ہالی وڈ کی فلموں میں لیا جاسکتا ہے۔ ان کی رعنائی اور شخصی سحر سے قطع ان کی اصل خوبی منکسر المزاجی ہے۔ وہ اپنے ملاقاتیوں کو اعتماد بخشنے اور رسان سے گفت وشنید پر مائل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان سے ملنے والے ان کی لگن اور اپنے مقصد پر ان کے ایقان سے از حد متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی ذات میں شخصی اوصاف اور حب الوطنی کا خوشگوار اور نادر امتزاج پایا جاتا ہے۔

بڑے آدمیوں کی قربت میں کام کرنا ایک انمٹ تجربہ ہوتا ہے۔ دوررس تبدیلیوں کا دور وا کرنے والے ان ایام کا چیلنج بے حد ولولہ انگیز ہے۔ بھرپور اور نتائج کے اعتبار سے مسحور کن 'انقلاب کی ابتدائی بے یقینی اور پُر اضطراب لمحات سے لے کر موجودہ جزوی استحکام تک ہمیں ایک ایسے شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے جو جذبہ خدمت سے سرشار ہے 'اپنے طور طریقوں میں دیوتا سمان ہے 'جس کے فیصلے حقیقت اور گرم جوشی کا رنگ لئے ہوتے ہیں اور جو اپنے نظریات میں بے حد پختہ اور پُر عزم ہے۔ وہ ابتری سے تعمیر کی طرف ہماری نجات کی علامت رہیں گے۔ بالخصوص اس ملک کے نوجوانوں کے لئے وہ پاکستان کو سدا صبح بہار کی طرح تازہ رکھنے کے عزم و حوصلے کا پیکر رہیں گے۔

متحرک قیادت

ایوب خاں کی متحرک قیادت نے جو روح پھونکی ہے وہ کسی جادو کی خوشبو کی طرح ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہے۔ تاریخ کا یہ سپوت ہمارے لئے لنکن سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے تشدد کا سہارا لئے بغیر قوم کے جسد سے انتشار پسند رجحانات کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ وہ لینن سے بڑا ہے کہ اس نے جبر سے کام لئے بغیر ملکی معیشت اور سماجی اقدار کو ایک بلند اور زریں مقام پر فائز کیا ہے۔ وہ ہمارا اتاترک ہے کیونکہ اس نے عظیم ترک رہنما کی طرح قوموں کی کہکشاں میں اپنی قوم کا وقار اور عزتِ نفس بحال کی ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ ہمارے لئے صلاح الدین کا درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس عظیم غازیٔ اسلام کی طرح 'اسی عظیم ترکے کے اس وارث نے دس کروڑ عوام کا فخر اور اعتماد بحال کیا ہے یہ وہ اوصاف

www.bhutto.org

ہیں جن کے بغیر کوئی قوم بے روح رہ جاتی ہے۔

ترقی کی کوئی حد نہیں ہوتی چنانچہ ایوب کا مشن مکمل نہیں ہوا۔ گذشتہ اڑھائی برس میں حاصل ہونے والی کامیابیوں کو انقلاب کی تکمیل نہیں بلکہ آغاز سمجھنا چاہئے۔ بایں ہمہ انقلاب کو اس اعتبار سے مکمل سمجھنا چاہئے کہ قومی سمت کا تعین ہو چکا، معاشرے میں ایک نظم قائم ہوا ہے اور پائیدار اداروں کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔ قائداعظم کی بے خوف قیادت میں حصولِ وطن کی شجاعانہ جدوجہد کرنے والی یہ بہادر قوم ایوب کے اس پیغامِ امید کے پرچم تلے آج پہلے سے کہیں متحد ہے کہ اس ملک کو ترقی پسند اسلام کا تفاخر بنا دیا جائے۔

ہم اس نصب العین کو سلام کرتے ہیں ہم سندھی، بلوچی، بنگالی، پنجابی اور پٹھان ہونے کے ناطے اپنے اپنے ماضی اور ورثے پر فخر کرتے ہیں لیکن مادرِ وطن کے لئے اپنی وفاداری اور عزم میں ناقابلِ تقسیم ہیں اور پیغمبر اسلام آنحضرت محمد ﷺ کے پرچم تلے اپنی جانیں نچھاور کرنے پر آمادہ ہیں۔

پاکستان اینڈ ٹل

www.bhutto.org

www.bhutto.org

سندھ کے مال گزاری نظام کی اصولی تنظیم

گذشتہ سال میں نے اس علاقہ کی مجموعی ترقی کے بارے میں آپ سے خطاب کیا تھا۔ میں نے اس علاقہ میں رائج مال گزاری کے نظام اور اس کی نامناسب شرح کے خلاف لوگوں کے احتجاج اور اس کے منصفانہ حل کے لئے اپنی مساعی کا ذکر کیا تھا۔

اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس علاقے میں مالیہ کی شرح بہت زیادہ ہے لیکن اس اضافے کی ٹھوس وجوہات ہیں۔ خصوصی حالات میں لوگوں سے مخصوص مقاصد کے لئے قربانی دینے کو کہا جاتا ہے۔ بھاری محصول بھی مخصوص مقصد کے لئے لوگوں کی طرف سے ایک اعلیٰ اور مؤثر قسم کی قربانی ہے۔ سابقہ سندھ میں غیر معمولی حالات اور خلاف معمول واقعات اس بڑھی ہوئی مال گزاری کے اسباب ہیں۔ مال گزاری کی شرح کا تعین لاینحل طور پر بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

سر چارلس نیپئر نے 1843ء میں سندھ فتح کیا اور اسے ایک علیحدہ گورنر کی تحویل میں دے دیا گیا۔ لیکن پہلے گورنر سر چارلس نیپئر کے استعفیٰ کے فوری بعد سندھ کا بمبئی کی پریذیڈنسی سے الحاق کر دیا گیا۔ بمبئی کے ساتھ سندھ کا الحاق غیر فطری بھی تھا اور ناقابل برداشت بھی۔ بمبئی کی حکومت نے جس کا دہلی کی مرکزی حکومت میں بہت اثر ورسوخ تھا اور جس کے ہندوستان کے ریاستی امور کے سیکرٹری سے براہِ راست تعلقات تھے' یہ دلیل پیش کی کہ اقتصادی طور پر سندھ ایک علیحدہ صوبہ کے طور پر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکے گا' اس لئے جب تک سندھ اقتصادی طور پر اپنے خود کفیل ہونے کا ثبوت پیش نہ کرے' اس کی علیحدگی کا جواز نہیں بنتا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں سندھ کے دو نمائندوں' سر شاہ نواز خاں بھٹو اور سر غلام حسین ہدایت اللہ نے سندھ کی بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدگی کی بڑے زور سے وکالت کی اور

www.bhutto.org

اسی کانفرنس کی رسل ذیلی کمیٹی نے علیحدگی کے اصول کو اس شرط پر تسلیم کر لیا کہ سندھ اس بات کا ثبوت دے کہ وہ اپنے پاؤں پر کامیابی سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے 17 ر جولائی 1933ء کے ریکارڈ کے صفحہ 2095 پر لکھا ہے کہ سر شاہ نواز خاں بھٹو' ہز ہائی نس آغا خاں اور مسٹر ایم اے جناح نے رسل ذیلی کمیٹی میں اس بات کی یقین دہانی کرائی ہے کہ علیحدہ صوبہ سندھ کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملنے کے مسئلے کو یکسر خارج کر دیا جائے۔ سر شاہ نواز خاں بھٹو نے کہا۔ "سندھ یقیناً اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گا اور ہمیں کسی قسم کی مالی اعانت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے تو ہم علیحدگی کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہیں؟" قائد اعظم محمد علی جناح نے کہا "یہ نئے مجوزہ صوبے کے نمائندوں کا کام ہے کہ وہ دکھائیں کہ کس طرح خسارے کو ٹیکسوں کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے"۔ کمیٹی کے چیئرمین آنجہانی ارل رسل نے کہا "میں آپ کو کمیٹی کی سفارش سے آگاہ کر دوں گا وہ یہ ہے کہ جب تک سندھ یہ ثابت نہیں کر تا کہ وہ کامیابی سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے اس وقت تک اس کی علیحدگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔

چنانچہ سندھ کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ قربانیاں دے تا کہ اقتصادی طور پر خود کفیل ہو سکے۔ چونکہ اور کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا اس لئے نیا تعمیر شدہ لائڈ بیراج نجات کا باعث بنا۔ جو زمین اس سے سیراب ہوتی تھی اس پر بھاری مالیہ عائد کیا گیا کیونکہ کوئی متبادل صورت نہیں تھی۔ سندھ کو ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا کہ یا تو وہ بمبئی کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے یا بھاری مالیہ کا سامنا کر کے علیحدہ صوبہ بن جائے۔ ان حالات کے تحت ضرورت کے مطابق کم و بیش شرح کا فارمولا مرتب کیا گیا اور مالیہ کی شرح بڑھا دی گئی۔ بیراج کے قرضے توقع سے قبل ادا کر دیئے گئے اور سندھ خسارہ کے بجائے فاضل بجٹ کا صوبہ بن گیا۔

یہ مروجہ نظام کم و بیش ہونے والی شرح کے فارمولا پر قائم تھا۔ یہ دو اقسام پر مشتمل ہے۔ ایک بیراج کا علاقہ اور دوسرا بیراج سے باہر کا علاقہ۔ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کی شرح بدلتی رہتی ہے۔ لیکن بیراج کے باہر کے علاقہ کے لئے ایک حد مقرر کر دی گئی ہے۔

آخری بار اس علاقہ کے لئے مالیہ کے تعین کا فیصلہ 1943ء میں کیا گیا تھا۔ یہ دس سال تک رائج رہا' اور اس کے بعد 1953ء میں نیا فیصلہ عمل میں آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سندھ علیحدہ صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن صوبائی حکومتوں نے اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ گذشتہ فیصلہ میں جس مدت کے بعد نظر ثانی کی ضمانت دی گئی تھی وہ مدت ختم ہو چکی تھی اور قیمتوں میں اضافہ' زمین کی استعداد میں کمی' سیم تھور' چاول کے کیڑوں اور بہت سے دوسرے اسباب کی وجہ سے نظر ثانی ناگزیر ہو چکی تھی۔ 1955ء میں جب وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو نظر ثانی کی ضرورت مزید بڑھ گئی۔ یہ اس لئے بھی قطعی ضروری تھا کہ پورے صوبہ میں ایک متحدہ نظام اور مماثل نمونہ

کا نظام رائج کیا جائے۔ وحدت مغربی پاکستان کے فوری قیام کا باعث جو مقاصد بنے تھے انہیں ملحوظ رکھ کر ان کی مسلسل پیروی میں صوبائی حکومتوں کو اس مسئلہ پر فوری توجہ مبذول کرنی چاہئے تھی مگر انہوں نے نہیں کی۔

موجودہ حکومت اس امر سے آگاہ ہے کہ ٹیکسوں کا تعین عام طور پر ٹیکس ادا کرنے والوں کی استعداد کے مطابق کیا جاتا ہے جسے وہ برداشت کر سکیں ورنہ آگے چل کر سیاسی اور اقتصادی اتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رومن سلطنت کے زوال کی بڑی وجہ نامنصفانہ اور غیر معقول مالیہ کا نظام تھی۔ بعض مؤرخ یہ خیال کرتے ہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان ممکن ہے یونین زیادہ دیرپا ثابت ہوتی اور دولت مشترکہ کے تعلقات فروغ پاتے اگر ٹیکسوں کے خلاف شورش نہ برپا ہوتی۔ سیاسی اسباب کے علاوہ اقتصادی طور پر بھی اس اصول کو اپنانا دانشمندی ہے۔ لوگ ملک کی اقتصادی ترقی کے محرک کو کھو دیتے ہیں اگر بھاری اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کے ذریعے انہیں نچوڑ لیا جائے۔ کابینہ کا ایک رکن اور اس علاقہ کا باشندہ ہونے کی وجہ سے میں اس علاقے کے مسائل سے ذاتی طور پر آگاہ ہوں۔ میں اس اہم مسئلہ کے منصفانہ اور جائز تصفیہ کے لئے مناسب توجہ دے رہا ہوں۔ لیکن اس مسئلہ کی پیچیدگی کی وجہ سے اسے مختلف مرحلوں پر حل کیا جائے گا۔ اس سمت میں جو پہلا بڑا قدم اٹھایا گیا ہے' وہ آبیانہ اور مالیہ کی علیحدگی ہے۔ یہ قدم آرڈیننس نمبر ۱۷ 1959ء کے تحت اٹھایا گیا تھا۔ اس آرڈیننس کی تشکیل کے وقت مندرجہ ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔

(الف) ..... آبیانہ اور مالیہ کی مجموعی شرح علیحدگی سے قبل کے مصارف سے بڑھنے نہ پائے۔

(ب) ..... مالیہ کی شرح پر سندھ کے کم و بیش نظام کے مطابق نظر ثانی کی جانی چاہئے اور اس کا تعین تصفیہ کے وقت کی فصل کی پیداوار کی بجائے موجودہ فصل کی پیداوار پر ہو۔

(ج) ..... اگر مجموعی مصارف میں کسی قسم کا اضافہ ہوا تو یہ کم و بیش طریق کے بجائے نقد اور فصلوں پر ہو۔

دوسرا اہم قدم جو اس علاقہ کے آباد کاروں کی مدد کے لئے اٹھایا گیا وہ ترقیاتی محصول کی تنسیخ تھا۔

تیسرا اہم قدم 31 ..... جولائی کو حیدر آباد میں ہونے والی اعلیٰ سطح کی کانفرنس میں اٹھایا گیا۔ میں نے کانفرنس کے روبرو اس علاقہ کے آباد کاروں کا نقطہ نظر پیش کیا۔ میں مسرت سے یہ کہتا ہوں کہ مالیہ میں 25 فیصد کی تخفیف کا فیصلہ کیا گیا۔ ان تمام اقدامات سے کاشت کاروں کو امداد اور اعانت ملی ہے۔

کسی بھی حکومت کے لئے' خاص طور پر اس کے لئے جو اقتصادی طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہو یہ ایک مشکل امر ہے کہ وہ اپنے مالیہ میں تخفیف کرے۔ ہم نے اس علاقہ میں مالیہ میں مناسب کمی کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مالیاتی نظام کو معقول بنیادوں پر مربوط و متحد کرنے کا کام بے حد پیچیدہ ہے اور کوئی ٹھوس اور قطعی فیصلہ کرنے سے قبل ماہرین کی طرف سے اس کا گہرا جائزہ لینا ضروری ہے۔

www.bhutto.org

بڑے بڑے امتیازات کم کیے جا رہے ہیں لیکن بعض حالتوں میں یہ امتیازات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور ان پر عمل در آمد ہو رہا ہے۔ بعض اہم مادی پہلو جیسا کہ خطّہ کی تاریخ، علاقہ کی عام اقتصادی حالت قیمتوں کا رجحان، منڈیوں کا فاصلہ، ذرائع مواصلات اور وہ عام اخراجات جو زمینداروں کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ان کا مطالعہ و معائنہ بے حد ضروری ہے۔

5 ر ستمبر 1961ء

ساتواں حصہ

ایوب کے خلاف جدوجہد اور اسکے بعد

www.bhutto.org

www.bhutto.org

صحافت میں میرا پہلا قدم

میں حیران ہوں کہ کیا میں اسے نئی مہم جوئی کا نام دوں! میں صحافت میں پہلی مرتبہ قدم نہیں رکھ رہا ہوں، چند سال پہلے طالب علمی کے زمانہ میں پہلی مرتبہ میں نے اس میدان میں قدم رکھا اور ابلاغ کے اس فن سے واقفیت پیدا کی۔ میں پاکستان کا والٹر لپمین نہیں بننا چاہتا اگرچہ مجھے اس باصلاحیت برادری کا رکن بن کر فخر کا احساس ہو گا جس سے اس کا تعلق ہے۔

آیئے بات یہاں سے شروع کریں کہ پہلے ہی باشعور رائے عامہ کو مزید بصیرت سے بہرہ ور کرنے اور ان قومی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینے میں جو کہ مزید الجھتے جا رہے ہیں اخبارات کا کردار اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ مختلف معاشروں میں صحافت نے مختلف روپ بدلے ہیں لیکن اس میں کچھ مشترک رشتے جو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ برطانیہ اور یورپ، نیز اوقیانوس سے پار امریکہ میں صحافت کا معیار بہت بلند ہے اور اس میں بے پناہ نفاست آگئی ہے۔ انگریزی زبان سے واقفیت کی وجہ سے ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم انگریزی اور امریکی صحافت سے سبق اخذ کر سکیں اس کا ہم پر کافی اثر ہے اس نے ہمارے خیالات کو مہمیز لگائی ہے اور ہمیں کچھ افکار بھی دیئے ہیں۔ مغربی تہذیب کے ساتھ روابط کی وجہ سے ہم فرانسیسی صحافت کے اعلیٰ معیار سے واقف ہیں اگرچہ ہم فرانسیسی زبان نہیں جانتے۔ "لاموندے" اور "لافگارو" جیسے اخبارات اپنی اطلاعات اور پُر بصیرت اور گہرے تبصروں کے لئے کافی مشہور ہیں۔

ممتاز مغربی اہلِ قلم کے حالات کے گہرے تجزیوں سے بحیثیت مجموعی معاشرے کو فائدہ پہنچتا ہے اور

www.bhutto.org

حکومتوں کو بھی جو اہم قومی مسائل سے نپٹی ہیں جن کا تعلق جنگ اور امن، اقتصادی اور سماجی ترقی سے ہوتا ہے۔

عام طور پر افریقہ اور ایشیا میں ابھی تک صحافت کی جڑیں مضبوط نہیں ہونے پائیں یہ اسی طرح ہنگامہ خیز اور غلطیوں کی آماج گاہ ہے جیسے کہ ایشیا اور افریقہ کے حالات ہیں۔

مناسب معلومات نہ ہونے کی وجہ سے ہم پاکستانی لاطینی امریکہ میں صحافت کے بارے میں مکمل آگاہی نہیں رکھتے لیکن میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ لاطینیوں کی صحافت ان کے ممالک کی امریکہ سے نزدیکی اور جنوبی امریکہ میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کی آزمائش سے متاثر ہوئی ہے۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ اس میں ہمارے معیاروں سے مشابہ کئی باتیں ہیں جن کی سادہ وجہ بہت سے مسائل کی یکساں نوعیت ہے۔ بات یہ ہے کہ صحافت کا معیار اور اسلوب ہر معاشرے میں برپا ہونے والے حقائق کا عکس ہی ہوتا ہے۔ صحافت رجحانات کو سمجھتی اور تخلیق کرتی ہے۔ یہ گرمئی رفتار پیدا کرتی ہے اور عوام کے مزاج اور ان کی دھڑکنوں سے صحافت لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ یہ حالات کے بہاؤ کے ساتھ دوڑتی ہے اور صورتحال کو بدلانے والی ہر لہر پر سوار ہو جاتی ہے۔

پہلے زمانے سے کہیں زیادہ ہمارے زمانے میں صحافت سیاہی اور خون دونوں سے لکھی جاتی ہے۔ اس نے بے پناہ رکاوٹوں کے خلاف جرأت کا ثبوت دیا ہے بعض اوقات اس نے بزدلانہ بے عملی بھی دکھائی ہے۔ صحافت حالات کی قیدی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ میں جیل کی چابی بھی ہے۔ اکثر لوگ کہیں گے کہ اعلیٰ پایہ کی صحافت اخبارات کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ اخبارات کا کام محض آج کے خشک حالات کو قلمبند کرنا ہی نہیں، کیونکہ یہ کام تو شاید ٹیلیویژن اور ریڈیو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہیں، بلکہ کھول کر رکھ کر دینا، رہنمائی کرنا، پیش بینی کرنا اور پرکھنا بھی ان کا کام ہے۔

دوسرے الفاظ میں صحافت محض قلمبندی کا ذریعہ، یا ڈاکخانہ یا ابلاغ کا وسیلہ نہیں۔ اس کے فرائض بہت زیادہ اہم ہیں۔ ان فرائض کو مناسب طور پر نباہنے کے لئے ضروری ہے کہ جرأت کے ساتھ بات کی جائے اور حق گوئی سے کام لیا جائے، خواہ یہ پریشانی اور اذیت کا باعث ہی کیوں نہ ہو۔

یورپی اور اینگلو امریکی صحافت طویل جدوجہد کے بعد اعلیٰ معیار پر پہنچی ہے اور اس کی خوبی حاصل کردہ مرتبے کا ہی عکس ہے۔ بنابریں شدت اور وفور جذبات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان علاقوں میں اعلیٰ معیار اس آزاد فکر سے پیدا ہونے والی قوت محرکہ اور تحریک سے نکلا ہے جو کہ پاکیزہ الفاظ یعنی "آزادی اظہار" کی دستوری پناہ کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ ہم اس دلیل سے بھی پہلو تہی نہیں کر رہے کہ ان معاشروں میں ٹیکنیکی اور ثقافتی ترقی کی وجہ سے صحافت پر خود ساختہ نظم و ضبط تھوپا گیا ہے۔ کئی صحافی، اگر وہ اپنے ضمیر کے ساتھ مذاق نہیں کرتے تو وہ اپنے ضمیر کے خلاف لکھنے اور ضابطہ کو توڑنے پر قلم کو ہاتھ سے رکھ دینے کو ترجیح دیتے ہیں، بعض کام تو سرے سے ہوتے ہی نہیں۔ خود عائد کردہ ضابطے اور پختہ سالی کے پیدا کردہ قوانین کا ضبط کے علاوہ کسے یہ معلوم نہیں کہ طاقتور اقتصادی عوامل آزادی اظہار کو محدود

کرنے کا کام کرتے ہیں۔ مجھے یورپ اور امریکہ میں سرکاری افسران کی طرف سے صحافیوں کو ہدایات کی بابت اتنا کچھ معلوم ہے کہ میں سرکاری ہدایات کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ سرکاری ہدایات عوامی مفادات اور قومی سلامتی کے سیاق و سباق میں خبر رساں اداروں میں احتیاط کے ساتھ تحریر و تقریر کی رہنمائی کرتی ہے اور اس پر کنٹرول رکھتی ہیں چنانچہ نہایت ترقی یافتہ اور جمہوری معاشروں میں بھی مکمل آزادی صحافت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔

جس طرح کہ اخبارات کی بے لگام آزادی قومی مفاد کے لئے مضر ہے اسی طرح آزادی پر قدغن اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔ کچھ چیزیں تو ایسی ہوتی ہیں جن کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جنہیں چھپانا مشکل ہوتا ہے۔ اگر عوام کے جذبات اور مایوسیوں کو ڈھانپ دیا جائے تو ماحول خوفناک بدبو سے بھر جاتا ہے جو ملکی حدود سے باہر تک پھیل جاتی ہے۔ "آزادی اظہار" اس کے معانی اور فوائد کے بارے میں دلائل لاتعداد ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی دلائل ہی نہیں بلکہ بے شمار فلسفیانہ نکات بھی حق میں یا مخالفت میں دیئے جا سکتے ہیں لیکن بات بے نتیجہ رہے گی۔

مغربی صحافت کی اعلیٰ خوبیوں کی متعدد وجوہات میں سے آزادی اظہار کو ہم سب سے اہم کہہ سکتے ہیں اپنی تمام خامیوں کے باوجود مغربی صحافت اس معیار پر پہنچ گئی ہے جو بحیثیت مجموعی قابلِ ستائش ہے۔

ہم ایشیا، افریقہ، روس اور مشرقی یورپ میں صحافت کی صورتحال سے بالکل ناآشنا نہیں ہیں۔ ان وسیع خطہ ہائے ارض کے کئی ایک ملکوں میں صحافت نے بہت ترقی کی ہے۔ مثلاً متحدہ عرب جمہوریہ نے قابلِ تعریف ترقی کی ہے۔ نام لینا کوئی مستحسن بات نہیں لیکن یہ سب کو معلوم ہے کہ قاہرہ کے اخبار الاہرام کے مدیر حسنین ہیکل نے صحافت کی قابلِ قدر خدمت کی ہے۔ اس ممتاز قلم کار نے افکار کی شمعیں روشن کی ہیں اور فکر انگیز کام کیا ہے۔

روس اور چین الگ زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ ان عظیم قوموں نے کئی مشہور قلم کار پیدا کئے ہیں۔ ان کا لکھنے کا اسلوب وہ نہیں جسے مغرب میں "آزادی اظہار" کہتے ہیں لیکن پھر بھی تخلیقی فکر آگے بڑھانے میں ان کی خدمات ناقابلِ تردید ہیں۔ ان ملکوں کے صحافی جذبے کے ساتھ لکھتے ہیں اور ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو ہلکی پھلکی صحافت پیدا نہیں کر سکتی۔ پھر ان کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ مغربی ممالک میں تو یہ مسابقت کا جذبہ ہے جو بہترین ذہنوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن ایسے ملک بھی ہیں۔ جہاں مسابقت کا نظام تو موجود نہیں لیکن اس میدان میں ان کا کام قابلِ ذکر ہے۔ اس نظام میں صحافت کا مقصدی جذبہ مغربی معنی میں "آزادی اظہار" نہیں بلکہ ملک کے نظریاتی مقاصد ہیں۔ حقیقی نظریاتی ملکوں میں صحافی بھی مختلف پیشوں سے منسلک دوسرے شہریوں کی طرح اپنے نظریات سے متحرک ہو کر ہی بہترین تخلیقی کام انجام دیتے ہیں۔

بہ الفاظ دیگر اگر صحافت کو نتیجہ خیز کام کرنا ہے اور اگر اس کو معاشرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہونا ہے، اگر اس کو صحت مند خدمت انجام دینی ہے تو یا تو اسے مغربی انداز کی "آزادی اظہار" کے تحت کام

www.bhutto.org

کرنا ہو گا یا پھر نظریہ کی زبردست قوت سے حرکتِ عمل کرنی ہو گی۔ اچھی صحافت کے لئے دونوں میں سے ایک صورت ناگزیر ہے۔ اگر کوئی ملک اظہار کی آزادی نہ دے اور نظریہ کے اعتبار سے بھی بانجھ ہو تو اس کی صحافت بھی اسی طرح بانجھ ہو گی۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح یہ بھی دم گھٹ کر ختم ہو جائے گی۔

صحافت کو فطری رخ اختیار کرنے دینا چاہئے۔ ہم بھی اس لائحہ عمل سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہم نے صحافت کو مختلف مدارج سے گزرتے دیکھا ہے۔ ماضی میں ہم نے بے لگام اسلوب بھی دیکھا ہے، جس کے بہت سے پہلو ناپسندیدہ تھے اور جو عام ملکی حالات کے عکس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

کئی دوسری چیزوں کی طرح ہماری صحافت بھی حد سے تجاوز کر گئی اور اسے لگام دینا پڑی اس وقت پاکستان میں صحافت ایک مشکل عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ آخر کار یہ یقیناً اپنا مقام متعین کر لے گی۔ پہلے ہی اس نے قانونی پابندیوں کے علاوہ اپنے اوپر کچھ رضاکارانہ پابندیاں بھی لگائی ہیں۔ اگر کل کو تمام پابندیاں اٹھالی جائیں تب بھی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ خود نافذ کردہ پابندی کسی حد تک برقرار رہے گی۔ یہ بذاتِ خود پختگی کی علامت ہے۔

ہماری انگریزی صحافت کے حالات مخدوش ہیں۔ حوصلہ افزا بڑے نام زیادہ نہیں اور ان کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہیں ان میں سے چند ایک نے اپنا پیشہ ترک کر دیا ہے اور زیادہ جاذبِ نظر پیشوں میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔ مستقبل میں ہماری صحافت کو مزید گزند پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر اس کی ترقی کیلئے ماحول سازگار ہو تو اس کا معیار پھر سے بلند نہیں ہو سکتا۔

اردو، بنگالی اور کچھ علاقائی زبانوں کی صحافت نے بھی قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔ یہ ایک اطمینان بخش امر ہے لیکن پھر بھی بہتری کی گنجائش موجود ہے خصوصاً چیدہ رپورٹنگ اور اداریوں کے میدان میں' اس لئے کہ یہ نئے حالات پھیلاتے ہیں اور بین الاقوامی اور ملکی حالات کا تجزیہ کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ ہماری صحافتی خبریات کا بیشتر حصہ عام معاملات کی رپورٹنگ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اخبارات اور رسالے فرسودہ اصطلاحوں سے اٹے ہوئے ہیں۔ سرکاری آدمیوں اور تقریبات کے افتتاح یا اختتام کی تصویروں کی اشاعت کو ضرورت سے زیادہ جگہ دی جاتی ہے۔ سنسنی خیز خبروں' معمول کے پیغامات کی عبارتوں اور آمد و رفت کی خبروں کو کچھ زیادہ ہی جگہ دی جاتی ہے۔ شادیوں کا تو ذکر ہی کیا بعض لوگ لکھتے وقت راز افشائی کی کوشش کرتے ہیں مگر اس ضمن میں جارحانہ انداز اختیار کر جاتے ہیں۔ اسلوب بیان کا ارتقا ہونا باقی ہے اور گہرائی کی تلاش کی بھی ضرورت ہے۔ یہ آہستہ آہستہ ارتقا کے پاٹوں میں سے گزر رہی ہے بالخصوص اردو اور بنگالی اخبارات میں دوسرے تقاضوں کے علاوہ اعلیٰ معیار کے لئے صحافیوں کے حالاتِ کار کو بہتر بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس پیشے کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں معاشرتی مرتبے کے بغیر احترام کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تمام ضروری عوامل کا ربط باہم بروئے عمل آ جائے تو ہمارے لئے بہتر کارکردگی دکھانے کا موقع پیدا ہو جائے گا۔ ہم نے بہت سے ممتاز ادیب پیدا کئے ہیں جن میں سے بعض کی تو دوسرے علاقوں میں نظیر نہیں ملتی' اگر صرف دو کا ہی ذکر

www.bhutto.org

کریں تو حمید نظامی اور فیض احمد فیض نے عظمت کی شمعیں روشن کی ہیں۔ ان دو ابتدا کرنے والوں نے وہ خدمت انجام دی ہے اور اسلوب قائم کئے ہیں جن کی تقلید کی جانی چاہیے۔

صحافت کو بے شمار مسائل درپیش ہیں۔ لیکن انہیں حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نہ صرف صحافیوں اور صحافت کے لئے حالات کار بہتر بنائے جائیں بلکہ انہیں تنقیدی خود نگری کی اجازت بھی دی جائے۔ میں یہ گفتگو غیر صحافی کی حیثیت سے کر رہا ہوں تعصب کی باتیں کرنا ہرگز مقصود نہیں اور میں صحافیوں کے دوست ہی کی حیثیت سے جو کہ محب وطن بہادروں کا ایک گروہ ہیں' یہ باتیں کر رہا ہوں۔

میں نے مفید کام میں مصروف ہونے اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لئے ہی قلم اٹھایا ہے۔ پیدائشی طور پر میں زمیندار ہوں لیکن ابھی تک میں نے اپنے آبائی پیشے کو بہت ہی کم وقت دیا ہے۔ زمین ہمارے ملک کی ماں ہے۔ ہمارے خوبصورت کھیتوں کی پیداوار اور ہماری طاقت ہے۔ صحافت کی طرح زراعت میں بھی بہت سے تضادات موجود ہیں۔ کھیتی باڑی کے قدیم طریقوں کے ساتھ ساتھ ہم آج کل ٹریکٹر اور مشینیں بھی زیر استعمال دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی صحافت بھی' جسے ہم اپنا اہم ترین پیشہ کہہ سکتے ہیں نازک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ جب بھی زراعت کا عبوری دور ختم ہو گیا تو ہمیں امید ہے کہ ہم نہ صرف اس بنیادی شعبے میں بلکہ صحافت سمیت دوسرے شعبوں میں بھی ایک طاقتور خود کفیل اور خوشحال معاشرہ بن جائیں گے۔

تعلیمی اعتبار سے میں قانون کے پیشے سے متعلق ہوا' لیکن میری زراعت کے ساتھ وابستگی کی طرح قانونی مصروفیات بھی بے قاعدہ ہی رہی ہیں۔ میں قانون کے عظیم پیشے کو اپنا پورا وقت دینے کے لئے اعلیٰ ترین علمی صلاحیتیں رکھتا ہوں' لیکن متعدد وجوہ کی بنا پر میں ایسا کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ میں پیشہ قانون کا احترام کرتا ہوں لیکن مجھے اس سے شدید جذباتی لگاؤ نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب نہ صرف زراعت اور قانون کے لئے بلکہ صحافت کے لئے بھی وقت نکالوں گا اور ایسا کسی باضابطہ اور باقاعدہ معنی میں نہیں بلکہ ذہن اور جسم کو چست اور صحت مند رکھنے کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ قانون کا پیشہ ایک عظیم پیشہ ہے۔ ہر نظام میں اسے بلند مقام حاصل ہو گا۔ ایسا معاشرہ جس میں قانون ناپختہ اور بے ربط ہو غیر مہذب اور وحشی ہی کہلائے گا۔ قانون عظیم نفاست کا دوسرا نام ہے اور اس میں خامی ایک لعنت ہے۔ قانون کی حکمرانی تہذیب کی طاقتور ترین ڈھال ہے۔ یہ ہر شہری اور ریاست کا فرض ہے کہ وہ معاشرتی نظام کے اس بڑے ستون کو مضبوط بنائے۔ وہ لوگ جو قانون کا تحفظ چاہتے ہیں اس کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ جو لوگ قانون کی پاکیزگی برقرار رکھتے ہیں وہ بھی انصاف کی بنیاد پر لوگوں پر حکمرانی کے فوائد سے باخبر ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بہت سے قابل اور محنتی وکیل موجود ہیں' ان ممتاز لوگوں نے ہمارے ملک کی بہت خدمت کی ہے۔ اور مستقبل میں وہ اس سے بھی زیادہ خدمت کرتے رہیں گے۔ نظام قانون میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں ہم ابھی تک مقامی نظام وضع کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ عبوری دور کے انقلابات پرانے مروجہ

www.bhutto.org

معیاروں سے ٹکرا رہے ہیں لیکن زود یا بدیر اس ٹکراؤ سے مناسب امتزاج پیدا ہو کر رہے گا۔

اگرچہ پیدائشی طور پر میں زراعت پیشہ اور تعلیمی اعتبار سے ایک وکیل ہوں مگر سیاست سے بھی میرا واسطہ رہا ہے۔ ہر چیز سے بڑھ کر سیاست ہی میری روح کو بیدار کرتی ہے اور ایک مستقل رومان کا شعلہ بھڑکاتی ہے۔ سیاست ایک اعلیٰ سائنس اور فنِ لطیف ہے۔ یہ معاشرے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے اور منصفانہ توازن کی حتمی معمار ہے۔ ہمارے ملک کو کئی ایک سیاسی مسائل درپیش رہے ہیں لیکن صرف اس میدان میں ہی بالآخر صحیح صورت حال صورت پذیر ہوگی جو ہمارے عوام کی بھلائی کا باعث بنے گی۔ سیاست صاف ستھری ہونی چاہئے۔ یہ منفی مصلحتوں پر مبنی نہیں ہونی چاہئے۔ نہ ہی اس کا انحصار نعروں اور ذاتی منفعت اور لالچ پر ہونا چاہئے بہت سے لوگ قابلِ فہم وجوہ کی بناپر سیاست کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کئی لحاظ سے سیاست دان بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے کہ ہم نے سیاست میں سیاست بازی سے کام لیا ہے۔ ہم نے ایک عظیم فن کو آلودہ کر دیا ہے۔ لوگ اب ایسے سیاست دانوں پر مزید اعتماد نہیں کر سکتے جو ان کے جذبات سے کھیلتے رہے ہیں اور مفاد کی جھلک پر اصول قربان کرتے رہے ہیں۔

قوم کی سیاسی زندگی میں ایک نیا دور ابھر رہا ہے۔ اب جبکہ تقدیر نئے سال کے طلوع کی دہلیز پر کھڑی ہے پاکستان کے سیاست دان ایک نازک اور نئی آزمائش کا سامنا کر رہے ہیں۔ اب ایک نیا اندازِ فکر اور ایک نیا اسلوب ابھر کر رہے گا۔ اس لئے کہ پرانے اطوار لوگوں کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ اب یہ کافی نہیں کہ کوئی آدمی تند و تیز پارلیمانی مقرر ہو یا یہ کہ ماہر برجستہ گو ہو اور یہ جانتا ہو کہ "نکتہ اعتراض" کب اٹھانا ہے یا سوالات کی بوچھاڑ سے کب دق کرنا چاہئے اب سیاست کے ہر پہلو میں ایک نیا ہمہ جہت انداز دریافت کرنا پڑے گا۔ ہاتھ کا زمین تک پہنچنا ہے' آنکھ کا زیرِ سطح لہروں کو دیکھنا ہے اور کانوں میں بہت دور سے عوام کے دلوں کی دھڑکن سننے کی صلاحیت پیدا کرنا لازمی ہے اب "زندہ باد" کا بلند سُر اور عام جلسوں میں تحسین کے ڈونگرے سیاسی اہلیت کا آخری معیار نہیں قرار پائیں گے۔

ڈرائنگ روم کی جوڑ توڑ اب مکروہ حد تک بڑھ گئی ہے جسے مستقبل میں عوام برداشت نہیں کریں گے۔ عوام بہتر اور باعزت زندگی کے خواہش مند ہیں۔ اگر سیاست دان نے دور حاضر کے تقاضوں کے نئے چیلنج کا مقابلہ نہ کیا تو اس کی عیاری اور ذہانت رائیگاں جائے گی۔ اب مسئلہ "بناؤ اور بگاڑو" یا ایک معروف اردو محاورے کی زبان میں "جوڑ توڑ" کا نہیں اب لیڈروں کو جیل بھیج کر یا دہشت گردی اور جبر کا آسان نسخہ استعمال کر کے قومی مسائل کا حل تلاش کرنا ممکن نہیں رہا۔ دہشت گردی اور جبر کبھی بھی سیاسی مسائل کے حتمی حل ثابت نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس ان طریقوں سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئی ہیں۔ انتظامیہ کو دھمکانا نہیں چاہئے نہ ہی انتظامیہ کے لئے دھمکانا اچھا ہے تنقید جائز ہونی چاہئے اور حل منصفانہ اور حقیقت پسندانہ ہونے چاہئیں۔ آزاد معاشرے میں ذاتی دشمنی کی کوئی گنجائش نہیں۔

گورنمنٹ اور حزبِ اختلاف کے درمیان فرق جذبہ انتقام اور دشنام طرازی پر مبنی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کی بنیاد اصولوں کے مخلصانہ اختلاف پر ہونی چاہئے۔

قانون، صحافت اور سیاست میں بہت کچھ مشترک ہے۔ لیکن سیاست اس قدر ہمہ گیر مضمون ہے کہ سیاست دان کے لئے اس فن کو ساتھ لے کر پیدا ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ ایسے کئی دوسرے مضامین کو سمجھنے کی اہلیت رکھنا بھی لازمی ہے۔ سیاست دان کو موزوں وقت کا احساس بھی ہونا چاہئے اسے عوام کا مزاج اور امنگیں سمجھنی چاہئیں۔ سیاست دان کو معمار اور عوام کا مزاج شناس ہونا لازمی ہے نیز اس میں آزاد قوم کی ثقافت کو قوت اظہار بخشنے کی اہلیت ہونی چاہئے۔ اسے جاننا چاہئے کہ مصیبتیں کیسے برداشت کی جاتی ہیں۔ عوام کی تکلیف پر کیسے چیخ وپکار کی جاتی ہے اور ان کے مصائب پر کیسے آنسو بہائے جاتے ہیں۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جب عوام خوش ہوں تو کیسے مسکرانا چاہئے۔ اگر اسے مسائل کی تہ تک اور عوام کے دلوں تک پہنچنا ہے تو اسے درد اور مسرت کے معنی جاننے چاہئیں۔ اسے معاشی اور فوجی امور کی سوجھ بوجھ ہونی چاہئے اور ہنگامی حالات میں تحمل اور تعمیری اطوار کا ثبوت دینا چاہئے۔ اسے دن کی روشنی میں کام کرنے کا سلیقہ آنا چاہئے اور مکمل تاریکی میں چلنے کی اہلیت رکھنی چاہئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نامساعد حالات میں نصب العین کو تھامے رکھنے کے لئے اس میں ایمانداری اور ہمت ہونی چاہئے۔ اس میں لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کی ہمت اور اس وقت "نہیں" کہنے کی جرأت ہونی چاہئے جب یہ "نہیں" مقبول نہ ہو۔

سیاست بڑی آب وتاب رکھتی ہے۔ اس میں وہ کچھ بھی شامل ہے جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی جو نہیں لکھا ہوا سیاست دان میں تحمل بھی ہونا چاہئے اور جرأت بھی۔ بعض اوقات تحمل نہیں بلکہ خطرپسندی اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خطرپسندی اور جرأت میں مہم جوئی کا شائبہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ جو لوگ اپنے لیڈروں پر اعتماد کرتے ہیں ان کے مستقبل سے کھیلنا خطرناک بات ہے۔

صحافت اور سیاست باہم متعلق ہے۔ ایک صحافی کے لئے ضروری ہے کہ اسے سیاست کا علم ہو تاکہ وہ سیاسی حالات کو سمجھ سکے اور وہ ان کا صحیح اندازہ لگا سکے اور تجزیہ کر سکے۔

جمہوری یا نظریاتی ملک میں مستقل نوعیت کی سیاست کا کردار بھی صحافت اور دوسرے تخلیقی فنون کی طرح بہت اہم ہوتا ہے۔ جو ملک نہ تو جمہوری ہو اور نہ ہی نظریاتی اس میں سیاست دانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جمہوری حالات اور ان کے حصول کے لئے جدوجہد نے لافانی ناموں کا گروہ پیدا کیا ہے۔ جمہوری آدرشوں کی پیدا کی ہوئی قوت سے انسانیت عظیم بلندیوں پر پہنچی ہے۔ فرد کی جمہوریت کے ساتھ وابستگی اس قدر مستقل ہے کہ اس کے بتائے ہوئے حقوق کو ناقابلِ تنسیخ اور پیدائشی کہا جاتا ہے۔

اس غیر معمولی چیز کے ساتھ ساتھ تاریخ نے بالخصوص گذشتہ ایک سو برس میں زلزلہ خیز نظریاتی تحریکوں کا ارتقا بھی دیکھا ہے جس کی تشریح جمہوریت کے معروف معانی سے مختلف ہے۔ کلاسیکی شہری آزادیاں غصب ہونے پر عوام نے زبردست تحریکیں چلائی ہیں۔ ایسے معاشروں میں عوام کو جس چیز نے

www.bhutto.org

بلندیوں پر اڑایا ہے وہ انفرادی آزادی کا شعلہ نہیں بلکہ وہ آگ ہے جو نظریہ نے روشن کی' جو عدل اجتماعی کے لئے لوگوں سے طویل المیعاد قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے۔

مغربی طرز کی جمہوریت ایشیا میں مروج رہی ہے۔ اور اس کے طفیل بہت سے فائدہ مند کام ہوئے ہیں۔ اس نے ہمارے عوام میں آزادی کی مجاہدانہ جدوجہد کا جوش پیدا کیا ہے۔ یہ ہمارے قول و فعل پر اثر انداز ہوئی ہے اور اس نے ہمیں مستقبل کے لئے لائحہ عمل دیا ہے۔ یہ تمام خوبیاں برحق' لیکن مغربی طرز کی جمہوریت' ایشیا اور افریقہ میں خاصے انتشار اور تخریب کا باعث بھی بنی ہے۔ اپنی تمام تر معروف خدمات کے باوجود جان لاک اور جان سٹوارٹ مل نہ ہی لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور نہ ہی جکارتہ میں۔ ہمارے لیڈر جو آکسفورڈ' کیمبرج یا پھر سینڈہرسٹ سے پڑھ کر نکلے تھے' مغرب کے جمہوری تصورات سے سرشار تھے انہوں نے اس تصور کو سمجھا اور پھر ہمارے حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہم بالکل نئے سرے سے آغاز کار کرتے اور اوپر سے کوئی چیز نافذ کرنے کی بجائے اپنے حالات کو بنیاد بنا کر ایک نظام وضع کرتے۔

ہندوستان میں بھی جمہوری ادارے ہیں لیکن آج ہندوستان کشت و خون کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس کی جمہوریت غیر فطری ہے۔ تمام پراپیگنڈے اور نمائش کے باوجود ہندوستان جمہوریت ناکام ہو چکی ہے کیونکہ جمہوریت ہندوستانی فلسفہ اور ذہنیت کے لئے اجنبی چیز ہے۔ جمہوریت عدمِ مساوات اور عدمِ رواداری کی فضا میں نہیں پنپ سکتی۔ ہندوستانی فلسفہ کا منبع استحصال اور غلبہ ہے اور یہ جمہوریت اور نظریہ دونوں کے منافی ہے۔ جمہوریت اور نظریہ ہندوستانی سیاست کے محرک نہیں بن سکتے۔

عوام اپنے ناقابلِ تنسیخ جمہوری حقوق سے صرف نظریاتی مقاصد کے لئے اپنی مرضی سے دستبردار ہوئے ہیں' کیونکہ یہ انصاف اور وقار کی نوید سناتے ہیں۔ بنیادی طور پر نظریاتی مقاصد سیاسی نوعیت رکھتے ہیں اور یہ محض معاشی مصلحتوں پر مبنی نہیں ہوتے باوجودیہ کہ معاشیات سیاست کے انجن کے ساتھ کا سب سے بڑا ڈبہ ہے۔

عوام کو نہ صرف ان وجوہات کا علم ہونا چاہئے جن کے لئے انہیں اپنے حقوق میں کمی کے لئے کہا گیا ہے بلکہ انہیں اپنے لیڈروں کے مخلص ہونے کا بھی یقین ہونا چاہئے۔

مناسب اجتماعی مقصد کے بغیر عوام سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ غیر معین عرصے تک اپنے سیاسی حقوق کی قربانی دیتے رہیں گے۔ ایک نظریاتی ریاست بھی اپنے نظریاتی مقاصد کے حصول کے بعد سیاسی آزادی کا وعدہ کرتی ہے۔ عوام تاریخ کا رخ پہچانتے ہیں۔ ہر دن بہتر بصیرت لے کر آتا ہے۔ اب عوام خود ساختہ یا محدود اور غیر قومی مقاصد کے لئے اپنے سیاسی حقوق میں تخفیف برداشت نہیں کریں گے۔

لہٰذا کوئی حکومت اپنے عوام کا تعاون یا تو ایسی جمہوریت کی صورت میں حاصل کر سکتی ہے جس میں فرد کے حقوق کو تحفظ حاصل ہو یا پھر ایسی نظریاتی مملکت میں جہاں شہری حقوق اس وقت تک معطل رکھے

www.bhutto.org

جائیں جب تک کہ مفادِ عامہ کے ارفع سیاسی مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔ ان دو انتہائی مقامات کے درمیان کوئی اور مقام نہیں ہے۔ عوام کا رضا کارانہ تعاون نظاموں کی آلودگی کی صورت میں نہیں مل سکتا۔ نظریاتی ملک جمہوری بنیادوں پر استوار ہو سکتا ہے لیکن دونوں نظاموں کا مرکب کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ نہ تو آمریت میں جمہوری مزاج پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی جمہوریت کو آمریت کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

پرچم صاف ہونا چاہئے اور اسے جمہوری یا نظریاتی مملکت کی نشان دہی کرنی چاہئے اگر عوام کا تعاون کوئی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی خواہش کی جاتی ہے تو پرچم کے لئے تیسری صورت خارج از بحث ہے۔

سیاست سے میرا تعلق میرے ماحول کی پیداوار ہے۔ میرا تعلق ایک سیاست سے تو ضلع سے ہے جہاں میرے خاندان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سیاست میری گھٹی میں پڑی تھی۔ لیکن یہ مختلف نوعیت کی سیاست تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں پرانے طور طریقوں کی جگہ نئے اطوار آنے چاہئیں۔ حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے طریقے بھی بدلنا لازمی ہیں۔

اگر مجھے وہ ماحول نصیب نہ ہوتا جس میں کہ میں پیدا ہوا اور تربیت پائی اور اگر مجھے وہ موقع نہ ملتا جس نے مجھے تیس برس کی جواں عمر میں ملک کے ایک اعلیٰ سیاسی منصب پر پلک جھپکنے میں بٹھا دیا تو میں حیران ہوں کہ میں کون سا پیشہ اختیار کرتا؟

اگر میں آزاد ہوتا اور حالات اور ماحول کی جبریت کو اس قدر دخل نہ ہوتا تو شاید میں فنِ تعمیر کا پیشہ اختیار کر لیتا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی فنِ تعمیر پسند رہا ہے۔ یہ ایسا مضمون ہے جو اس وقت بھی میری توجہ کا مرکز رہا جب کہ میں سیاست کے ہنگاموں میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب چھ یا سات سال کی عمر میں میں نے پہلی مرتبہ موہن جوڈارو دیکھا تھا۔ یہ جگہ پوری طرح میرے دل میں اتر گئی۔ میں وہاں بار بار جاتا اور ہزاروں سال پہلے کی اس تہذیب کے معماروں کے تعمیراتی کارناموں کی درستی اور حُسنِ تناسب کی گھنٹوں داد دیتا تھا۔ مجھ پر اس کا اثر جادو کا سا تھا اور ان ناقابلِ فراموش دنوں کے بعد بھی جب میں انجینئرنگ اور فنِ تعمیر سے پہلی مرتبہ روشناس ہوا میں اس مضمون میں روز افزوں اور مستقل دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ بعد میں اپنی جوانی کے ایام میں جب میں نے تاج محل کا معجزہ دیکھا تو میں نے تعمیر کے عظیم فن کی ابدی محبت کا عہد کیا۔ میں نے یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے اپنے مضمون کی بجائے فنِ تعمیر پر گھنٹوں لیکچر سنے۔ میرا روم میٹ جو ایک پارسی تھا اور سکول کے دنوں سے ہی میرا دوست تھا' وہ فنِ تعمیر کا طالب علم تھا' میں نے اس سے اس کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔

جب مجھے بحیثیتِ وزیر اسلام آباد کا کام سونپا گیا تو مجھے سرور آ گیا۔ بدقسمتی سے اسلام آباد کے ساتھ میرا تعلق بہت مختصر سا تھا۔ کراچی میں ایرانی سفارت خانے میں ایرانی اور ترک سربراہوں کے اعزاز میں دی گئی دعوت کے موضوع پر میں نے صدر پاکستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں بلا تاخیر نئے

www.bhutto.org

دارالخلافہ کا نام رکھ دینا چاہئے۔ میں نے یہ تجویز اس لئے پیش کی کیونکہ میرا خیال تھا کہ نام کے بغیر دارالخلافہ مکمل ہونے تک ناقابلِ فہم ہی رہے گا۔ ہم نے کئی ناموں پر غور کیا اور میں نے مرکز آباد تجویز کیا لیکن بالآخر اس کا نام اسلام آباد طے پایا۔ نام اتنا اہم نہیں ہوتا۔ لیکن دارالخلافہ کا نام رکھنا اس لئے ضروری تھا کہ پہلی اینٹ لگانے سے پہلے ہی یہ ٹھوس شکل اختیار کر لے۔ نئے دارالخلافے کی جگہ خوبصورتی کے لحاظ سے بے حد جاذب نظر ہے۔ اس کا منی منظر بہت اعلیٰ ہے لیکن بد قسمتی سے اسے جلد بازی میں اور بد نما بنایا جا رہا ہے۔ جس طریقے سے اسے بنایا جا رہا ہے اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔ یہی حال کچھ چھوٹے منصوبوں کا ہے جیسے کراچی کی کے ڈی اے سکیمیں۔ کلفٹن پی ای سی ایچ سوسائٹی کا بد صورت منظر پیش کرتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہم کھلی جگہوں کے دشمن ہیں۔ ہم ہر خالی جگہ پر بد صورت عمارتیں بنانا چاہتے ہیں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فنِ تعمیر اور سیاست میں براوراست تعلق ہے۔ ماہرِ تعمیرات کو سیاست دان کی طرح ماحول کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اسے وقت اور جگہ کی سوجھ بوجھ ہونی چاہئے۔ اسے آب وہوا اور مٹی کی بابت جاننا چاہئے اور اسی کے مطابق تعمیر کا کام کرنا چاہئے۔ اسے حال نہیں مستقبل کی ضرورتیں بھی پوری کرنی چاہئیں اس کی عمارت مکینوں اور باہر سے دیکھنے والوں کے ذوق پر پوری اترنی چاہئے۔ یہ اس طرح بنائی جانی چاہئے کہ یہ آرام دہ ہو اور ضیاع سے پاک ہو۔ اس کی سہولتیں صرف مکینوں اور مہمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ان کے لئے بھی ہونی چاہئیں جن کو یہ ورثہ میں ملے گی۔ سیاست کی طرح عمارت کا اپنا مزاج اور اسلوب ہونا چاہئے نیز یہ مکین کے وسائل اور بجٹ کے مطابق بنائی جانی چاہئے۔ یہ انسانی فطرت کو سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے لئے ماہرانہ مزاج درکار ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ منصوبے کے مطابق ہونا چاہئے۔ منصوبے کے بغیر تعمیر ممکن نہیں' جیسے منصوبے کے بغیر سیاست ممکن نہیں۔ ماہرِ تعمیرات کو بھی سیاست دان کی طرح تعمیر کا کام کرنا چاہئے اور سیاست دان ہی کی طرح خوبصورت اور حقیقت پسندانہ معیار قائم کرنے چاہئیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام سڑکیں روم کو جاتی تھیں اسی طرح تمام سڑکیں سیاست کی طرف جاتی ہیں۔ اگر فنِ تعمیر اور سیاست میں کوئی مماثلت ہے' اور میرے خیال میں گہری مماثلت ہے' تو فنِ تعمیر سے میرا شغف میری سیاست میں دلچسپی ہی سے پیدا ہوا ہے۔ چونکہ میں نے دونوں کا ملاپ دیکھا ہے اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ قانون کی طرح میرا فنِ تعمیر کا علم بھی سیاست میں فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔

میں جگہ جگہ گھوما ہوں اور میں نے صاف گوئی سے کام لے کر لکھا ہے۔ آیئے نئے سال کی گھنٹیوں کی آوازوں کو خوش آمدید کہیں وہ اس لئے کہ ممکن ہے ختم ہونے والے سال سے زیادہ دلچسپ ہو۔ وقت اور اس کے ساتھ ہی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ نئے سال نے ایک ایسی نئی صورتحال سے متعارف کرایا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کہ یہ نئی اور پرانی صورتوں کو مدغم کر سکتی ہے۔

www.bhutto.org

ایسپڈ سے آسمان زمین پر نہیں گرا۔ اور اگر یہ ختم ہو جائے تو جہنم نہیں اتر آئے گا۔ لیکن چونکہ پرانی کتاب کا نیا ورق الٹا جا رہا ہے آیئے پُرامید طور پر بات ختم کریں۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ حکومت نے کئی لیڈروں کو رہا کیا تھا اور اس سے حکومت کے اختیار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر مشرقی پاکستان کے لیڈروں کو رہا کر دیا جائے تاکہ وہ ان کے ساتھ شامل ہو سکیں جو آٹھ سال کے طویل عرصے کے بعد سیاسی میدان میں واپس آ چکے ہیں تو اس بات کی تعریف ہی کی جائے گی۔

میں نے شغل اور دوستوں کے لئے لکھا ہے اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ باقاعدہ لکھنا ممکن بھی ہو گا یا نہیں۔ یا یہ کہ اس ابتدائی رونمائی کے بعد لکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اس تیج و خم کے انداز میں قارئین کے لئے کشش بھی ہے یا نہیں۔ دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ جو کچھ میں نے لکھا ہے اگر وہ غیر دلچسپ ہے تو میں ہاتھ اٹھا کر کہہ دوں گا کہ صحافت میں یہ میری پہلی کوشش ہی نہ تھی بلکہ خیرباد بھی۔

پاکستان آبزرور' ڈھاکہ' 12 رجنوری' 1967ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ایک نئی پارٹی کیوں؟

پاکستان اپنی آزاد اور خود مختار زندگی کے تیسرے عشرہ میں داخل ہو رہا ہے لیکن 12 کروڑ پاکستانیوں کے تمام بنیادی مسائل کا حل اور ان کا مستقبل ابھی تک غیر یقینی ہے۔ یہ بات اس لئے بھی زیادہ افسوسناک ہے کہ آزادی سے پہلے آزادی کے بعد اس برصغیر کے مسلمانوں نے مکمل اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی بنیادیں اسلام کے بنیادی اصولوں پر اُستوار کی جائیں گی اور ہماری سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی اسلام کے دینی اور دنیاوی اصولوں کی قوت سے رواں دواں ہو گی، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ نہ ہو سکا اور اس کے لئے کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ مارشل لاء سے پہلے پاکستان اپنی قومی زندگی کے تمام ضروری شعبوں میں بہت ہی پیچیدہ مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ 1956ء کے آئین کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مخلوط یا غیر مخلوط انتخابات کا نظریہ، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان صوبائی مساوات کا مسئلہ، دینی اور لادینی سیاسی نظریہ کا باہم تعلق، اقلیتوں کے حقوق، مغربی پاکستان کی وحدت کا مسئلہ اور دوسرے بہت سے ایسے ہی نازک اور بھڑک اٹھنے والے مسائل درپیش تھے۔

معاشرے میں رشوت ستانی، نفسانفسی اور کنبہ پروری کا اس قدر دَور دورہ تھا کہ ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی تیزی سے پستی کی طرف جا رہی تھی لوگوں میں بددلی اور مایوسی پھیل چکی تھی اور حکومت کے نظم و نسق کی اہلیت پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا خصوصاً غریبوں اور محنت کش طبقوں کے حقوق اور خواہشات کو جس بے دردی سے نظرانداز کیا گیا، اس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ یہی غریب اور محنت کش لوگ

www.bhutto.org

جن کے بل بوتے پر معاشی اور اقتصادی میدان میں سرمایہ داروں کے لئے بے انتہا ترقی کے مواقع پیدا ہوئے اور کارخانوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی لیکن ان کی ترقی کے لئے جو ہماری آبادی کی اکثریت ہے مختلف حکومتوں نے کوئی ٹھوس اقدام نہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غربت اور افلاس ہمارے ملک کے محنت کش طبقوں کو گھن کی طرح کھانے لگی۔

نوکر شاہی اور حکومت کے اہل کار بجائے اس کے کہ وہ لوگوں کی بہبود کی طرف متوجہ ہوتے انہوں نے سیاسی کشمکش میں سیاست دانوں کے ساتھ اپنے آپ کو بری طرح الجھا دیا۔ اور سیاست دانوں کے شانہ بشانہ اس آزاد ملک کے خادم بننے کی بجائے اس کے حاکم بن گئے۔ اس وجہ سے ملک میں غیر یقینی سیاسی ماحول اور بھی نازک حالات سے دوچار ہو گیا اور ہمارے تمام قومی مسائل میں اضطراب کی کیفیت دن بدن نمایاں ہوتی گئی۔

ملکی نظم و نسق کی کارکردگی کا معیار بجائے اس کے کہ موجودہ صدی کے بین الاقوامی معیاروں پر پورا اترتا' دن بدن تیز رفتاری سے روبہ انحطاط ہوتا گیا۔ کاشت کاروں میں بے مقصدیت اور مزدور طبقے میں بے تنظیمی اور غیر معین راہ عمل کا احساس جڑیں پکڑنے لگا اور سفید پوش اور تنخواہ دار طبقہ اپنی جائز ضروریات زندگی کے لئے ترسنے لگا۔ خود غرضی اور ذاتی نفع رسانی ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں رچ گئی۔ تعلیم اور نوجوان کی بہبود جو کہ قومی ترقی کا سرچشمہ قرار پاتے ہیں' ہمارے ملک میں روبہ زوال ہو گئے۔ تمام قومی ادارے ماسوائے عدلیہ اور افواج پاکستان' شدید بحران کا شکار ہو گئے۔

ہندوستان کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے ہمارے ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس کا بین ثبوت وادی کشمیر میں ہندوستان کی کھلم کھلا جارحیت تھی' جس کا مقصد دراصل پاکستان کے بنیادی' معاشی اور علاقائی حقوق پر غاصبانہ قبضہ تھا۔

یہ تھے وہ حالات جو 1958ء کے مارشل لاء سے پہلے تھے۔ عوام کی امیدوں اور تمناؤں میں ایک دفعہ پھر زندگی کی رمق نظر آئی۔ عوام نے سوچا کہ ہمارے قومی مسائل اب ایک مضبوط لیکن پُر شفقت ہاتھ سے سلجھ جائیں گے۔ نئی حکومت نے زرعی اصلاحات سے سیاسی زندگی کی تطہیر سے اور اقتصادی اور معاشی زندگی میں نظم و ضبط کی کوشش کر کے کسی حد تک اپنے قیام کا جواز پیدا کیا۔ بنیادی جمہوریتوں کے باعث کچھ نئے ادارے وجود میں آئے ، جن سے قومی مسائل کو حل کرنے کی امید دلائی گئی۔ کسی حد تک نظم و نسق میں خرابیوں کو دور کیا گیا اور رشوت ستانی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

1962ء میں مارشل لاء کے ہٹنے پر ایک حد تک جمہوریت اور "حکومت شاہی" کا دوغلا نظام رائج کر دیا گیا۔ اسکے ساتھ ہی قریباً تمام قومی پریس کو نیشنل پریس ٹرسٹ کی صورت میں اپنے قبضے میں لے لیا اور دوسری طرف ایک سیاسی پارٹی کا اجراء کر دیا گیا۔ جو پہلے تو کنونشن لیگ کہلائی اور بعد میں اس کا نام "پاکستان مسلم لیگ" رکھ دیا گیا تاکہ یہ سیاسی پارٹی ان حالات کا مقابلہ کر سکے جن کا درحقیقت جمہوریت سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہونے کا امکان تھا۔

www.bhutto.org

بنیادی جمہوریتوں کے تحت 1962ء اور 1965ء میں انتخابات ہوئے موجودہ حکومت کی نافذ شدہ اصلاحات کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ حکومت اپنی افادیت اور کارکردگی کی اہلیت کو مکمل طور پر کھو بیٹھی ہے۔ اسی دورِ حکومت میں بہت سے بنیادی قومی مسائل کا احیاء ہوا ہے اور نئے مسائل نے سر اٹھایا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں اب رشوت ستانی، کنبہ پروری اور دوسری بدعنوانیاں کہیں زیادہ عروج پر ہیں۔ عدلیہ جو کہ مارشل لاء سے پہلے باعث وقار و افتخار تھی۔ مارشل لاء کے بعد ایک کمزور قومی ادارہ بن کر رہ گئی ہے اور ہمارے نظام قانون میں قانون دان طبقے کی ناراضگی کے باوجود اس قدر الجھنیں اور بے ضابطگیاں داخل کر دی گئیں ہیں کہ عوام سے جن کے حقوق کی پشت پناہی عدلیہ اور قانون ہی بالآخر کرتے ہیں یہ ڈھال بھی چھین لی گئی ہے۔

جرائم اور تشدد کی وارداتوں میں روز افزوں اضافے نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ صنعت کاری میں بے مقصد اور محض ذاتی اغراض کے پیش نظر ترقی، زرعی ترقی کی طرف مجرمانہ عدم توجہ کا باعث بنی ہے اور اس کی وجہ سے ایک بہت ہی سنگین معاشی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کے دوررس نتائج پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اس ملک کو خوراک میسر نہیں ہو سکتی جب تک کہ غیر ملکی گندم کی بھرمار اس ملک میں نہ کی جائے اور یہ غیر ملکی گندم ہمارے زر مبادلہ کے ذخائر کو تیزی سے ختم کرتی جا رہی ہے۔

محنت کش طبقہ سخت ہیجان میں مبتلا ہے۔ غریب اور سفید پوش طبقے کے لئے افراط زر اور دن بدن بڑھتی ہوئی قیمتوں کا بوجھ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے ہمارا دانش ور طبقہ اور نئی نسل بے حسی اور بے مقصدیت کا شکار ہو رہے ہیں۔ جھوٹی اور مبتذل اقدار زندگی نے ہمارے قومی جذبے اور حوصلے کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ طالب علموں میں اضطراب اور کرب کا احساس تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ عوام میں قومی مسائل سے لاتعلقی کی روش پیدا ہو رہی ہے۔ سول سروس تک کو آئینی حقوق کا پہلا سا تحفظ اب حاصل نہیں رہا۔ 1962ء میں ہندوستان اور چین کی جھڑپ کے بعد پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج کی قوت میں جس قدر اضافے کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہ کی گئی حالانکہ ہندوستان نے اپنی فوجی قوت کو 1962ء کے بعد خطرناک حد تک مضبوط کر لیا تھا۔ یہ سنگین ترین لغزش ناقابل معافی ہے۔ ہندوستان کے 1965ء کے جارحانہ حملے کے بعد شروع شروع میں فوجی طاقت کو مضبوط کرنے کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی اب بجائے اس کے کہ تمام دوسری ضروریات کو پس پشت ڈال کر فوجوں کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے اس بات کا چرچا کیا جا رہا ہے کہ دشمن ہندوستان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سمجھوتہ کر لیا جائے اور فوجوں کی تخفیف کر دی جائے۔

خارجی معاملات اور خارجہ پالیسی میں تضاد کی وجہ سے دن بدن کھچاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ تضاد کا یہ چکر اب اس حد تک مکمل ہو چکا ہے کہ اس کی وجہ سے اب اسی ملک کے بین الصوبائی تعلقات میں

www.bhutto.org

بھی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔

صدارتی اور پارلیمانی طرزِ حکومت اور محدود اور بالغ رائے دہی کے سلسلے میں نئے آئینی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ تاشقند کے بدنام سمجھوتے اور ہندوستان کے ساتھ امن کی عاجزانہ درخواستوں کے باوجود عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے قوانین دفاع پاکستان کے عذر لنگ کے تحت غیر معین عرصہ کے لئے دستبردار کر دیا گیا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ قومی زندگی بے مقصد ہو گئی ہے اور تمام ملت کا سانس گھٹنے لگا ہے۔

قومی زندگی کو مکمل سیاسی بحران کے عمیق گڑھے کی طرف دھکیلا جا رہا ہے وہ سیاست دان جو ابھی ابھی پابندیوں سے آزاد ہو کر سیاسی میدان میں واپس آئے ہیں ان میں سے کچھ نے تو حکمران پارٹی میں شامل ہو کر حکمران پارٹی کی بے مقصدیت اور بے راہ روی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ دوسروں نے اپنی اپنی سیاسی پارٹیوں کی دوبارہ تنظیم کر کے ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے کہ شاید وہ اس طرح ملک کے اندرونی اور بیرونی مسائل پر قابو پا لیں گے۔

لحظہ بہ لحظہ اور قدم بہ قدم قومی مسائل کا یہ تدریجی اور ارتقائی عمل ایک واضح صورت اختیار کرتا جا رہا ہے ان مختلف سیاسی اور قومی الجھنوں سے سلجھاؤ کی صورت ابھر رہی ہے کوئی بھی ردِ عمل اور تضاد بالآخر مثبت عمل اور متزاج کی طرف لوٹتا ہے اور اسی طرح سیاسی تبدیلیاں ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ سیاسی عمل ناگزیر ہے۔

ایبڈو کے ہٹنے کے بعد سابق سیاست دان صاف طور پر دو گروہوں میں بٹ گئے ایک تو وہ جنہوں نے اپنے سابقہ سیاسی مقام اور نظریات سے انحراف کسی صورت میں گوارا نہ کیا اور دوسری طرف وہ جنہوں نے صحیح سیاست اور شرافت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسی حکومت کے دامن عاطفت میں پناہ لی جس نے انہیں سیاسی مجرم اور قومی تباہی کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس کے بعد کونسل مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں نے اپنے اپنے انتخاب کئے گو کچھ پارٹیوں نے ابھی انتخابات اور کچھ ایسی ہی دوسری رسمی کارروائیوں سے گزرنا ہے۔

مئی 1967ء میں ڈھاکہ میں تحریک جمہوریت پاکستان (پی ڈی ایم) کا وجود کونسل مسلم لیگ، عوامی لیگ، جماعت اسلامی اور نظام اسلام پارٹی کی شمولیت سے عمل میں آیا۔ تحریک جمہوریت پاکستان نے آٹھ نکاتی پروگرام کے تحت پاکستان میں جمہوریت کو بحال کرنے کا تہیہ کیا۔ گو پی ڈی ایم کے وجود میں آنے سے بعد عوامی لیگ کا ایک گروہ اسے چھوڑ چکا ہے اور ابھی یہ تحریک پوری طرح حرکت میں نہیں آئی لیکن پھر بھی یہ ہماری ملکی سیاست کی ارتقائی ترقی کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔

جمہوریت کی بحالی کے لئے تمام قدامت پسند سیاسی پارٹیوں کا الحاق نہ صرف ہماری موجودہ سیاسی صورت حال کو واضح کرتا ہے بلکہ اسی سے یہ بھی عیاں ہے کہ ان مختلف قدامت پسند سیاسی پارٹیوں

www.bhutto.org

کے اقتصادی اور معاشرتی اصول اور پروگرام کم و بیش یکساں ہیں پی ڈی ایم چونکہ قدامت پسند رجحانات کی آئینہ دار ہے ، اسی لئے ترقی پسند عناصر پی ڈی ایم میں شامل سیاسی پارٹیوں سے آسانی کے ساتھ اشتراک عمل نہ کر سکے ۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہی وجہ ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی پی ڈی ایم کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہ کر سکی اور اسے اپنے سیاسی وجود کو علیحدہ قائم رکھنا پڑا۔

حالات کی رفتار اس بات کی متقاضی ہے کہ اب اس دور کا آغاز ہو کہ تمام روشن خیال عناصر اور سیاسی پارٹیاں بھی مل کر پی ڈی ایم کی طرح ایک علیحدہ تنظیم قائم کریں۔ اس نئی سیاسی صورت حال سے یہ خوش آئند تبدیلی پیدا ہوگی کہ ہماری سیاسی پارٹیاں جو کہ پہلے منفی طور پر محض شخصیات کے سہارے پروان چڑھتی تھیں، اب واضح طور پر دو سیاسی رجحانات رکھنے والے یعنی روشن خیال اور قدامت پسند گروہوں میں بٹ جائیں گی۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ جب قدامت پسند اور ترقی پسند تنظیموں کو اپنا اپنا مقام اور اتحاد حاصل ہو جائے گا تو ان کے لئے آسان ہو گا کہ وہ حقیقی جمہوریت کی بحالی کی بنیاد پر آپس میں سمجھوتہ کر لے۔ ایک قابل عمل مشترکہ پروگرام بنا سکیں۔

آنے والے مہینوں میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ ترقی پسند پارٹیاں پی ڈی ایم کی طرح ایک ایسی تنظیم بنانے میں کامیاب ہو سکیں گی جس کی وجہ سے قومی سطح پر ایک ایسی فضا ساز گار ہو گی جس میں حزب مخالف کی تمام پارٹیاں اکٹھا ہو کر حقیقی جمہوریت کی بحالی کے لئے آئینی جدوجہد کر سکیں گی۔

ان وجوہات کی بنا پر ضروری ہے کہ حزب مخالف کی پارٹیوں کو آپس میں باہمی سوجھ بوجھ اور تعلقات کی فضا پیدا کرنی چاہیے در حقیقت اپوزیشن پارٹیوں کا نصب العین ایک دوسرے کی نفی اور نکتہ چینی کی بجائے حزب مخالف کے تمام عناصر اور قوتوں کو اکٹھا کر کے انہیں یکجہتی اور یکسوئی عطا کرنا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں کیا یہ ضروری ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی جائے جب کہ اصل مقصد حزب اختلاف کی مختلف پارٹیوں کا اتحاد ہے۔ اگر ذرا غور سے موجودہ سیاسی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ نئی پارٹی کا قیام اس وجہ سے ہی ضروری ہے کہ حزب اختلاف کی موجودہ سیاسی پارٹیوں کا اتحاد اس نئی سیاسی پارٹی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ سیاسی پارٹی ہماری موجودہ سیاسی پارٹیوں کے تاریخی اور سیاسی نظریات کی الجھنوں کو سلجھانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے گی کیونکہ یہ کام نئی سیاسی پارٹی مخلصانہ طور پر بغیر کسی تعصب یا ذاتی عناد کے کرے گی۔ موجودہ حالات میں اس لئے بھی ایک نئی پارٹی بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر روشن خیال عناصر کو اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔

نیشنل عوامی پارٹی بدقسمتی سے تین مخالف گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور ان میں سے خاص طور پر دو گروہوں کے اختلافات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اسی طرح عوامی لیگ نہ صرف بین الصوبائی اختلافات میں مبتلا ہے بلکہ پی ڈی ایم کے سوال پر اور دیگر معاشی اور سماجی مسائل پر بھی متحد نہیں رہی۔ مختلف بڑی سیاسی پارٹیوں کے لئے گویہ ناممکن نہیں کہ وہ اپنے اندرونی اختلافات سے درگزر کرتے ہوئے ایک قومی متحدہ محاذ قائم کر سکیں لیکن یہ یقینی طور پر بہت مشکل کام ہے کیونکہ ان سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے

www.bhutto.org

تفرقات کو ایک واضح صورت دے دی ہے۔ اس لئے ان میں باہمی اتحاد کا کام ایک نئی سیاسی جماعت ہی کر سکتی ہے جس کی بنیاد روشن خیال اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ عظیم قومی مفاد کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اگلا قدم اٹھایا جائے اس لئے گو سطحی طور پر اس بات میں کچھ تضاد نظر آتا ہو کہ نئی پارٹی کا وجود ضروری ہے یا نہیں۔ لیکن دراصل اتحاد عوام کے لئے ان حالات میں اس سے زیادہ مثبت اور تعمیری اقدام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تمام قوم' اور تمام ملت اتحاد کے لئے تڑپ رہی ہے۔ حزب اختلاف اپنی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک یہ اتحاد قائم نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد کے لئے محض خواہش کی ضرورت ہی نہیں اور اتحاد محض کہنے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتا۔ اتحادِ عوام کے لئے ٹھوس کام' قربانیوں اور وسائل کی ضرورت ہے۔ یہ نئی سیاسی جماعت خدا نے چاہا تو یہ کام کر کے دکھائے گی اور اتحادِ عوام کا وسیلہ بنے گی۔

اس نئی سیاسی پارٹی کے قیام کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک کے عوام کا ایک فعال حصہ جس میں ہماری نئی نسل پیش پیش ہے' اس کا ایمان ہے کہ قدامت پسندی اور رجعت پسندی سے پاکستان کی بڑی بڑی مشکلات کو حل نہیں جا سکتا۔ ہر زمانے کا اپنا سیاسی ماحول اور اپنے سیاسی خدوخال ہوتے ہیں موجودہ دور جو کہ نئی امنگوں اور ان سے وابستہ عمل کی نئی دعوتوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی نئی قوت' اور نکھار کے ساتھ پاکستان کے تمام عوام کے لئے ایک ایسے مثالی معاشرے کی تعمیر کا کام سنبھال لے۔ جس کے لئے اس ملک کے عوام نے بے انتہا قربانیاں دی ہیں۔ اب عوام کبھی بھی اس بات پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ماضی کی طرف دیکھتے رہیں اور نہ ہی وہ موجودہ حالات کی سنگینی کو زیادہ برداشت کر سکتے ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ عدل و انصاف پر مبنی ایک نیا نظام قائم کیا جائے جس میں ملک کے کروڑوں عوام کے بنیادی حقوق اور مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ یہ کام اور یہ فرض' ایک نئی سیاسی جماعت ہی ادا کر سکتی ہے۔ اس اخلاص کے جذبے اور اس نئے یقین اور نئی امید کے ساتھ ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کا حل ہماری قومی اقدار کے مطابق روشن خیالی اور نئے نقطہ نظر سے تلاش کیا جائے گا۔

ہمارے اندازِ فکر میں انقلاب آفریں تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ لمبا راستہ اختیار کرنا کوئی خوشگوار کام نہیں جب کو چھوٹا راستہ موجود ہو۔ لیکن پاکستان کے موجودہ حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ لمبا راستہ اختیار کیا جائے کیں تجربے نے یہ بتا دیا ہے کہ جب ایسے مسائل درپیش ہوں جن سے عوام اور ملک کی تقدیر وابستہ ہو' آسان اور چھوٹا راستہ دراصل منزل سے آشنا نہیں کرتا بلکہ سراب کی نشان دہی کرتا ہے۔

ان سیاسی حقیقتوں کے پیش نظر اور عظیم ملی مفاد کے لئے جن کا کسی حد تک تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ ایک نئی سیاسی جماعت اور ایک نیا سیاسی لائحہ عمل اور دستور اس قوم اور ملت کے لئے اشد ضروری ہیں۔ موجودہ حالات میں ایک نئی سیاسی جماعت کی تنظیم اور نشوونما بہت

www.bhutto.org

مشکل کام ہے۔ اس سلسلہ میں تمام مجبوریوں اور بندشوں کا احتساب ضروری ہے لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جو کہ اس قدم اٹھانے پر پیش آئیں گی ہماری سیاسی زندگی کی موجودہ صورت اور ہمارا قومی مفاد اس راستے کو اختیار کرنے پر ہمیں دعوت دیتے ہیں۔ چاہے اس کے لئے ہمیں انتہائی قربانی دینی پڑے اور اپنا آپ وقف کرنا پڑے صرف اسی راستے کو اختیار کرنے سے ہی قومی یکجہتی اور حب الوطنی کے مفادات کو تقویت پہنچائی جاسکے۔ عوام اپنے جذبہ اخلاص اور یقین محکم کے طفیل اس بات کے قابل ہیں کہ وہ حقیقت پسندی سے اپنے تمام مسائل کو حل کریں۔ اس کے لئے مشعل راہ ہمارے قائداعظمؒ کے اقوال و ارشادات ہیں اور یہ ہمارے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے۔ اس ملک کے عوام اس بات کا تہیہ کر چکے ہیں کہ وہ اس جذبے اور روح کو دوبارہ زندہ کر کے رہیں گے جو ہمیں محمد علی جناح نے عطا کیا تھا۔ ہمارا مقصد نئے مسائل پیدا کرنا نہیں اور نہ پرانے مسائل کو زندہ کرنا ہے بلکہ ان مسائل کا حل تلاش کرنا ہے جو پچھلے بیس سالوں سے ہماری سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ ملک کی تقدیر کا فیصلہ چند افراد اپنی مرضی سے کرنے کے مجاز نہیں ہیں بلکہ تمام عوام اپنے حقیقی نمائندوں کے ذریعہ سے جنہیں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا ہو اپنے آئینی، سیاسی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

پاکستان کے عوام سے یہ درخواست باہمی یقین اور اعتماد کی بنیاد پر کی جاتی ہے اور باہمی یقین اور اعتماد کی بنیاد ضروری ہے کہ عدل و مساوات کے اصولوں پر رکھی جائے نہ کہ جبر و استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے پرانے مسلک پر۔ اس نئی بنیاد پر پاکستان کے عوام اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل کا حل یقینی طور پر تلاش کر سکتے ہیں۔

قادرِ مطلق خدا پر غیر متزلزل ایمان کے ساتھ جو تمام جہانوں اور انسانوں کا پالنے والا ہے اور دینِ اسلام کے لئے جذبہ غیرت رکھتے ہوئے اور پاکستان کے مقاصد کے لئے اپنے آپ کو کلی طور پر وقف کرتے ہوئے ہم سب اللہ کا نام لے کر اس عظیم کام کی ابتداء اور اتحاد عوام کا اعلان کرتے ہیں۔ اس یقین محکم کے ساتھ کہ اتحاد عوام سے اور اجتماعی تدبر اور سوچ و بچار کی بدولت پاکستان کی خدمت میں مگن ہو کر ہم اپنے شاندار مستقبل کی طرف گامزن ہوں گے اور دنیا میں عدل و مساوات اور امن کو قائم کرنے کا موجب بنیں گے .... (آمین)

1967ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پاکستان کی سیاسی صورت حال

بنیادی حقوق

جب سے پاکستان وجود میں آیا ہے ہر حکومت قومی وحدت کے لئے اپیلیں کرتی رہی ہے۔ پاکستان یکے بعد دیگرے مختلف بحرانوں سے گزرتا رہا ہے۔ ہر بحران پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے اور تمام تر دلسوز اپیلوں کے باوجود قومی وحدت ہم سے گریزاں رہی ہے۔ اس بات کی ضرور کچھ ٹھوس وجوہ ہوں گی کہ ہمارے یہاں وحدت کے بجائے بحرانوں کی بہتات رہی ہے۔ ان وجوہ کے جائزے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کو دو طرح کے بحرانوں کا سامنا ہے۔ عوامی قسم کے بحران جنہوں نے پوری دنیا لیکن خاص طور پر ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے' دوسرے دو بحران جن کے سائے برصغیر پاک وہند پر مسلط ہیں۔ ان دو بحرانوں میں بڑا واضح تعلق ہے۔ بحرانوں کی نوعیت کچھ بھی ہو' اور وہ سادہ ہوں یا پیچیدہ ضروری ہے کہ حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جائے۔

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ ایک ایسے موڑ کی طرف بڑھ رہی ہے جو عالمگیر تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ محض ایک اور ڈائن بائن پھو نہیں ہو گا۔ ڈائن بائن پھو اور موجودہ بحران کے درمیان وہی فرق ہے جو 1954ء۔ 1968ء میں ہے۔ ہم ایک عمودی چٹان کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ اس کے نیچے موت کی وادی ہے۔ کیا ہمیں جانتے بوجھتے آگے بڑھ کر تباہی سے ہم کنار ہو جانا چاہئے یا پیچھے ہٹ جانا چاہئے؟ پلٹ آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس سے ہماری عزت نفس کو کوئی دھچکا نہیں پہنچے گا۔ اس کا نتیجہ تو صرف یہ ہو گا کہ یہ خوب صورت دنیا خواہ مخواہ کی تباہی سے بچ جائے گی۔

www.bhutto.org

پاکستان ایک گرداب میں گھرا ہوا ہے جب ہم پیچھے مڑ کر اپنے وجود کے گزشتہ بیس سالوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ بین الاقوامی اور پاک و ہند مسائل کو گنڈ کرنے کا ایک خطرناک رجحان پرورش پا تا رہا ہے۔ اس موقف پر اصرار کرنا بے معنی ہے کہ بحران آج کے دور کا تقاضا اور اس ہمارے مضطرب عہد کا فطری مظہر ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ جو شیطانی رجحان کارفرما ہیں ان کا دھارا بدل دیا جائے۔

یہ صرف ہمارا ملک ہی نہیں جو بحرانوں کے دائرۃ السو میں گرفتار ہے' مگر بہت سے ملکوں نے ہم سے ملتے جلتے مسائل حل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اور وہ طاقت پکڑ کر دوسرے معاملات کو سر کرنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ آگے بڑھنے کی طاقت اپنے بنیادی داخلی مسائل حل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں کے برعکس بدقسمتی سے پاکستان ابھی تک اپنے بیشتر بنیادی داخلی مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کا اثر عوام' ان کے مقدر' ان کے بچوں کی زندگیوں اور ان کے معاشرے کی آئندہ ہیئت پر پڑنے والا ہے۔ جن مسائل کا تعلق عوام اور ان کی امنگوں سے ہے' سچ پوچھیے تو آج تک انہیں عوام کے سامنے رکھا ہی نہیں گیا کہ وہ انہیں حل کرتے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یقین دلایا تھا کہ پاکستان کی حکومت اور دستور کا انتخاب پاکستان کے عوام کریں گے۔ یہ وعدہ ہنوز معرض التواء میں ہے۔

جب تک ملک کے عوام اپنے مستقبل کا آزادانہ فیصلہ نہیں کرتے ہماری مشکلات کا خاتمہ محال ہے۔ موجودہ جمود کو محض ہتھکنڈوں سے نہیں توڑا جا سکتا۔ آگے کی جانب کوئی قدم پچھلی غلطیوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر ہی اٹھ سکتا ہے۔

انتشار کے گرد و غبار میں ایک راستے کے نشانات واضح ہو رہے ہیں۔ عوام کی ایک روز افزوں تعداد جس میں نئی نسل سرفہرست ہے اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ پاکستان کے مسائل حل کرنے کے لئے پرانے طور طریقے ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ ہر عہد کی اپنی سیاسی معنویت ہوتی ہے' اپنے مدوجزر ہوتے ہیں۔ آج کے جوشیلے اور للکارتے ہوئے دور کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی پوری آبادی کی بہترین امنگوں کے مطابق معاشرے کی تعمیر کے لئے ایک بالکل نئی راہ تراشی جائے۔ ہم ماضی کی طرف پلٹنے کو تیار نہیں' نہ ہی عوام موجودہ حالات کو مزید برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے اعلان کیا ہے کہ طاقت کے مالک عوام ہیں۔

داخلی اختلافات کو باہم رضامندی اور افہام و تفہیم سے حل کرنا لابدی ہے۔ طرز حکومت اور دستور کے متعلق طویل مباحثہ بالآخر انجام کو پہنچ جانا چاہئے۔ آزادی ضمیر کے اس دور میں عوام کی دانش مندی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان نے حکومت اور دستور کے خاصے تجربے کر دیکھے ہیں۔ اپنی اجتماعی ذہانت کے بل پر جسے پچھلے بیس سال کے تجربے نے مزید پختگی عطا کر دی ہے' ہمارے عوام اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔

www.bhutto.org

یہ بات واضح ہے کہ بنیادی جمہوریت، جو فاشزم کا دوسرا نام ہے، ہمارے کام نہیں آ سکتی۔ ایسے آزاد اداروں کی ضرورت ہے جو اپنے خالقوں کے بعد بھی قائم رہ سکیں اور جن میں ایسے افراد کے خلاف مدافعت کی سکت ہو جو طاقت کے حریص اور دولت کے رسیا ہیں۔ ان اداروں کی کارکردگی سے عوام میں اعتماد ابھرنا چاہیے۔ جس کا مطلب ہے کہ انہیں مطلق العنان طاقت کی مشق ستم کے خلاف معاشرے کے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔ قانون کو یوں عمل میں آنا چاہیے کہ وہ عوام کے ہاتھ کی تلوار ہو نہ کہ موجودہ غیر منصفانہ صورت حال کو برقرار رکھنے کی ڈھال۔ جب عوام اپنے قدموں پر کھڑے ہوں گے تو آج کی قتل گاہوں پر ایک عادلانہ معاشرے کی بنیاد رکھیں گے۔ وہ ہم مرتبہ مردوں اور عورتوں پر مبنی ایک آزاد بھائی چارے کی تخلیق کریں گے جو ان کے آدرشوں کی تکمیل کا درجہ رکھے گا۔

یہ صرف پاکستان کے عوام کا حق ہے کہ وہ غلط یا صحیح فیصلہ کریں کہ ریاست کو فیڈریشن ہونا چاہیے یا وحدانی، دونوں بازوؤں کا مرکز کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ کیا رشتہ ہونا چاہیے، طرز حکومت پارلیمانی ہو یا صدارتی یا اس کی کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے جس میں ان دونوں نظاموں کے عناصر گھلے ملے ہوں؟ فیڈرل نظام ہو یا وحدانی، دونوں جمہوریت سے ہم آہنگ ہیں۔ یہی کچھ پارلیمانی اور صدارتی نظاموں کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اس سے اس دلیل کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ایسے مسائل پر عوام کے خیالات معلوم کرنے ضروری ہیں، جن کا حل مجرد اصولوں کے بارے میں مناظرہ بازی کے ذریعے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ قانون ساز اسمبلیاں کسی انتخابی ادارے کے بجائے بالغ آبادی کے براہ راست ووٹوں سے منتخب ہونے چاہئیں۔ بالواسطہ انتخابات کے نظام میں بدعنوانی اور دھاندلی کا شکار ہو جانے کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ پوری کی پوری آبادی کو ڈرانا دھمکانا اور بہلانا پھسلانا ممکن نہیں مگر کسی انتخابی ادارے کے گنے چنے افراد کو ایذاؤں یا نوازشوں سے متاثر کر لینا کہیں آسان ہے۔ ووٹ کا حق استعمال کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہیے اور نہ ہی اسے صاحب جائیداد یا تعلیم یافتہ ہونے سے مشروط کرنا چاہیے اور یہ حق دونوں جنسوں کے لئے یکساں ہونا چاہیے۔

آزادی کی فضا میں عوام اپنی دیانت دارانہ رائے کے استعمال میں کوئی روک ٹوک محسوس نہیں کریں گے۔ عوام کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کا دستوری طور پر اقرار ہونا چاہیے۔ جس معاشرے میں شہری آزادیاں کارفرما نہ ہوں، یا ہوں تو برائے نام ہوں، وہ ایک غلام معاشرہ ہے۔ وہ بنیادی حقوق جو دستور میں حادثاتاً جگہ پا گئے اب سوچے سمجھے طریقے سے کالعدم قرار دیے جا چکے ہیں۔ سترہ دن کی جنگ 1965ء میں ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اعلان تاشقند ہوا اور 68-1967ء کے بجٹ میں دفاع کے اخراجات میں کمی کر دی گئی۔ بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات میں تبدیلی کے جو تازہ رجحانات سامنے آ رہے ہیں اور جس طرح ہم صلح و آشتی کے زینے پر کشاں کشاں بڑھ رہے ہیں ان کے پیش نظر ڈیفنس آف پاکستان رولز کو نافذ رکھنے کا کوئی قابل قبول جواز باقی نہیں رہتا۔

www.bhutto.org

ناجائز اختیارات کو بے نقاب کرنے کے بجائے کھلے بندوں سمگلنگ اور بددیانتی کی سرطانی افزائش نے دوسری برائیوں کے ساتھ ڈیرے ڈال کر عوام اور حقیقت کے درمیان پردے ڈال دیئے ہیں۔ جرم اور تشدد میں مصیبت ناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ بدعنوانی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ عام آدمی کے لئے اتنے پیسے کمانا محال ہو گیا ہے کہ وہ شریفانہ زندگی گزار سکے۔ ٹیکسوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور متوسط طبقہ بری طرح ان کی زد میں آیا ہوا ہے۔ یہ حالات چین کی کومن تانگ حکومت کے دور کے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ صنعت کاروں اور افسروں کے درمیان اقتصادی اور سیاسی طاقت میں ساجھے کی خاطر نکاح ہو چکا ہے۔ دیہات میں زندگی غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ شہروں میں سکونت کی ناگفتہ بہ حالت ہے اور چاروں طرف بے ہنگم غلیظ آبادیاں پھیلتی جاتی ہیں جن کا لوگوں کی صحت پر نہایت برا اثر پڑ رہا ہے۔ ہسپتالوں میں مہلک بیماریوں کے علاج کی سہولت میسر نہیں۔ نقلی دوائیاں بیماروں کو دی جاتی ہیں۔ جو انہیں فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ وہ بدمعاش جو اشیائے خوردنی میں آمیزش کرتے ہیں اور اپنی ناجائز دولت میں چور بازاری سے دن دونا اضافہ کرتے ہیں انہیں سزا کا کوئی خوف نہیں رہا۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کے نظام کی کارکردگی شرمناک ہے۔ حادثات کی اتنی بھرمار ہے کہ شاہراہیں موت کے پھندے بن گئی ہیں۔ ٹرینوں کو دن دیہاڑے روکا جاتا اور مسافروں کو لوٹا جاتا ہے' جبکہ ڈاکوؤں اور پولیس کے درمیان گھنٹوں باقاعدہ بندوق بازی ہوتی ہے۔ دریائی اور جنگلی علاقے لٹیروں کی پناہ گاہ بن چکے ہیں۔ معصوم نوجوان لڑکوں کو زبردستی ان بیگار کیمپوں میں دھکیلا جا رہا ہے' جو قصبات کے مضافات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لاہور جیسے بڑے شہروں میں گواہوں کو کچہریوں کی حدود میں قتل کیا جا رہا ہے۔ قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان پر قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں لیکن مجرم فرار ہو جاتے ہیں اور شناخت نہیں ہو پاتے۔

پریس پابہ زنجیر ہے اور مطبوعہ لفظ کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ سیاسی لیڈروں کو ستایا اور سیاسی پارٹیوں کو دبایا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو جو قیام پاکستان کے لئے لڑے اور جنہوں نے مشکل ترین لمحات میں پاکستان کے وقار کی حفاظت کی سب و شتم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہڑتال کا حق دیا جاتا ہے اور نہ غریبوں کی دلجوئی کا کوئی سامان کیا جاتا ہے۔ نوزائیدہ صنعت کار طبقے کی تجوریاں بھرنے کے لئے محنت کش طبقوں کا خون نچوڑا جا رہا ہے۔ ملکی نظم و نسق ایک ظالمانہ افسر شاہی کے پاؤں تلے دم توڑ رہا ہے' جو سیاست میں روز بہ روز گھناؤنا کردار ادا کر رہی ہے۔ قانونی ڈھانچے میں رخنہ اندازی نے انتشار کی فضا کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اس حکومت نے طلبہ کو خاص طور پر تختہ مشق ستم بنایا ہے۔ ہمارے نوجوان طبقے کو جس سے ہم اپنے مستقبل کی تمام امیدیں وابستہ رکھتے ہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستان کی جواں مردی کے جوہر کو کند کرنے کے لئے ظالمانہ آرڈیننس نافذ کئے گئے ہیں۔ وہ سندیں جو ایسے علم کے حصول کا ثبوت ہیں' جو کسی سے واپس نہیں لیا جا سکتا' انہیں ضبط کر کے واپس لے لیا جاتا ہے۔ ذہنوں پر یہ ڈاکا سرکاری طور پر ڈالا جا رہا ہے۔ نوجوان نسل پر بھروسا کرنے کی جرأت کے بجائے حکومت ہمارے طلبہ کو شک کی نظر سے

www.bhutto.org

دیکھتی ہے اور آبادی کے اس حصے سے اتنا دور تک ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں ڈرتی۔

دوسری تمام آزادیوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی آزادی بھی چھین لی گئی ہے اور یونیورسٹیوں کو خود مختاری سے محروم کر کے محکوم بنا لیا گیا ہے۔ اگر یہی کیفیت جاری رہی تو انجام کار پولیس ہی یہ فیصلہ کیا کرے گی کہ کیا پڑھایا جائے۔ اگر حکومت ذرائع نشرو اشاعت پر تمام تر کنٹرول رکھتے ہوئے بھی طلبہ کی تائید حاصل کرنے میں ناکام ہے تو وہ لوگ غالب علموں کو کیونکر گمراہ کر سکتے ہیں جنہیں ان تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ طلبہ کی جمعیت اب اپنے لئے خود سوچ بچار کرنے لگی ہے اس لئے اب اسے گمراہ کرنا آسان نہیں۔ حکومت چونکہ عوام سے دور ہو چکی ہے اس لئے نہ تو نوجوانوں کو سمجھ سکتی ہے اور نہ عام لوگوں کی امنگوں کو۔ یوں اس حکومت نے موجودہ نسل کو مایوس کیا ہے اور آئندہ نسل کی تائید بھی گنوا دی ہے۔

پھر عجب کیا کہ پریس کا منہ بند کر دیا گیا ہے اور اپوزیشن کو خاموش۔ حکومت کی آواز ہی سچائی کی واحد آواز ہے اور اسے نازی انداز کے پراپیگنڈے کی شکل میں مقبوضہ پریس، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر تنفر انگیز حد تک اچھالا جاتا ہے۔ جدھر بھی دیکھیں آپ کو بے اطمینانی ہو گی۔ غریبوں کے لئے بدعنوانی، خویش پروری اور لاقانونیت کا بڑھتا ہوا وبال اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ استحصال اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا ہے۔

جمہوریت اور سوشلزم

شہری آزادیوں میں ہماری آئندہ مسرت کا راز مضمر ہے۔ مختلف مفادات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے جو عناصر ناگزیر ہیں ان میں شہری آزادیوں کو اولین مقام حاصل ہے۔ تمام بنیادی حقوق اہم ہیں اور تنسیخ ہو یا ترویج انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی آزاد معاشرے کا ڈھانچہ مجموعی طور پر ان تمام حقوق پر قائم ہوتا ہے جو بنیادی ہیں۔ سچ مچ کی آزادئ اظہار صحیح معنی میں زیر عمل آ ہی نہیں سکتی، جب تک کہ پریس آزاد نہ ہو یا آزادانہ کیل جول کا مناسب موقع میسر نہ ہو۔ پریس کا کام لوگوں کو بے خبر رکھنا نہیں، باخبر رکھنا ہے۔ ہمارے پریس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ جھوٹ بولے، غلط خبریں دے اور کیچڑ اچھالے۔ آج پریس کو دھوکا دینے پر نوازا جاتا ہے، مگر اس مطالبے سے گریز کرنے پر معتوب کیا جاتا ہے۔ موجودہ حالات میں یہ پاکستان کے عوام کی ذمہ داری ہے کہ پریس کی آزادی کی بحالی کے لئے جدوجہد کریں۔ اگر تمام جمہوری طاقتیں عزم صمیم کر لیں اور سر جوڑ لیں تو عوام کو ناکامی نہیں ہو گی۔ ہاں اگر پریس کے کچھ ارکان اشتہارات اور سرکاری سرپرستی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں تو یہ اپنے ہاتھوں اپنے مقاصد کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔ یہ پریس کی صوابدید پر ہے کہ ان دونوں صورتوں میں کس کا انتخاب کرے۔

موجودہ حالات کی جگہ ایک ایسے جمہوری اقتدار کا دور دورہ ہونا چاہئے جس میں پوری کی پوری آبادی نہ صرف شریک ہو بلکہ اس بات کا احساس رکھے کہ اسے یہ اقتدار حاصل ہے اور اس پر فخر کرے۔ اس

www.bhutto.org

کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ بنیادی حقوق کو بحال کیا جائے اور پاکستان کے عوام کو ایک ایسے مساویانہ معاشرے کے قیام کے لئے ابھارا جائے جو لوگوں کی ضروریات کا کفیل ہو اور ان کے زیر اثر ہو۔ تمام تر طاقت عوام کو منتقل ہو جانی چاہئے۔ یہ صرف جمہوریت کے ذریعے ہو سکتا ہے "جمہوریت ہماری سیاست ہے" کے اصول کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما ہے۔

جمہوریت ضروری ہے لیکن یہ بذاتہٖ کوئی منتہیٰ نہیں، جمہوریت کے قیام کی جدوجہد میں ہمیں اقتصادی مقاصد کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو اولین حیثیت کے حامل ہیں۔ اقتصادی ترقی کے بغیر کوئی قوم خالی خولی جمہوریت سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ جمہوری آزادی ضروری ہے لیکن اقتصادی مساوات اور انصاف اور بھی ضروری ہیں۔ اقتصادی تبدیلیوں کے بغیر قومی زندگی میں کوئی درخشاں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اقتصادی مسائل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اگر عوام کی غلامی کا خاتمہ درکار ہے تو جمہوریت کے شانہ بشانہ کشادہ دل سوشلزم کی بھی ضرورت ہے۔ اس بیش آباد ملک کے محدود ذرائع کو ضائع کیا جا رہا ہے اور بین الاقوامی منڈی میں خام مال کی گرتی ہوئی قیمتوں کے باعث صنعتی ممالک سے ضروری سامان خریدنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال میں ہمارے اقتصادی مسائل کا واحد حل سوشلزم ہے۔ سوشلزم ہی استحصال کے خاتمے اور وحدت کے فروغ کی واحد راہ ہے۔ جب تک استحصال ختم نہیں ہوتا وحدت ایک نعرے کے سوا کچھ نہیں۔

ہم اقتصادی تباہی کے کنارے کھڑے ہیں سرمایہ دار نوابوں کا ایک مختصر سا طبقہ قومی دولت کو بے دردی سے لوٹ رہا ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان تفاوت آئے دن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس امتیاز کو مٹانے کے لئے ایسا کوئی قانون نہیں جو اجارہ داریوں اور صنعت مالاؤں کے خلاف ہو۔ موجودہ نظام کو انسانیت نواز سرمایہ داری ہی کی کوئی شکل دینے کا برائے نام تذکرہ بھی نہیں پایا جاتا' جیسا کہ زیادہ سمجھدار سرمایہ دار ممالک میں ملتا ہے۔ یہاں پاکستان میں تو کھلی لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ نجی سرمایہ کاری کو مہمیز لگانے کے بہانے ایسی ناجائز مراعات دی جا رہی ہیں جن سے استحصال کی ہمہ گیری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ملک نے ابھی تک اپنی صنعتی بنیاد مستحکم نہیں کی جس سے صنعت اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے۔ صرف فیکٹریاں قائم کرنے کے لئے ہی نہیں' انہیں جاری رکھنے کے لئے بھی بیرونی امداد درکار ہے۔ اب جب کہ بیرونی امداد میں کمی واقع ہو گئی ہے تو پاکستانی صنعتیں یا تو بند ہوتی جا رہی ہیں یا پھر دن میں ایک شفٹ کام کر رہی ہیں۔ برا بھلا جو زرمبادلہ حاصل ہو رہا ہے اس کی خاطر موجودہ حکومت برآمدات پر اپنی گرہ سے مالی امداد دے رہی ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو اس مالی امداد کا بوجھ بالآخر زراعت پر پڑتا ہے یا ان صنعتی مزدوروں پر جو ضروریات زندگی کی روز افزوں قیمتوں کے مطابق خرچ کرنے پر مجبور ہیں۔

شاید یہ خیال کیا جاتا ہو کہ بیرونی امداد سے قوم کی نجات ہو جائے گی لیکن اس کی کوئی امید نہیں ویتنام کی جنگ اور بڑے پیمانے کی بیرونی امداد کے بارے میں امریکی کانگریس کے رویے سے عیاں ہے کہ

پاکستان کو بچے کھچے ٹکڑوں پر قناعت کرنی ہوگی۔ بیرونی امداد کا حصول یوں بھی بیکار ہے کیونکہ یہ اتنی غیر پیدا کار ہے کہ اس کے باعث ابھرنے والے قرضوں کی ادائیگی کی خاطر قوم کے خون کا قطرہ قطرہ نچوڑا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے ایک ایسی حکومت کی پریشان تصویر ہے جو ایک طرف تو یہ دعویٰ رکھتی ہے کہ جن ملکوں کو بیرونی امداد ملتی ہے ان میں وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے اور دوسری طرف سود کی شرح میں کمی کی بھیک مانگ رہی ہے' بلکہ بے لفظوں میں التوائے قرض کی اجازت چاہ رہی ہے۔

یہ محض سود کی اونچی شرح ہی نہیں جس کے باعث بیرونی امداد قابل اعتراض ٹھہرتی ہے امداد کا بہت بڑا حصہ اجناسی امداد کی صورت میں آتا ہے چند سال پہلے حکومت کو زرعی پیداوار کی کمی دور کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے بجائے اس نے پی۔ ایل 480 کے تحت امریکی گندم درآمد کرنے پر تکیہ کیا تھا۔ اب ہم اس کوتاہ اندیش پالیسی کی بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں لیکن اجناسی امداد میں ایک اور بڑی خرابی ہے کہ وہ فوری طور پر صرف ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کو ایسی اجناس کے دام بھرنے پڑیں گے جن کی انہوں نے شکل بھی نہ دیکھی ہوگی۔

قرضوں کی ادائیگی کے بھاری بوجھ کے ساتھ ساتھ لازمی درآمدات' جن میں فوجی سامان بھی شامل ہے پر اٹھنے والے زرمبادلہ کے خرچ نے حکومت کو حواس باختہ کر دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حکومت اتنی گھبرا گئی ہے کہ اس نے یکایک صنعت سے منہ پھیر کر زراعت سے معجزے کی توقع وابستہ کر لی ہے اور لیجئے یہ رہی معجزاتی گندم اور یہ رہا معجزاتی چاول ...... دونوں بازوؤں کے لئے ایک ایک معجزہ مستقبل قریب میں حالات سدھرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی بیرونی امداد میں کمی کے باعث افراط زر کو ہوا ملے گی۔ قیمتیں ابھی سے اندازے سے زیادہ اونچی اٹھ گئی ہیں۔ آئندہ یہ رفتار اور بھی تیز ہو جائے گی۔

سوشلزم اور اسلام

سوشلزم ہی سب کے لئے مساوی مواقع پیدا کر کے استحصال سے بچا سکتی ہے' طبقاتی امتیاز کی دیواریں توڑ سکتی ہے اور اقتصادی اور سماجی انصاف کو قائم کر سکتی ہے۔ سوشلزم جمہوریت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے اور اس کی منطقی ثمر آوری۔ سوشلزم کا دائرۂ کار تا حد قیاس وسیع ہے۔ ان ملکوں کے علاوہ جو انقلاب کی بھٹی سے گزرے ہیں کئی ایسے ملک ہیں' جن میں دستوری شہنشاہیاں بھی شامل ہیں' جہاں تشدد آمیز تبدیلیوں کے بغیر سوشلسٹ تقاضوں کو بتدریج پورا کیا گیا ہے۔ سوشلزم کے اصول کی ہمہ گیری بنیادی طور پر دو باتوں پر منحصر ہے۔ اول جدید سوشلزم کی بنیاد معروضی ہے۔ دوم سوشلسٹ طرز فکر دنیا کے ہر خطے کے ہر ملک کے کارفرما اقتصادی اور سیاسی حالات سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے سوشلزم پاکستان کے لئے براہ راست توجہ کے لائق ہے' جو ایک ایسا ترقی پذیر ملک ہے جہاں داخلی اور خارجی استحصال کا دور دورہ ہے۔

قومی دولت کے زینے پر پاکستان سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑا ہے اور انسانی ابتلاء کی جو مجموعی کیفیت یہاں

www.bhutto.org

پائی جاتی ہے وہ دنیا بھر میں پاکستان جیسے کسی علاقے میں نہیں پائی جاتی جہاں بارہ کروڑ انسان بستے ہیں۔ پاکستان دنیا کا وہ علاقہ ہے جہاں افلاس کی گھٹائیں سب سے گہری ہیں۔ سوشلزم کے ذریعے اس داغ کو دھونا ہی پڑے گا۔ سب سے پہلا قدم یہ ہو گا کہ غاصبانہ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا جائے اور سوشلزم کو حرکت میں لایا جائے۔ ذرائع پیداوار کو 'جو صنعتی ترقی کو جنم دیتے ہیں' یا جن پر صنعتوں کا انحصار ہے' ہرگز نجی ہاتھوں میں نہیں رہنے دینا چاہئے۔ تمام کاروبار جو قومی معیشت کے بالائی ڈھانچے کی تشکیل کرتے ہیں' لازماً عوامی ملکیت میں ہونے چاہئیں۔

بنیادی ذرائع پیداوار اور ذرائع مبادلہ پر عوامی اختیار کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نجی سیکٹر کو ختم کر دیا جائے گا۔ نجی کاروباریوں کو اپنا مفید کردار انجام دینے کی مہلت دی جائے گی لیکن وہ اجارہ دارانہ ذخائر قائم کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ نجی سیکٹر کو انہی حالات کے تحت پروان چڑھنا چاہئے جو نجی کاروبار کو زیب دیتے ہیں' یعنی مقابلے کے حالات' نہ کہ اس طرح کے سرکاری تحفظ کی آڑ میں' جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔

عوامی ملکیت کو ریاستی سرمایہ داری کی سطح پر گرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ محنت کشوں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ مناسب ترغیبات کے ذریعے فیکٹریوں کو مستعدی کے ساتھ چلانے میں حصہ لیں۔ ذرائع کو قومیانے کے ساتھ ساتھ ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن کے باعث محنت کشوں کے حالات بہتر ہوں۔ انہیں مناسب سکونت' تفریح' اپنے اور اپنے کنبوں کے علاج' اور بچوں کی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور ان تمام دوسرے طریقوں کو بروئے عمل لایا جائے گا جن سے ان کا معیارِ زندگی اور ثقافتی سطح بلند ہو۔ ایک جگہ کے حالات دوسری جگہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں جو سوشلزم نافذ ہو سکتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے نظریہ حیات سے ہم آہنگ ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے جمہوری ہو۔ کسی طرح کی بیرونی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر سوشلزم کی اسکنڈی نیوین قسم ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سوشلزم کی پاکستانی قسم نہ ہو جو ہمارے مزاج کے حسب حال ہو۔" سوشلزم ہماری معیشت ہے" کیونکہ سوشلزم کے بغیر ہم یکجہتی وحدت اور یکجہتی مساوات حاصل نہیں کر سکتے جو ایک ایسی قوم کے لئے اور بھی قیمتی ہے جو جغرافیائی طور پر دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔

اسلام اور سوشلزم کے اصول ایک دوسرے سے متضاد نہیں۔ اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور سوشلزم مساوات کے حصول کا جدید طریقہ ہے۔ پاکستان کے عظیم شاعر و فلسفی ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے پاکستان کے متعلق یہی خواب دیکھا تھا کہ سوشلسٹ طرز کی اسلامی ریاست ہو گا۔ ان کے خواب میں صرف ایک حصہ شرمندہ تعبیر ہوا ہے۔ پاکستان ایک مسلمان ریاست ہے لیکن اس میں کارفرما غاصبانہ سرمایہ داری' جس نے عوام کو تباہ و برباد کر دیا ہے' اسلامی اصولوں کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناحؒ نے بھی ایک سے زیادہ موقعوں پر اعلان کیا تھا کہ پاکستان سوشلسٹ طرز حکومت کی حامل اسلامی ریاست ہو گا۔ اپریل 1943ء میں دہلی کی ایک تقریر کے دوران قائداعظمؒ نے پاکستان کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ یہی تھا کہ پاکستان میں ایک عوامی حکومت ہو گی۔ انہوں نے ان زمینداروں اور سرمایہ داروں کو تنبیہ کی تھی جو عوام کا خون چوس چوس کر" ایک ایسے نظام کے ذریعے پھول پھل رہے ہیں جو انتہائی

www.bhutto.org

بدکارانہ ہے، جو انتہائی عیارانہ ہے اور جو انسانوں کو اتنا خود غرض بنا دیتا ہے کہ ان پر کوئی دلیل اثر نہیں کرتی" انہوں نے کہا تھا۔

"پاکستان کا دستور اور طرز حکومت وہی ہوں گے جو لوگ طے کریں گے"

"اسلام ہمارا دین ہے" اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔ اسلام کی برتری کے بغیر پاکستان قائم نہیں رہ سکتا۔ سوشلسٹ انداز کی حکومت اس برتری کی رقیب نہیں۔ اس کے برعکس سوشلزم پوری قوم کو اسلامی قدروں کا محافظ بنا دے گی۔ تمام تر ذمہ داری کو ان مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے کر جنہیں بابائے قوم نے "ایسے خود غرض افراد کا نام دیا تھا جن پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی" ہم نظریہ پاکستان کو بیرونی اثرات کی زد میں لے آتے ہیں۔ بیرونی طاقتیں پاکستان کی پوری کی پوری آبادی کو نہیں خرید سکتیں۔ بیرونی طاقتیں صرف ایسے غرض مندانہ مفادات پر اختیار حاصل کر سکتی ہیں جن کا بیرونی سرمائے کے ساتھ کوئی مشترک مفاد ہو۔ —————— حق تو یہ ہے کہ غرض مندانہ مفادات بیرونی طاقتوں کے پروردہ ہیں۔ ایک پوشیدہ ہاتھ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کی ترقی پذیر اقوام کی صفوں میں بےرحمی کے ساتھ محو حرکت ہے۔ پاکستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ بیرونی اثرات کو مہلت دی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے اندر دور دور تک سرایت کر جائیں۔ متعدد موقعوں پر بیرونی دباؤ کے تحت بنیادی قومی مفادات پر سمجھوتہ بازی کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہئے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب عوام کو اختیار حاصل ہو۔ پوری کی پوری آبادی کو رشوت نہیں دی جا سکتی اور نہ سب کے سب بیرونی ایجنٹ ہی بن سکتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس قوم کے اسلامی نظریہ حیات کا بہترین طور پر تحفظ پاکستان کے عوام ہی کر سکتے ہیں اور اس کے ضمن میں وہ مٹھی بھر صنعت کار کچھ نہیں کر سکتے جن کی فیکٹریاں، سال بہ سال، بیرونی امداد پر چل رہی ہیں۔

معروضی طور پر مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ اگر ایسا کوئی تضاد ہوتا تو نہ مفکر پاکستان، اور نہ معمار پاکستان ہی نے، سوشلزم کی وکالت کی ہوتی۔ ان کے نظریات کی دستاویزی شہادت موجود ہے اور ان کو چھوڑ کر ان بے جڑ افراد کے پیچھے لگنا کوئی معنی نہیں رکھتا جنہوں نے اس حکومت کی آڑ میں اشتہے پرپرزے نکالے کہ بابائے قوم کی تردید کرنے چل دیئے۔

پاکستان کی تمام حکومتوں کی جانب سے ہونے والے اتحاد کی اپیل کو ایک ایک کر کے رد کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ نوبت آ گئی ہے کہ موجودہ حکومت ایسی سازشیں کھود نکالنے لگی ہے جو قومی اتحاد کی جڑ کاٹ رہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے جب کہ پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں برصغیر کے مسلمانوں نے متحدہ طور پر حصہ لیا تھا؟ پاکستان کے قیام کے وقت پاکستان کا اتحاد دوسرے ملکوں کے لئے باعث رشک تھا۔ یہ شاندار اتحاد کیوں ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے؟ اسلامی بھائی چارا جو ہمارے اتحاد کی بنیاد فراہم کرتا ہے کیوں خطرے میں ہے؟ ہمارا شیرازہ اس لئے بکھر رہا ہے کہ موجودہ نظام میں عوام پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ ان کے حقوق منسوخ کر دیئے گئے ہیں اور ان کے مقدر کو متاثر کرنے والے مسائل پر ان کی رائے نہیں لی جاتی۔ عوام اور حکومت کے درمیان خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

www.bhutto.org

عوام کی بے دردانہ لوٹ کھسوٹ قومی اتحاد کو کمزور کر رہی ہے اور ملک بھر میں شدید تناؤ پیدا کر رہی ہے۔ پاکستان کے اتحاد کو محض پندونصائح سے یا صدارتی احکام سے قائم نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ ان سب اور بہت سی دیگر متعلقہ وجوہ کی بنا پر لوگوں کے درمیان اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں۔ حالت بسرعت بدتر ہوتی جا رہی ہے' لیکن مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تعلقات ایک نازک موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔ فروری کے آخری ہفتے میں بنگال کے ایک مرکزی وزیر نے اس پریشان کن صورت حال کا تجزیہ کیا تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس نے ساری بے چینی کی وجہ یہ بتائی کہ ناکارہ درسی کتابوں کا استعمال نوجوان نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ شاید وزیر موصوف کی نظر میں پاکستان ایک عارضی مظہر ہے۔ اس لئے انہوں نے نوجوانوں کے لئے لئے کہ وہ اس نسل کے مصائب کو بھول گئے ہیں جس نے انگریزوں اور کانگریس کے ہاتھوں دکھ جھیلے تھے۔ وزیر موصوف کو علم ہونا چاہئے تھا کہ کشیدگی کی وجوہ کہیں زیادہ گہری ہیں اور اس میں تو شک ہی نہیں کہ ناکارہ درسی کتابوں کا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ ہی ہمارے عوام کے کمزور حافظے کا۔ نظریات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور نظریۂ پاکستان جو انصاف اور مساوات پر مبنی ہے کوئی عارضی عنصر نہیں جو صرف ان لوگوں کے حافظے میں محفوظ رہے' جنہیں بیرونی راج کے تحت دن گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔

جب آزادی کی روح کی جگہ غلامی کی کوئی نئی قسم مسلط ہو جائے تو گزشتہ قربانیوں کی یاد کے ساتھ ساتھ اور بہت کچھ بھی محو ہو جاتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں جو حالات کارفرما ہیں وہ اصلاح کا تقاضا کر رہے ہیں اور مشرقی بازو میں یہ تقاضا سب سے شدید ہے۔

پاکستان ایک قوم' ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ جغرافیائی تقسیم قوم کو تقسیم نہیں کرتی۔ اس کا کوئی ایک حصہ دوسرے حصے پر فوقیت نہیں رکھتا کیونکہ سب برابر ہیں۔ پاکستان ایک سالم سانچے میں، ایک ہی وقت میں ڈھالا گیا تھا۔ پاکستان کے کسی جغرافیائی حصے کو یہ حق نہیں کہ دوسرے سے بالا بالا اپنے لئے پاکستان کا نام اختیار کرلے۔ دونوں بازوؤں کے لوگوں نے آزادی کی خاطر' پاکستان کی خاطر' یکساں قربانیاں دیں اور مصیبتیں سہی ہیں۔ اگر مغربی پاکستان کو ریڈ کلف کے غیر منصفانہ فیصلے کے ذریعے وسیع علاقوں سے محروم کر دیا گیا تو اسی طرح مشرقی پاکستان کو بھی اس کے علاقوں سے محروم کیا گیا ہے۔ دونوں بازوؤں کے بنیادی مفادات مشترک ہیں اور اگر تمام حصوں میں جمہوری مساوات نافذ ہو تو اتحاد بحال ہو جائے گا۔

پاکستان کا اتحاد اس وقت بروئے عمل آئے گا جب عوام کو ان کے سیاسی حقوق' جن میں اقتصادی مساوات بھی شامل ہے' دے دیئے جائیں گے۔ لوٹ کھسوٹ جتنی زیادہ ہوگی قومی اتحاد اتنا ہی محال ہوتا چلا جائے گا۔ جتنی جلدی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو گا اتنی جلدی اتحاد کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ پاکستان کے وہ شاندار عوام' جن کی پشت پر ایک بھرپور اور قابل فخر تاریخی ورثہ ہے، ماضی کی طرح دوبارہ متحد ہو جائیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ان کے حقوق بحال کر دیئے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نہایت عزم کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ :

www.bhutto.org

اسلام ہمارا دین ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

طاقت کے مالک عوام ہیں۔

یہ چار ستون پاکستان کی عمارت کو مضبوط اور محفوظ بنا دیں گے۔ جب یہ اصول نافذ ہوں گے تو تمام قسم کی اندرونی اور بیرونی تخریبی کارروائیاں رک جائیں گی۔ ان اصولوں کے پرچم تلے پاکستان برصغیر کے مسلمانوں سے کئے ہوئے عہد کو ایفا کرے گا اور جموں اور کشمیر کے عوام کو بھارت کے چنگل سے آزاد کرائے گا۔

خارجہ پالیسی

پاکستان کی خارجہ پالیسی کئی طوفانوں سے گزری ہے۔ اس کی بنیاد کئی واہموں پر رکھی گئی ہے۔ ہم نے موقع دیا ہے کہ زمانے کے حالات پاکستان کو پیچھے چھوڑ جائیں۔ ایسے مواقع اکثر آئے ہیں کہ ہم بودی دلیلوں سے دیوانہ وار چمٹے رہے اور مستحکم دلیلوں کو سرسری طور پر ٹالتے رہے۔ ہم نے یکے بعد دیگرے کتنی ہی مایوسیاں سہی ہیں اور کتنی ہی ناکامیوں کا منہ دیکھا ہے۔ ہم ایک انتہا سے دوسری انتہا کی جانب لڑھکتے رہے ہیں' سرکشی سے اطاعت گزاری تک' غرور و تکبر سے عجز و انکسار تک' تیزی اور طراری سے سستی اور جمود تک پاکستان کی خارجہ پالیسی نامرادی اور مایوسی کا شکار ہوتی رہی ہے۔ اس عمل کے دوران دو جنگیں بھی لڑی گئی ہیں جن سے کوئی قومی مقصد حاصل نہیں کیا جا سکا بلکہ تنازعات کے حل کی بجائے ایسے معاہدے کر لئے گئے ہیں جو قومی مقاصد کے برعکس ہیں۔ اس طرح نہ تو اقتصادی خود کفالت وجود میں آئی ہے اور نہ ملکی تحفظ کی ضمانت ملی ہے۔

آزادی کی ابتدائی ہلچل میں جب ہماری قیادت نے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے تک کے نو آبادیاتی تسلط کی محرومیوں کے بعد خارجہ تعلقات کی اقلیم میں قدم رکھا تو ہم سے بہت سی حماقتیں سرزد ہوئیں۔ سب سے پہلے تو برطانیہ اور دولت مشترکہ کو بنیادی اور اساسی اہمیت کا حامل گردانا گیا اور یہ اندازہ نہ کیا گیا کہ برطانیہ کے اقتدار کو گہن لگ چکا ہے اور دولت مشترکہ دراصل برطانیہ کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کی آڑ ہے۔ جب ہماری قیادت پر یہ حقیقت کھلی کہ طاقت کی بساط بدل چکی ہے تو ہم نے یکدم رخ موڑا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جانب ہو لئے اور جھٹ پٹ اس کے دامن سے بندھ گئے۔ اس ساحل پر لنگر انداز ہو کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہمیں یقین تھا کہ اس عظیم طاقت کے دست قدرت کے محض ایک لمس سے ہمارے سب مسائل دیکھتے ہی دیکھتے حل ہو جائیں گے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ خارجہ تعلقات کی تمام پیچیدگیوں کو نظر انداز کر کے ایک سال خوردہ سیاست دان نے' بے موقع محل' اسلامستان کی تان اڑائی اور یوں عرب اقوام' انڈونیشیا' ترکی اور ایران کے ذہنوں

میں غیر ضروری غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ ایک طرف تو اسلامستان کی تبلیغ کی جا رہی تھی اور دوسری طرف پاکستان کا وزیر اعظم مسلم اتحاد کو نظر تحقیر سے دیکھ رہا تھا جو اس کے خیال میں صفر کو صفر میں جمع کرنے سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ ستم بالائے ستم، پاکستان ایسے فوجی معاہدوں میں شامل ہو گیا جو عرب ریاستوں اور دوسرے اہم غیر جانبدار ممالک کی نظر میں کھٹکتے تھے۔ ان معاہدوں میں شامل ہو کر پاکستان کو اپنے خود مختارانہ حقوق کا کچھ حصہ اپنے ہاتھ سے دینا پڑا اور اس نے مسلمان اقوام کو خصوصاً اور تیسری دنیا کو عموماً اپنے سے دور کر لیا۔ اس سے سوویت یونین اور عوامی جمہوریہ چین جیسے دو طاقتور ملک جو ہماری شمالی سرحدوں پر بیٹھے تھے بپھر گئے۔

جس حکومت کی خارجہ پالیسی نے 1959ء میں بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کو قابل قبول سمجھا تھا اس نے 1965ء میں اس ملک کے ساتھ اپنے آپ کو برسر جنگ پایا۔ ایک وقت تھا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی نے امریکہ کو اپنے علاقے پر اختیارات دیتے ہوئے کوئی باک محسوس نہ کیا تھا اور دوسری بڑی طاقتوں کے سلسلے میں اشتعال انگیز رویہ اختیار کر رکھا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے جغرافیائی محل وقوع کی ایک زبردست دریافت ہوئی کہ اس نے بڑی بڑی ہمسایہ طاقتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ایران کے ساتھ بھائی چارے کا بہت تذکرہ رہا ہے لیکن اس کے باوجود خلیج فارس کے نام کو قبول کرنے کے سلسلے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس سے یہ صدیوں سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ افغانستان کے ساتھ تعلقات منقطع ہو گئے تھے لیکن بعد ازاں افغانستان کو جگری بھائی کہہ کر پکارا گیا۔ ایسی پالیسی اختیار کر کے جس میں چونکا دینے والے تضادات کی بھرمار ہے، پاکستان کو ایسے مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں وہ بے یار و مددگار کھڑا ہے۔

امریکہ کے ساتھ "عظیم اتحاد" کے دوران پاکستان کا موقف کچھ اور تھا اور امریکہ کا موقف کچھ اور۔ امریکہ بھارت کو نہیں، کمیونسٹ ملکوں کو گھیرے میں لینا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان کا خیال تھا کہ یہ اتحاد بھارت کے خلاف ایک زبردست ڈھال ثابت ہو گا لیکن یہ خیال ایک واہمہ تھا، جسے 1965ء کی جنگ نے بری طرح بے نقاب کر دیا۔

جب ملٹری سائنس کی وہ حیرت افروز پیش قدمیاں جاری تھیں جنھوں نے سپوتنک کو خلا کی تسخیر پر روانہ کر دیا۔ ایٹمی خطرے میں توازن کی راہ ابھاری اور اسی نوعیت کے دیگر انقلاب آفریں حالات کو جنم دیا، جن کے باعث ہر قوم نے اپنی بنیادی پالیسیوں پر نظر ثانی کی، تو پاکستان خواب خرگوش میں مدہوش رہا۔ دوسری قوموں نے تو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ مطابقت کرنے کی تدبیر کی، لیکن پاکستان امریکہ کے کندھے سے لگا سوتا رہا۔ جان فاسٹر ڈلس کا عہد اس کی موت سے پہلے ہی اپنی موت مرنے لگا تھا لیکن پاکستان حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے بجائے امریکہ کے لئے آغوش محبت وا کئے بیٹھا رہا اور جفا کار محبوب کے فراق میں آہیں بھرتا رہا۔ پاکستان نے جس اوکھلی میں سر دیا تھا، آج تک اس سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

www.bhutto.org

بیرونی مطالبات کو لگام دینے کا شاید ہی کوئی سامان کیا گیا ہو۔ اس اقتصادی یا دیگر نوعیت کی امداد کا کیا فائدہ جس کی خاطر پاکستان کی خود مختاری کو داؤ پر لگانا پڑے۔ جو لوگ امریکہ کے اس دباؤ کے آگے دیوار بنے کھڑے تھے کہ پاکستان بھارت کا تابع فرمان بن جائے اور جموں اور کشمیر کے بارے میں اپنا جائز موقف ترک کر دے ان پر یہ الزام دھرا گیا کہ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات میں پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں وقت ثابت کر دیگا کہ اطاعت گزاری کی یہ پالیسی قوم کو ایک ایسے مقام پر پہنچا سکتی ہے، جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ متوازن تعلقات استوار کرنے کی راہ یہ نہیں کہ کسی ایک طاقت کا دُم چھلا بن جائیں۔ اس کی راہ یہ ہے کہ کسی کا بھی دُم چھلا نہ بنا جائے۔

حکومت یہ یقین دلاتی رہتی ہے کہ وہ کسی ایک بڑی طاقت کی حمایت میں ایسا کوئی اقدام نہیں کرے گی جس سے دوسری بڑی طاقتوں کے مفادات پر زد پڑے۔ لیکن پھر بھی وہ سیٹو اور سنٹو میں شامل چلی آتی ہے۔ ایک بڑی طاقت کو اپنے علاقے پر ایسی مراعات دے کر حکومت کھلے دوغلے پن کا شکار ہو رہی ہے جنہیں دوسری طاقتیں اپنے خلاف دشمنی تصور کرتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ امریکہ نے ہماری فوجی امداد بند کر دی ہے ہماری حکومت ان مراعات سے دست کش نہیں ہوئی۔ اس طرح پاکستان ایک بیکار کی ذمہ داری کے بوجھ تلے پس رہا ہے، جس کے باعث جنگ کی صورت میں ملک کی اینٹ سے اینٹ بج سکتی ہے۔ یہ بہت مہیب خطرات ہیں۔

پاکستان امریکہ کا کھلم کھلا حواری چلا آتا ہے، لیکن پھر بھی حکومت تینوں بڑی طاقتوں کے ساتھ ایک عجیب قسم کی غیر جانب داری کا دعویٰ کرتی رہتی ہے۔ ہم دو جہتی تعلقات کا اعلان بھی کرتے رہتے ہیں اور ایک انتہائی قسم کی ہمہ جہتی کا روپ بھی دھارے رکھتے ہیں چین بھارت تنازع نے ملک کے جغرافیائی محل وقوع کے بارے میں ہمارے حکمرانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ آخر کار انہوں نے یہ صداقت دریافت کر لی ہے کہ خارجہ پالیسی کے لئے لازمی ہے کہ جغرافیائی حقائق کو پیش نظر رکھے اور پاکستان کو حتی الامکان اپنے زیادہ سے زیادہ ہمسایہ ممالک کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ خاص طور پر جبکہ ایک ہمسایہ ملک کے ساتھ اس کا ایک گہرا تنازع چل رہا ہے۔ لیکن دس پندرہ سال تک پاکستان کے تعلقات بھارت کے علاوہ عوامی جمہوریہ چین، سوویت روس اور افغانستان کے ساتھ بھی کشیدہ رہے ہیں۔ چند روز پہلے تک برما کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات استوار نہ تھے اور نہ ہی نیپال سے ہمارا کوئی رابطہ تھا۔ وہ ملک جسے یکا یک جغرافیائی تقاضوں کا ہوش آیا کل تک اپنے تمام علاقائی ہمسایوں کے ساتھ، جن میں دو عظیم طاقتیں بھی شامل ہیں، کسی طرح کے روابط سے محروم تھا یا اگر روابط موجود تھے تو ان میں جان نہ تھی۔

عوامی جمہوریہ چین اور سوویت روس کے ساتھ پاکستان کا کوئی تنازع نہ تھا اس کے باوجود ہم عوامی جمہوریہ چین اور سوویت روس کو برانگیختہ کرنے میں بیٹوں کے امریکی حواریوں سے، جن میں برطانیہ اور جرمنی بھی شامل ہیں، بازی لے گئے۔ بھارت جو نہرو کے دور میں واقعی غیر جانب دار تھا، اسے جانبدار

www.bhutto.org

پاکستان کے مقابلے میں اگر زیادہ نہیں تو اتنی ہی اقتصادی امداد اور خوراک کی رسد ملتی رہی۔

امریکہ کے ساتھ مکمل وابستگی کی پاکستانی پالیسی بڑی حد تک اس بات کی ذمہ دار ہے کہ سوویت روس نے بھارت کو ہم پر مسلسل ترجیح دی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ حق خود ارادیت کا اصول اور بھارت کے وعدے نظرانداز ہوتے تھے۔ سوویت روس جموں و کشمیر کے بارے میں بھارت کے ناقابل قبول موقف کی حمایت کرتا رہا۔ چین بھارت تنازع کے بعد، جب پاکستان اور چین کے روابط میں اضافہ ہوا تو اس وقت کہیں جا کر پاکستان کے بارے میں روس کے رویئے میں بہتری کی چھوٹی موٹی نشانیاں نظر آنے لگیں۔

اب جب سے پاک چین تعلقات میں جمود آیا ہے سوویت روس کو اپنی روایتی پالیسی کی جانب لوٹنے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا اور اس نے چین کی جانب سے کسی ردعمل کے خوف کے بغیر بھارت کی فوجی امداد بحال کر دی ہے۔ مقبوضہ پریس میں بھارت کے جنگی ساز و سامان میں اضافہ کرنے کے روسی فیصلے پر بہت شور و غوغا مچا رہا ہے۔ وزارت خارجہ کے جمہ دان ترجمان نے بھی تاسف اور تعجب کا اظہار کیا ہے۔ اس کے اور ان سب کے بقول جو اس نوحہ گری میں شامل تھے روسی امداد نے برصغیر میں طاقت کے توازن کو مزید بگاڑ دیا ہے اور روح تاشقند کو مجروح کر دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت کی فوجی طاقت میں اضافے سے پاکستان کا تحفظ اور بھی خطرے میں پڑتا جا رہا ہے۔ اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ پریشانی بلکہ مایوسی کا مقام تو ہے، تعجب کی بات ہرگز نہیں۔ وزارت خارجہ کو اس لئے تعجب ہوا ہے کہ اب اس نے حالات کا صحیح صحیح اندازہ کرنا ترک کر دیا ہے۔ اعلان تاشقند کے دو فریق تھے غیر جانبدار بھارت اور جانبدار پاکستان جس کی فوجی امداد امریکہ نے منقطع کر دی ہے اور جس کی سیاسی تائید سے چین نے ایک حد تک ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

بھارت کے ساتھ سوویت روس کا ترجیحی سلوک بدستور جاری ہے۔ اس ملک کے ساتھ اس کے تعلقات کے فروغ کی ہر وجہ موجود ہے۔ امریکہ پر زبردست انحصار کے باوجود بھارت نے آج تک اسے اپنے علاقے پر حقوق دینے کی رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اس کے برعکس اپنے قیام کے وقت سے لے کر دس سال تک پاکستان نے روس کے ساتھ اپنے تعلقات کے بھونڈے ریکارڈ کو بہتر بنانے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا تھا۔ میں نے 1961ء میں روس کے ساتھ تیل کا جو معاہدہ کیا تھا اس کے سوا ایک بھی ایسا ناقابل ذکر آزادانہ اور بروقت قدم نہ اٹھایا گیا جو ہنگامی تقاضوں کے بجائے مستقل بنیادوں پر ہمارے شمالی ہمسایوں کے ساتھ بہتر افہام و تفہیم کی راہیں کھولتا۔ اگرچہ پچھلے چار سالوں میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں لیکن پاکستان سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ اپنے مخلصانہ عزائم کے ادنیٰ سے اظہار کے طور پر کمیشن برائے کوریا کی رکنیت ہی ترک کر دی ہوتی۔

سوویت روس نے پاکستان کی جانب دوستی کا جو برا بھلا ہاتھ بڑھایا وہ پاکستان کے ان نیم دلانہ اور بعد از وقت اقدامات کے جواب میں نہیں تھا جو حالات سے مجبور ہو کر اس نے کیے تھے بلکہ وہ زیادہ تر پاکستان کے

www.bhutto.org

ساتھ چین کے بڑھتے ہوئے تعلقات کا نتیجہ تھا یا در کھنے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ روس نے پاکستان سے قریب آنے کے ضمن میں جو اقدامات کئے اور ان میں "تاشقند" سب سے اہم ہے' وہ بھارت کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے نہیں تھے بلکہ پاکستان میں چین کے اثر کو توڑنے کے لئے تھے۔

سوویت روس نے بھارت کی فوجی امداد بحال کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ آج پاکستان کس خطرناک حد تک بے یار و مددگار ہو چکا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ صدر نے پچھلے دنوں اس ملک کا جو دورہ کیا تھا اور جس پر مقبوضہ پریس نے خوب خوب داد کے ڈونگرے برسائے تھے' دراصل ناکام ثابت ہوا تھا۔ اس دورے میں ہماری پوزیشن کمزور تھی۔ سوویت یونین کی بالائی قیادت کی جانب سے کسی جوابی "تشریف آوری" کے بغیر پاکستان کا سربراہ مملکت دو سال کے اندر اندر تین مرتبہ سوویت روس گیا۔ صدر پاکستان فوجی امداد لینے کے لئے خود ماسکو گئے اور اس کے جواب میں سوویت روس کا وزیر اعظم بھارت کو فوجی امداد کی نوید سنانے جنوری 1968ء میں بنفس نفیس نئی دہلی پہنچا۔ یہ اس لئے ہوا کہ صدر پاکستان نے سوویت روس کا رخ اس وقت کیا جب امریکہ پاکستان کی فوجی امداد بند کر چکا تھا۔ وہ اس وقت روس پہنچے جب چین کے ساتھ تعلقات میں کوئی سکت نہ رہی تھی۔ ان حالات میں کسی فائدے کو توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ کوئی فائدہ حاصل بھی نہیں ہوا۔

یہ ناممکن ہے کہ انسان ایک ہی وقت میں اظہار پسندیدگی بھی کرے اور لعنت ملامت بھی کرے۔

بھارت کو ملنے والی روسی امداد کے خلاف احتجاج کی جھنجھناہٹ ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ روس کے وزیر برائے بیرونی تجارت کا پاکستان میں نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ پاکستان کے مفاد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو روس کے وزیر برائے بیرونی تجارت کی آمد سراسر بے موقع تھی اور اس کی کوئی تک نہ تھی۔

بھاری سامان جنگ کے مقابلے میں عام تجارتی سامان کے حصول پر رضامندی' آنے والے دنوں کی کوئی اچھی تصویر پیش نہیں کرتی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان کو زک پہنچانا کتنا آسان ہے اور اسے منالینا کتنی معمولی بات۔ اس دورے نے پاکستان کے احتجاجات کے کھوکھلے پن کا پول کھول دیا۔ ذرا سی بھی وقت کے بغیر' سوویت روس ایک معمولی سے دورے کے ذریعے بھارت کو دی جانے والی بھاری فوجی امداد کا نقش ہمارے ذہن سے مٹانے اور پاکستان کو انتہائی معمولی تجارتی سامان دے کر مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان حالات میں صرف ایک قابل قبول راہ عمل تھی کہ روسی حکومت سے کہا جاتا کہ وہ اپنے وزیر کی آمد کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دے جب تک فضا کچھ سازگار نہیں ہو جاتی یہ ایک غیرت مندانہ موقف تھا اور سوویت روس کو اس سے کچھ سبق حاصل ہوتا۔ اس سے ہمارے احتجاج کو وقعت نصیب ہو جاتی جہاں بیس سال سے سٹیل مل نہیں لگی وہاں چند مہینے اور نہ لگتی تو کوئی آسمان نہ ڈھے جاتا۔

پاکستانی حکومت کے عزم کی کمزوری کا اندازہ لگا کر اور یہ تسلی کر کے کہ پاکستان بھارت کو ملنے والی فوجی امداد کی بحالی کا صدمہ سہہ گیا ہے' روسی وزیر اعظم نے یکایک اپریل کے وسط میں وہ دعوت قبول

کرنے کا فیصلہ کر لیا جسے پچھلے دو سال میں بار بار دہرایا گیا تھا۔ صدر کی بیماری کے باوجود جس کے باعث وہ دو ماہ سے زیادہ عرصے تک صاحب فراش رہے تھے' صدر اور روسی وزیر اعظم کے درمیان عالمی صورت حال خصوصاً پاک روس تعلقات اور پاک بھارت امور پر راولپنڈی میں طویل مذاکرات ہوئے۔ اسلام آباد میں جو مصیبت زدہ کشمیر کی سرحد سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے ، ایک ٹیلیویژن انٹرویو کے دوران مسٹر کوسیگن نے فرمایا کہ دنیا میں صرف تین ایسے بین الاقوامی مسائل ہیں جو توجہ کے مستحق ہیں۔ جرمنی' مشرق وسطیٰ اور ویت نام۔ فوجی میدان کو چھوڑ کر باقی شعبوں میں اشتراک عمل کے روشن امکانات کا ذکر کیا گیا اور اقتصادی اور ثقافتی تعاون کو وسعت دینے کے معاہدے پر گہرے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ فوجی تعاون کے سلسلے میں چپ ہو رہنا بہت سنجیدہ معاملہ تھا۔ لیکن پھر بھی یہ چپ اس قدر گھناؤنی نہ تھی' جس قدر اس دورے کا وہ سیاسی نتیجہ جس نے روس کے اس عزم کو بے نقاب کر دیا کہ اب اس نے پاک بھارت تعلقات کے بارے میں اپنے جانے پہچانے موقف کو لباس عمل پہنانے کی ٹھان لی ہے۔

ٹیلی وژن انٹرویو کا یہی مفہوم تھا اور مسٹر کوسیگن کے تمام دوسرے اہم بیانات کا یہی پیغام تھا۔ پاکستان نے اس مفہوم اور پیغام کو سمجھنے میں ایسا کمال دکھایا کہ روسی وزیر اعظم نے کسی پیشگی پروگرام کے بغیر نئی دہلی کا عزم سفر کر لیا تاکہ بھارت کو کھلے بندوں تسلی دیں کہ اب پاکستان اس کے ساتھ باہمی تنازعات کو یکے بعد دیگرے حل کرنے کا ایک نیا باب کھولنے کو تیار ہے۔ اپنے خلوص کے ثبوت کے طور پر روسی وزیر اعظم کی پاکستان سے روانگی کے دو چار دن بعد ہی قلمدان وزارت ایک نئے وزیر خارجہ کو سونپ دیا گیا تاکہ صلح صفائی کی پالیسی کو عملی جامہ پہنائے۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلا واقعہ ہے کہ سول سروس کے کسی رکن کو اس اعلیٰ سیاسی عہدے کے لئے منتخب کیا گیا ہو تاکہ سرکاری پالیسی کو غلط سیاسی نتائج کے خوف سے بے نیاز ہو کر میں لایا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک موڑ پر آپہنچے ہیں۔ کچھ کچھ وہ فضا پیدا ہو رہی ہے جب مارشل لاء کے شروع شروع کے دنوں میں اپریل 1959ء کے دوران صدر ایوب خاں نے برسراقتدار آنے کے چھ ماہ کے اندر اندر' بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی تھی۔ اس وقت مسٹر منظور قادر صدر ایوب خاں کے وزیر خارجہ تھے جو نئے وزیر خارجہ کے برادر نسبتی ہیں اور جن کا بھارت کی جانب جھکاؤ جانا پہچانا تھا۔ اگر مسٹر نہرو نے مشترکہ دفاع کی سکیم کو جس کا داعی امریکہ تھا، ردّ نہ کر دیا ہوتا تو برصغیر کی تقسیم پر پانی پھر گیا ہوتا۔ مگر گزشتہ سالوں کے دوران ویسے بہت سے واقعات رونما ہو چکے ہیں جن کے باعث عین ممکن ہے کہ نئے وزیر خارجہ وہ منزل سر کر لیں جو مسٹر منظور قادر سے سر نہ ہو سکی تھی۔ اس رُوح مصالحت کی بحالی میں اب چین بھارت اختلافات تازیانہ ثابت ہوں گے اور اس مشترکہ موقف سے تائید ملے گی جو برصغیر میں امریکہ اور روس کے مفادات کا سنگم ہے۔

پچھلے دو سال میں حکومت نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کا مجموعی نتیجہ یہ مرتب ہوا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات میں کمی واقع ہو گئی ہے ہمارے باہمی تعلقات کے جوش و خروش میں جو

www.bhutto.org

تبدیلی رونما ہوئی ہے وہ آزاد مبصروں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ بظاہر چین کے ساتھ ہمارے تعلقات ختم نہیں ہوئے۔ دیکھنے میں یہ تعلقات خاصے پُرتپاک ہیں۔ ڈپلومیسی کے یہی آداب ہیں۔ خارجہ پالیسی میں تبدیلی عموماً دبے پاؤں آیا کرتی ہے گلاب کی کلی کی مانند یہ دھیرے دھیرے گُلِ سربز بنتی ہے۔ اگر تبدیلی کی کوئی نشان رو موجود نہ ہوتی تو لنڈن سے ملائیشیائی وزیر اعظم کی اس تجویز کی خبر نہ آتی ہوتی کہ ایک نیا خلافِ چین دفاعی معاہدہ ہونا چاہئے جس میں سنگاپور 'انڈونیشیا' تھائی لینڈ 'فلپائن' برما' لنکا' بھارت اور پاکستان شامل ہوں۔ یہ خبر گیارہ فروری 1968ء کے روزنامہ ڈان میں شائع ہوئی تھی۔ یہ جھوٹی ہے یا سچی بہرحال اس انداز کی تجویز ملائشیا کے وزیر اعظم کے ذہن میں ان دنوں ہرگز نہ آپاتی، جب پاکستان اور چین میں گاڑھی چھنتی تھی اور ستمبر 1965ء میں چین نے بھارت کو الٹی میٹم دیا تھا کے ذہن میں اس طرح کی تجویزیں اسی لئے آرہی ہیں کہ دوسروں کی طرح اس نے بھی فرق کو بھانپ لیا ہے۔ گویا تبدیلی واقع ہو چکی ہے خواہ زبانی طور پر کتنی ہی شدومد سے تردید ہوتی رہے، حالات وہ نہیں جو ہوا کرتے تھے اور یہ بات ہمارے لئے اچھی نہیں۔

یہ بات اس لئے بری ہے کہ بھارت کو روسی امداد ملے یا نہ ملے برصغیر میں مقدار کے اعتبار سے فوجی عدم توازن ہمیشہ موجود رہے گا۔ یہ عدم توازن کم و بیش تو ہو سکتا ہے لیکن دونوں ملکوں کے وسائل میں گہرے فرق کے باعث قائم و دائم رہے گا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدے کئے تھے۔ پاکستان اس بھروسے پر ان میں پھنس گیا تھا کہ بھارت کے خلاف کسی حد تک دفاع کرنے کے لئے اسے امریکی جنگی سامان مل جائے گا۔ عدم توازن کو کم کرنے کے لئے ایک چور دروازہ ڈھونڈ لیا گیا تھا تاکہ کچھ ہتھیار مل جائیں لیکن امریکہ اب پاکستان کو بھارت کے خلاف مدافعت کے لئے ہتھیار نہیں دے گا نہ سوویت یونین ہی پاکستان کو بھارت کے خلاف دفاع کے لئے ہتھیار مہیا کرے گا۔

پاکستان نے بھارت کے سلسلے میں اپنے رویے میں خصوصاً کشمیر کے متعلق تبدیلی کی جو یقین دہانی کی ہے اس پر خوشنودی کے اظہار کے طور پر ممکن ہے کہ سوویت روس آئندہ پاکستان کو کچھ فوجی امداد بھی دے دے جو بھارت کو ملنے والی امداد کی گرد کو بھی نہ پہنچے گی۔ پاکستان کو یہ امداد بھارت کے خلاف اپنا تحفظ کرنے کے لئے نہیں' بلکہ سیاسی وجوہ کی بناء پر دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ بعض شرائط عائد کر کے امریکہ بھی فوجی امداد بحال کر دے۔ برصغیر کی بدلی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر برصغیر میں اپنے مقاصد کو کوئی گزند پہنچائے بغیر' امریکہ پاکستان کو فوجی امداد مہیا کر سکتا ہے۔

لیکن نہ تو روس اور نہ ہی امریکہ اس بات کی اجازت دے گا کہ فوجی عدم توازن میں کوئی کمی آجائے۔ عوامی جمہوریہ چین وہ واحد ملک ہے جسے پاکستان کی اصل ضروریات سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں اس ملک کے مفادات پاکستان کے مفادات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ خالصتاً مشترکہ مفادات کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم اپنے اردگرد دیکھیں تو وہ واحد عظیم طاقت جس کے مقصدی

www.bhutto.org

مفادات پاکستان سے موافقت رکھتے ہیں اور واحد ملک جو پاکستان کی مدد کرنے کے قابل ہے 'عوامی جمہوریہ چین ہے۔

عوامی جمہوریہ چین ہے۔ صرف یہ ملک اس قابل ہے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان فوجی عدم توازن کو کم کر سکے۔ خواہ وہ پاکستان کو ہتھیار دے کر ایسا کرے' سیاسی ذرائع سے کرے' یا دونوں طرح سے وہ بھارت اور پاکستان کا بالکل قریبی ہمسایہ ہے اور بھارت کے ساتھ اس کا سرحدی تنازع ہے جسے پاکستان نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پاکستان کو بھارت سے نپٹنے کے لئے کسی نہ کسی تائید کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ حکومت کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند' واقعہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں چین ہی ایسی تائید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر یہ تائید باقی نہ رہے تو پاکستان تینوں بڑی طاقتوں کے ساتھ ساتھ بھارت کے رحم و کرم پر ہو گا۔ اس ایشیے کو حال ہی کی بہت سی اہم تبدیلیاں مزید گہرا کر دیں گی' جو اس بات کی غماز ہیں کہ چین اپنی خلوت گزینی کو توڑنے ہی والا ہے۔ ویت نام کی جنگ میں پانسہ پلٹنے کے ساتھ ساتھ امریکہ میں چین کے متعلق رویہ بدلتا جا رہا ہے۔ نائب صدر ہمفری نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز ہی اس خواہش سے کیا ہے کہ وہ امریکہ اور چین کے درمیان امن کے پل تعمیر کریں گے۔ گورنر راک فیلر نے بھی صدارتی انتخاب کی مہم میں کودتے ہوئے ان سے ملتے جلتے احساسات کا اظہار کیا تھا۔

موجودہ حکومت کے لئے نہایت مناسب ہو گا کہ فوری نوعیت کی اغراض کے علی الرغم' عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ وہ تعلقات بحال کرنے کے لئے باقاعدہ اقدامات کرے جو 1962ء کے چین بھارت تنازع کے بعد پیدا ہوئے تھے اور 1965ء کے پاک بھارت معرکے کے دوران عروج پر پہنچے تھے۔ چین ایک ایسی عظیم طاقت ہے جس کی قوت میں دن دونا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایک ایشیائی ملک ہے اور پاکستان کا قریبی ہمسایہ۔ اگلے سال تک جب سنکیانگ گلگت روڈ مکمل ہو جائے گی تو پاکستان ایک مرتبہ پھر وسط ایشیا کے تاریخی عقب سے ہم رشتہ ہو جائے گا اور اس کی صف آرائی کی صلاحیت میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا۔ بھارت کو اس سڑک سے جو خدشات درپیش ہیں ان کا اظہار اس کی جانب سے موصول ہونے والے پُرزور احتجاجی مراسلوں اور اس بیان سے ہو سکتا ہے جو اس کے وزیر مملکت و امور خارجہ نے بھارتی پارلیمان میں دیا تھا۔ اپنی پریشانی کی نشانی کے طور پر بھارت نے اپنے تحفظ کو لاحق اس تازہ خطرے کی جانب سوویت روس کی توجہ بھی مبذول کرائی ہے۔ لازم ہے کہ ایشیا میں چین کا اثر بڑھتا چلا جائے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے مقصدی مفادات پاکستان سے ہم آہنگ ہیں اور جو پاکستان کو ہر شعبہ حیات میں روز افزوں امداد دیتا رہے گا جبکہ امریکی امداد روز بروز گھٹتی چلی جائے گی۔

وہ دن دور نہیں جب عوامی جمہوریہ چین اور امریکہ کو ایشیا کے معاملے میں ایک باعزت سمجھوتہ کر لینے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کی مثال سوویت روس اور امریکہ کے درمیان کارفرما بقائے باہمی کا بندوبست ہے۔ پاکستان کو اس دن کا انتظار کرنا چاہئے اور ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہیں کرنا چاہئے جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حکومت پاکستان کا عزم عین اس وقت جواب دے گیا۔

www.bhutto.org

جب بُرے دن ختم ہونے کو تھے' اگر وہ جی کڑا کئے رکھتی تو روس تو روس امریکہ کے ساتھ معاملت میں بھی وہ اپنے آپ کو تسلی بخش پوزیشن میں پاتی۔

پاک بھارت امور میں "مزاحمت" کی پالیسی کی جگہ "تابعداری" نے لے لی ہے، جس کو "تعاون" کے خوشنما خول میں پیش کیا جارہا ہے۔ بھارت کے ساتھ تعلقات کے مسئلے پر موجودہ حکومت اور پاکستان کے عوام کا موقف ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے اور دونوں کا انداز فکر بے حد جداگانہ ہے۔ ہر ڈوبتا سورج حکومت کی کسی نہ کسی نئی ناکامی سے پردہ اُٹھاجاتا ہے۔ جموں اور کشمیر ہو یا آسام سے مسلمانوں کا خروج' بھارت کی خدمت میں پیش ہونے والی تمام عرضداشتیں ناکام ونامراد ثابت ہوئی ہیں۔ بھارت کے حضور میں یہ حکومت جو بھی سجدۂ نیاز کرتی ہے بھارت کی طرف سے اس کا جواب پہلے سے بھی بڑی ٹھوکر کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جب سے پالیسی بدلی ہے پاک بھارت تنازعات اور بھی پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ جموں اور کشمیر میں اور آسام میں حالات پہلے سے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ بھارتی مسلمان فرقہ وارانہ فسادات کی چڑھتی ابھرتی موجوں کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم کی جانب سے پاکستان کو بُرے نتائج کی دھمکیاں دی جاتی ہیں' جس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مستقبل میں کسی وقت بھارت کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو سمیٹنے کی خاطر پاکستان کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ رن کچھ کے تنازع کا حاصل پاکستان کی مسلح افواج کی جیت اور ٹکراؤ کی پالیسی کی صداقت کا ثبوت تھا۔ اگر مسلح افواج نے رن کچھ اور کشمیر میں بھارت سے ٹکر نہ لی ہوتی تو پاکستان کو سیاسی اعتبار سے اور طاقت کے مظاہرے کے ہاتھوں منہ کی کھانی پڑتی۔

البتہ حال ہی میں اپنے بیرونی دوستوں کے مشورے پر بھارت نے پاکستان کے ساتھ کچھ متانت برتنی شروع کر دی ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ جلد ہی کسی عمومی سمجھوتے کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش ہونے والی ہے؟ پاک بھارت تعلقات میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً اس کوشش کا پہلے بھی آغاز اور انجام ہوتا رہا ہے۔ لیاقت علی خاں سے لے کر پاکستان کے ہر وزیراعظم کو اس صورت حال سے گزرنا پڑا ہے۔ دوستی اور دشمنی کی روح نے صدر ایوب خاں کے عہد حکومت میں جہاں اپنی معراج کو جا چھوا وہاں اپنی گراوٹ کی انتہا کو بھی جا پہنچی۔ اب ان کے عہد میں اس سلسلے کا دوسری مرتبہ اعادہ ہو رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے' اس راہِ عمل میں بھارت کو مہلت مل رہی ہے اور پاکستان کمزور ہو رہا ہے۔ پاکستان ایک مرتبہ پھر واہے کی جانب لپک رہا ہے جس کے باعث اسے نقصان تو بہت پہنچے گا لیکن فائدہ ذرا بھی نہ ہوگا۔ اس طرح کی ہر مشق کی ناکامی پر ہم نے دیکھا ہے کہ صحیح صورت حال کے مطابق عوام کی از سرِنو صف بندی کرنا بیش از بیش مشکل ہو جاتا ہے۔

حکومت کا یہ عزم اب آئینے کی طرح صاف ہوتا جارہا ہے کہ وہ برِصغیر میں ہر قیمت پر' یہاں تک کہ بھارت کی شرائط پر' امن چاہتی ہے۔ یہ خوف روز بہ روز ٹھوس شکل اختیار کرتا جارہا ہے۔ اس کی اصلیت کے بہت سے مظہر ہیں' تنازع کشمیر کو' جو پاک بھارت تعلقات کا مرکزی مسئلہ رہا ہے' بڑی کاریگری سے پس پشت ڈال دیا

www.bhutto.org

گیا ہے اور اب اس کی نوعیت محض رسمی ہو کر رہ گئی ہے۔ ماضی میں دستور تھا کہ بھارت نے جونہی اقوام متحدہ کی بنیادی قرار دادوں کی خلاف ورزی میں کوئی اہم قدم اٹھایا ہم اس معاملے کو سلامتی کونسل میں لے گئے۔ 1948ء سے 1965ء تک پاکستان کی ہر حکومت اس پالیسی پر سختی سے کاربند رہی جب سے معاہدہ تاشقند ہوا ہے بھارت نے جموں و کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے کتنے ہی اقدامات کئے ہیں جو اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی کھلی خلاف ورزی ہیں۔ ریاستی سروسوں کو بھارتی سروسوں کا جزو اور مہاراجہ کو بھارت کی مرکزی کابینہ کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔ بھارت کے ان اور ان جیسے دوسرے اقدامات کا تقاضا تھا کہ ہم سلامتی کونسل میں آواز اٹھاتے لیکن حکومت پاکستان نے نہایت احتیاط کے ساتھ اس سے گریز کیا ہے۔ جموں اور کشمیر پر سلامتی کونسل نے ستمبر 1965ء میں جو مشہور قرار داد منظور کی تھی اس کے تحت اقوام متحدہ پر لازم ٹھہرایا گیا تھا کہ فوجوں کی واپسی پر اس تنازع کا حل تلاش کیا جائے۔ اقوام متحدہ میں امریکی سفیر گولڈ برگ نے اس قرار داد کے تحت عائد ہونے والی ذمہ داری کے متعلق کہا تھا کہ یہ "کتاب مقدس کی طرح اٹل" ہے۔ مسلح افواج کی واپسی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ اعلان تاشقند کے بعد ہونے والی کوششیں فضول ثابت ہو چکی ہیں اور پاک بھارت تنازعات کے حل کی راہ بند ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود حکومت سلامتی کونسل کا رخ کرنے سے گریزاں ہے کہ مبادا بھارت کے ساتھ اس کے تعلقات میں کوئی روڑا اٹک جائے اور دونوں بڑی طاقتوں کو یہ بات ناگوار گزرے، کیونکہ وہ تو اس بنیادی تنازع کو کسی عمومی سمجھوتے کے نیچے دبا دینے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔

یکم جون 1968ء کو ایک بھارتی رپورٹ میں ذکر کیا گیا تھا کہ نہر سویز کی بندش کے باعث یہ ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ بھارت اور سوویت روس کے درمیان، پاکستان اور افغانستان کے علاقوں میں سے گزرتا ہوا تجارت کا ایک زمینی راستہ ہونا چاہئے۔ فطری بات ہے کہ بھارت اس تجویز پر والہانہ لبیک کہے، کیونکہ اس طرح اسے ایک واضح سیاسی فائدہ حاصل ہو گا، جو تجارتی فائدوں کی نسبت کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا ہو گی جب وہ روسی اسلحہ جس کا مقصد پاکستان کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنا ہے ہمارے "تعاون" سے ہماری سڑکوں پر سے بلا روک ٹوک گزر کر ایک براہ راست اور مختصر راستے سے بھارت پہنچنے لگے گا۔ طرح طرح کے ترغیب انگیز مال سے لدے ہوئے بھارتی قافلے جن میں فتنہ پرداز جاسوس اور انتشار پیشہ دلال شامل ہوں گے ہماری شاہراہوں پر مست خرامی کریں گے اور واہگہ سے لے کر ڈیورنڈ لائن تک کے اہم اڈوں پر سامان اتاریں گے اور رسد لیں گے۔ پاکستانی علاقے پر سے بھارت کو نقل و حمل کی سہولت دینے کا صرف یہی سنگین پہلو نہیں ہے۔ اگر پاکستان بھارت کے لئے اپنی سرحدیں علاقائی تجارت بڑھانے کی غرض سے کھول دے تو کیا بھارت بھی چینی قافلوں کو تبت اور نیپال کی درمیانی شاہراہ کے راستے ہوتے ہوئے بھارتی علاقے کے پورے طول و عرض میں سے مشرقی پاکستان برما اور لنکا تک پہنچنے کی اجازت دے گا۔ اس طرح کی تجویز اگر پھول پھل سکے تو اس سے ان تمام ممالک کے درمیان تعاون کا رشتہ پیدا ہو سکتا ہے جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، لیکن بھارت کسی صورت بھی اس کی اجازت نہیں دے گا۔

پاکستان میں سے گزرتا ہوا زمینی راستہ بھارت کو روس کی سرحدوں تک پہنچا دے گا اور اس سرزمین

www.bhutto.org

کی عسکری اہمیت گھٹا دے گا۔ اگر پاکستان ایسی تجویز کے سامنے گھٹنے ٹیک دے تو صلح پسندی کے کسی مزید ثبوت کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ اس تجویز نے نہر سویز کی بندش سے جنم نہیں پایا۔ یہ دو سال پہلے پاکستان، افغانستان اور روس کے درمیان نقل و حمل کے اجرا کے لئے پیش کی گئی تھی۔ اس وقت حکومت پاکستان نے مجوزہ انتظام سے بھارت کو مستفید ہونے کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ امید کرنی چاہئے کہ حکومت اس بنیادی موقف پر قائم رہے گی ورنہ فرخا بیراج پر جو تعطل پیدا ہو گیا ہے اور جس طرح اگرتلہ پر بھارت کے سایے پڑ رہے ہیں اور کشمیر پر اس کی گرفت سخت تر ہو رہی ہے اگر بھارت کو پاکستانی علاقے سے گزرنے کی اجازت دے دی گئی تو یہ حرکت شکست کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہو گی۔

حکومت نے خود اقرار کیا ہے کہ فرخا بیراج کے بارے میں بھارت کے ساتھ مذاکرات بیکار ثابت ہوئے ہیں اور بھارت بیراج کی تعمیر میں نہایت تیزی سے کام لے رہا ہے، کیونکہ اس کا خیال ہے کہ ایک مرتبہ بیراج بن گیا تو پھر پاکستان اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ کشمیر پر باہمی مذاکرات اور بھی بیکار ثابت ہوں گے۔ حالات کا شدید تقاضا ہے کہ حکومت فوری طور پر سلامتی کونسل کا رخ اختیار کرے اور مطالبہ کرے کہ وہ اپنے اس وقیع عہد کو ایفا کرنے کے لئے اختیار کو استعمال میں لائے جو اس نے ستمبر 1965ء کی قرارداد کی صورت میں واشگاف طور پر کیا تھا۔

سری نگر میں طلبہ کے حالیہ مظاہروں نے مشکلات کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ بھارت کے رازداں بخشی غلام محمد نے صورت حال کو ایک ایسے آتش فشاں سے تشبیہ دی ہے جو کسی لمحے بھی پھٹ سکتا ہے۔ حکومت بار بار اعلان کرتی رہتی ہے کہ وقت آنے پر مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں لے جائے گی اور یوں اسے اپنی ذمہ داریوں سے گریز کی ایک راہ مل جاتی ہے۔ اگر سلامتی کونسل کی مداخلت کا اب بھی وقت نہیں آیا تو جس وقت کا انتظار حکومت کر رہی ہے وہ کبھی نہ آئے گا۔ خاصا وقت پہلے ہی گنوایا جا چکا ہے۔ اگر مزید وقت ضائع کیا گیا تو سلامتی کونسل کو اپنی ذمہ داری سے کنارہ کش ہونے کا بہانہ ہاتھ آ جائے گا اور اس طرح حق خودارادیت پر مبنی ایک امن انگیز معاہدے کا دروازہ بالآخر بند ہو جائے گا۔

پاکستان ایک بین الاقوامی غلام بن کر رہ گیا ہے۔ حکومت کی گزشتہ پالیسیوں نے ملک کو کونے میں دھکیل دیا ہے۔ امریکہ کو اس کی حسب معمول چنداں پروا نہیں۔ ایران اور متحدہ عرب جمہوریہ اپنے مسائل کے تصفیے کے لئے ترکی اور تیونس سے رجوع کرتے ہیں اور اس پاکستان کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس نے ایران کے ایما پر ملائشیا سے سفارتی تعلقات بحال کر لئے تھے۔ سوویت روس بھی اب بھارت کو دوبارہ فوجی امداد جاری کر دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ برائس بھارتی باشندے کو جو برطانیہ کے قانون ترک وطن کی خلاف ورزی کرے برطانوی پریس میں جان بوجھ کر پاکستانی کا لقب دے دیا جاتا ہے اس کے برعکس کینیا سے برطانیہ بھاگ کر آنے والے گروہ در گروہ بھارتیوں کو محض اس لئے کینیا کے ایشیائی کہہ کر پکارا جاتا ہے کہ ذکی ایس بھارت پر الزام نہ آئے گا۔ پاک چین تعلقات کی آب اتر گئی ہے۔ اقتصادی طور پر ایک پسماندہ ملک کی حیثیت سے پاکستان کے پاس ایٹمی طاقت بننے کی بنیادی تکنیکی اہلیت نہیں اور پھر بھی وہ نفس کشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی تجاویز کا محرک بن رہا ہے جن کا مقصد اینی

www.bhutto.org

اسلحے کی روک تھام ہے اور جنہیں ایٹمی طاقتیں غیر ایٹمی ملکوں پر ٹھونسنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس جب تک ایٹمی طاقتیں ٹھوس مراعات نہ دیں بھارت ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے معاہدے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ پاکستان کے اطاعت گزارانہ رویّے کے برعکس بھارتی وزیراعظم کا قابل داد رویّہ یہ ہے کہ امریکہ اور روس کی دونوں منت سماجت کے باوجود بھارت نے تخفیف اسلحہ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وزیراعظم کوسیگن بذات خود دہلی گئے تھے کہ اس معاہدے کے سلسلے میں بھارتی حکومت کی رضامندی حاصل کریں ان کے رخصت ہونے کے اگلے ہی دن مسز گاندھی نے اعلان کر دیا کہ معاہدے کی موجودہ صورت چونکہ بھارت کے مفاد کے خلاف ہے اس لئے بھارت اس میں شرکت نہیں کرے گا خواہ اسے روس اور امریکہ سے ملنے والی امداد سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں یہ ہو گا یہ کہ بھارت تمام ممکن مراعات بھی حاصل کرے گا اور ایٹمی طاقتوں کو بالآخر ممنون احسان کرنے کا حق بھی محفوظ رکھے گا۔ پاکستان کوئی رعایت حاصل نہیں کرے گا کیونکہ اپنے آپ کو ایٹمی طاقت کے مقام سے محروم رکھ کر وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہا ہے! اس طرح پاکستان نے سودا کرنے کے تمام فائدے

پہلے ہی سے کھو دیئے ہیں اور اپنے قومی مفادات کو خاص طور پر بھارت کے انکار کو دیکھتے بھالتے، مجروح کر لیا ہے۔ آخر ایٹمی طاقتوں سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کر وہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی جو وہ غیر ایٹمی ملکوں کی قیمت پر کر گزرنے کے لئے اتنی بیتاب تھیں۔

جب بھی کشمیر پر بھارتی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے تو بھارت بحران پر قابو پانے کے لئے مذاکرات کا جال بچھاتا ہے۔ اس نے 1953ء میں یہی کچھ کیا تھا جب پاکستان کے ساتھ مذاکرات کی آڑ میں اس نے شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا تھا۔ یہی کچھ اس نے 1962ء میں چین بھارت تنازع کے دوران کیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس ہتھکنڈے پر اتر آیا ہے کیونکہ شیخ عبداللہ نے کشمیر کے مسئلے کو زندہ کر کے ایک تازہ بحران پیدا کر دیا ہے۔ شیخ عبداللہ کا کشمیر میں جس والہانہ انداز سے استقبال کیا گیا ہے اس سے بھارتی حکومت کو خاصی تشویش لاحق ہو گئی ہے اس حد تک کہ بھارتی وزیر داخلہ کی طرف سے انہیں دوبارہ گرفتار کرنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی حکومت نے پاکستان کے ساتھ تنازعات کے بارے میں بات چیت کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ جب بھی بھارت کو مصیبت پڑتی ہے وہ پاکستان کو فضول مذاکرات میں الجھا کر بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح اسے مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اپنی پوزیشن مضبوط کر لے اور معاملات کو اپنے ڈھب میں لے آئے جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو بھارت اپنا عمومی موقف اختیار کر لیتا ہے کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں بات چیت کی گنجائش ہی نہیں۔ پاکستان کو بھارت کے بچھائے ہوئے جال میں جا پھنسنے کی جو لگن لگی ہوئی ہے کشمیر میں اسے نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔ بھارتی پراپیگنڈا اسے خوب ہوا دے گا تاکہ ان عوام کے جذبات پر گھڑوں پانی ڈالا جا سکے جو جانتے ہیں کہ ماضی میں بھی کسی طرح وہ بھارت کے اسی طرح کے ہتھکنڈوں کے ہاتھوں ڈسے جا چکے ہیں جو وادیٔ کشمیر کے ہر بحران پر قابو پانے کے لئے بھارت آزماتا رہا ہے۔ ہماری اس روش سے شیخ عبداللہ بھی ضرور سبق سیکھیں گے کہ وہ بیچارے ایک طرف بھارت کی غاصبانہ پالیسی اور دوسری طرف پاکستان کی بے رخی کے دو پاٹوں میں پس رہے ہیں۔

استحکام کا افسانہ

پاکستان کے استحکام کا بہت چرچا ہے۔ استحکام تو مستقل اداروں کے وجود اور پالیسی کے تواتر سے پیدا ہوتا ہے۔ صدر کی بیماری نے واضح کر دیا ہے کہ موجودہ حکومت مستقل اداروں پر قائم نہیں۔ استحکام محض افسانہ ہے کیونکہ اس حکومت کی پالیسیوں میں تواتر کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ جیسا کہ قبل ازیں ثابت کیا جاچکا ہے داخلہ اور خارجہ دونوں پالیسیاں غلط کارانہ اور تضاد کا شکار ہیں۔ وہ پنڈولم کی ایک انتہا سے دوسری انتہا کی جانب جھولتی چلی آتی ہے۔ استحکام کا یقیناً صرف یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کوئی حکومت دس سال تک اقتدار سے چمٹی رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی حکومت کی پالیسیوں کو پھول پھل لانے کی مہلت ملے اور وہ بار بار نہ بدلے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک حکومت سے اقتدار کو باضابطہ طور پر دوسری حکومت کی جانب منتقل کرنے کے لئے ادارے موجود ہوں۔

پاکستان میں ان میں سے کوئی شرط بھی پوری نہیں ہوتی۔ صدر کی حالیہ علالت سے صورت حال میں ایک نوعی اور مقداری تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ اس نے جانشینی کا مسئلہ ابھار دیا ہے۔ دو ماہ سے زائد عرصے تک حکومت کا کاروبار سربستہ راز رہا اور خود اپنے بنائے ہوئے دستور کی خلاف ورزی کی جاتی رہی۔ صرف ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔ قومی اسمبلی کے سپیکر نے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے ایک جج کے عہدے کا حلف لیا' حالانکہ اسے ایسا کرنے کا صرف اسی صورت میں اختیار تھا کہ اسے قائمقام صدر بنا دیا جاتا۔ سپیکر کو کاروبار حکومت سے قریب رکھنے کے بجائے ایک وفد میں ملک سے باہر ارسال کر دیا گیا تاکہ اس کی موجودگی سے پھوٹنے والی پریشانی رفع کی جاسکے کیونکہ ملک میں رہتے ہوئے اس کی دستوری حیثیت نگاہ میں آتی تھی۔ دستور کی سنگین خلاف ورزی کی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ دستور اور اس سے وابستہ نظام کی زندگی اس ہستی کے دم سے قائم ہے' جس نے انہیں جنم دیا ہے۔ اندرونی تناؤ اور مہلک سازشیں پھولتے پھولتے اتنی پھولیں کہ غبارہ پھٹ جائے گا۔ فیصلے پہلے سے بھی ڈانواں ڈول ہو جائیں گے اور پالیسیاں پہلے سے بھی بے قاعدہ ہو جائیں گی۔ اقتدار کی تگ و دو فریب روز شروع ہو جائے گی اور گروہ بندی کا آغاز ہو جائے گا جس سے جانشینی کے مقابلے میں بے یقینی مزید بڑھ جائے گی' ہوا افواہوں سے مکدر ہو جائے گی۔ یوں یہ نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ پہلے بھی صورت حال تشویش ناک تھی لیکن صدر کی بیماری نے اس کی شدت میں اضافہ کر دیا ہے۔ صدر کی صحت اس لئے جواب دے گئی کیونکہ انہوں نے ناقابل برداشت بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ اپنے آپ کو جسمانی تباہی سے بچانے کے لئے انہیں اپنی بہت سی ذمہ داریوں سے دستکش ہونا پڑے گا۔ مگر نظام حکومت میں یہ گنجائش نہیں کہ طاقت کو بانٹا یا سونپا جاسکے۔ اسے صرف ایک ستون کے سہارے استوار کیا گیا ہے۔ جسے ہٹا دیا جائے تو پوری عمارت زمین پر آرہتی ہے۔ اس کے علاوہ صدر کے گرد جو لوگ ہیں ان پر یہ اعتبار

www.bhutto.org

نہیں کیا جاسکتا کہ ان پر بھاری ذمہ داریاں ڈال دی جائیں تو وہ انہیں مستعدی سے نباہ جائیں گے دستور کے دائرے میں ناممکن ہے کہ طاقت کا پھیلاؤ مؤثر ثابت ہو۔ نظام میں چونکہ لچک ہی نہیں اس لئے اگر اس کے ساتھ قابل عمل دُم چھلے لگائے جائیں تو اس کا ڈھانچا انہیں سہار نہ سکے گا۔

عوامی احساسات کے دباؤ تلے اگر اس موقع پر کچھ ترمیمیں کی بھی گئیں تو ان سے صرف حکومت کی اعصابیت کی غمازی ہوگی' صورت حال سدھرنے کا کوئی امکان نہیں نائب صدر کا عہدہ تخلیق کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ صدر کے ساتھ ایک مشیر اعلیٰ منسلک کر دیا جائے۔ دستور میں پہلے ہی دو مشیروں کی گنجائش موجود ہے۔ ان میں سے جو نشست بنگال کے لئے مختص تھی وہ ہمیشہ خالی رہی ہے۔ البتہ دوسری

مختصر سے عرصے کے لئے دستور کے نفاذ کے وقت پُر کی گئی تھی یا پھر اب پُر کی گئی ہے جب کہ دستور کو جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ترکیبیں خلا کو پُر کرنے کے لئے ناکافی ثابت ہوئی ہیں نائب صدر یا تو صدر کا تابع مہمل ہو گا یا پھر عملی طور پر صدر کے اختیارات استعمال کرے گا۔ اگر وہ صدر کے تمام اختیارات سنبھال لیتا ہے تو بالائی سطح پر اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ دوسری طرف اگر نائب صدر کو محض رسمی اختیارات حاصل ہوں تو نہ وہ انتظامیہ اور مقننہ کو قابو میں رکھ سکے گا اور نہ سرد سیں اسے احترام کے قابل سمجھیں گی۔ اس کے وظائف دوسروں کے دائرۂ کار میں دخل انداز ہوں گے اور فیصلوں کو دو ٹوک بنانے کے بجائے جھلاہٹ پیدا کرنے کا باعث بنیں گے۔ جب تک وہ اتنے ہی بڑے انتخابی ادارے کی جانب سے منتخب نہیں ہوتا جو صدر کو منتخب کرتا ہے وہ اختیارات ہی کو مؤثر طور پر استعمال کر سکتا ہے نہ احترام ہی کے قابل ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے ذریعے سے منتخب ہونے والے نائب صدر کو کوئی اخلاقی اور قانونی جواز حاصل نہ ہو گا۔

اس بات کا امکان ہے کہ نائب صدر دوسرے بازو سے چنا جائے' بشرطیکہ حکمران ٹولے کی تسلی ہو جائے کہ اسے انگلیوں پر نچایا جا سکے گا۔ بہرحال اس انتظام سے پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان تفریق کو عروج پر پہنچانے کی ترغیب میں اضافہ ہو گا۔ حالات کا جو رخ سامنے آ رہا ہے اس کے پیش نظر اس اقدام کا مطلب ہو گا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ناچاقی کے بیج قانونی طور پر بو دیے گئے ہیں۔ دوسری جانب اگر نائب صدر بھی اسی صوبے سے لیا جائے' جہاں سے صدر' تو اسے مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نظام حکومت کی شکست و ریخت شروع ہو چکی ہے اور داخلی اصلاح کا کوئی اقدام اسے بچا نہیں سکتا۔ اس کا اقرار وزیر قانون نے امسال شروع مارچ راولپنڈی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کیا تھا یہ اس اعتبار سے انتہائی غیر معمولی مظاہرہ تھا کہ انہوں نے معنوی طور پر تسلیم کیا کہ قومی زندگی میں اسی طرح کا ایک خلا موجود ہے جیسا کہ 1958ء میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور جس کے باعث فوج کی مداخلت کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس بات کا دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ وزیر قانون نے پاکستان مسلم لیگ کے بارے میں کہا تھا

www.bhutto.org

کہ اس کا وجود برائے نام ہے اور وہ قومی تائید حاصل کرنے یا عوام کو متاثر کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ حکومت کے ایک وزیر کی جانب سے یہ ناکامی کا سنگ بنیاد اقرار ہے۔ وزیر قانون کی تقریر کی کوئی دوسری تشریح نہیں کی جا سکتی کیونکہ انہوں نے خود اپنے الفاظ میں مانا ہے کہ حکمران پارٹی وجود ہی نہیں رکھتی اور ملک میں ایسے حالات کارفرما ہیں جو ایک مرتبہ پھر فوجی مداخلت کو دعوت دے رہے ہیں۔ انتظامیہ میں جو بھی ہنگامی تبدیلیاں کی جائیں وہ عارضی ثابت ہوں گی اور بحران کو اور بھی شدید بنا دیں گی۔ متبادل انتظامات اگر تشدد سے پاک بھی ہوئے تو لوگوں میں اعتماد پھونکنے میں ناکام رہیں گے۔ حکومت کی مشینری ایک ایسی جگہ پہنچ کر رک گئی ہے کہ نہ تو یہ موثر رعائتیں دینے کے قابل ہے اور نہ اسے مزید رعایت دی جا سکتی ہے۔ جو بھی اپوزیشن کا کوئی لیڈر کسی جمہوری مطالبے کو منوائے بغیر حکومت سے گٹھ جوڑ کرے گا اس کا تعاون بیکار ہو کر رہ جائے گا کیونکہ وہ فوراً عوام کی نظروں سے گر جائے گا۔ دوسری جانب اگر کچھ پوزیشن لیڈر جمہوری مراعات حاصل کر کے حکومت میں شامل ہو جاتے ہیں تو اقتدار حکومت کے ہاتھوں سے نکل جائے گا' عوام اپنے آپ کو مضبوط محسوس کرنے لگیں گے اور حالات عوامی طاقتوں کو ایسے مقام پر لا کھڑا کریں گے کہ وہ حکومت کو مسند اقتدار سے ہٹا کر ہی دم لیں گے۔

بحران پر داخلی ادل بدل سے قابو نہیں پایا جا سکتا۔ حکومت کے مرکز اقتدار کو تعمیر نو کا کام شروع کرنے کے لئے موجودہ ڈھانچے سے باہر کوئی متبادل راستہ تلاش کرنا پڑے گا۔ اسی طرح اس نظام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا جمہوری قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا جس سے بحران پر قابو پایا جا سکے۔ مسئلے کا صحیح حل موجودہ نظام کے دائرے سے باہر کوئی جمہوری اقدام ہی ہو سکتا ہے لیکن حکمران اسے آزمانے سے کترائیں گے' حالانکہ سب جانتے ہیں کہ بحران سے نپٹنے کا یہی واحد منطقی راستہ ہے۔

راہ عمل

موجودہ دستور جو 1962ء میں نافذ کیا گیا اور جس سے حکومت کو قانونی جواز حاصل ہے تین ایسی دفعات 14' 15 اور 16 کا حامل ہے جو صدر کے جسمانی یا ذہنی طور پر معذور ہو جانے کی صورت میں زیر عمل آنے والے بندوبست کا ضابطہ طے کرتی ہیں۔ ان متعلقہ دستوری دفعات میں شرائط اور طریق کار کو کھول کھول کر بیان کیا گیا تھا لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود دفعہ 16 زیر عمل نہ آ سکی' جس کے تحت سپیکر کو صدر کی علالت کے طویل بحرانی دنوں میں صدر کی جگہ کام کرنا چاہئے تھا۔ جب صدر ایک مہلک مرض میں مبتلا تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے عہدے کے گراں بار فرائض انجام دینے سے بالکل قاصر تھے تو کس کا حکم چلتا تھا اور مملکت کے امور کون طے کرتا تھا؟ یہ ہمیں نہیں بتایا گیا۔ دستور کے مطابق جس شخص کو صدر کے فرائض ادا کرنے چاہئیں تھے وہ سپیکر تھا۔ پھر اسے وہ ذمہ داری سنبھالنے سے کیوں روکا گیا جو ملک کے اعلیٰ ترین قواعد و ضوابط' یعنی دستور کے مطابق اس پر عائد ہوتی تھی۔ اسے کس نے روکا؟ یہ بیکار کے سوالات نہیں' کیونکہ یہ اصل مسئلے کی جڑ تک جاتے ہیں۔

www.bhutto.org

اگر دستور کے مطابق سپیکر کو صدر کے طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو بساطِ اقتدار کے حقائق کے پیش نظر اغلب یہی تھا کہ اس کی سربراہی محض برائے نام ہوتی۔ اس کے باوجود اسے یہ خالصتاً اتفاقی یا ذہنی کردار ادا کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ جو کچھ ہوا اس کی شاید دو وجہیں ہیں۔

سب سے پہلے تو بعض امراء کے تعصب کو زیر نظر لانا چاہئے جنہیں حکومت میں امتیاز یا وہ اقتدار اور اثر حاصل ہے کہ وہ اس کے مستحق نہیں۔ اس کو انگریز حکمرانوں کے نسلی تعصب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو وہ نسل اور رنگ کے باعث تمام دیسی باشندوں سے برتتے تھے۔ اب صورت یہ ہے کہ جن متعصب پاکستانیوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ اپنے آپ کو انگریز حکمرانوں کا گدی نشین سمجھتے ہیں۔ صدر کی علالت کے دوران امور مملکت کا فیصلہ کرنے والے قریبی لوگوں کے لئے یہ خیال ناقابل برداشت تھا کہ ایک مشرقی پاکستانی سپیکر ایسے حالات میں صدر کی جگہ سنبھال لے جب مستقبل امید افزا نہ ہو۔ ان سے بعید تھا کہ دستور کے مطابق درست کارروائی کی اجازت دیتے۔ سپیکر جو بنگالی ہیں صدر کے بیرونی ملکوں کے دوروں کے دوران پہلے کئی مرتبہ صدر کے قائم مقام رہ چکے ہیں لیکن تب اور بات تھی' ان کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آنے ہی نہ دیا جاتا تھا جس کی کچھ اہمیت ہو کیونکہ صدر صاحب فوری نوعیت کے تمام معاملات پر باہر سے ضروری احکام دے سکتے تھے۔

دیکھا جائے تو سپیکر ایسے شخص ہیں کہ انہوں نے دل سے کوشش کی ہے کہ حکومت اور وہ ایک جان دو قالب نظر آئیں۔ مگر جب اصل اقتدار میں شرکت کا سوال پیدا ہوا تو ان سے وہی سلوک کیا گیا جو ملتے جلتے حالات میں انگریز اپنے جاں نثار ہندوستانی حامیوں سے کیا کرتے تھے' یہ اسامی مخصوص لوگوں کے لئے تھی' دیسی لوگوں کے لئے نہ تھی۔

اب ہمیں دوسری وجہ کو دیکھنا چاہئے' حکومت کا کردار آمرانہ ہے۔ بہت سے غرض مندانہ مفادات کو جان بوجھ کر جنم دیا گیا ہے تاکہ شخصی اقتدار قائم رہے۔ یہ انہی معنی میں آمرانہ حکومت ہے جو محض ایک ستون پر کھڑی ہے۔ تاریخ کا پورا دفتر گواہ ہے کہ اس طرح کے نظام میں مرکزی شخصیت ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی دوسرے شخص کو اس کے پہلو بہ پہلو' بلکہ قریبی نچلی سطح پر بھی جگہ دی جائے۔

انسان لافانی نہیں' اگر حکومت موروثی ملوکیت کے تصور پر استوار ہوتی تو جانشینی کا مسئلہ بالکل آسان ہو جاتا۔ بظاہر دستور میں گنجائش ہے کہ صدر کے معذور ہو جانے یا اس کے سبکدوش ہو جانے پر کیا انتظامات ہوں گے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ دستور واقعی ری پبلکن ہے اور کم از کم سطحی طور پر ڈیموکریٹک لیکن اصل میں چونکہ تمام وزیر محض ہیچکار تھے' نہ کسی کی ساکھ تھی نہ کسی کو اختیار' اس لئے دستور کی متعلقہ دفعات کے نفاذ کا حکم خود صدر ہی کو دینا تھا۔ بالائی سطح پر کوئی بھی مؤثر تبدیلی کی جاتی تو اس سے تبدیلیوں کے ایک پورے سلسلے کا آغاز ہو جاتا۔ وزیروں کو عوامی تائید حاصل نہیں' وہ محض منصب دار ہیں جن کا اختیار صدر کی مرضی پر منحصر ہے چنانچہ چہیتے افسروں کے ساتھ ساتھ وزیروں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ دستوری دفعات کے نفاذ سے گریز کیا جائے۔ یہ دوسری وجہ ہے کہ دستور کو کیوں پس پشت ڈالا گیا۔

www.bhutto.org

اس دوسری وجہ کو ایک اور طرح سے بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مرکز اقتدار اپنے آپ کو قائم رکھنے کے لئے غرض مندانہ مفادات سے مدد لیتا ہے لیکن شخصی نظام میں کسی دوسری شخصیت کو ایک خاص حد سے زیادہ نمایاں ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس ضمن میں ملک امیر محمد خاں 'نواب کالا باغ' کے زوال کو یاد رکھنا چاہئے۔ اس لئے جب صدر کی علالت کے باعث بحران پیدا ہوا تو مرکز اقتدار میں کسی فرد واحد کو یہ جرات نہ تھی کہ وہ اقتدار اعلیٰ کا دعویدار نظر آئے بلکہ وہ سب من حیث المجموع اس نتیجے سے خوفزدہ تھے جو دستور کی متعلقہ دفعات کے نفاذ کی صورت میں ابھر سکتا تھا۔ کم از کم کچھ عرصے کے لئے ان کا مشترکہ مفاد اسی میں ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں۔ چنانچہ نائب صدر کا عہدہ قائم کرنے کا چرچا ہو رہا ہے۔

نائب صدر کے عہدے کی تخلیق دراصل دستور کی منطق ہی کے خلاف ہے جس میں درج ہے کہ جب صدر معذور ہو جائے تو لازم ہے کہ اسے عارضی یا مستقل طور پر فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اگر صدر واقعی معذور ہو گئے ہیں تو اس کا حل یہ نہیں کہ ان کے فرائض کوئی نائب صدر انجام دینے لگے۔ ہمارے کارفرما دستور کی متعلقہ دفعات کو ناقابل عمل نہیں گردانا جا سکتا' بس ان پر عمل نہیں کیا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں بھی نہیں کیا جائے گا۔

اس وقت یہ ہوتا نظر آ رہا ہے کہ مسند اقتدار کے آس پاس ذاتی مفادات کا گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔ یہ عناصر افراد کی شکل میں ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کو غرض مندانہ مفادات کی بڑی بڑی اور مضبوط تنظیموں کی تائید کی تلاش ہے۔ شہری وزیروں کی حالت سب سے کمزور ہے۔ ان میں سے شاید ہی کسی کو عوام کے کسی طبقے کی حمایت حاصل ہو۔ چنانچہ وہ بھی غرض مندانہ مفادات سے تائید کے خواہاں ہیں اور ساتھ ہی دوسرے اقتداری گروہوں' مثلاً سرداروں' کے ساتھ رشتہ جوڑنے میں کوشاں ہیں۔

سرمایہ دارانہ مفادات بھی سب کے سب یکجا نہیں' حکمران ٹولے کے ارکان انہیں اپنے اپنے دام محبت میں پھانسنے کی ضرور کوشش کریں گے۔ بعض انتہائی مقتدر سرمایہ دار اپنی ذاتی پالیسی پر کاربند ہوں گے اور حالات کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ بہرحال توقع ہے کہ وہ انہی عناصر کی مدد کریں گے جنہیں قبضہ قدرت میں رکھ سکیں۔ لیکن یہ بات ہرگز یقینی نہیں کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کو اپنے حق میں مفید سمجھیں۔ اغلب ہے کہ انفرادی اور جماعتی' دونوں طور پر' حکمران ٹولے کے اہم ارکان انہیں رام کرنے کی کوشش کریں۔ گٹھ جوڑ تو اب بھی موجود ہیں لیکن بحران کے دباؤ تلے ممکن ہے کہ ان میں تغیر و تبدل رونما ہو جائے۔

اگرچہ مستقبل کے بارے میں باوثوق انداز سے پیش گوئی نہیں کی جا سکتی' پھر بھی جو بہت سی قوتیں کارفرما ہیں ان کے جائزے سے آئندہ رونما ہونے والے حالات کے رجحان کا کچھ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں عظیم طاقتوں کو لپیٹ میں لے لینے والی جنگ جیسے بیرونی حالات کو نظر انداز کرنا ہو گا جن کے باعث ہمارے ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں کسی کم و بیش پر امن انتقالِ اقتدار کی تمام کوششیں لازماً تلپٹ ہو جائیں گی۔ عالمی جنگ یا بیرونی مداخلت کے بغیر بھی اس بات کا اگر مکمل نہیں تو بیشتر انحصار موجودہ اقتداری گروہوں پر ہی ہے کہ انتقالِ اقتدار کسی پر امن اور منظم طریق پر ہو سکے۔ بعض افراد یا طاقتور غرض مندانہ مفادات کی تنظیم کے بعض گروہ، دہشت کے عالم میں اپنی مشکلات کے حل کے طور پر طاقت کا استعمال آزمانے کی غلطی بھی کر سکتے ہیں۔

صورت حالات جو مختلف رخ اختیار کر سکتی ہے پہلے ان میں سے دو کو دیکھتے ہیں کہ ان کا انحصار حکومت کے اپنے اندر کی طاقتوں پر ہے۔

اوّل، حکومت یعنی موجودہ نظام مختلف ہتھکنڈوں اور حیلے بہانوں سے برقرار رہے اور اس کے چہرے پر دستوری حکومت کا نقاب پڑا رہے۔

دوم، حکومت کا تختہ الٹ جائے مگر بظاہر ایسا معلوم نہ ہو۔

صوت حال کے پہلے رخ کی تشکیل شروع ہو چکی ہے۔ اس ضمن میں چالیں چلی جا رہی ہیں کہ دستور کی وہ دفعات پس پشت ڈالی جا سکیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ یہ غلط تاثر دیا جا رہا ہے کہ دستور میں کوئی خلا تھا جسے نائب صدر کے تقرر سے پُر کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ دستور میں مسند نشین صدر کی عارضی یا مستقل معذوری جیسے اتفاقات سے عہدہ بر آ ہونے اور صدر کا انتخاب کرانے کی گنجائش موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک خلا بھی ہے کیونکہ اس میں یہ گنجائش نہیں کہ صدر کی پسند کے شخص کو بلا کھٹکے مسند اقتدار پر فائز کر دیا جائے۔ نائب صدر کے عہدے کی تخلیق کے پیچھے یہ خیال کارفرما ہے کہ صدر کے انتخاب سے گریز کیا جائے۔ اقتداری گروہوں کو امید ہے کہ اس طرح وہ آنے والے کئی سالوں تک، جبر اور بدعنوانی کے جانے پہچانے مرکب کے مسلسل استعمال سے، اپنے دست قدرت کو برقرار رکھ سکیں گے۔

وہ زیادہ دیر نہیں نکالیں گے، اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ وہ اپنے عزائم میں مختصر سے عرصے کے سوا کامیاب ہو سکیں۔ نہ تو افسر اور نہ ان کے موکل ہی اس قابل ہوں گے کہ ناپسندیدگی کے اس امڈتے ہوئے سیلاب کو روک سکیں جو اندریں حالات بپھر کر اقتدار کے فرسودہ بندوں کو پاش پاش کر دے گا۔ جن اقتداری گروہوں نے یہ راہ اختیار کی ہے ان کا خلجان یہ ہے کہ طاقت کے استعمال کی ہر کوشش ایک ایسی نئی صورت حال ابھارے گی جسے وہ دعوت تو دے سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ اسے قابو میں بھی رکھ سکیں۔

دوسری جانب عوام کی مرضی کے بغیر صدارتی نشینی کے دستوری حیلے میں بھی سنگین خطرات ہیں۔ آیئے نائب صدر کے حوالے سے سامنے آنے والے حل کا جائزہ لیں۔

www.bhutto.org

نائب صدر کے عہدے پر کوئی ایسا شخص ہی فائز ہو سکتا ہے جو یا تو صدر کے جانشین کے طور پر اقتداری گروہوں کے نزدیک قابل قبول ہو یا پھر ان گروہوں کی نظر میں ایسے مشاق شاطر کی حیثیت رکھتے جو ان کی مرضی کے آدمی کو مسند اقتدار پر لا بٹھانے کا ذمہ لے اور بساط اقتدار کو درہم برہم بھی نہ ہونے دے۔ اگر اس شخص میں زیر نظر مطالبات پورا کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوگی تو وہ اقتداری گروہوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر تو نہیں رہے گا۔ اسی لیے ہم نتیجے پر فوراً پہنچ جاتے ہیں کہ نائب صدر مشرقی پاکستان سے نہ ہو گا۔

موجودہ طرز حکومت شخصی اقتدار پر قائم ہے جسے غرض مندانہ مفادات کے ایک خاص تانے بانے کی تائید حاصل ہے۔ یہ غرض مندانہ مفادات مجموعی طور پر توجوں کے توں رہتے ہیں لیکن صدر اپنے ارد گرد کے افراد کو آگے پیچھے کرتا رہتا ہے۔ جو اس کے احکام بجالاتے ہیں سرمایہ دار اور ملکوں کے وہ مبصر جنہیں ہمارے حالات کی گہری بصیرت حاصل نہیں اس رجحان کا شکار رہے ہیں کہ اس جانے پہچانے فارمولے پر زور دیں، جس کے مطابق "دولت ہی اقتدار ہے"۔ پاکستان میں یہ بات ایک حد تک تو درست ہے لیکن جو غیر مہذب نظام افسوس نسبتاً ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ مسلط ہو گیا ہے، جو انگریزوں نے ہم پر ٹھونسا تھا اس نے اس فارمولے کو یوں بدل دیا ہے کہ اب "اقتدار ہی دولت ہے"۔ غیر مہذب طور طریق کی جانب واپسی کی ایک مثال یہ ہے کہ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے ظالمانہ جرگہ سسٹم کو پھر سے رائج کر دیا گیا۔ "اقتدار ہی دولت ہے" کا مطلب ہے کہ امیر بننے کے لئے انسان کے پاس اقتدار ہونا چاہئے یا برسر اقتدار لوگوں کی حمایت حاصل ہونی چاہئے۔

مستقبل کے بعض امکانات کا احاطہ کرنے کے لئے ملک کے حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ جب قومی معاملات میں یہ اصول ان باہر کے افراد یا گروہوں کے بجائے جنہوں نے کسی نہ کسی اعتبار سے لٹے پٹے عوام کی صفوں سے اپنے آپ کو ممتاز کر رکھا ہے، خود قوم کے اپنے ارکان کے ہاتھوں زیر عمل آتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ متعدد ملکوں میں رہنما اصول وہی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے "اقتدار ہی دولت ہے"۔ اس اصول نے بہت سے چھوٹے چھوٹے نو آزاد افریقی ممالک میں ناگہانی انقلابات کے ذریعے اپنے آپ کو منوایا ہے۔

غریب اور امیر ملکوں کے درمیان جو فرق ہے وہ ان کے کروڑپتیوں کی نہیں بلکہ ان کے عوام کی تقابلی حالت پر منحصر ہے۔ پاکستان کے کروڑ پتی بڑے فخر سے امریکہ اور مغربی یورپ کے کروڑپتیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ تقسیم کے وقت مٹھی بھر امیر پاکستانیوں کی فراوانئ زر کا راز زمینداریوں اور جاگیرداریوں میں مضمر تھا۔ اب کروڑپتیوں کی ایک تازہ کھیپ تیار ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے کاروباروں اور صنعتی اداروں کا اگر محاسبہ کیا جائے کہ انہوں نے چند ہی سالوں میں کیونکر ترقی کی ہے تو یہ حقیقت الم نشرح ہو جائے گی کہ اس میں سرکاری سرپرستی نے فیصلہ کن کردار انجام دیا ہے۔ سرکاری طور پر سراسر جھوٹا پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ ایک آزاد معیشت میں آزاد کاروبار کی کارفرمائی نے ذہین کاروباریوں کو موقع دیا

www.bhutto.org

ہے کہ وہ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی سے جھولیاں بھر بھر سونا سمیٹ لیں۔

جو نظام ہمارے ملک میں اپنا یا گیا ہے اسے ہرگز ہرگز عدم مداخلت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ نظام ہرگز ہرگز آزادانہ نہیں۔ ایک ایک کل پرزہ حکومت کے اس طرح قبضے میں ہے کہ وہ جس کسی کی جیبوں کی جانب چاہے دولت کے دھارے کا رخ پھیر دے۔ اب جو لوگ ان کل پرزوں کو ادھر سے ادھر کرتے ہیں وہ خود بھی اس نظام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر بن سکتے ہیں۔ اس طریقے سے حکومت کے وزیروں کا تو ذکر ہی کیا' سرکاری افسر بھی اقتدار میں شرکت کر کے امیر بننے کے وسیع کاروبار کی انتظامیہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اونچے کاروبار اور سرکاری ملازموں کا تعلق قابل فہم ہے۔ یہ مشترکہ مفاد کی مخصوص قسموں کے حوالے سے باہمی انحصار کا رشتہ ہے۔ سرکاری ملازموں کے تعاون کے بغیر سرمایہ دار کاروباری اپنا صنعتی ادارہ قائم کرنے یا تجارت کے ذریعے نفع کمانے کی توقع نہیں کر سکتا۔ لائسنس دینے کے نظام سے صرف ان بڑے بڑے تاجروں ہی کو دلچسپی نہیں' جنکی تجوریاں پہلے ہی لاکھوں سے اٹی ہوئی ہیں بلکہ بساط کاروبار کے ہر نووارد کو دلچسپی ہے اور تو اور فیکٹریاں قائم کرنے یا مال برآمد کرنے کے لائسنس اکثر ایسے افراد کو سیاسی یا دوسری نوعیت کی خدمات انجام دینے کے انعام محض کے طور پر' یا خاندانی یا قبائلی تعلق کی بنا پر بخش دیئے جاتے ہیں' جو صنعتی یا کاروباری میدان میں قدم دھرنے کی نیت بھی نہیں رکھتے۔ جس شخص کو یہ بیش قیمت لائسنس ملتا ہے وہ یا تو اسے کھڑے کھڑے بیچ دیتا ہے یا پھر بعض مراعات دے کر کسی سرمایہ دار کا ساجھی بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ لائسنس دینے کے نظام نے (واقعی یہ ایک نظام بن چکا ہے) بہت سے خاندانوں کی قسمت بنا دی ہے ان لائسنسوں کی کیفیت ایسے چیکوں کی ہے جو قوم کے اجتماعی وسائل کے عوض بنائے جاتے ہیں' عام صارفین ہی کو بالآخر وہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جس پر لائسنس فروخت ہوتے ہیں۔

تمام سرکاری ملازم بدعنوان نہیں! بعض کو بدعنوانی کا موقع نہیں ملا اور بعض میں ابھی عزت نفس اور احساس فرض کی رمق باقی ہے۔ قریب قریب تمام سرکاری ملازم ان حالات کا دباؤ محسوس کرتے ہیں جو انہیں اپنے ضمیر کے ساتھ سمجھوتا کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دیانت دار افسر جب تک موجودہ صورت حال کو قبول نہ کریں ترقی ہی نہیں کر سکتے چنانچہ انہیں ایسے ناجائز فیصلوں پر عملدرآمد کرنے میں تعاون کرنا پڑتا ہے جن سے وہ کوئی ذاتی فائدہ اٹھانے کے خواہش مند نہیں ہوتے۔ سرکاری ملازم کی پنشن اتنی قلیل ہوتی ہے کہ جب تک وہ ریٹائر ہونے کے بعد کام نہ کرے یا ملازمت کے دوران' جب کہ موقع ہوتا ہے، ہاتھ نہ رنگے تو وہ اور اس کا کنبہ ان کے بڑھاپے میں مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی پنشن کا کوئی تحفظ نہیں۔ اگر اس کی دیانت داری حکومت کو کھٹکتی ہو تو ممکن ہے اسے پنشن کی ایک پائی نہ ملے۔ چنانچہ وہ کاروباری لوگوں کے اس حلقے سے

تعلقات استوار کرتا ہے جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے تاکہ جب وہ ریٹائر ہو تو کسی فرم میں کوئی عہدہ حاصل کر سکے۔

بالائی سطح کے سرکاری افسروں کے لئے بے حد ضروری ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں۔ ان حالات کا مطلب ہے کہ سفاک سرمایہ داروں کو کھل کھیلنے کا موقع میسر رہے۔ کم درجہ سرکاری ملازمین عدم تحفظ کے گوناگوں ڈراؤنے خوابوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہیں جو ان کی حیثیت کا لازمہ بن چکے ہیں۔ چنانچہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ حالات جوں کے توں رہیں۔ مگر اس بحرانی دور میں جو لوگ اس حکومت سے وابستہ ہیں انہیں سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہے کہ اس کے تسلسل کی یقین دہانی کے ذرائع کیونکر تلاش کئے جائیں۔ چنانچہ توقع کرنی چاہئے کہ اعلیٰ ترین سرکاری افسران تبدیلیوں کے جوکھم سے گریز کرنے کی کوشش کریں گے جو عوام کی حق رائے دہی کے استعمال کے نتیجے میں ابھر سکتی ہیں۔ ذاتی طور پر بالائی سطح کے افسروں کی حیثیت کا انحصار پسند ناپسند پر ہے۔ انہیں اپنا مستقبل عدم یقینی کے بادلوں میں گھرا نظر آتا ہے۔ وہ ایسا عنصر ہیں جس کیلئے دفع الوقتی ہی میں بیش از بیش فائدہ ہے۔ چنانچہ نائب صدر کی طرح کا حل سب سے زیادہ انہیں بھاتا ہے۔

تختہ الٹنے اور انقلاب میں بہت فرق ہوتا ہے کیونکہ انقلاب کے ساتھ تو آدرشوں کی حرکت و حرارت موجود ہوتی ہے اور اسے آبادی کے بہت بڑے حصے کی جاں نثارانہ تائید حاصل ہوتی ہے۔ جب تختہ الٹ جاتا ہے تو اس لمحے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ سیاسی مسائل کی گروہ کشائی ہو گئی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، تاوقتیکہ اس کا مقصد عوام کے حقوق کو بحال کرانا ہو۔ ورنہ انقلاب کے دعویداروں کو اسی طرح کے قتل عام کی ترغیب ملنے لگتی ہے جیسا انڈونیشیا میں ہوا اور ظاہر ہے کہ اس سے پاکستان کچھ ہی دیر میں پارہ پارہ ہو جائے گا

جبر و استبداد کی کسی نئی لہر کے آتے ہی بیرونی خطرات اس درجے کو پہنچ جائیں گے کہ پاکستان ایک محصور قوم بن کر رہ جائے۔ پاکستان کے ہمسایوں کے علاقائی دعوے زندہ ہو جائیں گے اندرونی بے چینی بیرونی طاقتوں کے لئے پہلے تو اپنا اپنا دباؤ بڑھانے اور پھر خود قوم ہی کو تباہ کرنے کے مقصد سے سازش کرنے کا موقع فراہم کر دے گی۔

ملک کے پیچیدہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طاقت کے وحشیانہ استعمال پر انحصار کرنا گزشتہ دس سال کے مجموعی تجربے کے خلاف ہو گا۔ یہ اقدام ایک ایسے بحران پر قابو پانے کی ضرورت سے زیادہ سہل انگارانہ "راہ پر چل نکلنے کے مترادف ہو گا جس کی جڑیں سیاسی اقتصادی بے چینی میں گڑھی ہیں۔ پاکستان کے عوام پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ طاقت کے استعمال نے ان کی مشکلات میں اضافہ کیا ہے قوم کے مسائل چونکہ نوعیت کے اعتبار سے سیاسی ہیں اس لئے ان کے دیرپا حل کا تقاضا سیاسی طرز عمل اپنا کر ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔

www.bhutto.org

اگر کسی ملک پر فوجی لوگ حکمرانی کرتے ہوں تو اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ ملک فوجی اعتبار سے مضبوط ہے۔ ہتھیار فراہم کرنے والا کوئی بڑا ملک پاکستان کو پہلے سے زیادہ ہتھیار دینے میں دلچسپی نہ لے گا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، پاکستان کو امریکی فوجی امداد ملنے کی اوّلیں وجہ "اندرونی تحفظ" تھا۔ اس مقصد کے حصول کی سیدھی سادھی راہ یہ ہے کہ عوام کو دبایا جائے لیکن خود امریکہ نے اس ضمن میں اپنا رویہ ایک حد تک بدل لیا ہے۔ اب اس کا مطالبہ یہ ہے کہ پاکستان بھارت کے ساتھ مل کر چین کے خلاف کنفیڈریشن بنائے یا بھارت کا حلیف بن کر رہے۔ کچھ دیر سے معاملات یہی رخ اختیار کر رہے ہیں اگرچہ پراپیگنڈا اس کے برعکس کیا جارہا ہے۔

خوش قسمتی سے بحران جن سیاسی راہوں کو جنم دے سکتا ہے وہ حالات کو جوں کا توں رکھنے اور ناگہانی انقلاب پر ہی ختم نہیں ہو جاتے، ہمیں بقیہ تین راہوں کا بھی جائزہ لینا چاہئے

(3) پارلیمانی نظام کا فوری نفاذ۔

(4) مقبول عام حکومت کے قیام کے لئے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک عبوری دور۔

(5) جمہوری نظام کے قیام کی خاطر دستوری ڈھانچے میں اصلاح۔

موجودہ صدارتی حکومت کی ناکامی اتنی واضح ہے کہ پارلیمانی نظام کی فوری بحالی کا غوغا سمجھ میں آتا ہے۔ البتہ یہ خیال خام ہے کہ ایسا کرنے کے لئے خود حکومت کوئی فرمان جاری کردے گی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو 1956ء کا دستور بحال کرنے کی رائے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جس حکومت نے یہ دستور بنایا تھا وہ عوام کی نمائندہ نہ تھی۔ کسی بھی طرز کی جمہوری حکومت کے لئے لازم ہے کہ اس کی بنیاد عوام کے کھرے مشورے کے نتیجے پر قائم ہو۔ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ چناؤ نظام حکومت کی طرف دو قسموں تک محدود نہیں .... موجودہ حکومت اور 1956ء کے دستور کے نمونے پر ڈھلی ہوئی پارلیمانی حکومت، وقت کے بہاؤ نے بنیادی نوعیت کے متعدد مسائل کو اجاگر کر دیا ہے۔ دونوں بازوؤں کے باہمی تعلقات کے اہم مسئلے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ ان میں اقتصادی انصاف کا سنگین مسئلہ بھی شامل ہے۔ خالصتاً دستوری نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو جو بھی نظام رائج کیا جائے اس میں مرکزی سطح پر تعرض اور توازن کی اس حد تک گنجائش ہونی چاہئے کہ ایک طرف طاقت کسی ایک ہاتھ میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائے اور دوسری طرف وہ اتنی منتشر بھی نہ ہو کہ غیر موثر ہو کر رہ جائے۔ اس مقام پر ہم ان گوناگوں مسائل کی تفصیل میں نہیں جائیں گے جن سے بالآخر کسی بھی دستور کے نفاذ سے پہلے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے تاکہ دستور ترقی پسندانہ اور جمہوری بھی ہو اور عوامی تائید کا نتیجہ بھی۔

وہ بہترین راہ جسے قابل عمل کروانا جاسکتا ہے یہ ہے کہ طے شدہ مقاصد کے تحت ایک مقبول عام حکومت قائم کرنے کے لئے ہم عبوری دور کو عبور کر جائیں اور اس کا چوتھی راہ کی شکل میں ذکر آ چکا ہے۔ مقبول عام حکومت کے قیام کے لئے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک عبوری دور اگر اس راہ پر گامزن ہو جائیں تو

پانچویں راہ ..... جمہوری نظام کے قیام کی خاطر دستوری ڈھانچے میں اصلاح .... خود بخود تخلیق چلی جائے گی کیونکہ عبوری دور کا یہی مقصد ہو گا کہ ملک کو ایک ترقی پسندانہ اور جمہوری دستور دیا جائے یہ مقصد تیسری راہ اختیار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا جس کے تحت پارلیمانی نظام کا فوری نفاذ ہونا چاہئے۔ موجودہ نظام میں اس میں کوئی گنجائش نہیں' جب کہ 1956ء کے دستور کی جانب پلٹنے سے صرف یہ ہو گا کہ جلد ہی ایک تازہ بحران جنم لے لے گا۔ عبوری دور کی اٹھان کسی نہج پر ہو گی' اس کا اندازہ اس لمحے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں بہت سی نزاکتیں مستور ہیں۔ عبوری دور کے اگر کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو یہ کہ اس کا آغاز بنیادی حقوق کی بحالی سے ہو ورنہ یہ محض فراڈ ہو گا جس کی سزا میں یا تو حکومت کا تختہ الٹ جائے گا یا خانہ جنگی چھڑ جائے گی۔ جب تک بنیادی حقوق بحال نہیں ہوتے' وہ اپوزیشن لیڈر بھی برسراقتدار گروہ سے سلسلہ جنبانی قائم نہیں کر سکتے جو حکومت کی جانب مائل ہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنے آپ کو اور اپنے مطمح نظر کو خطرے میں ڈال لیں گے۔

امکانات یہ ہیں کہ جو حالت اس وقت ہے اس میں اساسی طور پر کوئی تبدیلی نہ آئے گی اور اندرونی اور بیرونی مشکلات بڑھتی چلی جائیں گی۔ یہاں تک کہ 1969ء کا زمانہ آ جائے گا جب صدارتی انتخابات شروع ہوں گے۔ انتخابات کی خاطر زمین ہموار کرنے کے لئے حکومت میں تبدیلیاں کی جائیں گی جس میں انتظامیہ کے دائرے میں بے شمار تبادلے بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ سارے ادل بدل بیکار ثابت ہوں گے۔ انتخابات کے وقت یہ بات کھل کر سامنے آ جائے گی کہ نہ تو سرکاری افسر ہی' جو حکومت کی خاطر نت نئی چالیں چلتے رہتے ہیں، سیاسی خلا کو پر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ بیشتر موجودہ مرکزی اور صوبائی وزیر ہی عوام کی تائید حاصل کرنے میں کوئی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ صوبوں پر حکومت کا اختیار کمزور پڑ چکا ہے اور جو مسائل اب عوام کی توجہ کا مرکز ہیں وہ گزشتہ انتخابات کے دور کے مسائل کی نسبت کہیں زیادہ ہیجان انگیز ہیں۔ ملک کے ہر حصے میں کبیدگی کی پھیلتی ہوئی لہر بالآخر انتخابی ادارے کو بھی ضرور متاثر کرے گی۔ اگرچہ بنیادی جمہوریت کا نظام تحفظ نفس کا خفیہ ہتھیار ہے لیکن اس کے موجودہ ارکان کی جگہ زیادہ تر ایسے نوجوان لوگ لے لیں گے جنہیں اہل کار اتنی آسانی سے ڈرا دھمکا نہیں سکیں گے۔ فیصلہ کن وقت آنے پر بہت سے ارکان اسمبلی اور سیاست دان جن کی آنکھیں کھل چکی ہوں گی، حکومت کا ساتھ نہ دیں گے۔

مسئلے کی اساس یہ ہے کہ موجودہ نظام کو ناگہانی انقلاب اور ہلاکت آفریں خانہ جنگی کی راہ اختیار کئے بغیر کیونکر منسوخ کیا جائے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر اقتصادی اور سماجی انصاف کے سوال کو نظر انداز کیا گیا تو پاکستان کی سالمیت نہ صرف خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ اس کا پارہ پارہ ہونا یقینی ہو جائے گا۔ تمام محب وطن لوگ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ سالمیت کے پارہ پارہ ہونے میں بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی عیاں و نہاں صورت بھی شامل ہے۔ کوئی بھی حکومت جو قومی سطح پر قابل قبول ہو اور عبوری دور یا دوسری

www.bhutto.org

صورت میں 1969ء کے انتخابات کے بعد برسراقتدار آئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ترقی پسندانہ کردار کی حامل ہو۔ جب تک تبدیلی کا آغاز نہیں ہو جاتا تمام ترقی پسند طاقتوں کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرح ایک ترقی پسندانہ، جمہوری اور مساوات انگیز نظام حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرتی چلی جائیں۔

اپریل 1968ء

www.bhutto.org

اپوزیشن جماعتوں میں اتحاد کی ضرورت

حالات حاضرہ کے عالمگیر منظر پر نگاہ ڈالیں تو ان کی نمایاں خصوصیت سامنے آ جاتی ہے۔ اس خصوصیت کا نام ہے تبدیلی۔ ہر جگہ بڑے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ اگر حالیہ دس سالوں کو کوئی نام دینا ہو تو انہیں تبدیلی کے دس سال (Decade of Change) کہا جا سکتا ہے۔ دنیا بھر کے نوجوان پرانے نظام کے خلاف موج در موج بغاوت کر رہے ہیں۔ ان کا غیظ و غضب نئے نئے راستے ڈھونڈ رہا ہے۔ روایتی قدروں کا بھرم کھل گیا ہے۔ معاشرہ اور اس کے ادارے وقت کی کٹھالی میں پڑے ہیں۔ چیکوسلواکیہ، جاپان، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، بلکہ پوری دنیا کی قوموں پر نوجوانوں نے دباؤ ڈال رکھا ہے۔ اپنی بے نظیر ترقی کے باوجود فرانس میں ایک مرتبہ پھر خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چند روز کے اندر اندر صدر دی گال کی ناقابل تسخیر حیثیت کو نوجوانوں اور محنت کشوں کے مضبوط اتحاد نے متزلزل کر کے رکھ دیا۔

پاکستان اس اہم بین الاقوامی صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر، الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ عالمی آب و ہوا کا اس پر ضرور اثر پڑے گا۔ اندرون ملک جو حالات مسلط ہیں، بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ تبدیلی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ موجودہ صورت حال جاری نہیں رہ سکتی۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل واضح طور پر تبدیلی کی غمازی کر رہے ہیں۔ سیاسیات کے اٹل قوانین کارفرما ہیں۔ تبدیلی کی ناگزیری کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ بے شک اسی کا نام تاریخ ہے۔

پاکستان کے عظیم ترین مفادات داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ اس اندیشے کو حقیقت ثابت کرنے کے

www.bhutto.org

لئے اندرونی اور بیرونی شہادتوں کا کوئی شمار نہیں۔عوام کو ناگفتہ بہ اندرونی حالات کا نسبتاً زیادہ احساس ہے لیکن بیرونی خطرات بھی کچھ کم سنگین نہیں۔ میں محض دو حالیہ واقعات بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو بعد از وقت اقدامات کرنے میں خصوصی ملکہ حاصل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات مزید الجھتے چلے جاتے ہیں۔ آج سے چار سال قبل میں نے فرخا بند کے مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے جانے کی شدید ضرورت کا اظہار کیا تھا میں نے اقوام متحدہ میں متعدد بیانات میں اس کی جانب واضح الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔ آج جب کہ بند زیر تعمیر ہے اور بھارت تباہ کن ہٹ دھرمی دکھا رہا ہے ، حکومت کو ہوش آیا ہے کہ اس مسئلے میں اقوام متحدہ کو مداخلت کرنی چاہئے۔ اسی طرح جموں اور کشمیر پر ستمبر 1965ء کی قرارداد نے اقوام متحدہ کے لئے لازم قرار دیا تھا کہ فوجوں کی واپسی کے بعد اس تنازعہ کا حل تلاش کرے۔ اقوام متحدہ میں امریکی نمائندے ' گولڈ برگ نے اس قرارداد کے ضمن میں اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کی حیثیت خدائی فرمان کی سی ہے فوجوں کی واپسی کو عمل میں آئے دو سال ہو چکے ہیں۔ اعلان تاشقند کے بعد کی کوششوں کا نتیجہ جمود کی صورت میں نکل چکا ہے۔ اس دوران میں بھارت نے اقوام متحدہ کی قراردادوں اور دوسرے وعدوں کو پس پشت ڈال کر ، کشمیر میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے متعدد اقدامات کر لئے ہیں۔ ان شرمناک عہد شکینوں کے باوجود سلامتی کونسل کا دروازہ کھٹکھٹانے کے سلسلے میں حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے اس بین الاقوامی منبر کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے ہیں اگر بھارت کے ساتھ فرخا بند پر دو ملکی گفت و شنید محض دکھاوا ہو سکتی ہے تو کشمیر کے مسئلے پر پاک بھارت مذاکرات کا کوئی قابل ذکر نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے ؟ اس طرح دیکھا جائے تو حکومت نے اپنی کمزور اور متزلزل پالیسیوں کی بدولت بھارت کے ساتھ تنازعات طے کرنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے ہیں۔ داخلہ اور خارجہ پالیسیاں دونوں ذہلمل یقینی کا شکار ہو چکی ہیں چونکہ حکومت احساس سمت کھو چکی ہے لہٰذا حالت نازک صورت اختیار کر گئی ہے۔

ایک کایا پلٹ رونما ہونے والی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تبدیلی جمہوری انداز سے آئے گی یا طوفانی انداز سے قوم ابتری یا خون خرابہ برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا نتیجہ انتشار ہو گا قومی وحدت کو بہر حال برقرار رکھنا ہو گا۔ سماجی اور اقتصادی انصاف کو بہر طور نافذ کرنا ہو گا۔ قوم کی خود مختاری اور سالمیت پر حرف نہیں آنا چاہئے۔ تبدیلی کو جمہوری اور بھرپور ہونا چاہئے۔ تمام جمہوری طاقتوں کی یہ اولین ذمہ داری ہے۔ واقعات کی رفتار وقت سے بھی تیز ہے اپوزیشن جماعتوں کو اپنی جمہوری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ ان پر لازم ہے کہ عوام کو تیار کریں کہ بحران کا منہ پھیرنے کے جمہوری طریقے تلاش کر سکیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اپوزیشن کا اتحاد ایک ناگزیر بنیادی قدم ہے لیکن اتحاد ہوا میں تو نہیں ہوا کرتا۔ اس کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ کسی مثبت "کم از کم" پروگرام پر اتفاق رائے ہو۔ آنے والے انتخابات نے ہمارے لئے اتحاد اور متحدہ پروگرام کا بڑا اچھا موقع پیدا کر دیا ہے۔

www.bhutto.org

ضروری ہے کہ انتخابات میں عزم صمیم کے ساتھ حصہ لیا جائے اور انتخاب لڑنے کے لئے عظیم تر قومی مفادات کے تحت ہم سب کے درمیان اتحاد قائم ہو جائے۔ پاکستان پیپلز پارٹی ایک بار پھر تمام اپوزیشن جماعتوں اور جمہوری طاقتوں سے اپیل کرتی ہے کہ اس قابل قدر مقصد کے لئے متحد ہو جائیں۔ اس ضمن میں ہم نے اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مفید بات چیت کا آغاز کر دیا ہے تاکہ کسی مشترکہ پروگرام پر اتفاق ہو جائے۔ ہم مولانا بھاشانی کی جماعت کے ساتھ جمہوریت اور سوشلزم کے حصول کے لئے ایک مثبت معاہدہ کر چکے ہیں۔ ہم نے پچھلے دنوں راولپنڈی میں مشرقی پاکستان کے دیگر لیڈروں سے بھی مفید مذاکرات کئے ہیں۔ تحریک جمہوریت کے قائدین کے ساتھ بھی مذاکرات فائدہ بخش رہے ہیں۔

اپوزیشن جماعتوں کے درمیان 'بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ بازی کے بغیر' باہم تعاون کرنے کا وسیع میدان موجود ہے۔ قومی اتحاد اور جمہوریت کی بحالی ان کے مشترک پلیٹ فارم کی بنیادیں بن سکتے ہیں۔ میں یہ اپیل تمام تر اخلاص کے ساتھ سب قائدین لیکن خاص طور پر مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے قائدین سے کر رہا ہوں۔ حالات کا بے ریا جائزہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ چھ نکات پر ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کریں۔ حالیہ تجربات سے انہیں پتا چل سکتا ہے کہ چھ نکاتی پروگرام میں کہاں کہاں ترمیم کی ضرورت ہے۔ حقیقی خود مختاری' جو ایک جائز مطالبہ ہے 'قومی اتحاد کو خطرے میں ڈالے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے اگر مسئلے پر اس جذبے سے نگاہ ڈالی جائے تو ایک ایسا سیاسی حل تلاش کیا جا سکتا ہے جس سے خود مختاری کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے اور قومی اتحاد کو بھی خطرہ لاحق نہ آئے۔ اگر مطالبے کی روح مطالبے کی شکل سے زیادہ اہم ہے اور لازماً ایسا ہی ہے تو چھ نکات کے بارے میں ان کا رویہ ایسا کٹر اور متشددانہ نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری صورت میں نہ صرف قومی وحدت کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا بلکہ مملکت کے وجود کو جو خطرات درپیش ہیں وہ اس حد تک ابھر آئیں گے کہ ان پر عبور پانا محال ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر اپوزیشن جماعتیں متحد ہو جائیں تو جمہوریت بحال ہو سکتی ہے' پریس آزاد ہو سکتا ہے' محنت کش طبقوں کا استحصال ہو سکتا ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ پھر پاکستان کا اصل خواب بھی پورا ہو سکتا ہے اور بالآخر آنے والی نسلوں کے لئے ایک مبارک دن طلوع ہو سکتا ہے۔

1968ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

گورنر مغربی پاکستان کے اکیس الزامات اور بھٹو کا جواب

اس سال ہفتہ 21 ستمبر کو حیدر آباد میں پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک کنونشن منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جن عوام نے میرا فتح مندانہ خیر مقدم کیا ان کا بے اختیار جوش و خروش قابل دید تھا۔ کنونشن بے حد کامیاب رہی۔ وہ ہر اعتبار سے سرزمین پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار پانے کی مستحق تھی۔ اس کے باوجود لاہور کے روزنامہ "نوائے وقت" کے سوا ملک کے دیگر اخبارات نے جن کی اکثریت پر حکومت کا براہ راست کنٹرول ہے' اس کنونشن کا ذکر تک نہ کیا۔

اس کنونشن کے موقع پر میں نے جو کچھ کہا ہو گا۔ آخر اس کی کچھ تو اہمیت ہو گی کہ گورنر محمد موسیٰ کو میرا نام لئے بغیر اپنی ایک طول طویل سلسلہ بند تقریر میں' 11 اکتوبر کو' مجھ پر حملہ کرنے کی زحمت اٹھانی پڑی جو تمام اخبارات میں من و عن شائع ہوئی۔ پاکستان کے ہزاروں افراد کو پہلے پہل اسی طرح یہ معلوم ہوا کہ کئی ہفتے قبل میں نے حیدر آباد میں ایک تقریر کی تھی جس نے حکومت پر ایسی زبردست بد حواسی طاری کر دی ہے کہ گورنر مغربی پاکستان تک' بطور تریاک' تقریر داغے بغیر نہیں رہ سکے۔ مگر لوگوں کو اخبارات کے ذریعے میری حیدر آباد کی تقریر کے اصل مندرجات سے آگاہ نہ ہونے دیا گیا کیونکہ اگر وہ جانتے تو خود ہی موسیٰ صاحب کو جھٹلا دیتے۔

گورنر موسیٰ صاحب کو گلہ ہے کہ میں اپنے سیاسی حریف پر اس کی پیٹھ پیچھے حملہ کرتا ہوں۔ حیرت ہے کہ انہیں یہ گلہ مجھ سے ہے۔ ہمارے لئے جو حزب اختلاف میں ہیں اور خاص طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کے لئے' پریس کے دروازے بند ہیں' ریڈیو کے دروازے بند ہیں اور ہم تشہیر کے ہر ذریعے سے محروم ہیں۔ جو

www.bhutto.org

ہم کہتے ہیں اسے سامنے نہیں آنے دیا جاتا' لیکن ہم پر جو اتہامات لگائے جاتے ہیں اور ہمیں جن گالیوں سے نوازا جاتا ہے ان کی نمایاں تشہیر کی جاتی ہے۔ اس بغض آمیز تنگ نظری کی زندہ مثال موسیٰ صاحب کی اپنی تقریر ہے۔ میں یقیناً دو بدو بحث کے موقع کا خیر مقدم کروں گا۔

موسیٰ صاحب کو چاہئے کہ وہ اسی سٹیج سے عوام کو خطاب کریں جس سے میں کروں اور ثابت کر دکھائیں کہ وہ اپنے حریف کا سامنا جمہوری آداب واقدام کے مطابق کر سکتے ہیں' لیکن میں ان سے ایک اور درخواست ضرور کروں گا کہ اگر اس روز موسم اسی طرح گرم ہوا جس طرح کہ میری حیدر آباد کی تقریر کے دوران میں تھا اور میں کوٹ اتار دوں تو وہ برا نہ مانیں گے وہ بلا تکلف اپنا کوٹ پہنے رکھیں' بلکہ اس کے اوپر اگر وہ اوور کوٹ بھی پہن لیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

اس اسلامی جمہوریہ کے ایک صوبائی گورنر صاحب بڑی نفرت سے فرماتے ہیں کہ حیدر آباد میں جن سامعین سے میں نے خطاب کیا وہ تانگے والوں' رکشا ڈرائیوروں اور مزدوروں پر مشتمل تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اجتماع میں مزدوروں اور کسانوں کی بھاری تعداد موجود تھی اور میں اس بات پر نازاں اور خوش ہوں۔ جن عوام کو گورنر نے اس نفرت سے یاد کیا ہے وہی تو میری متاع عزیز ہیں' یہی عوام تو میری اصل طاقت ہیں اور میرے تصور میں ایک مفلس اور غریب پاکستانی کی زندگی رسوائے زمانہ 20 خاندانوں کی تمام تر دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس ملک کے عوام اس لئے میرے حامی ہیں کہ میری پارٹی کے اقتصادی مقاصد' مساوات کے اصول پر مبنی ہیں اور ہر طبقے کو محیط ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ کنونشن میں سامعین کا اجتماع مخصوص سرکاری حکام' سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس کے ملازمین' مبینہ دانشوروں اور جبری طور پر بادل ناخواستہ آنے والے بدنصیبوں کے اس اجتماع سے یکسر مختلف تھا جس سے موسیٰ صاحب نے حیدر آباد میں اس لئے خطاب کیا تھا کہ انہیں رطب و یابس کا ایک پشتارہ مقبوضہ پریس میں چھپوانے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔

موسیٰ صاحب نے ہر گز ہر گز دشنام آمیز القابات سے اجتناب نہیں کیا انہوں نے سیاسی مردودوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ان کی مراد حزب اختلاف کے قائدوں' اور شاید سب سے بڑھ کر مجھ سے ہے۔ کیا سیاسی مردودوں سے ان کی مراد ان افراد سے ہے جن سے عوام کو نفرت ہے' جو سیاسی حقوق کی بحالی کے مخالف ہیں' جو جبر و استبداد کے سہارے حکمرانی کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اس طرح تو وہ خود حکومت کے عہدیداروں کی مذمت کرنے لگیں گے۔ نہیں' سیاسی مردودوں سے ان کی مراد ان سے ہے جو سیاسی حقوق کے لئے' اظہار و اجتماع کی آزادی کے لئے' انسانی وقار کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی بدعنوانیوں اور اختیار کے ناجائز استعمال کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ان کی دانست میں سیاسی مردود وہ لوگ ہیں جنہیں عوام کا اعتماد اور ان کی محبت حاصل ہے اور جو اسی باعث حکومت کی تیغ ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

www.bhutto.org

موسیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ بعض افراد ایسے ہیں جن کا واحد مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اقتدار پر قبضہ کر لیں۔ ان کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کیا جو لوگ آج اقتدار سے چمٹے ہوئے ہیں یہ وہی نہیں جنہیں اقتدار کی ہوس تھی اور جو بندوق دکھا کر اقتدار پر قابض ہو گئے اور اب پوری قوم کی خواہشات کے خلاف کسی قیمت پر بھی اقتدار سے علیحدہ ہونے کے لئے تیار نہیں ؟ ان لوگوں کی ذہنیت ملاحظہ ہو کہ اپنے استبداد اور اندھیر نگری کا 10 سالہ جشن منا رہے ہیں۔ پاکستان کے لوگو ! اپنے گم گشتہ سالوں کا نوحہ کرو۔

اقتدار کے پجاری وہ لوگ نہیں جنہوں نے اصولوں کی خاطر 'قومی مفادات کی خاطر 'اقتدار کو خیرباد کہہ دی 'بلکہ وہ لوگ ہیں جو ایک مرتبہ برسر اقتدار آ گئے اور اب 'خواہ قوم تباہ و برباد ہو جائے 'اقتدار سے دست کش ہونے کو تیار نہیں۔

اس بے اصول حکومت کے ایک ترجمان کے منہ سے اصولوں کا تذکرہ سن کر اچنبھا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ لفظ ان کے منہ پر چڑھا ہوا ہے ، موجودہ ارکان حکومت کی کوئی " آئیڈیالوجی " نہیں کیونکہ انہوں نے وہ اصول ترک کر دیئے ہیں جو انہیں ورثے میں ملے تھے۔ یوں پاکستان میں جمہوریت کی روح فنا کر کے رکھ دی گئی ہے 'بلکہ جمہوریت کے لفظ کی بھی حکومت کی ایجاد کردہ بنیادی جمہوریت کے حوالے سے دیدہ و دانستہ مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ پھر وہ قومی حاکمیت اور حق خود ارادیت پر سمجھوتہ بازی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ نظریہ پاکستان کو دفنا کر وہ محض دولت سمیٹنے کے لئے حکمرانی کر رہے ہیں

ان کے برعکس ہمارے اصول الم نشرح ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نظریات واشگاف ہیں۔ انہیں اجمالاً یوں بیان کیا گیا ہے۔

اسلام	ہمارا	دین	ہے
جمہوریت	ہماری	سیاست	ہے
سوشلزم	ہماری	معیشت	ہے

ہمارا ایک سیاسی پروگرام ہے جس کا مزاج جمہوری اور سوشلسٹ ہے۔ لیکن اس کے برعکس حکومت کے مبہم فلسفے کی حد لوٹ مار 'استحصال اور چند چہیتے ہاتھوں میں دولت کے تباہ کن ارتکاز تک ہے۔

موسیٰ صاحب کا گمان ہے کہ اندرونی خلفشار کے پیچھے کچھ شیطان صفت ساز شیوں کا ہاتھ ہے۔ نہیں 'یہ خلفشار حکومت کی اپنی کارروائیوں اور پالیسیوں کا کرشمہ ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے قبائلی منافرت کو ہوا دی ہے۔ انہوں نے زبان کے مسئلے کو پھر سے چھیڑ دیا ہے حالانکہ یہ کل تک سب کے نزدیک ایک طے شدہ مسئلہ تھا۔ اب اس مسئلے نے دوبارہ سر اٹھا لیا ہے اور ایسے جذبات ابھار دیئے ہیں کہ انہیں آسانی سے فرو کرنا محال ہو جائے گا۔

حکومت جس طرز نگاہ سے معاملات کا جائزہ لیتی ہے وہ نسلی تعصبات کا حامل ہے کیونکہ حکومت میں ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ حکمرانی ان کا مقصد ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو علاقائی عصبیت کو ہوا

www.bhutto.org

دے کر اور دونوں بازوؤں کے درمیان اختلافات بھڑکا کر قومی اتحاد کو کمزور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے برسر اقتدار آنے سے قبل چھ نکات کے مطالبے کا کبھی سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا' نہ کسی نے جئے سندھ کا نعرہ سنا تھا۔ ان کے برسر اقتدار آنے سے قبل عظیم تر بلوچستان کی بات بھی نہ چلی تھی اور نہ پختونستان کے مطالبے کا احیاء ہوا تھا۔ ان کا دس سالہ دور اقتدار پنجاب کے لئے مایوسی اور کراچی کے لئے نامرادی لایا ہے کہ جہاں کبھی کربلا کی طرح' پانی نہیں ملتا اور کبھی شکر جیسی بنیادی اشیائے صرف عنقا ہو جاتی ہیں۔ سندھ اور بلوچستان مضطرب ہیں۔ بنگال کشیدہ خاطر ہے۔ اور سرحد میں حکمرانوں کے مٹھی بھر حواریوں نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ ان کے جبر نے اندرونی منافرتیں اور خصومتیں پیدا کر کے لوگوں میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ حکومت چونکہ مساویانہ شرکت میں ایمان نہیں رکھتی' بلکہ امراعات کی قائل ہے اس لئے وہ ایک ایسی قوم میں افہام اور ہم آہنگی نہیں ابھار سکتی' جس کے باشندے مختلف زبانیں بولتے ہیں' مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور علاقائی روایات اور رسوم سے وابستہ ہیں۔

موسیٰ صاحب کے خیال میں میری سب سے بڑی تقصیر یہ ہے کہ میں سوشلسٹ ہو کر حزب اختلاف کی صفوں میں اتحاد کو فروغ دینے میں کوشاں ہوں۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں اس کوشش سے کبھی غافل نہیں رہا' لیکن میری اس کوشش میں کچھ اور لوگ بھی میرے شریک حال ہیں۔ اپوزیشن پارٹیوں کو حکومت کے خلاف کسی متحدہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش صرف میں ہی نہیں کر رہا۔ میں کھلے بندوں اعلان کر چکا ہوں کہ تمام اپوزیشن پارٹیاں ایک مشترکہ نصب العین پر سر جوڑ کر کام کر سکتی ہیں جو بالغ رائے دہی کی بحالی' بنیادی حقوق اور جمہوری آزادی پر مشتمل ہو گا۔ میری جماعت کے اصولوں کا کسی طرح بھی اس نصب العین سے ٹکراؤ نہیں.......... اور ان اصولوں کی نگہداشت بہرحال موسیٰ صاحب کے ذمے نہیں۔

اپوزیشن پارٹیوں کے متحدہ محاذ کے بارے میں میرا تصور بہت سے ملکوں میں خصوصاً آمریتوں کے خلاف بروئے عمل آ چکا ہے اور کاروبار سیاست کی جانی پہچانی ریت ہے خود پاکستان کی 21 سالہ تاریخ میں ایک متحدہ محاذ 1954ء اور دوسرا حال ہی میں' گزشتہ صدارتی انتخابات کے دوران وجود میں آ چکا ہے۔ میں پاکستانی عوام کی جانب سے اس بات کو اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ عوام کی حاکمیت بحال کرنے کے مشترکہ مقصد کے لئے دوسری جماعتوں کے ساتھ اتحاد قائم کروں۔

جہاں تک "جاگیرداروں" سے میرے روابط کا تعلق ہے اور جن کے بارے میں موسیٰ صاحب کا خیال ہے کہ میرے اصولوں کے منافی ہیں' میں ان کی توجہ اس حقیقت حال کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو صوبے کے گورنر کے طور پر ان سے ڈھکی چھپی نہ ہونی چاہئے کہ بہت سے "جاگیرداروں" کے سیاسی عقائد انتہائی ترقی پسندانہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ان عقائد ہی کے باعث اس حکومت کے ہاتھوں مصیبتیں سہ چکے ہیں۔ اس میں ان کا کیا قصور کہ وہ جاگیردار گھرانوں میں پیدا ہو گئے۔ ہر کوئی اتنا خوش نصیب تو نہیں ہو سکتا کہ وہ نادار گھرانے میں پیدا ہو اور اتنی دولت اور اختیار سمیٹ لے کہ اس حکومت میں

جاگیرداروں کو بھی میسر نہ آئے۔ مثال کے طور پر میں گورنر موسیٰ کی توجہ، سردار کے خطاب کا تو ذکر ہی کیا، شہزادے اور نواب جیسے خطابات کے استعمال بے جا کی جانب دلانا چاہتا ہوں، جسے حکومت ایک پالیسی کے طور پر روا رکھ رہی ہے۔ موجودہ حکومت کے یہاں جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کرنے کا ٹھوس اور واضح رجحان پایا جاتا ہے۔

موسیٰ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ "میرا تازہ ترین مشیر اس علاقے کا وہ عظیم دانش ور ہے جسے ہائی کورٹ نے پاکستان کا غدار قرار دیا ہے۔" مجھے یہ حسن ظن ہے کہ موسیٰ صاحب لفظ مشیر کے معنی جانتے ہیں چنانچہ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ مجھے مشیر کی ضرورت نہیں میرے ارد گرد پارٹی کے ایسے مخلص کارکن موجود ہیں جنہیں میں ہم خیال و ہم مشرب رفقائے کار سمجھتا ہوں۔ سوشلسٹوں کی نحیف و نزار شخصیتوں اور ناصحوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ .... ایسے راسپوٹین ارباب اقتدار کو مبارک رہیں۔

اس حکومت کے ترجمانوں کو میرا بعض لوگوں سے ملنا جلنا نہ جانے کیوں قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ خود اس حکومت نے حال ہی میں اپنے حواریوں کے انتخاب کے ضمن میں کس کردار کا مظاہرہ کیا ہے؟ جب یہ حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے سیاست دانوں کو بد معاشوں کا خطاب دیا۔ ان کی بد عنوانیوں اور دوسرے گناہوں کا ڈھول پیٹا اور ایبڈو کے تحت ان میں سے اکثر کو سیاسی زندگی سے محروم کر دیا۔ 8 اکتوبر 1958ء کو صدر ایوب نے قوم کے نام اولین نشریے میں یہ کہنا مناسب سمجھا تھا:

> "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ ابتر حالات ان خود غرض لوگوں نے پیدا کیے ہیں جو سیاسی قائدوں کے لبادے میں لوگوں کو لوٹتے رہے یا ذاتی فائدوں کی خاطر سودا بازی کرتے رہے۔ ان میں سے بعض یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ انہیں دعویٰ تھا کہ پاکستان انہی کی تخلیق ہے اور بعض ایسے تھے جو پاکستان کے تصور ہی کے خلاف تھے۔ انہوں نے کھلے بندوں اس کی تباہی کی کوشش کی یا اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے مسائل کو الجھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ان لوگوں کا مقصد ذاتی نام و نمود یا ہوس اقتدار کے سوا کچھ نہیں۔
>
> اب ایک بات انتشار پسندوں، سیاسی طالع آزماؤں، سمگلروں، کالے چوروں اور اسی قماش کے دیگر سماجی کیڑوں، شارکوں اور جونکوں سے کہنی چاہتا ہوں۔ سپاہی اور عوام تمہاری شکل تک سے بیزار ہیں۔ لہٰذا تمہاری صحت کے لئے اچھا ہو گا کہ تم اپنے لچھن درست کر لو، ورنہ تمہارا حساب جلد اور یقینی طور پر چکا دیا جائے گا۔ بہر حال ان

www.bhutto.org

> لوگوں کو اس مغالطے میں نہیں رہنا چاہئے کہ ہم ان سے غافل ہیں......... ہماری انتھک کوشش ہو گی کہ جتنی جلدی ہو سکے ان کی گردن دبوچ لیں۔"

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ صورت حال بدلتی گئی۔ حکومت ایبڈو زدہ سیاست دانوں سے پینشنیں بڑھانے یا انہیں اونچے اونچے عہدے دینے لگی۔ ایک ایبڈو زدہ سیاست دان جس کے خلاف شرمناک جرائم کے سب سے زیادہ شدید الزامات لگائے گئے تھے اب موسیٰ صاحب کی کابینہ کا رکن ہے۔

یہ حکومت جس کسی کو ناپسند کرتی ہے اسے کھڑے کھڑے غدار قرار دے دیتی ہے وہ لوگ جو پس پردہ رہ کر جوڑ توڑ کیا کرتے تھے اور اب حکومت میں شامل ہیں انہوں نے فضل الحق کو بھی غدار قرار دیا تھا لیکن بعد ازاں اسے وزیر بنا دیا۔ وہ سہروردی کو بھارتی شہری اور غدار قرار دیتے تھے لیکن اسے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس حکومت نے وطن دشمن سرگرمیوں کے الزام میں خان قلات کو قید کیا لیکن اب وہ موسیٰ صاحب کے مشیر ہیں۔

اس حکومت کی لغت میں کاسہ لیسوں کو محب وطن اور مخالفوں کو غدار کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں بخوبی علم ہے پاکستان کے عوام کی بھاری اکثریت اس حکومت کے خلاف ہے۔ کیا یہ سب بھی غدار ہیں۔

موسیٰ صاحب نے میرے متعلق کہا ہے:

> "یہ شخص ان لوگوں سے ربط وضبط رکھتا ہے بلکہ ان کی قانونی پیروی کرنے کو بھی تیار ہے جن پر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا منصوبہ بنانے کا الزام ہے اور جن پر آج کل مقدمہ چل رہا ہے۔"

موسیٰ صاحب نے شیخ مجیب الرحمن اور مبینہ اگرتلہ سازش کیس کے دوسرے ملزمین کی جانب سے یہ اشارہ کر کے صریحاً توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے اور کاروبار عدل کو بری طرح متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں قانون کے بنیادی اصولوں کی خبر ہونی چاہئے کہ جب تک کسی شخص کا جرم ثابت نہ ہو جائے اسے معصوم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن موسیٰ صاحب دیدہ و دانستہ اس اصول کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ عدالت میں ایک وکیل کی حیثیت سے میری حاضری میرے اس عقیدے کے ذرا بھی منافی نہیں کہ ہمیں بھارت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ اتنی معمولی بات ہے کہ سمجھ میں نہیں آتی تو شاید موسیٰ صاحب کے نہیں آتی۔

موسیٰ صاحب نے کینیڈی مارکیٹ کے ضمن میں جو کچھ میرے متعلق فرمایا ہے وہ یکسر غلط ہے۔ یہ معاملہ بھی چونکہ عدالت میں زیر غور ہے اس لئے میں فی الحال اس پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ عدالت ہائے انصاف کے بارے میں موسیٰ صاحب کے غیر مناسب رویّے کی یہ ایک اور مثال ہے۔

ون یونٹ کے مسئلے پر میرے موقف میں کوئی تضاد نہیں۔ میں نے بالکل صاف صاف کہا ہے کہ

www.bhutto.org

دوسرے دستوری معاملات کی طرح اس کو بھی عوام کے جمہوری فیصلے کے مطابق طے پانا چاہیئے نہ کہ کسی آمر کے من مانے فرمان سے۔ اگر یہ حکومت ون یونٹ کی عظیم محافظ ہونے کی دعویٰ دار ہے تو اس میں اتنی اخلاقی جرات ہونی چاہیئے کہ لوگوں کو بتائے کہ 1961ء میں جنرل کے۔ ایم شیخ کے تحت اس نے جو بالا اختیار کمیٹی مقرر کی تھی اس کی غرض و غایت کیا تھی۔ حکومت کے جن ترجمانوں نے مسند اقتدار کے گرد ایک رفیع الشان شیشے کا گھر تعمیر کیا ہے انہیں دوسروں پر پتھر پھینکنے سے پہلے گریبان میں جھانک لینا چاہیئے۔

موسیٰ صاحب کی حکومت جس نے یونیورسٹی آرڈی ننس کے ذریعے طالب علموں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں، ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ ان کے ساتھ ملک کے آئندہ رہنماؤں کا سا سلوک کر رہی ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہ موقف ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوان ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہیں مستقبل کی قیادت کے لئے تیار کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے نہ کہ انہیں دبا دیا جائے۔ ملک کے نوجوان جانتے ہیں کہ اپنے حامیوں اور اپنے حقوق کے غاصبوں کے درمیان کیونکر امتیاز کریں۔ وہ موسیٰ صاحب کے اتہامات سے گمراہ نہیں ہوں گے۔

موسیٰ صاحب پوچھتے ہیں کہ میں 1965ء میں کہاں تھا اور محاذ جنگ پر کیوں موجود نہ تھا۔ میں یقیناً وہیں تھا جہاں مجھے ہونا چاہیئے تھا۔ میں ملک کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے پاکستان کے لئے بین الاقوامی تائید حاصل کرنے میں کوشاں تھا کیونکہ بحران کے لمحات میں یہی میرا سب سے اہم فریضہ تھا۔ چین، انڈونیشیا، ایران اور ترکی کے ساتھ اہم مذاکرات میرے سپرد تھے۔ میں کوئی پیشہ ور سپاہی نہیں۔ میں وہ کام کر رہا تھا جو مجھے سونپا گیا تھا اور جس کے لئے میں جواب دہ تھا۔

کیا موسیٰ صاحب دشمن پر مشین گن سے گولیاں چلا رہے تھے یا ان پر دستی بم پھینک رہے تھے وہ ایک پیشہ ور سپاہی ہیں لیکن کمانڈر انچیف کی حیثیت سے وہ اس مقام پر تھے جہاں کمانڈر انچیف ہوتا ہے اور یہ مقام محاذ جنگ پر نہیں ہوتا۔ میں اس مقام پر تھا جہاں مجھے وزیر خارجہ کے طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ بین الاقوامی حمایت حاصل کروں اور یہ کام اس حد تک انجام پایا کہ جنگ کے دوران وزیر اعظم شاستری نے رونا دھونا مچا دیا کہ بھارت بے یار و مددگار رہ گیا ہے۔ پاکستان کے سنگین ترین بحرانی لمحات کے دوران میں نے جو خدمات انجام دیں قوم نے اس کا نہایت فیاضی سے انتہائی واشگاف انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ 1965ء کی جنگ کے دوران میں نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے بین الاقوامی پریس اور غیر ملکی نشریات کی ایک جھلک کافی ہے۔

انہیں شکایت ہے کہ میں نے وزارت امور خارجہ کی قائم کردہ ایک خاص کمیٹی کے اجلاس میں شرکت نہ کی۔ جس کمیٹی کا وہ ذکر کر رہے ہیں وہ سیکرٹریوں کی سطح پر تھی اور جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا وزارت خارجہ کا سیکرٹری اس میں شرکت کرتا رہا۔ وزارت دفاع کی جانب سے جنرل موسیٰ اس لئے شریک ہوئے کہ وہ کمانڈر انچیف تھے، وزیر دفاع نہیں تھے۔ وزیر کی حیثیت سے میرے ذمے یہ کام نہیں تھا کہ میں

www.bhutto.org

سیکرٹریوں کے اجلاس میں شرکت کروں جس کی سفارشات بالآخر اس کابینہ کے سامنے پیش ہوئی تھیں جس کا میں رکن تھا۔ امور خارجہ کے وزیر کی حیثیت سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں موسیٰ صاحب کی اوٹ پٹانگ سفارشات کو کابینہ میں مسترد کرا سکوں۔ حکومت میں اتنے سال کاٹنے کے بعد موسیٰ صاحب کو کاروبار حکومت کے قواعد و ضوابط کا بخوبی علم ہو جانا چاہئے تھا۔ اگر یہ نکتہ اب بھی ان پر واضح نہیں ہوا تو انہیں اپنے سیکرٹریٹ سے کہنا چاہئے کہ اس پر روشنی ڈال دے۔

ان کا یہ الزام کہ میں نے کشمیر کے مسئلے پر بے تعلقی برتی، اس قدر فضول ہے کہ اس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ کشمیر کے مسئلے پر اس حکومت کا ریکارڈ اس قدر افسوسناک اور اس کا موقف اس قدر کمزور ہے کہ وہ ایک ایسے شخص پر انگشت نمائی کی جرات نہیں کر سکتی، جس نے جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت پر ایک مستحکم موقف کو اپنایا اور ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی پالیسی پر سختی سے کاربند رہا۔ مجھے اس حکومت نے میرے حکومت سے الگ ہوتے ہی اپنی کمزوری کے باعث ترک کر دیا۔

گورنر موسیٰ کہتے ہیں کہ جب جنرل سکندر مرزا اقتدار سے محروم ہو گئے تو میں نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ اپنی وزارت کے دوران میں نے کبھی ایسا نہیں کیا، بلکہ جب بھی میں لندن سے گزرا میں اکثر انہیں سلام کرنے کے لئے جاتا رہا اور میں واحد وزیر تھا جس کا یہ شیوہ تھا۔ موسیٰ صاحب کو خود جنرل سکندر مرزا سے پوچھنا چاہئے کہ کیا میں نے ان سے بے وفائی کی یا موسیٰ صاحب اور دوسروں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔

سپاس گزاری اور وفاداری کی بات چل نکلی ہے تو میں موسیٰ صاحب کے بارے میں بھی چند باتیں کہہ سکتا ہوں۔ خاص طور پر انہیں وہ مواقع یاد کرنے چاہئیں جب وہ میرے پاس یہ درخواست لے کر آیا کرتے تھے کہ کمانڈر انچیف کے طور پر ان کے عہدے میں توسیع کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کروں۔ موسیٰ صاحب کو یہ بھی یاد ہو گا کہ جب عہدے میں توسیع کے بجائے انہیں کسی ملک کا سفیر مقرر کر دیا گیا تو انہوں نے کس قدر تند و تلخ باتیں کی تھیں۔ مجھے یہ باتیں محض اس لئے کرنی پڑ رہی ہیں کہ انہوں نے میرے لئے اور کوئی چارۂ کار نہیں چھوڑا۔ لیکن میں اس ناخوشگوار موضوع کے بارے میں، ان ہی باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

موسیٰ صاحب نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے بعض دفاعی راز فاش کر دیئے ہیں۔ میں نے کوئی راز فاش نہیں کیا۔ اگر میں نے ایسا کیا ہے تو ان میں یہ واضح کرنے کی جرات ہونی چاہئے کہ میں نے کون سا خاص دفاعی راز فاش کیا ہے۔ یہ کہنے سے کوئی دفاعی راز فاش نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ جب میں عوامی جمہوریہ چین سے اپنے منصب کی ادائیگی کے بعد لوٹا اور نتائج کے بارے میں صدر صاحب کو رپورٹ دی تو اچھل کر سے اچھل پڑے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر کہا کہ قوم ہمیشہ تمہاری احسان مند رہے گی۔ گویا پاکستان کے عوام کو یہ پتا ہی نہیں کہ میں کبھی چین بھی گیا تھا۔

www.bhutto.org

جب حکومت کے ترجمان مجھ پر حملہ اور کیچڑ اچھالنا چاہتے ہیں تو انہیں ذرا فکر نہیں ہوتی کہ کیا کیا سرکاری راز فاش کر رہے ہیں اور موسیٰ صاحب نے تو اپنی حیدر آباد کی تقریر میں بار بار ایسا کیا ہے لیکن وہ میرا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ میں اپنے موقف اور وقار کا تحفظ کر سکوں جب میں ان لوگوں کا پول کھولتا ہوں تو وہ چیخ اٹھتے ہیں کہ میں نے وفاقی راز فاش کر دیا ہے۔

اگر انہیں دشمن پر راز افشا ہونے کے خطرے کے ذکر پر اتنا ہی اصرار ہے تو انہیں یاد کرنا چاہئے کہ صدر صاحب کا وزیر خزانہ ایک بیرونی طاقت کا ملازم تھا۔ یہ شخص جسے تمام قواعد و ضوابط اور عقل سلیم کے تحت اول درجے کا وفاقی خطرہ قرار دیا جانا چاہئے تھا، ملک کے شدید ترین بحرانی دور میں بھی خصوصی نوازشات سے بہرہ ور رہا۔ گو کہنے کو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن میں فی الحال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

میں نے عہدے کا حلف بھی نہیں توڑا، لیکن موسیٰ صاحب جو مجھ پر اس کا الزام دھرتے ہیں، انہوں نے 1958ء میں نہ صرف اپنے عہدے کا حلف توڑا تھا بلکہ اس دستور ہی کو ختم کر دیا تھا جس کی وفاداری کی انہوں نے قسم اٹھا رکھی تھی۔

بہر حال یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ وفاقی رازوں کے افشا اور عہدے کا حلف توڑنے کے الزامات کی تہہ میں کیا ہے۔ رازوں اور عہدوں کے حلف کے تحفظ سے حکومت کو یہ کھلی چھٹی نہیں مل جانی چاہئے کہ وہ انہیں ایسے لبادہ ظلمت کے طور پر استعمال کرے جو ان کے عہد شکنیوں اور عوام کے حقوق کو غصب کرنے والی کارروائیوں کو ڈھانپ لے۔ اگر کوئی اختیار کے ناجائز استعمال اور عہدوں کے تجاوزات کے خلاف احتجاج کرے تو اسے سرکاری رازوں کے افشا کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

وفاقی رازوں اور عہدے کے حلف کے بارے میں حکومت کا تصور یہ ہے کہ اہل وطن کے ہونٹوں کو سی دیا جائے حالانکہ اس کے اپنے عمائدین بھارت کے ساتھ حل طلب تنازعات کے تصفیے کے لئے غیر ملکیوں کے ساتھ طرح طرح کے ترغیب آمیز ہتھکنڈوں پر گفتگو کرتے ہوئے ہر طرح کی معلومات ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ قریب قریب تین سال قبل جب میں نے وزارت چھوڑی، تو میں کوئی ملکی راز فاش کئے بغیر، ایسے انکشافات کر سکتا تھا جس سے حکومت کی بنیادیں ہل جاتیں۔ میں محض اس لئے خاموش رہا کہ اس وقت جو حالات کار فرما تھے ان میں پاکستان کے دشمنوں کو اس اقدام سے بہت فائدہ پہنچتا۔ تین سال بیت گئے ہیں اور صورت حال بہت بدل گئی ہے۔ اب عوام کا مفاد اس میں ہے کہ بعض انکشافات کر دیئے جائیں کیونکہ اب ان انکشافات سے کوئی غیر ملکی طاقت فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اگر حقائق ہمیشہ راز میں رہا کرتے تو تاریخ کا نام و نشان ہی نہ ہوتا۔

تاشقند کے بارے میں کچھ کہنے اور اس مسئلے کے اندرونی راز فاش کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

حیدر آباد کی کنونشن میں، میں نے کہا تھا کہ میں تاشقند اور اس کے معاہدے کی تفصیلات کے بارے میں

www.bhutto.org

کچھ بتاؤں گا۔ موسیٰ صاحب نے مجھ پر یہ غلط الزام لگا کر کہ میں نے تاشقند کا مسودہ تیار کیا تھا' خود افشائے راز کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ جانی پہچانی بات ہے اور اس نوعیت کی کانفرنسوں کا عام دستور ہے کہ جو لوگ ثالثی کی پیشکش کرتے ہیں۔ اس معاملے میں یہ منصب سوویت روس کا تھا جس کے زیر اہتمام تاشقند کانفرنس منعقد ہوئی تھی...... وہی مذاکرات کی اساس کے طور پر ایک مسودہ پیش کرتے ہیں۔ میں نے ابھی تک اس ضمن میں کوئی بیان نہیں دیا کہ اس مسودے کے بارے میں میرا ردعمل کیا تھا اور نہ ہی میں نے مذاکرات کے انداز پر اور معاہدے کی انجام دہی پر زبان کھولی ہے۔

کیا حکومت کی یہ نیت ہے کہ تاشقند کی بلاخیز پٹاری کا ڈھکنا اٹھا دیا جائے ؟ خواجہ شہاب الدین نے فروری 1967ء میں ڈھاکے کے مقام پر اس تنازع کی ابتدا کی تھی۔ انہوں نے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ چھوڑا کہ میں ان کی للکار پر لبیک کہوں اور اس مسئلے کے تانے بانے کو زیر بحث لے آؤں' لیکن وہ پسپا ہو گئے ، کیوں کہ انہیں حکومت کے موقف کی کمزوری کا بخوبی احساس ہو گیا تھا۔ کیا حکومت نے اپنی لاجواب دانش مندی سے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اس معاہدے نے جو زخم لگائے تھے انہیں پھر سے ہرا کر دیا جائے۔ اگر حکومت اس مسئلے کو پھر سے اٹھانے کی خواہاں ہے تو نتائج کی تمام تر ذمہ داری اس کے کندھوں پر ہوگی۔

جب میں اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ میری رائے میں تاشقند میں قوم کے مفادات کو نقصان پہنچا' تو میں کسی راز سے پردہ نہیں اٹھا رہا ہوتا۔ گزشتہ تین سال کے دوران لوگوں کو اتنی معلومات میسر آ گئی ہیں کہ وہ خود بھی نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس موضوع پر بھارت ہی میں نہیں' بلکہ اور ملکوں میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

وہ لوگ جو غیر ملکی اخبار پڑھتے ہیں انہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ میں نے اعلان تاشقند کی مخالفت کی تھی۔ اہل وطن کو یاد ہو گا کہ میں تو تاشقند سے واپس آ کر تین ہفتوں کے لئے گھر چلا گیا تھا لیکن اس عرصے میں صدر ایوب خان لوگوں کے سامنے اعلان تاشقند کی وضاحت کرتے پھر رہے تھے۔

موسیٰ صاحب ان حالات سے بخوبی واقف ہوں گے جن کے پیش نظر میں فوری طور پر حکومت چھوڑ کر نہ چلا گیا۔ اب اصل حقیقت یہ ہے کہ میں نے تین مرتبہ استعفیٰ پیش کیا تھا۔ ایک مرتبہ اعلان تاشقند پر دستخط سے پہلے اور دو مرتبہ اس کے بعد۔ لیکن مجھے یہی کہا گیا کہ اگر میں نے اس وقت اپنے منصب سے علیحدگی اختیار کی تو یہ ایسے وقت میں ساتھ چھوڑ جانے کے مترادف ہو گا جب پاکستان ایک سنگین بحران سے دوچار تھا اور بیرونی فوجیں سرزمین وطن پر موجود تھیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ بحران کے لمحات میں اتحاد انتہائی ضروری ہے۔ اس پر میں بعض شرائط پر جنہیں میں ابھی طشت ازبام نہیں کر سکتا ڈھاکے میں قومی اسمبلی سے خطاب کرنے پر راضی ہو گیا۔

مجھ پر یہ الزام لگانے کے بعد کہ میں نے راز افشا کئے ہیں موسیٰ صاحب نے حکومت کا پول کھولتے

ہوئے اور اس کے لئے پریشانی کا موجب بنتے ہوئے خود یہ راز فاش کر دیا ہے کہ بھارت نے جنگ بندی کے وجود میں آنے سے تین چار روز پہلے اس کے لئے التجا کرنی شروع کر دی تھی وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جنگ بندی عالمی رائے کو مطمئن کرنے کے لئے تسلیم کی تھی۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے جانباز سپاہیوں کے خون اور قومی مفادات کو عالمی رائے کے سراب کی بھینٹ چڑھا دیا اور یہ ایسی بات ہے کہ آج تک کسی دوسری قوم نے یوں نہیں کیا۔ موسیٰ صاحب کا یہ اعتراف تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور پاکستان کے عوام اس حکومت کے اعمال کا ضرور محاسبہ کریں گے۔

اس وقت عالمی رائے عامہ کی کسی متحدہ ہیئت جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہ تھا۔ اکثر و بیشتر ممالک نے کھل کر ہماری حمایت کی۔ ایک عظیم طاقت "چین" نے ہمارے حق میں الٹی میٹم دینے کا اقدام بھی کیا۔ ایک اور بڑی طاقت "فرانس" نے سلامتی کونسل کو تجارتی پابندیوں کی قرارداد منظور کرنے کی اجازت نہ دی........

جب جنگ جاری تھی تو ہمیں متعدد ممالک سے نہ صرف اخلاقی بلکہ مادی امداد بھی ملی۔ صرف ان چند ممالک نے جنہیں ہمارے موقف سے ہمدردی نہ تھی، ہمیں جنگ بندی قبول کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اپنے کئی کے دشمنوں کی خواہشات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور اپنے حامیوں کو بیچ منجدھار چھوڑ دیا۔ یوں ہم نے مبینہ عالمی رائے کو مطمئن کرنے کے لئے اپنے مفادات قربان کر دیئے اور خون شہداء کی بے حرمتی کی۔

ایک جگہ گورنر صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنے رفقاء کار سے متفق تھا کہ فائر بندی کو تسلیم کر لینا دانشمندانہ پالیسی ہے۔ "اگر یہ شخص اس کے خلاف تھا" موسیٰ صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں "تو اسے اسی وقت اپنی نیت کا اعلان کر دینا اور کھلے بندوں اختلاف کا اظہار کرنا چاہئے تھا" اس بیان سے کچھ ہی پہلے موسیٰ صاحب یہ کہہ چکے ہیں کہ فائر بندی کے مقررہ وقت سے صرف آدھا گھنٹہ پہلے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو جنگ بند کر دینے کے بارے میں پاکستان کے موقف سے آگاہ کیا گیا تھا جو کچھ اقوام متحدہ میں پیش آیا ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنی بات تو طے ہے کہ اس وقت میں وہاں تھا۔ اگر یہ تسلیم ہو کہ میں اس وقت وہاں موجود تھا تو میرے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ جنگ بندی کے فیصلے سے اتفاق کرنے یا اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے میں اپنے رفقائے کار کے پاس ہوتا؟ میرے لئے کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک ہی وقت میں نیویارک اور راولپنڈی میں موجود ہوتا۔

موسیٰ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے کھلے بندوں اظہار اختلاف کرنا چاہئے تھا۔ یقیناً وہ سنجیدگی سے نہیں کہہ سکتے کہ مجھے امریکہ یا پاکستان سے باہر جنگ کے دوران میں خود سرزمین پاکستان میں کھلم کھلا اختلاف رائے کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔

موسیٰ صاحب نے مجھ پر جو اتہامات لگائے ہیں ان میں سب سے بے بنیاد اور شرمناک اتہام یہ ہے کہ میں نے بھارتی تخریب کاروں کی پشت پناہی کی۔

www.bhutto.org

مجھے نیویارک میں تھرپارکر سے صوبائی اسمبلی کے ایک ممتاز ہندو رکن کا ہیجانی پیغام ملا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس کے فرقے کے لوگوں کو قتل عام کا خوف لاحق ہے۔ اس نے مجھ سے وزیر خارجہ کی حیثیت سے اپیل کی تھی کہ پاکستان کے وفادار شہریوں کے طور پر ان کی زندگیوں کے تحفظ کا سامان کروں۔ یہ ایک دستوری ذمہ داری ہے کہ اپنے ہر فرقے کے شہریوں کا تحفظ کیا جائے ہم پر یہ ذمہ داری ہمارے دین کی جانب سے بھی عائد ہوتی ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کا تحفظ کریں۔ جب یہ پیغام ملا تو میں نے حیدر آباد کے کمشنر سے رابطہ پیدا کیا اور اس سے کہا کہ نظم و نسق برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور کوئی نا انصافی نہ ہونے دے۔ اگر پاکستانی ہندوؤں پر حملہ ہو جاتا تو اس کے نتیجے میں لاکھوں بھارتی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

1948ء میں حالات اتنے نازک نہیں تھے' لیکن جب کراچی میں فسادات برپا ہوئے تو سر ظفر اللہ خان نے 'جو اس وقت وزیر خارجہ تھے' قائداعظم کو اس مضمون کا تار بھیجا تھا کہ اگر فسادات یونہی جاری رہے تو سلامتی کونسل میں ہمارے کیس کو بری طرح نقصان پہنچے گا۔ جب میں نے 1965ء میں صوبائی اسمبلی کے ایک ایسے رکن کی اپیل پر 'جو تھرپارکر کا پاکستانی ہندو بھی تھا' یہ اقدام کیا تو 1948ء سے بھی خراب نتائج مرتب ہو سکتے تھے۔

جس کسی نے بھی تخریب کاری کا ارتکاب کیا اس کے خلاف قانونی کارروائی کی گئی اور اسے سزا دی گئی اس حقیقت حال سے کہ صوبائی اسمبلی کے اس ہندو رکن کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کی گئی اور وہ اب بھی اسمبلی میں سرکاری بنچوں پر بیٹھتا ہے' یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ حکومت اسے مجرم نہیں گردانتی۔

اس لغو الزام کا یہ مضحکہ خیز پہلو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ جنگ کے دوران جب میں کراچی پہنچا تو مجھے مطلع کیا گیا کہ میرے تحفظ کے لئے غیر معمولی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ خبر ملی ہے کہ بھارتیوں نے راجستھان محاذ سے مجھے قتل کرنے کے لئے کمانڈو بھیجنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ وہ شخص جو بھارتیوں کے غیض و غضب کا نشانہ بن رہا اسی پر یہ الزام دھرا جا رہا ہے کہ وہ بھارتی تخریب کاروں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

حکومت کو ہاتھ پاؤں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے میں کوشاں ہے۔ حکومت اپنے ملک کے پریس پر تو کنٹرول کر سکتی ہے لیکن دوسرے ملکوں کے وسائل' اطلاعات تو اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ جو امور حکومت کی دکھتی رگ ہیں ان پر باہر بہت کچھ لکھا لکھایا گیا ہے جس کا کچھ نہ کچھ حصہ پاکستان میں بھی در آتا رہتا ہے۔ حکومت کی بدعنوانیاں لوگوں سے زیادہ دیر ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتیں۔

میں یہ سادہ سا سوال کرنا چاہتا ہوں کہ موسیٰ صاحب نے مجھ پر جو الزامات اب لگائے ہیں یہ اس وقت

www.bhutto.org

کیوں نہ لگائے جب میں نے حکومت کو خیرباد کہی ؟ مجھ پر دستور کے آرٹیکل 121 کی دفعات کا اطلاق کیوں نہ ہوا ؟ اس کے برعکس صدر صاحب نے مجھ پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے اور قوم سے یہ بات چھپانے کا جتن کرتے رہے کہ میں حکومت سے دراصل کسی بات پر علیحدہ ہوا ہوں۔ موسیٰ صاحب کو جواب دینا چاہئے کہ اس وقت لوگوں کو اصل واقعات کے متعلق اندھیرے میں رکھنے کا اس قدر اہتمام کیوں کیا گیا۔ مجھ سے یہ التجائیں کیوں کی گئی کہ میں رخصت پر اور ملک سے باہر چلا جاؤں اور میری حمایت میں اس قدر عدیم المثال مظاہرے کیوں ہوئے ؟

مجھے اس سلوک کے بارے میں شکایت نہیں جو مجھ سے روا رکھا گیا بلکہ اس کی بناء اس سلوک پر ہے جو میرے ملک کے ساتھ روا رکھا گیا اور رکھا جا رہا ہے۔ میری شکایت یہ ہے کہ قوم کے ساتھ غداری کی گئی ہے۔ میں نے حکومت کی اس پالیسی پر اکثر تنقید کی ہے اور ایک شہری کے طور پر مجھے اس کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن اب موسیٰ صاحب ایک طرف تو مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ میں نے سرکاری راز فاش کرنے کا ارتکاب کیا ہے اور دوسری طرف مجھے اکسا رہے ہیں کہ میں قوم کو کھول کر بتاؤں کہ اس کے ساتھ کیونکر غداری کی گئی۔

موسیٰ صاحب کہتے ہیں کہ جب میں بھارتی ہائی کمشنر کے گھر گیا تو عقبی دروازے سے داخل ہوا۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ میں وہاں دن دیہاڑے دوپہر کے ایک بجے اپنی کار میں گیا اور سامنے سے داخل ہوا۔ میں وہاں چھپے چوری کیوں کر جاتا۔ جبکہ میرے ملنے جلنے تک پر سی آئی ڈی کا رات دن کا پہرہ ہے۔

لگے ہاتھوں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں بھارتی ہائی کمشنر کے یہاں سندھ طاس کے معاہدے پر دستخط کرنے یا مشترکہ دفاع کی کوئی تجویز لے کر نہیں گیا تھا۔ بھارتی ہائی کمشنر نے خود درخواست کی تھی کہ وہ مجھ سے سابقہ وزیر خارجہ کی حیثیت میں ' پاک بھارت تعلقات پر گفتگو کرنی اور اس ضمن میں میری رائے معلوم کرنی چاہتا ہے کہ کیا خلیق الزماں کی سرکردگی میں جو غیر سرکاری وفد بھارت بھیجا جا رہا ہے اس سے دونوں ملکوں کے درمیان بہتر افہام و تفہیم کو فروغ ملے گا؟

جو لوگ اس حکومت کے مخالف ہیں انہیں وطن دشمن قرار دیا جا رہا ہے۔ آخر اس حکومت کے پاس اپنی حب الوطنی کا کیا ثبوت ہے ؟ اگر اس حکومت کے چہیتے کاروباریوں کو اجارہ داری کی اجازت ہے تو کیا اسی طرح حکومت کو بھی استحقاق ہے کہ حب الوطنی کی اجارہ دار بن بیٹھے .... اس حکومت کو ایسا کوئی حق نہیں۔ اعلان تاشقند پر کس نے دستخط کئے تھے ؟ بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع کی خواہش کس نے کی تھی ؟ شمال سے چین کے خطرے کی بات کس نے چھیڑی تھی ؟ سندھ طاس کے معاہدے پر کس نے دستخط کئے تھے اور اب فرخا بیراج کی تعمیر پر بھارت کے اصرار کے سامنے کون پسپائی اختیار کر رہا ہے ؟ بھارت کو بیرو باڑی پر ناجائز قبضے کی مہلت کون دے رہا ہے ؟ جب میں نے آسام پر اپنے حقوق کا سوال اٹھا تو کس نے برا مانا تھا ؟ ایک بیرونی طاقت کو "بڑا بھیر" کا ڈھ کس نے پیچ پر دے کر پاکستان کی

www.bhutto.org

خود مختاری کا سودا کیا تھا ؟

پاکستان کے دشمن اس حکومت سے اظہار ہمدردی کرتے رہتے ہیں جو اپنی حمایت میں تو بھی ایرے غیرے کے سرٹیفکیٹ شائع کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتی۔ قومی مفادات پر نرم پڑ کر ایسی داد و تحسین بآسانی حاصل کی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے مفادات کا تحفظ تو ایک طرف' یہ حکومت بیرونی طاقتوں کی دھمکیوں اور ترغیبوں کے باعث اس جہت میں مسلسل ناکام چلی آئی ہے۔ یہ حکومت ڈینگیں تو بہت مارتی ہے لیکن باہر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔

میں ارباب حکومت کے اس پراپیگنڈے کو مسترد کرتا ہوں کہ پاکستان پہلے سے مضبوط ہو گیا ہے۔ امور خارجہ میں پاکستان کی حیثیت پہلے کی نسبت کہیں کمزور ہو گئی ہے' دیکھا جائے تو پاکستان بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا ہے اور کوئی اس پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔ حکومت تمام ممالک نے ساتھ اچھے مراسم کی دعوی دار ہے اگر یہ درست ہے تو اس کا باعث اس کے سوا کچھ نہیں کہ کمزوری کے باعث تسلیم کی خو ڈال لی گئی ہے۔ اب تو حکومت اس سطح پر اتر آئی ہے کہ بھارت کے ساتھ تنازعات کو کسی ایسے یکمشت سودے کے طور پر بنا لے جس میں جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خود ارادیت کا ذکر تک نہ ہو۔ 11 راکتوبر 1968ء کو میرے خلاف موسیٰ صاحب کی بے ہنگم طولانی تقریر کے صرف ایک دن بعد ارشد حسین صاحب نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں حکومت کا تازہ ترین موقف پیش کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے:

> "اپنی حکومت کی طرف سے میں کشمیر سمیت تمام حل طلب مسائل کو یکمشت سودے کی صورت میں یا یکے بعد دیگرے حل کرنے کے لئے پاکستان کی آمادگی کی از سر نو توثیق کرتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ بھارت اپنے اسی اقرار کی توثیق کرے کہ کسی مناسب اور معینہ مرحلے پر وہ خلوص سے اور اس نیت کے ساتھ کہ تنازعات کا حل تلاش کرنا چاہئے' کشمیر پر مذاکرات کے لئے تیار ہو جائے گا۔"

اگر یہ بیان بھارت سے یہ التجا کرنے کے مترادف نہیں کہ جب بھی اس کا دل چاہے اور جو شرائط اسے راس آتی ہوں ان پر سمجھوتہ کرنے پر رضامند ہو جائے ، تو مجھے بتایا جائے کہ حق خود ارادیت کے موقف سے ننگے انحراف کے اظہار کے لئے اس سے بہتر کون سی سیاسی زبان استعمال ہو سکتی ہے ؟

بیرونی قرضے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور اگر ہم نے اپنی معیشت کا نقشہ ہی نہ بدل ڈالا تو یہ ہمارے لئے پیر تسمہ پا بن کر رہ جائیں گے۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے درخواست کی گئی ہے کہ ضرورت پڑنے پر پاکستان کو ہنگامی قرضہ دینے کو تیار رہے۔ ہم اس قدر دیوالیہ ہو گئے ہیں کہ فرانس کے ساتھ قرضے کا ایک حالیہ معاہدہ کرتے ہوئے اصل رقم میں سے سود کی وہ رقم منہا کر لی گئی جو قرضے کی واپسی کے

www.bhutto.org

موقع پر ادا کی جاتی ہے۔ اب ہم ایک ایسی بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں کہ ملک کے زرمبادلہ کا 20 فیصد حصہ بیرونی قرضے برابر کرنے کی نذر ہو جاتا ہے۔

اس سے پہلے کبھی بد عنوانی اتنی عیاں اور فراواں نہ تھی اور نہ جرائم ہی کی یہ کثرت تھی۔ عزت' جان اور ملکیت اتنی غیر محفوظ ہو گئی ہیں کہ لاکھوں انسانوں کو مسلسل یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ نہ جانے کس وقت ان پر کیا بیت جائے۔ یہ صورت حال ابھارنے میں' عاملہ اور انتظامیہ کی مشینری کے ناجائز استعمال کے ذریعے' حکومت نے براہ راست حصہ لیا ہے۔ اگر ملک میں سب کچھ درست حالت میں ہوتا تو موسیٰ صاحب نے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے جس منصوبے کا دعویٰ کیا ہے نہ تو اس منصوبے نے جنم لیا ہوتا اور نہ بلوچستان ہی پر تشدد کے بادل چھائے ہوتے۔

ایک جگہ موسیٰ صاحب کہتے ہیں کہ مجھے پردۂ گمنامی سے بر آمد کیا گیا اور دوسری جگہ کہتے ہیں کہ مارشل لاء سے پہلے میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا نمائندہ تھا۔ دراصل میں 1957ء میں اقوام متحدہ جانے والے پاکستانی وفد کا ایک رکن تھا اور فروری 1958ء میں بحری قانون کے مسئلے پر جنیوا میں منعقدہ اقوام متحدہ کی کانفرنس میں شریک ہونے والے پاکستانی وفد کا سربراہ تھا اور اس وقت میں صرف 29 سال کا تھا۔ 30 برس سے بھی کم عمر کے جس نوجوان کو ایک اہم بین الاقوامی کانفرنس میں ملکی مفادات کی ترجمانی سونپی جائے اس کے بارے میں یہ کہنا لغو ہے کہ اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر آسمان پر چڑھا دیا گیا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ عمر کے اسی دور میں موسیٰ صاحب کن اعلیٰ مراتب پر فائز تھے۔ ہر شخص کا مقدر اللہ کے ہاتھ میں ہے اور قرآن پاک کا ارشاد ہے:۔

وتعز من تشاء وتذل من تشاء

حکومت نے مجھے بدنام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے لیکن وہ بری طرح ناکام رہی ہے کیونکہ پاکستان کے عوام کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا سکتی۔ تاریخ کے محاسبے سے کسی کو مفر نہیں۔ مستقبل واضح کر دے گا کہ کس نے قومی مفادات پر سودے بازی کی اور کس نے ان کے تحفظ کے لئے پامردی کا ثبوت دیا۔ 10 سالہ اندھیر نگری کے انجام پر حکومت کے تضادات اور موقع پرستانہ پالیسیوں کے باعث اس کا دامن شرم اور تضحیک سے مالامال ہو چکا ہے اگر اوسط دماغ جابروں کی یہ حکمران ٹولی سمجھتی ہے کہ اس کا گھٹیا اور تخریبی پراپیگنڈا لوگوں پر کچھ اثر انداز ہوتا ہے تو وہ پاکستان کے عوام کی سوجھ بوجھ کی ہتک کا ارتکاب کرتی ہے۔

میں گورنر موسیٰ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تقدیر کے پہیے نے ایک چکر پورا کر لیا ہے اور یوم حساب روز بروز قریب آتا جا رہا ہے۔

نومبر 1968ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

پٹیشن کی تائید میں بھٹو کا حلفیہ بیان

میں ذوالفقار علی بھٹو ' خلف مرحوم سر شاہ نواز خاں بھٹو ' مسلم ' بالغ ' ساکن ' لاڑکانہ ' حال نظر بند بورسٹل جیل لاہور ' مغربی پاکستان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ......

(1) میں مذکورہ بالا رٹ پٹیشن کے مطابق نظر بند ہوں جو میری اہلیہ بیگم نصرت بھٹو ' مدعی نے گورنر مغربی پاکستان کے جاری کردہ میری گرفتاری کے اس حکم کو چیلنج کرتے ہوئے دائر کی ہے جو انہوں نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے رول نمبر 23 کے تحت 12 نومبر 1968ء کو جاری کیا تھا۔

(2) میں نے رٹ پٹیشن ' مدعا علیہ کی جانب سے داخل کردہ متعلقہ تحریری بیان ' نظر بندی کی تائید میں عدالت عالیہ کے ریکارڈ پر لائے گئے مواد اور اس عدالت عالی وقار کے سامنے ہوم سیکرٹری نے جو بیان دیا تھا اس کا مطالعہ کیا ہے۔

(3) میں نے اپنے دستخطوں سے اس عدالت عالی وقار کی خدمت میں پٹیشن کی تائید میں مزید وجوہ پیش کی ہیں اور میں یہاں تصدیق اور اعادہ کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا مزید وجوہ کے مندرجات درست اور مبنی بر حقیقت ہیں اور انہیں اس حلفیہ بیان کا جز قرار دیا جا سکتا ہے۔

(4) نظر بندی کا مجریہ حکم قانون کے اعتبار سے غلط اور مدعا علیہ کی بدنیتی پر مبنی ہے تاکہ مجھے قانونی استحقاق کے بغیر اور غیر قانونی انداز میں نظر بند رکھا جائے۔ میں اس موقف کی تائید میں اس عدالت عالی وقار کی توجہ کے لئے مندرجہ ذیل حقائق اور وجوہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

(5) میں پرزور طور پر ان الزامات کو رد کرتا ہوں جن پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کا وہ میمورنڈم

www.bhutto.org

مشتمل ہے جس میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت میری نظر بندی کی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ الزامات حقائق کے اعتبار سے اتنے ہی بے بنیاد ہیں جتنے مقصد کے اعتبار سے بدنیتی پر مبنی ہیں۔ وہ مغز سے خالی ہیں چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ انہیں قانونی لبادے میں پیش کیا جاتا' جو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی بدولت بخوبی میسر آ سکتا تھا۔

میں نے 29، نومبر 1968ء کو عدالت عالی وقار کی خدمت میں جو تائیدی وجوہ پیش کی تھیں میں نے ان میں ان الزامات کو رد کر دیا تھا جو نظر بندی کی ان وجوہ میں شامل تھے جو مجھے 13، نومبر 1968ء کو دی گئی تھیں۔ میں اس موقع پر پورے زور سے اس موقف کا اعادہ کرتا ہوں کہ یہ الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں' بدنیتی پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد غیر دیانت دارانہ ہے۔ میں نے متعدد مقدمات پر طویل تقریروں کے دوران جو زبانی بیانات دیئے اور اشارات کیے تھے انہیں دیدہ دانستہ سیاق و سباق سے جدا کیا گیا ہے بلکہ توڑا مروڑا گیا ہے۔ میں نے امور مملکت کے بارے میں کوئی راز افشانی نہیں کی کہ جس سے بیرونی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے روابط پر کوئی حرف آتا ہو نہ ہی میں نے عوام کو خصوصاً طلبا کو برانگیختہ کیا ہے کہ وہ قانون شکنی کریں یا تشدد پر اتر کر بدنظمی پھیلائیں۔ مثال کے طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ (حکومت کو بدلنے کے لئے) "آخری دھکے" کی اصطلاح کا استعمال مجھ سے بالکل غلط اور شرانگیز سیاق و سباق میں منسوب کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے یہ اصطلاح آئینی موقف کے دائرے میں رہتے ہوئے استعمال کی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے خاص طور پر ان دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو آئین کے مطابق اس حکومت کے عہد کے باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً میں نے لاہور میں 11، نومبر 1968ء کی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کے پاس صرف بارہ مہینے اور انیس دن رہ گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے سابق صوبہ سرحد میں تقریروں کے دوران دنوں کی صحیح تعداد بیان کی تھی جو انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کو تبدیل کرنے میں باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے حیدر آباد میں میر رسول بخش تالپور کی کوٹھی کے صحن میں ایک محدود اجتماع سے اڑھائی گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اس کنونشن میں یہ اعلان کیا تھا کہ مشرقی پاکستان سے صدارتی انتخاب کے لئے کوئی متفقہ امیدوار سامنے نہ آیا اور اگر مغربی پاکستان سے بھی کسی پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو میں خود انتخاب لڑوں گا۔ یہ حقیقت میری اس نیت کی بہترین ترجمان ہے کہ میں حکومت کے خلاف آئینی جدوجہد شروع کرنا چاہتا تھا۔

کوہاٹ میں بھی میں نے ایک گھنٹے سے زاید زبانی خطاب کیا۔ نظر بندی کی وجوہ میں غلط طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں نے اس تقریر میں یہ کہا تھا کہ اگر حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بزور اقتدار پر قبضہ کر لوں گا۔ اپنی تقریر میں میں نے کہیں بھی اس طرح کا بے سروپا دعویٰ نہیں کیا۔ میری سیاسی سرگرمی کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ عوام کی مشترکہ جدوجہد میں شامل ہو کر ان کے گمشدہ حقوق کی بحالی کے ذریعے پاکستان کے لوگوں کی خدمت کرنا ہے۔ اگر مجھے اقتدار کی ہوس ہوتی تو میں نئے اصولوں پر

www.bhutto.org

سمجھوتے بازی کر رہی ہوتی اور قید و بند کے مراحل سے گزرنے کے بجائے اپنی مقتدر حیثیت کو قائم رکھا ہوتا۔

مجھے اصرار ہے کہ میں نے ڈیرہ اسماعیل خاں میں جلسہ عام میں تقریر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنے گرمجوش استقبال پر لوگوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور دفعہ 144 فوجداری کے پیش نظر ان سے درخواست کی تھی کہ وہ منتشر ہو جائیں میں نے تقریباً 15 منٹ تک مختصر تقریر کی تھی۔

لاہور میں ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے سامنے 11 نومبر 1968ء کو میں نے تقریباً چالیس منٹ تک زبانی تقریر کی تھی۔ تقریر کا موضوع خارجہ پالیسی تھا۔ حکومت نے بھارت کو جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے کی جو پیشکش کی تھی اس سے مضطرب ہو کر میں نے اس پیشکش کے نقصان دہ نتائج کا تجزیہ کیا تھا۔

میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نظر بندی کی وجوہ میں میری تقریروں کے تمام تر حوالے سیاق و سباق سے جدا کر کے پیش کئے گئے ہیں۔ انہیں بدنیتی سے توڑا مروڑا گیا ہے: ان کی غلط تفسیر کی گئی ہے اور انہیں صحیح روشنی میں پیش نہیں کیا گیا۔ اس کے علاوہ تقریروں کی رپورٹیں جو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شکستہ خط میں لکھی گئی تھیں، زیادہ سے زیادہ میری طویل تقریروں کے مختصر خلاصے کہلا سکتی ہیں جن میں متعدد فقرے اور الفاظ اس سیاق و سباق میں پیش نہیں کئے گئے جن میں انہیں ادا کیا گیا تھا۔

یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ اصل وجوہ جن کی بناء پر مجھے آزادی سے محروم کیا گیا ہے' نہ تو عائد کردہ الزامات میں ان کا ذکر ہے اور نہ ان کے مندرجات سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ بلاشبہ ان وجوہ کا مقدمے سے تعلق ہے۔ لیکن کوئی شرمناک سے شرمناک حکومت بھی انہیں عوام کے سامنے لانے کی شاید ہی جرات کر سکتی ہے۔ مگر ان کے وجوہ سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ وجوہ اس بدنیتی پر مبنی ہیں' جو میرے خلاف حکام کی دھاندلیوں میں جاری و ساری ہے اور جس سے الزامات کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔

الزامات میں جو دعوے کئے گئے ہیں ان کا صرف اس صورت میں کوئی سر پیر ہو سکتا ہے کہ یہ فرض کیا جائے کہ میں نے میری پارٹی نے یا میرے رفقاء نے حکومت کا بزور تختہ الٹنے کا کوئی منصوبہ' سازش یا پلاٹ بنا رکھا تھا۔ میں اس بات سے انکار کرتا ہوں کہ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے رفقاء کے ساتھ مل کر اس طرح کے کسی مقصد یا نیت کے ساتھ کوئی منصوبہ' سازش یا پلاٹ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ حکومت کا ساختہ ہے' اس کے تصور کا کرشمہ ہے' اس کی خراب و خستہ حالت کا آئینہ دار ہے۔ اپنے عہد حکمرانی کے دس سالوں کی تاریکی میں اسے ہر بات سازش نظر آتی ہے۔

(6) ملک میں جو عوامی مظاہرے ہو رہے ہیں وہ ایک فرسودہ نظام کے خلاف اظہار احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں اور عمومی صورت حال کے خلاف ناراضی کے عکاس ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں بلند

www.bhutto.org

ہونے والی آوازیں حکومت کی زیادتیوں' اس کی بدعنوانیوں' اس کے خود غرضانہ مقاصد' انسانی حقوق کے ضمن میں اس کی تحقیر آمیز پالیسی' اس کے ہاتھوں اداروں کی تباہی' تشدد پیشہ نوکر شاہی پر اس کے انحصار' عوام کی خدمت میں اس کی ناکامی ثقافت کے بارے میں اس کی نخوت آمیز روش' عوام سے اس کی حقارت اور کنبہ پروری کے ضمن میں اس کی ہوسناکی کے خلاف لوگوں کا بے ساختہ قول فیصل ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے اس حکومت سے محبت ہے یا میں اس کے اطوار پسند کرتا ہوں۔ ہمیں علم ہے کہ یہ حکومت کس درجہ غیر معقول ہے' بلکہ پاکستان کے لوگ اسے کس درجہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جو بھی گڑبڑ مجھ سے منسوب کی گئی ہے وہ حکومت کے اپنے اعمال.......... میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی بدعنوانی اور ظلم و تشدد......... کا فطری نتیجہ ہے جن کے باعث عوام کشیدہ خاطر ہو گئے ہیں۔ بے چینی کی وہ لہر جس نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے رکھا ہے' اسی عمومی عدم اطمینان کا اظہار ہے جو ارباب اختیار کے گوناگوں اعمال کے باوجود سطح پر آنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ لوگ جبر کے عہد اور ان بدیوں کے خلاف' جنھوں نے حکومت کے طرز حکمرانی کے باعث ہمارے معاشرے کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے' احتجاج کرنے کے لئے برسرعام نکل آئے ہیں۔ ہمارے عوام دوسرے ملکوں کے عوام سے مختلف نہیں۔ ان کی برداشت کی بھی ایک حد ہے' انہیں وہ بھی کسی کا درد محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی مسرت کے آرزومند ہیں۔ ان کا افلاس ناقابل تصور ہے لیکن پھر بھی وہ بہتر مستقبل کے لئے امید رکھتے ہیں۔ ان کا حق ہے کہ انہیں مناسب سامان زیست' سکونت اور لباس میسر ہو۔ فاقہ کشی نے ماؤں کی چھاتیوں سے دودھ کو اور ابتلاء نے کتنے ہی باپوں کے آنسوؤں کو خشک کر دیا ہے۔ یہ قانون خداوندی نہیں کہ ہمارے عوام تا ابد مایوس و نامراد رہیں اور ان کے بچے بھوک اور بیماری سے مرتے رہیں۔ ہمارے عوام اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بہتر زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں' انہیں خوراک اور لباس کی ضرورت ہے' روزگار اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی بے ہنگم خواب نہیں بلکہ وہ توقعات ہیں جو سائنس کے اس شاندار دور نے ابھاری ہیں۔ اگر عوام کے حقوق سے انکار کیا جائے گا تو وہ کسی نجات دہندہ کو تلاش کر لیں گے اور اگر نجات دہندہ میسر نہ آیا تو خود اپنی نجات کی راہ نکال لیں گے۔ جب عوام تبدیلی چاہیں تو کسی منصوبے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ عوام کا مزاج ہی منصوبہ ہوا کرتا ہے لیکن بد دماغ حکام جو تاریخ کی رو سے غافل ہوتے ہیں حکومت کے تواتر کے لئے آخری دم تک ہوسناکی سے جتن کرتے رہتے ہیں۔

(7) اگر صورت حال وہ نہ ہوتی جو تھی تو میں خواہ کچھ بھی کہتا یا کرتا' اس کا امکان نہ تھا کہ عوام کسی طرح بھی متاثر ہوتے۔ معروضی صورت حال یہ ہے کہ عوام جاگ اٹھے ہیں اور از خود آگے بڑھ کر احتجاج کر رہے ہیں۔ کسی سازش یا پلاٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا کوئی منصوبہ ہو جس نے قوم کی اقتصادی اور سماجی بہبود کو متاثر کیا ہو۔ مثال کے طور پر شکر کی نایابی میری

پارٹی کے کسی پلاٹ کے باعث پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس نے لوگوں کو غضب ناک کرنے کا ٹھوس نتیجہ ضرور پیدا کر لیا۔ سنگین اقتصادی اور بدعنوانی کی دوسری مثالوں کے شانہ بشانہ اس کی ذمہ داری بھی خود حکومت پر تھی۔ اقتصادی بدنظمی، سیاسی بے چینی کا سب سے موثر عنصر ہوتا ہے۔

نو آبادیاتی آقاؤں کا بندھا ٹکا بہانہ ہے کہ جب بھی محکوم عوام ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو ساری گڑبڑ چند سیاسی مظاہرین کے سر تھوپ دیتے ہیں وہ گولی، پھانسی اور قید کا نسخہ استعمال کرتے رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے قومی بیداری کے سیلاب کے آگے بند باندھ لیں گے۔ انگریز کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اپنے دور میں وہ آزادی کے ہر مطالبے کو چند غیر ذمہ دار مظاہرین کی سازباز قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ حکومت بھی دنیا کو کچھ اسی طرح کی بات کا یقین دلانا چاہتی ہے۔

(8) تبدیلی کا مظہر جو قانون فطرت ہے معاشرے کے حالات پر منحصر ہے نہ کہ خیالی منصوبوں پر۔ موجودہ نظام ضرور بہت ہی کچا ہے اگر حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ میرے ایک ہفتے کے دورے سے اس کا سارا ڈھانچا زمین پر آ رہا ہے۔ لوگوں نے مجھے اس لئے خوش آمدید نہیں کہا کہ میں تشدد کا کوئی منصوبہ زیر عمل لا رہا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ جب میں نے یہ اعلان کیا کہ رشوت ستانی انتہا کو پہنچ گئی ہے، طالب علموں کو بیڑیاں پہنا دی گئی ہیں، عوام کراہ رہے ہیں اور حالات نا قابل برداشت ہو چکے ہیں تو میں ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ مائی لارڈز! صدر صاحب کے برعکس جنہوں نے اپریل 1966ء میں ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ دھمکی دی تھی کہ وہ ہتھیاروں کی زبان استعمال کریں گے میں نے زبان کا ہتھیار استعمال کیا جو لوگوں تک پہنچے اور انہیں اس بہتر مستقبل کی مشترکہ تلاش کے لئے متحد کرنے کا ایک جمہوری ذریعہ ہے جو قانون کی حکمرانی کے مساواتی تصورات پر مبنی ہے۔

مسئلے کی تہ تک جانے کے لئے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مجھے دھاندلی سے جیل میں اس لئے نہیں ٹھونسا گیا کہ میں نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا بلکہ اس کی وجہ وہ اختلافات ہیں جو میرے اور حکومت کے درمیان جنگ بندی اور اعلان تاشقند کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے۔ اگر نقاب اٹھا دیا جائے تو یہ سوال اس خلجان کو سلجھا دے گا جو میرے حکومت سے اچانک رخصت ہونے کے ضمن میں پایا جاتا ہے اور میری گرفتاری اور نظر بندی کی وضاحت بھی کر دے گا۔ صداقت کو تعصب اور جوڑ توڑ کی گرد سے پاک کر دیا جائے تو یہ اپنی پوری آب و تاب سے میرے اس بیان کے حق میں گواہی دے گی کہ نہ تو میں نے تشدد کا پرچار کیا اور نہ طلبہ کو برانگیختہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنایا۔ حکومت کے تھکے ماندے چہرے سے انتشار کے آثار ہویدا ہیں۔ بہرحال یہ بیمار ہے یا شاد کام میں نے بزور اس کا تختہ الٹنے کا منصوبہ نہیں بنایا۔ اس کے برعکس حکومت نے بے دریغ طاقت کا استعمال کیا ہے۔ ہر کہیں معصوموں کے خون نے زمین کو سیراب کیا ہے۔ کبھی بلوچستان میں اور کبھی مشرقی پاکستان میں، کسی موقع پر پنجاب اور سندھ میں اور کبھی ہمارے شمالی علاقوں کی بستیوں میں۔ انتخابات کے دوران حکومت کے آدمی کراچی کی گلیوں میں قیصرانی

www.bhutto.org

شان و شوکت سے فتح کے جلوس نکالتے رہے ہیں۔

یہ حکومت طاقت سے پیدا ہوئی اور جس استحکام کا بہت ڈھول پیٹا جاتا ہے اس کا انحصار بھی طاقت پر ہے۔ اس نے اکتوبر 1958ء میں طاقت کے استعمال کا جو جواز پیش کیا کہ ملک کو انتشار سے بچایا جارہا ہے اور میں یہ پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ آج ملک کہاں کھڑا ہے؟ جبر اور بد عنوانی سے حکومت نے ملک کو خاتمے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ اس حکومت نے اپنے سے پہلی حکومت کا تختہ الٹا اور اس کا نام انقلاب رکھ کر انقلاب کے لفظ کی توہین کی ہے۔ یہ ہر سال یوم انقلاب بھی مناتی ہے لیکن ساتھ ہی اگر کوئی اور یہ لفظ منہ سے نکالے تو اسے سزا دینے میں بھی باک نہیں محسوس کرتی۔

(9) زیادہ دیر نہیں ہوئی' مغربی پاکستان کے گورنر نے نظام حکومت کی جمہوری روح کا دفاع کرتے ہوئے اپنی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا اور کہا تھا کہ جمہوریت کسی ہاتھی کا نام نہیں ہے جسے لوگوں کے سامنے رکھا جا سکے تاکہ وہ اسے چھو کر دیکھیں ہاں مائی لارڈ! جمہوریت واقعی کوئی ہاتھی نہیں لیکن پھر بھی یہ تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح گل بہار کی خوشبو کی طرح وجود رکھتی ہے۔ یہ آزادی کا نغمہ ہے جس کا ارتعاش چھونے سے بھی زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن احساس سے زیادہ جمہوریت کا مطلب ہے بنیادی حقوق' اس کا مطلب ہے بالغ رائے دہی کا حق' ووٹ کی رازداری' آزاد پریس' میل جول کی آزادی' عدلیہ کی آزادی' دستور ساز اداروں کی بالادستی' انتظامیہ پر احتساب اور دیگر متعلقہ کیفیات جو موجودہ حکومت کے نظام میں واضح طور پر غالب ہیں۔ اس حکومت کے طرز عمل نے مطبوعہ لفظ کو بے حرمت کر دیا ہے' رائے دہی کو ایسے افراد تک محدود کر دیا ہے جنہیں ڈرایا' دھمکایا یا بہلا یا پھسلایا جا سکتا ہے۔ قانون کی عمارت میں من مانی کی دفعات داخل کر دیں' دستور سازی کو معطل کر دیا' بنیادی حقوق کو ہیجان انگیز تعطل میں اور میل جول کے حق کو دفعہ 144 کی بھٹی میں ڈال دیا۔ کسی بھی معروضی معیار سے حکومت نے جو گھٹ راگ کھڑا کیا ہے اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔

(10) یہ بڑی مایوس کن حقیقت ہے لیکن اس کا لازماً یہ مطلب نہیں کہ تشدد کے بغیر تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔ جو محدود ذرائع میسر ہیں ان کے پورے پورے استعمال سے اس حکومت کو بدلا جا سکتا ہے۔ عوام میں تبدیلی کی ایسی بے پناہ لگن ہے کہ ملک کو تشدد کے بغیر تبدیلی کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی طور پر یہ حقیقت ظاہر کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کے عوام کو موجودہ حکومت اب مزید قابل قبول نہیں اور یہ ان کا اعتماد کھو چکی ہے بلکہ یہ بھی کہ یہ حکومت کے اپنے ذاتی مفاد میں ہے کہ وہ خوش دلی سے بر وقت رخصت ہو جائے۔ اگر نظام حکومت میں عوام کی مرضی کے مثبت اظہار کے لئے کوئی جگہ نہیں تو حکومت کے خلاف ایک منفی فیصلے کو سیاسی طور پر مثبت کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے عوام کی خدمت کے تحت اس صداقت کا اظہار خون خرابے کا پرچار نہیں' خوشامدیوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ کڑوے حقائق سے پردہ ہٹائیں۔ میرا یہ مقام نہیں کہ میں موجودہ خستہ حالی سے خطاب کے بغیر علاج کر سکوں۔ صرف

www.bhutto.org

حکومت اس اختیار سے مسلح ہے جس کے ذریعے وہ عوامی نفاذ کرے کے بغیر تبدیلی لا سکتی ہے۔ اگر حکومت اپنی پالیسیوں کے خلاف مظاہرے نہیں چاہتی تو اس کا علاج خود حکومت کر سکتی ہے۔ حکومت اپنی پالیسیاں بدل سکتی ہے۔ اپنے قوانین کو جمہوری بنا سکتی ہے اور لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے نظام حکومت کو آزادانہ بنا سکتی ہے۔ وہ انصاف کو بروئے کار لاکر اور انسانیت پرور سیاسی اور اقتصادی حالات ابھار کر قناعت پیدا کر سکتی ہے لیکن مظاہرے ہو رہے ہیں اور لوگوں میں تلخی ہے کیونکہ یہ حکومت اس کے بالکل برعکس روش پر گامزن ہے اور اپنے جبر کو "مضبوط مرکز" کا نام دیتی ہے۔

ہوم سیکرٹری نے 11 نومبر 1968ء کو گورنر مغربی پاکستان کے نام جو مبسوط نوٹ صوبائی نظم و نسق کی عمومی صورت حال کے بارے میں لکھا تھا اس میں وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اصل باعث براہ راست طلبہ نہیں تھے بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے طلبہ کو سیاسی مقاصد کے لئے برانگیختہ اور استعمال کیا۔ میں ہوم سیکرٹری کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے طلبہ کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔ مائی لارڈز! میں بالکل صاف صاف تسلیم کرتا ہوں کہ گڑبڑ کی ذمہ داری بلاواسطہ یا بالواسطہ طلبہ پر نہیں۔ ہمارے طلبہ اتنے ہوش مند ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکیں۔ انہیں علم کے حصول کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ مجھے نوجوان نسل پر بے پناہ اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نوخیز مردوں اور عورتوں کی یہ نسل ان مقاصد میں کامیاب رہے گی جن میں پچھلی نسل ناکام رہی۔ انہیں خدا نے پرواز تخیل سے نوازا ہے اور آنے والے زمانوں کا بوجھ اٹھانے کی سکت دی ہے۔ نوجوان کی اس نسل کا جو دنیا بھر کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی ہے، آسانی سے استحصال نہیں کیا جا سکتا جدید حالات کے بارے میں مطلق جہالت ہی کسی شخص کو یہ راہ دکھا سکتی ہے کہ وہ یہ نتیجہ اخذ کرے کہ آج کا نوجوان خواہ وہ پاکستان میں ہو یا کہیں اور، سیاسی استحصال کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔

مائی لارڈز! میرے پاس کوئی اختیار نہیں کہ میں طلبہ کو مادی فوائد پہنچا سکوں۔ ان کے لئے محبت اور اعتماد کے سوا میرے پاس ان پر نچھاور کرنے کے لئے سرپرستی کے ذرائع نہیں۔ لیکن حکومت کے پاس ان ذرائع کی کوئی کمی نہیں۔ تمام مادی فوائد، جن میں پراپیگنڈا پر کنٹرول بھی شامل ہے حکومت کے ہاتھ میں ہیں اور پھر بھی اس نے طلبہ کی جمعیت کی ہمدردی گنوا دی ہے۔ حکومت کے برعکس میری تو طلبہ تک پہنچ بھی نہیں۔ مجھے ان کی یونیورسٹیوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ حکومت کی پراپیگنڈا مشینری کے پہیے رات دن میرے خلاف زہر پھیلانے کے لئے متواتر گھومتے رہتے ہیں۔ لیکن طلبہ کی جمعیت اتنی روشن ضمیر ہے کہ حکومت اپنی ان نمایاں برتریوں کے باوجود طلبہ کو استعمال کرنے میں ناکام رہی ہے۔ مائی لارڈز! آج کے طلبہ ہوشیار ہیں اور انہیں گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت چونکہ طلبہ کے طبقے کو سمجھ نہیں سکی اور اس نے انہیں شک کی نظر سے دیکھنا پسند کیا ہے اس لئے اس کے کارندے یہ نتیجہ نکالنے کی ناقابل معافی غلطی کرتے ہیں کہ معاشرے کے یہ پھول اور آنے والے کل کے سربراہ اتنے اناڑی ہیں کہ سیاسی مقاصد کے لئے ان کا استحصال کیا جا سکتا ہے۔

www.bhutto.org

ہوم سیکرٹری نے سیاسی صورت حال پر جو نوٹ لکھا ہے وہ بہر حال پاکستان کے طالب علموں کو سیاسی بے چینی کے لئے در جانور کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اصلاح کی پرزور لگن میں طالب علم، خواہ وہ کہیں بھی ہو، سیاسی مظاہرین کے ہاتھوں استعمال ہونے والا لدر جانور نہیں بلکہ ترقی کی وہ طاقت ہے جس نے استحصال کے خاتمے کا عزم کر رکھا ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک میں طالب علم کا اثر نمایاں ہے۔ وہ معاشرے اور حکومت کی فرسودہ روایات کے خلاف بین الاقوامی مجاہد ہے۔ یہ ہے یونیورسٹی کا وہ طالب علم جسے حکومت ایک گمراہ کھلونا سمجھتی ہے......... میرے ہاتھوں میں گیلی مٹی کا ایک ٹکڑا سمجھتی ہے۔

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں نے طالب علموں کو اکسایا ہے گویا طالب علم پہلے سے بیدار نہ تھے اور یونیورسٹی آرڈی ننس اور دیگر اقدامات کے ذریعے سے جبر و استبداد کا جو طاغوتی نظام ان پر مسلط کیا گیا تھا اس کے خلاف کھلے بندوں احتجاج نہ کر رہے تھے۔ طالب علم ہمارے معاشرے کا ایک جز ہیں اور ایسے اجنبی نہیں جو کسی الگ تھلگ حصے میں رہتے ہوں۔ یہ فطری امر ہے کہ عام بدحالی اور پاکستانی عوام من حیث المجموع جن ناانصافیوں سے دوچار ہیں اور انہیں آئے دن جس طرح ہراساں کیا جاتا ہے' طلبہ بھی ان سے متاثر ہوں۔ اس جوش و خروش کے باعث جو نوجوانوں کا طرۂ امتیاز ہے انہوں نے نہ صرف اپنی شکایات بلکہ پاکستان بھر کے عوام کے دلوں میں پلنے والی نفرت کا اظہار کیا ہے۔

مجھے اصرار ہے کہ طالب علم کو نہ تو عوام کی مصیبتوں سے اور نہ اہل دانش کی مایوسیوں سے علیحدہ رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اس درد انجام معاشرے کا جزو لاینفک ہے جو استحصال کی چکی میں پس رہا ہے۔ پاکستان کا طالب علم بارہ کروڑ عوام کی آزادی رائے سے محروم خلقت کی دستور ساز اسمبلی ہے۔

(12) لیکن اپنے دوسرے ہم کاروں کی طرح ہوم سیکرٹری بھی ان حد بندیوں کے اندر کام کرتے ہیں جو صداقت سے بیر رکھتی ہیں۔ سیکرٹری صاحب مجبور ہیں کہ تصویر کو رنگ دار شیشوں میں سے دیکھیں۔ وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لوگ ایک پرزور اور بے ساختہ لہر کی صورت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ وہ حکومت سے تنگ آ چکے ہیں اور یہ ان کا غلامی کے خلاف احتجاج کا اظہار ہے۔ ہوم سیکرٹری کا تجزیہ کیونکر یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جو ابھار پایا جاتا ہے وہ چند سیاسی تقریروں سے پیدا نہیں ہوا بلکہ چینی اور دوائیوں جیسی ضروری اشیاء سے محرومی کے خلاف لوگوں کی اجتماعی ناراضگی کا مظہر ہے۔ یا یہ کہ یہ حکومت کی ناکامیوں کے خلاف عوام کا اسی طرح کا خود رو اور بے ساختہ محاسبہ ہے جیسا کہ ان ملکوں میں عمل میں آتا رہا ہے۔ جہاں شخصی آمریت کا دور دورہ رہا ہو۔ بلاشبہ ہوم سیکرٹری ایک ایسی رپورٹ پیش کرنے پر مجبور تھے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جناب والا کے سامنے د آف پاکستان رولز کے نتیجے میں کس کر پیش کیا گیا ہے کہ مبینہ طور پر میں نے اپنے پیارے وطن کے تحفظ کے خلاف اقدامات کئے ہیں، اس وطن کے خلاف جس پر بیرونی جارحیت کے وقت میں نے اس کے دفاع کے لئے ایسے عزم کا ثبوت دیا تھا کہ مجھے

www.bhutto.org

اپنے عوام کی لازوال خوشنودی حاصل ہوئی تھی۔

(13) یونیورسٹی آرڈیننس میں ترمیم پر راضی ہو کر اور بدعنوانی کے خلاف بعد از وقت اقدامات کرنے پر تیار ہو کر حکومت نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ گڑبڑ کی اصل وجہ لوگوں کی ٹھوس مشکلات تھیں۔ کسی اسلامی تہذیب کے وہ کھاتے پیتے لوگ، جنہیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے دورِ قدیم نے لطافت بخشی ہو کیونکر اچانک چند تقریروں سے آگ پکڑ کر یک بارگی یوں اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں کہ گورنر موسیٰ کے الفاظ میں وہ اس حالت میں پہنچ جائیں کہ ان کی ناقابل تسخیر حکومت ایک ہی ہلے میں دھڑام سے گرنے لگے۔

یہ غیر معمولی حالت کبھی پیدا نہ ہوتی اگر حالات معمول پر ہوتے۔ خود حکومت نے اس بات کا اقرار کیا ہے کیونکہ اس نے رسوائے زمانہ یونیورسٹی آرڈیننس کے ضمن میں طلبہ کے بعض منصفانہ مطالبات کو مان کر یہ کوشش کی ہے کہ حالات کچھ نہ کچھ معمول پر آ جائیں۔ حالات نے حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ اب وہ ایک حد تک نرم پڑ جائے۔ آرڈیننس میں مجوزہ ترمیم کے خلاف کوئی ایک آواز بھی سنائی نہیں دی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس بات کا پوری قوم مطالبہ کر رہی ہو وہ اس وقت تک نہ مانی جائے جب تک اسے زبردستی نہ منوایا جائے۔ اگر یہ اقدامات از خود ضروری تھے تو پھر انہیں اتنے برسوں تک ملتوی رکھنے اور طلبہ کے طبقے میں اتنی تلخی پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ موجودہ اضطراب ہرگز پیدا نہ ہوتا اگر استبدادی قوانین کو روزمرہ قانون کی حیثیت نہ دے دی جاتی۔ یہ بات قومی المیئے سے کم نہیں کہ تبدیلیاں لانے کے لئے اتنی زیادہ تلخی کی ضرورت پڑے۔ آرڈیننس میں جو بربریت مضمر ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے کسی خاص ذہانت یا پروازِ تخیل کی ضرورت نہیں تھی۔ دنیا بھر میں کہیں بھی، یہاں تک کہ ہٹلر کے عہد حکومت میں بھی، یونیورسٹی کی سندیں ضبط نہیں کی گئیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ حکام پر دس سال کی اندھادھند حماقت کے بعد اس ابتدائی حکمت کی وضاحت کے لئے موجودہ بحران کی ضرورت پڑی جس میں کئی معصوم اور نوخیز طالب علموں کی جانیں گئیں۔ یہ ہیں وہ غلطیاں جنہوں نے لوگوں کو برگشتہ کیا ہے نہ کہ میری تقریروں نے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے کس منطق کی ضرورت ہے کہ کسی ڈگری کی ضبطی، جو دراصل علم کے مترادف ہے، چھینی نہیں جا سکتی، کیونکہ اس کے چھیننے کا مطلب ہے کہ کسی شہری کے دماغ پر ڈاکا ڈالا جائے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے بجائے خود اپنے آپ کو اس رسوائی اور تضحیک کا ذمہ دار ٹھہرائے جو اس کی غلط کاریوں کی طویل فہرست کے باعث اس کے نام لگی ہیں۔

(14) طلبہ کی طرح بقیہ آبادی کا بھی یہی حال ہے۔ مشکلات اس لئے بڑھ گئی ہیں کہ حکومت لوگوں کی ضروریات سے غفلت برتتی رہی ہے۔ جب تک لوگوں نے مجبور نہیں کر دیا، اس حکومت نے ان کے جائز مطالبات کے پیش نظر اپنے آپ کوئی ایک بھی رعایت نہیں دی۔ لوگوں کے

www.bhutto.org

مفاد کو نظرانداز کر کے اور ان کا اعتماد کھو کر یہ حکومت بدنام ہو کر رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ موجودہ حکومت کے خلاف نفرت پھیلاؤں جبکہ لوگوں کی نفرت ایک انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ ہر طرف بے چینی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ لوگوں کو جمہوریت سے محروم کر دیا گیا ہے اور اقتصادی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ جموں اور کشمیر کے عوام کے حق خوداراودیت پر شکست خوردہ سمجھوتے بازی سنے برطانوی سیکرٹری امور خارجہ کے اس بیان کو ممکن بنایا جو اس نے 28 نومبر 1968ء کو راولپنڈی میں دیا تھا۔ فرخا بیراج کے بارے میں اسی نوعیت کے متزلزل موقف نے بھارت کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت دلا دی ہے کہ گنگا بھارتی دریا ہے۔ نظم و نسق تباہ ہو گیا ہے، جرائم کی افراط ہے اور دکھوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ حضور والا' یہ ہیں بحران کی وہ چند علامات جنہیں اس نوٹ کا جز ہونا چاہیے تھا جو ہوم سیکرٹری نے گورنر کے نام لکھا تھا۔ اگر ہوم سیکرٹری حکومت کی ڈوبتی ہوئی ساکھ کو بچانا چاہتے تھے تو انہیں اندھا دھند گرفتاریوں کی سفارش کرنے کی بجائے اپنے آقاؤں کو مشورہ دینا چاہیے تھا کہ لوٹ مار کا سدباب کرتے' حکمران طبقے کی غارت گری کو برائے خدا روکتے' اس بیڑے میں جو ان کے نام پر صوبے کے چار دانگ میں صفیں باندھے کھڑا ہے مزید بسوں کا اضافہ بند کرتے' عام آدمی کے خون اور پسینے پر مزید فیکٹریاں اور کاروبار نہ کھڑے کرتے اور اپنے نام اور اپنے چہیتوں کو مزید لائسنس جاری کرنے سے باز رہتے۔ اگر آج ملک میں آگ لگی ہوئی ہے تو یہ آگ حکومت کی بداعمالیوں ہی نے بھڑکائی ہے۔

پیراگراف نمبر 15 و نمبر 16 کی اشاعت کی اجازت نہیں ملی۔

(17) یہ شہری کا حق ہے کہ ملک پر حکمران حکومت کی کوتاہیوں یا جس نظام کے تحت وہ زندگی بسر کرتا ہے اس پر تنقید کرے۔ یہ بنیادی سیاسی حق ہے' اس کی کارفرمائی کا مطلب ہے کہ لوگ آزاد ہیں اور اس سے محرومی کا مطلب ہے کہ قوم غلام ہے۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے کہ وہ تبدیلیوں کی وکالت کرے خواہ یہ تبدیلیاں بنیادی نوعیت کی ہوں' خواہ ان تبدیلیوں کا تعلق آئین سے ہو' خواہ یہ تبدیلیاں معاشرتی نظام سے متعلق ہوں' خواہ یہ معیشت کی تبدیلیاں ہوں۔ اگر تنقید کی اجازت نہ ہو تو کسی طرح کی سیاسی سرگرمی ممکن ہی نہیں۔ تنقید ہر فرد اور ہر سیاسی پارٹی کا جائز منصب ہے۔ حکومت کا طرز عمل یہ ہے کہ ہر اس تنقید کو جو نشانے پر بیٹھے ڈیفنس آف پاکستان رولز کی خلاف ورزی قرار دے دے۔ ملک کو اس تنقید سے کوئی خطرہ لاحق نہیں جو بدعنوانی اور جابرانہ قوانین جیسی برائیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔ لوگوں کا امن جبر و استبداد سے تہ و بالا ہوا ہے تنقید سے نہیں۔ جابرانہ قوانین ہی شہری امن کو تہ و بالا کیا کرتے ہیں۔

ڈیفنس آف پاکستان رولز جیسے اس غیر معمولی قانون کے بے پناہ دائرہ کار میں جو ایسے حالات میں گزر بر عمل لایا جا رہا ہے جہاں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں کیونکہ ہم فی الحال کسی بیرونی جارح سے دوچار نہیں۔ قریب قریب ہر اس لفظ یا روداد کے بارے میں سرکاری کانوں پر گراں گزرتی ہو تشدد پر ابھارنے کا

www.bhutto.org

الزام لگا دیا جاتا ہے لوگوں کے امن و امان کا تحفظ بڑا نفیس بہانہ ہے۔ دس سال کی روز افزوں بدحالی نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس میں لوگوں کے امن و امان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امن و امان کو لوگوں کی فطری مدافعت نے نہیں بلکہ حکام کے ایجنٹوں کے تشدد نے تہ و بالا کیا ہے۔ اس کا الزام مجھ جیسے لوگوں پر تھوپنا جو بنیادی وجوہ کو دور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں حالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

(18) میں باضابطہ حکومت میں یقین رکھتا ہوں، طرز عمل کے مہذب معیاروں میں یقین رکھتا ہوں' معاشرتی اور اقتصادی انصاف میں یقین رکھتا ہوں' جمہوریت کی صحیح روح میں یقین رکھتا ہوں' عوام کی اس مسرت میں یقین رکھتا ہوں جو انسانی حقوق سے کامل طور پر بہرہ ور ہونے سے ابھرتی ہے۔ مجھے علم ہے کہ تشدد کے کیا کیا سرچشمے ہیں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ یہ سرچشمے اس وقت نہیں پھوٹتے جب لوگ آسودہ حال ہوں۔ دنیا میں بہت کم قومیں ایسی ہوں گی جو اتنی باصبر ہوں' دکھ اور ناانصافی جھیلنے کی اس قدر برداشت رکھتی ہوں جتنی کہ پاکستانی قوم اس نے دس طویل برسوں تک اس حکومت کو برداشت کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ دس سال کے اوائل میں حالات اتنے بُرے نہ تھے اور امید کی ایک کرن موجود تھی لیکن جُوں جُوں وقت گزرتا گیا حالات خراب تر ہوتے چلے گئے اور امید کی کرن ڈوب گئی۔ اب یہ نوبت ہے کہ عوام حکومت کے خلاف ہو گئے ہیں۔ تشدد یا عدم تشدد کا اس صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ جانی پہچانی بات ہے کہ پولیس کے ظالمانہ رویئے کے سامنے عوام کا ردِعمل لازمی طور پر تشدد ہی ہو گا۔ ان دنوں اکثر یہ ہوا ہے کہ عوام کو کچوکے دے دے کر انتہاپسندی کی راہ پر ڈالا گیا ہے۔ ان کے بچوں کو پولیس نے مارا پیٹا ہے' گولیوں کا نشانہ بنایا ہے' قتل کیا ہے۔ یہ حقائق ہیں' طالب علموں کو شہید کیا گیا ہے۔ میں نے تو پولیس کو نہیں اکسایا تھا کہ طالب علموں کو قتل کرے۔

(19) حکومت طلبا پر میرے اثر و رسوخ کے بارے میں بہت حساس ہے۔ نوجوان لوگ شاید میری جانب اس لئے متوجہ ہوئے تھے کہ میں ان کے مسائل سمجھتا ہوں اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہوں۔ میں اس بات کو کوئی خوفناک غلطی نہیں سمجھتا۔ آخر وہ ہماری آبادی کا جزو لاینفک ہیں' ہماری قوم کا کل سرسبد ہیں' ہمارے مستقبل کی امید ہیں۔ حکومت کے پاس ان کے مطالبات کا جواب یہ رہا ہے کہ اس نے تمام تعلیمی ادارے بند کر رکھے ہیں۔ کسی مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کا یہ عجیب و غریب طریقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سکول اور کالج ہی نہ ہوں گے تو طالب علم بھی نہ ہوں گے اور پاکستان کی آئندہ نسل ماشاءاللہ ناخواندہ ہو گی۔ اگر عوام کا امن و امان اسی قیمت پر خریدا جا سکتا ہے تو یہ امن و امان کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

(20) میں عرض کرتا ہوں کہ حکومت نے تسلیم کر لیا ہے کہ طلبا کے مطالبات مبنی بر حقیقت تھے اور ان میں جان تھی۔ خود صدر صاحب نے بھی اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے

یونیورسٹی آرڈیننس میں ترمیم کرنے کا وعدہ کیا ہے اصل میں انہوں نے مان لیا ہے کہ طلبا کے خلاف حکومت کا جابرانہ اقدام غلط تھا اور طلبا کو بہت بجا شکایات تھیں۔ اگر طلبا اپنی شکایات میں بجا تھے تو پھر میں نے ان کی جو تائید کی تھی وہ بھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اس بات کو صدر صاحب نے اپنی مبینہ "رعایات" کی صورت میں خود تسلیم کیا ہے۔ 22 دسمبر 1968ء کو عیدالفطر کے موقع پر قوم کے نام پیغام میں صدر ایوب نے کہا تھا۔

"ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہئے کہ غلط فہمیاں 'وسوسے' شکوک اور شبہات ہم میں پھوٹ ڈال دیں۔ سب سے بڑھ کر ہمیں یہ سیکھنا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کریں۔ نظریاتی اختلافات کو تلخی اور تشدد میں نہیں ڈھالنا چاہئے"

اگر ان نجیب احساس کو بروئے عمل لایا جاتا تو یہ اور بھی لائق تحسین بن جاتے لیکن حکومت ان کے برعکس عمل پیرا ہے۔ اس کا وتیرہ طعنہ زنی 'الزام تراشی اور گالی گلوچ ہے۔ وہ اپنے کرائے کے غنڈوں کو ملتان کے جلسے میں تلواریں دے کر بھیجتی ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کریں اور اس شہر (لاہور) کے ایک جلسے میں مجھے جسمانی طور پر مجروح کراتی ہے۔ دن دہاڑے پولیس کی سازباز سے وہ قومی شاہراہ پر زبردستی میرا راستہ رکواتی ہے تاکہ کلہاڑیوں سے مجھ پر حملہ کیا جائے اور پھر مسلح ڈاکوؤں کو میرے گاؤں بھیجتی ہے۔ تشدد کی ان ترمستیوں سے بھی اس کا پیٹ نہیں بھرتا تو ملتان کے مسلم لیگیوں کی گورنر مغربی پاکستان کی طرف سے گوشمالی کی جاتی ہے کہ وہ اس علاقے میں میرے دورے کے دوران میری ٹھیک طرح سے خبر کیوں نہ لے سکے۔ اس موقع پر موجود حاضرین میں سے ایک فرد کی بے باکی ملاحظہ ہو کہ اس نے گورنر کو بتایا کہ اس ضمن میں انہوں نے مجھے جان سے مارنے سے ادھر ادھر اپنی سی کوشش کی تھی۔ "ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے" اور "نظریاتی اختلاف کو تلخی اور تشدد میں نہ ڈھلنے دینے" کا یہ بہت نفیس طریقہ ہے۔ اگر ضابطۂ اخلاق واقعی یہی ہوتا تو مجھے محض اس بنا پر نشانۂ ستم کیوں بنایا جاتا کہ مجھے حکومت سے سیاسی اختلافات تھے؟

(21) نا اہل حکمران یہ نہیں سمجھتے کہ تاریخ کے دھارے کس ڈگر پر بہتے ہیں، اس لئے وہ اپنی مشکلات کو اس فرد کی ریشہ دوانیوں کے سر تھوپ دیتے ہیں جو انہیں سب سے زیادہ ناپسند ہوتا ہے۔ اگر طلبا کوئی مشکل پیدا کریں تو وہ سوچتے ہیں کہ ضرور کوئی نہ کوئی انہیں بھڑکا رہا ہے۔ یہ نوجوان اور خصوصاً طلبا کی خاصیت معلوم ہوتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہو تو وہ حالات کو یکسر بدلنے کی خواہش کے اظہار کا تاریخی منصب ادا کرتے ہیں۔ لیکن حکمرانوں کا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ وہ تبدیلی کے امکان کو کچلنے کی توقع میں طلبا کو کچلنے لگتے ہیں۔ حکومت عوام کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ راوی چین لکھتا ہے اور حالات بے حد اچھے ہیں، بس کچھ "شورش پسند" اور "دنگے باز" ہیں جو جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

www.bhutto.org

(22) حکومت نے مجھے بے ہودہ طور پر ہراساں کرنے اور بالآخر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دینے کی جو روش اختیار کی ہے اس کی بناء ان دو حقیقتوں پر ہے:

(الف) اسے یہ خوف تھا کہ تاشقند کے مسئلے کو پاکستان کے عوام کے سامنے ان کے فیصلے کے لئے لا کھڑا کروں گا۔ اور

(ب) صدر ایوب خاں کو یقین ہے کہ میں صدارت کے ضمن میں ان کا سب سے طاقتور حریف ہوں کیونکہ ان کے برعکس مجھے عوام کا اعتماد حاصل ہے۔

مجھے محض اس بناء پر اندھا دھند جیل میں ٹھونس دیا گیا ہے کہ جنگ بندی اور اعلان تاشقند پر حکومت اور میرے درمیان اختلافات ہو گئے تھے۔ میری تقریریں اور اس وقت کے حالات جیل میں میری نظر بندی کا اصل باعث نہیں میری نظر بندی کا اصل باعث یہ ہے کہ مجھے اس علم کو عوام تک لانے سے روک دیا جائے کہ اعلان تاشقند کیوں اور کیوں کر وجود میں آیا۔ حکومت اس بات کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ صداقت سے پردہ اٹھا دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو صدر صاحب خواہ جو

چاہیں جتن کر لیں کسی صورت بھی تیسری مرتبہ منتخب نہیں ہو سکتے۔ مجھے جیل میں محبوس کر کے اور یوں سیاسی میدان سے الگ کر کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صدر کے عہدے پر فائز رہنے کا حتمی انتظام کر رہے ہیں۔ یہ ہے میری نظر بندی کی اصل وجہ نہ کہ نظر بندی کی وجوہ کے میمورنڈم میں درج شدہ وہ الزامات جن کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے میرے خلاف جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ بدنیتی پر مبنی ہیں۔

(23) میرے اور صدر صاحب کے درمیان 1965ء کی جنگ کے دوران اور بعد ازیں اور بالآخر تاشقند میں سنگین اختلافات ابھر آئے تھے۔ ان غیر معمولی حالات میں جنہیں میری اچھی بھلی صحت کے سر منڈھا گیا جب میں نے حکومت کو خیرباد کہی تو 16 رجون 1966ء کی شام کو صدر صاحب نے مجھے اپنے گھر بلوایا۔ شروع شروع میں صدر صاحب خوشگوار رہے۔ میں نے پاکستان کی جو خدمت کی تھی اس پر انہوں نے میری بے حد تعریف کی۔ قدر افزائی کے طور پر انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کیا میں فرانس یا اپنی پسند کے کسی دوسرے ملک میں خصوصی شرائط پر سفارتی عہدہ قبول کر سکوں گا۔ میں نے اس پیشکش کے لئے صدر کا شکریہ ادا کیا لیکن اسے رد کر دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک ہنگامہ خیز دور میں آٹھ سال تک وزیر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد قومی زندگی میں اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے میں اپنی زمینوں پر واپس جانا چاہتا ہوں۔ صدر نے اس خیال کو سراہا اور ازراہ عنایت تجویز کیا کہ مجھے لاڑکانہ میں چینی یا پٹ سن کا کارخانہ قائم کر لینا چاہئے۔ وہ مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ حکومت اس منصوبے کے ضمن میں ہر سہولت دے گی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر صدر کی عنایت کا شکریہ ادا کیا کہ میں اسی بات کو ترجیح دوں گا کہ اپنی سرگرمیوں کو اس پیشے تک محدود رکھوں جس سے میرا خاندان نسل در نسل متعلق رہا ہے اس پر صدر نے اپنا لب و لہجہ بدل لیا۔

www.bhutto.org

انہوں نے مجھے سختی سے یاد دلایا کہ میں ناز و نعمت میں پلنے والا ایک نوجوان ہوں اور میں نے زندگی کے تھپیڑے نہیں سہے اور نہ یہ جانتا ہوں کہ ان کا مطلب کیا ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے کہا' وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مجھے واضح طور پر تنبیہ کر دیں کہ اگر پاکستان واپس آ کر میں نے سیاست میں حصہ لیا تو یہ میرے لئے مصیبت کا باعث ہو گا۔ بات کو پوری طرح واضح کرتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے یاد رکھنا چاہئے کہ اگر میں نے ان کی دشمنی کو مول لیا تو وہ مجھے "قبر تک نہ چھوڑیں گے"۔ ڈرانے دھمکانے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرتے ہوئے میں نے صدر صاحب سے نرمی سے کہا کہ جہاں تک سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں میرے فیصلے کا تعلق ہے اس کا انحصار قومی مفاد پر ہے نہ کہ دھمکیوں پر۔ یہ غیر مبہم جواب پا کر صدر صاحب اپنے پہلے رویئے کی جانب لوٹ گئے اور انہوں نے تجویز کیا کہ تمام معاملات کو ایک ہی دن چھاننے پھٹکنے کی کوئی جلدی نہیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر گفتگو ختم کر دی کہ ان امور کے بارے میں یورپ سے واپسی پر بات چیت ہو جائے گی۔

(24) یورپ میں ہمارے بہت سے سفیروں نے مجھے صدر صاحب کی شرائط قبول کرنے کے لئے طرح طرح کی ترغیب انگیز پیشکش کی۔ ان کے کہنے کے مطابق میں ابھی تک اتنا جواں تھا کہ وقتی طور پر سیاست کو بھلا کر بعد از ایوب دور کا انتظار کر سکتا تھا۔ ان کے مشورے نے کئی روپ دھارے۔ مسٹر عبدالرحمٰن خاں جو مغربی جرمنی میں ہمارے سفیر اور صدر صاحب کے برادر نسبتی ہیں صلح صفائی کی کوشش میں سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ جب میں اکتوبر 1966ء میں واپس آ رہا تھا تو میں کابل میں چند دن رک گیا۔ میں ابھی وہیں تھا کہ مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو' مسٹر ایوب اعوان' کی جانب سے پیغام ملا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ راولپنڈی میں قیام کے دوران میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ جب میں پشاور پہنچا تو ڈی۔ آئی۔ جی پولیس مسٹر انور آفریدی ہوائی اڈے پر مجھ سے ملے تاکہ تصدیق کریں کہ کیا میں نے مسٹر اعوان کی دعوت قبول کر لی ہے۔ میرے پنڈی پہنچنے کے اگلے دن مرحوم الطاف حسین جو اس وقت وزیر صنعت تھے اور جن سے میرے اچھے مراسم تھے مجھ سے ملنے تشریف لائے تاکہ بقول ان کے "دل سے دل" بات چیت ہو جائے۔ وہ ایک تجویز لے کر آئے تھے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ "معقول" ہے اور مجھے قبول کر لینی چاہئے۔ تجویز یہ تھی کہ میں "خاص رعایت" کے طور پر عملی سیاست میں حصہ لے سکتا ہوں' بشرطیکہ ایک یا دو چبھتے ہوئے موضوعات سے گریز کروں اور صاف صاف وعدہ کروں کہ 1970ء میں صدارتی انتخابات میں ذاتی طور پر حصہ نہیں لوں گا۔ میں نے مسٹر الطاف حسین کو بتایا کہ انتخابات ابھی بہت دور ہیں اور جس نوعیت کی یقین دہانی وہ مجھ سے چاہتے ہیں انہیں دینے سے قاصر ہوں۔

اسی شام اپنے ڈنر کے دوران مسٹر اعوان کئی ترغیب انگیز تجاویز سامنے لائے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں پاکستان مسلم لیگ میں نمایاں حصہ لیتا رہوں' مجھے اس بات کی آزادی ہو گی کہ میں عوامی سطح پر خارجہ

www.bhutto.org

پالیسی پر تعمیری تقریریں کرتا رہوں البتہ جنگ اور تاشقند پر زبان نہ کھولوں۔ ان کے بقول میری حیثیت صدر کے غیر سرکاری مشیر کی سی ہو گی۔ اسی طرح مجھے بعض ممالک میں صدر کے سفیر کی حیثیت سے خصوصی مناصب کے لئے دورے کا بھی موقع ملے گا۔ میں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس کی تجاویز رد کر دیں۔ رخصت ہونے سے قبل مسٹر اعوان نے مجھے تنبیہ کی کہ اس صورت میں مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔

(25) نومبر 1966ء میں جب صدر صاحب انگلستان میں سرکاری دورے پر تھے' میں ڈھاکے سے واپس آتے ہوئے لاہور میں رکا۔ مسٹر اختر ایوب جو صدر صاحب کے سب سے بڑے لڑکے ہیں میرے ہوٹل میں ایک ہی دن میں دو بار مجھ سے ملنے آئے اور صلح صفائی کے لئے وکالت کرتے رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس مقصد کے لئے گورنر موسیٰ مجھے دعوت دینے کے آرزومند تھے اور ان سے کہا تھا کہ رسمی طور پر دعوت دینے سے پہلے یہ پتا لگائیں کہ میں اسے قبول کروں گا یا نہیں۔ میں نے مسٹر اختر ایوب سے کہا کہ وہ گورنر موسیٰ سے کہہ دیں کہ وہ اور میں آٹھ سال تک اکٹھے کام کرتے رہے ہیں اور انہیں اس طرح کا تکلف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں گورنر موسیٰ سے ملا اور وہ صدر صاحب کی واپسی پر ان سے "صلح صفائی" کر لینے کی نصیحت کر چکے تو انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تاشقند پر زبان کھولنے سے احتراز کروں۔ اگر اس بات کو گورنر کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس کی شکل کچھ یوں ہو گی: "یہ سب رفت گزشت ہو چکا ہے لہٰذا اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر صدر صاحب بھی انسان ہیں' وہ اس بات کو کیونکر برداشت کر سکتے ہیں۔" میں نے مسٹر موسیٰ سے کہا کہ میں نے صدر صاحب کے ساتھ خاصی لمبی مدت کام کیا ہے اور بخوبی جانتا ہوں کہ جن لوگوں نے ان کی ناراضگی مول لی ان سے انہوں نے کس طرح کا سلوک کیا لیکن اس کے باوجود بعض امور ایسے ہیں جنہیں قوم سے نہیں چھپایا جا سکتا اور تاشقند بھی ایسا ہی مسئلہ واقع ہوا ہے۔

(26) اگلی پیش قدمی پھر مسٹر اختر ایوب اور ان کے چھوٹے بھائی طاہر ایوب نے 16 راپریل 1967ء یا اس سے لگ بھگ کی جب وہ کراچی میں میرے گھر آئے اور سمجھوتے کی ایک اور کوشش کی۔ جب میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا کہ انہیں اس طرح کی بات کرنے کا آخر اختیار ہی کیا ہے تو انہوں نے پرزور الفاظ میں بیان کیا کہ اگر انہیں اپنے والد کی منظوری حاصل نہ ہوتی تو وہ میرے گھر آنے اور اس موضوع پر بات کرنے کی جرأت بھی نہ کرتے۔

(27) موجودہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس' مسٹر رضوی' نے ان کے تتبع میں مئی 1967ء میں ایک اور کوشش کی جب وہ کراچی میں میرے پاس آئے تاکہ مجھے یہ ذہن نشین کرائیں کہ صدر صاحب کے لئے 1970ء میں تیسری مرتبہ صدر بننا کیوں ضروری ہے۔ ایک ماہ بعد انہوں نے اس نکتے پر مزید

زور دیا جب وہ دوبارہ مجھ سے لاہور میں ملے۔ یہ گول باغ کے اس اجتماع عظیم سے میرے خطاب سے ایک روز قبل کا واقعہ ہے جسے میرے تقریر شروع کے چند منٹ ہی بعد حکومت نے زبردستی تہ وبالا کرنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

(28) زور کا سرا ایک مرتبہ پھر مسٹر عبدالرحمٰن خان ' سفیر برائے جرمنی نے اٹھایا جب میں اگست 1967ء میں بون گیا ایک سال بعد ' مئی 1968ء میں مسٹر رضوی مجھ سے دوبارہ کراچی میں میری رہائش گاہ پر اسی مقصد کے تحت ملے جو 1966ء اور 1967ء کے موسم گرما کی ملاقاتوں میں مسٹر عبدالرحمٰن خاں کے پیش نظر تھا اور جس کے سلسلے میں انہوں نے اگست 1968ء میں بھی اصرار کیا جب بون میں وہ مجھ سے دوبارہ ملے۔

(29) حکومت نے پچھلے اڑھائی سال میں لگاتار جتنی بھی پیش قدمیاں کی ہیں ان کا مرکزی نقطہ یہ طے شدہ کوشش رہی ہے کہ:

(الف) مجھے اس بات سے روکا جائے کہ میں جنگ بندی اور تاشقند کو سیاسی مسئلہ نہ بناؤں۔

(ب) میں صاف صاف یقین دہانی کراؤں کہ 1970ء کے صدارتی انتخابات نہیں لڑوں گا۔

جب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ میں پسپائی اختیار نہیں کروں گا تو ساتھ ساتھ ستم کشی کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ یہ بڑھتے بڑھتے ظلم کی حدوں میں داخل ہو گئی۔ وہ واحد ایبڈو زدہ سیاست دان جسے وزیر بنایا گیا ہے میرے ضلع سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے امور داخلہ کا قلمدان سونپا گیا ہے تاکہ وہ مجھے سرنگوں کرے۔

(30) جس طریقے سے مجھے تختۂ مشق بنایا گیا اس کی ہر تفصیل کی فہرست پیش کرنے کے بجائے ' عدالت کی سہولت کے لئے میں اس ستم کشی کی صرف خاص خاص صورتوں پر اکتفا کروں گا جو حکومت نے میرے خلاف روا رکھی ہے:

(الف) میری ذات پر تشدد آمیز جسمانی حملے۔

(ب) مجھے اور میرے خاندان کو مالکانہ حقوق سے محروم کرنے کی کوششیں۔

(ج) جھوٹے مقدموں میں ملوث کرنا اور ان کے فیصلوں کے ضمن میں انصاف کے حصول میں مداخلت۔

(د) دیگر ذرائع سے شخصی سطح پر ہراساں کرنا۔

(ہ) میری سیاسی سرگرمیوں میں مداخلت اور میرے سیاسی حامیوں پر ستم کشی۔

(و) میرے دوستوں ' عزیزوں اور ملازموں کو ہراساں کرنا۔

(ز) جیل میں عدالت کی تحویل میں ہونے کے باوجود بدسلوکی۔

www.bhutto.org

اب میں مذکورہ بالا عنوانات کے تحت چند واقعات بیان کرتا ہوں۔

الف/1 جب میں جون 1967ء میں لاہور میں گول باغ کے جلسے سے خطاب کر رہا تھا تو بجلی کی تاروں کو ننگا کر دیا گیا تھا اور ساتھ ہی گراؤنڈ میں پانی چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ جو لوگ وہاں جمع ہوئے تھے انہیں بجلی کے جھٹکے لگیں۔ مختلف اطراف سے خصوصاً ڈائس کی پچھلی جانب سے گملے اور اینٹیں پھینکی گئیں۔ دو اینٹیں میرے سر میں لگیں اور میں زخمی ہو گیا' میرے بائیں کندھے پر ایک گملا آ کر لگا۔ جب میں وہاں سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا تو کرائے کے کچھ غنڈوں نے مجھے کانٹے دار تار کی باڑ کی جانب دھکے دیئے جس سے مجھے کئی اور زخم آئے۔ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو ارباب اختیار نے نظم و ضبط بحال کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس کے برعکس پولیس کی وہ بھاری جمعیت جسے جلسے شروع ہونے سے پہلے وہاں متعین کیا گیا تھا اچانک غائب ہو گئی۔

الف/2 جب پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد میں نے جنوری 1968ء میں ملتان کا دورہ کیا تو میرا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ حکومت نے عزم کر رکھا تھا کہ ملتان ڈویژن میں میرے مشن کی کامیابی کو سبوتاژ کرے گی۔ اپنے اس بد اندیش منصوبے کے حصول میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مسلم لیگ کے زعماء کو حرکت میں لایا گیا اور گڑبڑ پھیلانے کے لئے غنڈے کرائے پر لئے گئے۔ پروگرام کے مطابق مجھے ملتان کے چیدہ چیدہ شہریوں سے "شیزان" ہوٹل میں خطاب کرنا تھا پولیس کی حفاظت میں جو غنڈے وہاں جلسے کو درہم برہم کرنے کے حکم کے تحت بھیجے گئے تھے وہ آدھ گھنٹے تک پتھر اور اینٹیں پھینکتے رہے۔ وہ خنجروں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ ہوٹل کو اچھا خاصا نقصان پہنچا۔ پولیس نے اس وقت تک مداخلت نہ کی جب تک کہ اس بڑے ہجوم نے جو مجھے خوش آمدید کہنے جمع ہو گیا تھا ان غنڈوں کو بھگانے کے لئے بیچ میں مداخلت نہ کی۔

الف/3 اگلے دن مجھے خانیوال بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنا تھا۔ اپنے حامیوں کے ہمراہ میں ملتان سے صبح صبح روانہ ہوا۔ راستے میں قادر پور راواں کے مقام پر کرائے کے 25 غنڈوں نے ہماری موٹروں کو زبردستی روک لیا۔ وہ کلہاڑیوں اور چاقوؤں سے مسلح تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار بدنیتی سے مجھ پر لہرائے۔ انہوں نے ہماری چار پانچ کاروں کے ٹائر پھاڑ دیئے۔ جب میں مجبوراً اپنی کار سے باہر نکلا تو میں نے قریب ہی بہت سے کانسٹیبلوں کی معیت میں ایک پولیس انسپکٹر کو کھڑے دیکھا۔ انہوں نے مسلح لٹیروں کو قابو کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ حملہ آوروں سے ہمیں بچانے کے سلسلے میں ان کی بے پروائی پر انہیں شرم دلا کر میں نے اپنی کار تبدیل کی اور ایک طویل راستے سے بصد مشکل خانیوال پہنچا۔

الف/4 تیسرے روز مجھے قاسم باغ کے جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا، جسے حکومت درہم برہم کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ چنانچہ حکومت کے زر خریدوں اور تنخواہ داروں کو مختلف مقامات پر متعین کر دیا گیا تاکہ اس جلسے کو درہم برہم کر سکیں جو ملتان کی تاریخ میں ایک عظیم ترین اجتماع تھا۔ ایک جتھا قلعے کے اس دروازے کو روکنے کے لئے متعین کیا گیا تھا جو جلسہ گاہ پر کھلتا تھا۔ جب اس بات کا پتا چلا تو میرے

www.bhutto.org

حامی مجھے اس راستے کے بجائے پیچھے سے ایک خلاء میں سے گزار کر سٹیج پر لے آئے۔ جب دروازے پر متعین کرایہ داروں کو پتا چلا کہ میں سٹیج پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو انہوں نے ہجوم پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ ہجوم نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی مجھے بولتے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اس جتھے نے جسے ہجوم کے درمیان متعین کیا گیا تھا لوگوں کو بانکوں اور ڈنڈوں سے پیٹنا شروع کر دیا تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔ جب یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تو تیسرا جتھا جس کی قیادت ملتان کا ایک بدنام غنڈہ کر رہا تھا، اور جسے سٹیج سے قریب متعین کیا گیا تھا تلواریں، خنجر اور چاقو لہراتا ہوا لوگوں کو ڈرانے دھمکانے لگا۔ تلواریں سونتے یہ جتھا قدم بہ قدم میری جانب بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے دو نے، جو میرے بالکل پاس پہنچ گئے تھے، مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں اور چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اب میرا خاتمہ قریب آگیا ہے اور میں اس جگہ سے زندہ بچ کر نہ جاؤں گا۔ مجھے مجمع عظیم کے اس حصے نے بچایا جس نے ان غنڈوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا تھا جب کہ وہ مجھ سے صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اس جھڑپ میں نہ صرف ہجوم کے متعدد شرکاء بلکہ چند کرایہ دار بھی بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ انتظامیہ کی بالائی سطح جو ڈی آئی جی، ڈی سی، ایس پی اور دوسروں پر مشتمل تھی، اس نے اس گڑبڑ کا قلعے کے ایک مقام نظر سے تماشا کیا لیکن مداخلت کی ضرورت نہ سمجھی۔ جب لوگوں نے انتشار پسندوں پر قابو پا لیا تو پولیس پھرتی سے حرکت میں آگئی مگر محض اس لئے کہ زخمی کرایہ داروں کو اٹھا لے جائے اور جلد از جلد ہسپتال میں داخل کرا دے۔ جو لوگ ہجوم میں سے زخمی ہوئے تھے نہ تو پولیس نے ان کی کوئی مدد کی اور نہ انہیں ہسپتال میں داخلہ ملا۔

الف/5 آٹھ ماہ قبل کچھ اجنبی میرے گاؤں میں آوارہ گردی کرتے دیکھے گئے۔ انہیں مشتبہ پا کر بعض گاؤں والے ان کے پیچھے لگ گئے۔ یہاں تک کہ وہ چائے کی ایک دکان میں جا پہنچے۔ جب ان لوگوں نے میرے گھر کا ایک نقشہ میز پر بچھایا تو ان کا تعاقب کرنے والے افراد ان پر جھپٹ پڑے اور گھر کا نقشہ چھین لیا، ساتھ ہی وہ دستی بم اور پستول بھی چھین لئے جن سے یہ لوگ مسلح تھے۔ وہ انہیں تھانے لے گئے جہاں انہیں اور اس تمام اسلحے کو جو ان سے چھینا گیا تھا حوالۂ پولیس کر دیا گیا۔ بظاہر اپنے افسروں کی ہدایات پر تھانیدار نے ان سب لوگوں کو رہا کر دیا۔ یہ واقعہ اخبار "کمنٹ" میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ابھی تک اس کی تردید نہیں کی گئی۔

ب/1 میں اور میرا خاندان زرعی اصلاحات کے تحت اپنی بہت سی زرعی املاک سے دستکش ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وزیر داخلہ کی شہ پر مجھے ہراساں کرنے کے لئے بعض لوگوں کی جھوٹی درخواست پر بار بار تفتیش کرائی جاتی ہے تاکہ میرے نابالغ بچوں کو ان کی زرعی املاک سے محروم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں لاڑکانہ کے تین ڈپٹی کلکٹروں نے چار مختلف موقعوں پر تفتیش کی ہے اور الزامات

www.bhutto.org

کو بے بنیاد پایا ہے۔ ان کے نتیجہ تحقیقات کے باوجود ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ اور کمشنر خیرپور نے ہر بار اصرار کیا ہے کہ از سر نو تفتیش کی جائے۔ اگرچہ یہ تفتیشات، ہماری املاک سے متعلق ہیں اور عدالت ہائے مال کے زیر اہتمام انجام پائی ہیں جن میں وکلاء پیش ہوئے ہیں، بیانات درج ہوئے ہیں، گواہوں پر جرح ہوئی ہے اور دستاویزوں کی جانچ پڑتال کی گئی ہے لیکن عدالت کے نتیجہ تحقیقات کی نقول ہمیں مہیا کرنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ یہی نہیں، محکمہ انسداد رشوت ستانی کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنے طور پر الگ اس مسئلے کی تفتیش کرائے ۔۔۔۔ کسی مبینہ طور پر ستم زدہ کی طرف سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر نہیں، بلکہ لاڑکانہ میں حیدر آباد کے ایک پولیس انسپکٹر کی جانب سے دائر کردہ ایف آئی آر کی بنا پر ..... وزیر داخلہ نے بار بار بار یہ سرعام کہا ہے کہ میں نے غریب مزارعین کی زمین غصب کر لی ہے حالانکہ یہ بات ان حقائق کے منافی ہے جن کی تصدیق عدالت ہائے مال کے نتیجہ تحقیقات سے اور زرعی اصلاحات کی نظامت کے احکامات سے ہوتی ہے۔ یہ اقدام اس دہرے مقصد کے تحت کیا گیا ہے کہ مجھے بدنام کیا جائے اور حصول انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جائے۔

ب/2 اپریل 1968ء میں لاہور اور حیدرآباد کے بیسیوں سرکاری افسروں کو لاڑکانہ میں اس کام پر متعین کیا گیا کہ وہ میرے پورے خاندان کی جس میں میرے سب چچا اور چچیرے بھائی بہن بھی شامل ہیں املاک سے متعلقہ ریکارڈ اور دستاویزیں حاصل کر لیں جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہمیں ہماری املاک سے محروم کرنے کے ذرائع ڈھونڈے اور راہیں تراشی جائیں۔

ب/3 جب تک حکومت نے اکتوبر 1968ء میں چاول کی نقل و حمل پر پابندیاں نہ لگا دیں، پالیسی یہ تھی کہ خریداری کی حد پوری ہونے کے بعد چاول کی فروخت کے پرمٹ جاری کر دیئے جاتے تھے بسوائے ان معدودے چند موقعوں کے جب حکومت کو فوری ضرورت پڑ گئی ہماری 1967ء کی چاول کی فصل نہ تو خریدی گئی اور نہ اس کی فروخت کے لئے پرمٹ جاری کیا گیا۔ ہماری آمدنی کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ ہمیں شدید مالی مشکلات کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہاں تک کہ حکومت نے عام پالیسی کے طور پر اکتوبر 1968ء میں چاول کی نقل و حمل سے پابندیاں اٹھا لیں۔

ب/4 حکومت پاکستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے ان اعلانات کو منسوخ کرتے ہوئے جن کے تحت مجھے اسلحہ رکھنے کے ضمن میں لائسنسوں کی ضرورت نہیں تھی یک طرفہ کارروائی کی۔ اس کارروائی کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہوم سیکرٹری نے حکم دیا کہ میرا تمام لائسنس یافتہ اسلحہ ضبط کر لیا جائے۔ یہ حکم ہلال پاکستان کے ایوارڈ کے دائرے میں آنے والے ہتھیاروں پر بھی حاوی تھا بلکہ سجاوٹی ہتھیاروں اور ان قدیم ہتھیاروں پر بھی جو آرمز آرڈیننس کی زد میں نہ آتے تھے۔ کراچی ہائی کورٹ نے حکومت کی اس تمام تر کارروائی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ جیسا کہ عدالت عالی وقار نے فیصلہ دیا ہوم سیکرٹریٹ نے غیر قانونی احکام جاری کئے تھے جو اسلحہ ضبط کر لینے کے مترادف تھے۔ جب یہ معاملہ

www.bhutto.org

ہائیکورٹ میں زیر غور تھا تو اس دوران میں بھی ایک درخواست کے ذریعے جسے ہوم سیکرٹری کے حلفیہ بیان کی تائید حاصل تھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ حالت موجودہ کی منسوخی کا حکم حاصل کر لیا جائے تاکہ حکومت عدالت عالی وقار کے فیصلے سے قبل ہی میرے ہتھیار چھین لے۔ یہی نہیں بلکہ جب ہائی کورٹ نے حالت موجودہ قائم رکھنے کا حکم دے دیا تب بھی ڈی ایس پی مسٹر قادری جو ٹریکٹروں کے مقدمے کے انچارج تھے میرے گھر آئے اور انہوں نے اتنی بے باکی کا مظاہرہ کیا کہ مجھے حکم دیا کہ میں اپنے تمام ہتھیار ان کے حوالے کر دوں۔

ج حکومت نے مجھے یکے بعد دیگرے مختلف مقدمات میں ملوث کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مجھے ان مقدمات کی پیروی اور غداری میں اس قدر الجھا دیا جائے کہ میں ان سیاسی امور پر توجہ مرکوز نہ کر سکوں جنہیں ملک میں اولین حیثیت حاصل ہے۔

ج/1 ٹریکٹروں کا بدنام مقدمہ کھڑا کرنا بھی میرے ساتھ حکومت کی بدنیتی کو بے نقاب کرنے کے ضمن میں ایک متعلقہ شہادت ہے۔ اس مقدمے کے چند انوکھے پہلو جو کراچی ہائی کورٹ کی جانچ پڑتال اور غور و فکر سے گزر چکے ہیں اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہنے دیتے کہ حکومت میری سیاسی تباہی کے لیے آخری حد تک بھی جائے گی۔ میرے بارے میں صریح دھوکے باز اور جعل سازی کا معین ہونے کے جو الزامات لگائے گئے ہیں وہ اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب میری ناچیز قومی خدمات کے اعتراف میں مجھے ہلال پاکستان کے اعلیٰ سول ایوارڈ سے نوازا گیا تھا اور 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران اور بعد میں میں نے جو کوششیں کی تھیں انہیں پوری قوم نے سراہا تھا جس میں پاکستان کے صدر محمد ایوب خان اور پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس اے۔ آر کارنیلس بھی شامل ہیں۔ اس مقدمے میں جو سرکاری ملازمین وعدہ معاف گواہ بن گئے ہیں انہیں نہ صرف ملازمت پر بحال رکھا گیا بلکہ انہیں ترقی دے دی گئی۔ اگرچہ یہ مقدمہ اگست 1967ء میں ایک بالکل اجنبی شخص کی جانب سے گورنر مغربی پاکستان کے نام براہ راست شکایت کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا لیکن یہ بڑی معنی خیز بات ہے کہ مقدمے کے ضمن میں چارج شیٹ یکم نومبر 1968ء کو جاری کی گئی۔ عدالت نے 15 نومبر کو پہلی پیشی مقرر فرمائی تھی اور قانونی طور پر مجھے حاضر عدالت ہونا تھا لیکن 13 نومبر کو گرفتاری کے باعث معذور تھا۔ بعد ازیں عدالت کی جانب سے 14 دسمبر کو حاضری کے وارنٹ جاری ہونے کے باوجود حکومت نے عدالت کے اس حکم کی تعمیل کے لئے کوئی اقدام نہ کیا۔ اس کے برعکس ساہیوال جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے دیدہ دانستہ

چارج شیٹ میں مجھے مفرور بیان کیا گیا تھا حالانکہ اس وقت میرے محل وجود کے بارے میں اچھا بھلا علم تھا اور اس کا خوب چرچا کیا جا چکا تھا۔ حاضری کے وارنٹ کی دیدہ دانستہ خلاف ورزی کے علاوہ حکومت بے بوجہ باتوں پر التوا کی درخواستیں پیش کرتی رہتی ہے۔ ایک پیشی پر ڈی ایس پی مسٹر قادری نے یہ درخواست گزاری تھی کہ مقدمے کو سکھر سے لاڑکانہ منتقل کر دیا جائے کیونکہ تمام تر گواہ اور ملزمین

www.bhutto.org

لاڑکانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے الٹ 13 جنوری 1969ء کو حکومت نے ایک اور درخواست گزاری جس میں ان 29 ملزمین کی سہولت کو یکسر نظرانداز کر کے جو کبھی اپنے ماحول سے باہر نہیں آئے، یہ چاہا گیا کہ مقدمے کو سید حالا ہور منتقل کر دیا جائے۔

جب ابتداء اگست 1967ء میں ایف آئی آر دائر کی گئی تو ملزموں میں سے بعض لوگوں کی ضمانت قبل از گرفتاری قبول ہو گئی تھی۔ اس حکم کے توڑ کے لئے انہی بنیادوں پر ایک اور ایف آئی آر دائر کر دی گئی اور بعض ملزموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نظربندی کے دوران انہیں ڈرا دھمکا کر مجھے ملوث کرنے کے لئے

کے لئے ان سے جھوٹے اقرارات کرا لئے گئے۔ کم از کم دو سرکاری ملازموں کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا گیا ہے اور چارج شیٹ پیش ہو جانے کے باوجود انہیں معطل کرنے کے ضمن میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ایک وعدہ معاف گواہ مستی سید امیر حسین شاہ کو ترقی دے دی گئی ہے۔

حضور والا کو اس مقدمے کے خصائص کی ایک جھلک دکھانے کے لئے میں عرض کروں گا کہ جب میں اگست 1968ء میں لاہور میں تھا تو مجھے ڈائریکٹر انٹیلی جنس مسٹر رضوی کا پیغام ملا کہ اگر میں حکومت کے خلاف تنقید کو نرم کر دوں تو یہ اور دوسرے مقدمات واپس لے لئے جائیں گے۔

ٹریکٹروں کے مقدمے کے اندراج کے بعد مغربی پاکستان کے وزیر داخلہ نے دسمبر 1967ء میں کراچی میں ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ میرے خلاف "ڈھلے لوہے کا مقدمہ" بھی موجود ہے۔ اس کے بعد 1968ء کے اوائل میں دادو میں ایک تقریر کے دوران انہوں نے کہا کہ مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ میں بے گناہ ہوں۔ چھان بین کے دوران بہت سے اور موقعوں پر وہ جھوٹے اور ضرر رساں بیانات دیتے رہے ہیں جن میں جرم ثابت ہونے سے قبل ہی مجھے مجرم کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

ج/2 غریب طلبا کی تعلیم کے لئے میرے قائم کردہ ایک ٹرسٹ کو جو میری کوششوں سے جمع ہونے والے چندے سے چلتا تھا محکمہ اوقاف نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور وزیر داخلہ نے اس دوران میں کہ میری رٹ پٹیشن زیر سماعت ہے بعض کینہ ور اور غلط بیانات جاری کئے ہیں۔

ج/3 حال ہی میں مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ اس عرصے میں 'ہوم سیکرٹری کی زبان میں دہرے تحفظ کے لئے .... اور اس اصطلاح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت میرے ساتھ کس انداز سے نپٹ رہی ہے۔ مجھے ایک اور جھوٹے فوجداری ( ) مقدمے میں ملوث کر دیا گیا ہے جس میں مجھ پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ میں نے چینل کوڈی دفعہ 307 کے تحت ایک جرم میں معاونت کی ہے۔

دادو/1 واضح طور پر جھوٹی اور بے ہودہ درخواستوں پر میرے ضلع کے مال افسروں کی بار بار کی تفتیشات اور ان کی جانب سے مجھے ان کارروائیوں کی روداد کی نقول مہیا کرنے سے انکار ایک ایسا معاملہ ہے جو کراچی کی عالی وقار ہائی کورٹ کے فیصلے کا منتظر ہے۔

www.bhutto.org

داور و/2 جس انداز سے اور جن حالات میں کراچی کی پولیس نے مجھے اپنے سامنے حاضر ہونے کے لئے بلوا بھیجا وہ بھی ایک متعلقہ مسئلہ ہے اور یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اس خبر کو مقبوضہ پریس میں کس طرح اچھالا گیا تھا۔

داور و/3 میرے ضلع اور ڈویژن کے افسروں کو ہدایات بھیجی گئی ہیں کہ مجھ سے احتراز کریں' نہ تو مجھ سے ملیں جلیں اور نہ ایک شہری کے طور پر میں اپنی نجی یا عوامی تقریبات کے ضمن جو امور ان کے سامنے لاؤں ان پر کوئی توجہ دیں' یہاں تک کہ ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا جو واحد افسر تھے جن سے میں حکومت سے الگ ہونے کے بعد اڑھائی سال کے عرصے میں اپنے طور پر ملا تھا۔

داور و/4 پاکستان کی قومی اسمبلی کو بینکوں کے حسابات کی رازداری کا قانون پاس کئے دو ایک دن ہی ہوئے ہوں گے کہ ضلعی حکام نے میرے بینکاروں سے مطالبہ کیا کہ میرے حسابات ان کے سامنے رکھے جائیں۔ میں نے حکام سے جن میں گورنر سٹیٹ بینک اور مرکزی وزیر خزانہ تک شامل ہیں' احتجاج بھی کیا لیکن یہ غیر قانونی کوششیں جاری رہیں یہاں تک کہ بالآخر سیشن کورٹ لاڑکانہ کا ایک یک طرفہ حکم حاصل کر لیا گیا۔

داور و/5 میرے چچیرے بھائی ممتاز علی بھٹو ایم این اے اور دوسرے عزیزوں کو وقتاً فوقتاً تنبیہ کی جاتی رہی ہے کہ اگر انہوں نے مجھ سے قطع تعلق نہ کیا تو انہیں سنگین مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان دھمکیوں کی تعمیل میں ان کے مزارعین اور ملازمین کے خلاف متعدد جھوٹے مقدمات دائر کئے گئے ہیں۔ بالآخر انہیں 13 نومبر 1968ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت بغیر کسی جواز کے نظر بند کر دیا گیا۔ مشتاق علی بھٹو کو جو میرے کم سن بھتیجے ہیں حکام نے مسلسل تختۂ مشق ستم بنا رکھا ہے اور انہیں بھی نومبر 1968ء میں پبلک آرڈی نینس کے تحت نظر بند کر دیا گیا تھا۔

داور و/6 جب سے میں حکومت سے رخصت ہوا ہوں ہم سے متعلق ایک سو سے زیادہ لوگوں کو ستایا گیا ہے' نظر بند کیا گیا ہے اور جیلوں میں مارا پیٹا گیا ہے۔

داور و/7 مسٹر غلام مصطفیٰ کھر ایم این اے کو مجھ سے ذاتی دوستی کی بناء پر متعدد فوجداری مقدمات میں ملوث کر دیا گیا ہے جن میں ڈاکا زنی کا ایک ایسا مقدمہ بھی شامل ہے جس کے تحت انہوں نے اپنی ہی زمینوں سے اپنے مزارعین کے حصے کی چند من کپاس زبردستی اٹھالی تھی۔ کچھ عرصہ قبل' جب تک کہ سیشن کورٹ نے انہیں رہا نہیں کر دیا' حکام نے انہیں ملتان میں غیر قانونی طور پر علاقہ بند کر رکھا تھا۔ ان کا ایسا لگاتار پیچھا کیا گیا ہے کہ ایک گزشتہ موقع پر جب عالی وقار ہائی کورٹ نے ایک اور معاملے میں ان کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کی تو یہ بھی پیش نظر رکھا کہ یہ ضمانت ان تمام مقدموں کے لئے ہو گی جن میں وہ مطلوب ہیں۔ حکام نے اور ان کی جماعت کے قائدین نے انہیں بار ہا بتایا ہے کہ اگر وہ میری دوستی

www.bhutto.org

ترک کردیں تو نہ صرف ان کا فوری طور پر پیچھا چھوڑ دیا جائے گا بلکہ انہیں منہ ما نگا انعام دیا جائے گا۔ 13 نومبر 1968ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت ان کی نظر بندی کو یہ عدالت عالی وقار پہلے ہی غیر قانونی قرار دے چکی ہے۔

داور و/8 سندھ سے قومی اسمبلی کے ایک رکن کو بھی میری دوستی کی پاداش میں ہراساں کیا گیا یہاں تک کہ یہ سمجھ لیا گیا کہ انہوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے۔ انہیں تنبیہ کی گئی کہ اگر آئندہ وہ مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تو مجھ سے احتراز کریں۔

داور و/9 اسی طرح سندھ سے صوبائی اسمبلی کے متعدد ارکان کو، جن میں اس علاقے کے کئی با اثر لیڈر بھی شامل ہیں، واضح طور پر تنبیہ کی گئی کہ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں ان میں سے بعض پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور موقع موقع پر وہ زیر عتاب آتے رہے ہیں کہ مجھ سے معاشرتی طور پر کیوں ملے۔

میرے سیاسی حامیوں اور دوستوں کو جس طرح ہراساں کیا گیا اور ستایا گیا اس کی ایک ایک تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ حکومت نے اس معاملے میں جو طرز عمل اختیار کیا اس سے اب ہر کوئی واقف ہو چکا ہے۔ عدالت عالی وقار کو اس کی ایک جھلک دکھانے کے لئے چند مثالیں عرض کی جاتی ہیں۔

ہ/1 جب پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی جا رہی تھی تو اس مقام کو جہاں کانفرنس کے لئے سٹیج بنائی جا رہی تھی نذر آتش کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہ/2 حکومت نے لاہور اور ملتان میں میرے جلسوں کو تہ و بالا کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ میں الگ طور پر عرض کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی میں نے تقریر کی ہے حکومت نے رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ لاؤڈ سپیکروں کی اجازت نہیں دی گئی، دفعہ 144 فوجداری کے تحت امتناعی حکم کو بے دریغ نافذ کیا گیا ہے اور دفعہ 144 فوجداری کی شرائط کا ناجائز استعمال کیا گیا ہے۔ ساری انتظامیہ کو اس نہج پر ڈھال دیا گیا ہے کہ مجھے عوام تک پہنچنے سے باز رکھا جائے۔

ہ/3 ڈیرہ اسماعیل خان میں حکومت کے ایک وزیر کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ تشدد کا استعمال کرکے اور دفعہ 144 کو توڑ کر میرے دورے کو کامیاب ہونے سے روک دے۔ حکومت نے جھوٹے پریس نوٹ جاری کئے ہیں اور اطلاعات کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لایا گیا ہے تاکہ میری سیاسی سرگرمیوں اور مقاصد کے بارے میں غلط باتیں پھیلا دی جائیں۔ سول سروس کی روایات کو ملیا میٹ کرکے ڈپٹی کمشنروں اور دوسرے حکام نے براہ راست اور از راہ تسخر پریس میں سیاسی نوعیت کے جانبدارانہ بیانات دیئے ہیں۔ گورنر مغربی پاکستان نے میرے خلاف گالی آمیز اور جلی کٹی زبان استعمال کی ہے۔

ہ/4 7 نومبر 1968ء کو جب میں شیر پاؤ سے کار کے ذریعے راولپنڈی پہنچا تو سڑک پر پولی ٹیکنیک کے طلبا کے ایک بڑے ہجوم نے مجھے خوش آمدید کہا جو اپنے انسٹیٹیوٹ سے دو ایک میل آگے آکر جمع تھے کیونکہ پولیس نے اس کی طرف جانے والی شاہراہ بند کر رکھی تھی۔ جب میں ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل آیا تو

www.bhutto.org

میں نے ہال کے سارے علاقے کو اشک آور گیس کے دھوئیں میں اٹا پایا۔ مجھے پتا چلا کہ متعدد طلبا جو گارڈن کالج سے جلوس کی صورت میں نکلے تھے تاکہ لنڈی کوتل سے خریدے ہوئے اپنے مال کی ضبطی کے خلاف احتجاج کریں، ہوٹل انٹر کونٹی نینٹل کے سبزہ زار میں جمع ہو گئے تھے جہاں، کسی طرح کے اشتعال کے بغیر، انہیں اچانک اور بے رحمانہ مارا پیٹا گیا اور بھگا دیا گیا۔ ہوٹل میں پہنچنے کے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے پولی ٹیکنیک سے ایک ٹیلی فون موصول ہوا کہ پولیس نے وہاں گولی چلا دی ہے جس کے نتیجے میں ایک طالب علم عبدالحمید کی موت واقع ہو گئی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ طلبا مُصر ہیں کہ لاش کو جلوس کی صورت میں ایوان صدر لے جائیں اور چاہتے ہیں کہ میں جلوس کی قیادت کروں۔ میں نے طلبا کو مشورہ دیا کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے صورت حال مزید خراب ہو جائے میں نے ان سے پُرزور اپیل کی کہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اور کشیدگی کو مزید نہ بڑھنے دیں۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی پارٹی کے کچھ لوگوں کو پولی ٹیکنیک انسٹیٹیوٹ بھیجوں تاکہ وہ طلبہ پر حکومت کے پیدا کردہ بحران میں نظم و ضبط کی ضرورت کو واضح کر سکیں۔ وہ طلبا سے رابطہ پیدا نہ کر سکے کیونکہ پولیس نے انسٹیٹیوٹ کو بند کر رکھا تھا۔ 8 نومبر کو تین بجے سہ پہر کے قریب میں بذریعہ کار راولپنڈی سے پنڈی گھیب روانہ ہوا تاکہ عبدالحمید کے خاندان سے اظہار تعزیت کر سکوں۔ مسٹر خورشید حسن میر ایڈووکیٹ، جو پاکستان پیپلز پارٹی ضلع راولپنڈی کے چیئرمین ہیں، میرے ہمراہ تھے۔ اگلی صبح انہیں آتش زنی کے ایک مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا جو مبینہ طور پر راولپنڈی میں 8 نومبر 1968ء کو تین بجے سہ پہر کے بعد ہوا تھا۔ جب سیشن کورٹ نے ان کی ضمانت قبول کر لی، اور اس حکم پر بعد میں ہائی کورٹ نے بھی مہر تصدیق ثبت کی تھی، تو انہیں 10 نومبر کو، ان کی رٹ پیٹیشن کی پیشی کے دوران، ایک تنسیخی حکم کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس سے میری پارٹی اور پارٹی کے ارکان کے بارے میں حکومت کے رویئے کا مختصر سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میری پارٹی کی اصولی کمیٹی کے ایک رکن ڈاکٹر مبشر حسن کو اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا کہ وہ "حکومت کے خلاف نفرت پھیلا رہے تھے"۔ قومی اسمبلی کے دو ارکان کو جن میں سے ایک میرا عزیز اور دوسرا دوست ہے محض اس لئے گرفتار کر لیا گیا کہ انہیں گارڈن کالج راولپنڈی میں دیکھا گیا تھا اور یوں 13 نومبر اور اس کے بعد اندھا دھند گرفتاریوں کی ایک لہر وجود میں آئی۔

ز/1 مجھے 13 نومبر کی ابتدائی گھڑیوں میں لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن، رکن اصولی کمیٹی پاکستان پیپلز پارٹی، کے گھر سے گرفتار کیا گیا جہاں میں اور مسٹر ممتاز علی بھٹو ٹھہرے ہوئے تھے میری گرفتاری کے چند منٹ بعد مسٹر ممتاز علی بھٹو اور ڈاکٹر مبشر کو گرفتار کر لیا گیا اور بیگم مبشر کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ مجھے میانوالی جیل لے جایا گیا جہاں میں صبح سات بجے پہنچ گیا۔ میری گھری تلاشی لی گئی، میرے سامان کی ایک ایک چیز دیکھی گئی۔ میرے کاغذات اور کتابیں ضبط کر لی گئیں حالانکہ قانون کے تحت مجھے اجازت تھی کہ یہ چیزیں میرے پاس رہتیں۔

www.bhutto.org

مجھے ایک خستہ حال کوٹھڑی میں محبوس کیا گیا جو چوہوں اور مچھروں سے اٹی ہوئی تھی اور چارپائی ایک زنجیر سے بندھی ہوئی تھی۔ اس سے ملحقہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا کہ اسے غسل خانے کے طور پر استعمال کیا جائے لیکن وہ اس قدر غلیظ تھا کہ اس میں داخل ہوتے ہوئے بھی گھن آتی تھی۔ خوراک لال آٹے کی دو چپاتیوں پر اور دال پر جس میں پتھر تھے یا دو ذرا ذرا سی بوٹیاں مشتمل تھی۔ جب تک میں وہاں رہا ایک تیز بتی چوبیس گھنٹے جلتی رہتی تھی جس سے رات کو سونا محال تھا۔ مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہائی کورٹ نے میرے وکلاء کو مجھ سے ملنے کی اجازت دیدی ہے تو میں نے فوری طور پر کچھ کاغذ مانگا تاکہ میں ان سے ملاقات کے لئے کچھ اندراجات تیار کر لوں۔ میری بار بار کی درخواستوں کے باوجود مجھے 18 نومبر کی سہ پہر تک تحریری کاغذ نہ دیا گیا۔ میرے نام خطوط اور تاریں مجھے نہ پہنچائی گئیں۔ "پاکستان ٹائمز" اور "مشرق" کے سوا مجھے کوئی اور اخبار مہیا نہ کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ عالی وقار ہائی کورٹ نے حکم دیا تھا کہ تمام نظر بندوں کو ایک ہی جیل میں رکھا جائے 18 نومبر کی شام کو مجھے ساہیوال جیل لے جایا گیا جہاں میں 19 نومبر کی ابتدائی گھڑیوں میں پہنچا۔

ز/2 میری نظر بندی کے لئے ساہیوال جیل میں جو انتظامات کئے گئے وہ بے قاعدہ تھے اور وہاں بھی مجھے قید تنہائی میں رکھا گیا۔ یہاں چوہوں کی جگہ کمرہ چمگادڑوں سے بھرا ہوا تھا اور ان سے بچنے کے لئے میں اپنے چہرے پر تولیہ لپیٹ کر سوتا تھا۔ مچھروں اور مکھیوں کی بھرمار تھی۔ غسل خانہ کوٹھڑی سے الگ تھا۔ اسے اور لوگ بھی استعمال کرتے تھے۔ جیل کا دستور ہے کہ اے اور بی کلاس کے نظر بندوں کو ذاتی خدمت کے لئے ایک قیدی دے دیا جاتا ہے۔ جو مشقتی مجھے دیا گیا اسے کہا گیا کہ اگر اس نے مجھ سے بات کی تو اس کی کھال کھینچ دی جائے گی۔ میانوالی جیل کے برعکس اس شخص کو میرا کھانا تیار کرنے کے لئے سبزی کاٹنے کی چھری تک نہ دی گئی۔ اسی طرح میانوالی کے برعکس جہاں میری کوٹھڑی میں شام کے 8 بجے تالا ڈالا جاتا تھا، یہاں 5 بجے شام ہی وارڈن مجھے بند کرنے آجاتا تھا۔ البتہ میانوالی کی طرح خوراک یہاں بھی ناخوردنی اور ناکافی تھی۔ جب ہائی کورٹ کے حکم کے بموجب شیخ محمد رشید ایڈووکیٹ نے مجھ سے ملاقات کی تو میں نے انہیں وہ ذرا ذرا سی بوٹیاں دکھائیں جن پر میرا کھانا مشتمل تھا۔ قانون کے برخلاف نہ مجھے ریڈیو استعمال کرنے کی اجازت تھی اور نہ خوراک کا ذاتی انتظام کرنے کی۔ میں نے جیل کے حکام کو پانچ یا چھ درخواستیں بھیجیں جن میں اپنی نظر بندی کی غیر قانونی صورتوں پر احتجاج کیا گیا تھا لیکن نہ تو یہ درخواستیں مجھے لوٹائی گئیں اور نہ ان پر کوئی عمل ہوا میں نے ان درخواستوں میں نشان دہی کی تھی کہ اے کلاس نظر بند ہونے کے اعتبار سے مجھے بعض سہولتوں کا حق حاصل ہے جن سے مجھے دیدہ دانستہ اور کینہ وری سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ میرا عم زاد اور میرے دوست اس جیل میں تھے، ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ، ہمیں ایک دوسرے سے مطبوعات کا تبادلہ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ کسی دوسرے قیدی کو مجھے ملنے یا دیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یوں سمجھئے کہ جب مجھے اپنے وکلاء سے ملنے کے لئے اپنی وارڈ سے نکل کر سپرنٹنڈنٹ کے دفتر جانا پڑتا تھا تو تمام راستے کو

www.bhutto.org

خالی کرالیا جاتا تھا۔ میری ضروری ڈاک روک لی جاتی تھی۔ مجھے صرف وہ خطوط ملتے تھے جو میرے بچے لکھتے تھے یا پھر عوام کی جانب سے ادھر ادھر کے خطوط یا عید کارڈ۔

ز/3 مذکورہ بالا غیر قانونی حرکتوں کے باوجود حکومت نے ایک جھوٹا پریس نوٹ جاری کیا جس میں کہا گیا کہ میری بڑی اچھی نگہداشت ہو رہی ہے اور مجھے کوئی شکایت نہیں۔ جونہی میں نے یہ جھوٹا پریس نوٹ پڑھا میں نے تحریری طور پر اس کے خلاف احتجاج کیا اور اپنی سابقہ شکایات کو دہرایا کہ مجھے قید تنہائی میں رکھا جا رہا ہے اور قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مجھے دوسری سہولتیں بھی حاصل نہیں۔ جب عدالت نے ازراہ کرم میری شکایات کا جائزہ لیا تو ایک انتہائی ذمہ دار سرکاری افسر کی جانب سے جھوٹا بیان حلفی داخل کر دیا گیا۔ ساہیوال جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بھی اس عدالت عالی وقار کے روبرو تسلیم کیا کہ بالائی احکام کے تحت مجھے کسی سے بھی ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔

(31) یہ ہے کہ وہ طریقہ جس سے حکومت میرے درپے ہے۔ میں آٹھ سال تک مرکزی حکومت کا وزیر اور دوران جنگ میں وزیر خارجہ رہا ہوں۔ میری ملکی خدمات نے دوستوں سے داد و تحسین اور مخالفوں سے رشک و حسد پایا۔ ممتاز مفکر برٹرینڈرسل نے جن کی ساری زندگی جبر و استبداد کے خلاف ایک شاندار جدوجہد کے طور پر گزری ہے۔ 3 ستمبر 1966ء کے ہفت روزہ "اکانومسٹ" کے نام "ایوب کا حریف" کے زیر عنوان اپنے خط میں کہا تھا:

> "جناب والا! آپ نے (20 اگست 1966ء کو) مسٹر بھٹو پر جو حملہ کیا ہے اسے اہل مغرب کی نظر میں مسٹر بھٹو کے گناہ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو وہ ایک ایسی اہم شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں جس نے پاکستان کو افریشیائی دنیا کے سیاق و سباق میں رکھتے ہوئے اور اسے ان ملکوں کی صف سے جدا کر کے جن پر امریکہ کا غلبہ ہے حریت نواز پالیسی کا نقشہ بنایا۔
>
> "ان قومی قائدوں کا مقدر جو اپنے عوام کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہیں روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے سوا اس کے وہ نت نئے دباؤ کا سامنا کرنے کے وسائل رکھتے ہوں جو ان پر ڈالا جاتا ہے اور جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ "اکانومسٹ" جیسے جرائد ان پر ناخوشگوار لیبل لگاتے ہیں۔ مسٹر بھٹو اپنے ملک کے قومی قائد ہیں جو جناح کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور تالیوں کا وہ لامتناہی سلسلہ جس سے ان کی پذیرائی کی جاتی ہے صرف لندن تک محدود نہیں۔ ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو ان کی کامیابی کے لئے دعاگو ہیں اور جو اس کردار کے مداح ہیں جو افریقہ ایشیا اور

لاطینی امریکہ کے عوام کی معاشرتی امنگوں کی ہمنوائی میں وہ اپنے ملک کی حریت نواز پالیسی تشکیل کرنے میں ادا کر رہے ہیں۔"

صدر احمد سوئیکارنو، جنہوں نے پاکستان کو بے مثال امداد دی تھی، جب 20 اپریل 1966ء کو جکارتا کے مردیکا محل میں مجھے ری پبلک آف انڈونیشیا کے "آرڈر" سے نواز رہے تھے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ بات ان کے لئے باعثِ فخر ہے کہ انڈونیشیا اور پاکستان کی دوستی کے ضمن میں میری عظیم خدمات کے طور پر مجھے "آرڈر" عطا کر رہے ہیں۔ انہوں نے میرے متعلق کہا تھا کہ میں "آزادی کا عظیم مجاہد اور افریشیائی اقوام کے استحکام کا رکن" ہوں۔

سوویت روس اس وقت تک پاکستان کا مخالف رہا جب تک میں نے 1960ء میں ماسکو جا کر اس ملک سے ایک اہم معاہدہ انجام نہیں دیا۔ اس عظیم طاقت کے صدر میکویان نے ایک محفل میں پاکستانی اور روسی وفد کی موجودگی میں پاکستان کے لئے میری خدمات کو سراہا۔ انہوں نے صدر ایوب خان سے کہا........ "مسٹر بھٹو غیر معمولی طور پر سمجھدار انسان ہیں اور میری "جواں سالی اور قوت کا" صدر ایوب خان اور پاکستان کے لئے طاقت کا زبردست سرچشمہ ہیں"۔ صدر میکویان نے صدر ایوب خان کو مبارکباد دی کہ میرے "درجہ ذہانت" کا وزیر ان کی کابینہ میں شامل ہے۔

چونتیس سال کی عمر میں اگست 64ء میں مجھے ملک کا اعلیٰ اعزاز "ہلال پاکستان" عطا کیا گیا۔ یہ ایوارڈ دیتے ہوئے صدر ایوب خان نے صدر کے مہمان خانے میں جمع ہونے والے مسلم لیگی قائدین کی موجودگی میں ملک کے نوجوانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ میرے نقش قدم پر چلیں۔

(32) میں بے جا غرور سے نہیں، محض برسبیل تذکرہ عرض کرتا ہوں کہ پاکستان میں میرے مقام کے بارے میں عالمی قائدین اور صدر ایوب خان کس قدر مغالطے میں رہے ہیں۔ حکومت کی صوابدید ہے کہ میری جگہ اس جیل کی کوٹھڑی ہے جس کے بارے میں خود حکومت مغربی پاکستان کے 13 دسمبر 1968ء کے پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ وہ بدنام اور عادی مجرموں کے لئے مخصوص ہے۔ حکومت کی جچی تلی رائے میں میری جگہ مغربی پاکستان کی اس بدترین جیل میں ہے تاکہ میں وہاں قید تنہائی میں سڑتا رہوں اور مجھے وہ عام سہولتیں بھی میسر نہ ہوں جو قانوناً میرا حق ہیں۔

(33) مائی لارڈز دورِ عیسوی سے 399 سال قبل ایتھنز کے حکمرانوں نے بھی ایک فلسفی کو اس پاداش میں سزائے موت سنائی تھی کہ اس نے شہر کے نوجوانوں کو گمراہ کیا ہے۔ سقراط کو پینے کے لئے زہر کا پیالہ دیا گیا تھا۔

شاید اسی لئے ہوم سیکرٹری نے گورنر کے نام اپنے ایک نوٹ میں کہا ہے کہ:

"مسٹر زیڈ۔ اے بھٹو نے جنگ کی راہ اختیار کر لی ہے۔ موجودہ حکومت کے خلاف اپنے منتقمانہ عزائم کی تکمیل کے لئے وہ سرعام

www.bhutto.org

تشدد اور خون خرابے کی باتیں کرتے رہتے ہیں"

(34) یہ بیان کس قدر ستم ظریفانہ ہے! جب سے میں حکومت سے رخصت ہوا ہوں میں زندگی اور موت کے ناٹک میں الجھا رہا ہوں۔ میرے خاندان کو اچھوتوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑی ہے میرا حقہ پانی اتنی شدت سے بند کیا گیا ہے کہ میرے کمسن بچوں کے علاج معالجے کے لئے بلوائے جانے والے ڈاکٹروں کی بھی پوچھ گچھ ہوتی رہی ہے۔ اگر غیر ملکی سفارتی نمائندے مجھ سے ملتے ہیں تو ان کی حکومتوں کو احتجاجی مراسلے بھیجے جاتے ہیں۔ میرا قانونی دفاع کرنے والے وکلاء کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ دوستوں کو مجھ سے دور رہنے کی تنبیہ کی گئی ہے اور ملازموں کو خوف دلا کر مخبر بننے کے لئے کہا گیا ہے۔ خفیہ پولیس قدم قدم پر ہمارا پیچھا کرتی ہے۔ حکام کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ ہمارے لئے مشکلات پیدا کریں اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ عام شہریوں کی حیثیت سے ہمیں جو ضروریات درپیش ہوں ان پر بھی کان نہ دھریں۔ بدترین قسم کے کارندوں کو ہماری تحصیل میں متعین کیا گیا ہے تاکہ ہمارے لئے آئے دن خوف وہراس پیدا کرتے رہیں اور انتظامیہ کے دروازے ہیں کہ ہمارے اوپر بند ہیں۔

میں مملکت کے جن ممتاز عہدوں پر فائز رہا ان کے بغیر بھی اور مجھے جو اعزازات عطا کئے گئے تھے ان کے پیش نظر بھی میرا حق تھا کہ مجھے عزت اور لحاظ کا مستحق سمجھا جاتا۔ نسل در نسل میرے خاندان نے سندھ کی، غیر منقسم ہندوستان کی اور تقسیم کے بعد پاکستان کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ یہ ایک تاریخی امر ہے اور ان جناتی کہانیوں کا کوئی باب نہیں جو ضلعی گزیٹروں کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔

میں جنگ کی راہ کیونکر اختیار کر سکتا ہوں جب کہ جھوٹے فوجداری مقدمات گھڑے جا رہے ہوں اور حکومت مجھے اہلکاروں کے ذریعے تھانوں میں بلوا بلوا کر بے عزت کرا رہی ہو۔ یہ ہمیں صدر ایوب کے بقول "دوسروں کے جذبات واحساسات کا احترام کرنے" کا سبق سکھانے کا کوئی طریقہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ستمبر کا سارا مہینہ پولیس نے لغوی طور پر میرا ناک میں دم کر رکھا۔ چنانچہ ستمبر کا مہینہ حیدر آباد میں میری تقریر کے علاوہ دیگر وجوہ کی بناء پر بھی اہم ہے۔

(35) جب شدید ستم کشی اور حوصلہ شکن اہانتوں کے سائے میں 21 ستمبر کو میں نے حیدر آباد میں تقریر کی تو میرے اس اعلان اور فیصلے نے حکومت کو بوکھلا کر رکھ دیا کہ میں مناسب موقع پر لاہور میں تاشقند کے بارے میں زبان کھولوں گا اور انتخابات میں حصہ لوں گا۔ میرے خطاب کے تھوڑی ہی دیر بعد، غیر متوقع طور پر، مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر اعوان نے ایک مشترک دوست کے ذریعے مجھ سے رابطہ قائم کیا جس نے مجھے بتایا کہ مسٹر اعوان مجھ سے فوری طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ جب ہم اسی شام سندھ کلب میں ملے تو مسٹر اعوان نے حتمی طور پر جانچنا چاہا کہ میں نے حیدر آباد میں جو اعلان کیا ہے کیا وہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ چنانچہ نہ تو پشاور ریجن کا میرا دورہ اور نہ ہی میرے وہ بیانات میری گرفتاری کی اصل وجوہ ہیں جنہیں توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے جدا کر کے پیش کیا گیا ہے۔ حکومت نے مجھے انتخابات کے آغاز

www.bhutto.org

میں اس وقت جیل میں ڈالا ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے اپنے سیاسی فرائض کی ادائیگی میں نرم پڑنے پر مجبور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں یہ ضروری تھا کہ مجھے منظر سے الگ کر دیا جائے کیونکہ میں نے حیدر آباد میں انتخابات کے بارے میں اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا۔ جب ایک دفعہ یہ اندازہ کر لیا گیا تو میرے خلاف کارروائی کرنے کے کسی مناسب موقع کی تلاش شروع ہوئی۔ موجودہ کشیدگی، جسے حکومت نے دیدہ دانستہ ہوا دی تھی، حکومت کے آڑے وقت میں کام آئی اور مثالی بہانہ ثابت ہوئی۔

(36) میرے خلاف ایک جھوٹا فوجداری مقدمہ کھڑا کرنے کی بے ضمیرانہ کوششیں اور سرکاری حکام کو وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کرنا اسی مقصد کے تحت آتے ہیں۔ مطلوب یہی تھا کہ مجھے ایک فوجداری مقدمے میں سزا دلوا کر انتخابات میں حصہ لینے کے ضمن میں نااہل قرار دے دیا جائے۔ جب یہ نظر آیا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے تو اس منصوبے کی دھار تیز ہو گئی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اس نوعیت کے کسی مقدمے کے محض دائر کر دینے سے میری سیاسی سرگرمیوں میں موثر طور پر مداخلت نہ کی جا سکے گی جنہیں قریب آتے ہوئے صدارتی انتخابات کے پیش نظر کچل دینے کی ضرورت تھی، چنانچہ مجھے سیاسی منظر سے الگ کرنے کے لئے ایک اور ہتھکنڈا ایجاد کرنا لازم تھا۔ جب حکومت یوں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو موجودہ بحران نے اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں بلکہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کو زیر استعمال لا کر مجھے پابند سلاسل کرنے کی ایک آڑ مہیا کر دی۔

(37) اگر حکومت کو میری حیدر آباد کی تقریر پر اعتراض تھا نہ کہ انتخابات کے بارے میں میرے اعلان پر تو اسے مستقل بالذات قانون کے تحت مجھے 21 ستمبر کو یا اس کے لگ بھگ حیدر آباد میں گرفتار کرنا چاہئے تھا نہ کہ 13 نومبر کو لاہور میں۔ ایسا اس لئے نہ کیا گیا کہ انتخابات سے متعلقہ آراء کو چھوڑ کر میری آراء میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے حکومت کو پریشانی لاحق ہوتی اور میرے اعلان کردہ عزائم کو ناکام کرنے کے لئے اسے کچھ اور وقت درکار تھا۔ ورنہ جو شخص "خون خرابے" انقلاب اور حکومت کا بزور تختہ الٹنے کا پرچار" کرتا ہوا ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنے سیاسی مشن کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جایا کرتی۔ میں نے پشاور ریجن کا دورہ بھی مکمل کر لیا اور اس سے قبل مجھے پکڑا نہ گیا کیونکہ میری گرفتاری کی وجوہ کا تعلق محض انتخابات کے ضمن میں میرے اعلان سے تھا نہ کہ کسی اور بات سے جو میں نے حیدر آباد میں یا سرحد کے دورے کے دوران کہی ہو۔

انقلاب کی اس دعوت کے توڑ میں، جس کے بارے میں فرض کیا جا رہا ہے کہ میں نے حیدر آباد میں 21 ستمبر کو دی تھی، حکومت نے لے دے کر جو اقدام کیا وہ یہ تھا کہ مرکزی ہوم سیکرٹری مسٹر ایوب اعوان کو کراچی بھیجا تا کہ مجھ سے انتخابات کے بارے میں میرے فیصلے کی ذاتی طور پر تصدیق کریں نہ کہ اس دعوت کی جو میں نے خونی انقلاب برپا کرنے کے ضمن میں دی تھی۔ گورنر موسیٰ کو اس لئے حیدر آباد نہیں بھیجا گیا تھا کہ میں نے حیدر آباد کی گلیوں میں انقلاب کے جو مورچے گاڑے تھے انہیں ملاحظہ فرمائیں بلکہ مجھ

www.bhutto.org

سے سیاسی فکر لینے کے لئے وہ دس اکتوبر کو دربار ہال میں ایک تقریر کرنے گئے تھے۔ جیسا کہ دستور ہے مسٹر موسیٰ کی رام کہانی کو وزراء کے باجماعت بیانوں نے اور مقبوضہ پریس نے مزید ہوا دی۔ جب یہ پتا چل گیا کہ میری تقریر قانون کی زد میں نہیں آتی تو حکومت نے اس سے سیاسی سطح پر نبٹنے کی ٹھانی اور اس نے کوئی ایک ماہ تک یہ روش اختیار کئے رکھی۔ نہ صرف یہ کہ حکومت نے مجھے حیدر آباد میں تقریر کرنے کے فوراً بعد گرفتار نہ کیا بلکہ اس نے میری تقریر پر سیاسی بحث مباحثے کی حوصلہ افزائی کی۔ میرے "حکومت کے خلاف کھلی بغاوت کے پرچار" کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے گرفتار کرنا بے معنی بات ہے سوائے اس کے کہ میری گرفتاری کی وجہ کچھ اور ہو مجھے حالیہ گڑبڑ کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ' جیسا کہ میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ' موجودہ بحران میرا پیدا کردہ نہیں۔ حکومت خود اس کی ذمہ دار ہے۔ جو گڑبڑ یہاں واقع ہوئی اب وہ مشرقی پاکستان تک پھیل چکی ہے۔ پاکستان میں اچانک جو دھماکہ ہوا ہے اس کی بنا یہ ہے کہ حکومت کے خلاف لوگوں کی دبی ہوئی نفرت کا لاوا پھوٹ گیا ہے۔ مجھے اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا اور یہی وجہ ہے کہ اس ضمن میں میری گرفتاری کی جو وجوہ دی گئی ہیں ان کا کوئی جواز نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی غیر جانبدارانہ محاسبے کی تاب نہیں لا سکتی۔ میرے حیدر آباد جانے اور بعد میں سرحد کے علاقے کا دورہ کرنے کے درمیان کوئی پوشیدہ تعلق نہیں۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ یہ واقعات کسی منصوبے کا جز تھے۔ کوئی منصوبہ تھا ہی نہیں۔ حیدر آباد اور پشاور ریجن میں میری سرگرمیوں کے درمیان کوئی سازشی رشتہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ملک میں گڑبڑ پیدا کرنے کا بھی کوئی منصوبہ نہیں۔ حکومت نے موجودہ صورت حال سے میری گرفتاری کا بہانہ ڈھونڈنے میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے تاکہ صدارتی انتخابات کے بائیکاٹ سے متعلقہ واقعات کے دھارے کو متاثر کر سکے۔

(38) حکومت کو علم تھا کہ مشرقی پاکستان سے واپسی پر میرا ارادہ تھا کہ اپوزیشن پارٹیوں کے اتحاد اور انتخابات کے بارے میں کچھ اہم اعلانات کروں۔ یہ بھی علم تھا کہ میں رمضان سے کچھ روز پہلے مشرقی پاکستان روانہ ہو جاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت نے موجودہ بحران کو ابھارا اور پیشتر اس کے کہ میں مشرقی پاکستان کا اہم دورہ زیر عمل لاتا جس پر کہ ملک کے لئے دور رس سیاسی اہمیت کے حامل بعض نازک فیصلوں کا دارومدار تھا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بات نظر بندی کے حکم سے بھی واضح ہو جاتی ہے جس کے آخر میں میری نظر بندی کی دیگر وجوہ کے علاوہ ' یہ بھی کہا گیا ہے کہ میرے خلاف اس لئے کارروائی کی جارہی ہے کہ مجھے پاکستان کے دوسرے حصوں کا دورہ کرنے سے روک دیا جائے۔

(39) یہ حکومت "انقلاب" کے لفظ سے اتنی کیوں بدکتی ہے جب کہ اس کا سارا ڈھانچہ طاقت پر کھڑا ہے۔ بہت سے موقعوں پر اپوزیشن کو خون خرابے کی دھمکی دی گئی ہے۔ حال میں راولپنڈی میں اسلام آباد مسلم لیگ کا نائب صدر ایک صحافی کو پولیس کی موجودگی میں پستول کی گولیوں سے زخمی کرنے کے بعد پاکستان کے دارالحکومت کی گلیوں میں بے خوفی سے دندناتا پھرا ہے۔ راولپنڈی میں ایک طالب علم کو ٹھگوں نے زدوکوب کیا ہے۔ ایک کتبہ جس پر کلمہ لکھا تھا یوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا گویا

www.bhutto.org

اس ملک میں جن سنگھ کا راج ہو۔ صدر صاحب نے بارہا خون خرابے کی دھمکی دی ہے۔ گزشتہ صدارتی انتخابات کے دوران، رائے شماری کے موقع پر، فوج کو گلیوں میں بلا لیا گیا تھا۔ اپریل 1966ء میں مسلم لیگیوں سے ڈھاکے میں خطاب کرتے ہوئے صدر صاحب نے الم نشرح کر دیا تھا کہ اپنے مخالفین سے نپٹنے کے لئے وہ "ہتھیاروں کی زبان" استعمال کریں گے۔ 30 ستمبر 1968ء کو صدر صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام حصوں سے لاہور میں جمع ہونے والے مسلم لیگیوں سے خطاب کرتے ہوئے کچھ انکشاف انگیز آراء کا اظہار کیا۔ سیاسی صورت حال کا احاطہ کرتے ہوئے صدر صاحب نے اپنے حامیوں کو بتایا:

> "جو لوگ اس نظام کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں انھیں علم ہونا چاہئے کہ اگر اسے ہٹایا گیا تو ملک میں خانہ جنگی برپا ہو جائے گی"

کسی سربراہ مملکت نے اس سے واضح تر اعلان جنگ نہ کیا ہو گا۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ مجمع کو اکسایا جائے کہ اسلام آباد میں اپنی پارٹی کے نائب صدر کے نقش قدم پر چلیں۔ خانہ جنگی کی یہ دھمکی خلاء میں نہیں دی گئی۔ اس کی جڑیں حکومت کے نفسی بحران اور اس کے ان کارناموں میں ہیں جو دس سال کے عرصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ معتمدوں کو مسلح کیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے تحت مزید تیاریاں بھی کی جا رہی ہیں۔ کیا حکومت کے عہد زریں کا ثمر ایک المناک برادر کشانہ جنگ سے رقم کیا جائے گا؟ کیا "دور ترقی" کی کڑوی کسیلی فصل کا انجام اور اسپین یا نائیجیریا کی شکل میں ہو گا؟ کیا پاکستان کا یہی مقصد تھا کہ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو اور بیسویں صدی میں کربلا کو دہرایا جائے۔

اگر ایسا نہیں تو حکومت ببانگ دہل اعلانِ جنگ کیوں کر رہی ہے خانہ جنگی کسی قوم کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ تیس سال ہو گئے ہیں اور اسپین ابھی تک خانہ جنگی کے زخم چاٹ رہا ہے اور اب نائیجیریا ایک ہولناک خواب سے گزر رہا ہے۔ جب انقلاب آتا ہے تو پوری قوم ظلم و ستم کے خلاف متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ خانہ جنگی میں لوگ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں اور اس کا دائم عذاب رہتا ہے۔ صدر صاحب تو کھلی کھلی طاقت استعمال کر سکتے اور اس کی دھمکی دے سکتے ہیں لیکن دوسروں کو اس کی بھی اجازت نہیں کہ لوگوں کو اس کے بارے میں خبردار ہی کر سکیں۔

ایک طرف تو حکومت خانہ جنگی کی دھمکی دیتی ہے اور دوسری طرف وہ لوگوں کو "اتحاد، ایمان اور تنظیم" کی یاد دلاتی ہے۔ موجودہ بحران نے حکومت کو قائداعظمؒ کی یاد کا بہت شعور بخش دیا ہے۔ صدر صاحب نے 25 دسمبر 1968ء کو قوم کے نام ایک اور پیغام میں کہا ہے:

> "قائداعظمؒ کا نعرہ............ اتحاد، ایمان اور تنظیم............ لازوال معنویت کا حامل ہے۔ جو لوگ سیاست سے سروکار رکھتے ہیں ان پر لازم ہے کہ اپنے فکر و عمل کو اس نعرے کا تابع بنائیں"

www.bhutto.org

معمار پاکستان کے فلسفے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ہمیں یہ پتا چلے کہ صدر ایوب خاں نے سیاست دانوں کو آخر کس سیاق و سباق میں "اتحاد' ایمان اور تنظیم" کا پرچار کیا ہے؟ موجودہ تحریک میں شامل کوئی شخص بھی اسلام کے خلاف نہیں۔ دین کے معاملے میں تو کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ البتہ عوام اور حکومت کے درمیان اتحاد اور تنظیم کے معنی میں سنگین اختلاف ہے۔ ایک اتحاد تو وہ ہے جو آزاد لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے متحد ہوتے ہیں۔ ایک ان لوگوں کا اتحاد ہے جو آزادی اور آدرش کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ عوام بیرونی جارحیت اور اندرونی مطلق العنانی کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں' لیکن ایک اور طرح کا اتحاد بھی ہے۔ روم کے قدیم باشندے اسے "پیکس رومانا" کہتے تھے۔ انگریز اپنے "راج" کے استحکام کے لئے اس کے جویا رہتے تھے۔ یہ وہ اتحاد ہے جو بیرونی استعمار کی جانب سے یا اندرونی آمریت کے ذریعے سے تھوپا جاتا ہے۔ عوام اپنی رضا سے آزادی کے لئے متحد ہوا کرتے ہیں' غلامی کے لئے نہیں۔ یہ کوئی عجوبہ نہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں کی غلامی اور کانگریس کے استحصال کے خلاف شاندار اتحاد کا مظاہرہ کیا۔ وہ پاکستان کے لئے یا دوسرے لفظوں میں آزادی اور مساوات کے لئے متحد ہوئے تھے۔ برصغیر کے ہر حصے کے مسلمان مشترکہ جدوجہد میں شریک ہوئے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہندو بھارت کی مسلمان آبادی کو پاکستان کا جزو بننا تھا بلکہ اس لئے کہ نتائج کے علی الرغم اس جدوجہد کا مطلب تھا آزادی۔ یہ تھا اتحاد کا وہ نظریہ جس کا پرچار معمار پاکستان نے برصغیر کے مسلمانوں کو کیا تھا۔ کیا صدر صاحب کی اتحاد کی اپیل کا خطاب کسی آدرش کے لئے جدوجہد کرنے والے آزاد عوام سے ہے؟ کیا یہ جموں اور کشمیر کے حق خود ارادیت کے لئے ہے یا بھارت سے مشترکہ دفاع کے لئے؟ اتحاد کا مطالبہ فرخا بیراج کے خلاف بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ بھارت کے اس دعوے کے باوجود کہ دریائے گنگا اس کی ملکیت ہے حکومت بھارت کے ساتھ مذاکرات کر رہی ہے۔ کیا عوام سے بالغ رائے دہی اور بنیادی حقوق کے خلاف متحد ہونے کے لئے کہا جا رہا ہے یا ہنگامی قوانین کی حمایت میں یا اس لئے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے کی محنت سے بیس خاندانوں کی اقتصادی اقلیم کو فروغ دیں۔ یہی نوعیت اس سوال کی ہے کہ کیا تنظیم کی اپیل کا خطاب بھی آزاد عوام سے ہے؟ آمریت اپنی تنظیم آپ ہوتی ہے۔ دفعہ 144 ڈیفنس آف پاکستان رولز سیکیورٹی قوانین اور قانون فوجداری کا ٹرمیمی ایکٹ بھی تنظیم کی ہمہ گیر بنیاد فراہم کر دیتے ہیں۔ کیا تنظیم کی اپیل کا مطلب ہے قبرستان کا سا نظم و ضبط' حقوق سے محرومی پر خاموشی سے سر تسلیم خم کرنا' حکومت کے شخصی فرمان کی غلامانہ اطاعت۔

جو اتحاد' ایمان اور تنظیم محمد علی جناح نے پیش کئے تھے وہ عوام کی خوشدلانہ رضامندی کے بل پر ایک آزاد معاشرے کے ستونوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ معمار پاکستان نے مسلمانان ہند سے جس پاکستان کا وعدہ کیا تھا اس کے آئین اور حکومت کے لئے لازم تھا کہ انہیں عوام کی تائید حاصل ہو۔ کیا سیاست دانوں کو جمہوریت کے تقاضے کے طور پر ہماری آزادی کے مشعل بردار کے پیغام پر توجہ دینے کا مشورہ دیا جا

رہا ہے یا اتحاد اور تنظیم کے حصول کے لئے کسی بردہ فروش کے چابک سے کام لیا جائے گا؟

مائی لارڈز! اگر آپ بے لگام جاہ طلبی، ہوس اقتدار اور جلب زر کے پردے کے پیچھے جھانکیں تو یہ بات کھل جائے گی کہ میری گرفتاری کے مریضانہ محرکات نے دراصل اس خوف سے جنم لیا ہے جو اس حکومت کو عوام سے آتا ہے۔ اب جہاں پاکستانی عوام میری گرفتاری پر نالاں ہیں اور اس ضمن میں وہ اپنے احساسات کا صاف صاف اظہار بھی کر چکے ہیں وہاں یہ حکومت اور پاکستان کے دشمن باہم خوش ہو رہے ہیں کہ مجھے سیاسی منظر سے ہٹا دیا گیا ہے۔

(40) جگر خراش تجربات کے باوجود میں نے کبھی جنگ کی راہ اختیار نہیں کی۔ میں نے ابھی تک جنگ بندی یا اعلان تاشقند کی داستان بھی نہیں چھیڑی۔ میری جدوجہد کا منتہیٰ قومی احیاء ہے۔ میں قائداعظم اور اقبال کا جھنڈا سربلند رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا پر ثابت کر دیا جائے کہ بارہ کروڑ جیالے عوام کی یہ اسلامی مملکت اوج کمال کو پہنچ سکتی ہے اور جس آزادی اور مساوات سے اسلام نے تہذیب کا چراغ روشن کیا اس سے بہرہ ور انسانوں کے آدرش کو لباس مراد پہنا سکتی ہے۔ میری آرزو ہے کہ عدل و انصاف کا وہی نور ایک مرتبہ پھر دل افروز ثقافتوں کے اجتماع کو منور کر دے۔ میری آرزو ہے کہ ہمارے عوام اخوت کے جذبے سے سرشار کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں اور مساوات کب آب و تاب میں یکساں حصہ دار ہوں۔

وقت آئے گا کہ قسمت کا پہیہ گردش کرے گا اور اس گردش کے انقلاب سے ایک بہتر مستقبل طلوع ہو گا۔

پاکستان کو جو امور درپیش ہیں وہ زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ ہر دور میں ایک موقع آتا ہے کہ انہیں سنوارا یا بگاڑا جا سکتا ہے۔ یہ امور دکھ بھرے لمحات کے آفاق میں ڈوب جاتے اور مستقبل کی ایک حسین و جمیل صورت ابھار جاتے ہیں۔ ایک ایسا مستقبل جس میں پاکستان ملت اسلامیہ کا ناقابل تسخیر قلعہ اور دنیا بھر کے مظلوموں کا خدمت گار بن جائے گا اور جو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک کشمیر میں جارحیت کے آخری نشان کو نہیں مٹا دیتا اور بیت المقدس کو آزاد نہیں کرا لیتا۔

(41) مذکورہ بالا بیانات میرے اپنے یقین، علم اور یادداشت پر کہ جس کے بارے میں مجھے حتمی یقین ہے کہ سچ اور صحیح ہیں اور اس معلومات، مواد اور مشورے پر مبنی ہیں جو مجھے ان لوگوں سے ملا جنہیں عدالت عالی وقار نے اس حلفی بیان کی تیاری میں میری مدد کرنے کی اجازت دی تھی اور میں حتمی طور پر یقین رکھتا ہوں کہ مذکورہ معلومات، مواد اور مشورہ جو اس صورت میں مجھے دیا گیا وہ سچ اور صحیح ہے۔

(42) میں اس حلفی بیان کے ساتھ اس کی تائید میں پیش ہونے والی تمام دستاویزوں،

www.bhutto.org

عدالتی فیصلوں، احکامات، درخواستوں، ریکارڈوں اور اخباری رودادوں کی الگ فہرست کا ضمیمہ شامل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ترجمہ: حنیف رامے

جنوری 1969ء

دستخط ذوالفقار علی
بھٹو (حلیف)

www.bhutto.org

رٹ پٹیشن واپس لینے کی وجوہات

ماضی تاریخ کا حصہ ہے۔ جن واقعات نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا انہیں جنم دینے کا سہرا خواہ کوئی اپنے سر باندھ لے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ سیاسی حالت کی سنگینی دوسری تمام توجہات پر فوقیت رکھتی ہے۔

گزشتہ تین ماہ سے پاکستان ایک ایسے بحران میں محصور ہے کہ اس کی مثال اس کی تاریخ میں نایاب ہے۔ دس سال سے زیادہ عرصے تک اپنے حقوق سے محروم رہنے کے بعد عوام صدر ایوب خاں کی حکومت کے خلاف بے خوف و خطر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس عظیم الشان ابھار کو تحریک کا نام دینا صحیح نہ ہو گا کیونکہ پاکستان میں جو کچھ زیر عمل ہے وہ تحریک نہیں انقلاب ہے۔ عوام کے دکھ ناقابل برداشت ہو چکے ہیں اور ان کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا ہے۔ اب حالات کی باگ کو پیچھے کی جانب نہیں موڑا جا سکتا۔ یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ عوام موجودہ نظام کو بدلنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں نہ کہ چند مراعات کے حصول کے لئے۔ ان کے ناقابل انتقال حقوق پر کوئی سمجھوتے بازی نہیں ہو سکتی۔ عوام نے اپنے مسروقہ حقوق کی بحالی کے لئے خون بہایا ہے کیونکہ انہیں یہ حقوق عزیز تھے وہ ان حقوق کے عوض حکومت کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی خیرات یا عنایت کا معاملہ نہیں۔ مراعات ایک ایسا شرمناک لفظ ہے جو محلاتی سازشوں سے مخصوص ہے اور اس سے سمجھوتے بازی کی بُو آتی ہے اور سمجھوتے بازی کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ہتھیار رکھ دیے جائیں اور مشروط اطاعت قبول کر لی جائے۔

عوام ایک خوفناک اضطراب سے گزرے ہیں۔ نوجوانوں نے جانیں قربان کی ہیں اور جیل خانے

www.bhutto.org

سرگرم عمل عوام اور ان کے رہنماؤں سے اٹے ہوئے ہیں سرزمین وطن پر خوف وہراس کے پہرے ہیں۔ عوام نے جس کثرت سے قربانیاں دی ہیں وہ اس بات کی مہلت نہیں دیتی کہ اپنے حقوق کے بارے میں وہ دوبارہ دھوکا کھائیں۔ پاکستان کے عوام تبدیلی چاہتے ہیں نہ کہ مذاکراتی سمجھوتے بازی کے پردے میں حکومت کی برقراری۔ عوام نے حکومت کو رد کر دیا ہے۔ وہ بدعنوانی ' کنبہ پروری اور دھوکا دہی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ وہ نوکر شاہی کے تجاوزات ' پولیس کے استبداد اور لوٹ کھسوٹ کے اس مریضانہ نظام کی اونچ نیچ کو مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں جو عوام کے دکھوں پر پلتا رہا ہے۔

مستقبل کے دامن میں خیر کی امید بھی ہے اور بدی کا گمان بھی۔ اسوقت میزان کے پلڑوں میں قوم کا مقدر تل رہا ہے اور تمام دوسرے امور پس منظر میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ بحران مرکزی اہمیت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ لاینفک اتحاد کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ کوئی غلط فیصلہ ' کوئی متزلزل عزم ' صوابدید کی کوئی لغزش دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کی کوئی ترغیب تباہی کی جانب لے جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس دھمکیوں کے مقابل جرأت ' عوام کی جدوجہد کو معراج تک پہنچانے کا عزم صمیم اور جبر کے خلاف بے خوف و خطر یلغار پاکستان کو اس نئے مسرت دور سے ہمکنار کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جس کا اقبال نے خواب دیکھا اور قائداعظم نے یقین دلایا تھا۔

اگلا قدم عہد آفرین ہے۔ واضح مقصد کے بغیر یہ قدم صحیح رخ میں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جب قائدین کو جیل کی دیواروں کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے ' جب رسہ کشی کے ہاتھوں ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے ' جب خلفشار کا دور دورہ ہو تو حقیقت حال کے لئے کھل کر سامنے آنے کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی۔ وہ ان ہنگامی قوانین سے عیاں نہیں ہو سکتی جو قوم کے سر پر ایک ہولناک بادل کی سیاہ چادر کی طرح تنے ہوئے ہیں کہ یہ وہ قوانین ہیں جنہوں نے غلامی کی زنجیروں سے عوام کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔ یہ استبدادی ذرائع حکمرانوں کے ہاتھوں کی ظالمانہ طاقت کی مہیب یاددہانی کراتے ہیں۔ ایسے مصیبت ناک حالات میں کسی قومی حل کی جانب قدم بڑھانا ممکن ہی نہیں۔ جو سمجھوتا ایسے حالات سے جنم لے گا وہ ایک فریب ہو گا عوام کی امنگوں سے بے دردانہ غداری ہو گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور رائے عامہ کے دیگر اہم عناصر ' جن میں مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی بھی شامل ہے ' جمہوری مجلس عمل کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت کا سامنا کرنے کے لئے تمام کی تمام اپوزیشن متحد نہیں۔ حکومت مدافعت پر اتر آئی ہے اور عوام کے غیض و غضب نے اسے کونے میں لگا دیا ہے اور وہ اپنی بحالی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ اس نے اپوزیشن میں تفریق پیدا کرنے کی ایک خام کوشش کی ہے۔

حکومت کے نزدیک فوری اہمیت اس مقصد کو حاصل ہے کہ عوامی تحریک کا زور توڑ دیا جائے۔ حکومت کسی ایسے ہتھکنڈے کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے جس سے لوگوں کے جذب و شوق کو کند کیا جا سکے ' ان کے جوش و خروش کو سرد کیا جا سکے اور اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ تحریک کو تباہ کر دیا جائے۔

www.bhutto.org

جواں سال جانوں کی قربانی کے باوجود ان کی ولولہ انگیز جدوجہد کے باوجود طالب علموں کے مطالبات پورے نہیں کیئے گئے۔ اس کے برعکس انہیں ابھی تک زدوکوب کیا بلکہ پولیس کی جیپوں کے نیچے کچلا جا رہا ہے۔ مخصوص مراعات ان کا منہ چڑانے کے مترادف ہیں۔ طالب علموں کے مطالبات کو صدق دل سے پورا کرنا وقت کا شدید تقاضا ہے۔ جو نوجوان شہید ہوئے ہیں ان کے کنبوں کو خون بہا ادا کرنا لازمی ہے۔ زخمی طلبا کو بھی مناسب ہرجانہ ملنا چاہئے۔ یہ بات زخمی صحافیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ان لوگوں نے آزادی اور انسانی وقار کے لئے جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ وہ قوم کے خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ طلبا کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں نے بھی حکام کے غیر ضروری متشددانہ اقدامات کے دوران جانیں دی ہیں اور بہت سے زخمی بھی ہوئے ہیں۔ مرحوموں کے کنبوں کو خون بہا اور زخمیوں کو ہرجانہ ملنا چاہئے۔ صورت احوال ایسی وحشت ناک ہو گئی ہے کہ کلمے کی بے ادبی کی گئی ہے اور ابھی تک اس کے مرتکب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ علماء کو زدوکوب کیا گیا ہے اور ان پر لاٹھیاں برسائی گئی ہیں۔ پولیس نے ہماری مسجدوں کو بے حرمت کیا ہے۔ یہ دلدوز حالات کسی مثبت اقدام کے متقاضی ہیں۔ بے شمار لوگ ہوائی الزامات کی بناء پر' یا الزامات کے بغیر ہی' جیلوں میں پڑے ہیں۔ انہیں فوری طور پر رہا کر دینا لازم ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر مجیب الرحمٰن' خان عبدالولی خان اور سردار اکبر بگٹی جیسے قومی رہنماؤں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں بلا تاخیر رہا کر دینا لازم ہے۔ یہ وہ چند وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں نے زیر نظر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جب سے اس عدالت عالیہ میں میری رٹ پٹیشن دائر ہوئی ہے صورتحال میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اور پچھلے چند دنوں میں یہ تبدیلی اور بھی گہری معنویت اختیار کر گئی ہے۔ پاکستانی عوام کی طرف سے مجھ پر جو فرض عائد ہوتا ہے میں اس سے دستکش نہیں ہو سکتا۔ مجھ پر لازم آتا ہے کہ سر پر منڈلاتی ہوئی تباہی کو روکنے کے لئے جو کچھ میرے بس میں ہو کر گزروں۔ اپوزیشن کو انتشار کا شکار نہیں ہونا' ڈراوے میں نہیں آنا' جھانسے میں آ کر طبقات میں نہیں بٹنا۔ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے سائے میں اسے کانفرنس ٹیبل پر لے جایا جائے۔ خواہ کچھ ہو جائے عوام کے حقوق کی فوقیت لازم ہے اور ان کی جدوجہد کو فتح مبین کی معراج نصیب ہونی چاہئے۔ اس آدرش کے لئے میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں' میں ان لوگوں کی صف میں شامل ہونے کو تیار ہوں جنہوں نے عوام کے حقوق کے لئے خون دیا ہے۔

پاکستان کی قیادت کو آنے والے دور کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نام پر میں پاکستان کے عوام کے ساتھ یہ مقدس عہد کرتا ہوں کہ میری پارٹی اپنے محبوب وطن کے عظیم اور شاندار مستقبل کی تعمیر کے لئے لگاتار جدوجہد کرتی رہے گی۔ تاریخ کے ساتھ میرا یہی پیمان ہے۔

اس سلسلے میں حتمی طور پر کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ آج ہمیں جو عظیم مسئلہ درپیش ہے وہ

www.bhutto.org

کیونکر حل ہوگا۔ اس مسئلے کو اس وقت تک تو ہاتھ میں بھی نہیں لیا جا سکتا جب تک وہ ڈیفنس آف پاکستان رولز، جنہوں نے اس مسئلے کو بادلوں کی طرح لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ختم نہیں کر دیئے جاتے۔ آئندہ جو بھی ہو اس سے قبل یہ بنیادی شرط پوری ہونی چاہئے کہ ہنگامی حالات ختم کر دیئے جائیں۔ جب تک یہ بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی کسی بات پر غور نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہ بنیادی شرط پوری نہیں ہوتی دوسرے تمام معاملات ساکت رہیں گے اور آگے نہ بڑھ سکیں گے۔ جب تک ہنگامی حالات ختم نہیں کئے جاتے کسی دوسرے معاملے پر توجہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موجودہ صورت حال کے سیاق و سباق میں 'موجودہ شکل میں جمہوریت کی اس جدوجہد میں حصہ لیتے ہوئے' اس جابرانہ قانون کے خلاف احتجاج کے طور پر جو عوام اور ان کی آزادی کے درمیان دیوار بنا کھڑا ہے جس میں نتیجتاً اپنی رٹ پٹیشن واپس لیتا ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ اگر آج سے ایک ہفتے کے اندر اندر ہنگامی حالات ختم نہ کئے گئے تو میں تا مرگ بھوک ہڑتال کر دوں گا۔ حکومت کو ایک ہفتے کی مہلت دے کر میں اسے یہ معقول موقع فراہم کر رہا ہوں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ ہنگامی حالات کا خاتمہ قومی مفاد کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ کوئی ذاتی مطالبہ نہیں۔ یہ مطالبہ نیک نیتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے پیچھے بہترین مقصد ہے اور اس کی نوعیت الٹی میٹم کی نہیں ہے۔ اس کے برعکس میرا فیصلہ پاکستان کے عوام کے اس مطالبے کا غماز ہے جو ان کے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹا ہے۔

میں آخر میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے نوجوانوں کو سلام کرتا ہوں جو اس عظیم تحریک کے اصل ہیرو ہیں۔ .... پاکستان زندہ باد

ترجمہ......... محمد حنیف رامے

جنوری 1969ء

www.bhutto.org

انتخابات اور تحریک

حکومت کو بدلنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں۔ ایک انتخابات دوسرا انقلاب۔ تیسرے طریقے کا وجود ہی نہیں۔ ماسوائے اچانک موت یا پھر راہ فرار۔

متحدہ حزب اختلاف نے جب 1964ء میں بی ڈی نظام کے تحت انتظامات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تو یقیناً ان تمام امور پر نہایت وزنی پیرائے میں سوچا ہو گا۔ چار پانچ سال پیشتر ایوب حکومت کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ ابھی اس کے ماتھے پر جنگ بندی اور اعلان تاشقند کا داغ بھی نہ لگا تھا۔ نا اہل اہلکاروں کو طاقت کا نشہ بھی ذرا کم تھا۔ آخری دنوں کی نسبت بد عنوانی اور لاقانونیت ناقابل برداشت حد تک نہ تھی۔ طالب علم بھی اس قدر بد دل نہ تھے۔ خارجہ پالیسی بھی کچھ امید افزا تھی۔ لوگ اتنے مایوس نہ تھے۔ اگرتلہ کا سایہ ابھی نمودار نہیں ہوا تھا اور صدر ایوب خان جسمانی طور پر بھی چاق و چوبند تھے۔ اس کے باوجود گزشتہ انتخابات میں آج کے مقابلے میں کم منظم حزب اختلاف نے ایوب حکومت کے لئے سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں اور قریب تھا کہ حکومت درہم برہم ہو جاتی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ واقعہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بدولت ہماری سیاسی بیداری میں نہایت قیمتی اضافہ ہوا۔ ایوب حکومت جیت تو گئی لیکن اس کی کامیابی کھوکھلی تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے انتخابات لڑنے کا اعلان 1968ء کے وسط میں کر دیا تھا۔ پھر ستمبر 68ء کو میں نے حیدر آباد میں اس اعلان کی روشنی میں کہا تھا کہ کوئی اور میدان میں نہ آیا تو میں خود صدر ایوب کا مقابلہ کروں گا۔ نومبر 68ء میں اگر مجھے گرفتار کر لیا گیا تو اس اعلان کے پیش نظر پیپلز پارٹی نے میری

www.bhutto.org

عدم موجودگی میں میرا نام صدارتی امیدوار کے طور پر قوم کے سامنے صوابدید کے لئے پیش کیا۔ اسے علم تھا کہ بی ڈی نظام جمہوری نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی کو یہ سمجھانے کی بھی ضرورت نہ تھی کہ آمریت کو انتخابات کے ذریعے نہیں بدلا جا سکتا۔ ووٹ کے ذریعے حکومت کو بدلنا صرف جمہوریت میں ہی ممکن ہے۔ آمریت میں ووٹ کا حق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسے گزشتہ انتخابات میں حق رائے دہی کے استعمال کی محدود گنجائش سے بدلا تو نہ جا سکا لیکن اس کو ایک بار جھٹکا ضرور دے دیا گیا۔ چھ سال میں پہلی بار ایوب حکومت کو اپنا دفاع کرنا پڑا تھا۔ ان انتخابات نے نہ صرف ایوب حکومت کو کمزور کیا تھا بلکہ عوام کو ان کے کھوئے ہوئے حقوق کا احساس بھی دلایا تھا۔

آمریت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے ایک مسلسل جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لگاتار حملے ہی اس کے قلعے میں شگاف ڈال سکتے ہیں۔ 1964ء میں انتخابات ہوئے تو اس کی نسبت 1958ء میں ایوب حکومت بہت مضبوط تھی اور 1964ء میں 66-1965ء سے زیادہ طاقتور تھی، کیونکہ اب جنگ بندی اور اعلانِ تاشقند واقع ہو چکے تھے۔

69-1968ء میں یہ 1965ء سے کہیں زیادہ کمزور ہو گئی۔ اگر 1964ء میں انتخابات کا بائیکاٹ کیا جاتا تو ایوب حکومت 69-1968ء میں بھی کافی زیادہ محفوظ ہوتی۔ اس کی زیادتیوں سے عوام بھی کم ہی باخبر ہو پاتے۔ گزشتہ انتخابات نے ایوب حکومت کے قلعے کی فصیل میں ایک بہت بڑا شگاف ڈال دیا تھا۔ جنگ بندی اور اعلان تاشقند نے اس کی جڑوں کو کاٹ ڈالا۔ نواب کالاباغ کی روانگی سے اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ رشوت خور اور نااہل انتظامیہ نے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں حصہ لیا اور آخر وہ وقت آ پہنچا کہ ایوب حکومت کو گرانے کے لئے صرف ایک آخری جھٹکے کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے عوام کو منظم کرنے کی ضرورت تھی اور جب میں نے اکتوبر میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور راولپنڈی سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا تو ملک بھر کے عوام خصوصاً طالب علم یک زبان ہو کر احتجاج کرنے کے لئے میدان میں نکل آئے۔ اب حکومت لڑکھڑا رہی تھی۔ اب ضرورت تھی کہ ایک ایسی مستعد حکمت عملی بروئے کار آئے جس کی وجہ سے ایوب حکومت جزوی طور پر بھی اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو سکے۔ ایوب خان نے اپنے عہد حکومت میں ایک ایسا آئین بنایا تھا جس کے ذریعے محدود انتخابات ہوں تاکہ حکومت کو انتخابات سے جو خطرہ لاحق ہو وہ اس کے لئے جان لیوا ثابت نہ ہو۔

جب یہ آئین بنا تو حکومت میں اتنی جان موجود تھی کہ وہ ناپا تولا خطرہ مول لے سکتی تھی۔ انتخابات کا یہ طریقہ یعنی محدود حق رائے دہی دہرا مقصد حاصل کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ عوام یہ خیال کرتے رہیں کہ ان کے جمہوری حقوق سلب نہیں کئے گئے۔ دوسرے ان غیر ملکی طاقتوں سے دادِ تحسین حاصل کی جائے جن کی امداد پر ایوب حکومت کے قیام کا دارومدار تھا۔

جب ہم نے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ حزب اختلاف اپنی مرضی

www.bhutto.org

کے مطابق کسی میدان عمل کا تعین کر کے' جدوجہد نہیں کر سکتی۔ جو ہتھیار بھی میسر آجائیں اس کو ان کے ذریعے جنگ کرنا ہے' خواہ اسے یہ ضمانت بھی حاصل نہ ہو کہ انتخابات منصفانہ اور قانون کے دائرے میں ہوں گے۔

ہمیں یاد تھا کہ پچھلے انتخابات میں حصہ لینے سے بی ڈی نظام جمہوری نہ بن گیا تھا لیکن ہمیں یہ وہم بھی نہ تھا کہ اگر انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے گا تو ایوب حکومت کی آمریت میں فرق آجائے گا۔ پھر ہم پر یہ بات بھی واضح تھی کہ آئین یا تو قانونی ہے یا غیر قانونی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اس کے کچھ حصوں کو تو مانیں اور کچھ حصوں کو رد کر دیں کہ وہ ہمارے مطلب کے نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آئین اوپر کے حصوں میں تو غیر قانونی ہو اور درمیانی اور آخری حصے میں قانونی۔ اگر اوپر کی سطح کے انتخابات کا بائیکاٹ محض اس لئے کیا جائے کہ وہ ناجائز ہیں تو بنیادی جمہوریت اور اسمبلی کی سطح کے انتخابات کا بھی بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ ادھورے بائیکاٹ سے ہم آئین کے ایک حصے کا انکار کرتے ہیں اور دوسرے کا اقرار۔ ہم اس دوغلی پالیسی پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ جو لوگ بائیکاٹ کے حامی تھے ان کے لئے منطقی راہ یہی تھی کہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں یہ صورت حال پیدا کرتے کہ تینوں اسمبلیوں کے حزب اختلاف کے ممبر فوراً مستعفی ہو جاتے اور اپنے حامی اور ہم خیال بی ڈی ممبروں سے درخواست کی جاتی کہ وہ بھی استعفیٰ دے دیں۔ انہیں پھر یہ بھی چاہئے تھا کہ وسیع پیمانے پر "شہری نافرمانی" یا عدم تعاون کی تحریک چلا کر اس نظام کی اور اس آئین کی اوپر کی سطح سے لے کر نیچے تک مکمل مخالفت کرتے۔ کوئی منطقی اور ٹھوس فیصلہ کرنے کی بجائے اپوزیشن نے صرف اوپر کی سطح کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس بائیکاٹ کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ موجودہ نظام کے تحت انتخابات منصفانہ نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ احتجاج آئین کی غیر قانونی شکل کے خلاف تھا جس کے لئے درخواست کی گئی کہ ایک پرامن اور آئینی تحریک چلا کر انتخابات کا بائیکاٹ کیا جائے۔

اپوزیشن نے یہ نہ سوچا کہ پچھلے انتخابات میں حصہ لینا اس کے اس حالیہ موقف کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔ گزشتہ انتخابات میں تمام مراحل پر انتخابات میں حصہ لے کر اپوزیشن نے اس آئین اور اس نظام کو تسلیم کر لیا تھا اور اب محض ایک سطح پر بائیکاٹ کر کے اور باقی سطحوں پر انتخابات لڑ کر وہ ایک دوغلی پالیسی کا شکار ہو گئی تھی۔ پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہ تھی کہ انتخابات کے بغیر تحریک پرامن اور آئینی رہے گی۔ جب عوامی تحریک چل پڑتی ہے تو گاندھی جیسی شخصیت بھی اس کو قابو میں نہیں رکھ سکتی۔ ایک پرامن اور آئینی تحریک کبھی کسی آمر کو نہیں ہٹا سکتی۔

جب تک نظم و نسق بحال رہتا ہے آمر اپنی کرسی پر ڈٹا رہتا ہے۔ اگر تحریک کا مقصد آمر کو ہٹانا ہو تو تحریک "لاء اینڈ آرڈر" کے ڈھانچے کو متزلزل کر کے ہی ایسا کر سکتی ہے۔ اپوزیشن نے انتخابات کے بائیکاٹ کے لئے ایک پرامن اور آئینی تحریک چلانے کی اپیل کی۔ لیکن اگر ایوب حکومت کو انتخابات کے ذریعے نہیں بدلا جا سکتا تھا تو پرامن اور آئینی تحریک کے ذریعے اس کو بدلنے کے امکانات اور بھی کم تھے۔

www.bhutto.org

عوام ایوب کی حکومت سے نجات چاہتے تھے لیکن حکومت سے نجات کا راستہ یا انتخابات تھے یا انقلاب۔

اپوزیشن نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور انقلاب کے نام سے اس کی جان جاتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ امن امن کی اپیلوں کے باوجود تحریک نے انقلاب کا رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا، جس کے لئے اپوزیشن بالکل تیار نہ تھی۔ اپوزیشن کا مخمصہ یہ تھا کہ وہ انتخابات میں حصہ لینے کو غیر آئینی سمجھتی تھی۔ لیکن جب تحریک میں تشدد کا عنصر پیدا ہو جائے تو وہ بھی غیر آئینی ہو جاتی ہے۔ اپوزیشن اب "جائے رفتن نہ پائے ماندن" کی حالت میں تھی۔ اور اس حالت میں فوجی مداخلت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

جب حکومت میں حکومت کرنے کا دم نہ رہے اور اپوزیشن کے پاس کوئی متبادل راستہ نہ ہو تو فوجی مداخلت کوئی دور کی بات نہیں ہوتی۔ پیپلز پارٹی انتخابات کا راستہ کھلا رکھ کر فوجی مداخلت کو بھی ناممکن بنانا چاہتی تھی لیکن بقیہ اپوزیشن نے بر وقت اس بات کی اہمیت کا احساس نہ کیا۔ انتخابات متبادل قیادت پیش کرتے ہیں۔ تحریک از خود کسی فرد واحد کو حزب اختلاف کے سربراہ کے طور پر صدر کی جگہ پر نہیں بٹھا دیا کرتی۔ اس لئے حکومت بدلنے کے ضمن میں ایک پر امن 'آئینی تحریک کا تصور اپنے اندر تضاد رکھتا ہے۔ اگر حکومت کی طرف سے انتخابات میں گڑبڑ کرائی جا سکتی ہے تو پُر امن تحریک کو اپنے مطلب کی راہوں پر بھی ڈالا جا سکتا ہے۔

ایک پُر امن تحریک کو قابو میں رکھنا اتنا ہی مشکل یا آسان ہے جتنا بی۔ ڈی ممبروں کے ووٹ حاصل کرنا۔ ایک تشدد آمیز تحریک کو 'جو انتخابات کے دائرے سے باہر جاری ہو' امن و امان قائم کرنے پر دبایا جا سکتا ہے اور اگر اس تحریک کے قائدین سے کوئی مصالحت نہ ہو پائے تو اس قسم کی تحریک ایک نئے آمر کو بھی جنم دے سکتی ہے۔ ہمارے خیالات میں انتخابات میں حصہ لینا بہترین راستہ تھا۔ اکیلی پُر امن تحریک حکومت کو نہیں بدل سکتی تھی۔ اگر تحریک تشدد آمیز ہو جاتی تو فوجی مداخلت کا ڈر تھا۔ اس لئے انتخابات کا راستہ اس کا بہترین نعم البدل تھا۔ انتخابات کا مطلب یہ نہ تھا کہ تحریک ختم کر دی جاتی۔ عمل کے یہ دونوں دھارے ملک کے مستقبل کو خطرے میں ڈالے بغیر' انتخابی مہم میں یکجا ہو سکتے تھے۔ انتخابی مہم بذات خود ایک تحریک ہوتی ہے اور یہ تحریک اپنی راہ میں آگے بڑھتے ہوئے کئی شکلیں اختیار کر سکتی ہے۔ انتخابات البتہ اس کے بہاؤ کو قابو میں رکھنے کے لئے کناروں کا کام دیتے ہیں تاکہ یہ ایسا سیلاب نہ بن جائے جسے تھامنے کی سکت نہ حکومت میں ہو اور نہ اپوزیشن میں' اور فوجی مداخلت ناگزیر بن جائے۔

قصہ مختصر' غلط اندازوں اور بے وزن باتوں سے ہٹ کر' کسی بھی حکومت کو بدلنے کے چار مختلف انفرادی اور اجتماعی طریقے ہیں۔ ایک پانچواں طریقہ بھی ہے لیکن وہ ہمارے احاطے سے باہر ہے۔ تبدیلی ان طریقوں سے ہو سکتی ہے :

(1) خونی انقلاب کے ذریعے

(2) انتخابات میں حصہ لے کر

(3) تشدد آمیز تحریک چلا کر..........اور..........قدرت از خود

قدرت کا دخل بھی ہمارے اختیارات سے باہر ہے۔ لیکن اس کے نتائج میں ہمارا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ تبدیلی حکومت کا پانچواں طریقہ فوجی انقلاب ہے لیکن فوج کی طرف سے از خود پیش قدمی متوقع نہ تھی۔ جب تک کہ اس کو موقع فراہم نہ کیا جائے۔ مارشل لاء اور بات ہے 'فوجی انقلاب اور بات ہے۔ جب فوجی انقلاب کے ذریعے کوئی شخص حکومت کی باگ ڈور سنبھالتا ہے تو اس پر بہت جلد یہ عیاد ہو جاتا ہے کہ طاقت حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا کہ اس کو قائم رکھنا۔ حکومت کو قائم رکھنے کے لئے عوام کو مطمئن اور خوش حال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ کام صدر ایوب خان کے طویل دور میں بھی نہ ہو سکا جب کہ ایوب خان کو تمام تر سہولتیں اور اختیارات حاصل تھے۔

عظیم الشان تبدیلی لانے کا مؤثر ترین ذریعہ عوامی انقلاب ہے۔ انقلاب کے لئے تاریخی روایات کے ساتھ ساتھ بے پناہ قربانیوں کی بھی ضرورت ہے۔ کوئی ایک تشدد آمیز تحریک بھی 'جو یقیناً انقلاب ہی کی ایک قسم ہوتی ہے انقلاب کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ وہ تبدیلی جو فطری ہو اس پر 'اس کے نتائج سے قطع نظر' کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ایوب خان کے دور میں کوئی بھی فرد واحد اتنا با اثر نہ تھا کہ موجودہ نظام میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے اس کو جاری رکھ سکتا' اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایوب خان نے اپنا جانشین پیدا کرنے کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔

اب مستقبل کا انحصار اس بات پر تھا کہ حالات کے بارے میں قومی رہنماؤں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور وہ خلا کو پر کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ یہ لازمی بات تھی کہ اگر حزب اختلاف کوئی ہوش مندانہ فیصلہ نہ کرتی تو ابتری پھیل جاتی۔ جوں جوں ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی شدت اختیار کرتی جاتی یہ فطری امر تھا کہ حالات انڈونیشیا کے واقعات کو دہرانے کی طرف مڑ جاتے۔

> حزب اختلاف کا فرض تھا کہ آنے والے حادثات کی محافظ ثابت ہوتی۔ لیکن اس نے آنے والے حادثات کا صحیح اندازہ نہ کیا اور سیاسی طور پر غیر فعال ہو کر رہ گئی یا پھر آمر کے ساتھ "مکالمات" میں کھو گئی۔

انقلاب 'تشدد آمیز تحریک 'قدرتی عمل' یا اتفاقی حادثے (جس میں قتل کرنے کی سازش بھی شامل ہے) کے ذریعے ہی آمریت کو مٹایا جا سکتا ہے۔ آمر رضا کارانہ طور سے دستبردار نہیں ہوتا اور نہ ہی حقیقی جمہوری مراعات دیتا ہے۔ تاہم پاکستان میں نظام اس قدر نہیں بگڑا تھا کہ پر امن تحریک کا تصور ترک کر دیا جاتا۔ لیکن اس تحریک کا مقصد اگر یہ تھا کہ ایوب حکومت اور موجودہ نظام بدل جائے تو اس کے لئے انتخابات کا ذریعہ اپنانا ضروری تھا۔ اگر جاندار طریقے سے انتخاب لڑے جاتے تو ایوب حکومت کو بدل کر عوام کی نمائندہ حکومت قائم کرنا مشکل نہ تھا۔ انتخابی مہم کے ساتھ ساتھ تحریک کا دباؤ حکومت کو آزادانہ اور

www.bhutto.org

منصفانہ انتخابات کرانے اور عوام کو ان کے جمہوری حقوق لوٹانے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اگر انتخابات سے توجہ ہٹادی جائے یا دوسرے لفظوں میں حکومت کی تبدیلی کا راستہ بند کر دیا جائے تو پُرامن تحریک کے باوجود ایسا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے کہ حکومت کے لئے سمجھوتے بازی کی راہ کھل جائے۔

حکومت اور نظام کو قائم رکھنے کی خاطر حکومت چند مراعات دے بھی دیتی تو اس میں حزب اختلاف کی نسبت حکومت کو زیادہ فائدہ ہوتا۔ حالیہ تحریک کے دو امکانات ہیں۔ اگر تحریک کا جوش قائم نہیں رہتا تو مراعات دیے بغیر بھی حکومت اس پر قابو پا سکتی ہے اس طرح جدوجہد کی راہ اور بھی کٹھن ہو جائے گی۔ اگر تحریک کا جوش و خروش قائم رہتا ہے اور اس میں مزدور اور کسان بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صنعتی اور زرعی پیداوار رک جاتی ہے تو فوجی مداخلت کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک اپوزیشن تحریک کے اس موڑ پر اس پوزیشن میں نہیں ہوتی کہ اپنی تنظیم کے ذریعے اسے عوامی انقلاب میں ڈھال سکے نتیجہ یہی ہو گا کہ گرتی ہوئی حکومت کاروبار مملکت فوج کے سپرد کر دے۔ ادھر ہماری اپوزیشن کا یہ حال ہے کہ اس کے بیشتر عناصر نے انقلاب کی عملی تو کیا نظریاتی تیاری بھی نہ کی تھی۔ ان حالات میں اگر عوامی جدوجہد کو انتخابی مہم میں ڈھال دیا جاتا تو عوامی تحریک کو بہنے کے لئے کنارے مل جاتے اور فوجی مداخلت کا امکان قریب قریب ختم ہو جاتا۔ انتخابی مہم کے دوران فوجی مداخلت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ مداخلت، حکومت اور متبادل قیادت کی کشمکش میں دخل دینے کے مترادف ہوتی ہے۔

انتخابی مقابلہ نقصان دہ سودے بازی کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اس مقابلے کے دوران جو سیاسی سرگرمی پیدا ہوتی ہے اس سے عوامی تحریک کو ایک مسلسل آب و تاب ملتی رہتی ہے اور فوجی مداخلت اور حکومت کے جوابی حملے کے مواقع کافی کم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے حالات کے پیش نظر انتخابات وہ آخری تنکا ثابت ہوتے جو صدر ایوب کی لڑکھڑاتی ہوئی حکومت کی کمر توڑ دیتا اور ساتھ ہی فوجی مداخلت کا موقع بھی پیدا نہ ہوتا۔

انتخابات اور عوامی تحریک کے مقاصد میں بنیادی طور پر معمولی سا بھی اختلاف نہ تھا۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے۔ دونوں کا متحدہ بہاؤ پُرامن طور پر حکومت کو تبدیل کرنے کے لئے موثر ترین عمل تھا۔ دونوں کے اتحاد کی بنا پر حکومت اور بالآخر نظام کی تبدیلی ناگزیر تھی۔ اگر تحریک اور انتخابات، دونوں کو ایک دوسرے کا زوج بننے دیا جاتا اور دونوں کی خوبیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں تو حکومت کی تبدیلی کا راستہ کھل جاتا۔

ہمارے حالات میں نہ تو اکیلے انتخابات اور نہ اکیلی پُرامن تحریک اس قابل تھے کہ ایوب کی آمرانہ حکومت اور غیر جمہوری نظام کو تبدیل کر سکتے۔ منزل تک پہنچنے کے دونوں راستے صحیح تھے لیکن اپنی اپنی جگہ دونوں ادھورے تھے۔ دونوں کے اتحاد کی ضرورت تھی کیونکہ دشمن کے ذرائع زیادہ تھے۔

تحریک اور انتخابی مہم کے باہمی تعاون اور ہم آہنگی کی بنا پر عوام کا طاقت ور

www.bhutto.org

اتحاد ہمیں اس ٹھوس منزل کی طرف لے جاتا جہاں ہم حکومت کو بدل کر عوامی جمہوریت قائم کر سکتے۔ دونوں راہوں میں اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے حکومت پر دو اطراف سے اس وقت تک بار بار حملے کئے جا سکتے تھے جب تک اس کی عمارت کو گرا نہ لیا جاتا۔ تشدد کے بغیر حکومت اور نظام کو بدلنے کا بہترین ذریعہ یہ اتحاد تھا۔

> اپوزیشن کا المیہ یہی ہے کہ اس نے اس اتحاد کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور پیپلز پارٹی کے منطقی اور حقیقت پسندانہ موقف کو تسلیم نہ کر کے تحریک کے مقاصد کے ساتھ غداری کی۔

ہمارے عوام کا مزاج کسی بھی مخلصانہ قومی جدوجہد کو ناکام نہیں ہونے دیتا۔ جب ایک مرتبہ کسی نے آگے بڑھ کر جدوجہد کا آغاز کر دیا تو پھر یہ نقشہ تھا کہ ہر جگہ ہڑتالیں اور جلوس تھے اور نوجوان طلبا شہید ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پردہ نشین خواتین بھی سڑکوں پر نکل آئیں اور کالج کی طالبات نے پولیس سے ٹکر لی۔ حکومت اس قابل نہ رہی کہ حالات کو قابو میں رکھ سکے وہ بوکھلا گئی تھی اور نت نئے پینترے بدل رہی تھی۔ اگر پُرامن تحریک حکومت کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو قوم کی خوشی کا باعث تھا۔ لیکن یہ تصور کر لینا نہایت مشکل ہے کہ ایک غیر منظم پرامن تحریک جس کے پاس انتخابات کی مضبوط ڈھال بھی نہ ہو، آمریت کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اپوزیشن نے "پُرامن" کا صرف اصطلاحی لبادہ ہی اوڑھا ہوا ہو۔ اس صورت میں فطری امر تھا کہ جدوجہد ایک اور روپ اختیار کر لے۔ ایک طرف تحریک کی "پُرامن" نوعیت پر زور دیا جا رہا تھا اور دوسری طرف قول و فعل میں تضاد تھا، اس سے عوام کا الجھ جانا فطری تھا جس سے کئی اور دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ ایک "پُرامن" تحریک کو پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اسے ایک غیر معینہ مدت تک برسرِ عمل رہنا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریک کو بہترین قیادت نہ ختم ہونے والے فنڈ، آزاد پریس اور مضبوط تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اس کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ حکومت صرف غلطیوں پر غلطیاں کرتی چلی جائے۔ یہ تصور کرنا بھی ضروری ہے کہ حکومت اپنے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لئے کوئی قدم نہ اٹھائے گی۔ گویا پُرامن تحریک ضروری تو ہوتی ہے لیکن کسی آمرانہ حکومت کو بدلنے کی سکت اس میں نہیں ہوتی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ اپوزیشن منظم نہ ہو اور پریس آزاد نہ ہو۔

انتخابات کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ یہ عالمی دلچسپی کو ابھارتے ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں ان میں حصہ لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ انتخابات کی ایک خاص منزل ہوتی ہے جس کو وقت کے پیمانے میں ناپا جا سکتا ہے۔ انتخابات میں خواہ کتنی ہی دھاندلی ہو، ان کی وجہ سے ابھرا ہوا جوش اور سوالات مستقبل میں حکومت کے قیام کے لئے ٹھوس مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔ کسی آمر کے عہد حکومت کو کم کرنے کا بہترین پُرامن ذریعہ انتخابات ہیں اور عوام کو ابھارنے کا مؤثر ترین پُرامن راستہ بھی یہی ہے۔ انتخابات

www.bhutto.org

میں اگر شکست بھی ہو جائے تب بھی ایک متبادل پروگرام سامنے آ جاتا ہے۔ بعض اوقات متبادل قیادت بھی ابھر آتی ہے اور کچھ نہ ہو تو قومی مسائل کا تعین ہو جاتا ہے اور برسراقتدار حکومت اور قیادت کی کمزوریاں ڈرامائی انداز میں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔ انتخابات میں دھاندلی صرف ووٹنگ کے وقت ہوتی ہے۔ اس سے پہلے انتخابی مہم کے دوران عوامی بیداری اور تنظیم کے خاصے مواقع آتے ہیں۔ پریس کو بھی مجبوراً کچھ آزادی مل جاتی ہے اور یوں اصل حالات سے پردہ اٹھنے لگتا ہے۔ جوں جوں یہ پردہ اٹھتا چلا جاتا ہے برسراقتدار حکومت کمزور ہوتی جاتی ہے۔

پاکستان میں ایک ایسی پُرامن تحریک جس میں مسائل اور پروگرام کی وضاحت نہ کی گئی ہو زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی۔ ہم اپنی روایات کے اعتبار سے کسی طویل، منظم اور متواتر جدوجہد کے عادی نہیں۔ پاکستان میں ہر چیز بآسانی تقلیلِ حاصل کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ چونکہ اس برِّ عظیم میں لوگ، خاص طور پر مسلمان قومی تحریکوں سے کافی اثر پذیر رہے اس لئے تاریخی رجحان کی وجہ سے موجودہ عوامی تحریک بھی چل نکلی ہے۔ ایک دور میں مشہور تحریک خلافت جاری رہی اس کے بعد تحریک پاکستان چلتی رہی۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی خالصتاً پُرامن نہ تھی۔ تحریک خلافت عظیم رہنماؤں کی قیادت کے باوجود کامیاب نہ ہو سکی۔ تحریک پاکستان کی قیادت ایک عظیم رہنما نے ایک غیر متزلزل اور واضح مطالبے کے لئے کی۔ یہ تحریک خالصتاً پرامن نہ تھی کہ راست اقدام بھی اس کی منزل کا ایک موڑ تھا اور پھر اس کی قیادت مختلف الخیال پارٹیوں کے بڑبونگ کی نہ تھی جن کے مطالبات بھی غیر واضح ہوں۔ تحریک پاکستان غیر ملکی برطانوی سامراجی طاقت کے خلاف تھی اور اس جدوجہد سے مختلف تھی جو اکتوبر 1968ء میں پاکستان میں قائم شدہ آمریت کے خلاف برپا ہوئی۔

1962ء میں حسین شہید سہروردی نے برسراقتدار حکومت کے خلاف ایک طرح کی تحریک شروع کی تھی لیکن ہمارے یہ سابق وزیراعظم بیروت میں بے یار و مددگار، انتقال فرما گئے۔ اس کے برعکس محترمہ فاطمہ جناح نے اسی حکومت کے خلاف انتخابات میں حصہ لیا اور جب وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں تو حکومت کے سربراہوں نے ان کے لئے تجہیز و تکفین کا اہتمام کیا حالانکہ ان کے انتخاب میں حصہ لینے کی وجہ سے اس حکومت کو مستقل نوعیت کا بھاری نقصان پہنچا تھا۔ مسٹر سہروردی کی تحریک نے ایوب خان کے لئے ایک عارضی سی پریشانی ضرور پیدا کی تھی لیکن محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابات نے مستقل اثرات چھوڑے۔ مسٹر سہروردی کی تحریک کو بھلا دیا گیا ہے۔ اسی طرح پچھلے دنوں 1966ء کے اوائل میں، شیخ مجیب الرحمن نے چھ نکاتی تحریک چلائی لیکن ان کی گرفتاری کے بعد اس تحریک میں بھی وہ دم خم نہ رہا۔ انتخابی مہم کے دوران حزب اختلاف نہایت خوش اسلوبی سے حکومت کے خلاف مصروف پیکار ہو سکتی ہے۔ انتخابی مہم کے دوران حکومت پر نت نئے حملے کی گنجائش ہوتی ہے۔ حکومت کو برابر اپنا دفاع کرنا پڑتا ہے، اپنی حکمت عملی کی وضاحت کرنی پڑتی ہے اور اپنا رویہ معقول بنانا پڑتا ہے۔ جونہی حکومت کی جانب سے اپوزیشن کیا جاتا ہے حکومت پر یہ الزام آ جاتا ہے کہ وہ انتخابات میں دھاندلی کر

www.bhutto.org

رہی ہے۔ بدنیتی کا الزام بھی بآسانی لگ جاتا ہے۔ انتخابی مہم بذات خود ایک قومی خدمت ہے۔ اس کے ذریعے ملک کے بارے میں عوام کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے' قومی مسائل واضح ہوجاتے ہیں اور مغالطے دور ہوجاتے ہیں۔ کسی اپوزیشن رہنما نے پوری طرح محسوس نہیں کیا کہ پاکستان کا موجودہ بحران اس لئے پیدا ہوا کہ مسلسل انتخابات نہیں ہوسکے۔ پچھلے انتخابات میں خواہ بندشیں موجود تھیں مگر بھی تجربات حاصل ہوئے۔

جو ہتھیار بھی دستیاب ہوں ہم نے انہی کی مدد سے جنگ کرنی ہے۔ اگر یہ قابل قبول نہیں تو دوسرا حل انقلاب ہے نہ کہ انتخابات کا بائیکاٹ۔ انتخابات کی وجہ سے تمام معاشرہ حرکت میں رہتا ہے اور اس کے نتائج سے ہر شخص اثر پذیر ہوتا ہے۔ عوام انتخابی مہم کے ایک ایک موڑ کا جذبات کی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ انتخابات میں عوام کے جذب و شوق کو برقرار رکھنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں یہ خوف نہیں ہوتا کہ انتخابی مہم کی رفتار کم ہوجائے گی یا جوش ختم ہوجائے گا۔ یہ ایک واضح منزل کی طرف کوچ ہوتا ہے۔ اس سے عوام کو اپنے ووٹ کی قیمت یعنی جمہوریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا ٹکراؤ ایک جدوجہد کا انداز اختیار کرلیتا ہے، جس کے باعث مسائل کی وضاحت ہوتی ہے۔ پارٹیاں مبہم عزائم کا اظہار کرنے کی بجائے ٹھوس پروگرام اپنانے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔

وہ آزادی جو انتخابات کی وجہ سے میسر آتی ہے کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی ماسوائے انقلاب کے۔ انتخابات اور انقلاب ہی تعلیم اور عزم نو کے وہ زبردست ذرائع ہیں جن سے تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ اگر تشدد کے ذریعے تبدیلی کو رد کر دیا جائے تو صرف ایک ذریعہ باقی رہتا ہے' انتخابات: جس کو قبول کرلینا چاہئے۔ عام حالات میں فوجی بغاوت کے علاوہ اور کوئی تیسرا راستہ نہیں جس سے کسی آمرانہ حکومت کو بدلا جاسکے۔ ہر پانچ سال کے بعد صرف انتخابات ہی آمر کی زرہ بکتر میں جھنکار پیدا کرتے اور اس کے قائم کئے ہوئے استحصالی نظام کے قلعے میں زلزلہ برپا کرتے ہیں۔ یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہوگی کہ پانچ سال میں ایک مرتبہ بھی ہمارے ہاتھ آمر اور اس نظام کے گریبان تک نہ پہنچیں۔ انتخابات ایوب خان کی بہت بڑی کمزوری تھے۔ ان کا بائیکاٹ کرنا ایوب خان سے بھی زیادہ اس نظام کو گرنے سے بچانے کے مترادف تھا جو ایوب خان کے باعث ملک پر مسلط ہے۔ جو آمر محض انتخابات کے لمحے سے ڈرتا ہو' اس لمحے کو اس کی خواہش کے مطابق پرسکون کیوں گزرنے دیا جائے۔ ہوسکتا ہے جب انتخابات ختم ہوتے تو نتیجے کے اعلان سے لوگوں کو خاص دلچسپی ہی نہ ہوتی۔ انتخابات کا عمل 'از خود' ایوب کو شکست دے دیتا۔ اپنے گلے سے چپٹائے ہوئے اقتدار کو ایوب خان زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکتا تھا۔ اس کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے لئے انتخابات بہترین ذریعہ تھے۔ وقت اس کی جھوٹی فتح کے کھوکھلے پن کو ثابت کر دیتا۔ اس آزمائش میں سے ایوب خاں اگر بخیر و خوبی گزر جاتا تو یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوش قسمت انسان ہے۔ لیکن ایسا ہونا ایک عجوبہ ہوتا۔

کرنے کے لئے انتخابات بہترین ذریعہ تھے۔ وقت اس کی جھوٹی فتح کے کھوکھلے پن کو ثابت کرنا پڑتا کہ وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوش قسمت انسان ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ایک عجوبہ ہوتا۔

اگر تحریک کو انتخابات کی سطح سے نیچے لا کر محض نظم و نسق کا مسئلہ بنا کر رکھ دیا جائے تو اس کو قابو میں لانا حکومت کے لئے نہایت آسان ہوتا ہے۔ مثلاً اس صورت میں اس الزام کی بھی گنجائش نہ رہتی کہ ایوب خان انتخابات جیتنے کی خاطر ظلم و تشدد کر رہے ہیں۔ اگر ایوب خان کے مد مقابل کوئی بھی نہ کھڑا ہوتا تو پھر اس کے لئے یہ آسان ہو جاتا کہ وہ بحران کو کسی اور ڈگر پر موڑ دے کیونکہ اب اس کی بدنیتی کو ثابت کرنے کے لئے انتخابی مہم جیسی ساز گار فضا میسر نہ ہوتی۔

محترمہ فاطمہ جناح کو گرفتار کرنا ناممکن تھا۔ محض اس لئے نہیں کہ وہ قائداعظم کی بہن تھیں بلکہ اس لئے کہ وہ آئینی طور پر ایوب خان کی مد مقابل تھیں۔ مسٹر سہروردی اور مجیب الرحمٰن دونوں کو گرفتار کر لینا اس لئے آسان تھا کہ وہ انتخابات میں مد مقابل نہ تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح کا چیلنج ایوب خان کے لئے ایک بہت بڑی دھمکی تھی۔ انہوں نے سہروردی اور مجیب الرحمٰن سے کہیں بڑھ کر بے باکانہ حملہ کیا تھا لیکن ان کو گرفتار کرنا ایوب خان کے بس سے باہر تھا۔ بے شک انتخابات کے دوران حکومت کی طرف سے دباؤ ڈالا جا سکتا ہے جیسا کہ پچھلے انتخابات میں ہوا لیکن کسی تحریک پر دباؤ ڈالنے کی نسبت انتخابی مہم پر دباؤ ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے محتاط ہونا پڑتا ہے اور بار بار ایسا نہیں کیا جا سکتا اور جب کیا بھی جائے تو ڈھکے چھپے انداز سے کیا جاتا ہے۔ پھر تحریک میں غیر ملکی مداخلت کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن انتخابات کی مہم میں نفرت انگیز خفیہ معاہدوں کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔ تحریک سے ابھرنے والے نظم و نسق کے مسئلے پر مکمل توجہ دینے کے پیش نظر حکومت غیر ملکی خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے، ان ممالک سے قومی مفاد کو بیچ کر بھی معاہدے کر سکتی ہے۔ لیکن جب حکومت انتخابات کی گرفت میں ہو تو وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی۔ اگر تحریک پُرامن اور آئینی رہتی تو ایوب خان کو معمولی تکلیفات کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن اگر ایوب خان انتخابات کے خوف سے آزاد ہو جاتا تو اس کے لئے بہت سے راستے کھل جاتے۔ انتخابات کے فکر سے آزاد ہو کر وہ غیر منظم عوامی تحریک پر تشدد کرتا اور اس پر کوئی یہ الزام نہ لگا سکتا کہ اس نے انتخابات جیتنے کے لئے طاقت استعمال کی ہے۔ ہر کوئی یہ کہتا کہ وہ نظم و نسق کو تباہ ہونے سے بچانے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ اور یوں عوامی جدوجہد کے بارے میں مغالطے پیدا ہو جاتے۔ وہ مبارک تحریک جس کے لئے عوام نے خون دیا تھا اسے لوگوں کی نظر سے گرانے کے لئے اس رنگ میں پیش کیا جاتا کہ اس کے باعث عوام کو جان و مال کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

جب ہم پچھلے واقعات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اپوزیشن آخری لمحوں تک مشرقی پاکستان سے صدارتی نمائندے کے متعلق گفتگو اور غور و فکر کرتی رہی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آخری لمحے تک اپوزیشن انتخابات میں حصہ لینے کے متعلق سوچ رہی تھی لیکن پھر اچانک انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر

لیا گیا۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ بڑی حد تک اس اعلان سے متاثر ہو کر کیا گیا جو پاکستان پیپلز نے مجھے صدارتی امیدوار نامزد کرنے کے متعلق کیا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو یقیناً یہ ایک نہایت غیر معمولی وجہ ہے جس کی بنا پر انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ اگر ڈھاکے میں اپوزیشن کے اس فیصلے کو ٹھنڈے دل سے دیکھا جائے تو وہ غیر دانش مندانہ ہی نظر آتا ہے۔ یاد رہے کہ مولانا بھاشانی نے اجلاس میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ بائیکاٹ کے حق میں تھے مگر مولانا کے اس فیصلے کی اپنی وجوہات ہوں گی اور شاید بڑی وجہ یہ ہو کہ وہ اپوزیشن کے اس جال میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے کہ دائیں بازو کے کسی غیر موثر شخص کو مشرقی پاکستان سے صدارتی امیدوار کھڑا کر دیا جائے اور یوں صدر ایوب کے لئے الیکشن جیتنے کا راستہ آسان بنا دیا جائے۔ مجیب الرحمٰن تقریباً 3 سال سے جیل میں تھے اس لئے انہیں بائیکاٹ یا عدم بائیکاٹ میں دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ حالات سے کٹے ہوئے تھے، وہ جیل کی کوٹھڑی سے آواز لگا سکتے تھے کہ "سب کچھ جہنم میں جائے"۔

اپنے مزاج کے مطابق اپوزیشن نے "میانہ روی" اختیار کی ہے کہ نہ تو انتخابات میں حصہ لیا جائے اور نہ انقلاب کی بات کی جائے۔ جمہوری مجلس عمل کا اتحاد ناپائیدار ہے کیونکہ اس میں بہت سے نظریاتی، شخصی اور عملی اختلافات ہیں۔ آمریت کو اکیلا شخص نہیں ختم کر سکتا، اس کو شکست دینے کے لئے اتحاد کی ضرورت ہے، جو ہر شخص پر واضح ہے اور جسے ہر ایک تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اتحاد محض خواہش کی بنا پر نہیں ہوا کرتا۔ اس کیلئے جذبے اور اعتماد کی ضرورت ہے۔ اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہی لوگوں پر حملہ نہیں کیا جاتا جنہوں نے تحریک کا آغاز کیا ہو اور جن کا تعاون ناگزیر ہو اور جن کے بغیر جدوجہد کو نقطۂ عروج تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اتحاد کسی خلا میں نہیں ابھرا کرتا۔ جدوجہد تو ایک پہلو دار اور تہہ بہ تہہ صورت حاصل کا نام ہے۔ ہر شے کٹھالی میں پڑ جاتی ہے۔ خواہشات، تردوات اور تعصبات پر پرزے نکال لیتے ہیں۔ جدوجہد کے پردے پر طرح طرح کے عوامل اپنا اپنا رنگ جما لیتے ہیں جن میں لالچ اور انتقام کے ساتھ ساتھ نفرت اور کشادہ دلی بھی شامل ہیں۔ اگر معاملہ صرف نظریئے کا ہوتا تو اتنی مشکل نہ پڑتی۔ حالات کہیں پیچیدہ ہیں۔ ان حالات کے پس منظر میں انتخاب کے بائیکاٹ کے نام پر قائم ہونے والا اتحاد دیرپا نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ چونکہ پارٹیوں کی اکثریت نے کیا تھا جس میں عقلمند اور تجربہ کار لوگ شامل تھے اس لئے صحیح تھا۔ اگر پاکستان پیپلز پارٹی نے صدارتی امیدوار کے طور پر میری نامزدگی کا اعلان کر کے یک طرفہ اور غیر مناسب فیصلہ کیا تھا تو حزب اختلاف نے انتخابات کا بائیکاٹ کا فیصلہ کر کے اس سے کہیں زیادہ نامناسب اقدام کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اپوزیشن کے اس سنگین فیصلے میں معمولی سے التوا سے تحریک کو بہت زیادہ فائدہ پہنچتا اور حزب اختلاف میں مکمل اتحاد ہونے کے امکانات بڑھ جاتے۔ اس کے بجائے قبل از وقت اعلانات کا فرار پسندانہ انداز کچھ ایسا تھا جیسے پاکستان پیپلز پارٹی کے فیصلے کی راہ میں کانٹے بچھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اپوزیشن کی صفوں میں انتشار کو گہرا

www.bhutto.org

۱۱ مارچ 1968ء سے لے کر پاکستان تحریک جمہوریت انتخابات میں شرکت کرنے کے متعلق فیصلے کو ملتوی کرتی رہی تھی۔ اگر وہ اپنے فیصلے کو مزید چند ماہ کے لئے ملتوی کر دیتی تو جہاں اس کے اپنے مفاد پر کوئی اثر نہ پڑتا وہاں تحریک کے جوش کو بھی نقصان پہنچتا۔ جلدی میں اور غصے میں آ کر کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے قومی مفاد کے لئے بہتر یہ تھا کہ ہر چیز پر غور کرنے کے بعد پاکستان تحریک جمہوریت اپنے اس فیصلے کو ایک دو ماہ کے لئے ملتوی کر دیتی! اگر اپوزیشن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ٹھوس کوشش کی جاتی تو بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا اور کچھ پیچھے سے بھی نہ جاتا۔ دست برداری جدید سیاست کے پہلے ہی سبق کی خلاف ورزی ہے۔ 1968ء کے موسم بہار میں فرانس کی عوامی تحریک نہایت اہم نوعیت کی تھی۔ لیکن اس کے انجام میں لوگوں کے جذبات کی عکاسی نظر نہیں آتی۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ حزب اختلاف کی جماعتوں نے اصل میدان چھوڑ کر فرانس کی قسمت کو مظاہروں کے سپرد کر دیا تھا۔ آمریت کے خلاف جدوجہد بہادرانہ مظاہروں کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عوام کا باہر نکل آنا اور احتجاج کرنا ضروری ہے لیکن ایک ٹھوس منزل کے بغیر اس احتجاج کی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ عوامی احتجاج کو ایک فیصلہ کن اور منظم ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے حالات میں انتخابات ہی ایسا ڈھانچہ مہیا کر سکتے ہیں۔

پاکستان ایک بڑا ملک ہے جس کے عوام نہایت غریب ہیں۔ مظاہروں کے دوران نشیب و فراز بھی ممکن ہیں۔ نہایت طاقتور مظاہرے بھی ممکن ہیں اور مظاہرے کمزور بھی پڑ جاتے ہیں۔ اگر واقعات کچھ عرصے تک صحیح راستے پر رہیں تو ضروری نہیں کہ جدوجہد کا جوش و خروش برقرار رہے یا وہ تشدد پر نہ اتر آئے اور یوں حکومت اس کے سدباب کے لئے فوج کو نہ بلائے۔ اگر تحریک سست پڑ جاتی یا اس کو دھچکا لگتا تو انتخابات کے بائیکاٹ کے فیصلے کو ایک ٹھیس پہنچتی کیونکہ جوں جوں انتخابات کا وقت قریب آتا جاتا' بنیادی جمہوریت اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے سے ہر شخص کو روکنا حزب اختلاف کے لئے مشکل ہوتا چلا جاتا۔ انتخابات کے چڑھتے ہوئے "بخار" کو روکنے کے لئے تحریک اتنی منظم نہ تھی کہ انتخابات کے خلا کو پر کر سکے۔ بائیکاٹ کے فیصلے کو موثر بنانے کے لئے ضروری تھا کہ حزب اختلاف کے وہ رہنما جو اسمبلی کے ممبر تھے فوراً مستعفی ہو جاتے۔ مگر غالباً وہ اس وقت مستعفی ہونے کا سوچتے تھے جب اسمبلی کے بجٹ سیشن کا آخری اجلاس ہوتا۔ ان کا یہ عمل یقیناً بعد از وقت ہوتا۔ بائیکاٹ کا فیصلہ کسی بھی مقام نظر سے دیکھا جائے تضاد کا شکار نظر آئے گا۔

تحریک کی کامیابی کا دارومدار اس فیصلے پر نہیں تھا کہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا جاتا۔ لوگ حقیقتاً ایوب حکومت سے متنفر ہو چکے تھے اور وہ اپنے جذبات کا اظہار مطالبوں اور مظاہروں کی صورت میں کر رہے تھے۔ بائیکاٹ کے فیصلے نے تحریک کی آگ کو نہیں بھڑکایا' اس کا شعلہ تو پہلے ہی بلند ہو چکا تھا۔ اگر وقت کا تعین ضروری ہے تو 7 نومبر 1968ء وہ دن تھا جب تحریک کی ابتداء ہوئی جو خواہ کیسے بھی ہوئی ہو' کم از کم بائیکاٹ کے فیصلے کی وجہ سے نہیں ہوئی اگر تحریک جمہوریت' بائیکاٹ کا فیصلہ نہ بھی کرتی تب بھی تحریک کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ اس کے برعکس' اگر وہ اپنے اس فیصلے کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیتی تو شاید

www.bhutto.org

حکومت کی بے چینی مزید بڑھ جاتی۔ آثار سے ظاہر تھا اگر انتخابات کی بات کو مناسب اہمیت دی جاتی تو تحریک بھی قوت پکڑتی جاتی اور مارشل لاء کی نوبت بھی نہ آتی۔ سیاست میں تمام امکانات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان کامیابی کی امید میں غلطیاں کرنے کے بجائے ناکامی پر نظر رکھتے ہوئے صحیح قدم اٹھاتا رہے۔ اگر انتخابات کے بغیر تحریک کا جوش برقرار رہتا اور وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہ ہو سکتی تھی۔ اس طرح ہر چیز خود بخود ہوتی چلی جاتی۔ لیکن صورت حال اس کے برعکس تھی۔ "پرامن" تحریک اپوزیشن کی بے نظمی اور حکومت کی، خصوصاً نوکر شاہی کی کوششوں سے تشدد کا رنگ اختیار کرنے لگی اور اس تشدد کو حکومت کے ساتھ ساتھ اپوزیشن نے خوب اچھالا اور یوں مارشل لاء کو ناگزیر بنا دیا۔ کیا اپوزیشن کے ترکش میں کوئی اور تیر نہ تھا جسے پھینکا جا سکتا یا بائیکاٹ کا تیر آخری تیر تھا۔ یہ تیر چلا کر کیا حاصل ہوا؟ امن آہستہ آہستہ تشدد میں ڈھل گیا۔ اس سے حکومت تو بدل گئی لیکن مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ صرف انتخابات ہی پرامن تحریک کو اس قابل بنا سکتے تھے کہ فوجی مداخلت کے بغیر حکومت بدل جائے۔ اگر اپوزیشن اب انتخابات کی طرف رخ کرے گی تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ حزب اختلاف اب اپنی غفلت مٹا رہی ہے۔ انتخابات کے بائیکاٹ کے نتیجے میں اپوزیشن کی صفوں میں انتشار گہرا ہوتا گیا۔ ایوب حکومت نے اپوزیشن کے ایک حصے سے گفتگو کا ڈول ڈال کر بقیہ حصے سے اس کو دور کر دیا اور یوں وہ اتحاد جس کی علمبرداری کا دعویٰ حزب اختلاف کے سب لیڈروں کو تھا خود ان کے ہاتھوں سے پارہ پارہ ہو گیا۔

عوامی جدوجہد کے آخری دنوں میں ایوب خان کے لئے صرف پانچ متبادل راستے باقی رہ گئے تھے۔

1۔ رضاکارانہ طور پر خود ہی دست بردار ہو جائے۔

2۔ سپریم کمانڈر کی حیثیت سے فوج کی پناہ میں چلا جائے

3۔ مارشل لاء نافذ کر کے خود ایک طرف ہو جائے۔

4۔ حزب اختلاف سے کوئی معاہدہ کئے بغیر اہم مطالبات کو تسلیم کر کے اپنے نظام اور انتظامیہ کو پھر سے فعال بنا لے۔

5۔ حزب اختلاف کے ایک حصے سے سودے بازی کر کے ساز باز کر لے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی چھٹکارا نہیں تھا۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس سے پیشتر کہ مارچ کا مہینہ بھی گزر جائے اس کو فیصلہ کن انداز میں عمل کرنا تھا اور خطرات مول لینے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ جوں جوں حالات ابتر ہوتے چلے جائیں گے، سول سروس اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لئے اس کو حزب اختلاف کے ایک گروہ سے تبادلۂ خیالات کرنے کا مشورہ دے گی۔ کیونکہ وہ رضاکارانہ طور پر ایک طرف ہٹ جانے میں پس و پیش کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ایک اور فوجی انقلاب اس کے لئے نقصان دہ

www.bhutto.org

بھی ہو سکتا تھا کیونکہ تاریخ کبھی کبھی اپنے آپ کو دہراتی بھی ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ یہ سوچے کہ سکندر مرزا اور اس میں بہت فرق ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا بھی وہی حشر ہو جو سکندر مرزا کا ہوا تھا۔ لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کی چھٹی حس اسے یہ اقدام کرنے سے باز رکھے گی۔ وہ اہم مطالبات تسلیم کرنے کے طریقے پر عمل کر رہا تھا مثلاً یونیورسٹی آرڈی ننس کی تنسیخ کر دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عوام کو خوش کرنے کے لئے اور بھی اقدام کرتا۔ لیکن اب پانی سر سے گزر گیا تھا۔ نظام میں جزوی تبدیلیاں پیدا کر کے بحران پر قابو پانے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔

حقیقتاً ایوب خان کے لئے اب صرف دو راستے باقی رہ گئے تھے یا تو مارشل لاء نافذ کرے یا پھر سیاست دانوں سے ساز باز کرے۔ فوج کو حکومت کی باگ ڈور دے دینا آسان تھا۔ لیکن پھر بہت ہی کم عرصے میں' زیادہ سے زیادہ دو سال کے عرصے میں' بحران اس قدر شدت بھی اختیار کر سکتا تھا کہ پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔ موجودہ حالات میں مارشل لاء کی نوعیت ایک عبوری حکومت ہی کی ہو سکتی تھی۔ ایوب خان کا ذاتی مفاد اسی میں تھا کہ حزب اختلاف سے تبادلۂ خیالات کیا جائے لیکن کیا پاکستان کا مفاد بھی اس میں تھا کہ حزب اختلاف ایوب خان سے تبادلۂ خیالات میں شرکت کرے۔ اگر تمام حزب اختلاف حکومت کے ساتھ گفت و شنید کے لئے تیار ہو جاتی تو ضرورت ہوتی کہ عوامی تحریک کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ اگر تبادلۂ خیالات معاہدے کی شکل اختیار نہ کرتا تو حزب اختلاف اس قابل نہ ہوتی کہ دوبارہ تحریک کی طرف واپس آ جائے یا انتخابات کا راستہ اختیار کرے۔ پھر صدر ایوب خاں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والی اپوزیشن کے لئے مشکل ہو جاتا کہ تحریک کو دوبارہ زندہ کر سکے یا فوری طور پر انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر سکے۔ انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے حزب اختلاف نے اپنے لئے اور کوئی متبادل راستہ نہ چھوڑا جس پر وہ چل سکتی۔ اگر

حزب اختلاف نے اپنے لئے انتخابات کے دروازے بند نہ کئے ہوتے تو حکومت کے ساتھ مذاکرات میں اس کی حیثیت بہت مضبوط ہوتی۔ ان حالات میں مذاکرات پر "فیصلہ کن" کی مہر نہ لگ سکتی بلکہ انتخابات حکومت کے لئے ایک متبادل دھمکی ہوتے۔ حکومت ایک مخمصے میں پڑی رہتی اور حزب اختلاف کے پاس دفاع کی دوسری لائن تیار ہوتی۔ اگر انتخابات کے بغیر ہی عوامی تحریک کامیاب ہو جاتی تو بہت اچھا ہوتا اگر ایسا نہیں ہوتا اور انتخابات حکومت کے لئے ایک اور دھمکی ہوتے ہیں جن کی بنا پر ایک تازہ تحریک جنم لیتی ہے جسے انتخابی مہم کہا جاتا ہے اور پہلی تحریک اور انتخابی مہم مل کر حکومت کو بدل دیتی ہیں۔ اب اگر عوامی تحریک ناکام ہو جاتی تو یا تو حزب اختلاف اس پر صرف آنسو بہاتی رہتی یا پھر اس کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑتے اور انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنا پڑتا اور ہر چیز از سر نو شروع ہوتی۔ لیکن عوام کے جذبے کو ایک مرتبہ تھپک کر سلا دینے کے بعد فوری طور پر جگانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

حزب اختلاف کے ان رہنماؤں نے ڈھاکہ میں اکٹھے ہوئے گھوڑے کو تانگے کے آگے جوتنے

www.bhutto.org

کے بجائے پیچھے جوت ڈالا تھا۔ اگر وہ انتخابات میں حصے لینے کا فیصلہ کرتے تو لوگوں کو بہت حوصلہ افزائی ہوتی اور عوامی تحریک کو بے حد تقویت ملتی۔ انتہا پسند حضرات کے اس خیال کو اہمیت دینا زیادتی ہوگی کہ جمہوری مجلس عمل نے یہ فیصلہ عالمی طاقتوں کی باہمی صلح صفائی سے متاثر ہو کر کیا تھا۔ تحریک کے ساتھ بائیکاٹ کا بھاری پتھر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک آگے نہ بڑھی اب اگر اپوزیشن اس نکتے کو پا بھی جائے اور بائیکاٹ کا فیصلہ بدل کر انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنا چاہئے تو یہ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے بیچ منجدھار کوئی شخص چاہے کہ کشتیاں بدل لے۔ شروع سے ہی راہ عمل کا تعین صحیح ہونا چاہئے تھا۔ بنیادی غلطیوں سے قومی بحران پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ حالات ایسا رخ اختیار کر رہے تھے کہ ان کے پیش نظر انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کو بائیکاٹ کے فیصلے میں بدلا جا سکتا تھا۔ انتخابی مہم کے ذریعے ایک متبادل قیادت اور پروگرام پیش کر کے حکومت کو کمزور کر دینے کے بعد عوامی تحریک کے حق میں انتخابات کا بائیکاٹ کیا جا سکتا تھا۔ 1964ء میں جب انتخابات بالکل قریب آ گئے تو ان کے بائیکاٹ کے اعلان کے خطرے نے حکومت کو اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ پولنگ سٹیشنوں پر فوج طلب کر لی گئی تھی۔ منطقی تقاضا یہی تھا کہ انتخابات میں حصے لینے کا فیصلہ کیا جاتا تاکہ تحریک میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی اور جدوجہد میں جوش پیدا ہو جاتا۔ بائیکاٹ کے فیصلے کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کی طرف واپس آنا اس کے مقابلے میں بہت مشکل تھا کہ انتخابات میں حصے لینے کا اعلان کرنے کے بعد بائیکاٹ کیا جاتا۔

متحدہ حزب اختلاف کی پُرزور مہم سے یا تو حکومت کو ہلایا جا سکتا ہے یا پھر اس کی تبدیلی کے امکانات کو روشن کیا جا سکتا ہے سوال یہ ہے کہ کیا حزب اختلاف حکومت کی تبدیلی چاہتی ہے یا صرف مراعات چاہتی ہے۔ اگر وہ واقعی تبدیلی چاہتی ہے تو وہ انتخابات سے نہیں بچ سکتی۔ ہاں اگر وہ صرف مراعات کی خواہش مند ہے تو پھر اس کا بائیکاٹ کا فیصلہ ٹھیک ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی حکومت کی تبدیلی چاہتی ہے نہ کہ مراعات۔ یہ یقینی امر ہے کہ موجودہ نظام چند مراعات سے نہیں بدلا جا سکتا۔ قومی زندگی کو گول مول باتوں سے بحال نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کو زندگی کا رس اور مستقبل کی امید عطا کرنے کے لئے ایک نئی قیادت کی ضرورت ہے جو موجودہ فرسودہ نظام کو بدل کر رکھ دے۔

پاکستان پیپلز پارٹی جو ایک ایسی انقلابی پارٹی ہے جس کے مطمح نظر ایک رواں دواں مساوات ہے حال اور مستقبل کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ یہ رابطہ اسی طرح استوار ہو سکتا ہے کہ ایک مثبت تبدیلی وجود میں آئے۔ انتخابات ایسی تبدیلی کا بہترین ذریعہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے خلائی باتیں کرنے کی بجائے انتخابات میں حصہ لینے کا ٹھوس فیصلہ کیا۔ مئی 1968ء میں ہی پارٹی نے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہمیں انتخابات کا طریقہ کار پسند نہ تھا اور یہ طریقہ دشمن کا ایک ہتھیار تھا۔ لیکن ہم دشمن کے ہتھیاروں سے خوف زدہ نہ تھے۔ ہم انتخابات کو جیتنے یا ہارنے کی نظر سے نہ دیکھتے تھے اور نہ دیکھتے ہیں۔ بلکہ ہم انتخابات کے ذریعے عوام کو تربیت دینا چاہتے تھے۔ ان

www.bhutto.org

کے جائز حقوق کا احساس دلانا چاہتے تھے اور ایک ایسی مہم جاری کرنا چاہتے تھے جس کے ذریعے آمریت کے قلعے کو مسمار کیا جاسکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے عوام کی خاطر ایک طویل جدوجہد کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ عوامی فتح حاصل کرنے کی راہ نہایت پیچ دار ہے جو کہ ایک انتخاب یا ایک تحریک پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ مگر ہم اس بات کے قائل نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر پڑے رہیں کہ حالات ساز گار ہوں گے تو عوام کی خدمت کریں گے۔ ہم حالات کو خود پیدا کرتے ہیں۔ ہم اکھاڑے میں اس وقت داخل نہیں ہوتے جب ہمیں معلوم ہو کہ ہم پر کوئی نہیں چھپٹے گا۔ اگر ہم بھی کوتاہ اندیش اور موقع پرست ہوتے تو ہم نے ایک عوامی پارٹی بنائی ہی نہ ہوتی اور نہ ہم نے اپنے لئے مصائب کو دعوت دی ہوتی۔ ہم مخلصانہ یقین رکھتے تھے کہ اگر حزب اختلاف متحد ہو کر انتخابات میں سنجیدگی سے حصہ لیتی تو اس کیلئے ایوب حکومت کو تبدیل کر دینا کوئی مشکل نہ ہوتا اور یوں مارشل لاء کا خطرہ بھی ٹل جاتا۔

یہاں یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ پاکستان پیپلز پارٹی عوامی تحریک کے خلاف نہیں تھی۔ یہ کبھی بھی اس تحریک کے خلاف نہ ہو سکتی تھی جس کی ابتداء اس نے خود کی تھی۔ جس بات پر ہم زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ تھی کہ عوامی تحریک اور انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ دو متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کا زوج ہیں۔ تحریک آخر دم تک نہایت کامیاب رہی اس کے باوجود کہ انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اگر انتخابی مہم کو موقع دیا جاتا تو وہ عوامی تحریک کو ٹھوس راہ پر ڈال کر اس کو ثمر آور بنا دیتی۔ عوامی تحریک حکومت کو اسی لیے نہ بدل سکی کہ ہم نے اس کی گاڑی کو انتخابات کے پیچھے نہ لگائے۔ اپنے اس جداگانہ نقطہ نظر کے باوجود تحریک کو پاکستان پیپلز پارٹی کی مکمل حمایت حاصل رہی اور اس تحریک کے لئے جتنی قربانیاں اس پارٹی نے دیں دوسری تمام پارٹیوں کو مجموعی طور پر بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ بہت سے سیاست دان اپنے اپنے گوشہ ہائے تنہائی سے مشورہ دے رہے تھے کہ حکومت اور حزب اختلاف میں مصالحت ہو جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ حکومت خواہش مند ہو گی کہ حزب اختلاف میں موافق لوگوں کے ساتھ مصالحت کرانے کے لئے اس قسم کے لوگ دلالی کا کام کریں۔ اصل سوال یہ تھا کہ کیا حزب اختلاف کو چند مراعات پر مصالحت کر لینی چاہئے یا اس بات پر زور دینا چاہئے کہ ہمیں مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے؟

"مراعات" عوام کے حقوق سلب کرنے کے لئے ایک شاطرانہ لفظ ہے۔ عوام اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ کوئی خیرات نہیں طلب کرتے۔ حزب اختلاف میں جو عوامل حکومت کے ساتھ مذاکرات پر زور دے رہے تھے انہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے تھی قومی زندگی کو پیش آنے والے نقصانات اور فوائد کا ذمہ دار کون تھا اس کا فیصلہ مستقبل ہی کرے گا۔ لیکن ان عوامل کو اس معصوم خون کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے تھا جو ایک مقدس مقصد کی خاطر بہا تھا۔ مذاکرات سے پہلے

یہ شرائط پیش کی جانی چاہئیں تھیں کہ حکومت اپنی راست بازی کی وضاحت کرنے کے لئے ابتدائی قدم اٹھائے مثلاً مشرقی پاکستان کی لوٹ کھسوٹ ختم ہونی چاہئے اور ایک ظالمانہ نظام کے تحت اس کے ساتھ جو غلط سلوک کیا گیا ہے اس کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ ہر جگہ لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہے۔ قدم قدم پر عوام کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے۔ بلوچستان میں نہایت نازک صورت حال ہے۔ یہ بہت بڑی زیادتی ہے کہ مختلف علاقے کے لوگوں کی مشکلات کو محض تعصبات کی بنا پر نظرانداز کیا جائے۔ ماضی میں ہم نے اس طرح بہت نقصان اٹھایا ہے۔ پاکستان کے ہر حصے کو مسائل درپیش ہیں۔ ان تمام مسائل کا ہمدردانہ اور گہرا جائزہ لینا چاہئے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ پنجاب کو کوئی مشکل درپیش نہیں تو بحران کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکے گا۔ اگر تمام ملک کی طرح پنجاب بھی غیر مطمئن نہ ہوتا تو مغربی پاکستان میں مظاہروں کا مرکز کیوں بنتا۔ کراچی کو اب مزید اس بات کی سزا نہیں ملنی چاہئے کہ وہاں کے لوگوں نے ایوب خان کے خلاف ووٹ دیئے تھے۔ اس وسیع شہر کے اکثر لوگ کئی سال تک اس بات کی سزا بھگت چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے ووٹ کا آزادانہ استعمال کیوں کیا تھا۔ اسی طرح صوبہ سرحد کی مشکلات کو مخلصانہ جذبات اور عقل مندی سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مشکلات اس نظام حکومت کی دردناک وراثتیں ہیں۔ وہ حزب اختلاف جو حکومت کے ساتھ مذاکرات کر کے مسائل کا حل ڈھونڈنے نکلی تھی اسے دراصل ان مشکلات کا حل ڈھونڈنا چاہئے تھا۔ اس موقع پر ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اگر ایوب حکومت حزب اختلاف کے ایک گروہ سے مذاکرات کرتی ہے تو پاکستان پیپلز پارٹی اپنے آپ کو عوام کی آئندہ جدوجہد کے لئے تیار رکھے گی اور اس وقت تک جدوجہد کرتی رہے گی جب تک عوام اپنے مقدر کے حقیقی مختار نہیں بن جاتے۔ ہم حق بالغ رائے دہی کے ساتھ ساتھ تمام بنیادی حقوق کا مطالبہ کرتے رہیں گے جو کہ عوامی سطح پر غیر مشروط طور پر دیے جائیں نہ کہ سودے بازی کی صورت میں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا جزو ایمان ہے کہ کسی بھی صورت میں عوام کے ساتھ غداری نہ کی جائے۔ آج ہمارے عوام پہلے سے کہیں زیادہ ہوش مند ہیں لیکن وہ شریف النفس ہیں۔ ان کو ایسے پُرفریب پروپیگنڈے کے ذریعے طرح طرح کے گھسے پٹے نعروں سے' دھوکا دیا جا سکتا ہے کہ اس کے بارے میں ان کو آگاہ کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے انتخابات میں حصہ لینے کے متعلق پاکستان پیپلز پارٹی کے فیصلے کو پوری وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے تاکہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور وہ طرح طرح کے مغالطے رفع ہو جائیں جو عوام دشمن عناصر کی جانب سے پیپلز پارٹی کے بارے میں پھیلائے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عوام پر تحریک اور انتخابات کا رشتہ واضح ہو جائے۔

جنوری 1969ء

ترجمہ علی جعفر زیدی

www.bhutto.org

www.bhutto.org

مذاکرات

پاکستان پیپلز پارٹی ان مذاکرات میں شامل نہیں ہو رہی جو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان راولپنڈی میں ہونے والے ہیں۔ عوام مراعات نہیں چاہتے وہ حکومت کے ساتھ ساتھ نظام حکومت کو بھی بدلنا چاہتے ہیں۔ موجودہ صورت حال سے نبٹنے کے لئے انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مذاکرات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے۔ ہماری دعا ہے کہ جو لوگ مذاکرات میں شامل ہو رہے ہیں وہ اپنے خیال کے مطابق جمہوری حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

مذاکرات کی کامیابی کے لئے ہم کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں۔ ان تجاویز کی حیثیت مذاکرات میں ہماری شمولیت کی شرائط کی نہیں ہے۔ البتہ یہ تجاویز حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مذاکرے میں مدد دے سکتی ہیں۔ تجاویز حسب ذیل ہیں:

(1) حکومت اخبارات کی مکمل آزادی کا اعلان کرے اور قانونی تبدیلیاں عمل میں لانے سے پہلے جن کے ذریعے اخبارات کے متعلق سخت گیر قوانین واپس لئے جائیں اخبارات پر سے ہر طرح کی پابندیاں اٹھا لینے کا وعدہ کیا جائے۔

(2) صدر مملکت نے خود اعتراف کیا ہے کہ کم ترقی یافتہ علاقوں کے عوام کی شکایات دور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ گول میز کانفرنس کی سرکاری ٹیم میں ان علاقوں کے نمائندے بھی شامل ہیں اس لئے صدر مملکت کو متذکرہ علاقوں سے عوامی نمائندوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مدعو کرنا چاہئے۔

www.bhutto.org

(3) حکومت کو وعدہ کرنا چاہئے کہ وہ طلباء کے مسائل کے متعلق قوانین وضع کرنے سے پہلے طلباء کے تمام مطالبات اور مسائل کے متعلق طلباء کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کرے گی۔

(4) حکومت تمام سیاسی زعماء 'لیبر لیڈروں' کارکنوں اور طلبا کو جنہیں ابھی تک رہا نہیں کیا گیا یا حفاظتی قوانین کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا گیا ہے فوراً رہا کر دے۔

(5) حکومت اعلان کرے کہ جو افراد ہلاک ہوئے ان کے ورثاء کو مناسب خون بہا ادا کیا جائے اور عوامی جمہوریت میں جو افراد مجروح ہوئے انہیں بھی معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

(6) حکومت ہائی کورٹ کے کسی جج یا عدلیہ کے کسی اور اہم فرد کو مساجد کی بے حرمتی اور عوام پر پولیس اور انتظامیہ کے متشددانہ اقدامات کی آزاد تحقیقات کے لئے مقرر کرے۔

(7) گزشتہ نومبر کی 7 تاریخ کو راولپنڈی اور نوشہرہ میں جو پولیس فائرنگ ہوئی تھی اور جس کے بعد حکومت نے جبر و تشدد کی کارروائیاں شروع کر دیں ان کی آزادانہ تحقیقات کی جائے۔

(8) حکومت پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ منسوخ کرنے کا وعدہ کرے اور اس قانون کا نفاذ ختم کر دے۔

(9) سرکاری اراضی کو اراضی کی فروخت' سوا ان کسانوں کے جو زمینوں کے مالک نہیں ہیں یا جن کے لئے کم اراضی ہے باقی تمام افراد کے لئے بند کر دی جائے۔

(10) لیبر لیڈروں کے ساتھ مشورہ کر کے ٹریڈ یونینوں پر ہڑتالوں کی پابندی ختم کر دی جائے اور جو تنظیمیں ٹریڈ یونینوں کے اصولوں کے منافی ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔

1969ء

www.bhutto.org

ہمارے عہد کے سیاسی مسائل

سیاسی جماعتوں کی کانفرنس

بعض لیڈر اس پر خواہ مخواہ تنقید کر رہے ہیں اگرچہ چند بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ہو جائے تو جمہوریت کی بحالی کا راستہ بالکل صاف ہو جائے گا (1) پارلیمانی طرز حکومت (2) ایک یونٹ (3) آبادی کی بنیاد پر نمائندگی (4) وفاقی نظام اور (5) صوبائی خود مختاری۔ تمام لیڈر اس طرز حکومت پر متفق ہو چکے ہیں کیونکہ یہی وہ واحد طرز حکومت ہے جس میں مغربی اور مشرقی پاکستان کو مؤثر طور پر اقتدار میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ ایک یونٹ ملک کے تمام سرکردہ لیڈر اسے قائم نہ رکھنے پر اتفاق رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس لئے یہ بھی اب کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں بننا چاہئے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے لیڈر بھی سابق صوبوں کی بحالی پر زور دے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ایک یونٹ کا خاتمہ طے شدہ حقیقت بن گیا ہے۔

تمام سیاسی جماعتیں اور لیڈر "ایک شخص ایک ووٹ" کے اصول پر متفق ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس سوال کو بھی نزاع کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ بعض پہلو مشرقی پاکستان کے لئے خصوصیت کا درجہ رکھتے ہیں جبکہ مغربی پاکستان کے حالات کے بھی بعض خصوصی پہلو ہیں۔ اگر ایک یونٹ کے خاتمہ کے بعد مغربی پاکستان کے سابق صوبے بحال ہو گئے تو ظاہر ہے اسکے نتیجے میں وفاق کی صورت پیدا ہوگی۔ وفاق کا قدرتی تقاضا دو ایوانوں پر مشتمل پارلیمنٹ

www.bhutto.org

ہوتا ہے۔ ایوانِ زیریں میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ ایوانِ بالا میں وفاق میں شامل تمام یونٹ مساوی نمائندگی کے حقدار سمجھے جاتے ہیں۔ اہم اُمور کے تصفیہ کے لئے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا جاتا ہے تاہم اس سوال پر بھی باہمی افہام و تفہیم سے تصفیہ کی صورت نکالی جاسکتی ہے۔

دنیا کے تمام دوسرے ملکوں میں تمام سیاسی جماعتیں گفت و شنید کے ذریعے مرکز اور صوبوں کے اختیارات کا تعین کرتی ہیں۔ اصل مقصد یہ ہے کہ مرکز اور صوبوں میں تلخی اور کشیدگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور یہ تاثر جیسا کہ عام طور پر ہماری سیاسیات میں پایا جاتا ہے ختم ہو جانا چاہیے کہ مرکز صوبائی معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مرکز اور صوبوں میں اعتماد اور خیر سگالی کی فضا پائی جائے۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات کے سلسلہ میں "مضبوط مرکز" کی بجائے "موثر اور باصلاحیت مرکز" کی ضرورت ہے۔ "موثر اور باصلاحیت مرکز" سے میری مراد یہ ہے کہ ایسا مرکز جو ملک کو بحران سے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ مضبوط مرکز کی اصلاح سے مراد ڈکٹیٹر شپ لی جاتی ہے کیونکہ ایوب خاں نے اپنے گیارہ سالہ دور آمریت کے دوران صوبوں کی "انفرادیت" اور "شخصیت" کو ختم کر کے رکھ دیا تھا اس لئے مضبوط مرکز کا تصور بدلتے ہوئے حالات میں تبدیلی کا متقضی ہے۔

میں نے اس قسم کی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کر کے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اختلافی مسائل کو مل بیٹھ کر طے کر لیں اور دنیا پر یہ ثابت کر دیں کہ ہم ایک سنجیدہ اور باوقار قوم ہیں اور اپنے مسائل خود حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس سوال پر کہ وہ مجوزہ کانفرنس بلانے کے سلسلہ میں خود پہل کیوں نہیں کرتے، پیپلز پارٹی کے لیڈر نے جواب دیا کہ دوسرے سیاست دان خواہ مخواہ اس سلسلے میں میرے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور رکاوٹ ڈالتے ہیں تاہم کونسل مسلم لیگ کے ممتاز لیڈر سردار شوکت حیات خان نے ایسی کانفرنس بلانے پر زور دیا ہے۔ میں سردار صاحب سے ملوں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس سلسلے میں مزید کیا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

استصواب کی حمایت

اگر سیاسی جماعتوں میں آئین کے متعلق چار پانچ بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ ہو جائے تو اس کے بعد اس پر استصواب کے ذریعے عوام کی مرضی معلوم کی جاسکتی ہے۔ استصواب نہایت ٹھوس جمہوری طریقہ ہے اور مغربی ملکوں میں جنہیں مساوات، انصاف اور جمہوریت کا علمبردار سمجھا جاتا ہے عوام کی مرضی معلوم کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں فرانس کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس سوال پر کہ جب آپ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ تمام سیاسی جماعتیں آئین کے چند بنیادی اصولوں پر متفق ہو جائیں تو پھر استصواب کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے، مسٹر بھٹو نے جواب دیا، عوام کی رائے لینا بھی ضروری ہے، اس سے آئینی سمجھوتہ کو دوہری تائید حاصل ہو جائے گی۔ ایک سیاسی جماعتوں اور دوسری عوام کی۔

اگر ہم استصواب کا طریقہ قبول نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں مارشل لاء رہے گا جبکہ ہم مارشل لاء سے جمہوریت کی طرف لوٹ آنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی متبادل راستہ نہیں آتا سوائے اس کے کہ ملک میں نہ جمہوریت ہو، نہ انتخابات ہوں اور نہ آئین بنے۔ میں ایک سیاسی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے یہ چاہتا ہوں کہ انتخابات جلد ہوں لیکن جب انتخابات سے قبل آئین بنتا ہے اور انتخابی فہرستیں بھی تیار ہوتی ہیں، حلقہ بندی بھی ہوتی ہے تو یہ اندازہ لگانا حکومت کا کام ہے کہ اس میں کیا انتظامی مشکلات درپیش ہونگی۔ اور اس میں کتنا عرصہ لگے گا۔ اگر صدر یحییٰ یہ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سال کا عرصہ لگے گا تو ان کا اندازہ ٹھیک ہی ہو گا۔

سیاسی جماعتوں سے اتحاد

اتحاد کی باتیں پیش از وقت ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت اس کی ضرورت بھی نہیں تاہم انتخابات کے وقت اس کے امکانات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ مجھے ابھی اپنی پارٹی کو منظم کرنا ہے عوام سے اپنے منشور کی مقبولیت اور حمایت حاصل کرنی ہے' اس لئے اتحاد کی باتیں پیش از وقت ہیں۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے بلاوجہ مجھ پر ذاتی حملے کئے ہیں۔ میں بھی ان پر ذاتی حملے کر سکتا ہوں سیاسی لیڈروں کو جن میں بزرگ سیاست دان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملکی سیاسیات کے نئے رجحانات کو سمجھنا چاہئے اور دوسروں کو یہ حق دینا چاہئے کہ وہ بھی اپنی بات عوام تک پہنچا سکیں۔ اس کے علاوہ جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنا کام کریں اور ہم اپنا کام کریں۔ پاکستان ڈیمو کریٹک پارٹی نے اپنا منشور ہمارے اصولوں کے مطابق تیار کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اپنے منشور کو عوام سے کیا گیا وعدہ تصور کرتی ہے اور ہم اپنے منشور پر عملدرآمد کی اہلیت بھی رکھتے ہیں جبکہ ڈیمو کریٹک نے محض انتخابی سٹنٹ کے طور پر اسے تیار کیا ہے اور وہ اس پر عملدرآمد کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

جماعت اسلامی کے نظریات کا احترام

جماعت اسلامی نے نئے رجحانات اور تقاضوں کو تسلیم کر لیا ہے اب وہ بھی وہی بات کرتے ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔ میں جماعت اسلامی والوں کا احترام کرتا ہوں کیونکہ ان کا اپنا نظریہ تو ہے۔

سوشلزم اور اشتراکیت

ہمارے سوشلزم کا مقصد اشتراکیت کو روکنا ہے اگر ہم نے اقتصادی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے موجودہ نظام کو بدلنے کی طرف توجہ نہ دی تو کمیونزم کو اس ملک میں روکنا ممکن نہیں ہو گا۔ کمیونزم کو روکنے کا واحد طریقہ اسلامی سوشلزم ہے۔ نظریہ پاکستان کی حفاظت اور اسلام کی خدمت کے لئے مساوات کے اس نظام کو بروئے کار لانا ضروری ہے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اسلام میں جمہوریت

www.bhutto.org

اور مساوات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر جمہوریت کے لئے "ڈیمو کریسی" کے انگریزی لفظ پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں تو مساوات کے لئے "سوشلزم" کے لفظ پر کیوں اعتراض ہونا چاہیے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اگر سوشلزم اسلام کے خلاف ہوتا تو ہم نہ صرف اس کی تائید نہ کرتے بلکہ اس کی مخالفت کرتے' کیا قائد اعظم نے اسلامی سوشلزم پر زور نہیں دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھاشانی اور مجیب بھی سوشلزم چاہتے ہیں۔ سکارنو اور ناصر نے بھی سوشلزم کو اپنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان لوگوں نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے؟ سہگل اور اس کے کارخانہ میں کام کرنے والے مزدور کو محض بھائی بھائی کہہ دینے سے مساوات نہیں ہو جاتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں کو اپنے اپنے جائز حق ملیں۔ مزدور کو طبی سہولتیں حاصل ہوں۔ اس کے بچوں کو تعلیم کے مواقع ملیں' اسے رہنے کے لئے مکان میسر ہو اور اسے اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ ملے۔

مسئلہ کشمیر

بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنے باپ کی طرح پاکستان سے تعلقات کو معمول پر لانے کا جو ڈھونگ رچایا تھا' یحییٰ خاں نے اس کا درست اور صحیح جواب دے دیا ہے۔ بھارت نے ہمارے علاقوں پر غاصبانہ قبضہ جمار کھا ہے، مشرقی پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنے کے اقدامات کر رہا ہے۔ جب کہ اندرا گاندھی امریکہ اور روس کو یہ دکھانے کے لئے صدر یحییٰ کو خط لکھ رہی ہیں کہ بھارت تو پاکستان سے دوستانہ تعلقات چاہتا ہے لیکن پاکستان نہیں مانتا۔ سابق صدر ایوب خاں کے اس انداز فکر کو غلط اور ملک کے لئے نقصان دہ قرار دیا کہ مسئلہ کشمیر پر بامقصد اور بامعنی بات چیت ہونی چاہیے اور یہ کہ مسئلہ کشمیر کا "منصفانہ حل" تلاش کیا جائے۔ کہ ان اصطلاحات کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان حق خود اختیاری کے علاوہ بھی کوئی حل قبول کرنے کو تیار ہے۔ ہمارا موقف اور اصول یہی ہے اور یہی رہنا چاہئے کہ مسئلہ کشمیر کا ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ ہے حق خود اختیاری۔ ہمارا یہ اصول دراصل ہماری طلب ہے اگر ہم نے کوئی دوسرا تاثر لیا تو دنیا یہ سمجھے گی کہ ہم اپنے اصول سے ہٹ گئے ہیں' اور اصولوں سے ہٹنے والی قوم کی کوئی امداد نہیں کرتا۔ بھارت بار بار کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دے کر بات چیت سے پہلے اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کی کوشش کرتا ہے جب کہ پاکستان بامعنی اور بامقصد بات چیت کی رٹ لگا کر اپنی پوزیشن کمزور بنا رہا ہے۔

صدر نکسن کا دورہ

صدر نکسن کے دورۂ ایشیا کا اصل مقصد یہ معلوم کرتا ہے کہ ویت نام کی جنگ ختم ہونے کے بعد ایشیا میں امریکہ کی پالیسی میں زبردست تبدیلی آئے گی۔ اب اس تبدیلی کا وقت آ چکا ہے۔ نئی پالیسی کے تحت امریکہ اب ایشیا کی سرزمین پر اپنی فوجوں کو Commit نہیں کرے گا۔ کیونکہ ویت نام کی جنگ

سے اس نے یہی سبق حاصل کیا ہے۔ اب وہ ایشیائی ملکوں سے یہ کہیں گے کہ آپ اپنی سلامتی کی ذمہ داری خود سنبھالیں ہم صرف آپ کی مدد کریں گے کہ اگر ہماری سلامتی ہماری اپنی ذمہ داری ہے تو ہمیں باہر کے لوگوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بھی مداخلت کے مترادف ہے۔ ہم اپنے مفادات سے پوری طرح آگاہ ہیں یہ بات کسی طرح جائز نہیں کہ غیر ایشیائی طاقتیں ہمیں یہ بتائیں کہ ہمارے مفادات کیا ہیں۔ یہ طرز عمل نہ صرف ہمارے معاملات میں مداخلت کے برابر ہے بلکہ نئی نو آبادیاتی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

بھارت ' پاکستان اور افغانستان کا اقتصادی تعاون۔ پاکستان ' ایران اور ترکی میں علاقائی تعاون کا سلسلہ موجود ہے۔ افغانستان کو ہم نے راہداری کی سہولتیں بھی دے رکھی ہیں۔ افغانستان چاہے تو اس سے ہم تعاون بڑھانے کو تیار ہیں لیکن بھارت کے ساتھ اقتصادی تعاون کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا ' جب کہ اس کے ساتھ ہمارے بنیادی جھگڑے ہی ابھی طے نہیں ہوئے۔ 1949ء میں بھارت کی طرف سے اقتصادی بائیکاٹ کے بعد ہی پاکستان نے اقتصادی میدان میں ترقی کی جانب موثر قدم بڑھایا تھا۔ اگر آزادی کے بعد بھارت کے ساتھ ہمارا اقتصادی تعاون ہوتا تو آج ہم برلا اور ٹاٹا کے طفیلی ملک ہوتے۔ اس کے علاوہ ابھی ہم ترقی کی اس منزل پر نہیں پہنچ سکے جہاں معیشت کو مربوط بنانے کی خاطر دوسرے ہم پلہ ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل بڑھایا جائے۔ اس تجویز سے یہی حاصل ہو گا کہ بھارت کو افغانستان اور پاکستان پر اقتصادی غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

نوائے وقت : 13 ر اگست 1969ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

آٹھواں حصہ

عظیم المیہ

www.bhutto.org

www.bhutto.org

مشرقی پاکستان کی صورت حال

انتشار پسند اور علیحدگی پسند کون ہیں؟

دن بدن پاکستان کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ لوگوں کی غالب اکثریت جو تنخواہ داروں، کارکنوں، مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے، آج ہمیشہ سے زیادہ غریب ہو چکی ہے۔ ارباب اقتدار نے ان کی مادی بہبود کو اس لئے نظرانداز کیا ہے تاکہ امیر امیر تر ہوتے چلے جائیں۔ انہوں نے لوگوں کو ان حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے جو آزاد انسانوں کی حیثیت سے انہیں حاصل ہیں۔ پریس اور ریڈیو پر تو زبردست قبضہ تھا ہی، عوام کی شکایات کا گلا بھی گھونٹا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرقی بازو کے لوگوں کو یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ مغربی بازو کے مصیبت زدہ عوام کس دردناک حالت سے دوچار ہیں۔

جہاں موجودہ اقتصادی اور سماجی پالیسی نے ملک بھر کے لوگوں کو شدید نقصان پہنچایا ہے وہاں موجودہ سیاسی پالیسی خصوصاً سیاسی رائے کے اظہار کو دبانے کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دونوں بازوؤں کے لوگوں میں کھچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک شدید بحران کا لمحہ آپہنچا ہے۔

ارباب اقتدار یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ فساد کی جڑ، بقول ان کے "انتشار پسند" اور "علیحدگی پسند" ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ملامت آمیز انداز گفتگو کے مطابق وہ تمام لوگ، جو ارباب اقتدار اور ان کے سرمایہ دارانہ مفادات کے مخالف ہیں، انتشار پسند ہیں۔ اس لئے آپ اور میں اور ہم سب جو یہ آرزو رکھتے ہیں کہ بددیانتی، لوٹ کھسوٹ اور استبداد کا خاتمہ کیا جائے وہ انتشار پسند ہیں۔ جہاں تک علیحدگی پسندوں کا تعلق ہے مشرقی پاکستانیوں کے سوا اور کس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے؟ ہم میں سے جو لوگ

www.bhutto.org

مغربی پاکستان میں رہتے ہیں انہیں علیحدگی پسند کہنا محال ہے۔ سوائے اس کے کہ ہمارے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم راولپنڈی .... سے علیحدگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ارباب اقتدار نے "علیحدگی پسند" کی جداگانہ گالی کو مشرقی پاکستانیوں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ جو الفاظ وہ خود استعمال کر رہے ہیں، وہ ان کے اصل رنگ روپ کے غماز ہیں، کیونکہ وہ خود ہی کچھ ہیں جس کا الزام دوسروں پر دھرتے ہیں

پاکستان ایک قوم ہے 'ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ جغرافیائی تقسیم قوم کو تقسیم نہیں کر سکتی۔ اس کے کسی حصے کو کسی دوسرے حصے پر فوقیت حاصل نہیں، کیونکہ سب برابر ہیں۔ پورا پاکستان ایک ہی وقت' ایک ہی سانچے میں 'ایک ہی مرتبہ ڈھالا گیا تھا۔ اس کے کسی جغرافیائی حصے کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں سے الگ ہو کر پاکستان کا نام اختیار کر سکے۔ دونوں بازوؤں کے لوگوں نے آزادی کی خاطر' پاکستان کی خاطر ایک ساتھ دکھ اٹھائے اور قربانیاں دی تھیں۔ اگر مغربی پاکستان کو تقسیم کے غیر منصفانہ انتظامات کے ہاتھوں وسیع علاقوں سے محروم ہونا پڑا تو یہی مشرقی پاکستان کے ساتھ ہوا۔ ان کے تمام بنیادی مفادات ایک ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ دونوں کے درمیان غلط فہمی جڑ پکڑنے لگ گئی ہے؟

یہ وطن عزیز کی بدقسمتی رہی ہے کہ فیصلہ کن لمحات میں' عوام سے بالا بالا طاقت محض چند لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہی۔ جن میں سے چند ایک یقینی طور پر غیر ملکی اثر کے تابع تھے۔ پھر اقتصادی پالیسی کو ایسے خطوط پر وضع کیا گیا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان عدم مساوات بڑھتی چلی گئی۔ ان رجحانات کو جنم دینا نہایت دور رس غلطی تھی۔ اس سیاسی اور اقتصادی پالیسی کے لازمی نتیجے کے طور پر بہت جلد طرح طرح کے خود غرضانہ مفادات ابھر آئے اور کھل کھیلے۔ ان مفادات کو من مانی کرنے کی ایسی کھلی چھٹی ملی کہ پہلے کبھی نہ ملی تھی۔ نتیجہ تنزل کی وہ حالت ہے جو آج سارے پاکستان پر طاری ہے۔

لوٹ کھسوٹ کے اس نظام کے خود غرضانہ مفادات نے جنہیں ارباب اقتدار "آزادانہ لین دین" کا نام دیتے ہیں اس وقت پوری قوم کے استحصال کے لئے اور بھی پر پرزے نکالے جب ان کی لگامیں تو ڈھیلی چھوڑ دی گئیں لیکن احتجاج کرنے والی زبانوں پر سختی کے ساتھ تالے لگا دیئے گئے اور پھر یوں ہوا کو مشرقی پاکستان کے خزانے ان مفادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ارباب اقتدار اور ان مفادات سے فیض اٹھانے والوں کو اپنی تائید کرنے والے چند مشرقی پاکستانی مل گئے جو نہ صرف ان کی وکالت کرتے ہیں بلکہ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے معاملات میں ان کے انتہائی سرگرم پیرو ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بدقسمت عوام بھی اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کی نسبت کوئی اچھے حالوں نہیں رہے۔ خبروں کی تشہیر پر جو کڑے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور مخالف جماعتوں کی جو مؤثر ناکہ بندی کر رکھی ہے اس کے باعث دونوں بازوؤں کے لوگ ملک کی اصل حالت سے بے خبر رہتے ہیں۔

جو اقتصادی اور سیاسی مسائل پاکستان کو درپیش ہیں وہ بنیادی طور پر دونوں بازوؤں کے لئے یکساں ہیں۔ یہ مسائل اقتصادی اور سماجی انصاف اور سیاسی حقوق سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود غرضانہ

مفادات کی کار فرمائی نے صورت حال کو مسخ کر دیا ہے۔ اس پر پاکستان کے دونوں حصوں کی جغرافیائی دوری نے مزید ستم ڈھایا ہے۔ چنانچہ بعض ایسے پیچیدہ حالات پیدا ہو گئے ہیں جو مشرقی پاکستان سے مخصوص ہیں اور جن کی شدت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان کا فوری اور بھرپور حل تلاش کیا جائے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی حقیقی ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ سوشلسٹ خطوط پر ٹھوس اقتصادی اصلاحات جاری کی جائیں اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو مکمل جمہوری آزادی سے بہرہ ور کیا جائے۔ دوسری صورت میں حالات اتنے بگڑ جائیں گے کہ جلد ہی یہ نوبت آ جائے گی کہ اتحاد کو قائم رکھنے میں دشواری ہوگی۔ پھر دونوں بازوؤں کو اپنی اپنی جگہ ایک سی مصیبت کا سامنا ہو گا۔

کچھ عرصے سے ارباب اقتدار اور ان کے حاشیہ بردار دونوں بازوؤں کے درمیان عدم مساوات کے خاتمے کی باتیں کر رہے ہیں تاکہ کسی طرح عوام کو اصل بات کا پتہ نہ چلے۔ یہ تو ان کی باتوں اور تجویزوں ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اس ضمن میں کوئی مؤثر قدم اٹھانے کی نیت نہیں رکھتے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ سرکاری پراپیگنڈہ عدم مساوات کے جس نام نہاد خاتمے کو ایک کارنامے کے طور پر اچھال رہا ہے اس کی حقیقت محض اتنی ہے کہ جس شرح سے عدم مساوات بڑھ رہی ہے اس میں ایک ذرا سی کمی واقع ہو گئی ہے۔ اگر جو اعداد و شمار پیش کئے جا رہے ہیں ان میں کچھ صداقت ہے تو ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر عدم مساوات کم نہیں ہو رہی بڑھ ہی رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کی ضروریات کی جانب خصوصی توجہ دینے کا جو اعلان کیا جا رہا ہے اس کا کیسا حسین نتیجہ مرتب ہو رہا ہے؟ مشرقی پاکستان کو ملنے والی چھوٹی چھوٹی رقموں پر کچھ اس انداز سے داد طلب کی جاتی ہے گویا یہ رقمیں عوام کی دولت کا حصہ نہ ہوں بلکہ وزیروں اور انکے حاشیہ برداروں اور لوٹ کھسوٹ مچانے والے امیروں کی جیبوں سے نکلی ہوں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ مظلوم، عوام کے مطالبات پورا کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن اس کے برعکس یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مٹھی بھر مشرقی پاکستانیوں کی خوشنودی حاصل کر اور اپنے ان چہیتوں پر ان کارخانوں اور کاروباروں کو نچھاور کیا جا رہا ہے جو در اصل قوم کی ملکیت ہیں۔ اس پالیسی کو اکھاڑ پچھاڑ کی پالیسی کہنا چاہئے اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں غرض مندانہ مفادات کی ایک ایسی تنظیم کھڑی کر دی جائے جو ایک طرف خود بھی کچھ لوٹ کھسوٹ کرے اور دوسری طرف ان قوی تر مفادات کا ساتھ دے جو پوری قوم کو لوٹ کھسوٹ رہے اور تباہ کر رہے ہیں۔ اکھاڑ پچھاڑ سے دولت نہیں پیدا ہوتی، اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ دولت عوام کے ہاتھوں اور اختیار سے نکل کر چند مخصوص افراد کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ ایسے افراد کے پاس جنھوں نے ان پھولے پھلے کاروباروں کی آبیاری میں تنکا بھی نہیں توڑا ہوتا جو انہیں تحفے کے طور پر عطا کر دیئے جاتے ہیں۔ ان دھوکا دھڑی کے سودوں میں ظاہر ہے کہ بے ایمانی اور سفلہ پن کے سر سرا رہتا ہے اور بد دیانتی کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔

نہ تو موجودہ پالیسی کے نتیجے میں خوش حالی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ یہ پالیسی ساز قومی وحدت کا تحفظ کر

www.bhutto.org

سکتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے آپ کو اپنے انگریز آقاؤں کے گدی نشین سمجھتے ہیں اور جنہیں یہ گمان ہے کہ وہ اونچی جاتی میں پیدا ہوئے ہیں تاکہ نیچ لوگوں پر حکومت کریں۔ انہوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے مقولے کو دل و جان سے اپنا رکھا ہے۔ انتشار پسندوں اور علیحدگی پسندوں کے بارے میں ان کا پراپیگنڈہ اسی مقولے پر مبنی ہے۔ ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ کہیں ان کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔

ہمارا فرض ہے کہ حقائق کو ٹھیک سمجھیں اور جان لیں کہ پاکستان کے عوام میں نفاق کا بیج بونے والے دراصل کون ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ قوم کی سالمیت کا تحفظ کریں اور دونوں بازوؤں کے عوام کے درمیان کھچاؤ بڑھانے والے ہر اقدام کا مقابلہ کریں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ لوٹ کھسوٹ کے نظام کا خاتمہ ہو جائے اور ملک میں جمہوری سوشلزم کا دور دورہ ہو جائے۔

1968ء

www.bhutto.org

نواں حصہ

تیسری دنیا

www.bhutto.org

www.bhutto.org

تیسری دنیا کے افلاس زدہ عوام

آج بین الاقوامی سطح پر انسانی امور میں اصل مسئلہ غریبوں اور امیروں کے درمیان تقسیم کا ہے ایک طرف تو لکڑیاں کاٹنے والے اور مشکوں کے ذریعے پانی پہنچانے والے ہیں۔ اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہیں سیارے کے وسائل پر قدرت حاصل ہے اس تقسیم کی حقیقت کو جسے بعض اوقات شمال اور جنوب کی تقطیب کہا جاتا ہے پچھلے سال کی تبدیلیوں نے اجاگر کر دیا ہے۔

اس تقسیم کا ایک ناقابل عبور خلیج ہونا ضروری نہیں یہ ایک انوکھی صورت حال ہے جس کے ہم شاہد ہیں اور یہ اس کے سوا اور کسی بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ قوموں کے ان دو طبقوں کے درمیان ایک تخلیقی مکالمہ ہو۔ اس کا تقاضہ ہے کہ منصفانہ اقتصادی نظاموں کی تعمیر کے اسی عمل کو بین الاقوامی اصطلاحات کا جامہ پہنایا جاوے اور ان طبقاتی جھگڑوں کو طے کیا جائے جن میں شمال یا جنوب 'مشرق یا مغرب کی بہت سی قوموں کی قیادتیں اس وقت اپنے ملکوں میں الجھی ہوئی ہیں۔

مخالف سمت میں بہت سی علامتوں کے باوجود اس مکالمہ کو ابھی اس طریقہ اور اس قسم کے پلیٹ فارم سے شروع کرنا باقی ہے جو کسی قطعی نتیجہ تک پہنچائے اسے گڈمڈ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے چونکہ یہ ضابطہ سازیوں کے گورکھ دھندے میں پھنسا ہوا ہے اس لئے اسے یہ خطرہ لاحق ہے کہ لفاظی میں کہیں اس کا گلا گھونٹ نہ دیا جائے۔ اس سے بھی بد تر بات یہ ہے کہ اسے طاقت کی سیاست میں ایک مہرہ عسکری حرکت کا ایک اڈا یا ایسے انتظامات کرنے کے لئے ایک آڑ بنایا جا سکتا ہے جو بذات خود ذلیل نہ ہوں لیکن جو تاریخی مسئلہ کی مرکزیت کو مسخ کرتے ہیں۔

www.bhutto.org

اس مکالمے کو گڈمڈ کرنے کے کیا اسباب ہیں؟ انہیں منظر عام پر لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس حیرت انگیز کام کی خوبی سے انکار کیا جارہا ہے جو 77 کے گروپ کے زیر اہتمام کیا گیا ہے جس کی عکاسی منشور الجیرز 'اعلان لیما' اور پروگرام 'اقدام' ڈاکٹر کے فیصلوں اور اعلان منیلا میں کی گئی ہے نہ ہی یہ ان قرار دادوں کی قدر و قیمت کو کم کرتا ہے جو غیر جانبدار ملکوں نے قاہرہ 'جارج ٹاؤن الجیرز' لیما اور سب سے حال میں کولمبو میں اقتصادی مسائل پر منظور کی ہیں نہ ہی یہ ایک نئے اقتصادی نظام پر اس قسم کے مباحثے میں کوئی عدم دلچسپی ظاہر کرتا ہے جس کا آغاز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھٹے خصوصی اجلاس میں کیا گیا تھا اور جس نے ساتویں خصوصی اجلاس میں کچھ ترقی کی تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس ساری کوشش نے سوچ کا صرف بنیادی ڈھانچہ تعمیر کیا ہے تاکہ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کو انصاف کی وہ نئی سمت دیں جو تمام انسانیت کے موجودہ چیلنج کا مناسب طریقے پر دے سکتی ہے۔

انصاف کی یہ سمت اب تک حقیقت کا روپ کیوں نہیں دھار سکی؟ اس کا سبب یہ ہے کہ تیسری دنیا سے اس کے لئے اب تک کوئی منظم تحریک نہیں چلائی گئی۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بین الاقوامی پلیٹ فارموں پر ترقی پذیر ممالک استحکام کے جو مظاہرے کرتے ہیں وہ بلاشبہ اخلاص پر مبنی ہیں اور ان کو بخوبی محسوس کیا گیا ہے تاہم ہم اپنے آپ کو اس عقیدے پر مائل نہیں کر سکتے کہ تیسری دنیا کی توانائیاں اس اصل مسئلہ پر مرکوز ہیں جن سے یہ آج دوچار ہے تیسری دنیا کی نفاق انگیز حالت اس حقیقت سے عیاں ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے سارے موجودہ گروپوں کی بنیاد اپنے ارکان کے علاقائی اور سیاسی تعلق پر ہے اور چونکہ وہ اپنی ذات کے اندر اس حد تک محدود ہیں اس لئے وہ اس مسئلہ پر توجہ نہیں دے سکتے جو سارے علاقوں پر محیط ہے اور سیاسی یا نظریاتی اختلاف سے بالاتر ہے! اسلامی کانفرنس عرب لیگ افریقی اتحاد کی تنظیم لاطینی امریکہ ممالک کی اقتصادی تنظیمیں اپنے محدود منشوروں کیوجہ سے ایک خاص براعظم علاقے یا عقیدے کے ملکوں تک محدود ہیں لہٰذا دعویٰ نہیں کرتی ہیں کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے اقتصادی مفادات کا بحیثیت مجموعی ادراک کرتی ہیں۔

نہ ہی ایسا دعویٰ غیر جانبدار ممالک کا گروپ کرتا ہے اگرچہ اس گروپ نے اب اپنے آپ کو بڑھا کر 80 سے زائد ارکان کا گروپ بنالیا ہے تاہم بہت سے ترقی پذیر ممالک اس حلقے سے اب تک باہر ہیں۔ اس گروپ کے آغاز کے وقت تشکیل کا جو اصول بڑی طاقت کے تعلقات سے منسلک کیا گیا تھا اس کا کوئی ناسیاتی تعلق آج تیسری دنیا کے بنیادی مقاصد اور جدوجہد سے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ بیشتر غیر جانبدار ممالک کے رجحان کے برخلاف پچھلے برسوں میں بے انصافی کے ساتھ اس اصول کا اطلاق کیا گیا ہے یہ بات عیاں ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے ایک گروپ اور دوسرے گروپ کے درمیان تقسیم سے صرف تیسری دنیا کی اجتماعی قوت بھی کر سکتی ہے دونوں گروپ ایسے ممالک پر مشتمل ہیں جو شہنشاہیت یا نو استعماری غلبہ کی سختیاں برداشت کر چکے ہیں اور جو بین الاقوامی اقتصادی ناانصافیوں کو ختم کرنے کی

www.bhutto.org

جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں میں خوش ہوں کہ اس حقیقت کا زبردست طریقے پر اظہار حالیہ کولمبو کانفرنس میں کیا گیا ہے میری محترم دوست وزیراعظم سری لنکا نے غیر جانبدار مملکتوں کی اکثریت کے احساسات کی مستند طور پر ترجمانی کی جب انہوں نے یہ کہا کہ غیر جانبداری کی تحریک کوئی خالصتاً الگ کلب نہیں ہے اور یہ کہ اگر کوئی خلوت پسندی ہے تو وہاں ملکوں کی ہے جو کم مراعات یافتہ ہیں انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ صرف غیر جانبدار قومیں ہی نہیں ہیں جنہوں نے تبدیلی کے امکان کو محسوس کیا ہے بلکہ تیسری دنیا اس وقت اپنے سیاسی اور اقتصادی قوت کو منظم کرنے میں مصروف عمل ہے تاکہ انحصار اور استحصال کے پرانے طریقوں کو تبدیل کرے ہماری محروم قوموں کی جانب سے مشترکہ کارروائی کے لئے ایک وسیع تر بنیاد قائم کرنے کی ضرورت کا اس سے بہتر اقرار نہیں ہو سکتا۔

ایک خاص مدت تک ترقی پذیر ملکوں کے اتحاد کی ضرورت دنیا میں اقتصادی قوت اور اثر و رسوخ کے تیز رفتار اجتماع کے ظہور سے ماند پڑ گئی تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے جب اپنے اس حق کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بنیادی اور کم ہونے والے وسائل پر کنٹرول کریں گے اور اس کی قیمت متعین کریں گے تو دکھی انسانیت نے اسے ایک صدیوں پرانی غلطی کی ڈرامائی اصلاح تصور کیا اس سے یہ امید پیدا ہوئی کہ وہ اس پرانے نظام کی جگہ جس میں ملکوں کے ایک گروپ کے اصل وسائل امپیریل ملکوں کی ترقی اور آسائشوں کے لئے کنٹرول میں رکھے جاتے ہیں انہیں سستے داموں خریدا جاتا ہے اور بڑی بے دردی سے استعمال کیا جاتا تھا ایک نیا نظام آئے گا جس میں یہ وسائل اپنے جائز مالکوں کے فائدے کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یہ امیدیں خاک میں مل گئی ہیں لیکن ایک شے یعنی تیل کی قیمت سے متعلق جو تبدیلی ہوئی اس نے خود یہ مظاہرہ کر دیا کہ مقصد کے اتحاد سے اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی سیاسی و اقتصادی مرضی چلانے سے کیا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے اس سے یہ ظاہر ہوا کہ جب قومیں تاریخ کے موڑوں پر اپنے مشترکہ فائدے کے لئے متحد ہو جائیں تو دیرینہ ادارے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور روایتی اقتصادی طریقے دم توڑ دیتے ہیں۔

اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب قومیں پارہ پارہ ہوتی ہیں جب وہ مقصد کا اتحاد پیدا نہیں کر سکتیں تو وہ نہ صرف موجودہ بے انصافیوں کا برابر شکار رہتی ہیں بلکہ عالمی اقتصادی قوتوں کے عمل سے ان میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے تیسری دنیا کے نو آزاد ملکوں کے لئے بین الاقوامی اقتصادی ماحول اس وقت بھی معاندانہ تھا جب انہیں خود مختار مملکت کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن ان کی سیاسی آزادی کے عشروں کے دوران ان کے اور مالدار ملکوں کے درمیان اقتصادی ناہمواری حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں آج وہ اپنے اس اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے نقطہ آغاز سے بھی پیچھے ہیں اس قحط کا ذکر کیا جائے جس نے افریقہ کے حصول میں حالیہ برسوں میں المناک طور پر بہت سی جانیں تلف کی ہیں ان کی خستہ حالی کی چند علامتیں وہ بھوک ہے جو دوسرے ملکوں میں پھیلی ہے اور وہ ادائیگیوں کے توازن میں مزمن خسارے ہیں

www.bhutto.org

اور تجارت کی بدتر ہونے والی شرائط ہیں جب ان میں سے کوئی گروپ ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مالدار ملکوں کی زبردست اقتصادی طاقت اپنا زور دکھاتی ہے اور تجارت اور سرمایہ کے اداروں کے ان کے حق میں تعصب کی وجہ سے یہ ممالک اندرونی اور بیرونی ردوبدل کے اثرات کو غریب تر قوموں کی جانب منتقل کر دیتے ہیں۔ جب تیل کی قیمت بڑھی تو ترقی یافتہ ملکوں نے بحیثیت مجموعی کم قربانی یا کوئی قربانی نہیں دی انہوں نے اپنی صنعتی پیداواروں کی قیمتیں بڑھا دیں اور اس طرح تیل کے نام نہاد بحران کے بوجھ کو تیسری دنیا کی طرف واپس کر دیا جب تیسری دنیا کی طرف سے برآمد کردہ بنیادی پیداواروں کی بات آتی ہے تو ترقی یافتہ ممالک پھر قیمتوں کا تعین کرتے ہیں کیونکہ وہ اصل منڈیاں ہیں اور پیداواری کوٹہ پر اختلاف رائے اور دوسرے اسباب ترقی پذیر ملکوں کو اپنا وزن ڈالنے سے روکتے ہیں۔ اس عمل کو اس وقت تک روکا نہیں جا سکتا جب تک کہ سارے ترقی پذیر ممالک اپنے مقاصد کو مربوط نہ کریں اور متحد ہو کر کام نہ کریں گذشتہ پندرہ سال میں تیل کو چھوڑ کر جو تیسری دنیا کی برآمدات کا بیشتر حصہ بنتا ہے بنیادی اشیاء کی قیمتوں میں حقیقی معنوں میں خاصے فیصد تک کمی ہوئی ہے اس پر مستزاد ان برآمدات کی قیمتوں میں شدید سالانہ اتار چڑھاؤ ہے جس کا زیادہ تر دارومدار مالدار ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سرگرمی پر ہے۔

جب کچھ ترقی پذیر ممالک مصنوعات بنانے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں اور مصنوعات فروخت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کی مصنوعات کو امتناعی کوٹہ کے ذریعہ امیروں کی منڈیوں سے خارج کر دیا جاتا ہے یہ سارے عوامل متعدد نتائج برآمد کراتے ہیں ابتدائی اشیاء کی قیمتوں کے بارے میں غیر یقینی کیفیت غریب تر ملکوں کی اقتصادی منصوبہ بندی کو قمار بنا دیتی ہے۔ انکی مصنوعات سے متعلق پوزیشن ان کے خود کفالت حاصل کرنے کے مقصد کو ناکام بنا دیتی ہے امیر تر ملکوں سے انھی در آمدات کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم ادا کرنے کی ضرورت ان میں سے بیشتر کو قرض کے دلدل میں اور پھنسا دیتی ہے یہ ایسی صورت حال ہے جو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان اشیاء مصنوعات، ٹیکنالوجی اور مالیات کے اقتصادی تبادلے میں بے رحمی سے اپنے کو دہراتی ہے اس کا مجموعی نتیجہ تقریباً مکمل انحصار ہے۔

ان ساری باتوں کے پیش نظر یہ نظریہ روز افزوں طریقے پر پھیلایا جا رہا ہے کہ غریبوں کی ترقی کا دارومدار امیروں کی مسلسل تیز ترقی پر ہونا چاہئے کیونکہ صرف اسی صورت میں غریبوں کے مال کی منڈیاں بڑھ سکتی ہیں اور ان کے اشیاء کی قیمتیں برقرار رہ سکتی ہیں یہ ایک تباہ کن نظریہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور امیروں کے درمیان خلا کو برابر بڑھتے رہنا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ امیروں کو زمین کی دولت کا زبردست حصہ اپنے تصرف میں لاتے رہنا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امیر ممالک محض مال کی ضرورت سے زیادہ کثرت کی وجہ سے پیداوار کی رفتار میں قدرے کمی کر دیں تو غریب ممالک کے لئے کوئی امید نہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم خواہ اس نظریہ کی مذمت کرنے میں حق بجانب ہوں، یہ موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کی محض داخلی خصوصیت کو بیان کرتا ہے یہ اس ناقابل انکار حقیقت کی عکاسی

www.bhutto.org

کرتا ہے کہ ہماری تجارت کی شرائط ہماری منڈیاں اور ہمارے وسائل کے بہاؤ کا بہت زیادہ دارومدار امیر تر ملکوں میں اختیار کی جانے والی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں پر ہے۔اس نظام کے بنیادی سہاروں کو ایک رات میں تو تبدیل نہیں کیا جاسکتا لیکن اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ غریب تر ممالک کو سانحہ کی صورت میں بیمہ مہیا کیا جائے۔کم مراعات والے ممالک کے مستقبل کو بڑھتی ہوئی نابرابری پر انحصار کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ایک راہ نکالنا لازمی ہے تاکہ تیسری دنیا کے لئے تجارت کی شرائط بہتر ہوں مالدار ملکوں میں کوٹے کی ناانصافیاں اور تجارتی پابندیاں دور کی جائیں اور بیرونی قرضہ کا مفلوج کرنے والا بوجھ کم کیا جائے جو غریب اور امیر ملکوں کے درمیان زیادہ تر غیر مساوی تجارت اور تبادلہ کا نتیجہ ہے۔

ہم نے تیسری دنیا کے ممالک کی صدیوں کو عشروں میں لپیٹنا ہے۔ہمارے سامنے ان ملکوں جیسے پُرسکون حالات موجود نہیں جنہوں نے بہت عرصہ پہلے انتہائی سازگار اور پرامن فضا میں اپنی معیشتوں کو تعمیر کیا ان ملکوں کے ہاں کوئی ایسے ادارے بھی نہیں تھے جنہیں گرانا ضروری ہوتا بلکہ یہ ایسے ادارے تھے جو بتدریج اصلاح اور سماجی تبدیلی کی مسلسل کارکردگی سے مطمئن ہوگئے۔ہم ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں مواقع پیدا ہوں۔جس میں اپنے عوام کی غیر مراعات یافتہ اکثریت باعزت باوقار اور پرامید زندگی بسر کرسکے۔ ہم اپنے عوام کو بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کے لئے خندہ پیشانی سے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ہم فوری آرام و آسائش سے محرومی کو قبول کرتے ہیں لیکن اپنی قربانی کی قدر و قیمت کو ان اداروں اور رسومات کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے جو اپنے وجود کے اعتبار سے ہی ہمارے خلاف برسرپیکار ہیں۔ ہمارے عوام کی محنت کی قدر و قیمت اس ناہمواری کے باعث مستقل کم ہورہی ہے جو ہمارے اور امیر ملکوں کے اقتصادی تعلقات میں پائی جاتی ہے۔ہم بمشکل وقت گزار رہے ہیں۔اگرچہ ہمارے لئے اپنے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانا ناگزیر ہے لیکن ان کے لانے کے لئے حکمت عملی کی گنجائش بہت کم ہے۔1970ء سے شروع ہونے والے عشرہ کے وسطی برسوں میں ترقی یافتہ ممالک میں جو بحران پیدا ہوا تھا اس کا بدترین اثر ہم پر پڑا اور ہماری ترقی کی رفتار برسوں پیچھے چلی گئی۔ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں فی کس آمدنی کم ہوگئی ہے۔اگرچہ ان ملکوں میں سے بعض ملک پاکستان کی طرح اپنی ترقیاتی کوششوں کو برقرار رکھنے بلکہ انہیں تیز تر کرنے میں کامیاب رہے لیکن اس کے نتیجے میں ان پر قرضوں کا بوجھ بڑھ گیا۔چنانچہ ہمیں ایسی ترقی حاصل کرنی ہے جس سے پیداواری عمل خود بخود جاری رہے لہٰذا ہم سب کو چاہئے کہ خارجی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیں اور ہماری اجتماعی کمزوری سے خارجی اقتصادی ماحول کا جو تعلق ہے اس کا بھی جائزہ لیں تاکہ عالمی معیشت ہمارے لئے سمندری تھپیڑوں کا کردار ادا نہ کرے۔کہ تھوڑا سا سفر طے کرنے کے بعد یہ تھپیڑے ہمیں دھکیل کر وہیں چھوڑ دیں جہاں سے ہم نے اپنی منزل کی جانب سفر شروع کیا تھا۔

اگرچہ بے شمار بین الاقوامی اجتماعات میں ان بنیادی حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے جواب میں باہمی انحصار کا احساس جو قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہوا بلکہ اس کا الٹا

www.bhutto.org

ردعمل ہوا۔ اس بات کا اندازہ امیر ملکوں کے بڑھتے ہوئے احساس خودپسندی سے لگایا جاسکتا ہے لہٰذا قوموں کی غربت کو ان موروثی نقائص کا نتیجہ بتایا جاتا ہے جو ان قوموں میں پائے جاتے ہیں اور اب تو ہمیں بار بار یہ دلیل سنی پڑتی ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک اپنی زبوں حالی کے خود ذمہ دار ہیں امیر ممالک اپنے گروپوں اور انجمنوں کو مضبوط سے مضبوط بنا رہے ہیں اور اب وہ تمام تر توجہ اپنے مفادات کو مستحکم کرنے پر مرکوز کر رہے ہیں چنانچہ یہ ممالک بین الاقوامی مالی اصلاح اور تجارت اور وسائل کی منتقلی میں زیادہ تر آپس میں معاملات طے کر لیتے ہیں اور اس ضمن میں ترقی پذیر ملکوں کا اثر برائے نام ہے۔

موجودہ بین الاقوامی اداروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس عدم توازن کو درست کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بالکل غیر حقیقت پسندانہ بات ہے یہ وہ لوگ جو ان اداروں میں امداد اور مالی امور سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس رجعت پسندانہ رویہ کا شکار ہو گئے ہیں جو امیر اور طاقتور ملکوں میں پایا جاتا ہے ان میں چوٹی کے جو ممالک ہیں ان کی مجموعی قومی پیداوار میں بیرونی امداد کا تناسب مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے بین الاقوامی ادارہ ترقی اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام جیسی تنظیمیں رقوم کی قلت کا شکار ہیں ترقی پذیر ملکوں کی برآمدات کے کوٹہ پر پابندیاں ختم کرنے کے لئے وہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے ہیں جو سالہا سال سے منعقد ہو رہے تھے۔ ترقی پذیر ملکوں کو خام مال کی برآمدات کی قیمتوں کو مستحکم اور بہتر بنانے کے سوال پر محض الفاظ کی جنگ ہو رہی ہے چنانچہ قرار دادوں کی شکل میں درد و دور کرنے کی دوا دی جاتی ہے جیسا کہ پیش گوئی کی گئی تھی پیرس کانفرنس بھی افسوسناک تعطل کا شکار ہے جس سطح پر یہ ادارے کام کر رہے ہیں ان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ موجودہ چیلنج کا جواب دے سکیں دھیمی دھیمی گفتگو تخلیقی مذاکرات کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان بین الاقوامی اقتصادی نظام سے متعلق تمام موضوعات پر مشترکہ مفاد نہیں پایا جاتا۔ ان ملکوں میں بھی اختلاف بیان کیا جاتا ہے ایک طرف وہ ملک ہیں جن کا تعلق صرف اور صرف ایشیا سے ہے اور دوسرے وہ جو نیم صنعتی ممالک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرضوں میں رعایت کا معاملہ ان ملکوں کے لئے اہمیت نہیں رکھتا جنہیں سرمائے کی منڈی تک براہ راست رسائی حاصل ہے۔ اور وہ صرف قرضوں کے حصول کے لئے اپنی "ساکھ" برقرار رکھنا چاہتے ہیں لیکن ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ترقی پذیر ملکوں کا مشترکہ مفاد ایک ہے یعنی یہ کہ انہیں عالمی اقتصادی نظام میں برابری کا مقام ملنا چاہئے اس نکتہ پر ان کے درمیان جو اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہ تمام فروعی اختلاف سے بالاتر ہے۔ ایک ایک مسئلہ پر مکمل یکجہتی کا ہونا اتحاد کے لئے ناگزیر نہیں اختلاف کا مطلب مخالفت نہیں ہے مثال کے طور پر مشترکہ منڈی کا اقتصادی اتحاد دیکھئے جس کی پشت پر کئی اداروں کا ایک جال بچھا ہے اور جو مشترکہ سیاسی مقاصد کو فروغ دے رہے ہیں یہ اتحاد ممبر ملکوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے کہیں زیادہ نظر آتا ہے اتحاد کو باہمی رواداری سے پروان چڑھایا جاتا ہے یہ اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ عدم اتحاد کی صورت میں ہر ایک کے مفاد کو لازمی طور پر نقصان پہنچے گا۔

www.bhutto.org

ہم تیسری دنیا کے ممالک بھی اپنے مشترکہ مصائب پر متحد اور استحصال کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی ضرورت پر متفق ہیں۔ اپنے سیاسی نظاموں یا خارجی نقطہ نظر سے قطع نظر ہمارے پاس ایک مشترکہ اختیار ہے۔ وہ یہ کہ ہم دنیا کی اکثریت کو اس اقتصادی نظام سے نجات دلائیں جس نے ان لوگوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے لہٰذا اس شخصیت کو پراگندگی کا شکار نہ ہونے دیا جائے جو طویل المیعاد مقاصد کو قلیل المیعاد مفادات سے ہم آہنگ کرنے میں ناکامی کی صورت میں پیدا ہوئی ہے اگر ہم اپنی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے باہمی تعاون کی حدود اور دائرہ کار کا جائزہ نہیں لے سکے تو اس کے نتیجہ میں ہماری شخصیت کو اس سیاسی عزم کے فقدان کے باعث کمزور نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ایک ایسے نظام کو تبدیل کرنے کے لئے مشترکہ قوت کو بھرپور طور پر بروئے کار نہیں لا سکے جس کا ڈھانچہ ہی ترقی پذیر ملکوں کے خلاف امتیاز پر مبنی ہے اس سیاسی عزم کا اظہار ہماری اجتماعی قیادت کی اعلیٰ ترین سطح کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ تیسری دنیا کے 77 ملکوں کے گروپ کا پلیٹ فارم موجود ہے جس سے وہ اپنی مشترکہ کوششوں میں رابطہ پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ گروپ تجارت اور ترقی کے ادارہ کے سیاق و سباق میں قائم کیا گیا تھا۔ لہٰذا بعض اوقات گروپ کے مستقبل کے امکانات خود اس کے ابتدائی محرکات کے سبب محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ گروپ کی ساخت اور تشکیل کچھ اس قدر بوجھل اور بے ڈھبی ہے کہ گروپ ان معاملات کا موزوں حل پیش نہیں کر سکتا جو تبدیلی لانے کے لئے ناگزیر ہیں ایک ایسی تنظیم جس کا دائرہ محدود ہو اور جو ترقی پذیر ملکوں کی سیاسی امنگ اور اقتدار اعلیٰ کی ترجمانی نہیں کر سکتی، اس تنظیم کو ان ملکوں کی حکمت عملی کی رہنمائی کا اہم کام نہیں سونپا جا سکتا۔

تیسری دنیا میں اپنی خوابیدہ اور دبی ہوئی قوت کے بارے میں احساس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ یہ شعور اور آگاہی اتنی واضح ہے کہ ہمارے اور کا انتہائی اہم مسئلہ پر نام نہاد جانب دار دور کا نام نہاد غیر جانبدار ملکوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہے۔ اس فرق کی نشاندہی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ عالمی سطح پر طبقاتی جنگ کو کوئی دعوت دی جائے اس پکار کا مقصد اقتصادی قوت کو از سر نو تقسیم کرنا ہے کیونکہ صرف اسی طریقے پر ہی کشیدگی کا لا متناہی سلسلہ اور آئے دن کے انقلابات کو روکا جا سکتا ہے۔ اس دعوت کا مقصد عالمی برادری کی بقا کی وکالت کرنا ہے۔

ہم اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں کہ نیا اور منصفانہ اقتصادی نظام کسی ایک اجلاس یا کانفرنس کے نتیجہ میں وجود آ سکتا ہے تیسری دنیا کو اقتصادی آزادی کے لئے وادی پر خار سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن اس راہ کو آسان بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ تیسری دنیا کی قیادت جس کی پشت پر انسانی رائے عامہ کی بے پناہ قوت موجود ہو متحد، منظم اور باعزم ہو اس مقصد کے لئے میں نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں کی سربراہ کانفرنس بلانے کی اپیل جاری کی ہے تاکہ تیسری دنیا کی قوموں کی پوری قوت کو یکجا کر کے انھیں بین

www.bhutto.org

الاقوامی اقتصادی استحصال' نجات اور ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔

اس اپیل کا براہ راست تعلق تیسری دنیا کے اتحاد کے تقاضے کے بڑھتے ہوئے احساس واعتراف سے ہے۔ گذشتہ ماہ کولمبو میں غیر جانبدار ملکوں کی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ہمارے دور کے اس اہم مسئلہ پر توجہ دی گئی آئندہ ہفتہ میکسیکو میں ترقی پذیر ملکوں کے نمائندوں کا وزراتی سطح پر اجلاس منعقد ہو رہا ہے جس میں ان ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کے ذرائع اور وسائل پر غور کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میکسیکو کانفرنس بھی اس منزل کا دوسرا سنگ میل ثابت ہوگی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس بھی اس ماہ کے آخر تک منعقد ہو رہا ہے لہٰذا پاکستان کے لئے مناسب وقت آگیا ہے کہ وہ تیسری دنیا کی اس سربراہ کانفرنس کے انعقاد کے لئے اپنی اپیل کے پس منظر میں کار فرما بنیادی ملحوظات کی وضاحت کرے جو بنی نوع انسان کی غیر مراعات یافتہ اکثریت کے اتحاد کو یقیناً مستحکم بنائے گی۔

پاکستان اس کانفرنس کے انعقاد اور اس کی کارروائیوں کو ثمر آور بنانے کے لئے تمام ترقی پذیر ملکوں کے تعاون کا طلب گار ہے 20 سال سے زیادہ کا عرصہ گزرا ہے کہ نو آزاد ممالک کا اجلاس بنڈونگ میں ہوا اور وہاں وہ سیاسی اصول اور مقاصد مرتب کئے گئے جو بین الاقوامی معاملات میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ عالمی سیاسی صورت حال کے خراب ہونے سے متعلق جو خدشات پائے جاتے تھے انہیں بنڈونگ کانفرنس نے غلط ثابت کر دیا۔ بلاشبہ اس کے اعلانات پُرامن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بنیادی منشور فراہم کرتے ہیں۔

اسی طرح تیسری دنیا کی سربراہی کانفرنس ارتقائی عمل میں ایک اہم قدم ہوگی۔ یہ ایشیا' افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قوتوں کی سیاسی آزادی کے بعد اگلے مرحلے میں داخل ہونے کی راہ دکھائے گی۔ یہ مرحلہ وہ ہوگا جب دنیا کی قوموں کے لئے مساوی مواقع فراہم کرنے کا دارومدار بڑی بڑی غیر ملکی امدادی رقوم کی صورت میں خیرات یا مخصوص تجارتی رعایتوں وغیرہ کے ذریعہ جزوی اصلاحات پر نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بھڑکتے ہوئے جذبات اور تباہ کن محاذ آرائی کا خطرہ نہ صرف ٹل جائے گا' بلکہ عالمی سطح پر شراکت کا امکان پیدا ہوگا۔ آخری تجزیہ میں ترقی پذیر ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سرگرمیوں میں ترقی یافتہ ملکوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی لازمی ہے غریب ملکوں کی سربراہ کانفرنس ان کے اس عزم کا مظاہرہ کرے گی کہ وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ معیشتوں میں اس مقصد کے حصول تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہیں گے۔

صورتحال کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے ایک حکمت عملی اختیار کر کے اور موزوں اداراتی انتظامات کے ذریعہ تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں تیسری دنیا کے ممالک کی پالیسیوں کو مربوط اور ان کی پوزیشن کو بحال کر سکتی ہے اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعاون کا کم از کم متفقہ پروگرام مرتب کر کے اس پر عمل درآمد کر سکتی ہے اس طرح یہ علاقائی یا بین العلاقائی ترقی پذیر ملکوں کے مختلف گروپوں میں شروع کی ہوئی کوششوں کو مربوط اور ہم آہنگ کرے گی اور تیسری دنیا اس قابل ہو

www.bhutto.org

سکے گی کہ مضبوط تر ہو اور عالمی اقتصادی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کرے۔

تیسری دنیا کے پیغام کو گزرتے ہوئے دور کی لفاظی کا جامہ نہیں پہنانا چاہئے اور نہ اسے کسی ملک یا ممالک کے گروپ کے سیاسی مفادات کے مطابق تراشنا چاہئے اگر متمول اور مقتدر ممالک اپنی دولت اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لئے متحد ہو سکتے ہیں جیسا کہ نازک لمحات میں وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں تو اگر غریب قومیں اپنی ہی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور غریب اور غریب کے درمیان خلیج پیدا کرنے میں اپنی نسبتاً محدود طاقت کو ضائع کرتی رہیں تو یہ انسانیت کے ساتھ زیادتی ہوگی تیسری دنیا کے افلاس زدہ عوام اپنی اجتماعی مرضی کے لئے ایک نئے محور کی تمنا کر رہے ہیں وہ غیر انسانی سلوک کے خلاف اس انسان کی آخری فتح کے لئے جہاد کرنے کی غرض سے طاقت کے ایک نئے قلعہ کی تلاش کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی ضرورت اور غریبوں کی ترجیح ہے جو کانفرنس میرے تصور میں ہے اس میں شرکت کے لئے ایک اور صرف ایک فولادی کسوٹی ہوگی۔ یعنی تیسری دنیا کی غیر ترقی یافتہ اور مظلوم برادری ایشیا 'افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومیں خواہ وہ جانبدار یا غیر جانبدار ہوں اشتراکی یا غیر اشتراکی ہوں 'سفید 'زرد یا سیاہ یا بھورے رنگ والی ہوں وہ اس مشن میں شریک ہوں گی اور بنی نوع انسان کے لئے ایک قانون کے تحت ایک دنیا کی نقیب بن جائیں گی۔

1976ء

www.bhutto.org

www.bhutto.org

دسواں حصہ

پھانسی کے سائے تلے

www.bhutto.org

www.bhutto.org

میری سب سے پیاری بیٹی

ایک سزا یافتہ قیدی کس طرح اپنی خوبصورت اور ذہین بیٹی کو اس کے یوم پیدائش پر تہنیت کا خط لکھ سکتا ہے جبکہ اس کی بیٹی (جو خود بھی مقید ہے اور جانتی ہے کہ اس کی والدہ بھی اسی کی طرح تکلیف میں مبتلا ہے) اس کی جان بچانے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہے؟ یہ رابطہ سے زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ محبت و ہمدردی کا پیغام کس طرح ایک جیل سے دوسری جیل اور ایک زنجیر سے دوسری زنجیر تک پہنچ سکتا ہے؟

نہرو بھی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔ نہرو نے بھی جیل سے اسے اس کے یوم پیدائش پر تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔ میں نے اس امر کا تذکرہ تم سے پہلے بھی کیا ہے اور ایسا یا تو پہلے یا دوسرے خط میں کیا ہے جو میں نے تمہیں لکھا تھا اور دوسرے تین خطوط 1964ء میں جکارتا سے لکھے تھے جب تم چھوٹی بچی تھیں اور مری میں کنوینٹ میں زیر تعلیم تھیں۔ صنم، سیما تو اور بھی چھوٹی تھیں۔ اس طویل خط میں میں نے ذکر کیا تھا کہ نہرو نے کس طرح تاریخ عالم کے بارے میں اپنی بیٹی اندرا کو خطوط لکھے تھے۔ بعد میں یہ خطوط ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیئے گئے تھے اور کتاب کا نام "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" (عالمی تاریخ کے مناظر) رکھا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ پہلا خط اندو (اندرا) کے یوم پیدائش پر ایک تہنیتی خط تھا۔ وہ اندرا کو پیار سے "اندو" کہتے تھے، جب وہ تیرہ سال کی تھی۔ جس وقت تک میں 23 سال کا ہوا تھا میں نے "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" کو چار بار پڑھا تھا۔ نہرو ہمارے زمانہ کے انتہائی صاف ستھری انگریزی لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے الفاظ میں ایک قسم کا فیضان اور ترنم ہوتا تھا۔

جکارتہ سے 14 سال پہلے میں نے جو خط لکھا تھا اس میں میں نے تمہیں متنبہ کر دیا تھا کہ میں نہرو کی

www.bhutto.org

نقالی نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے ان کی نقالی اس وقت بھی نہیں کی تھی اور نہ ہی اب میں ان کی پیروی کر رہا ہوں۔ بے شک اس وقت میں بھی جیل میں ہوں اور وہ بھی اس وقت جیل ہی میں تھے جب انہوں نے اپنی بیٹی کو خطوط لکھے تھے۔ یہ عنصر میرے اور نہرو کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں یہ خط اپنی بیٹی کو اس کی پیدائش کی سالگرہ پر لکھ رہا ہوں۔ لیکن میرے اور نہرو کے درمیان مماثلت بہت زیادہ نہیں ہے۔ نہرو کو جیل میں غیر ملکی حکمرانوں نے ایک جگہ عزت و وقار کے ساتھ رکھا تھا۔ انہوں نے آزادی کے حصول کے لئے جنگ کی تھی۔ وہ بھارتی عوام کے ایک عظیم لیڈر تھے۔ انہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اور بڑے عزو وقار کے مالک تھے۔ وہ کوئی گھٹیا قسم کے قاتل نہیں تھے اور نہ ہی سرکاری رقوم کے غبن کرنے والے تھے۔ وہ لاڑکانہ کے گاؤں کی کوئی غیر اہم شخصیت نہیں تھے۔ جو حکمراں ٹولہ کے ہاتھوں موت کی کوٹھری میں گھل رہے تھے۔ میرے اور نہرو کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے۔ ان کی بیٹی ایک تیرہ سالہ چھوٹی سی لڑکی تھی جس نے اس زمانہ کی سیاست میں اپنا کردار ادا کیا تھا اور اس ادارہ کو منظم کیا تھا جس کو اس نے "منکی بریگیڈز" (بندروں کا بریگیڈ) کا نام دیا تھا۔ اس وقت تک ان کی بیٹی سیاست کی آگ میں سے ہو کر نہیں گزری تھی تمہارے گرد آگ جلا دی گئی ہے۔

اور یہ آگ ایک بے رحم جنتا نے جلائی ہے۔ یہ آگ تباہ کن اور ہولناک ہے۔ اس لئے بہت زیادہ فرق ہے۔ دونوں ناقابلِ موازنہ ہیں۔ اگر کوئی مماثلت ہے تو وہ اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اندرا گاندھی کی طرح تم بھی تاریخ سازی کر رہی ہو۔ میں اندرا گاندھی سے اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں حالانکہ میں ان کے والد کو زیادہ بہتر طور پر جانتا تھا جیسا کہ تمہارے دادا اس کے دادا کو اس سے بہتر طور پر جانتے تھے جس قدر کہ میں اس کے والد کو جانتا تھا۔ میں ان کی خوبیوں اور اوصاف کا بہت احترام کرتا ہوں اور میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں ان کے سب سے بڑے مداحوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بھارت کی وزیرِاعظم ہوئیں اور گیارہ سال تک اس اعلیٰ عہدہ پر فائز رہیں۔ وہ بھارت کی دوبارہ بھی وزیرِاعظم ہو سکتی ہیں۔ انہیں "دیوی" کا خطاب دیا گیا جب انہوں نے مشرقی پاکستان پر قبضہ جمایا۔ ان تمام باتوں کا علم رکھتے ہوئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تذبذب نہیں ہے کہ میری بیٹی جواہر لال نہرو کی بیٹی کے مقابلہ میں جن کو بھارت کی دیوی کہا جاتا ہے کہیں بہتر ہے۔ میں کوئی جذباتی یا ذاتی قسم کا اندازہ نہیں لگا رہا ہوں۔ یہ میری دیانتدارانہ رائے ہے۔

تم میں اور اندرا گاندھی میں ایک شے قدرِ مشترک ہے کہ تم دونوں یکساں طور پر بہادر ہو۔ تم دونوں پختہ فولاد کی بنی ہوئی ہو یعنی تم دونوں کی قوتِ ارادی فولادی نوعیت کی ہے۔ لیکن تمہاری صلاحیت و ذہانت تمہیں کہاں لے جائے گی؟ عام طور پر تو یہ صلاحیت و ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی۔ لیکن ہم ایک ایسے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ذہانت و صلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھونٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے۔ سوائے تمہارے والد کے 'قائدِاعظم اور شاید

سہروردی کے اس ملک پر حکومت شعبدہ بازوں اور کپتانوں نے کی ہے۔ شاید اس صورتِ حال میں تبدیلی پیدا ہو جائے، اگر کوئی جنگجو قسم کا نوجوان جدوجہد کا آغاز کرے۔ اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے ہیں تو پھر تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔ یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہو گا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی۔

تمہارے دادا نے مجھے فخر کی سیاست سکھائی۔ تمہاری دادی نے مجھے غربت کی سیاست کا سبق دیا۔ میں ان دونوں باتوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہوں تاکہ ان دونوں کا انضمام ہو سکے۔ پیاری بیٹی میں تمہیں صرف ایک پیغام دیتا ہوں۔ یہ پیغام آنے والے دن کا پیغام ہے اور تاریخ کا پیغام ہے۔ صرف عوام پر یقین کرو۔ ان کی نجات و مساوات کے لئے کام کرو۔ اللہ کی جنت تمہاری والدہ کے قدموں تلے ہے۔ سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے۔ برصغیر کی پبلک زندگی میں کچھ کامیابیاں میرے کریڈیٹ پر ہیں لیکن میری یادداشت میں صرف وہ کامیابیاں انعام و اکرام کی مستحق ہیں جن کے ذریعہ مصیبت زدہ عوام کے تھکے ہوئے چہروں پر مسکراہٹیں بکھر گئیں ہیں۔ اور جن کے باعث کسی دیہاتی کی غمناک آنکھ میں خوشی کی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کے عظیم لیڈروں نے جو خراج تحسین مجھے پیش کیا ہے ان کے مقابلہ میں اس موت کی کال کوٹھری میں میں زیادہ فخر و اطمینان کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک بیوہ کے الفاظ یاد کرتا ہوں جس نے مجھ سے کہا تھا کہ "صدکو واریاں سولر سائیں" اس نے یہ الفاظ اس وقت کہے تھے جب میں نے اس کے کسان بیٹے کو ایک غیر ملکی وظیفہ پر باہر بھیج دیا تھا۔

بڑے آدمیوں کے نزدیک تو یہ چھوٹی باتیں ہیں لیکن میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لئے یہ حقیقتاً بڑی باتیں ہیں۔ تم بڑی نہیں ہو سکتی ہو، جب تک کہ تم زمین کو چومنے کے لئے تیار نہ ہو یعنی عاجزی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ تم زمین کا دفاع نہیں کر سکتیں جب تک کہ تم زمین کی خوشبو سے واقف نہ ہو۔ میں اپنی زمین کی خوشبو سے واقف ہوں۔ نظریات، اصول، تحریریں تاریخ کے دروازہ سے باہر ہی رہتی ہیں۔ غالب عنصر عوام کی تمنائیں ہیں اور ان کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہے۔ جب اس راگ یا موسیقی کے معنی سمجھ لئے جاتے ہیں تو منزل کے نشان واضح ہو جاتے ہیں۔ اور اصول و نظریات کو پیرلگ جاتے ہیں کہ وہ وقت پر اس راگ کی شان کو بڑھانے کے لئے آموجود ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں عملیت کے نظریہ کا پرچار کر رہا ہوں۔ عملیت کا نظریہ میں تو بہت کچھ موقع و محل کے لحاظ سے آسانی ہوتی ہے۔ میں مسئلے کے اصل سبب کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چیلنج کی اصل وجہ اور جدوجہد کے اصل سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میں اس جیل کی کوٹھری سے تمہیں کیا تحفہ دے سکتا ہوں جس میں سے میں اپنا ہاتھ بھی نہیں نکال سکتا؟ میں تمہیں عوام کا ہاتھ تحفہ میں دیتا ہوں۔ میں تمہارے لئے کیا تقریب منعقد کر سکتا ہوں؟ میں تمہیں ایک مشہور نام اور ایک مشہور یادداشت کی تقریب کا تحفہ دیتا ہوں۔ تم سب سے قدیم تہذیب کی وارث ہو۔ اس قدیم تہذیب کو انتہائی ترقی یافتہ اور انتہائی طاقتور بنانے کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کرو

www.bhutto.org

ترقی یافتہ اور طاقتور سے میری مراد یہ نہیں کہ معاشرہ انتہائی ڈراؤنا ہو جائے۔ ایک خوفزدہ کرنے والا معاشرہ 'ایک مہذب معاشرہ نہیں ہوتا۔ مہذب کے معنی میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور طاقتور' معاشرہ وہ ہوتا ہے جس نے قوم کے خصوصی جذبہ کی شناخت کر لی ہو' جس نے ماضی و حال سے 'مذہب اور سائنس سے' جدیدیت اور تصوف سے' مادیت اور روحانیت سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ ایسا معاشرہ ہیجان و خلفشار سے پاک ہوتا ہے اور کلچر سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس قسم کا معاشرہ شعبدہ بازی کے فارمولوں اور دھوکہ بازی کے ذریعہ معرض وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ وہ روحانی یا آفاقی اقدار' تلاش کی گہرائی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک غیر طبقاتی معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ مارکسٹ معاشرہ ہو۔ مارکسٹ معاشرہ نے خود اپنا طبقاتی ڈھانچہ تخلیق کر لیا ہے۔ یورپ کے مارکسٹوں نے کمیونزم سے انحراف کیا ہے اور انہوں نے ایسا موجودہ طبقاتی ڈھانچہ سے سمجھوتہ کر کے کیا ہے۔ ورنہ ایزیکو برلنگر "تاریخی سمجھوتہ" کی کوشش نہ کرتا جو دراصل بالآخر ایلڈو مورو کے قتل کا باعث ہوا۔

جب میں وزیر خارجہ تھا تو ایک جرمن سفارت کار نے مجھ سے اسلام آباد میں 1965ء میں کہا تھا کہ افریقہ ایک برف کی چادر کے مانند ہے جس پر تیل کی ایک موٹی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ کہ وہ اس حالت میں طویل عرصہ تک رہے گا۔ اس کے ایسا کہنے سے میں متاثر ہوا تھا۔ میرے جیسا ایشیائی آدمی ایک ایسے سفارت کار کے تجزیہ پر اعتراض یا تنقید نہیں کر سکتا تھا جس کا تعلق آقاؤں کی نسل سے تھا اور پھر وہ تو ایسے مشہور سائنسدان کا بھائی تھا جو میزائل بنانے کے لئے امریکہ منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کے تجزیہ کا احترام کرتا ہوں لیکن میری منکسرانہ رائے میں افریقہ گو کہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے نظر انداز کیا گیا ہے اور اس کا تمسخر اڑایا گیا ہے لیکن وہ دو عشروں سے کم عرصہ میں دنیا کے اسٹیج کے مرکز پر نمودار ہو گا یعنی مرکزی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ ایسا ہی ہوا ہے۔ لیکن جو جدوجہد افریقہ میں جاری ہے وہ بنیادی طور پر کمیونزم اور آزادی کے درمیان جدوجہد نہیں ہے۔ یہ جدوجہد اس وسیع و عریض اور مشہور و معروف براعظم کے وسائل اور خام مال کے لئے ہے۔ فرق یہ ہے کہ جدوجہد کرنے والی ایک پارٹی نے افریقہ کے عوام کی تمناؤں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیا ہے۔ دوسری پارٹی ایسا کرنے میں ناکام رہی ہے باوجود اس کے کہ اینڈریو ینگ نے جرأت مندانہ لیکن ناکام کوششیں کی ہیں۔ ابتداء میں تو میں اینڈریو ینگ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اب میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس نے افریقہ کے مسئلے کی جزئیات کو سمجھ لیا ہے اور ایسا دوسری پارٹی کے نقطہ نظر سے کیا ہے۔ لیکن اینڈریو ینگ تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ یا تو بالکل نکال باہر کیا جائے گا یا پھر غیر موثر کر دیا جائے گا۔ اور ایسا اس حکومت کی طرف سے ہو گا جو فرانس کے بوربنوں کی طرح کچھ بھی سیکھنے سے انکاری ہے۔

اس سلسلہ میں لیکن ایشیاء کے حوالہ سے سیلگ ہیریسن نے حال ہی میں ایک اور محققانہ کتاب لکھی ہے جس کا نام "دی وائڈننگ گلف" (بڑھتی ہوئی خلیج) ہے۔ یہ کتاب ایشیائی قوم پرستی

کے موضوع پر ہے اور اس میں اس ضرورت کا احساس دلایا گیا ہے کہ امریکہ وسیع تر تناظر میں اس صورت حال کو سمجھے۔ پاکستان سے متعلق باب میں کتاب کے صفحہ 273 پر اس نے کہا ہے کہ "ذوالفقار علی بھٹو نے (جنہوں نے بعد میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے پیکنگ کے ساتھ قریبی روابط کا آغاز کیا) نومبر 1962ء سے ہی پاکستان کو چین کے خلاف تصورات سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا جب انہوں نے قومی اسمبلی سے کہا تھا کہ پیکنگ کے ساتھ پاکستان کی دوستی ایک آزاد عنصر ہے اور یہ کہ اگر کشمیر کا تنازعہ صلح صفائی کے ساتھ طے بھی ہو جاتا ہے تب بھی ہم چین کے خلاف بھارت کا ساتھ نہیں دیں گے۔ برصغیر ہند کے واسطے مشترکہ دفاع کا مغربی مقصد ایک مخالف چین کے تصور پر مبنی تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے لئے اس مسئلے کا حل چین کے ساتھ ہماری دوستی کو خطرہ میں ڈالے بغیر ہمارے درمیان ایک قسم کی مساوات کو دریافت کرنا ہے۔ اگر ہم دونوں صحیح پالیسی پر عمل کریں تو مشترکہ دفاع کا سوال غیر متعلق ہو جائے گا' اس کے فوراً بعد ایک انٹرویو میں (راولپنڈی 10 دسمبر 1962ء) بھٹو نے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا۔ چین کے بارے میں امریکی مفاد کی شناخت کی جو ان کی پالیسیوں میں نمایاں رہی اور جس کی توضیح بعد کے برسوں میں وہ مجھ سے اکثر اوقات کرتے تھے۔ (بھٹو نے 20 دسمبر 1967ء) کو لاڑکانہ میں ایک انٹرویو کے دوران چین اور امریکہ کے درمیان دیتانت کی توقع کی از سر نو تصدیق کی اور بعد میں "متھ آف انڈی پینڈنس" میں (آزادی موہوم) صفحہ 21 پر ایسا کیا) انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ قلیل المیعاد لحاظ سے تو چین اور پاکستان کے تعلقات پاک امریکہ تعلقات کے لئے نقصان دہ ہوں گے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ چین اور امریکہ اپنے اختلافات کو ختم کر دیں گے اور غالباً ایسا 1970ء کے عشرہ کے شروع میں ہو گا۔ بہرحال چین' پاکستان کی دوستی کا اس لئے حق دار ہے کہ وہ ایشیائی خود داری اور خود اعتمادی کا چیمپئن ہے جس کو پاکستان میں وسیع پیمانہ پر سراہا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ منطق نہ صرف بذاتِ خود توجہ کی مستحق ہے بلکہ اس میں مزید کشش و جاذبیت پیدا ہو جائے گی۔ اگر بھارت اور چین کی رقابت میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں لازمی طور پر پاکستان اور چین کے درمیان سلامتی کے مشترکہ مفادات پیدا ہو جائیں گے۔ بھٹو نے صحیح اندازہ لگایا تھا کہ بھارت اور چین کے تنازعہ میں شدت پیدا ہو گی اور چین اور پاکستان کا تعلق جلد ہی لازمی طور پر بھارتی تعلق کے اثر سے مستحکم ہوا جس کا بلا آخر نتیجہ یہ ہوا کہ پیکنگ نے نئی دہلی کو 1965ء کی جنگ کے دوران الٹی میٹم دیا اور پاکستان کو کافی فوجی امداد دی۔"

اس سے پہلے اپنی کتاب کے صفحہ 27 پر سیلگ ہیریسن نے لکھا ہے کہ "مسلم لیگ کے لیڈروں نے جو ابتداء میں پاکستان کی تخلیق کے ذمہ دار تھے اپنی اپیل کی بنیاد صرف مذہب پر رکھی تھی اس لئے کہ وہ تنگ نظر جاگیرداروں کے اقتصادی مفادات کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ بعد کی حکومتوں نے زیادہ تر سماجی انصاف کو نظر انداز کیا' یہاں تک کہ ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش

www.bhutto.org

جنگ کے بعد جو کچھ بچا تھا اس کو بچانے کی کوشش کی۔"

سیلگ ہیریسن کی کتاب "دی وائیڈیننگ گلف" سے حوالہ دینے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اگر 1962ء میں میں صحیح طور پر امریکہ اور چین کے تعلقات کے بارے میں اندازہ لگا سکتا تھا تو پھر میں اپنے ملک کے بارے میں تو اور زیادہ جانتا تھا کہ اسے برصغیر اور خطہ میں کیا رول ادا کرنا ہوگا۔ اسی مقصد سے میں نے جرمن سفارت کار کے ساتھ اپنی گفتگو کا حوالہ دیا ہے جو راولپنڈی میں 1965ء میں ہوئی تھی اور افریقہ کے مستقبل کے بارے میں تھی۔

ایشیائی قوم پرستی میں مختلف عناصر شامل ہیں۔ یہ تصور متحرک بھی ہے اور ارتقائی بھی ہے۔ یہ تصور یقینی طور پر جمود والا نہیں ہے۔ اس کا مطلب اب "ہندوستانی چھوڑ دو" نہیں ہے۔ ایشیائی قوم پرستی کے درخت کی بہت سی شاخیں ہیں۔ وہ اپنا سایہ ایک وسیع و عریض زمین پر ڈالتا ہے۔ وہ کسی قدیم یا جامد نوعیت کی تعریف کو چیلنج کرتا ہے۔ سب سے تباہ کن غلطی جو امریکہ نے ویت نام میں کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نے ایشیائی قومیت کے تصور کو بہت زیادہ آسان کیا تھا' ایشیائی قومیت کے موزیک میں جو قدیم ثقافتوں اور قدیم مذاہب سے ملک بنا ہے کیا کمیونزم ایشیائی قومیت کا ایک حصہ ہے یا ایشیائی قومیت کمیونزم کی تابع ہے۔؟ اس سوال کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس کا انحصار ہر ملک کی تاریخی حیثیت پر ہے کچھ ممالک میں تو ایشیائی قومیت کمیونزم کی تابع ہے اور کچھ ملکوں میں تابع نہیں ہے۔ ایشیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں یہ سوال عملی شکل میں پیدا نہیں ہوا۔

جدید کمیونزم کیا ہے؟ کیا وہ روس کا کمیونزم ہے یا چین کا کمیونزم ہے۔ یا ٹیٹو اور کاسترو کا کمیونزم ہے؟ کیا وہ ویت نام اور کمبوڈیا کا کمیونزم ہے یا انگولا کا قومی کمیونزم ہے؟ کیا یہ یورپی کمیونزم ہے؟ اگر یہ یورپی کمیونزم ہے تو کیا وہ اٹلی کا "تاریخی سمجھوتہ یا مفاہمت" ہے یا پھر اسپین کا کمیونزم ہے جس نے لینن کے اصولوں سے لاتعلقی اختیار کرلی ہے۔ اگر ایشیا کا کمیونزم تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے تو پھر افریقہ کا کمیونزم تو اور بھی زیادہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس امر پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کہ کیوبا والے افریقہ کی گڑبڑ والی سرزمین میں موجود ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تشویش بغیر کسی سبب کے ہے۔ میں اس قسم کا انتہا پسند فیصلہ نہیں کروں گا۔

صورتیں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتی ہیں۔ اس محدود صورتِ حال کو تسلیم کرتے ہوئے میں ویت نام کو دی جانے والی زبردست اور انمول حمایت کا حوالہ دوں گا جو چین نے ویت نام کو دی تھی جس نے مغربی فوجی مداخلت کے خلاف طویل جدوجہد کی تھی۔ جنگ کے خاتمہ کے تین سال کے اندر ہی ویت نام اور چین کے درمیان تعلقات کشیدہ نظر آتے ہیں۔

اگر جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی ہے تو افریقہ کے کچھ حصوں میں کیوبا والوں کی موجودگی کا لازمی طور پر مطلب مستقل تباہی نہیں ہے۔ خواہ سچ ہو یا غلط ہو' ادیس ابابا میں کیوبا والوں اور

www.bhutto.org

ایتھوپیا کی جنتا کے درمیان اختلافات کی افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ بنیادی طور پر افریقہ میں کیمونزم جو اپنا مقصد حاصل کر رہا ہے وہ انگولا یا ایتھوپیا میں کیوبا والوں کی موجودگی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس سبب سے ہے کہ مغربی طاقتوں نے افریقی عوام کی جائز تمناؤں اور حقیقی شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر زائرے میں فوجی مداخلت اس نسل کے کیپٹنگ سے کے ہم خیال لوگوں کے دلوں کو خوش کر سکتی ہے لیکن بالآخر اس کے باعث افریقہ میں کیمونزم کا اثر ورسوخ اس سے زیادہ قائم ہو گیا ہے جس قدر کہ کاسترو کی کوششوں سے براعظم افریقہ میں قائم ہو سکا ہے۔

میں افریقہ میں روس یا کیوبا کی پالیسیوں کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔ میں اصولوں کی وضاحت کر رہا ہوں۔ اصول یہ ہے کہ کوئی بھی طاقت جو افریقی عوام کی جائز تمناؤں سے وابستگی اختیار کرتی ہے اور ان کے صحیح تشخص کے تعین میں مدد دیتی ہے اس کو محض عالمی وابستگیوں اور مطلب پرستانہ مفادات کی بنیاد پر تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کیوبا والا یا روسی شہری خواہ وہ دانشور ہو یا فنی ماہر ہو، اریٹیریا کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو میں ایسے اقدام کو شدید مذمت کا مستحق سمجھوں گا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کی مذمت کروں گا۔ اریٹیریا اپنی آزادی کے واسطے حقیقی جدوجہد کر رہا ہے۔ نہ تو مشرق اور نہ ہی مغرب اس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ ایتھوپیا کا اریٹیریا پر قبضہ جارحیت کے نتیجہ میں محض فتح کے سبب تھا۔ ہمیں اس کی طرف داری کرنی چاہئے۔ جو حق پر ہو۔ ہمیں محض مفادات کی خاطر تعلق کی بنیاد پر پہلے سے متعین کردہ پوزیشن اختیار نہیں کرنی چاہئے۔

نظریاتی معنی میں ایشیا کے مقابلہ میں افریقہ کا ذہن کم پختہ ہے۔ لیکن ایشیا کی طرح افریقہ کی غالب قوت اس کا قومیت اور مساوات کا جذبہ ہے۔ قومی جذبہ کے اس قبائلی اور مختلف النوع تصور میں کیمونزم کے رنگ کی حد کا انحصار روس یا کیوبا یا مشرقی جرمنی کی افریقی براعظم میں موجودگی کے مقابلہ میں مغرب کے ردِ عمل کے طریقہ کار پر زیادہ ہے۔ افریقہ کے بارے میں مغرب کے رویہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ "بدشکل کالے آدمی" کے فخر اور احساس کے جذبہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ صرف زبانی خدمت کی ڈپلومیسی کافی نہیں ہوگی۔ افریقہ کی دونوں ہاتھوں سے لوٹ بند ہو جانی چاہئے۔ یہ کافی رعایت نہیں ہے کہ کسی منی بس میں کسی افریقی کے برابر بیٹھ جایا جائے۔ افریقہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اور وہ تبدیل ہوتا رہے گا۔ افریقہ کے عوام گو کہ قبائلی اور پسماندہ ہیں لیکن وہ بے عزتی کو برداشت نہیں کریں گے۔ ایشیا کی صورت حال اسی طرح پیدا ہوئی۔ افریقہ کی صورتِ حال بھی اسی طرح وقوع پذیر ہوگی اور زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ پیدا ہوگی۔

نوازشِ خسروانہ جتانے اور مربی ہونے کے لمبے چوڑے دعوے کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جنگجو افریقہ کا عام آدمی اب غیر ملکی استحصال کرنے والے کے سامنے زمین پر نہ تو رینگے گا اور نہ ہی سجدہ ریز ہوگا جیسا کہ 1896ء میں اشنتی شاہی خاندان والوں نے کیا تھا۔ اب جو صبح نمودار ہونے والی ہے اس میں

www.bhutto.org

افریقہ قبائلی اور نو آبادیاتی نظام کے ورثہ پر قابو پالے گا اور وہ ایک باعزت و باوقار مستقبل اپنے بچوں کے لئے تعمیر کرے گا جو اس وقت ظلم و تشدد کا شکار ہے۔

مغربی یورپ میں کیا صورتِ حال ہے؟ مغربی یورپ کے نوجوان جو ایک عظیم تہذیب کے سرگرم کارکن ہیں کیمونزم سے کہیں آگے چلے گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کیمونزم پیچھے رہ گیا ہے۔ اس سبب سے دوسری باتوں کے علاوہ اور شاید کچھ بنیادی لحاظ سے مغربی یورپ کی صورتِ حال افریقہ یا ایشیا یا لاطینی امریکہ کے مقابلے میں زیادہ سنگین نوعیت کی ہے۔ مغربی یورپ کو پہلے کٹر مذہبی معنی میں اپنے آپ کو بچانا ہے قبل اس کے کہ وہ چھاتہ بردار فوج کی ڈپلومیسی کے ذریعہ افریقہ کو بچانے کی کوشش کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام مغربی یورپ میں شدید قسم کے عوارض میں مبتلا ہے۔ وہ ترقی کی حدود سے تجاوز کر چکا ہے۔ مغربی اقوام کے لئے کینیز اور جنگ فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اندرونی تضادات اب پھٹ پڑنے کے قریب آ گئے ہیں۔ جدید نسل موجودہ صورتِ حال سے بیزار ہو چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ نوجوانوں نے مغربی یورپ کی کیمونسٹ پارٹیوں سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن مغربی یورپ کی کیمونسٹ پارٹیوں نے نوجوانوں اور محنت کش طبقات کو قطعی طور پر نا امید اور مایوس کیا ہے اس لئے کہ وہ طویل عرصہ تک "ہونے یا نہ ہونے" کے درمیان تذبذب کا شکار رہیں۔ یورپی کیمونزم کے رول کے بارے میں شک و شبہ میں اضافہ ہو رہا ہے کہ آیا وہ زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا قابلِ عمل اور فعال متبادل ہے یا نہیں۔ (یورپی کیمونزم کو برتی عمل کے ذریعہ ناکارہ بنا دیا گیا اور اس طرح ایک انقلابی قوت کی حیثیت سے اسے غیر موثر کر دیا گیا ہے۔ اس کے زوال نے مغربی یورپ میں روس کے سیاسی اثر و رسوخ کو متاثر کیا ہے لیکن انقلابی نظریہ کی حیثیت کو متاثر نہیں کیا ہے۔ اب یہ نظریہ زیادہ جارحانہ شکل اختیار کر رہا ہے۔ نوجوان اور رومانوی تصورات کے قائل افراد زیادہ شدت کے ساتھ تشدد اور گھٹن کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایک نئے متبادل کی تلاش میں ہیں جو ایک بے صبر اور تخیلاتی نسل کی انقلابی اور رومانوی امنگوں کی تکمیل کر سکے۔ وہ پلاسٹک کے دور سے عاجز آ گئے ہیں۔ وہ یورپی کیمونزم کے وعدوں سے بالکل مایوس اور نا امید ہو گئے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یورپی کیمونزم کا سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نام نہاد سمجھوتہ رجعت قہقہری کا باعث ہوا ہے۔ وہ اس رجعت قہقہری کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ وہ آگے بڑھ کر اندھیرے میں کود جانے کو ترجیح دیں گے۔

وہ پسندیدہ نعرہ جس نے مئی 1968ء میں فرانس میں مقبولیت حاصل کی تھی یہ تھا کہ "ممانعت کرنا منع ہے" کوئی شے بھی یورپ کے نوجوانوں کے لئے مانع نہیں ہو سکتی کہ وہ کیمونزم اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں ہی کو مسترد کر دیں۔ ان دونوں نظاموں کی غیر موجودگی میں وہ کون سے نظام کی تعمیر کریں گے؟ کیا ایک نئے فلسفہ کے ساتھ نظام یا ڈھانچہ تعمیر کرنے کے ان کے تصور کا مطلب عمداً خود کو تباہ کرنا ہے؟ یہ بات تو پاگل پن معلوم ہوتی ہے لیکن یورپ کے نوجوان پاگل تو نہیں ہیں۔ اگر عالمگیر دھماکہ

دوسروں کے حکم وہدایت پر ہوتا ہے تو یہ اقدام زیادہ خودداری پر مبنی ہو گا کہ عالمگیر تباہی کے غیر ملکی احکامات سے پہلے اپنے آپ کو چھوٹے پیمانہ پر اور زیادہ انسانی سطح پر خود ہی تباہ کر لیا جائے۔ دل کہتا ہے کہ سچائی کو دریافت کرنا ہے اور دل فیصلہ کر لیتا ہے۔ جب چنگیز خاں منگولیا کے ایک دور دراز گاؤں سے تھوڑے سے سواروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا تو کیا اس نے یہ تصور کیا تھا کہ وہ اور اس کی آئندہ نسلیں یورپ، چین اور بھارت میں اندر تک گھس جائیں گی اور ایک ایسا نظام فراہم کریں گی جو آئندہ کئی نسلوں تک قائم رہے گا؟

تاریخ نے انسانوں کی ایسی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ تباہ کرنے کے مصمم ارادہ سے روانہ ہوئے لیکن تباہ کرنے کے بجائے انہوں نے تعمیری کام کیا۔ تاریخ ان لوگوں کی مثالیں بھی پیش کرتی ہے جو تعمیر کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن تعمیر کے بجائے انہوں نے تخریب کی۔ ساربون نے 'ہائیڈ برگ اور ترینیٹے کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے دلوں میں ایک شعلہ بھڑک رہا ہے لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج کے نوجوان مردوں اور عورتوں کے دلوں میں یہ جذبہ موجزن نہیں ہے۔ صرف وقت ہی بتائے گا کہ آیا یہ شعلہ دنیا کو سوز کرے گا اور نئی روشنی عطا کرے گا یا ساری روشنیاں بجھ جائیں گی۔

مغربی یورپ میں صورتِ حال ایشیا اور افریقہ کے مقابلہ میں اور زیادہ پیچیدہ ہے۔ افریقہ میں اقتدار کا کھیل بالکل ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ ایشیا میں اقتدار کا یہ کھیل ایک طے شدہ تبدیلی بن گیا ہے۔ یورپ میں یہ کھیل اپنے عروج کو پہنچ گیا ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ یورپ کو افریقہ کے بارے میں زیادہ فکر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران صدر روز ولٹ نے کہا تھا کہ "ہمیں خوف کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن ہم خوف کرتے ہیں۔" کیمونزم کا خوف کیمونزم کے مقابلہ میں زیادہ مہلک ہے۔ مغربی یورپ میں کٹر قسم کے کیمونزم کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر ایشیا میں سوائے چین کے یہ قومی جذبہ (نیشنلزم) کے وسیع چشموں میں سما گیا ہے۔ افریقہ میں ایک نئی قسم کا جنگجویانہ نوآبادیاتی نظام اس کی سرپرستی کر رہا ہے اور ضروری نہیں کہ چھوٹے سے کیوبا کا عظیم کاسترو ایسا کر رہا ہو۔ پھر بھی اس نے کوئی حتمی اظہار کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ چند مزید برسوں تک یہ ایک گھومنے والے دروازہ کا کھیل رہے گا اور کرسیوں کی تبدیلی کا کھیل بنا رہے گا۔

مشرقِ وسطیٰ کے بارے میں جس چیز کی مجھے فکر ہے وہ کیمونزم کا چیلنج نہیں ہے۔ کوئی بھی معقول نظام ایسے ممالک میں کامیاب ہو سکتا ہے جہاں غیر محدود قسم کی خوشحالی ہو اور چھوٹی سی آبادی کے تصرف میں ہو۔ جب میں معقول نظام کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد روایتی قسم کا نظام ہوتا ہے جس کو ایک روشن خیال اور محبِ وطن قیادت نے اپنایا ہو اور اس پر معقول انداز میں عمل کیا ہو۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کو فوری خطرہ پڑوسی ممالک کی فوجی جنتاؤں کی مہم جوئی سے ہے۔ فوجی جنتاؤں سے میری مراد

www.bhutto.org

مطلب پرست جنرلوں کی فوجی حکومت ہے اور ترقی پسند پارٹی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے جس میں فوج انقلاب کی ایک منظم اور ماتحت تلوار کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کے سیاسی عزائم رکھنے والے جنرل پڑوسی ممالک کے جنرلوں کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں۔ اور کھیل تماشے کر سکتے ہیں۔ ایک خطرہ تو یہ ہے۔ دوسرا خطرہ اسرائیل کی جانب سے اچانک فوجی کارروائی ہے تاکہ وہ مشرق وسطی کی تیل کی دولت پر قابض ہو سکے۔ اس امکان کو نظرانداز نہ کیجئے۔ جس قدر زیادہ ضدی اور ہٹ دھرم اسرائیلی وزیر اعظم ہوتا ہے اسی قدر یہ خطرہ سر پر زیادہ منڈلانے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسرائیل کے پاس ایٹمی اسلحہ موجود ہے۔ مشرق وسطی اور آس پاس کے علاقہ میں فوجی ڈکٹیٹر شپ ذیلی قومیتوں والے ممالک میں قومی' ریاستی نظام کے جلد ترشکست و ریخت کا باعث ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ کمیونسٹ طاقت کا بالآخر کنٹرول قائم ہو سکتا ہے۔

شہنشاہ ایران نے ایران میں خلفشار کے نتائج کے بارے میں جون 1979ء میں جو تبصرہ کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایران کے تخت طاؤس پر یا تو کوئی بادشاہ جلوہ افروز ہوتا ہے جو اگر ضروری ہو تو آئینی اصلاحات کرتا ہے اور یا یہ تخت طاؤس ایران کے بہت سے عجائب گھروں میں سے کسی عجائب گھر میں رکھ دیا جاتا ہے۔ آخری تجزیہ کے لحاظ سے ایران میں بادشاہت کا متبادل نہ تو ملا کی حکومت ہے اور نہ ہی فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ بادشاہت کا متبادل تودہ پارٹی ہے۔ لبرل جمہوریت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایران میں لبرل جمہوریت کی روایت نہیں ہے۔ یہ بادشاہت کے تحت کام کر سکتی ہے جس میں پارلیمنٹ کو جمہوری اختیارات حاصل ہوں لیکن وہ نگرانی والے کنٹرول کے بغیر جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ اول تو حریص جنرل جمہوریت کی نام نہاد گڑبڑ سے فائدہ اٹھائیں گے' دوسرے اس کے بعد جنرل مال غنیمت کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔ اس کی وجہ سے ان کے اور عوام کے درمیان تنازعہ پیدا ہو گا۔ تو وہ پارٹی ملبہ کو بچانے کی غرض سے اس خلا میں داخل ہو گی جیسا کہ نپولین فرانس کے ملبہ کو بچانے کے لئے منظر عام پر نمودار ہوا تھا یا زار کے زوال کے بعد لینن روس کے ملبہ کو بچانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا یا حال ہی میں ماؤزے تنگ وسطی ریاست کے زوال کے بعد (جو چیانگ کائی شیک کو ورثہ میں ملی تھی) چین کے ملبہ کو بچانے کی غرض سے کمربستہ ہو گیا تھا۔

لاطینی امریکہ عرصہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے زیر سرپرستی ہے۔ اس سے قبل اسپین اور پرتگال کا نوآبادیاتی نظام بڑا ظالمانہ تھا۔ لاطینی امریکہ کو اس کی جبلی صلاحیت کے مطابق ترقی کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جمہوریت کا درخت لاطینی امریکہ کی گرم زمین میں نہیں اگایا گیا۔ میکسیکو میں بادشاہت قائم کرنے کے نپولین سوئم کے مضحکہ خیز تجربہ کے سوائے میکسیکو میں بادشاہت کی روایت موجود نہیں تھی۔ لاطینی امریکہ جذباتی اور پارہ صفت لوگوں کا ایک وسیع و عریض براعظم تھا جہاں نہ تو

www.bhutto.org

بادشاہت کی اور نہ ہی جمہوریت کی دیسی روایت قائم تھی۔ لاطینی امریکہ فوجی ڈکٹیٹروں کا براعظم بن گیا تھا جنہوں نے اسپین اور پرتگال کے غیر ملکی نو آبادیاتی نظام کی جگہ لے لی تھی۔ اور اپنا داخلی قسم کا نو آبادیاتی نظام قائم کیا تھا۔ جمہوری روایت کی عدم موجودگی نے ان کے ظلم و تشدد کو آسان بنا دیا تھا۔ وہ زیادہ تر بلکہ سب ہی امریکہ کی خوشامدیں کرنے والے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کے خیالات مختلف ہوتے تھے تو وہ یا تو برطرف کر دیا جاتا تھا اور یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ ان تذلیل کن حالات نے 1958ء میں کاسترو کو پیدا کیا اور اس ورثہ نے لاطینی امریکہ میں کاسترو کی پوزیشن کو مستحکم کیا ہے۔ چھوٹا سا کیوبا ایک بڑی طاقت کے گوشت میں ایک کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے اور افریقہ میں وہ مغربی یورپ کی طاقتور اقوام کے لئے ایک ڈراؤنے خواب کی طرح ہے۔ لاطینی امریکہ عظیم تبدیلیوں کے دہانہ پر کھڑا ہے۔ یہ تبدیلی خون آشام اور پر تشدد ہوگی۔ یہ عوام اور فوجی جنتا کے درمیان ایک جدوجہد ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس کشمکش میں عوام کی فتح ہوگی۔ مداخلت ہوگی لیکن اس مداخلت کے باعث جنگ اور بھی زیادہ خون آشام اور شدید ہو جائے گی اور عوام کی مکمل فتح یقینی ہو جائے گی۔

افریقہ کے لئے مناسب حل تلاش کرتے ہوئے یہ مشورہ بھی مساوی طور پر درست ہوگا کہ لاطینی امریکہ کے مسئلہ پر بھی روشن خیالی کے طریقہ کار کا اطلاق کیا جائے۔ یہ اس قسم کے معقول اور بے لوث طریقہ کار کا وقت ہے۔ اس کے بعد بہت دیر ہو جائے گی۔ یہ اچھی بات ہے کہ نہر پانامہ کے معاہدات جیسے کچھ بھی ہیں ٹھیک وقت پر ہوئے ہیں ورنہ نتائج طویل المیعاد قسم کے تنازعہ کے حل سے قبل کے سمجھوتہ کے لئے نقصان دہ ہوتے۔ بلاشبہ فیڈرل کاسترو لاطینی امریکہ کے حالات کی پیداوار ہے۔ تاہم یہ کہنا بھی بالکل درست ہوگا کہ وہ لاطینی امریکہ کے بارے میں امریکی پالیسیوں کی پیداوار ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ کاسترو اپنے سگار کے دھوئیں کے غباروں کو لاطینی امریکہ کے ارد گرد اور اب افریقہ کے ارد گرد پھینکنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اور وہ ایسا اس لئے کر سکا ہے کہ امریکہ نے اپنا بنیادی رویہ لاطینی امریکہ کے بارے میں تبدیل کرنے سے اور افریقہ کے بارے میں نظریاتی رویہ اپنانے سے انکار کر دیا ہے۔ دونوں ہی براعظموں کے لئے مساوات اور فراخ دلانہ شراکت کا رویہ درکار ہے۔

مشرقی یورپ حالات سے سمجھوتہ کر رہا ہے جو نظر آتا بھی ہے اور نظر نہیں بھی آتا ہے۔ کمیونزم کے بارے میں مایوسی اور تنقید میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسٹالن کے معاملہ میں کمیونزم کے بارے میں مایوسی اور تنقید میں اضافہ ہو رہا ہے اور اسٹالن کے معاملہ میں کمیونزم کو ایک واحد نظریہ کے طور پر اپنانے پر تنقید میں اضافہ ہوا ہے۔ البانیہ بھی اب کمیونزم سے اس قدر وابستہ نہیں ہے جس قدر کہ وہ چند سال پہلے تھا۔ نیٹو تیس سال پہلے سنگی پن سے مسکرایا تھا۔ سیٹو مشرق اور مغرب کے درمیان اور مشرق اور مشرق کے درمیان پلوں کی تعمیر میں مصروف ہے۔ برانٹ کی سیاست نے نئی راہیں کھول دی ہیں جو دو عشروں قبل نہ تو قابل قبول تھیں اور نہ ہی انہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نئی صورت حال ابھی تک مستحکم تو نہیں ہو

www.bhutto.org

سکی ہے لیکن مجموعی طور پر اس وقت اس کی حمایت ہیلسنکی معاہدہ سے ہوتی ہے۔

بڑی طاقتوں کے تعلقات اور ان کے درمیان تعلقات اثر و رسوخ کے خطوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ فوجی حکمتِ عملی کے گھیراؤ کے تصور سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایٹمی دہشت کے توازن سے متاثر ہوتے ہیں اور ایسے عارضی قسم کے تعلق سے متاثر ہوتے ہیں۔ جس کی نشاندہی وقتاً فوقتاً اشتعال انگیزی اور بیماری کے سے دوروں سے ہوتی ہے۔ یہ تیسری دنیا کے انمول وسائل پر کنٹرول اور غلبہ حاصل کرنے کی تلاش ہے۔ ہم اس کھیل میں شطرنج کے مہروں اور کھلونوں کی طرح اس وقت تک رہیں گے جب تک ہم شطرنج کے مہرے بنے رہنے پر فخر کرتے رہیں گے اور جب تک ہمیں کھلونے بنے رہنے کا شوق رہے گا۔

ایک وقت تھا جب امریکہ کا ایک وزیر خارجہ 70 کلفٹن میں کھانے کی میز سے غصہ کی حالت میں تقریباً اٹھ کھڑا ہوا تھا جب میں نے اس سے کہا تھا چین کے بارے میں اس کے ملک کی خارجہ پالیسی غیر منطقی ہے اور کوتاہ نظری پر مبنی ہے۔ حال ہی میں زبگینو بریزنسکی جو صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر ہیں چین گئے اور ایسی باتیں کیں کہ گویا امریکہ اور چین کے درمیان دتیانت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ مسٹر بریزنسکی تو چینی لیڈروں کو خوش کرنے کے لئے اچھی باتیں کرتے ہیں جبکہ امریکی وزیر خارجہ سائرس وانس روسیوں سے اگر ایسی اچھی نہیں تو کم از کم سنجیدہ قسم کی باتیں سالٹ کے معاہدہ کے بارے میں کرتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ افریقہ میں روس کی پالیسی کو سمجھ میں نہ آنے والی پالیسی کا نام دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں ذہین نہیں ہوں لیکن میں " اسٹریٹجنک اسلحہ " کے اخلاقی معنی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ امریکہ کے " مائی نیوٹ مین " میزائلوں کے بارے میں جو یہ تصور تھا کہ وہ روس کے حملے سے محفوظ ہیں ان کو بھی اب اس لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ روسی میزائلوں کے بالکل صحیح نشانہ پر لگنے کے امکان میں اضافہ ہو گیا ہے اور قبل اس کے کہ " مائی نیوٹ مین " انتقامی کارروائی کرے روسی میزائل اسے تباہ کر سکتے ہیں۔ اب امریکی اس تلاش میں مصروف ہیں کہ " مائی نیوٹ مین " کا متبادل میزائل بنائیں یا اس کے ساتھ کسی دوسرے میزائل کا اضافہ کریں۔ سالٹ معاہدے کے ناقدین کا خیال ہے کہ " مائی نیوٹ مین " کے متبادل میزائل (مثلاً کروز میزائل ' ہاتھ سے پھینکنے والا ایم ایکس میزائل۔ ٹرائیڈنٹ 2 آبدوز میزائل اور بی۔ 52 کے پیچھے چلنے والا بمبار طیارہ) سالٹ معاہدہ اور بی' 1 کینسل کئے جانے کے باعث بنایا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ سالٹ معاہدہ کے پروٹوکول میں تین سالہ توسیع کے امکانات کا انحصار زیادہ تر مزید روسی مراعات پر ہے۔

" اسٹریٹجنک اسلحہ " کی خواہ کوئی تعریف ہو یہ ایک مسئلہ ہے کہ آیا روس دوسرے سالٹ معاہدہ پر مزید مراعات دے گا اور افریقہ میں اپنی پالیسیوں کو بڑھانے سے باز آ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی روس اور چین مذاکرات میں مصروف ہیں جو کبھی تو بڑے گرما گرم ہوتے ہیں اور کبھی اس قدر گرما گرم نہیں ہوتے ہیں۔ جاپان اور وفاقی جمہوریہ جرمنی ایک لبھانے والی صورتِ حال سے بیزار معلوم ہوتے

ہیں۔ یہ دونوں ممالک اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وفاقی جمہوریہ جرمنی تمام ہی حالات میں یورپ کے مسئلہ پر روس کے ساتھ زیادہ مضبوط اور جامع مفاہمت کے امکان کو رد کر دے گا۔ یہی بات جاپان اور چین کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جہاں تک ایشیا کے متعلقہ تھیٹرز کا تعلق ہے' آج کل کی وابستگیوں کے سیاسی جوڑ توڑ میں اس رجحان کو عام بول چال میں "نیشنلائزیشن" کہا جاتا ہے۔

میں مکرر کہتا ہوں کہ صورت حال میں تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ ایک طرف دتیانت ہے۔ دوسری جانب بہت سے نئے تنازعات پیدا ہو گئے ہیں۔ جو علاقائی بھی ہیں اور عالمی بھی۔ درمیان میں بھی ہیں اور اندر بھی۔ ان کے گہرے سیاسی۔ فوجی اور اقتصادی عوامل ہیں۔ کچھ تجزیہ نگار تو کہیں گے کہ ایک نئی سرد جنگ شروع ہوا چاہتی ہے جبکہ کچھ دوسرے تجزیہ نگار اس سے بھی آگے بڑھ کر کہیں گے کہ تیسری عالمی جنگ اس دور کے معنی میں شروع ہو چکی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن دنیا کی حالت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے گزرے ہوئے دن کے نعرے گزرے ہوئے دن کے گیتوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ ان کو سنا جاتا ہے' ان کو استعمال کیا جاتا ہے اور وہ اس طرح جذبات ابھارتے ہیں اور ان میں تموج پیدا کرتے ہیں جیسے کہ "طلسماتی شام" یا "رات کے اجنبی" جیسے گانے میرے جیسے بوڑھے شخص کے دل میں جذبات موجزن کرتے ہیں لیکن میرا خون ان سے نہیں گرمائے گا جیسا کہ وہ 1950ء کے عشرہ میں برکلے میں اور 1940ء کے عشرہ میں جنیوا میں گرمایا تھا جب میں نے وہاں انہیں سنا تھا۔ اس قسم کے الفاظ مثلاً "بندونگ کا جذبہ" "غیر وابستگی" اور "آزاد دنیا" اب بھی جذبات کو ابھارتے ہیں لیکن گرم جوشی ختم ہو گئی ہے اس لئے کہ واقعات نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ نئے نو آبادیاتی نظام کے نہ نظر آنے والے ہاتھ کے بارے میں مشتعل ہونا بے معنی ہے۔ جب کہ جدید اور برہنہ نو آبادیاتی نظام دنیا کے مختلف حصوں میں رونما ہو رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناوابستگی کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ناوابستگی کا زور اس سے زیادہ نہیں ٹوٹا ہے کہ جس قدر کہ سرمایہ دارانہ نظام اور بین الاقوامی کمیونزم کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ ناوابستگی کی تحریک اس سے زیادہ بے حال نہیں ہو گئی ہے جس قدر کہ سرد جنگ کا واقعی خاتمہ ہو گیا یا دیوار برلن مسمار ہو گئی ہے۔

بحران کے حل کرنے کا انگریزوں کا اپنا پراسرار یا عجب طریقہ ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی بہت زیادہ رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ سر فرانسیس ڈریک نے ہسپانوی بحری بیڑے (اسپینش آرماڈا) کی آمد پر جس رد عمل کا اظہار کیا تھا وہی جذبہ بنیادی طور پر داخلی اور خارجی تنازعات کے معاملہ میں برطانوی رویہ پر چھایا رہتا ہے۔ یہ اچھی سیاست ہے کہ بہت زیادہ رد عمل ظاہر کرنے سے باز رہا جائے اور بہت زیادہ کشت و خون

کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ اینڈریو شنک تنقید کرتا تھا لیکن بیرونی بحران کا اکثر حل اسے خیرباد کہہ دینے ہی میں ہوا کرتا ہے۔ انگریزوں کو "ڈیوولیوشن" (پارلیمینٹ سے دوسرے اداروں کو کام کی منتقلی) جیسے الفاظ اختراع کرنے کا بھی ملکہ ہے۔ جب "فیڈریشن" (وفاق) جیسے الفاظ جامد ہو جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ایک عشرہ کے اندر ہی برطانیہ ایک فیڈریشن بن جائے اور ایوان امرا کی جگہ وفاق سینٹ لے لے

——— وفاقی جمہوریہ جرمنی کا معجزہ عام آدمی کی محنت اور نظم و ضبط کا معجزہ تھا۔ ایک اور شکست کے خوف سے مغلوب ہو کر جرمن عوام نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ شکست اور ذلت کو فتح اور عزت میں تبدیل کر دیں گے۔ یہ ایک شکست خوردہ قوم کی بحالی تھی۔ جرمن عوام ایک قابل تعریف مقصد حاصل کرنے کے بعد اب تھوڑا آرام کرنا چاہتے ہیں۔

——— جرمنی کا نوجوان سخت محنت کے نظم و ضبط پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگا ہے۔ نوجوان نسل کا ایک طبقہ اگر کاہلی کو نہیں تو کم از کم آرام کرنے کو اچھا تصور کرنے لگا ہے۔ نوجوان نسل کا یہ طبقہ انگریزوں کی سستی یا کاہلی کو اچھا سمجھنے لگا ہے جبکہ پرانی نسل اس سے نفرت کرتی تھی۔ اور فرانسیسی تو پہلے ہی تن آسانی پر یقین رکھتے ہیں۔

اس قسم کی خصوصیات کا ارتقاء کس طرح مغربی یورپ کے لاوارث نظام کی ضروریات کی تکمیل کرے گا۔ خصوصاً جبکہ نو آبادیات ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا مغربی یورپ اور امریکہ کے اندر کا گہرا بحران نو آبادیاتی نظام کی ایک جنگجویانہ شکل اختیار کرے گا جیسا کہ صدر قذافی نے زائرے میں غیر ملکی آپریشن کے بعد حال ہی میں کہا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تیسری دنیا کے وسائل کو کنٹرول کرنے کی یہ آخری بے تحاشا کوشش فوجی مداخلت کے ذریعہ ہوگی اور تیسری دنیا کی پٹھو حکومتوں کی طرف سے ہوگی؟ شاید ایسا ہی ہو۔ تاہم ڈپلومیسی کا ایک جدید طریقہ نئے قواعد کے ساتھ 1973ء کی رمضان جنگ کے بعد مشکل ہو رہا اور تیل کی قیمتوں میں یکایک اور بہت زیادہ اضافہ کے باعث توجہ کا باعث بنا ہے۔ تیل کی قیمتوں میں یکایک اضافہ کے باعث دنیا بھر کی اقتصادیات شدید بحران اور عدم توازن کا شکار ہو گئی ہیں۔ شمال جنوب کی تفریق زیادہ وسیع ہو گئی ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ انکٹاڈ یا اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس کی پریس کانفرنس کی طفل تسلیوں کے بعد آئندہ مہینہ سات صنعتی ممالک کی بون میں کانفرنس ہوگی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم کیلاہن نے کہا ہے کہ شمال اور جنوب کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ ماضی کے تجربہ کے پیش نظر مجھے شبہ ہے کہ آیا کوئی قابل قدر یا ٹھوس نتیجہ جولائی 1978ء کی بون کانفرنس سے برآمد ہو گا۔ یہ کانفرنس بھی ماضی کی کانفرنسوں کی طرح بے سود اور بے نتیجہ رہے گی۔ ردوبدل یا سمجھوتہ کرنے کے عزم کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ بڑی صنعتی طاقتیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ ان کی اپنی اقتصادیات اس

قدر شدید مشکل میں مبتلا ہیں کہ وہ اس بات کو کہیں زیادہ ترجیح دیں گی کہ گھر پر ہی سخاوت کریں۔ یہ نکتہ تو وہ نہیں سمجھتی ہیں۔ تیسری دنیا خیرات نہیں مانگتی ہے۔ تیسری دنیا اپنا حق طلب کرتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ سرد جنگ کی محاذ آرائی کی ابتداء سے ہوا۔ سرد جنگ کی محاذ آرائی کی جگہ وتیانت نے لے لی۔ اس وقت ہمیں وتیانت کے ساتھ مایوسی کی انحتی ہوئی لہر کا سامنا ہے۔ مئی کے آخر میں صدر کارٹر کی شکاگو میں پریس کانفرنس اور انا پولیس میں ان کی حالیہ تقریر سے ظاہر ہوگا کہ بین الاقوامی طاقت کا کھیل نیم محاذ آرائی یا نیم وتیانت میں تبدیل ہورہا ہے جس کا انحصار اس زور پر ہے جو ان کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ میں نے اپنی کتاب "متھ آف انڈی پینڈینس" (آزادی کا واہمہ) میں اس صورت کو نظر میں رکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ موجودہ تصورات کے خاتمہ کا اور ترجیحات کے از سر نو متعین کرنے کا باعث ہو۔ دو پارٹیوں والا ڈھانچہ جس کی تبلیغ میں نے تیسری دنیا کے لئے کی تھی اور جس کو پاکستان کے واسطے وضع کیا تھا ہوسکتا ہے کہ اس کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔ ناوابستگی کی وتیانت کے زمانہ میں گرتی ہوئی قدر وقیمت نیم محاذ آرائی نیم وتیانت میں جزوی طور پر بحال ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس وابستگیوں کو از سر نو قوی کیا جاسکتا ہے۔

جب میں پاکستان کی قسمت کا نگراں تھا تو 1979ء کے وسط میں میں نے ان خاص قوتوں کے بارے میں ابتدائی تبصرہ کیا تھا جو عالمی سطح پر سرگرم عمل تھیں۔ پھر 1976ء اور 1977ء میں کئی مواقع پر میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ تین خوفناک قوتیں سرگرم عمل ہیں جو کبھی تو ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں کبھی ایک دوسرے سے تنازعہ کرتی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ محاذ آرائی کرتی ہیں۔ یہ قوتیں مذہب' کیمونزم اور نیشنلزم (وطنیت) ہیں۔ یہ تین نظریات افراد اور قوموں کے ذہن کو متاثر کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ بجائے اس کے کہ ہم چمکدار زرہ بکتر پہن کر کسی ایک نظریہ کے لئے جہاد کریں یہ بات علاقائی' عالمی توازن کے حق میں ہے کہ ہم ان کے مشترکہ پوائنٹس (نکات) میں ہم آہنگی پیدا کریں اور تنازع اور ٹکراؤ والے نکات میں تلخی اور شدت پیدا کرنے سے پرہیز کریں۔ میں نے مزید واضح کیا تھا کہ بہتر تو یہ ہے کہ ایسا رول اس طرح ادا کیا جائے کہ اپنا نظریہ نہ تو کمزور ہو اور نہ ہی اس کے ساتھ وفاداری میں کوئی ردوبدل یا سمجھوتہ کرنا پڑے۔ اس کا مطلب "جیو اور جینے دو" سے زیادہ ہے۔ اس کا مطلب سفید یا کالے رنگ کے مقابلہ میں بھورے رنگ پر زیادہ توجہ مبذول کرنا تھا۔ آپ براہ راست یروشلم کی راہ اختیار نہیں کرسکتے اور وہاں محض اس لئے امن وسکون نہیں پاسکتے کہ وہ ایک مقدس شہر ہے۔ افریقہ کے مسئلے کو وہاں سی۔ 41 طیاروں کے ذریعہ چھاتہ بردار فوج اتار کر حل نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ماؤزے تنگ کی غالب خواہش ایک نئے انسان کی تخلیق تھی۔ ایک ایسے نئے چینی کی تخلیق تھی جو انقلاب کے پرچم کو ہمیشہ ہمیشہ بلند رکھے۔ سیاسی افق سے دوبارہ غائب ہوجانے والے تنگ سیاؤ پنگ اس قسم

کا نیا انسان تخلیق کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ انہوں نے اس عظیم کام کو اس صدی کے آخر تک مکمل کرنے کا اپنے آپ کو پابند کیا ہے۔ جو لوگ آنے والی تباہی کے خوف سے مغلوب ہیں وہی لوگ اس تباہی کو لانے والے ہیں۔ جو لوگ موجودہ صورتِ حال کے ساتھ گھبراہٹ کے عالم میں چپکے ہوئے ہیں کہ جیسے وہ ناقابل تغیر ہے وہی لوگ موجودہ صورتِ حال کی جلد تباہی کے ذمہ دار ہیں۔ صورتِ حال میں ناقابلِ تصور باتیں پیدا ہو رہی ہیں اور کمپیوٹر والی یقینی صورتِ حال کم ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کس چیز کا سہارا لیتے ہیں۔ یا کس بات پر بھروسہ کرتے ہیں؟ میں عوام پر بھروسہ کرتا ہوں اور ان کے باطنی ردِ عمل پر اعتماد کرتا ہوں۔ لوگ ہی رہنمائی کرتے ہیں اور لوگوں ہی کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ لیڈر کو عوام کی تمناؤں کا علم ہونا چاہیے اور ان کی تمناؤں کی بنیاد پر عوام کو ایک جرأت مندانہ جہت عطا کرنی چاہیے۔ اس معاہدہ میں دھوکہ بازی سب سے زیادہ مہلک ہے۔

میں نے تنازعہ کے حل سے پہلے سمجھوتہ کی ضرورت کے بارے میں ایک سے زائد بار لکھا ہے۔ تنازعہ کے حل سے پہلے سمجھوتہ غیر معینہ مدت کے لئے نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک نازک و متحرک صورتِ حال کا مستقل حل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عارضی ضرورت ہے۔ عارضی سہل ترکیب یا سہل طریقہ کار نہیں ہے۔ ہمیں اپنے خیالات مجتمع کرنے اور اپنے ذہنوں کو صاف کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں نظریاتی علاقہ دیئے بغیر یعنی اپنے نظریات کو خیرباد کہے بغیر سیاسی جنگ بندی کی ضرورت ہے۔ ہمیں مردہ خیالات کو دفنانے اور تھکن پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جنگ بندی کی ضرورت ہے۔ تنازع کے حل سے پہلے سمجھوتہ باعزت اور برملا ہونا چاہیے۔ دونوں ہی پارٹیوں کو شکست ہوئی ہے یا مجھے یہ کہنا چاہیے کہ کوئی بھی پارٹی جیت نہیں سکتی۔ جنگ بندی کے دوران موجود قوتوں کا مجموعہ ایک نیا نظام یا موجودہ قوتوں کے درمیان مساوات تخلیق کر سکتا ہے۔ خواہ فارمولا کچھ ہی ہو اس کو پرانی اور نئی جنگوں کے میدانِ جنگ میں وضع نہیں کیا جا سکتا۔ نیا بین الاقوامی نظام تیسری دنیا کی سربراہ کانفرنس کے مطالبات کے ذریعہ ہی ابھر سکتا ہے۔ شمال' جنوب کے تنازعہ کا حل (جو مشرق 'مغرب کے تنازعہ کے مقابلہ میں زیادہ سنگین ہے' لازمی طور پر ناقابلِ تنقید دیانتداری کے ساتھ تلاش کیا جاتا ہے۔ حقیقی تخفیفِ اسلحہ کی صورت خود بخود پیدا نہیں ہو جائے گی اور نہ ہی تخفیفِ اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاسوں میں فرسودہ یا گھسے پٹے تبصروں سے پیدا ہو گی حالانکہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے سب سے پہلے 18 سال قبل اس قسم کی کانفرنس کی تجویز پیش کی تھی۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ چین اور فرانس کی شرکت کے بغیر تخفیفِ اسلحہ کے سلسلہ میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا سکتی ہے۔ 18 سال کے بعد میرا موقف یہ ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس بہت تاخیر سے ہو رہی ہے۔ ایک بار پھر واقعات نے بڑی تیزی سے پیش رفت کی ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنسوں کی پناہ میں (جو شاندار کمروں میں منعقد ہوتی ہیں اور جن سے عالمی لیڈر خطاب کرتے ہیں) اسلحہ کا مقابلہ خبط کی حد تک پیدا ہو رہا ہے۔ یہ حد یا سطح خوفناک ہے جس کی کوئی مثال یا نظیر نہیں ہے۔ اس غیر معقول اسلحہ پرستی کی چند خصوصیات کے ذریعہ میں اس صورتِ حال کی وضاحت

www.bhutto.org

کرتا ہوں۔

(1) 1970ء میں دنیا کی اقوام تقریباً 200 ارب ڈالر فوجی اسلحہ پر خرچ کر رہی تھیں۔ جب سے یہ مجموعی رقم 400 ارب ڈالر ہو گئی ہے یا ایک ارب ڈالر یومیہ سے زائد کا اضافہ ہوا ہے۔

(2) دنیا میں باقاعدہ مسلح افواج کا سائز 1978ء میں 23 ملین ہو گیا ہے۔ جو 1970ء کے مقابلہ میں 2 ملین زائد ہے اور 1960ء کے مقابلہ میں 7 ملین سے زائد ہے۔

(3) : ـــ صنعتی ممالک غریب ترقی پذیر ممالک کو 8 ارب ڈالر مالیت کا اسلحہ برآمد کر رہے ہیں جو 1970ء کے مقابلہ میں تقریباً 3 گنا اور 1960ء کے مقابلہ میں چار گنا ہے۔

(4) 1970ء کے عشرہ کی ابتداء کے بعد امریکہ اور روس نے اپنے ایٹمی اسلحہ کے ذخائر میں اضافہ کر دیا ہے جو بجائے 8 ہزار کے 14 ہزار ہو گئے ہیں اور دوسرے ممالک مثلاً برطانیہ 'فرانس 'چین 'بھارت اور شاید اسرائیل کے پاس مزید 500 ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔

اب تک باوجود ہیجان اور دوسروں کی جنگیں لڑنے کے کسی کو بھی فتح حاصل نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی کسی کو شکست ہوئی ہے۔ اگر ہم اسی طرح تذبذب کا شکار رہے تو کسی کو بھی فتح حاصل نہیں ہوگی۔ ہر کوئی خسارہ میں رہے گا۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھی ایک حل ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عالمی لیڈروں نے دنیا کے عوام کو اس صورتِ حال کے واسطے تیار کیا ہے؟ کانفرنسوں 'نیم حلوں یا لکڑہاروں اور سقاؤں کا خون چوسنے کا وقت گزر چکا ہے۔ سرخ پرچم کا لہرانا ان لوگوں کو ذرا بھی خوفزدہ نہیں کرے گا جو صدیوں کی غربت کے باعث رنگ ہی کی شناخت نہیں کر سکتے ہیں۔ روڈیشیا جیسے داخلی سمجھوتے ہماری جنگجویانہ لیکن جائز تمناؤں کے لئے ایک توہین ہیں۔

اردگرد کی بے اطمینانی کے سمندر میں موبوتو جنتا کو ڈوبنے سے روکنے کی غرض سے دو سال کے اندر زائرے میں دوسری بار فوجی مداخلت کی گئی ہے جس کو احمقانہ وجوہات کی بنا پر حق بجانب قرار دیا جا رہا ہے۔ مداخلت کا سبب اس قدر کمزور ہے کہ فرانسیسیوں کی فرانسیسی منطق ناقابلِ یقین ثابت ہو گئی ہے۔ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ موبوتو کا کوئی بھی متبادل موبوتو سے بدتر ہے۔ اس عجیب قسم کے ڈکٹیٹر کو بیرونی فوجی مداخلت کے ذریعہ دوبار عوام کے انتقامی غیض و غضب سے بچالیا گیا ہے۔ پھر بھی اس نے حال ہی میں بڑی بے باکی کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ وہ ایسی کسی بھی مغربی کوشش کو مسترد کر دے گا جو زائرے میں پھیلی ہوئی عام بدعنوانی اور رشوت ستانی کو ختم کرنے پر اصرار کرے گی یا امداد حاصل کرنے کی شرط کے طور پر انسانی حقوق کے بارے میں اصلاحات پر زور دے گی۔ جنرل موبوتو نے کہا کہ "اس کا جواب نفی میں ہے اور قطعی نفی میں ہے۔ میں سنگ سنگ میں قیدیوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا ہوں۔ آپ یہ کیوں قبول کرتے ہیں کہ وہ میرے داخلی معاملات میں مداخلت کریں۔" یہ جنرلوں کے اور فوجی جنتا کے نفرت انگیز دوہرے معیار ہیں جنہوں نے عوام کو ان سے ناقابلِ تنسیخ حد تک متنفر اور بیزار کر دیا ہے۔

کولویزی کی فضا میں سفید اور سیاہ فاموں کے قتلِ عام کی بدبو ابھی مشکل سے ہی حل ہو پائی تھی کہ موبوتو کی

www.bhutto.org

جانب سے شاباک کے تانبے سے مالامال صوبہ میں غیر ملکی فوجی 'انقلابیوں' کا پیچھا کر رہے ہیں اور انھیں ٹھکانے لگا رہے ہیں جبکہ موبوتو بدعنوانی اور رشوت ستانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اور انسانی حقوق کا دفاع کرنے کے لئے غیر ملکی مداخلت کی مذمت کرنا درست خیال کرتا ہے۔ ہر شخص کے بارے میں اس کے احباب کی بنا پر رائے قائم کی جاتی ہے۔ یہ بات فضول نہیں کہی گئی ہے کہ "مجھے بتائیں کہ آپ کے دوست کون ہیں اور میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کیا ہیں۔" شکست تسلیم کئے بغیر تنازع کے حل سے قبل سمجھوتہ یا مفاہمت ہونا چاہئے تاکہ نئے اور منصفانہ اقدار کی بنیاد پر دنیا کے نظام کا از سرنو ڈھانچہ تیار کیا جا سکے۔ یہ آخری موقع ہے اگر در حقیقت آخری موقع بھی ہماری انگلیوں میں سے ہو کر پہلے ہی پھسل نہیں گیا ہے یعنی ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں گیا ہے۔

اس وسیع ڈھانچہ کی گنجائش کے اندر ہمیں اپنی توجہ برصغیر ہند اور ایشیا پر مرکوز کرنی چاہئے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ آبادی میں بے تحاشا اضافہ یا غربت نہیں ہے اور نہ ہی ٹیکنالوجی کی کمی یا عدم موجودگی ہے۔ ان پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم اپنے عوام کو صحیح طور پر استعمال کریں اور ان کی صحیح سمت میں رہنمائی کریں۔ ہمارے عوام منظم اور متحرک ہو جائیں گے اگر ان کو پوری طرح شریک کیا جائے اور ان کو پوری طرح شرکت کے لئے تیار کیا جائے۔ عوام کی غیر استعمال شدہ توانائیوں کو کام میں لانے کے لئے اور انہیں دولت میں وافر حصہ دینے کے لئے اور مستقبل میں امید دلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ صحیح نظام ہو اور صحیح خیالات ہوں۔ جی این پی کو مجنونانہ دوڑ اور آئی ایم ایف کے ساتھ دینے والے قرضے کافی نہیں ہوں گے۔ یہ قطعی طور پر ناکافی ہیں۔ ہمارا چھوٹے پیمانہ پر مسئلہ وہی ہے جو دنیا کا وسیع پیمانہ پر ہے۔ صرف حل تاریخی اور جغرافیائی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ہمارے مسائل کے حل کے لئے سب سے زیادہ خوفناک خطرہ فوجی جنتاؤں سے ہے۔ جو مارشل لاء کے کوڑے پر انحصار کرتے ہیں۔ کیا فوجی جنتا کی اس شکل اور بین الاقوامی سیاسی جنتا کے درمیان کوئی متوازی خط کھینچا جاسکتا ہے؟ فرق یہ ہے کہ بین الاقوامی سیاسی جنتا ظالم اور غیر تربیت یافتہ فوجی جنتا کے مقابلہ میں زیادہ ذہین اور محتاط یا چوکس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہنے کی ترغیب ناقابلِ مزاحمت ہو کہ وہ دونوں بالکل ایک ہیں لیکن اس قسم کا موقف اختیار کرنا بہت زیادہ مبالغہ آمیزی پر مبنی ہو گا۔ بے شک کچھ سطحی اور غیر اہم قسم کی یکسانیت تو دونوں میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ دونوں ہی استحصال کرنے والے ہیں اور دونوں کا تعلق حکمران ٹولہ سے ہے۔

لیکن بنیادی طور پر یہ یکسانیت یا مشابہت منطقی طور پر مناسب اور جائز نہیں ہے۔

ایشیا کے منظر پر وطنیت یا قومیت ہر شے پر چھا جانے والی ہے اس وطنیت کا سب سے نازک پہلو اس میں کمیونزم کا مقام نہیں ہے۔ سب سے زیادہ نازک پہلو اس کے ڈھانچہ کے اندر ذیلی یا قومیت کا مقام ہے۔ یہ مسئلہ از سرِنو پیدا ہوا ہے اور زیادہ شدت سے پیدا ہوا ہے نہ صرف ایشیا میں بلکہ یورپ اور کینیڈا میں بھی اور بظاہر افریقہ میں بھی۔ مغربی یورپ میں یہ برطانیہ اور اسپین میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ صرف

دو مثالیں ہیں۔ مشرقی یورپ میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال یوگوسلاویہ میں پائی جاتی ہے۔ کینیڈا میں یہ کیوبک میں موجود ہے۔ یہ ایک انوکھی صورتِ حال ہے۔ ایک طرف تو دنیا ذرائع مواصلات اور دوسرے ذرائع کی بھرمار کے باعث سکڑتی جا رہی ہے۔ یکجا ہونے کا جذبہ مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ انضمام اور علاقائی تعاون کی جانب رجحان میں تیزی پیدا ہو رہی ہے۔ ہم اسے یورپی مشترکہ منڈی کی شکل میں۔ یورپ کی پارلیمینٹ کے مطالبہ میں اوا اے یو اور ایشین کی شکل میں۔ اسلامی سیکریٹریٹ کی تخلیق میں دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس نسلی اور لسانی انا یکجا ہونے کا جذبہ کے اندر اپنے تشخص پر زور دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔

ایک وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وفاق متضاد دعووں کا حل ثابت ہوگا۔ وفاق اب بھی ذیلی قومیت کا لازمی حل ہے لیکن کچھ مقامات پر وہ ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ شاید یہاں بھی جذبہ اور خواہش نے حل سے آگے پیش رفت کر لی ہے۔ کچھ مقامات میں مسئلے کا حل وقت سے پہلے ہو گیا ہے اور دوسرے مقامات میں تاخیر سے ہوا ہے۔ اس کا اطلاق بھی خراب طریقہ سے اور بے ایمانی کے طریقہ سے کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وفاقی حل میں اعتماد متزلزل ہو گیا ہے لیکن ذیلی قومیتوں کے جذبہ کی تسکین کے لئے اس سے زیادہ معاندانہ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ فوجی جنتا کا غلبہ ہو۔ اسی فضا میں ذیلی قومیتوں کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارتے ہیں۔ جذبہ کی محرومی انتہائی عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ اگر ذیلی قومیت یا وطنیت ایشیائی وطنیت یا قومیت کا سب سے سنگین مسئلہ ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ فوجی حکومت ایشیائی وطنیت یا قومیت کی بدترین دشمن ہے۔ یہ عوام کو حکومت میں شرکت سے محروم کرتی ہے۔ اس سے ذیلی قومیتوں کی انا کو سب سے زیادہ ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ عوام کو نمائندگی کے حق سے محروم کرتی ہے۔ اس سے ذیلی قومیتیں سب سے زیادہ برگشتہ ہو جاتی ہیں۔ اس دور میں ذیلی قومیتیں محسوس کرتی ہیں کہ انہیں دھوکہ دیا گیا ہے اور انہیں گمراہ کیا گیا ہے۔ اسی دور میں ذیلی قومیتیں یہ خیال کرنے لگتی ہیں کہ ان کی آزادی اور ان کے حق خود ارادی کو جھوٹے وعدوں کے ذریعہ دھوکہ سے سلب کیا گیا ہے اور ان جھوٹے وعدوں ہی کے باعث انہوں نے عظیم تر قومی تشخص میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ٹھوس معنی میں تعلق کا فیصلہ کن پہلو خود مختاری اور خود مختاری کی زیادہ سے زیادہ مقدار میں ہے۔

اگر اس مسئلے کا کوئی اطمینان بخش حل نکل آتا ہے اور اگر وہ حل یا سمجھوتہ منصفانہ طور پر کام کرتا ہے تو ایشیائی قومیت یا وطنیت کو جو خطرہ لاحق ہوتا ہے ختم ہو جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں نیشنلزم خود مختاری کے ڈھانچہ پر پلتا بڑھتا ہے۔ فوجی حکومت ایک ہی وار میں خود مختاری کو تباہ کر دیتی ہے۔ جیسے کہ ٹڈی دل کھڑی فصلوں کو ایک ہی حملہ میں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ذاتی طور پر حق جتانے سے محرومی ذیلی قومیتوں کو مشتعل کر دیتی ہے۔ خود مختاری کے ذریعہ انضمام کے بجائے وہ علیحدگی کی جدوجہد میں مصروف ہو کر انتشار کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے خود مختاری کی محرومی قومی اتحاد کے استحکام کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔ جاپان جیسے ایک ہی قوم والے ملک تو

www.bhutto.org

مستثنیات میں سے ہیں۔ چین نے بھی اپنی ذیلی قومیتوں سے مسئلے کا حل اپنے طور پر تلاش کر لیا ہے۔ اس نے ایسا پارٹی کے نظریہ اور خود مختاری کے ذریعہ کیا ہے۔ برما نہایت دولت مند ملک مشہور تھا۔ وہ قیمتی پتھروں اور خام مال سے بھرا پڑا تھا۔ برما ہر سال لاکھوں ٹن چاول برآمد کیا کرتا تھا۔ آج برما ایک عظیم بحران سے دوچار ہے۔ صدر نے ون نے آزادی کی جنگ لڑی ہے۔ اور وہ ایک غیر معمولی طور پر ذہین شخص ہے لیکن اس نے برما کو فوجی جنتا کے تحت طویل عرصہ تک رکھا۔ جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ میں یہ بات افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں اس لئے کہ نے ون میرا ذاتی دوست ہے۔ اس نے اپنی دوستی کا اظہار 1967ء میں کیا تھا جب ایوب خاں کا فوجی جنتا مجھے تنگ کر رہا تھا۔ میں یہ دکھانے کے لئے ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ کر رہا ہوں کہ فوجی جنتا کی حکومت کس طرح ملک کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ انڈونیشیا کے مسئلہ کو سوئیکارنو نے سیاسی چابکدستی اور سیاسی کامیابیوں کے ساتھ بڑی دانشمندی سے حل کیا ہے۔ تاہم یہ مسئلہ انڈونیشیا میں اب بھی باقی ہے۔

صدر سوئیکارنو انڈونیشیا کے بانیوں میں سے تھے۔ انہوں نے مختلف جزائر کو متحد کیا اور ان کے باشندوں کو انڈونیشی قوم بنا دیا۔ انہوں نے اپنے عوام کو ایک مشترکہ زبان دی اور رومن رسم الخط عطا کیا۔ صدر سوئیکارنو نے عورتوں کو پابندیوں سے نجات دلائی۔ انہوں نے ایک ناٹو میں شامل ملک اور آسٹریلیا کی مخالفت کے باوجود مغربی ارئین کو آزاد کرایا۔ وہ بندونگ کانفرنس کے روحانی باپ تھے۔ انہوں نے انڈونیشیا کے عوام کو وقار عطا کیا اور انڈونیشیا کو ایشیا کا ایک سربر آوردہ ملک بنا دیا۔ سوئیکارنو کمیونسٹ نہیں تھے لیکن انہوں نے روس اور چین کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات کو فروغ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ امریکہ کا بہت احترام کرتے تھے اور صدر جان ایف کینیڈی کے لئے ان کے دل میں بڑی گرمجوشی کے جذبات تھے۔ ان معلوم عناصر کے باوجود چین کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات ان لوگوں کو ناگوار تھے جو یہ خیال کرتے تھے کہ چین ایک خطرہ ہے۔ چونکہ چین سے دوستی کرنا ایک گناہ خیال کیا جاتا تھا اس لئے اس گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو لازمی طور پر سیاسی منظر سے ہٹادینا ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے سوئیکارنو کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کی گئی۔ ان کے بارے میں عام سی کہانیاں گردش کرنے لگیں کہ انڈونیشیا کی اقتصادیات گڑبڑ کا شکار ہیں۔ افراطِ زر کی شرح ناقابلِ برداشت ہے۔ سوئیکارنو چین کے پٹھو ہیں۔ وہ انڈونیشیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ خانہ جنگی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ انڈونیشیا کو بچانا ہے۔ انڈونیشیا کو جنرل سوہارتو اور ان کی فوج جنتا نے 1966ء میں گویا تباہی سے بچا لیا۔

1978ء میں انڈونیشیا کی کیا حالت ہے جبکہ جنرل سوہارتو اور ان کی فوجی جنتا کو ملک کو بچاتے ہوئے 12 سال گزر گئے ہیں۔ جنرل عبدل ہارس نسوشن کے الفاظ میں جنہوں نے سوئیکارنو کو اقتدار سے محروم کرنے میں سوہارتو کی مدد کی تھی۔ "سماجی حالات ایک آتش فشاں کی مانند ہیں۔ صورت حال اس

www.bhutto.org

قدر دھماکہ خیز ہے کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ایک بڑی گڑبڑ کا باعث ہو سکتا ہے۔"

انڈونیشیا جو ایک دولت مند اور زرخیز ملک کی شہرت رکھتا تھا۔ اب ڈھائی ملین ٹن سے زائد چاول درآمد کر رہا ہے۔ ملک کے اہم پٹرولیم کے وسائل یا ذخائر ختم ہو رہے ہیں۔ سوئیکارنو کے انتہائی نازک دور میں جس قدر بدنظمی اور بدعنوانی تھی اس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بے چینی اور بے اطمینانی ' بدعنوانی اور بدانتظامی ' ظلم اور طلباء ایجی ٹیشن ' اس وقت انڈونیشیا میں موجود ہے۔ ملک کی تیل کی کمپنی تمینیا 4ء1 ارب ڈالر کی مقروض ہو گئی ہے جس کے باعث انڈونیشیائی اقتصادی بقاء خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اس قسم کی صورتحال سوئیکارنو کے زمانہ میں نہیں ہوئی تھی حالانکہ سوئیکارنو پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ملک کی اقتصادیات کو گڑبڑ کی نذر کر دیا ہے۔ جب سوئیکارنو انڈونیشیا کے صدر تھے تو انڈونیشیا کی یونیورسٹیوں میں کبھی فوج کا قبضہ نہیں ہوا۔ سوئیکارنو کی صدارت کے زمانہ میں انڈونیشیا کی فوج کو مغربی ارئین کو آزاد کرانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ ملائشیا کے ساتھ محاذ آرائی کی حمایت کرنے کے لئے استعمال کیا گیا اور 1965ء کی جنگ میں بھارت کے خلاف پاکستان کی حمایت میں استعمال کیا گیا۔

سوہارتو کی فوجی جنتا کی حکومت کے زمانہ میں انڈونیشیا کی مسلح افواج کو عوام کے خلاف کر دیا گیا ہے۔ انہیں ملک کے نوجوانوں ' صحافیوں اور دانشوروں کے خلاف کر دیا گیا ہے۔ جنرل بارتونو دھار سوتو نے (جو ایک ممتاز سفارتکار ہیں اور فوجی جنتا سے بددل اور مایوس ہو گئے ہیں) اس مہینہ حالیہ احتجاجات کے اسباب کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ "اصل سبب قیادت کی اقتصادی پالیسی سے بے اطمینانی ہے جو بہت زیادہ جی این پی کی حامی اور طرفدار ہے اور دولت کی مساوی تقسیم پر یقین نہیں رکھتی۔ پھر بدعنوانی اور رشوت ستانی ہے اور جمہوریت کا فقدان ہے۔ میں فوج کے حالیہ کردار سے واقعی پریشان ہوں۔ طلبہ پر فوج کے حالیہ حملے جو قطعی طور پر غیر مسلح تھے اس نئی سخت پالیسی کا بظاہر نتیجہ تھے ' فوج کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ عوام میں سے ہے اور عوام کے واسطے ہے۔ لیکن اس قسم کی کارروائی سے تو فوج عوام سے دور ہو جائے گی اور عوام اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔"

سوشلسٹ نظریات کے حامی سوئیکارنو کے زوال کے بعد اور آزاد انٹرپرائز کے حامی سوہارتو کے برسراقتدار آنے کے بعد یہ خیال تھا کہ انڈونیشیا میں غیر ملکی سرمایہ کاری کثرت سے ہو گی۔ سوہارتو کی "مستحکم" حکومت کے بارہ سال بعد صورتحال یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کار انڈونیشیا کے باہر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ جکارتا میں ایک غیر ملکی سرمایہ کار نے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ "انڈونیشیا میں کوئی بات منطقی نہیں ہے۔ میں مستقبل میں غیر ملکی سرمایہ کاری کے بارے میں خاصا مایوس ہوں اور خود ملک کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہوں۔"

سوئیکارنو کے دور کے مقابلہ میں اب زیادہ رشوت ستانی ہے۔ زیادہ بے روزگار ہے اور زیادہ بے اطمینانی کی کیفیت ہے۔ افراط زر کو کنٹرول کرنے اور جی این پی میں اضافہ کرنے کے بارے میں جو لمبے

چوڑے دعوے کئے جارہے ہیں اس کے باوجود زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ گو کہ اس میں کمی بھی نہیں ہوئی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کار ملک سے باہر جارہا ہے۔ اقتصادیات کی حالت زیادہ ابتر ہے۔ طلبہ مشتعل ہیں۔ دانشور نا امید اور مایوس ہیں۔ عوام اپنی ہی فوج سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ قومی تفاخر جس میں سوئیکارنو کے زمانہ میں اضافہ ہوا تھا اب اس میں بہت زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔ سیاسی اور اقتصادی بے اطمینانی کسی بھی لمحہ ایک بغاوت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ پہلے کے مقابلہ میں انڈونیشیا میں کمیونزم زیادہ مضبوط و مستحکم ہے۔

میں سوہارتو کو ذاتی طور پر پسند نہیں کرتا ہوں۔ در حقیقت اپریل 1966ء میں جب میں آدم ملک کی درخواست پر صدر سوئیکارنو کا جکارتا میں مہمان تھا تو میں نے صدر سوئیکارنو کو یہ ترغیب دینے میں معمولی سا کردار ادا کیا تھا کہ وہ جنرل سوہارتو کے ساتھ کھلی محاذ آرائی کرنے کی غرض سے جو منصوبے بنا رہے ہیں ان کو انڈونیشیا کی خاطر اور ایک اور قتلِ عام کو روکنے کی غرض سے ترک کر دیں۔ صدر سوئیکارنو نے آدم ملک کی موجودگی میں عشائیہ کے موقع پر مجھ سے کہا تھا کہ صرف میں ہی انہیں ان کے فیصلہ کو تبدیل کرنے کی کامیاب ترغیب دے سکتا تھا۔ عشائیہ کے بعد آدم ملک نے مجھ سے کہا تھا کہ انڈونیشیا کے عوام میرے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے کہ میں نے صدر سوئیکارنو کو ان کا فیصلہ تبدیل کرنے کی ترغیب دی ورنہ ایسا کشت و خون ہوتا کہ جس کی نظیر نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے ایسا نیک جذبات کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن انڈونیشیا کی موجودہ صورتِ حال تسلی بخش نہیں ہے۔ فوجی جنتا نے دنیا کے ایک امیر ترین ملک کو تباہ کر دیا ہے۔

پاکستان اور انڈونیشیا کی صورتِ حال کے درمیان یکسانیت حیرت انگیز ہے فرق یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ہے۔ اگر بارہ سال کے عرصہ میں فوجی جنتا دنیا کے ایک امیر ترین ملک کو تباہ کر سکتی ہے تو اس امر کا اندازہ لگانے کے لئے کچھ زیادہ تخیل کی ضرورت نہیں ہے کہ فوجی جنتا ایک ہی سال میں دنیا کے غریب ترین ملک کے ساتھ کیا کچھ کر سکتی ہے۔ انڈونیشیا اور پاکستان دونوں ہی ایشیا میں ہیں۔ دونوں مسلم ممالک ہیں۔ دونوں میں فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ دونوں ہی جنتاؤں نے مقبول قیادت کی جگہ سنبھالی ہے۔ دونوں مقبول لیڈروں کی یہ شہرت تھی کہ وہ چین کے اور سوشلسٹ نظریات کے حامی ہیں۔ دونوں ہی عوام کی طاقت اور اپنے ممالک کی عظمت و شان پر یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انڈونیشیا کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ میرا مقصد صدر سوہارتو کو ناراض کرنا نہیں ہے۔ سوئیکارنو کی موت کے 8 سال بعد سوہارتو نے مجبور ہو کر اس شخص کو انڈونیشیا کا ہیرو تسلیم کیا ہے جس کی حکومت کا تختہ انہوں نے الٹا تھا۔ کیا پاکستان کی فوجی جنتا مجھے اس لئے ہلاک کرنا چاہتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد وہ مجھے خراجِ عقیدت پیش کرے؟

ذیلی نیشنلزم ملائیشیا میں زیادہ سنگین نوعیت کا پایا جاتا ہے لیکن ملائیشیا میں اس پر قابو پانے کے لئے سیاسی کوششیں کی جارہی ہیں"۔ اب ہم ہندوستان کو لیتے ہیں۔ بھارت میں فیڈریشن (وفاق)

www.bhutto.org

کئی اسباب کی بنا پر قائم ہے۔ 1952ء کے بھارتی آئین کے ذریعہ اتحاد کے مسئلے کا وفاقی حل تلاش کیا گیا تھا۔ سوائے ڈیڑھ سال کے عرصہ کے جس میں 1975ء میں مسز گاندھی نے ہنگامی حالت نافذ کی تھی' بھارت میں جمہوری حکومت رہی ہے۔ جس میں عوام کی پوری طرح شرکت ہے۔ مجموعی طور پر صوبائی خود مختاری کا احترام کیا گیا ہے۔ بھارت میں فوج نے ابھی تک اپنے آپ کو سیاست میں ملوث نہیں کیا ہے۔ بھارتی قیادت نے اس حساس معاملہ کے احترام میں خاصی ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ بھارتی عوام خصوصاً ہندو علاقائی نیشنلزم کے لئے احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ گاندھی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر بھارت میں مسلمانوں کا وجود ختم ہو جائے تب بھی اسلام دوسرے ممالک میں رہے گا لیکن اگر ہندوؤں کا نام و نشان بھارت سے مٹ جائے تو ہندو مذہب تباہ ہو جائے گا۔ بھارت کا اتحاد ہندو مذہب اور خود مختاری کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ ہندوؤں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ بھارت کو متحد رکھیں۔ بھارت ماتا کا تخیل اور بھارت ماتا کی تقسیم پر غم و غصہ اور نفرت کا اظہار ان ہی جذبات کے باعث ہے۔

بھارت کے اتحاد کا انحصار بہت سے چھوٹے اور بڑے صوبوں کے وجود پر ہے۔ ایک صوبہ باقی بھارت پر اپنا سایہ نہیں ڈالتا ہے۔ اور نہ ہی مسلح افواج یا سول سروس میں یا اقتصادیات پر کسی ایک صوبہ کی اجارہ داری ہے۔

1947ء سے 1971ء تک بھارتی اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے پاکستان کی جانب سے نام نہاد خطرہ کو استعمال کیا گیا۔ 1962ء کے بعد چین کی جانب سے خطرہ کو بھی اس چیلنج میں شامل کر دیا گیا جو بھارتی اتحاد کو درپیش تھا۔ 1977ء کے بعد بھارتی اتحاد کو مستحکم کرنے کا طریقہ بھارتی جنگجویانہ وطن پرستی ہے جس میں ایٹمی حیثیت کا دعویٰ اور برصغیر میں غالب قوت ہونے کا دعویٰ شامل ہیں۔ بھارتی لیڈر اس بارے میں بھی پروپیگنڈہ کرتے ہیں جس کو وہ "پاکستان کی ناکامی" کا نام دیتے ہیں۔ بھارتی جمہوریت کا پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر شپ سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی محدودات کے باوجود بھارت نے کافی اقتصادی ترقی کی ہے۔ وہ اناج کے معاملہ میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں ہیں۔

لیکن ان کامیابیوں کے باوجود میں اب بھی کہوں گا کہ بھارت کے اتحاد کو جو خطرہ لاحق ہے وہ ختم نہیں ہوا ہے۔ اپنی متاثر کن ترقی اور ناقابل تردید کامیابیوں کے باوجود بھارت کے اتحاد کو جو خطرہ لاحق ہے۔ وہ ایک حقیقت ہے۔ ایک اندرونی تحلیل کا عمل جاری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تحلیلی عمل کامیاب رہے یا ناکام رہے۔ نتیجہ کا انحصار کئی عوامل پر ہے جس میں پاکستان کا مستقبل کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ اس کا انحصار بھارت کے عوام اور لیڈروں پر ہے۔ اس کا انحصار خطہ میں ہونے والے واقعات پر ہے اور بڑی طاقتوں کے رویہ پر ہے۔ انتشار کا رجحان موجود ہے۔ کچھ علاقوں میں ان رجحانات نے شدت اختیار کر لی ہے۔ آیا بھارت کا اتحاد برقرار رہتا ہے۔ یا ذیلی نیشنلزم کو بلا آخر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب فی الحال ممکن نہیں ہے۔ اس معاملہ میں بہت سے عناصر ملوث ہیں۔

www.bhutto.org

بھارت کا موزیک انتہائی پراسرار ہے۔ اس کے بہت سے دیوتا ایک ہی مندر کی چھت تلے یا کھلے آسمان کے نیچے رہ سکتے ہیں۔ اگر مندر بہت چھوٹا ہو تو پھر ان میں ٹکراؤ بھی ہو سکتا ہے اور بھارت کو ایسے کشت و خون میں جھونک سکتا ہے جس میں بھائی بھائی کا گلہ کاٹے۔ جواہر لال نہرو ہمیشہ اسی بات سے خوفزدہ رہتے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک وطیرہ رہا ہے۔ اس نمونہ یا وطیرہ کو تبدیل کرنے کے لئے بھارتی قیادت کے پاس جدید ذرائع اور وسائل موجود ہیں۔ لیکن ایک ایسا نمونہ جس کی گہری جڑیں اشوک کے زمانہ تک پھیلی ہوئی ہوں اس میں جدید ذرائع اور وسائل کو چیلنج کرنے کی قوت مزاحمت بھی ہوتی ہے۔ کیا پاکستان نسلوں اور قوموں کے اس انقلابی عمل میں ایک محرک ثابت ہوگا؟

یہ پاکستان کے بارے میں خط نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھ دیتا جس کا عنوان "گلمپسز آف پاکستان ہسٹری" (پاکستان کی تاریخ کے مناظر) ہوتا۔ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ قوم بدترین قسم کے بحران میں مبتلا ہو گئی ہے۔ وہ بقا اور شکست و ریخت کے درمیان سڑک کے بیچ میں کھڑی ہوئی ہے۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد سے ہی بحران کے بعد بحران بڑی تیزی سے آتا رہا ہے۔ اس ملک کی تخلیق کی خاطر لاکھوں جانوں کو قربان ہونا پڑا تھا۔ پاکستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محمد اقبال کا خواب اور قائداعظم محمد علی جناح کی تخلیق ہے۔ کیا خواب میں کوئی غلطی ہوئی تھی' اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ اگلے چند سال میں یہ مسئلہ غالباً طے ہو جائے گا اور شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسا ہو جائے لیکن ایسا بغیر کشت و خون کے نہیں ہو گا۔ یہ عمل ناگزیر نہیں ہے۔ لیکن حکمراں فوجی جنتا کی موجودہ پالیسیاں اس ملک کو اس افسوسناک صورتِ حال کی جانب دھکیل رہی ہیں جو ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ 9 رجون 1978ء کو عوامی جمہوریہ چین کے نائب وزیر اعظم تینگ سیاؤپنگ نے کہا ہے کہ نسل انسانی تیسری عالمی جنگ کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اگر عالمگیر جنگ کی خوفناک تباہی ہوتی ہے تو پاکستان کے مستقبل کا تعین باقی دنیا کے مستقبل کے تعین سے ہو گا۔

ایک وقت تھا کہ قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا۔ بعد میں جب انہیں ہندو نیشنلزم کی تنگ نظر ذہنیت کا یقین ہو گیا جو سیاست اور اقتصادیات پر ہندو غلبہ پر مبنی تھی تو انہوں نے اقبال کے خواب کی تکمیل کی جانب توجہ مبذول کی اور ایسا غیر معمولی عزم کے ساتھ کیا۔ پاکستان کی تخلیق کی مزاحمت ایک ایسی پہاڑ کی چوٹی کی مانند تھی جو ناقابلِ رسائی ہو۔ یہ مزاحمت انڈین کانگریس کی طرف سے اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے کی گئی جن میں مودودی اور ان کی جماعتِ اسلامی شامل تھی۔ گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ بھارت ماتا کی تقسیم کے لئے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ مسلم اکثریت والے صوبوں میں پاکستان کی مزاحمت سر خضر حیات خاں ٹوانہ کی طرف سے ہوئی جو پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور صوبہ میں مخصوص مفادات والے طبقات کے لیڈر تھے۔ بنگال میں یہ مزاحمت شیر بنگال فضل الحق کی پارہ صفت سیاست کے ذریعہ ہوئی۔ (مشکل یہ ہے کہ ہماری سیاست میں بہت سے شیر پیدا ہوتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت

آتا ہے تو وہ بلیاں بن جاتے ہیں) سندھ میں پاکستان کی مزاحمت اللہ بخش کی طرف سے ہوئی لیکن وہ 1943ء میں قتل کر دیئے گئے اور جی ایم سید نے ان کا چوغہ پہن لیا یعنی ان کی پیروی شروع کر دی۔ صوبہ سرحد میں مزاحمت کی قیادت سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں نے کی۔ اور یہاں تک تخلیق پاکستان کی مخالفت کی کہ صوبہ سرحد کی مستقبل میں وابستگی کے لئے ریفرنڈم منعقد کرانا پڑا۔ بلوچستان کے زیادہ تر با اثر سردار پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔ اس معاملے کو طے کرنے کے لئے جو شاہی جرگہ منعقد ہوا تھا اس کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے لئے بہت کچھ کام کرنا پڑا تھا۔ ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ دو قومی نظریہ کے خلاف تھے۔

پھر پاکستان کس طرح عالم وجود میں آیا۔ مسلم عوام نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنے روایتی قسم کے لیڈروں کو مسترد کر دیا اور پاکستان اپنے خون میں رنگے ہوئے ہاتھوں کے ذریعہ حاصل کیا۔ انڈین کانگریس کی معاندانہ پالیسیوں نے اور انگریزوں کے منفی رویہ نے انہیں تخلیق پاکستان کے لئے مزید اکسایا۔ یہ مسلم عوام کے عزم و جذبہ کی فتح تھی جن کی قیادت ایک جرأت مند اور بے باک لیڈر کر رہا تھا۔

قرار داد پاکستان جو مسلم لیگ نے قائداعظم کی زیر صدارت لاہور میں 23 مارچ 1940ء کو منظور کی تھی اس کی دو خصوصیات تھیں۔

(الف) اس نے برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریت والے صوبوں اور علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کے ایک وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔

(ب) اس نے پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کو صوبائی خود مختاری دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اس جذباتی تموج کے زمانہ میں آئینی مسائل پر اور پاکستان کی سرحد کے بارے میں بہت کم توجہ مبذول کی گئی۔ ہر خواب دیکھنے والے نے اپنے خواب کی شاندار تعبیر پیش کی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب تحریک پاکستان پر سورج غروب ہو چکا تھا اور طبل جنگ کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تو صوبائی خود مختاری کے سوال نے اپنا سر اٹھایا۔ بعد کے برسوں میں یہ ایک مرکزی مسئلہ بنا رہا۔

پاکستان کی سیاست کے الجھے ہوئے تانے بانے میں صوبائی خود مختاری کا مسئلہ شروع سے ہی ایک بنیادی مسئلہ بنا رہا ہے۔ آئین سازی کی پہلی کوشش جو بیسک پرنسپلز کمیٹی رپورٹ (بنیادی اصولوں کی کمیٹی رپورٹ) کے نام سے مشہور ہے اسی مسئلہ پر ناکامی کا شکار ہو گئی۔ میرا ارادہ اس موجودہ بحران کی شدت و اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے ان سیاسی غلطیوں کو گنانے کا نہیں ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے کی جاتی رہی ہیں۔ اندرونی طور پر یہ بحران بہت سنگین ہے۔ میں صوبائی خود مختاری کے مسئلہ پر اس لئے بحث کر رہا ہوں کہ یہ ایک محوری یا مرکزی مسئلہ ہے۔ بعد میں یہ بحران پیریٹی (مساوات) کے فارمولا سے پیچیدہ بنا دیا گیا جس کو مشرقی پاکستان کو اس کے جائز حقوق سے محروم کرنے کے لئے عوام دشمنوں نے وضع کیا۔ جس وقت صوبائی خود مختاری کے مسئلہ پر سمجھوتہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا گورنر جنرل غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو غیر قانونی طور پر برطرف کر دیا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس کے گروہ یا گروپ کے

www.bhutto.org

خصوصی مفادات کو آئینی سمجھوتہ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ 1955ء میں مغربی پاکستان میں ایک یونٹ (صوبہ) قائم کر دیا گیا۔ جس سے مغربی پاکستان کے صوبوں کی جیسی کچھ بھی خود مختاری تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ ایک یونٹ اور مساوات کے جڑواں ستونوں پر 1956ء کا آئین دوسری آئین ساز اسمبلی نے تعمیر کیا جو پہلی آئین ساز اسمبلی کی طرح حقیقی معنی میں عوام کی نمائندہ نہیں تھی۔

ایک یونٹ اور مساوات کے اطلاق کا مطلب دو ریاستیں تھا جس میں ایک ریاست کو دوسری ریاست پر غلبہ حاصل تھا۔ دونوں مغربی اور مشرقی پاکستان پر غلبہ کا آلہ کار وہی رجعت پسند جتھایا گروہ تھا۔ 1958ء میں جبکہ عام انتخابات میں صرف پانچ مہینے باقی رہ گئے تھے 1956ء کے آئین کو جنرل ایوب خاں کے پہلے مارشل لاء نے منسوخ کر دیا۔ مارشل لاء کے تحت خود مختاری کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ایسا تین سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک ہوتا رہا۔ 1962ء میں ایوب خاں نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی بنیاد پر اپنا آئین دیا جو بالواسطہ انتخابی کالج پر مبنی تھا اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے صوبوں کے لئے سیاسی خود مختاری کے بجائے انتظامی نوعیت کا تھا۔ سیاسی خود مختاری کا کوئی متبادل نہ ہونے کے باعث خود مختاری کا مسئلہ اور زیادہ شدید ہو گیا۔ وہی رجعت پسند جتھا یا گروہ حکومت کرتا رہا۔ 1969ء میں عوام کی زبردست شورش نے ایوب خاں کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کو منتقل کرتے جیسا کہ خود ان کے 1962ء کے آئین میں درج تھا ایوب خاں نے اپنے فوجی آور دہ یحییٰ خاں کو دوبارہ مارشل لاء نافذ کرنے کے لئے کہا اور اس طرح ملک پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ عوام کے مزاج کو دیکھتے ہوئے جنرل یحییٰ خاں نے بالغ رائے دہی اور ایک فرد ایک ووٹ کی بنیاد پر انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے ایک یونٹ توڑ کر صوبائی خود مختاری بھی بحال کر دی۔ اپنے لیگل فریم ورک آرڈر (قانونی ڈھانچہ کا نظام) کے ذریعہ یحییٰ خاں نے حالات کو اس طریقہ سے ڈھالنے کی کوشش کی کہ جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے عوام کے مطالبات کو تسلیم کر لیا ہے لیکن در حقیقت وہ اپنے اور اپنے گروہ کے اختیارات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ تاہم صورت حال ان کی ریشہ دوانیوں سے کہیں زیادہ آگے نکل چکی تھی۔

برسوں کے ظلم کے بعد جب سیلاب کے دروازے کھلے تو کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ انہیں ایک انقلاب عظیم کے بجز بند کر سکے۔ مجیب الرحمٰن نے محسوس کیا کہ بس اب کافی کچھ ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے مشہور چھ نکات کے انتخابی منشور پر انتخابی مہم چلائی جس کا مطلب کنفیڈرل نوعیت کی صوبائی خود مختاری تھا۔ اس جنگجویانہ فریاد پر اس نے مشرقی پاکستان میں انتخابات میں عظیم کامیابی حاصل کر لی۔ ہماری پارٹی سندھ اور پنجاب میں اکثریت والی پارٹی بن گئی۔ ہم نے مجیب الرحمٰن کو واضح طور پر بتا دیا کہ ہم نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ عزت محسوس کریں گے اگر ہم حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھیں لیکن ایسا ہم صرف وفاقی ڈھانچہ ہی میں کریں گے۔ لیکن اگر ڈھانچہ کنفیڈریشن کا ہوا تو کنفیڈریشن کے دونوں

بازوؤں کو حکومت میں شرکت کرنا ہوگی۔ یہ ایک سادہ سی اور ناقابلِ تنقید تجویز تھی۔ اگر مجیب الرحمن اپنے چھ نکات کے ساتھ اس حد تک سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوتا کہ حکومت کا ڈھانچہ وفاقی نوعیت کا ہو تو وہ بڑی خوشی سے وفاقی حکومت کی تشکیل کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ ہوا اور اس نے کنفیڈریشن بنانے کا تہیہ کر رکھا ہو تو وہ ملک کے دوسرے بازو کی اکثریتی پارٹی کو مسترد کر کے کنفیڈریشن پر حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ مجیب الرحمن اپنے چھ نکات سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے سب کچھ لے لینے یا بالکل چھوڑ دینے کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اس طرح حقیقی تعطل پیدا ہو گیا۔ جنرل یحییٰ خاں نے خیال کیا کہ یہ تعطل انہیں عمر بھر برسرِ اقتدار رہنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لئے فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی فوجی کارروائی نے جس کو کسی معقول سیاسی طریقہ کے مطابق حق بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا تھا بھارت کو نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ 16 دسمبر 1971ء تک ڈھاکہ بھارتی فوج کے قبضہ میں آ گیا اور مغربی پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی بھارت کی تحویل میں آ گئے۔

میں اس وقت اقوامِ متحدہ میں تھا اور ایک ناممکن صورتِ حال کو بچانے کے لئے از حد کوشش کر رہا تھا۔ جب جنرل یحییٰ خاں نے ہونے والی تباہی کا جائزہ لیا اور انہیں شکست ہو جانے کا مکمل یقین ہو گیا اور یہ امکان پیدا ہو گیا کہ کچھ بھی واپس نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو کچھ تھوڑا بہت بچا ہے وہ بھی خطرہ میں ہے تو انہوں نے ایک خصوصی طیارہ مجھے پاکستان واپس لانے کے لئے بھیجا۔ یحییٰ خاں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور شراب کی بوتل ان کے پاس رکھی ہوئی تھی جب 20 دسمبر 1971ء کو صبح کے ساڑھے دس بجے انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ بری طرح ناکام ہو گئے ہیں اور یہ کہ میں شکست خوردہ پاکستان کا چارج سنبھال لوں اس لئے کہ صرف میں ہی باقی ملک کو بچانے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ ان نامبارک حالات میں میں نے سوا بارہ بجے دوپہر کو صدر پاکستان کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

میں نے تمام محاذوں پر بڑی سرگرمی کے ساتھ پیش رفت کی۔ جن اولین کاموں پر میں نے توجہ مبذول کی ان میں آئین سازی کا کام شامل تھا تا کہ آئین صوبائی خود مختاری کے پریشان کن سوال پر جمہوری اتفاقِ رائے سے منظور ہو جائے۔ میں نے اقتصادیات کو مجتمع کیا۔ میں نے اہم سماجی اور اقتصادی اصلاحات کیں۔ میں نے بنگلہ دیش کے مسئلہ کو بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے حل کیا۔ میں نے بھارت کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا جس میں کوئی خفیہ شق نہیں تھی اور سندھ اور پنجاب کا 5 ہزار مربع میل سے زائد علاقہ پاکستان کے لئے واپس لیا۔ میں نے 90 ہزار جنگی قیدی عزت کے ساتھ لئے اور ایسا بغیر جنگی مقدمات کے ہوا جن کے چلائے جانے کا خطرہ تھا۔ میں نے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد کی۔ میں نے امریکہ کی جانب سے اسلحہ کی سپلائی پر جو پابندی عائد تھی اسے ختم کرایا۔ میں نے مسلح افواج کو جدید بنایا۔ میں نے ملک کو دوبارہ راستہ پر ڈال دیا۔ ملک کی بحالی حیرت انگیز تھی۔ مجھے سب سے بڑا اطمینان اس بات سے

حاصل ہوا کہ میں نے جمہوری طریقوں سے ملک کو کل پارٹی آئین دیا۔ 1973ء کا آئین وہ پہلا آئین تھا جس کو ایک جمہوری اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کیا تھا۔ جو اسلام، جمہوریت اور خود مختاری کی بنیاد پر ایک بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ یہ پاکستان کے چاروں صوبوں کے باشندوں کی آواز تھی جس کا اظہار ان کے منتخب لیڈروں نے ایک آئینی دستاویز میں کیا تھا۔ خود مختاری کا مسئلہ جو ایک نسل کے دور سے زیادہ عرصہ تک حل نہیں ہوا تھا جو برصغیر کی سیاست کے لئے زمانہ قدیم سے ایک لعنت سمجھا جاتا تھا آخر کار طے ہو گیا تھا اور عوام اور ان کے منتخب نمائندے مطمئن ہو گئے تھے۔ میں نے ایسی خوشی اور مسرت کی لہر محسوس کی جس سے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

بلند توقعات اور نئے پیدا شدہ اعتماد کے ساتھ ہم نے 1973ء کے آئین کے نظام اور تحفظ کے تحت کام کرنا شروع کیا۔ صوبائی خود مختاری کی جمہوری طریقہ سے وضاحت کی گئی تھی۔ اس نے چاروں صوبوں میں کام شروع کر دیا۔ یہ ایک حیرت انگیز یا معرکہ الا آرا کارنامہ تھا۔ ہماری پارٹی کو پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل تھی اور اس نے ان دونوں صوبوں میں صوبائی حکومتیں تشکیل دی تھیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نہ تو نیپ کو اور نہ ہی اس کی ساتھی چھوٹی جماعت یعنی مفتی محمود کی جمعیت علماء اسلام کو قطعی اکثریت حاصل تھی۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو نیپ نے بلوچستان اسمبلی کے عورتوں کے بالواسطہ انتخاب میں صرف ایک ووٹ کی اکثریت حاصل کی تھی۔ یہ اکثریت اس قدر کم یا برائے نام تھی کہ وہ کوئی مستحکم حکومت نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ صوبائی اسمبلی کی تشکیل ہوئی تھی۔

دوسری باتوں کے علاوہ اس سبب سے کافی ہیرا پھیری ہو رہی تھی۔ دونوں اسمبلیوں میں کچھ با اثر آزاد ممبر تھے لیکن صوبہ سرحد میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔ آزاد ممبروں کے ساتھ بات کرنے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں ان کو ناقابلِ اصلاح موقع پرست خیال کرتا ہوں اور وہ غیر ملکی حکومت کا ورثہ ہیں۔ بہر حال ان دونوں اسمبلیوں کے آزاد ممبران، وفاقی حکومت کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے یا اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے بہت سی دل کو لبھانے والی تجاویز بھیجیں۔ اس قسم کی تجاویز صوبہ سرحد کے آزاد ممبروں کی جانب سے زیادہ تواتر کے ساتھ آ رہی تھیں۔ شروع میں اور کچھ عرصہ کے لئے میں نے حقارت کے ساتھ ان کی تجاویز کو مسترد کر دیا تھا۔ میں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کہہ دیا تھا کہ آزاد ارکان اسمبلی پھسل جانے والے افراد ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہیں۔

میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا تھا کہ نیپ اور جے یو آئی نے بالآخر ایک متفقہ آئین بنانے میں تعاون کیا ہے اور اگر تعاون نہیں بھی کیا ہے تو کم از کم انہوں نے اس سے اتفاقِ رائے کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے مرکزی کمیٹی کے ارکان سے کہا کہ مجھے بہت اہم داخلی اور خارجی معاملات طے کرنے ہیں

اس لئے میں اپنی توانائیوں کو صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آزاد ممبروں کی پارہ صفت حمایت کی بنیاد پر غیر مستحکم حکومتیں برقرار نہیں رکھ سکتا۔ میں نے مرکزی کمیٹی سے کہا کہ دوسری وجوہات کے علاوہ ان وجوہات کی بنیاد پر میں نیپ اور جے یو آئی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں حکومتیں بنائیں۔ میں نے مرکزی کمیٹی کے سامنے وضاحت کی کہ ایسا کرنے سے میرے مسائل میں کمی ہو جائے گی اور نیپ اور جے یو آئی والے بجائے ایجی ٹیشن والی سیاست کے تعمیری نوعیت کی سیاست میں لگ جائیں گے۔ میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کرنے کا انوکھا اور غیر متوقع قدم اٹھایا تاکہ دونوں صوبوں میں نیپ اور جے یو آئی کے درمیان جو ڈانواں ڈول قسم کا اتحاد ہے اس کو استحکام حاصل ہو جائے اور آزاد ممبروں کی پارلیمانی ریشہ دوانیوں کا توڑ ہو سکے۔

نیپ کے حق میں اس قدر خیر سگالی کا جذبہ دکھانے کی کچھ دوسری وجوہات بھی تھیں۔ میری پارٹی اور دوسری پارٹیوں میں بہت سے سیاست داں خصوصاً قیوم خاں کی مسلم لیگ کے سیاستداں اس خیر سگالی کے جذبہ کے اظہار پر بڑے چوکنا اور حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ نہ صرف سیاستداں بلکہ ہمارے معاشرے کے بہت سے طاقتور اور با اثر طبقات پریشان ہو گئے تھے۔ نیپ کا پاکستان کی مخالفت میں ایک طویل اور انمٹ ریکارڈ تھا۔ تخلیقِ پاکستان کے بعد نیپ کے لیڈر بہت برسوں تک یکے بعد دیگرے حکومتوں کے ہاتھوں جیلوں میں رہے تھے۔ جنرل یحییٰ خاں نے جنہوں نے اپنے مارشل لاء کا آغاز نیپ کے ساتھ دوستی کا اظہار کر کے کیا تھا اپنے زوال سے چند ماہ پیشتر ہی اسے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ اب میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کے گورنر مقرر کر کے ایک غیر معمولی اقدام کر رہا تھا اور جے یو آئی کی شرکت میں حکومتیں بنانے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ نیپ کے بارے میں کچھ وائٹ پیپر (قرطاسِ ابیض) دستاویزات اور سپریم کورٹ کا فیصلہ موجود ہے جن میں اس دور کے واقعات کا ذکر ہے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ملک کے دولخت ہو جانے کے بعد میں نے نیپ کے آگے تعاون کا ہاتھ بڑھانے کی انتہائی سنجیدہ اور مخلصانہ کوششیں کیں۔ یہ پالیسی کا نہ کہ موقع پا محل کی سہولت والا معاملہ تھا۔ میرا ایسا کرنے کی وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات ذاتی نوعیت کی یا مطلب پرستی پر مبنی نہیں تھیں۔ کوئی بھی وجہ کسی طرف داری کے سبب سے نہیں تھی۔ میری وجوہات کا اصل سبب پاکستان اور سارے خطہ کا مفاد تھا۔

میری وجوہات بلند خیالی پر مبنی تھیں ' نہ کہ نچلی سطح سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں پاکستان کو ایک اور موقع فراہم کرنا چاہتا تھا۔ میں صاف دل کے ساتھ ابتداء کرنا چاہتا تھا۔

یہ کہنا بالکل فضول بات ہے اور یہ دلیل دینا انتہائی لغو اور بیہودہ ہے کہ میں نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتیں قائم کرنے کے لئے نیپ جے یو آئی کی حکومتوں کو ختم کرنے کی سازش کی۔ اگر میرا یہ مقصد ہوتا تو میں ان دونوں صوبوں میں نیپ جے یو آئی کی حکومتیں بنانے میں اس قدر غیر معمولی طور پر کیوں مدد کرتا۔ مجھے آبادی کے ایک طبقہ کی طرف سے اس تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو مجھے

www.bhutto.org

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نیپ کی حکومتیں قائم کرا کر برداشت کرنی پڑی۔ میں دونوں اسمبلیوں کے آزاد ممبروں کو جھڑکی نہیں دیتا جو وفاقی حکومت کی حمایت و سرپرستی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ مرکز میں تو پی پی پی کی حکومت تھی۔ سندھ اور پنجاب میں بھی پی پی پی کی حکومتیں تھیں۔ مجھے نئے آئین کے تحت جمہوریت کے منظم طور پر ارتقاء میں اور دیرپا استحکام کے حصول میں زیادہ دلچسپی تھی بمقابلہ اس امر کے کہ میں دو صوبائی حکومتوں کو گرا کر ناقابلِ اعتماد آزاد امیدواروں اور کچھ پی پی پی کے ممبروں پر مشتمل حکومتیں بناؤں۔ ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اعلیٰ تر مقاصد زیادہ اہم تھے۔ اس سطح پر کامیابی کا مطلب ہر طرف کامیابی تھا۔ میں اس قدر احمق نہیں تھا کہ میں اپنے عظیم مشن کو خطرہ میں ڈالتا اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پی پی پی کی حکومتوں کو قائم کرنے کے مشکوک اور غیر دلکش مقصد کی خاطر ہر شے کو خدا حافظ کہہ دیتا۔

محاذ آرائی سے نپٹنے کے لئے میری کوششیں جامع قسم کی تھیں۔ میں سانڈ سے لڑنے والے پہلوان کی مانند تھا۔ بہت سے مفاد پرست عناصر چاہتے تھے کہ میں سانڈ کے پیٹ میں تلوار گھونپ دوں لیکن میں ہر بڑی یا بھاگڑ میں ایک طرف کو ہو جاتا تھا یا طرح دے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے ایک دوست نے جن کا اس محاذ آرائی میں کوئی بے جا مقصد نہیں تھا۔ مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا مجھ میں لڑنے کا حوصلہ اور چیلنج قبول کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو وضاحت کرتے ہوئے محاذ آرائی کے وسیع معنی بتائے تھے اور انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر قومی اتحاد کی خاطر یہ بات ناگزیر ہو گئی تو میں نہ صرف ثابت قدم رہوں گا بلکہ سرخرو ہو کر نکلوں گا جو قومی اتحاد کے لئے مفید ہو گا۔ میں نے حساب لگالیا تھا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہر مسئلہ کے حل سے پہلے ایک سمجھوتہ یا مفاہمت کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ جے یو آئی کوئی بڑا عنصر نہیں تھی۔ پارٹی کے لیڈر مفتی محمود ایک معمولی ذہانت والے آدمی تھے جو صرف ہمارے پس ماندہ معاشرہ میں ہی وزیر اعلیٰ ہو سکتے تھے۔ نیپ ایک دوسری نوعیت کی جماعت تھی لیکن اس کی عوامی بنیاد کچھ جنگجو قسم کے لوگوں کی حمایت تک محدود تھی۔ صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع میں نیپ کو کوئی قابلِ ذکر حمایت حاصل نہیں تھی۔ اس کے مضبوط گڑھ ضلع پشاور کے کچھ حصوں میں اور مردان اور صوابی میں تھے۔ اس نے مالاکنڈ میں بھی کچھ پیش رفت کی تھی۔ بلوچستان میں چونکہ قبائلی نظام تھا اس لئے نیپ بلوچستان کے صرف ان علاقوں میں طاقتور تھی جہاں قبائلی سرداروں کا تعلق نیپ سے تھا۔ ایسا خاص طور پر مری، بگتی کے علاقہ میں اور جھلاوان کے مینگل علاقہ میں تھا۔ سیروان کے کچھ علاقوں میں بھی نیپ کے خاصے حامی تھے۔ لسبیلہ، سبی، کچھی اور پختون علاقوں میں اس کا اثر و رسوخ برائے نام تھا۔ کوئٹہ میں بھی نیپ کا کچھ اثر و رسوخ تھا لیکن آباد کاروں کی خاصی آبادی کی وجہ سے یہ اثر و رسوخ زائل ہو گیا تھا۔ ان آباد کاروں میں ہزارہ کے لوگ اور مختلف طبقات کے لوگ شامل تھے۔ پارلیمانی جمہوریت کی ریاضی میں نیپ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

لیکن مسئلہ زیادہ وسیع جہت کا تھا۔ نیپ کے لیڈر خصوصاً بلوچوں میں مخلص اور ذہین تھے۔ میری ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ رائے میں نیپ کے صدر جو ایک سربر آوردہ پختون ہیں ایک ایسے سیاستدان ہیں جن کی استحقاق یا اصلیت سے بڑھ کر قدر و منزلت کی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ ذہین ہیں لیکن وہ مایوس کن حد تک صرف ذاتی تصورات تک محدود ہیں۔ یا تو اپنے ذاتی تصورات کی وجہ سے یا پھر اپنی مزاجی کیفیت کے باعث ان میں یکایک ایک زاویہ نگاہ اپنا لینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور وہ نقصان دہ غلطیاں کرتے ہیں۔ اور مہلک قسم کے غلط اندازے قائم کرتے ہیں۔ وہ فرومایہ اور کم ظرف بھی ہو سکتے ہیں۔ اکبر بگٹی کے علاوہ دوسرے بلوچ لیڈر اس قدر چمک دمک والے تو نہیں ہیں لیکن زیادہ پختہ کار ہیں۔ عوامی مقبولیت اور قیادت کی صلاحیت سے زیادہ نیپ کی اہمیت اس کے موقف یا عزم و یقین میں ہے۔ اس کے موقف ہی کی مقناطیسی اپیل نے ذیلی نیشنلسٹ عناصر کو خصوصاً نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کیا ہے۔ اس کے اسی موقف کے باعث بالآخر میری اس سے محاذ آرائی ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک طویل اور ناخوشگوار جدوجہد ہوگی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس محاذ آرائی کا سنگین ردعمل قومی اتحاد پر ہماری سیاست میں جمہوریت کی حیثیت پر ہوگا۔ ان اسباب کی بنا پر میں کوشش کر رہا تھا کہ نیپ کو "تاریخی سمجھوتہ" کرنے کی ترغیب دوں۔ میں وہی بات کر رہا تھا جو اینلڈ و موروانٹی میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نیپ پاکستان کے اتحاد کے حلقہ میں شامل ہو جائے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اپنا حساب کتاب لگایا تھا۔ نیپ کے لیڈروں نے بھی اپنے اندازے قائم کئے تھے۔ وہ پاکستان کے ایزیکو سلیکگرز ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ ڈھاکہ کے زوال اور افغانستان میں سردار محمد داؤد کے برسر اقتدار آنے کے بعد نیپ کے لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اب ان کے اقدام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ انکے چیلنج کرنے کے رویہ کے باعث میں بلوچستان کی صوبائی حکومت کو برطرف کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ آئین کے تحت میں نے صوبہ بلوچستان میں صدارتی راج نافذ کر دیا اور اکبر بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اکبر بگٹی میری پارٹی کے رکن نہیں تھے انہوں نے میری پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ اس وقت وہ ایک ایسی پارٹی میں شامل ہیں جس کی شناخت ہی مشکل ہے۔ حالانکہ میرا اقدام بلوچستان تک محدود تھا لیکن صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود نے نیپ سے ہمدردی کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے ایسا غالباً برطرف کئے جانے کے خوف سے نہ کہ ہمدردی کی بنا پر کیا۔ اس کے بعد گہرے اور خوفناک بادل آ گئے۔ بلوچستان میں بغاوت کو کچلنا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ اس بغاوت کو کچلنے میں تین سال سے زائد عرصہ لگا۔ فوج کو بغاوت کچلنے کے لئے ملوث کرنا ناگزیر ہو گیا۔ فوجی رول میں توسیع ہوتی رہی۔ اس کے تانے بانے سویلین تقریبات تک پھیل گئے۔

تاہم اگر فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ اس بحران میں میں زبردست سیاسی اور سماجی و اقتصادی

حل کا استعمال نہ کرتا تو فوجی آپریشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ زرعی شعبہ میں میری بنیادی اصلاحات۔ سرداری نظام کا خاتمہ' سڑکوں کی تعمیر۔ دیہاتوں میں بجلی پہنچانے کے کام۔ ٹیوب ویلوں کے لئے کھدائی' ٹریکٹروں کی آوازوں اور دوسرے بہت سے فوائد نے بلوچستان کے غریب لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کردی۔ میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں اور نہ ہی خودستائی کر رہا ہوں' جب میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے خوابیدہ بلوچستان کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے بیسویں صدی میں چلنے کے قابل بنایا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ باقی پاکستان کی حالت اس صدی میں ہے۔

دو مواقع پر میں نے اندازہ لگایا تھا کہ فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا وقت آگیا ہے۔ دونوں ہی مواقع پر فوج کے موجودہ سربراہ نے مجھ سے اپیل کی تھی کہ میں انہیں ڈھیلے سروں کو باندھنے کے لئے آخری توسیع کی اجازت دوں۔ فوجی اقدام کو نمٹانے کے بجائے وہ اور زیادہ اختیارات فوجی اقدام کو نمٹانے کے نام پر طلب کر رہے تھے۔ جب جنرل ٹکا خاں فوج کے سربراہ تھے تو ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ فوج کے موجودہ سربراہ کے برعکس وہ سیاسی یا انتظامی نوعیت کی سفارشات نہیں کرتے تھے۔ جنرل ٹکا خاں اپنی ذمہ داریوں کی فوجی رول تک ہی محدود رکھتے تھے اور وہ غیر فوجی معاملات میں دخل در اندازی نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ شخص حیدر آباد کے مقدمہ میں لوگوں کو پھانسنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ اجازت طلب کرتا رہتا تھا کہ اسے افغانستان میں باغیوں کا پیچھا کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ سول ملازمین پر سخت تنقید کرتا تھا۔ خصوصاً بلوچستان کے آخری چیف سیکرٹری پر چونکہ میں نے مارچ 1977ء کے انتخابات کے ایک مہینہ بعد فوج کو بلوچستان سے واپس بلانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اس لئے یہ صورت حال مجھے اس کی عجیب و غریب باتیں برداشت کرنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔

صوبہ سرحد میں تشدد ہوا اور گڑبڑ ہوئی لیکن کہیں بھی اس پیمانہ پر ایسا نہیں ہوا جیسا کہ بلوچستان میں ہوا تھا۔ اس صوبہ میں بموں کے دھماکے کئے گئے اور تخریب کاری کے طریقے اختیار کئے گئے۔ اسکول اور بنک اس تخریب کاری کی کارروائیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ بدقسمتی سے نوجوان شیرپاؤ پشاور یونیورسٹی میں ایک بم کے دھماکہ میں ہلاک ہو گئے تاہم مناسب مدت کے اندر صوبہ سرحد کی صورت حال قابو میں آگئی۔

افغانستان کے صدر محمد داؤد ان واقعات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں صورت حال کو موثر طور پر کنٹرول کر لیا ہے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں نے بحران پر قابو پالیا ہے تو ایک حقیقت پسند شخص کی طرح انہوں نے مجھے کابل مدعو کیا تاکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات کو طے کیا جاسکے۔ وہ دوسرے متبادل طریقے آزما چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے نہ صرف داخلی بحران پر قابو حاصل کر لیا ہے بلکہ غیر ملکی مداخلت کو بھی غیر موثر بنا دیا ہے۔ جس میں امکانی امداد اور اصل امداد دونوں ہی شامل تھیں۔ پانسہ پھینکا جاچکا تھا۔ میں نے خلوص دل سے بات چیت کے لئے ان کی دعوت پر لبیک کہا۔ جب جون 1976ء کے پہلے ہفتہ میں میں نے

افغانستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو صدر افغانستان نے میرا خوش دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین سال پہلے اپنی پہلی ہی تقریر میں پاکستان کو دھمکیاں دی تھیں جب وہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آیا تھا۔ کابل میں بات چیت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ صدر داؤد چاہتے تھے کہ میں نیپ کے لیڈروں کو خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے رہا کر دوں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب خیر سگالی کا خوشگوار اثر ہو گا تو افغانستان متنازعہ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لے گا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر جن کے تذکرہ کی اس خط میں ضرورت نہیں ہے' میں نے افغانستان کے صدر سے کہا کہ دونوں خیر سگالی کے جذبات پر ایک ساتھ ایک معاہدہ کی شکل میں عمل ہو گا۔ میں نے ان سے کہا کہ انصاف کا توازن لینے اور دینے کے معاہدہ میں ہے جو ایک ہی وقت ہو۔ میں نے نیپ کے لیڈروں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور ان کے خلاف الزامات واپس لینے کو کہا جس کے بدلہ میں انہیں ساتھ ہی ساتھ ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ ہم نے اگست 1976ء میں پاکستان میں مذاکرات جاری رکھنے سے اتفاق رائے کیا۔ میرے کابل سے روانہ ہونے سے قبل ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا۔ اس اعلامیہ میں کہا گیا تھا کہ دونوں ممالک اپنے سیاسی اختلافات کو پرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر طے کریں گے۔

جب داؤد اگست 1976ء میں پاکستان آئے تو یہ بلا آخر طے ہو گیا کہ دونوں جانب سے اکٹھا معاہدہ ہو گا جس پر ایک ساتھ عمل کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان نیپ کے لیڈروں کو رہا کر دے گی۔ اور ان کے خلاف غداری کے الزامات واپس لے لے گی اور افغانستان کی حکومت موجودہ سرحد (ڈیورنڈ لائن) کو تسلیم کرے گی۔ افغانستان اور پاکستان کے دفاترِ خارجہ کے حکام نے اپنے اپنے وزراء کی قیادت میں "پیکیج فارمولہ" کی تفصیلات لاہور میں اگست 1976ء میں بذریعہ تحریر طے کیں۔ طرفین نے اس امر سے اتفاق کیا کہ میں اکتوبر/نومبر 1976ء میں کابل کا دورہ کروں گا اور افغانستان کے صدر کے ساتھ باضابطہ معاہدہ' معاہدہ کے مسودہ کی شرائط کے مطابق کروں گا۔ دیر میں جو گڑ بڑ ہوئی خواہ وہ کسی سازش کے تحت ہوئی یا نہیں اس کے باعث میں نومبر 1976ء میں کابل نہیں جا سکا۔ پھر 6 جنوری 1977ء کو نواب شاہ میں میرے اور پاکستان میں متعین افغان سفیر مسٹر نور احمد اعتمادی کے درمیان یہ طے ہوا کہ میں مارچ 1977ء کے آخر میں کابل جاؤں گا اور ایسا پاکستان میں انتخابات کے ایک یا دو ہفتے بعد کروں گا۔

بلوچستان میں بغاوت کے عروج کے دوران بھی میں آخری سیاسی حل کے بارے میں برابر سوچ رہا تھا۔ میں حیدر آباد جیل میں ایک بلوچ لیڈر سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا اور ایسا وہ سمہ دار درمیانی لوگوں کے ذریعہ کر رہا تھا۔ ان کے ذریعہ میرے اور بلوچ لیڈر کے درمیان خاصا تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ جب لاہور میں اگست 1976ء میں معاہدہ کا مسودہ تیار ہوا تو میں ان روابط کو بہت زیادہ اور فوری اہمیت دینے لگا۔ بلوچ لیڈر کے ساتھ مذاکرات خاصے تفصیلی نوعیت کے تھے۔ نیپ کے صدر کے ساتھ رابطہ کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ 1977ء کے موسم بہار کی اکھاڑ پچھاڑ نے میری غیر منقسم توجہ کو ایجی ٹیشن کی جانب موڑ دیا۔

www.bhutto.org

لاج تو رکھنی ہی تھی۔ فون بالکل بیکار میں تو نہیں بجا تھا۔ ظاہر تھا کہ موجودہ صورتِ حال یا حالت کی طرف واپسی غیر حقیقت پسندانہ ہوتی کہ جیسے تین سال کے عرصہ میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی توقع کا یہ مطلب ہوتا کہ بلوچوں نے جو قربانیاں دیں 'وہ کسی سبب کے بغیر دیں۔ سبب یا کاز کیا تھا؟ ایک عظیم اور آزاد بلوچستان اور پختونستان؟ اگر یہی کاز تھا تو وہ میری حکومت اور پاکستان کے عوام کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ ہم نے مجبوراً محاذ آرائی کا راستہ اختیار کیا تھا تاکہ پاکستان کی مزید شکست و ریخت کو روکا جا سکے اور اس مقصد میں ہم کامیاب ہو گئے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کا مطالبہ میرے لئے اور پاکستانی عوام کے لئے بالکل ناقابلِ قبول تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ناقابلِ عمل تھی کہ فریق مخالف پہلے کی صورتِ حال پر مراجعت کے لئے راضی ہو گا۔ نیشنلزم اور ذیلی نیشنلزم کے تقاضوں کو قومی اتحاد کے ساتھ ہم آہنگ کرنا تھا۔ اور ان کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنی تھی لیکن ایسا ذیلی قومی خواہشات کے معاملہ میں عزت و انصاف کے ساتھ کرنا تھا جن کا اظہار بلوچستان نے ایک بغاوت کی صورت میں کیا تھا۔ سادہ الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ خود مختاری کی حد اور مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ اس خود مختاری میں اضافہ کا تعین میرا کام تھا۔ اور اس کے لئے مجھے اسی قسم کی اتفاق رائے حاصل کرنا تھی جیسا کہ میں نے 1973ء میں حاصل کی تھی۔ درمیانی لوگوں کے ذریعہ بلوچ لیڈر کے ساتھ میرے مذاکرات کا یہی مقصد تھا۔ درحقیقت اس نازک موضوع پر صرف ایک درمیانی آدمی کو اعتماد میں لیا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سینٹ کو زیادہ اختیارات دینے کی گنجائش ہے۔ اس امر کی بھی گنجائش ہے کہ وفاقی فہرست میں سے ایک یا دو چیزیں صوبائی فہرست میں منتقل کر دی جائیں۔ ہمیں اس بارے میں اپنے ذہن کھلے رکھنے چاہئیں کہ آیا کنکرنٹ ۔ جو وفاق اور صوبوں دونوں کے لئے ہو) لسٹ کو برقرار رکھنا چاہئے یا اسے ختم کر دینا چاہئے۔ خود مختاری کے بارے میں نیا سمجھوتہ جمہوری مذاکرات کے ذریعے کیا جائے اور یہ مذاکرات ملک کے حقیقی لیڈر کریں۔

مارچ 1977ء کے انتخابات کے بعد میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اس مسئلے کو مذاکرات کی میز پر طے کروں گا۔ میری طرف یعنی قومی سطح پر بلوچستان میں بغاوت ناکام ہو گئی تھی اور صوبہ سرحد میں تشدد اور اکا دکا گڑبڑ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ معمول کے مطابق حالات کی بحالی ہو چکی تھی۔ میری خارجہ پالیسی کی وجہ سے اس قسم کی خطرناک غیر ملکی مداخلت جیسی کہ افریقہ میں حال ہی میں دیکھی گئی تھی نہیں ہوئی تھی۔ ان مثبت کامیابیوں نے اگست 1976ء میں لاہور میں پاکستان اور افغانستان کے درمیان معاہدہ کے مسودہ کی راہ ہموار کی تھی۔ اب دیرپا سیاسی توازن کے لئے از سر نو مذاکرات شروع کرنے کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا جو ناراض صوبوں کے لئے قابل قبول ہو اور پاکستان کے متحدہ وفاق کے ڈھانچے کے اندر ہو۔ مجھے بلوچ اور پختون لیڈروں کی سوچ کا بھی اندازہ لگانا تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ باعزت سمجھوتہ کا ان کا تصور کیا ہے۔ تاہم ذرا و نا خواب تو ختم ہو چکا تھا۔ درحقیقت اگر حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں تو ہم کم از کم فائدہ کی پوزیشن میں ضرور تھے۔ اور میں یہ بات انتہائی انکساری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ جب بغاوت عروج پر تھی تو

www.bhutto.org

مجھے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں پاکستان، بھارت اور افغانستان کے درمیان سرد جنگ میں نہ آ جائے۔ یہ حقیقت کہ ایسا نہ ہوا میری انتہائی اہم کامیابی تھی۔ بغاوت علاقہ میں محدود رہی اور اس پر قابو پالیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے برعکس اس بغاوت نے بین الاقوامی حیثیت اختیار نہیں کی۔ غیر ملکی دروازے بند کر دینے کے بعد اور راستہ صاف کر دینے کے بعد وقت آ گیا تھا کہ بندوقوں کو نیچے رکھ دیا جائے اور مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ مذاکرات مارچ 1977ء کے انتخابات کے بعد شروع نہیں ہو سکے اس لئے کہ موسم بہار میں ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے ایجی ٹیشن کے حل کا بندوبست کیا ملک میں 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

جولائی 1977ء کے فوجی انقلاب کے بعد جنرل ضیاء الحق نے کابل کا دورہ کیا اور صدر داؤد سے ملاقات کی۔ کابل سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے نیپ کے لیڈروں کو حیدر آباد جیل سے رہا کر دیا۔ مستقبل قریب میں وقت بتائے گا کہ آیا ایسا غیر مشروط طور پر کیا گیا یا مسئلے کے حل سے قبل مفاہمت یا سمجھوتے کی یقین دہانی پر کیا گیا۔ مارچ 1978ء میں صدر داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ دل خوش کن تقاریر ہوئیں۔ تاہم ایک تقریر میں صدر داؤد نے خاص طور پر کہا کہ سیاسی مسئلے ابھی حل ہونا باقی ہیں۔ کوئی مشترکہ اعلامیہ جاری نہیں کیا گیا' جب سردار داؤد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ اگر تیس سال کے تعطل اور ہیجان کے بعد جس میں کبھی کبھی تو بہت زیادہ اضافہ بھی ہوا' میں جون 1976ء میں کابل میں کابل حکومت سے مشترکہ اعلامیہ جاری کرا سکا جو پُرامن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں پر مبنی سیاسی اختلافات کو طے کرنے کے بارے میں تھا تو پھر یہ ایک معمہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کیوں کابل یا اسلام آباد میں ایک مشترکہ اعلامیہ کے ذریعہ اس کی تصدیق و توثیق نہیں کرا سکے۔ اگر کوئی زیادہ اہم خفیہ معاہدہ ان کے درمیان ہوا تھا تب بھی جون 1976ء کے کابل اعلامیہ کا دعا پاکستان اور افغانستان کے عوام کے فائدہ کے لئے اور زیادہ ضروری تھا۔

شاید ایک نیا خفیہ معاہدہ ہوا تھا جب جنرل ضیاء الحق کابل گئے تھے۔ یا جب سردار داؤد مارچ 1978ء میں پاکستان آئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس قدر بڑی کامیابی ہو کہ مشترکہ اعلامیہ کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو۔ داؤد کے پاکستان کے دورہ کے تقریباً ایک ماہ بعد 27 اپریل 1978ء کو افغانستان میں ایک انقلابی تبدیلی ہوئی۔ افغانستان کے نئے لیڈروں نے اعلان کیا ہے کہ پختون اور بلوچ مسئلہ باقی ہے اور یہ کہ وہ اس سیاسی مسئلہ کا حل پاکستان کے ساتھ پُرامن طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ دو مہینوں میں یہ بات کئی بار کہی گئی ہے۔ میں تنقید کرنا نہیں چاہتا لیکن ہماری جانب سے افغانستان میں تبدیلی کا ردعمل تباہ کن تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کی حکومت کی چولیں اس تبدیلی کے باعث ہل کر رہ گئی ہیں جیسے کہ اس پر کوئی ناگہانی آفت نازل ہو گئی ہو۔ اذیت دینے کے ساتھ ساتھ اہانت کرنے کی غرض سے حکومت کے پی این اے کے ساتھیوں نے افغانستان کے انقلاب کے بارے میں انتہائی تباہ کن اور غلط تصورات پر مبنی بیانات جاری کئے۔ چونکہ پریس پر سخت ترین کنٹرول تھا اس لئے افغان ان اشتعال انگیز بیانات کے بارے میں یہی سمجھے کہ ان بیانات کا کوئی تعلق حکومت پاکستان سے نہیں ہے۔ ان پر بعد

www.bhutto.org

میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ بالکل غیر ضروری اعلانات کیے گئے کہ پی این اے کے لیڈروں کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کی جارہی ہیں جن میں افغانستان میں تبدیلی کے بارے میں غور و خوض ہو گا۔

اسی عرصہ کے دوران بھارتیوں نے (جنہوں نے افغانستان کی نئی حکومت کو فوراً تسلیم کر لیا تھا) "بڑے بھائی" کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ بھارتی وزیر خارجہ نے اس قسم کے کئی بیانات دیئے کہ بھارت نے پاکستان کو یقین دلایا ہے کہ افغانستان میں تبدیلی کے باعث گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان بیانات کا مقصد نئے افغان لیڈروں کی پسندیدگی کا حصول تھا اور اس امر کی توثیق کرنا تھا کہ پاکستان کو افغانستان میں تبدیلی کے باعث گھبراہٹ اور پریشانی ہے۔ بھارتی وزیر خارجہ کو مداخلت کرنے اور مربیانہ رویہ اختیار کرنے کا کوئی حق نہیں تھا اور اس کے ایسا کرنے کے باعث معاملات بہتر ہونے کے بجائے اور بھی خراب ہو گئے۔ اس نے ایک ہی پتھر سے دو پرندوں کا شکار کیا۔ پاکستان، افغانستان کے بارے میں اس قدر لاعلم نہیں ہے کہ وہ بھارت کی یقین دہانی یا پسندیدگی پر یقین و بھروسے کرے۔ واشنگٹن میں افغان وزیر خارجہ نے خاص طور پر اس امر کا ذکر کیا کہ پاکستان نے ان کی حکومت کو تاخیر سے تسلیم کیا۔ تخفیف اسلحہ کے بارے میں اقوام متحدہ کا خصوصی اجلاس پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی تنازعات کو اچھالنے کے لئے کوئی مناسب پلیٹ فارم نہیں تھا۔ یہ خصوصی اجلاس تخفیف اسلحہ کے مسئلہ پر بحث کے لئے بلایا گیا تھا۔

اس کے باوجود پاکستان اور افغانستان کے نمائندوں کے درمیان بیانات کا تبادلہ ہوا اور یہ بیانات پاکستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی اختلافات سے متعلق تھے۔ پاکستانی نمائندہ نے اس مشترکہ اعلامیہ کا سہارا لیا جو میں نے جون 1976ء میں افغان حکومت سے حاصل کیا تھا اور جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان بات چیت کی بنیاد قرار پایا تھا۔ حالانکہ صدر داؤد اور جنرل ضیاء الحق کی کابل اور اسلام آباد میں بعد میں ملاقاتیں ہوئی تھیں لیکن نیویارک میں اقوام متحدہ کے خصوصی اجلاس میں پاکستان کے نمائندہ کو میرے جون 1976ء کے اعلامیہ ہی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ وہ مزید پیش رفت کو ظاہر کرنے کے لئے نہ کوئی اور دستاویز پیش کر سکا اور نہ ہی کسی اور معاہدہ یا اعلامیہ کا حوالہ دے سکا۔ ان اسباب کی بنا پر جن کا علم صرف اسی کو تھا پاکستانی نمائندہ نے سمجھوتے کے اس مسودہ کو دبا دیا جو لاہور میں 1976ء میں تیار کیا گیا تھا اور جس میں سیاسی اختلافات کو طے کر دیا گیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ بارہ مہینوں کے عرصہ میں اس تحریک نے تقریباً وہ سب کچھ دوبارہ حاصل کر لیا ہے جو اس نے کھو دیا تھا۔

مارشل لاء حکومت جو صرف طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور بھارت کو خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہے یہ خیال کرتی ہے کہ یہ سارے مسائل اس کے کنٹرول میں ہیں۔ افغانستان میں غیر متوقع تبدیلی نے شروع میں تو اس حکومت کو چیختے چلانے پر مجبور کر دیا لیکن اب جبکہ 28 اپریل 1978ء کو آسمان

نہیں ٹوٹ پڑا اس لئے اب حکومت نے اپنے چیلے چانٹوں کی زیادہ پُرامید توضیحات کو قبول کر لیا ہے۔ اور اس نے اپنے کھوئے ہوئے توازن کو بظاہر دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ اول تو فوجی جنتا کو شروع میں ہی شور شرابا نہیں کرنا چاہئے تھا اور نہ ہی اسے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہئے تھا کہ وہ اس ملک کے عوام کو سزا دینے کے لئے واپسی کا راستہ اختیار کر سکتی ہے۔ آسمان تو نہیں گرا کرتا ہے۔ میں افغانستان میں تبدیلی کے باعث خوفزدہ نہیں ہوں۔ افغانستان میں تبدیلی کے باعث مجھے تو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ حالانکہ میری رائے میں اس ملک کا انقلاب 1971ء میں پاکستان کے دولخت ہو جانے کے بعد اس خطّہ میں رونما ہونے والا سب سے بڑا واقعہ ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا مستقبل اس صورت حال سے قطع نظر متوازن صورتِ حال سے دوچار ہے۔ صدر داؤد بھی مجمع میں شامل ہو جاتے یا اسی رائے کے حامی ہوتے۔

پاکستان کے لئے ایران کی حمایت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ لیکن ایران غیر جانبدار ہو سکتا ہے۔ اگر پاکستان میں عوام کی طرف سے وسیع پیمانہ پر اس کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا جائے۔ من مانی طور پر علیحدہ حقِ رائے دہی کے نفاذ کے باعث اقلیتوں کے ساتھ بہت زیادہ امتیازی سلوک کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ حکومت کی اس سوچ کی نمائندگی کرتا ہے کہ آیا انتخابات منعقد کئے جائیں یا نہیں ہے۔ اور نہ ہی اختلاف روا ہے۔ اس حکومت نے ہر چیز میں گڑبڑ پیدا کر دی ہے۔ افغانستان میں جو تبدیلی ہوئی ہے اس کے بارے میں اس حکومت کا رویہ اشتعال انگیز اور افسوسناک ہے۔ اس حکومت کا طریقہ کار احمقانہ ہے اور حماقت اس کی عادتِ ثانیہ ہے۔ ہم نے اس کے طور طریقوں کی منطق کو دیکھا ہے جو سراسر پاکستان کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ اس کی منطق اس کے غیر منطقی ہونے کا خلاصہ یا دلیل ہے۔

تاریخی۔ جغرافیائی اور نسلی اسباب کے باعث صوبہ سرحد اور بلوچستان کا مسئلہ غیر ملکی سایہ کے تحت چلا گیا ہے۔ اس کا تعلق ان تین جنگوں سے ہے جو انگریزوں نے افغانستان سے لڑی تھیں۔ جو بات چیت برطانیہ اور افغانستان کے درمیان بھارت اور پاکستان کی آزادی سے پہلے ہوئی تھی وہ بغیر کسی تعلق کے نہیں تھی۔

بلوچستان کا ایک حصہ تو پاکستان میں ہے جبکہ دوسرا حصہ ایران میں ہے۔ بلوچستان کا ایک چھوٹا سا حصہ افغانستان میں بھی ہے اور روس میں بھی ہے۔ جب تک کہ میں نے قبائلی علاقوں کے بارے میں پالیسی تبدیل نہیں کی تھی ان حساس علاقوں کے ساتھ پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے غیر ملکیت والے علاقوں کا سا سلوک کیا تھا۔ غیر ملکی عنصر نے خواہ اس کی کوئی بھی اہمیت ہو اس مسئلے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ اس سبب سے خود مختاری کے اندرونی یا داخلی مطالبہ کی بھی وسیع تر تشہیر ہوئی اور اس پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ اس کے علاوہ بلوچستان کی فوجی نقطہ نگاہ سے اہمیت (خصوصاً 1973ء کے تیل کے بحران کے بعد) اس مجموعی صورت حال میں ایک اہم عنصر تھی۔

جن لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ایک یونٹ (صوبہ) تو پاکستان کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک عطا کردہ نعمت ہے اور جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خود مختاری کا مطالبہ "مسلم قومیت" کے تصور کے برعکس و

www.bhutto.org

منافی ہے ان کے خیال میں تو صرف بلوچستان اور صوبہ سرحد ہی "مسلم قومیت" کے بگڑے ہوئے بچے نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک سندھ کا خود مختاری کا مطالبہ بھی محض شور و شغب پر مبنی ہے۔ درحقیقت سندھ میں ذیلی قومیت کا جذبہ زیادہ شدید نوعیت کا تھا۔ سیاسی اور علمی نقطہ نگاہ سے سندھ ان جذبات کے اظہار میں بلوچستان اور صوبہ سرحد سے آگے تھا۔ یہاں بھی سیاسی اثرات کے علاوہ تاریخی اور اقتصادی عوامل نے اپنا کھیل کھیلا۔ سندھ کے مسئلہ کی حالانکہ وہ کچھ لحاظ سے صوبہ سرحد اور بلوچستان کے مقابلہ میں زیادہ شدید نوعیت کا تھا اس قدر زیادہ تشہیر نہیں ہو سکی' اس لئے کہ نسلی اور دوسرے متعلقہ معاملات کو صوبہ سرحد اور بلوچستان کی طرح پڑوسی ممالک میں رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے علاوہ سندھ میں ذیلی قومی جذبہ سندھ آبادی ہی تک محدود رہا اور صوبہ میں غیر سندھی آبادی اس میں شریک نہیں ہوئی۔ غیر سندھی آبادی کا زیادہ تر اجتماع کراچی' حیدر آباد اور سکھر جیسے اہم شہروں تک محدود رہا۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی غیر سندھیوں کی تعداد سندھیوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ وہ کافی اقتصادی طاقت کے مالک تھے۔ زیادہ بہتر طور پر منظم تھے۔ سول سروسز اور مسلح افواج میں ان کے اچھے قدم جمے ہوئے تھے۔ دوسری باتوں کے علاوہ ان وجوہات کی بنا پر یہ خیال کیا گیا کہ سندھ کی ذیلی قومیت والے نعروں کو بغیر کسی مشکل کے دبایا جا سکتا ہے۔

سندھو دیش کی تحریک کو اس لئے سنجیدگی سے نہیں لیا گیا کہ اس کے غیر ملکی روابط نہیں تھے اور وہ اندرونی طور پر گھیرے میں تھی۔ لیکن اس کی اہمیت کو کم سمجھنا غلطی تھی یہ حقیقت ہے کہ سندھو دیش تحریک میں غیر ملکی بلیک میل کا عنصر غائب تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس حساس مسئلے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یا ذیلی قومیت کے جذبہ کو فوجی طاقت کے ذریعہ کچلا جا سکتا ہے۔ 1843ء میں سندھ کی فتح کے عرصہ بعد تک سندھ بمبئی پریذیڈنسی کے ساتھ وابستہ رہا۔ صرف 1936ء میں وہ بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ ہوا۔ سندھ کے بہت سے علاقوں میں کافی تعداد میں ہندوؤں کی آبادی ہے۔ تھرپارکر کے ضلع میں جو بھارتی صوبہ راجستھان کی سرحد کے ساتھ ہے ہندو کچھ سب ڈویژنوں میں اکثریت میں ہیں۔ تھرپارکر کے ٹھاکر اور رانا اپنے علاقہ میں بڑے بااثر ہیں۔ ان کے ازدواجی اور دوسری رشتہ داری کے تعلقات راجستھان کے حکمران شہزادوں کے ساتھ ہیں۔ سرحد کی دونوں جانب حر اور مرید ہیں۔ اس بات کا علم تمہارے لئے دلچسپی کا باعث ہو گا کہ 1965ء کی پاکستان' بھارت جنگ میں جس آخری مقام پر پاکستانی فوج نے قبضہ کیا تھا وہ "بھٹو والی" تھا جو راجستھان میں ہے۔

سندھ اور راجستھان کے درمیان جن روابط کی وابستگیوں کا مختصر طور پر یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ خواہ کتنی ہی کم ہوں لیکن بھارت کے مقاصد و عزائم ان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بھارت نے بھارت ماتا کی تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا ہے۔ اس نے دیکھا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان میں جارحیت کا ارتکاب کرنے میں کامیاب رہا' جیسے ہی بنگالیوں کا خود مختاری کا نعرہ ایک جنگی نعرہ بن گیا۔

مشرقی پاکستان کی غیر بنگالی آبادی کی اس وقت کوئی بھی اہمیت نہیں رہی جب سارا کھیل بگڑ گیا۔ سندھی ہندو جو بھارت منتقل ہو گئے ہیں ان کا بھارت کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں میں کافی اثر و رسوخ ہے۔ جب جنتا پارٹی نے مارچ 1977ء میں انتخابات جیتے تھے تو وزیر اعظم کی نامزدگی کا معاملہ دو معمر بھارتی لیڈروں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تو جے پر کاش نرائن تھے اور دوسرے اچاریہ کرپلانی تھے جو سندھی ہندو تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جب سندھ کے ہندو بھارت جا رہے تھے تو اچاریہ کرپلانی سندھ آئے تھے تاکہ ان لوگوں کی منتقلی میں مدد کریں۔ قائد اعظمؒ نے انہیں ایک پیغام بھیجا تھا جو سندھ کے ہندوؤں کو سندھ کو خیرباد کہنے کی حوصلہ شکنی کرتا تھا نہ کہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اچاریہ کرپلانی کا طنز آمیز جواب تھا کہ "شان سالو ینداا ون مان سا اینداا"۔ ایک اور سندھی ہندو مسٹر اڈوانی نئی دہلی کی جنتا حکومت میں وزیر اطلاعات ہیں۔ اسی طرح با اثر سندھی ہندو انڈین نیشنل کانگریس میں ہیں۔ 1971ء کی پاک 'بھارت جنگ میں بھارتی فوج نے حتمی سیاسی 'فوجی مقصد کے تحت سندھ سیکٹر پر اجتماع کیا تھا۔ بھارت کے طویل المیعاد اور غیر مصالحانہ مقاصد کے پیش نظر یہ بات ذرا بھی حیرت کا باعث نہیں تھی کہ افغانستان کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے والی حکومتوں میں بھارت کی حکومت کا دوسرا یا تیسرا نمبر تھا۔ اس صورت حال کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے میں نے کراچی کی بندرگاہ کی اہمیت پر روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ ہی سندھ کی بڑی بلوچ آبادی کے بارے میں کچھ کہا ہے۔ جو سندھیوں کے زمرہ میں نہیں آتی۔ اور نہ ہی اندرون سندھ کی پختون آبادی کا ذکر کیا ہے جو غیر سندھیوں میں شامل نہیں ہیں اور نہ ہی کراچی میں پختون مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کے بارے میں کچھ کہا ہے۔

جب میں پاکستان کا صدر بنا تو سندھو دیش تحریک عروج پر تھی۔ پاکستان پر میرے ساڑھے پانچ سالہ کنٹرول کے دوران میں نے رفتہ رفتہ لیکن بڑی حد تک اس علیحدگی کے جذبہ کو غیر مؤثر بنا دیا اور نوجوانوں کے خیالات کو پاکستانی قیمت کے اصل دھارے کے اندر سمو دیا۔ 1970ء کے انتخابات میں میری پارٹی نے جو قومی پیغام کی علمبردار تھی سندھو دیش کی تحریک کے دیوتا کو 30 ہزار سے زائد ووٹوں سے شکست دی اور ایسا خود اس کے حلقہ انتخاب میں کیا۔ یہ ایک زبردست کامیابی تھی جو سندھو دیش تحریک کی آگ کو بجھا سکتی تھی۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک بڑی طاقتور تحریک تھی اور مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہے کہ اس کا احیاء اب اس قدر تیز رفتاری جنرل ضیاء الحق کی کابل اور اسلام آباد میں ملاقاتوں کے درمیان صدر داؤد نے اگست 1976ء کے سمجھوتہ کی کسی سفارتی عیاری کے ذریعہ شکل بگاڑ دی ہو۔ پاکستان کے لئے یہ کس قدر بدقسمتی کی بات تھی کہ جو مسئلہ برسوں کی انتھک کوششوں کے بعد حل ہو گیا تھا ایک بار پھر متنازعہ بن گیا تھا۔ اب جھولا یا ہنڈولا پاکستان کی طرف چلا گیا تھا۔ پاکستان میں ہر بنیادی مسئلے کو از سر نو چھیڑا گیا ہے اور یہ مسئلہ بھی ان از سر نو چھیڑے جانے والے مسائل میں شامل ہے۔

پاکستان اپنی جہت اور استحکام کے احساس سے محروم ہو گیا ہے۔ ملک تاریکی کی حکومت کے تحت

www.bhutto.org

ہے۔ اس کے برعکس افغانستان سیاسی رجحان رکھنے والی قیادت کے تحت آ گیا ہے۔ نئی حکومت نے پالیسی بیانات دیئے ہیں جن میں عوام کی اعلیٰ ترین حیثیت اور اختیارات کو تسلیم کیا گیا ہے اور ثقافتوں کی مساوات کا ذکر کیا گیا ہے۔ نئے افغان لیڈر اصلی پختون ہیں لیکن ان میں نسلی تعصب نہیں ہے۔ نئی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ناوابستگی ہوگی۔ تاہم ایک پڑوسی بڑی طاقت کے ساتھ اس کا اعتماد کا رشتہ ہے۔ اگر یہ پڑوسی بڑی طاقت ایک ارب ڈالر سے زائد کا فوجی سازوسامان صومالیہ کو فراہم کر سکتی ہے اور اسے غیر اہم کہہ کر معاف کر سکتی ہے تو وہ اس خطہ میں اور بھی زیادہ جرأت مندانہ اقدام کر سکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بڑی طاقت افغانستان کو اربوں ڈالر مالیت کی فوجی امداد فراہم کر سکتی ہے جس میں جدید ترین میزائل '42 بھی شامل ہیں۔ یہ جدید ترین اسلحہ کابل کے بازاروں میں تو نہیں رکھا جائے گا۔ افغانستان کے وزیر خارجہ نے نیویارک میں کہا کہ صرف پاکستان کے ساتھ افغانستان کے سیاسی اختلافات ہیں۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ ایران کے ساتھ افغانستان کا نہ تو کوئی تنازعہ ہے اور نہ تھا فوجی جنتا کی رجعت پسند اور روشن خیالی کی مخالف پالیسیوں کے باعث برگشتہ ہیں۔ فوجی جنتا کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ و تعلق نہیں ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت ہے۔ صحافیوں کے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے۔ سیاستدانوں کو بلا امتیاز جیلوں میں بھر دیا گیا ہے۔ سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے گئے ہیں۔ طلبہ کے جذبہ کو کچل دیا گیا ہے اس لئے کہ اسے انتشار اور گڑبڑ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کو چادروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اعلیٰ حکام اور پولیس والے کسی نگراں کنٹرول کے بغیر کام کر رہے ہیں۔ رشوت اور بدعنوانیوں میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ حکومت کے پی این اے کے دوستوں کو بھی دھوکہ دیا گیا ہے اور فوجی جنتا نے انہیں چکمہ دیا ہے۔ ان کو فوجی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے ناجائز طور پر استعمال کیا گیا اور مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان کو حکومت کی کوششوں میں آسانی پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اقتصادیات گڑبڑ کا شکار ہیں۔ سارے اداروں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ پارلیمینٹ ایسی ہی بے جان ہے جیسے کہ دروازہ کی کیل بے جان ہوتی ہے۔ 1973ء کے آئین کو چھ فٹ زمین کے اندر دفن کر دیا گیا ہے۔ حکومت ہر جگہ ناکام ہو گئی ہے۔ اس کی شیروانی استعمال کرنے کی مہم بھی ناکام ہو گئی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ حکومت تنہا ہے اور اس سے عوام نفرت کرتے ہیں ایران کس طرح اس حکومت کو غیر ملکی مداخلت کی صورت میں بچا سکتا ہے؟ اس قسم کی صورت حال میں یا تو ایران علیحدہ یا غیر جانبدار رہنے کے لئے مجبور ہوگا یا پھر وہ ایران کے مفادات اور اس کی سالمیت کے تحفظ کی خاطر مداخلت کرے گا۔

یہ خیال کرنا تو نری حماقت بلکہ دیوانہ پن ہے کہ چونکہ جنرل ضیاء الحق نے بھارت کو "ایک پیارا اور عظیم پڑوسی" کہہ دیا ہے۔ اس لئے بھارت کی موجودہ قیادت الگ کھڑی دیکھتی رہے گی اور دوسرے اس کے حصے بخرے کرتے رہیں گے۔ جنرل ضیاء الحق خواہ بھارت کو خوش کرنے کے لئے کچھ ہی کریں

www.bhutto.org

اور خواہ کشمیر کے بارے میں خفیہ شرائط کی بات کریں جن کا کوئی وجود نہیں ہے بھارت ' پاکستان سے پورا پورا فائدہ حاصل کر کے رہے گا۔ 12 / جون 1978ء کو بھارتی وزیر اعظم نے امریکہ میں کہا کہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی خاطر بھارت چین کے خلاف اپنے سرحدی علاقہ کے دعوے کو ترک کر دے گا۔ صرف دو مہینے پیشتر بھارتی وزیر اعظم نے پاکستانی صحافیوں سے کہا تھا کہ بھارت چین سے وہ علاقہ دوبارہ حاصل کرنے پر اصرار کرے گا جس کو وہ لداخ میں بھارتی علاقہ کہتے ہیں۔ اس غیر مفاہمانہ یا غیر مصالحانہ رویہ کا اظہار افغانستان میں انقلاب سے پہلے کیا گیا تھا۔ دو مہینے بعد یہ مخالف رویہ چین کو غیر جانبدار بنانے کی غرض سے اختیار کیا گیا ہے تاکہ پاکستان پر کسی جانب سے حملہ کی صورت میں چین غیر جانبدار ہو جائے۔ اسی بات کو ایک پختون لیڈر نے 1972ء میں " پاکستان کی تین طرفہ تقسیم " کہا تھا۔ پاکستان کا خاتمہ تو بھارت کا ایک مقدس اور غیر متزلزل مشن تھا۔ یہ خیال کرنا تو انتہائی حماقت ہوگی کہ کشمیر یا سلال بند یا تجارت کے بارے میں بھارت کو خوش کرنے سے بھارت باقی ماندہ پاکستان پر اپنی حریصانہ نگاہیں ڈالنا بند کر دے گا۔

اس کے برعکس مراعات تو بھارت کی بھوک یا طمع میں اور بھی اضافہ کرتی ہیں۔ مصالحت و مفاہمت اور اپنے حقوق و مفادات سے دست برداری تو بھارتی قیادت کو اور زیادہ یقین دلاتی ہے کہ پاکستان ایک خوددار قوم کی حیثیت سے باقی رہنے کا عزم کھو چکا ہے۔ بھارتی مداخلت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ شک صرف اس بارے میں ہے کہ مداخلت کرنے والی طاقتوں کے درمیان پاکستان کے چاروں صوبوں کی تقسیم کس طرح ہو۔ آج کل مرار جی ڈیسائی اور اٹل بہاری باجپائی کان کے کچے مارشل لاء حکمرانوں کے کانوں میں میٹھے اور سریلے الفاظ بول رہے ہیں۔ یہ صرف ان کی چال ہے۔ باجپائی جن سنگھ کا لیڈر رہا ہے۔ خواہ وہ آج کل کچھ بھی کہیں نہ تو اس کے اور نہ ہی جن سنگھ کے تعارف کی کوئی ضرورت ہے۔ جہاں تک مرار جی ڈیسائی کا تعلق ہے تحریکِ پاکستان کے معمر سیاستدان اس امر کی تصدیق کرنے کے لئے ابھی زندہ ہیں کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو چھوڑتے ہوئے کوئی دوسرا کانگریسی لیڈر پاکستان کا اس قدر مخالف نہیں تھا جس قدر کہ بھارت کے موجودہ وزیر اعظم تھے۔ نہرو اور اندرا گاندھی کی شہرت زیادہ وسیع القلب اور روادار ہونے کی تھی۔ ان کو اس قدر متعصب نہیں خیال کیا جاتا تھا جس قدر پٹیل اور ڈیسائی کو متعصب سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلہ میں صدر رچرڈ نکسن نے اپنی حالیہ شائع شدہ یادداشتوں میں پاکستان کے بارے میں بھارتی لیڈروں کی دغابازی اور مکاری کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو یہاں نقل کرنا مناسب ہو گا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ ......

" 4 / نومبر کی صبح کو میں نے اوول آفس میں بھارت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات کی۔ ان کا واشنگٹن کا دورہ ایک نازک وقت میں ہوا تھا۔ آٹھ مہینے قبل مشرقی پاکستان میں صدر یحییٰ خاں کی

www.bhutto.org

حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی تھی۔ بھارتی حکام نے اطلاع دی تھی کہ تقریباً ایک کروڑ مہاجرین مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر بھارت میں داخل ہو گئے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یحییٰ خاں کو بالآخر مشرقی پاکستان کے آزادی کے مطالبہ کو ماننا پڑے گا۔ اور ہم نے ان پر زور دیا تھا کہ وہ زیادہ مصالحانہ اور اعتدال پسند رویہ اختیار کریں۔ ہمیں یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ بھارت کس حد تک اس موقع کو نہ صرف مشرقی پاکستان میں پاکستان کے کنٹرول کو ختم کرنے کے لئے استعمال کرے گا بلکہ وہ مغربی پاکستان کو بھی کمزور کرنے کے لئے اس موقع کو استعمال کرے گا۔"

"مسز گاندھی نے میری بے حد تعریف کی کہ میں ویت نام کی جنگ کو سمیٹ رہا ہوں اور چین کے معاملہ میں جرأت مند اقدام کر رہا ہوں۔ ہم نے پاکستان کی مشکل صورتِ حال پر بات چیت کی اور میں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ امر انتہائی اہم ہے کہ بھارت کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو اس صورتِ حال کو اور زیادہ خراب کر دے۔"

"انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ بھارت کا مقصد پاکستان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا بھارت' پاکستان کی تباہی یا اسے مستقل طور پر مفلوج و ناکارہ کر دینے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ سب سے بڑھ کر بھارت استحکام کی بحالی چاہتا ہے۔ ہم ہر قیمت پر گڑبڑ اور افراتفری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"بعد میں مجھے علم ہوا کہ جس وقت مسز گاندھی نے یہ باتیں کہیں انہیں بخوبی علم تھا کہ ان کے جنرل اور مشیر مشرقی پاکستان میں مداخلت کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اور مغربی پاکستان پر حملہ کرنے کے ہنگامی بنیاد پر منصوبے تیار کر رہے ہیں۔"

"اس صبح کو ہماری جو گفتگو ہوئی اس سے میں اس حقیقت کے باعث پریشان ہوا کہ حالانکہ مسز گاندھی نے امن کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن انہوں نے ہیجان و خلفشار کو بڑھنے سے روکنے کے لئے کوئی تجاویز پیش نہیں کیں۔ یحییٰ خاں نے اس بات سے اتفاق کر لیا تھا کہ وہ بھارتی سرحد سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے۔ اگر بھارت بھی ایسا کرے لیکن مسز گاندھی نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔"

"ایک ہی مہینہ کے بعد روسی اسلحہ سے لیس ہو کر بھارتی فوج نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ مغربی پاکستان کی سرحد کے ساتھ بھی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن یہ بتانا ناممکن تھا کہ آیا بھارت کا مقصد پاکستانی فوج کو اسی مقام پر محدود رکھنا تھا جہاں وہ تھی یا یہ کارروائی پاکستان پر پورے حملہ کا پیش خیمہ تھی۔ اس قسم کے فوجی منصوبے ایک مہینہ سے کم میں تیار نہیں کئے جاتے ہیں اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مسز گاندھی نے جان بوجھ کر اس ملاقات میں مجھ سے دھوکہ بازی کی تھی۔"

صدر نکسن کا یہ تبصرہ ان کی یادداشتوں کے صفحات 525 اور 526 پر مندرج ہے۔ اگر لبرل ذہن رکھنے والی مسز گاندھی صدر نکسن جیسے زیرک اور تجربہ کار سیاستدان کو پاکستان کے بارے میں

www.bhutto.org

بھارت کے رویہ کے متعلق دھوکہ دے سکتی تھیں تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ متعصب قسم کے جنتا پارٹی کے لیڈر کس طرح نا تجربہ کار مارشل لاء حکمرانوں کو پاکستان کے بارے میں اپنی ڈپلومیسی کے متعلق دھوکہ دے سکتے ہیں۔

اس فوجی حکومت کو تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ اس کی ناک تلے کیا ہو رہا ہے۔ اس کی نشاندہی وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ کے جلانے سے ہوئی جو مارشل لاء حکمرانوں کی ناک تلے ہوئی۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ مکمل امن وچین ہے اس لئے کہ سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ سیاسی سرگرمیوں کو ختم نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ "آدمی ایک سیاسی جانور ہے۔" اور ریاست ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ سیاسی سرگرمیاں یا تو سطح پر رہتی ہیں اور یا زمین دوز ہوا کرتی ہیں۔ اس رفتار سے بہت ہی کم عرصہ میں اٹلی کے ریڈ بریگیڈز کی طرح پاکستان میں بھی اپنی قسم کے ریڈ بریگیڈز پیدا ہو جائیں گے۔ سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دے کر یہ حکومت دہشت گردی کی پرورش کر رہی ہے۔ اگر سیاسی سرگرمیوں کو ڈومینیکن ری پبلک جیسے چھوٹے سے ملک میں ختم نہیں کیا جاسکتا تو پھر انہیں پاکستان جیسے ملک میں کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟ روایتی سیاسی سرگرمیوں کو ممنوع قرار دینا درحقیقت ان لوگوں کو دعوت دینا ہے جو اقتدار پر قبضہ خفیہ طور پر اعتماد حاصل کر کے کرتے ہیں۔ مارشل لاء حکومت فریٹنکیسن کا تجربہ رہی ہے۔ سیاسی منظر پر اس کی مداخلت یا اس کے دخول نے خطہ میں پاکستان کو غیر مستحکم کر دیا ہے۔ کڑوے پھلوں کی فصل ابھی کاٹنا باقی ہے۔

جب سپریم کورٹ تمہاری والدہ کی آئینی درخواست کی سماعت کر رہا تھا تو میں نے عدالت سے کہا تھا کہ اگر آئین کو غیر معینہ مدت کے لئے التواء میں یا معطل رکھا جاتا ہے تو اس کا نتیجہ پاکستان کے لئے مہلک ہو گا۔ میں نے عدالت پر زور دیا تھا کہ وہ عام انتخابات کی تاریخ مقرر کرے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ کم سے کم ممکنہ وقت کے اندر آئینی قانون مارشل لاء کی جگہ لے لے۔ ان حالات میں میں نے دلیل پیش کی تھی کہ مارشل لاء کو جائز قرار دینے کے افسانہ کو ایک برے خواب کی طرح قبول کیا جاسکتا ہے۔ ایک کڑوی گولی کی طرح نگلا جاسکتا ہے۔ ایک ڈراؤنے خواب کی مانند خیال کیا جاسکتا ہے جو گزر چکا ہے۔ میں نے واضح کر دیا تھا کہ اگر درمیانی مدت ختم نہ ہوئی اور کم از کم عرصہ کی نہ ہوئی تو لوگ یہی خیال کریں گے کہ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ وہ اس کے معطل کئے جانے یا اس سے انحراف کئے جانے کے قانونی افسانہ کو قبول نہیں کریں گے۔ اس صورت میں یہ دلیل دی جاسکے گی کہ پاکستان 1947ء کی حالت پر واپس چلا گیا ہے اور اب اس کا وجود اس آئین کے مطابق نہیں ہے جس کو پاکستان کے عوام نے 1973ء میں منظور کیا تھا بلکہ اس کا وجود 1947ء کے آزادی ہند کے قانون کا مرہونِ منت ہے۔ جس کو برطانوی پارلیمینٹ نے منظور کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہ دلیل دی جاسکے گی کہ صوبائی خود مختاری کی وہ حد جس کو صوبوں نے از خود وفاق کے سپرد کر دی تھی 1973ء کے آئین کے منسوخ کئے جانے کے باعث

صوبوں کو واپس مل گئی۔ بدقسمتی سے سپریم کورٹ نے میرے انتباہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مارشل لاء ضرورت سے زائد مدت تک برقرار رہا ہے۔ وہ ایسا مہمان ہے جس کا کبھی بھی خیر مقدم نہیں کیا گیا۔ یہ دلیل دینا تو مضحکہ خیز ہے کہ 1973ء کا آئین اب بھی باقی اور برقرار ہے۔ تقریباً ایک سال سے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ انتخابی نظام کے بارے میں اس کے بنیادی کلازوں میں ایک آدمی نے من مانی طور پر ترمیم کی ہے۔ یہی شخص اپنا قلم اٹھا کر آئین میں چھوٹی بڑی ترمیمات کر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مستقبل قریب میں آئین کی شکل کو بگاڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اخلاقی اور سیاسی صورتِ حال یہ ہے کہ 1973ء کا آئین ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑ گیا ہے یعنی ختم ہو چکا ہے۔ یہی قانونی پوزیشن بھی ہے۔ اب پاکستان 1947ء کے ہندوستان کی آزادی کے قانون کی جانب مراجعت کرے گا جس کو برطانوی پارلیمینٹ نے منظور کیا تھا۔ صوبائی خود مختاری کی وہ مقدار جو صوبوں نے اپنی مرضی و منشا سے پاکستان کے وفاق کو سپرد کی تھی اب پھر صوبوں کو واپس مل گئی ہے۔ اگست 1976ء میں ڈیورنڈ لائن کے بارے میں میرا جو معاہدہ صدر داؤد کے ساتھ ہوا تھا اس سے یا تو صدر داؤد جنرل ضیاء الحق کی مرضی سے بعد میں منحرف ہو گئے یا پھر نا قابلِ وضاحت وجوہ کی بنیاد پر اس کو عوام سے چھپا لیا گیا۔ تو پھر ہم کہاں کھڑے ہیں؟

1۔ ملک بغیر آئین کے ہے۔

2۔ پاکستان کا وجود 1947ء کے ہندوستان کی آزادی کے قانون کے باعث ہے جس کو برطانوی پارلیمینٹ نے منظور کیا تھا۔

3۔ دونوں ہی صورتوں میں صوبوں کو وہ خود مختاری دوبارہ حاصل ہو گئی ہے جو 1973ء کے آئین کے تحت انہوں نے وفاق پاکستان کو سپرد کی تھی۔

4۔ افغانستان ڈیورنڈ لائن کو تسلیم نہیں کرتا۔

5۔ افغانستان کا موقف ہے کہ بلوچوں اور پختونوں کا مسئلہ پر امن طریقہ سے پاکستان کے ساتھ طے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ افغانستان کا موقف ہے کہ یہ مسئلہ صرف پاکستان کے ساتھ نہ کہ ایران کے ساتھ طے ہونا تھا۔

6۔ بھارت اپنی شرائط پر کشمیر کا سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔

7۔ بھارت نے چین کے خلاف علاقائی دعوے کو ترک کر دیا ہے۔ اور وہ چین کے ساتھ دوستی چاہتا ہے۔

8۔ روس نے افغانستان کی نئی حکومت کی مکمل حمایت کا وعدہ کیا ہے۔

9۔ روس نے پاکستان کی سیٹو میں شمولیت پر تنقید کی ہے۔

10۔ شہنشاہِ ایران نے متنبہ کیا ہے کہ اگر ایران میں گڑبڑ جاری رہی تو تودہ پارٹی کو فائدہ پہنچے گا۔

11۔ بھارت اپنی ایٹمی پالیسی کے ذریعہ اپنی سربراہی و برتری کے حقوق جتا رہا ہے۔ اس نے ایشیائی خطۂ امن کی پاکستان کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے۔

www.bhutto.org

12۔ پاکستان کے عوام غیر مطمئن۔ ہیجان میں مبتلا اور سخت مایوسی کے عالم میں ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ گارڈین نے پاکستان کے بارے میں لکھا ہے کہ پاکستان ایسا ملک ہے "جس کے پاس مسائل کا حل نہیں ہے۔"

پھر تقریباً تیس سال کے عرصہ میں یہ تباہ کن صورتحال کس طرح پیدا ہوئی؟ یہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ 1954ء کے بعد تباہ کن لوگ فوجی جنتا کے نمائندوں کی حیثیت سے پاکستان کی سیاست میں براہ راست ملوث رہے ہیں۔ جنرل ایوب خاں 1954ء میں مرکزی وزیر ہو گئے اور فوجی جنتا نے 1952ء میں ڈار چیسٹر ہوٹل میں ایک یونٹ اسکیم تخلیق کی۔ غریب ڈار چیسٹر ہوٹل! میں اس ہوٹل میں 1950ء سے قیام کرتا رہا ہوں جب میں آکسفورڈ میں ایک طالب علم تھا۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ ڈار چیسٹر ہوٹل ایک یونٹ کا ذمہ دار ہو گا۔ پھر بلا شرکت غیرے یا خالص فوجی حکومت 1958ء میں قائم ہوئی اور اس وقت ودفان ہوئی جب 1971ء میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا۔ 5 ر جولائی 1977ء کو وہ پورے کروفر اور غیظ و غضب کے ساتھ پاکستان کو "بچانے" کی غرض سے دوبارہ واپس آ گئی' بالکل اسی طرح جس طرح اس نے 1971ء میں مشرقی پاکستان کو "بچایا" تھا۔ مارشل لاء بالکل غیر نمائندہ نہیں ہوتا ہے۔ وہ عوام کی تو نمائندگی نہیں کرتا ہے لیکن وہ رجعت پسند فوجی ٹولہ کی نمائندگی ضرور کرتا ہے۔ اس ٹولہ اور اس کے نمائندوں نے یکے بعد دیگرے فوجی جنتاؤں نے اس ملک کو اس افسوسناک حالت پر پہنچا دیا ہے۔ برصغیر میں سندھ وہ پہلا صوبہ تھا جس نے اپنی قانون ساز اسمبلی میں قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ آج سندھ خوفناک حد تک تلخ لہجہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ بلوچستان بغیر صوبائی حیثیت کے (چہ جائیکہ صوبائی خود مختاری کے) دو عشروں تک بالکل پرسکون رہا۔ 1958ء میں ایوب خان کے مارشل لاء کی بلوچ آبادی کے ساتھ محاذ آرائی' سرداری نظام یا زرعی اصلاحات یا دوسری اصلاحات کے باعث نہیں ہوئی بلکہ چھوٹے چھوٹے سیاسی مسائل پر ہوئی جو ذاتی نوعیت کے تھے۔ نوروز خاں بروہی کو قرآن پاک کی قسم پر پہاڑوں سے اتارا گیا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن پھر حیدر آباد میں اسے پھانسی دے دی گئی۔

یہ ٹولہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ 1963ء یا 1964ء میں ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں ایک تقریر کے دوران میں نے اس ٹولہ پر براہ راست تنقید کی تھی۔ یہ تنقید اس قدر تند و تیز تھی کہ ایک پیر سیاستداں کو (جن کا خیال تھا کہ شجاع آباد ان کی جائے پناہ ہے' یہاں تک کہ میں نے 1970ء کے انتخابات میں فتح حاصل کی) اب تک وہ تقریر یاد ہے۔ اس تقریر سے یہ ٹولہ اس قدر لرزہ براندام ہوا کہ تقریر کا ٹیپ ڈھاکہ سے لاہور ایک خصوصی ایلچی کے ذریعہ بذریعہ طیارہ بھجوایا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہ اس ٹیپ کو ذاتی طور پر ایوب خاں کو دے اور ان سے درخواست کرے کہ وہ اسے فوری طور پر سنیں۔

یہ ٹولہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ میں پاکستان کا وہ پہلا لیڈر

www.bhutto.org

ہوں جس نے اس کی اجارہ داری کو پاش پاش کیا ہے اور براہ راست عوام سے رجوع کیا ہے۔ اس ٹولہ میں شامل لوگ یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے ذریعہ حکومت کروں' جیسا کہ ماضی میں تمام دوسرے لیڈروں نے کیا تھا۔ لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ان کو خون چوسنے والا کہا جنہوں نے پنجاب کے نام پر پنجاب کے عوام کا استحصال کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پنجاب کے عوام کے پاس جاؤں گا اور پنجاب کے عوام کے سامنے ان کی دھوکہ بازی کی قلعی کھولوں گا اور ایسا ملک کے باقی عوام کے سامنے بھی کروں گا۔ جس طرح کہ اسلام کے نام پر انہوں نے اسلام کو دھوکہ دیا ہے۔ جیسے کہ احتساب کے نام پر وہ احتساب سے بچ گئے ہیں اسی طرح پنجاب کے نام پر انہوں نے پنجاب کے عوام کو دھوکہ دیا ہے۔ مسلم قومیت کے نام پر جس کا سادہ زبان میں مطلب ایک یونٹ (صوبہ) ہوتا ہے وہ نہیں چاہتے کہ پنجاب کے عوام کا پاکستان میں غلبہ ہو۔ وہ پاکستان پر اپنا ذاتی غلبہ چاہتے ہیں جس میں پنجاب بھی شامل ہے۔ پنجاب میں ایک یا دو فیکٹریاں لگا لینے سے یہ ٹولہ پنجاب کے عوام کی خدمت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے استحصال کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ پنجاب کے عوام اور ملک کے باقی عوام کی خدمت کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مخصوص مفادات کو ختم کیا جائے اور استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔

دوسرے الفاظ میں ایسا اس ٹولہ کو ختم کر کے کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ ٹولہ پنجاب کے عوام کے مفاد میں اپنے آپ کو ختم کرے گا؟ وہ یقینی طور پر ایسا نہیں کرے گا۔ یہ ٹولہ کبھی بھی پنجاب کے عوام کی خدمت نہیں کرے گا۔ یہ بنیادی تضاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب کے عوام میرے ساتھ ہیں۔ اور ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس ٹولہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے دریائے راوی کا پانی پیا ہے۔ یہ ٹولہ کہتا ہے کہ میں نے تو دریائے سندھ کا پانی پیا ہے۔ دونوں دریاؤں کا تعلق پاکستان سے ہے۔ دونوں دریاؤں کا پانی اچھا ہے۔ لیکن پانی خون تو نہیں ہے۔ اس ٹولہ نے تو عوام کا خون پیا ہے۔ جبکہ میرے نزدیک عوام کا خون خود میرے خون کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے۔ میں کسی قسم کے غلبہ کو قبول نہیں کر سکتا خواہ وہ غلبہ اندرونی ہو یا بیرونی ہو۔ میں عوام کی برتری میں یقین رکھتا ہوں اور عوام سے میری مراد حقیقی عوام ہیں نہ کہ یہ قابلِ نفرت فوجی ٹولہ ہے۔ 1970ء میں میں پنجاب کے ہر گاؤں گیا۔ پنجاب کے ہر قصبہ اور شہر گیا اور میں نے اس ٹولہ کے غبارے میں سے ہوا نکال دی اور میں پنجاب کے عوام کا غیر متنازعہ لیڈر بن گیا جس طرح کہ ملک کے باقی ماندہ عوام کا میں غیر متنازعہ لیڈر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ٹولہ مجھ سے نفرت اور حقارت کرتا ہے۔ میں نے ان کی قلعی خود ان کے گھر کے صحن میں کھول دی۔ میں نے پنجاب کے عوام کو شہہ دی کہ وہ اس ٹولہ میں شامل لوگوں کو گردن سے پکڑ کر اور لاتیں مار کر کوڑا گھر میں پھینک دیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میری گردن مارنا چاہتے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے حال ہی میں اپنے نافذ کردہ مارشل لاء کا ایک سبب بتایا ہے۔ اس نے ایک امریکی نامہ نگار سے کہا کہ میرا ارادہ اقتدار منتقل کرنے کا نہیں تھا خواہ مجھے انتخابات میں شکست بھی ہو

www.bhutto.org

جاتی۔ وہ جلد ہی محسوس کرے گا کہ اس کے 5 جولائی 1977ء کے مطلب پرستی پر مبنی اقدام نے نہ صرف پاکستان کو اور اس خطہ کو غیر مستحکم کیا ہے بلکہ شاید پاکستان کو مستقل طور پر نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ اپنی خودکشی کرنے والی پالیسیوں کی سمت کو جلد معکوس نہیں کرتا ہے تو از سر نو پیدا شدہ محمد علی جناح بھی بگڑی ہوئی صورت حال کو بچا نہیں سکتے ہیں۔ مارشل لاء کسی بھی مہذب ملک کے لئے ایک سرطان کی مانند ہے۔ پاکستان کے لئے تو مارشل لاء اس کے وجود کے اسباب ہی کی نفی ہے اس لئے کہ پاکستان ایک جمہوری تحریک کے ذریعہ عوام کی تخلیق ہے۔ دوسرے دنیا میں کوئی بھی ملک اپنے جی این پی کا اس قدر حصہ مسلح افواج پر خرچ نہیں کر رہا ہے جس قدر کہ پاکستان کر رہا ہے۔ دنیا کے ایک غریب ترین ملک کے عوام کی یہ جراٴت مندانہ قربانی سال بہ سال جاری ہے۔ مسلح افواج کے حق میں عوام کی اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ مسلح افواج پاکستان کی سالمیت کو جو خطرات لاحق ہیں ان سے نمٹے۔ اس لئے نہیں ہے کہ مسلح افواج پاکستان کی خارجی حیثیت کے بارے میں ملک پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے سمجھوتہ کرلیں۔ تیسرے دنیا کا کوئی اور ملک ایسا نہیں ہے جس کے پڑوسی ملک نے اس کو دنیا کے نقشہ سے نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا ہو۔ اسرائیل اس وقت تک اسی پوزیشن میں تھا جب تک کہ صدر سادات نے یروشلم کا دورہ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ فوجی لحاظ سے اسرائیل کو برتری حاصل ہے۔ برصغیر میں پوزیشن اس کے برعکس ہے۔ یہاں فوجی لحاظ سے جو ملک پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے اس کو غالب فوجی برتری حاصل ہے۔ اس لئے پاکستان کی مسلح افواج اپنی اس حقیقی ذمہ داری سے ذرا بھی انحراف نہیں کر سکتی ہیں پاکستان کی سالمیت کی خاطر وہ ملک کی سیاسی زندگی میں اپنے آپ کو نہ تو ملوث کر سکتی ہیں اور نہ ہی اس میں ضم ہو سکتی ہیں۔ وہ فوجی جو فوجی بیرکوں کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور سرکاری محلوں میں رہتے ہیں وہ جنگیں ہار جاتے ہیں اور جنگی قیدی بن جاتے ہیں جیسا کہ 1971ء میں ہوا تھا۔ پاکستانی فوج کے جرنلوں نے اس تاریخ کو دھرانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

جیمس مارس کی ایک حالیہ کتاب میں جس کا عنوان فیئر ویل دی ٹرمپٹس " (طبل جنگ کو خیرباد) ہے۔ مصنف نے کہا ہے کہ " قانون کی عملداری عارضی ثابت ہوئی جب شاہی پولیس والوں کو واپس بلا لیا گیا اور کسی بھی نوآبادیاتی گورنر سے زیادہ سخت اور خونخوار ظالموں نے جمہوریت کے چمکدار زیور کو کچل ڈالا۔ جن قوموں کی تربیت ریاستی امور میں کی گئی تھی وہ خانہ جنگی میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں یا پھر بدعنوانی اور رشوت ستانی کی عادی ہو گئیں۔ "

ایسا وہاں ہوا ہے جہاں نام نہاد پیشہ ور فوج کے نام نہاد پیشہ ور جرنلوں نے جو سینڈھرسٹ کے تربیت یافتہ تھے سیاسی اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کیا ہے اور سیاست کو وقت گزاری کا ایک عمدہ کھیل سمجھ کر ایسا کیا ہے۔

حالیہ برسوں میں انسانی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس امر کا تو ابھی تعین ہونا باقی ہے کہ آیا انسانی حقوق بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے خیال سے ڈپلومیسی کے ضابطہ اخلاق میں شامل کر

دیئے گئے ہیں۔ یا ان کو محض موقع محل کی سہولت کی خاطر تنگ نظر مقاصد کی خاطر اپنی پسند کے مطابق استعمال کیا جارہا ہے۔ ایک اخلاقی اصول کی حیثیت سے انسانی حقوق کے ساتھ وابستگی نمایاں خدمت انجام دے سکتی ہے۔ اگر اس مقصد کی پیروی ذاتی مفادات سے ہٹ کر کی جائے اور فرشتوں کی طرح غیر جانبداری برتی جائے۔ لیکن اگر مقصد موقع محل کی سہولت ہے یا کسی مخالف کو پھانسنا ہے تو وہ ڈپلومیسی میں دوہرے معیار کی طرح خود اپنے ہی اوپر الٹ کر آئے گی۔ چونکہ فوجی جنتا انسانی حقوق کی وحشیانہ نفی ہے اس لئے فوجی جنتا سے انسانی حقوق کے کسی خاص پہلو کا احترام کرنے کی اپیل کرنا ایک طنزیہ صورتِ حال ہے۔ ایسی صورت میں انسانی حقوق کے احترام کا واحد طریقہ یہی ہے کہ غیر قانونی فوجی جنتا کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ فوجی ڈکٹیٹروں نے ایشیا' لاطینی امریکہ اور افریقہ کو روند ڈالا ہے۔ ان کے اس اقدام کے نتیجہ میں انہوں نے مارکس اور اینگلز' لینن اور ماؤ کی تصنیفات سے زیادہ کمیونزم کو پھیلانے کے لئے کام کیا ہے۔ وہ بعد کے نو آبادیاتی دور کے بدترین ظالم ہیں۔ انہوں نے قابلِ احترام اداروں کو تباہ کیا ہے اور اپنے عوام کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا ہے۔

انہوں نے داخلی نفاق اور بیرونی کشمکش پیدا کی ہے۔ ڈکٹیٹر وہ جانور ہے جس کو پنجرہ میں بند کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے اپنے پیشہ اور اپنے آئین سے انحراف کیا ہے۔ اس نے عوام سے دھوکہ کیا ہے اور انسانی اقدار کو تباہ کیا ہے۔ اس نے ثقافت کو تباہ کیا ہے۔ اس نے نوجوانوں کو پابند کر رکھا ہے۔ اس نے حکومتی ڈھانچہ کو تہ وبالا کر دیا ہے۔ وہ محض اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ وہ ایک قہر ہے جو انسانوں کو ہلاک کرنے والا ہے۔ وہ جذامی ہے۔ جو شخص بھی اسے چھوتا ہے وہ بھی جذامی ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو یکایک نچلی حیثیت سے اعلیٰ پوزیشن پر پہنچ گیا ہے۔ وہ نظریہ اور اعلیٰ اصولوں سے بے بہرہ ہے۔ اس فوجی جنتا میں سے کسی نے بھی تاریخ کے ایک لمحہ کے لئے بھی خدمت انجام نہیں دی ہے۔

ان فوجی ڈکٹیٹروں نے آزادی کے لئے جنگ نہیں لڑی ہے اور نہ ہی وہ کسی نظریہ کے پابند ہیں۔ وہ ایسے سازشی ہیں جو سماجی لحاظ سے نچلے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یکایک ترقی کر کے اعلیٰ طبقہ میں شمار ہونے لگے ہیں۔ وہ غیر ملکی سفارت کاروں کے "شو بوائے" ہیں۔ وہ عوام کا مخالف ایسا پیشہ ور ہے جو ہر چھوٹے سے موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ اپنے پیشہ کو خیرباد کہہ کر اپنے مالک کے پیشہ کو اپنا لے۔ وہ ایسا شخص ہے جو لوگوں سے متنفر اور بیزار ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو ایک اعلیٰ افسر کی بیساکھی پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ افراطِ زر میں ایک یا دو فی صد کی کمی کا مطلب کشمیر کی آزادی ہے۔ کیا وہ اس اعلیٰ افسر سے یہ دریافت کرتا ہے کہ کیا افراطِ زر میں کمی کے ساتھ روزگار میں بھی اضافہ ہوا ہے؟ ترقی یافتہ ممالک میں افراطِ زر کو کم کرنا زیادہ لازمی ہوا کرتا ہے خواہ اس کے باعث بے روزگاری میں اضافہ ہو' اس لئے کہ افراطِ زر سے تو آبادی کا زیادہ بڑا حصہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک میں بے روزگاری کے مصائب کو سماجی تحفظ کی اسکیموں کے ذریعہ تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں روزگار کی فراہمی زیادہ اہم ہوا کرتی ہے خواہ ایسا افراطِ زر کی قربانی دے کر کرنا پڑے اس لئے کہ آبادی کا

www.bhutto.org

بڑا حصہ افراطِ زر کے مقابلہ میں بے روز گاری سے زیادہ متاثر ہوا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی پذیر ممالک میں سماجی تحفظ کی قابلِ ذکر اسکیمیں بے روز گار لوگوں کے لئے نہیں ہوتی ہیں۔ افراطِ زر اور بے روز گاری کے درمیان انتخاب کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں شدید ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی اعلیٰ ترین حل دستیاب نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک کے حالات بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ افراطِ زر اور بے روز گاری دونوں ہی بری چیزیں ہیں۔ اور پریشان کن ہیں۔ لیکن اگر ان دونوں برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو ترقی یافتہ ممالک افراطِ زر کے مقابلہ میں زیادہ بے روز گاری کو ترجیح دیں گے۔ ترقی پذیر ممالک کے لئے یہی بہتر مشورہ ہو گا کہ میرے خیال میں الفاظ یہ ہونے چاہئیں کہ "وہ افراطِ زر کے مقابلہ میں بے روز گاری کا انتخاب کریں۔" وہ بے روز گاری کے مقابلہ میں افراطِ زر کا انتخاب کریں۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک نے مثال کے طور پر برازیل نے عمداً یہ تکلیف دہ انتخاب کر کے ترقی کی ہے۔ کینسیین کے نظریات کا ہو سکتا ہے کہ ان ممالک پر اطلاق نہ ہو جو ترقی کی حدود پھلانگ چکے ہیں لیکن ان کا اطلاق ان ممالک پر نہیں ہوتا ہے جو اقتصادی لحاظ سے اپنے بچپن سے گزر رہے ہیں۔ یہ وہ سوالات ہیں جو ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ذہن میں نہیں آسکتے۔ ایسے فرد کے نزدیک تو جو چیز دولت مند ممالک کے لئے اچھی ہے وہی غریب ممالک کے لئے بھی اچھی ہے۔ وہ دولت مند آدمی کے فارمولہ کو قبول کرتا ہے اس لئے کہ وہ دولت مند آدمی کا آلۂ کار ہے۔ غرباء کو حقیقی اور کافی سہولت غیر ترقیاتی اخراجات میں کمی کر کے پہنچائی چاہئے۔ ایسا کرنا وہاں اور بھی ضروری ہے جہاں غیر ممالک کے ساتھ تنازعات پر سمجھوتہ کیا گیا ہے یا جہاں ان تنازعات کو فوجی ذرائع سے حل کرنا ناقابلِ تصور ہو۔ اس طرح کی تخفیف افراطِ زر کی شرح کو کم کر دے گی اور پیداواری روز گار بھی فراہم کرے گی۔ کیا اس طرح کے بنیادی اور اہم اور اقتصادی لحاظ سے درست فیصلے کئے جا سکتے ہیں جب بجٹ کا اعلان پارلیمینٹ میں نہیں بلکہ ٹیلی ویژن اسٹوڈیو کے آرام دہ کمروں میں کیا جائے؟ فوجی جنتا تو اس قسم کے فیصلے نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ جنرل تو کنڈر گارٹین کے بچوں کی طرح ہیں۔ ان کے کھیلنے کے لئے تو کھلونے چاہئیں۔ جنگی ہتھیار ان کے کھلونے نہیں ہیں۔ وہ جنگ نہیں کر سکتے۔ وہ جنگ نہیں کریں گے۔ تاہم انہیں اسلحہ چاہئے۔ یہ اسلحہ پریڈ گراؤنڈ میں ان کے فخر و وقار کے لئے ہے۔ ایسے خوشامدیوں کو خوشامدیوں ہی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اندوہناک حقیقت سے دور رہیں کہ ان کی حقیقت نہ کھلے اور وہ ناخوشگوار سچائی کو نہ سن سکیں۔ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ حقیقی مارچ سے خوفزدہ ہیں۔ یہ مارچ خیالات کا مارچ ہے۔ مردوں اور عورتوں کا بغیر فوجی بوٹوں کے مارچ ہے۔ ننگے پیر مردوں اور عورتوں کا مارچ ہے۔ وہ ہر شے کو جیل میں ڈال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک روتے ہوئے شیر خوار بچہ کو بھی جیل میں ڈال دیتے ہیں جو بھوک سے بلبلا کر ماں کے دودھ کے لئے بلکتا ہے۔ ایسا کوٹ لکھپت جیل میں ہوا ہے۔ جب یہ افراد اپنے ملک کے مفادات اور مستقبل کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں تو مغربی طاقتوں کے لئے یہ خیال کرنا ہی ایک حماقت ہے کہ وہ مغربی ممالک کے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

ایشیاء میں دو ممالک اس قسم کی ڈکٹیٹر شپ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو تھائی لینڈ ہے اور دوسرا پاکستان ہے۔ تھائی لینڈ کی تشفی تو اس امر سے ہو جاتی ہے کہ وہاں موروثی بادشاہت ہے۔ اس ملک میں آئینی خلاء سے بچا جا سکتا ہے خواہ آئین کو برطرف کر دیا جائے۔ ایسا بادشاہ کی موجودگی کے باعث ہے۔ پاکستان کا سہارا صرف وہ قانون ہے جس کو برطانوی پارلیمنٹ نے منظور کیا تھا۔ اگر پاکستان 1947ء کے آزادی کے قانون کا سہارا لیتا ہے تو برطانوی پارلیمنٹ ہی 1947ء کے آزادی کے قانون میں ترمیم کرنے کی قانونی طور پر مجاز ہے یا پھر وہ اس قانون کے بدلہ میں کوئی دوسرا قانون منظور کر سکتی ہے اور پاکستان کو پھر ایک برطانوی نوآبادی بنا سکتی ہے یا پاکستان کے صوبوں کو دوسری جانشین ریاستوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔ دراصل پاکستان کو سہارا دینے والی کوئی صورت نہیں ہے، اگر اس کا جمہوری آئین برطرف اور مسترد کر دیا جائے۔ میرے ذہن میں یہی قانونی بحران تھا جب میں نے قوم کو مارشل لاء کے قانونی طور پر جائز قرار دیئے جانے سے پیدا ہونے والے منحوس نتائج سے متنبہ کیا تھا۔

پیشہ ور فوجی ڈکٹیٹروں کے دماغ ایک جیسے خطوط پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا موقف اور طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے مجبوراً اور عارضی طور پر فوجی بیرکوں کو خیرباد کہا ہے۔ جن کو وہ ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتے اور یہ کہ انہوں نے ایسا ملک کو خانہ جنگی اور کمیونزم کے خطرہ سے بچانے کی خاطر کیا ہے اور گندے سیاستدانوں نے جو گڑبڑ پیدا کی ہے اس کو صاف کرنے کے لئے، امن و امان برقرار رکھنے کے لئے، رشوت ستانی کو ختم کرنے کے لئے اور سیاسی استحکام قائم کرنے کے لئے یہ اقدام کیا ہے۔ اگر آپ ایوب خاں، یحییٰ خاں اور ضیاء الحق کی تقاریر کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ مشترکہ عنصر بغیر کسی مشکل کے معلوم ہو جائے گا۔ درحقیقت ایک ہی قسم کی ڈوری ان "سادہ سپاہیوں" کی وردی میں ہوتی ہے جن کی تمنائیں منفی نوعیت کی ہوتی ہیں اور ان کا تعلق ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے دوسرے علاقوں سے ہوتا ہے۔ وہ کسی اعلیٰ نظریہ پر عمل پیرا ہونے کے لئے اقتدار پر غاصبانہ قبضہ نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کے سمجھوتہ میں ترمیم کرنے کے لئے۔ تانبے کی کانوں میں غیر ملکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے، اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کہ ملک ناٹو یا سینٹو کے معاہدات سے علیحدگی اختیار نہ کر سکے۔ بڑی طاقتوں کے عالمی مفادات کے تحفظ کی خاطر قوم کے علاقائی دعوؤں کو ترک کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ حق خود ارادی کے حق کے بجائے وہ جی این پی کی بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنے کے بجائے وہ افراطِ زر کی شرح میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ خود ان کا عملہ افراطِ زر میں اضافہ کا سب سے بڑا سبب ہے۔ وہ تضادات کے خالق ہیں۔ وہ جب سیاسی منظر سے علیحدہ ہوتے ہیں تو وہ اپنے پیچھے کہیں زیادہ بدعنوانی اور رشوت ستانی، زیادہ عدم استحکام، زیادہ بعد اور اختلاف رائے، زیادہ کمزور اقتصادیات، زیادہ انتشار اور آئینی خلاؤں کے باعث پیدا کردہ گنجلک چھوڑ جاتے ہیں۔

www.bhutto.org

اب تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ اٹلی کے ریڈ بریگیڈز کیوں فوج کو مشتعل کر رہے ہیں کہ وہ اٹلی کی ریاست پر قبضہ کر لے اس لئے کہ وہ تو ریاست کو تباہ کرنے کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات اٹلی کی مثال سے ظاہر ہے اس لئے کہ اٹلی تو مغربی تہذیب کی ماں ہے اور کوئی دکھاوے کی جمہوریت نہیں ہے۔ اٹلی جیسے انتہائی ترقی یافتہ ملک میں ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ میں اس قسم کے بنیادی مسائل کو فوری طور پر سمجھ لیا جاتا ہے اس لئے کہ ترقی پذیر ممالک میں عمیق سیاسی مسائل کو عوام کی کھلی آنکھ آسانی سے نہیں دیکھ سکتی ہے چونکہ عوام غربت کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہوتے ہیں۔ فوجی جنتا کے جنرلوں کی مہم جوئی کا ایک متعلقہ عنصر "بدعنوان اور گندے سیاستدانوں" کا مذاق اڑانا۔ ان کی اہمیت کو کم کرنا اور ان کی تذلیل کرنا ہوتا ہے۔ بغیر کسی پس وپیش کے فوجی جنتا تمام قومی خرابیوں کی ذمہ داری سیاسی قیادت کے کندھوں پر ڈال دیتی ہے۔ ماضی کے واقعات کے بارے میں مبالغہ آمیز اور غلط توضیحات کی جاتی ہیں اور ماضی کی سیاسی قیادت کو بدنام کرنے کی غرض سے جعلی دستاویزات تیار کی جاتی ہیں۔ اقتدار پر غاصبانہ طور پر قبضہ جمانے کے ساتھ ساتھ سیاسی لیڈروں کے کارناموں کو بھی غصب کر لیا جاتا ہے۔ جو سیاسی لیڈر جس قدر زیادہ مقبول ہوتا ہے اور قوم کے واسطے جس قدر زیادہ اس کے کارنامے ہوتے ہیں اتنا ہی زیادہ زور شور کے ساتھ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور اس کے اوپر ظلم وستم ڈھایا جاتا ہے۔

سیدھا سادا فوجی سپاہی تو بس اس بات پر یقین کرتا ہے کہ ریاست کے مسائل بالکل سادہ نوعیت کے ہیں اور یہ کہ بکڑے قسم کے سیاستدانوں نے انہیں عمداً پیچیدہ بنا دیا ہے تاکہ وہ اپنے غیر فطری سیاسی عزائم کی تسکین کر سکیں۔ اس صورت حال پر یقین کرتے ہوئے سادہ طبیعت فوجی سپاہی پیچیدہ بیرونی مسائل کو حل کرنے کے لئے نامناسب عجلت سے کام لیتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ خیر سگالی کے جذبہ کے ساتھ اور فریق ثانی کی پیٹھ ٹھونک کر مسئلے کی سنگینی کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے اور اسے ایک ہی لمحہ یا انتہائی مختصر سے وقت میں حل کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ سیاستداں نے مسئلہ کو غیر ضروری طور پر الجھا دیا ہے اور یہ کہ فوجی سپاہی اس معاملہ میں کامیاب ہو سکتا ہے جس میں پیشہ ور سیاستداں ناکام رہا ہے۔ اسی جذبہ اور مقصد کے تحت ایوب خاں، یحییٰ خاں اور اب ضیاء الحق نے جموں وکشمیر کے تنازعہ سے کھلے دل کے ساتھ سیدھے سادے فوجی سپاہیوں کی طرح نمٹنے کی کوشش کی۔ لیکن طنزیہ صورت حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یکے بعد دیگرے اس معاملے کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔ ان میں سے کوئی بھی سیاستدانوں کو بدنام کرنے اور لافانی شہرت حاصل کرنے کے دوہرے مقصد میں ایک سیدھے سادے سپاہی کی حیثیت سے تنازعہ کو منصفانہ طور پر حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی حماقتوں کے نتیجہ میں عوام کو اور زیادہ مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

جب بھارتی وزیر خارجہ جنوری 1978ء میں اسلام آباد آئے تو یہ کہا گیا ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے اس خیال کا اظہار کیا کہ کشمیر کے معاملہ میں "کچھ دو کچھ لو" کا معاملہ کرنا پڑے گا۔ اگر حق

خوداراوی کے تسلیم شدہ بین الاقوامی اصول کو ترک کر دیا جاتا ہے تو بہت کم اقوام ایک کہیں زیادہ بڑی ریاست کے مقابلہ میں ایک چھوٹی ریاست کی حمایت کریں گی جبکہ تنازعہ ایک اخلاقی اصول سے گر کر ایک لاش رہ جائے جس کو قصاب کی دکان میں کاٹا جائے۔ اس صورتِ حال میں ویناہی ہو گا کچھ لینا نہیں ہو گا۔ اس لیئے کہ شیر کو شیر کا حصہ ملے گا یعنی بڑے ملک کو بڑا حصہ ملے گا۔ 1959ء میں ایوب خاں خود ہی پالم ایئرپورٹ پہنچے اور بھارت کو شمال کی جانب سے خطرہ کے پیشِ نظر مشترکہ دفاع کی تجویز پیش کی۔ بھارت نے 1965ء میں ایوب خاں کے ڈنڈا کر کے اس خیر سگالی کے جذبہ کا جواب دیا۔ پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس میں جو 1970ء میں رباط میں منعقد ہوئی تھی 'ایک سکھ یحییٰ خاں کی اجازت سے اسلامی لیڈروں کی کانفرنس میں بھارت کی نمائندگی کرنے کی غرض سے داخل ہوا۔ گاندھی نے ہمیشہ یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہندوستان جائز طور پر مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتا ہے اور اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں ہے لیکن کسی بھی حالت میں اور تخیل کی کسی بھی پرواز کے تحت ہندو بھارت مسلمانوں کے کاز کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ یحییٰ خاں نے اپنے پیشرو کی پیروی کرتے ہوئے رباط میں پاکستان کے روحانی موقف کو ایک دوسرا مکا رسید کیا۔ جب یحییٰ خاں کو اسلامی سربراہ کانفرنس میں بھارت کی شرکت کے بارے میں سخت ناموافق اور فطری ردعمل سے آگاہ کیا گیا تو یحییٰ خاں خوف کے مارے اپنے سمجھوتہ سے پھر گئے۔ لیکن نقصان پہنچ چکا تھا۔ بعد کے جارحانہ حب الوطنی پر مبنی بیانات اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتے تھے خصوصاً اس طویل بیان کی روشنی میں جو آغا شاہی نے کانفرنس میں بھارت کی شرکت کے دفاع میں دیا تھا۔ باوجود انتھک کوششوں کے جو یحییٰ خاں نے ایوب خاں کی پیروی میں کیں اور بھارت کو بنیادی سہولتیں فراہم کیں' بھارت نے 1971ء میں یحییٰ خاں کے بھی ڈنڈا دے دیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ضیاء الحق کس سبب سے اپنے بے ضمیر پیشروؤں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور اسی ناکارہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔ وہ سخت غلطی کا شکار ہیں اگر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جالندھر سے انہیں بانس کے بجائے مٹھائی ملے گی' ڈیسائی نے پہلے ہی بانس کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ احمد آباد میں تیار کیا جا رہا ہے' پہلے دو بانس الٰہ آباد میں بنائے گئے تھے۔ "وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

اگر آزادی۔ جمہوریت۔ آئینی حکومت اور انسانی حقوق کی "آزاد دنیا" کے لئے دیرپا قیمت ہے تو اس کا جواب یا حل یہی ہے کہ فوجی ڈکٹیٹروں کو مکمل طور پر الگ تھلگ اور سماج سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر اسپین کے جنرل فرینکو کو جو اسپین کی خانہ جنگی کا فاتح تھا بیس سال سے زائد عرصہ تک الگ تھلگ رکھا جا سکتا تھا تو یہ ان دکھاوے کے ڈکٹیٹروں کو جو نہ تو فرینکو ہیں اور نہ اسپین جیسے ملک کے حکمراں ہیں نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مذمت کی جا سکتی ہے اور انہیں سزا دی جا سکتی ہے۔ صرف اس صورت میں جمہوریت۔ آئینی حکومت اور انسانی حقوق میں آمرانہ نظام کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو گی۔ یہ یا تو کمیونزم ہے یا آزادی ہے۔ یہ یا تو سویلین حکومت ہے یا فوجی جنتا کی حکومت ہے۔ درمیان کی کوئی شے

موجود نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کی بنیاد ریت میں دھنس رہی ہے۔ فوجی جنتا کیمونزم کی نقیب ہوا کرتی ہے۔ اس حقیقت کو محسوس نہ کر سکنے کی ناکامی افریقہ۔ ایشیاء اور لاطینی امریکہ میں گنجلک کا باعث ہے۔ فوجی حکومت قطعی طور پر اور ناقابلِ تنسیخ حد تک عوام کو جرنلوں اور ان کے مربیوں کے خلاف کر دیتی ہے۔ عوام اور کس طرف رجوع کریں؟ اگر آزادی جمہوریت اور انسانی حقوق کو یہ دیکھنے کے لئے کاؤنٹر پر رکھا جائے کہ آیا آنے اور جانے کی قیمت دس سینٹ زیادہ ہے یا کم ہے اور اتنی سی بات پر ان کا سودا کیا جائے تو آزادی تو ایک نہایت سستی سی جنس ہے اور انسانی حقوق کی قیمت تو پھر ایک نکل کے برابر بھی نہیں ہے۔

جب سرد جنگ عروج پر تھی اور مغربی طاقتوں کی کیمونسٹ طاقتوں کے ساتھ زبردست محاذ آرائی تھی تو یہ بات قابلِ فہم تھی کہ مغرب نہ صرف روس اور کیمونسٹ چین کے خلاف تھا بلکہ وہ ان غیر کیمونسٹ ممالک کے بھی خلاف تھا جو کیمونسٹ ممالک کے دوست تھے یا ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان ممالک کو "سفر کے ساتھی" سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دیتانت کے بعد۔ صدر نکسن کے چین کے دورہ کے بعد اور ہلسنکی سمجھوتہ کے بعد جبکہ مغرب روس کے ساتھ سالٹ دوئم معاہدہ کرنے کا خواہش مند ہے اور چین کو اسلحہ فروخت کر رہا ہے صورتِ حال بہتر طور پر تبدیل ہو جانی چاہئے اور دوسرے ممالک کے لئے نمایاں طور پر تبدیل ہو جانی چاہئے۔ دیتانت اور شنگھائی کے اعلامیہ کے بعد تو ہر ملک مختلف حوالہ سے سفر کا ساتھی ہے۔ مغرب کیمونسٹ ممالک کے ساتھ معمول کے مطابق اور دوستانہ تعلقات چاہتا ہے۔ یہ بات نہ صرف روس اور چین کے لئے درست ہے بلکہ یوگوسلاویہ۔ رومانیہ۔ پولینڈ اور دوسرے مشرقی یورپی کیمونسٹ ممالک کے لئے بھی صحیح ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغرب ان غیر کیمونسٹ ممالک کے ساتھ خوش نہیں ہے جن کو مغرب روس یا چین کے حامی خیال کرتا ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ روس کے صدر برزنیف یا چین کی کیمونسٹ پارٹی کے چیئرمین ہیوکیونگ کو غیر کیمونسٹ نیشنلسٹ مسلم لیبیا کے قذافی اور مسلم الجیریا کے غیر کیمونسٹ نیشنلسٹ بومدین پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ بات بتانے کے بعد اب میں آگے نہیں جاؤں گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کی رائے میں کسی کیمونسٹ ملک کا لیڈر ہونا کسی غیر کیمونسٹ ملک کے غیر کیمونسٹ لیڈر کے مقابلہ میں قابلِ ترجیح ہے جس کے دوستانہ تعلقات کسی کیمونسٹ ملک سے ہوں۔ تشبیہ یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ مغرب کا حامی ہونا اور بھی خطرناک ہے۔ اگر قومی کاز کے دفاع میں وہ لیڈر اختلافِ رائے کرتا ہے تو اس سویلین لیڈر کو فوجی انقلاب کے ذریعہ اقتدار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کی جگہ ایک فوجی ڈکٹیٹر سنبھال لیتا ہے جس کو کسی معاملہ میں اختلافِ رائے کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی ہے۔ جن میں ملک کے اہم قومی مفادات شامل ہیں۔ اس تشبیہ کا اطلاق اور مزید ہوتا ہے۔ اس قسم کے ضمانت شدہ پٹھو کی عوام اور قوم کے خلاف پالیسیاں ملک میں کیمونزم کو اس سے زائد پھیلاتی ہیں جس قدر کہ کسی سویلین قومی لیڈر کا عدم اتفاقِ رائے کہیں کہیں کیمونزم کے پھیلنے کا باعث ہوتا ہے۔

اس جنون کا بھی ایک طریقہ کار ہے۔ ایک کیمونسٹ ملک کے ایک کیمونسٹ لیڈر کو ایک غیر

www.bhutto.org

کمیونسٹ ملک کے ایک غیر کمیونسٹ لیڈر پر ترجیح دی جاتی ہے جس کو ایک مغرب نواز اور خود ہی تبدیل ہو جانے والے ایک سویلین لیڈر پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس قسم کی مشکل صورت حال کو فوجی جنتا خطرہ میں ڈال دیتی ہے جس کو مغرب نے فروغ دیا ہو۔ فوجی جنتا کی پالیسیاں کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ اس چکر کے ذریعہ مغربی ممالک قیادت سے معاملہ کرتے ہیں اور اس قسم کے ملک سے معاملہ کرتے ہیں جو مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ قابل ترجیح ہوتا ہے۔ یہ گورکھ دھندا دیتانت اور شنگھائی اعلامیہ کی منطق کی وضاحت کرتا ہے۔ یہی ھلنسکی کا جذبہ ہے اور بریزنیکی نے اپنی پیکنگ کے دورہ میں جو کمیونسٹ چین اور اس کے لیڈر کی تعریف کی ہے اس کا مقصد و منشاء بھی یہی ہے۔

چونکہ ایوب خاں ایک عملی آدمی تھے اور ہونے والے واقعہ سے ان کو تکلیف ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے سادہ سے الفاظ میں پاکستان میں ہونے والی گفتگو کے دوران صدر نکسن کے سامنے صورت حال کو رکھا۔ صدر نکسن نے اس گفتگو کو اپنی یادداشتوں میں صفحہ 256 پر اس طرح ریکارڈ کیا ہے کہ " پاکستان میں میں نے اپنے پرانے دوست صدر ایوب خاں سے ملاقات کی۔ انہوں نے یکم نومبر 1963ء کو ویت نام کے صدر نگوڈنگھ ڈائم کے قتل پر جو کینیڈی کے قتل سے تین ہفتے پہلے ہوا تھا اور جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس میں امریکہ کی سازش تھی افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ " میں شاید کہہ نہیں سکتا کہ اول تو آپ کو ڈائم کی حمایت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ لیکن آپ نے عرصہ تک اس کی حمایت کی اور ایشیا میں ہر شخص کو اس بات کا علم تھا۔ خواہ وہ اس صورت حال کو پسند کرتے تھے یا نہیں کرتے تھے وہ اس حقیقت کو جانتے تھے۔ اور پھر یکایک آپ نے اس کی مدد کرنا چھوڑ دی اور ڈائم قتل کر دیا گیا" انہوں نے اپنے سر کو ہلایا اور پھر کہا کہ " ڈائم کا قتل بہت سے ایشیائی لیڈروں کے لئے تین معنی رکھتا ہے کہ امریکہ کا دوست ہونا خطرناک ہے۔ یہ کہ غیر جانبدار رہنے میں فائدہ ہے اور یہ کہ بسا اوقات امریکہ کا دشمن ہونا بھی مددگار ہوتا ہے۔ "

ایوب خاں نے اپنے خصوصی انداز میں ایک عام اصول کو ذاتی حیثیت دے دی تھی جس کو میں نے مغربی حکمت عملی کی توضیح کے لئے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب نام نہاد آہنی پردہ موجود تھا تو مغرب کے لئے یہ ایک منطقی بات تھی کہ وہ اس پردۂ آہنی کے پیچھے کمیونسٹ ممالک کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرے اور ان کے خلاف بھی مخالفانہ رویہ اختیار کرے جو اس پردۂ آہنی کو باہر سے مستحکم کرتے تھے یا مستحکم کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن جب دیتانت کے باعث آہنی پردہ اٹھ گیا اور مغربی لیڈر کریملن میں ووڈکا اور کیویر کے ساتھ روسی لیڈروں کے جام صحت پینے لگے اور بعد میں ایسا ماؤ سی تنگ اور چینی لیڈروں کے جام صحت بھی عوام کے عظیم ہال میں پینے لگے تو پھر کمیونسٹ ممالک کے غیر کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ ان کی مغائرت اور عناد بالکل غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ غیر مناسب اور غیر منطقی ان غیر جانبدار اور مغرب نواز سیاسی لیڈروں کے بارے میں مغرب کی ناراضگی کا اظہار ہے جو اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے اس سے اختلاف رائے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

www.bhutto.org

میں ایک اور قدم آگے جانے کی جرأت کروں گا اور کہوں گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا امریکہ کے وفاقی جمہوریہ جرمنی اور جاپان کے ساتھ تعلقات میں اس سے زیادہ کھنچاؤ اور تناؤ ہے جس قدر کھنچاؤ اور تناؤ اس کے تعلقات میں کمیونسٹ پولینڈ کمیونسٹ رومانیہ کے ساتھ ہے۔ عالمی مساوات درحقیقت اُلٹی ہے۔

اس اندوہناک شکایت کو تاریخ کی منطقی توضیح کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ 1844ء میں کارل مارکس نے کہا تھا کہ "سرمایہ دارانہ نظام خود ہی اپنی بربادی کے بیج بوتا ہے۔" اس صورتِ حال کو بیان کرنے کا یہ ایک اختصار والا طریقہ ہے۔ مارکس اس امر کا حوالہ دے رہا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے آپ کو خود ہی تباہ کر رہا ہے اس لئے کہ سرمایہ دار ممالک دنیا کے خام مال کے واسطے آپس میں جنگیں لڑتے ہیں۔ چونکہ سرمایہ دارانہ نظام نے بظاہر تباہی کے اس طریقہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اس لئے اس نے ڈپلومیسی کے ذریعہ اپنی تباہی کا دوسرا طریقہ اپنا لیا ہے۔

اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر ناصر اور سوئیکارنو کمیونسٹ لیڈر نہیں تھے۔ اور وہ مغربی طاقتوں کے پٹھو اور چمچے بھی نہیں تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ امریکہ کے دوسرے صدور کے مقابلہ میں صدر آئزن ہاور نے ناصر کی پوزیشن کے بنیادی فرق کو سمجھا تھا۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں آئزن ہاور جیسے فوجی لیڈر کی سیاسی بصیرت اور دانشمندی کا اعتراف کر کے خود اپنے موقف کی تردید کر رہا ہوں۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ فوجی لیڈر تو بے شمار ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی ان کے درمیان امتیازی خط کھینچا ہے۔ جنرل چارلس ڈیگال بھی ایک اعلیٰ پایہ کے فوجی لیڈر تھے اور ایک سربرآوردہ سیاسی لیڈر تھے۔ ایسے لیڈر واقعی لیڈر ہوتے ہیں۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے جہنم سے ہو کر گزرے تھے اور وہ ڈپلومیسی سیاست سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ جنرل ڈیگال اور جنرل آئزن ہاور دونوں ہی کو عوام نے دونوں کے ذریعہ منتخب کیا تھا اور دو مستحکم جمہوری ممالک کے صدر منتخب کئے گئے تھے۔ انہوں نے اقتدار پر قبضہ پیچھے کے دروازے سے آکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی فوجی انقلاب برپا کر کے ایسا کیا تھا۔ ایسے مشہور و معروف فوجی اور سیاسی لیڈروں کا موازنہ غیر انقلابی۔ غیر نظریاتی اور جی این پی کے دلدادہ غاصبوں سے کرنا درحقیقت اول الذکر کی توہین ہے۔

دو اور مثالیں انتہائی موزوں ہیں۔ پاکستان کو 1965ء میں سزا دی گئی۔ اسلحہ کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی گئی حالانکہ پاکستان سیٹو اور سینٹو کا ممبر تھا' اور بہت سے اقدامات میں وہ امریکہ کا شریکِ کار تھا۔ پاکستان جو ایک وفادار اتحادی اور نہرو کے الفاظ میں سب سے زیادہ وابستہ اتحادی تھا اس کو چین کی پالیسی کے باعث سزا دی گئی۔ پانچ سال بعد ایک امریکی صدر پاکستان کو واشنگٹن اور پیکنگ کے درمیان ایک پل کے طور پر استعمال کر رہا تھا کہ وہ اس پل کو پار کر کے پیکنگ پہنچ جائے۔ وزیرِ اعظم چو این لائی نے بلا مقصد یہ بات امریکی صدر سے نہیں کہی تھی کہ وہ اس پل کو نہ بھولیں جس کو پار کر کے وہ پیکنگ پہنچے ہیں۔ دوسری مثال برازیل کی ہے۔ صدر گولرٹ مویشیوں کے ایک بڑے باڑے کے مالک تھے اور

بہت دولت مند آدمی تھے۔ ان کی خوبصورت بیوی ایک ملکہ کی طرح لباس پہنتی تھی۔ گولرٹ خواہ کچھ بھی رہا ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے بہت سے روپے ہوں لیکن وہ کمیونسٹ نہیں تھے بالکل اسی طرح جس طرح ایوب خاں کمیونسٹ نہیں تھے۔ لیکن ایک ناقابلِ معافی گناہ جو صدر گولرٹ سے سرزد ہوا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے 1963ء یا 1964ء میں عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کر لیا تھا۔ چین کے ایک تجارتی مشن نے برازیل کا دورہ کیا تھا اور چند مہینوں کے بعد ہی برازیل میں فوجی انقلاب برپا ہوا جس نے صدر گولرٹ کو برطرف کر دیا۔ ان کے برطرف کئے جانے کے وہی اسباب بیان کئے گئے کہ ملک میں افراطِ زر ہے اور اقتصادی بدانتظامی ہے۔ برازیل تقریباً 15 سال سے فوجی ڈکٹیٹر کے تحت ہے۔ اس قدر طویل عرصہ توانسانوں کو انسانی صفات سے محروم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح سے برازیل کی فوجی جنتا نے دہشت گردی کو کنٹرول کیا ہے۔ اب بریژنیسکی کس طرح اپنی تقریروں کا موازنہ جو انہوں نے مئی 1978ء میں چین کی تعریف میں کیں، ان تقریروں سے کریں گے جو گولرٹ نے 1963ء یا 1964ء میں برازیل میں چین کی تعریف میں کی تھیں۔ اگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب وقت وقت کی بات ہے تو دوستوں اور اتحادیوں کو اس لئے تو سزا نہیں دینی چاہئے کہ وہ بہتر طور پر صحیح وقت کی حس رکھتے ہیں۔

مغربی تہذیب عیسائی تہذیب ہے۔ اس عظیم اور شاندار تہذیب کی جڑیں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں پیوست ہیں۔ عیسائیوں کے کہنے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نہ صرف ایک نبی تھے بلکہ وہ "اللہ کے بیٹے" بھی تھے۔ ہم مسلمان انہیں ایک نبی کی حیثیت سے مانتے ہیں اور ان کی پاک اور مقدس پیدائش پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اسلام سختی سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا مذہب ہے۔ وہ "والد" "بیٹے" اور "روح القدس" کے تصور کو قبول نہیں کرتا ہے۔

عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات وہدایات اللہ کے ایک نبی کی تعلیمات وہدایات کے مقابلہ میں زیادہ مقدس ہیں۔ عیسائیوں کے کہنے کے مطابق وہ ہدایات و تعلیمات خود اللہ تعالیٰ کی ہدایات و تعلیمات ہیں۔ تیسری دنیا کے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں گے اگر عیسائی مغرب لفظاً اور معناً حضرت عیسیٰؑ کی صرف ایک ہی ہدایت پر عمل کرے۔ وہ ہدایت یہ ہے کہ "جس بات کا تعلق سیزر سے ہے اس کا حق سیزر کو ادا کرو اور جس بات کا تعلق اللہ سے ہے اس کا حق اللہ کو ادا کرو" تیسری دنیا صرف وہی چاہتی ہے جو اس کا حق ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ دو سو سال سے زائد عرصہ تک مغرب کی عیسائی تہذیب بڑی بے رحمی کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ کی اس ہدایت سے انحراف کر رہی ہے۔ مغرب ہر وہ شے جس کا تعلق سیزر سے ہے لے رہا ہے۔ اور ہر وہ شے بھی لے رہا ہے جس کا تعلق اللہ سے ہے۔ مغرب اس حصہ کو منصفانہ طور پر تقسیم نہیں کر رہا ہے۔ وہ ہمیں وہ شے نہیں دے رہا ہے جس پر ہمارا حق ہے۔ اس تقسیم کا تعلق تیسری دنیا کے اقتصادی۔ سماجی۔ نسلی اور سیاسی حقوق سے ہے۔ اس کا مطلب

www.bhutto.org

افریقہ میں بغیر کسی تاخیر کے اکثریت کی حکومت ہے۔ اس کا مطلب نسلی امتیاز کے خاتمہ اور کسی نسل کو الگ تھلگ کر دینے کے خاتمہ سے ہے۔ اس کا مطلب مواقع کی عدم مساوات کے خاتمہ سے ہے۔ اس کا مطلب انسانی عظمت کے احترام سے ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا مطلب باعزت اور انصاف پر مبنی زندگی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی کو نقصان یا تکلیف پہنچائے بغیر ہی انتظامات کئے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنی روزمرہ کی روٹی چاہتے ہیں۔ ہم اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ روٹی پر مکھن یا کریم ضرور لگایا جائے۔ ہم اس مادی خوشحالی کی سطح پر نہیں پہنچے ہیں کہ طمع میں مست رہیں اور مطلب پرستی میں فخر محسوس کریں۔ ہم اس سے زائد نہیں چاہتے جو ہمارے قریبی پڑوسی کو حاصل ہے۔ ورنہ اچھا پڑوسی ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ ہم مشرق و مغرب اور دونوں دنیاؤں کی دوستی چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیسری دنیا میں ہیں اور یہ وہ دنیا ہے جو دو دنیاؤں کے درمیان ایک پل ہو سکتی ہے۔

ہم فاصلہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم مغرب کو تنگ اور پریشان نہیں کریں گے۔ ہمارا اپل وہ بوسہ نہیں ہوگا جو جنرل موبوتو سیسے سیکو نے صدر ویلری گسکا رڈ ڈی ایسٹینگ کا لیا تھا جب وہ افریقہ کے بارے میں ورسیلز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے جنگ سے تنگ آکر پیرس میں آکر اترے تھے۔ اور نہ ہی ہمارا اپل

جنرل ضیاء الحق کی طرح برطانیہ کے حیران وزیر اعظم کو سینہ سے لگانا ہوگا جب وہ جنوری 1978ء میں لاہور سے اسوان کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ برادرانہ اخوت اور بے تکلفی قدرے مادی مساوات کے حصول سے نہ کہ "آقا۔ ملازم" کے تعلق سے پیدا ہوتی ہے جس کے باعث شدید اقتصادی ناہمواری اور عدم مساوات پیدا ہوتی ہے 1954ء میں ہند چینی کے بارے میں جنیوا کانفرنس میں جان فاسٹر ڈلیس نے وزیر اعظم چو این لائی سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی نئی دہلی میں آخری رسومات کی ادائیگی کے موقع پر خوبصورت لارڈ لوئیس ماؤنٹ بیٹن ایک ایڈ مرل کی شاندار وردی میں میری نشست سے صرف تین نشستوں کے فاصلہ پر بیٹھے تھے۔ میں نے برطانوی لارڈ کے ساتھ جو غیر منقسم ہندوستان کے آخری وائسرائے تھے ہاتھ ملانے سے گریز کیا' کچھ تو اس لئے کہ میرے خیال میں انہوں نے پاکستان کو نقصان پہنچایا تھا اور کچھ اس ہتک کا بدلہ لینے کے لئے جو ڈلیس نے ایشیاء کے ایک عظیم لیڈر کی کی تھی۔ احترام اور ستائش کے ذریعہ ہمارا اپل ہماری دوستی کا ہاتھ ہوگا۔ اگر مغرب احترام و ستائش کا جواب احترام و ستائش سے دیتا ہے تو ہماری دوستی مضبوط اور گرمجوشی سے عبارت ہوگی۔

ہم مغرب کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس کی کمزوریوں اور خوبیوں کا علم ہے۔ مغرب جس نے صدیوں تک تیسری دنیا پر اپنا غلبہ قائم رکھا ہے ہمارے بے چین موڈ اور حساس جذبات کو سمجھنے میں یا تو ناکام رہا ہے اور یا وہ اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا ہے۔ جب روس کے وزیر اعظم اقوام متحدہ میں اپنے جوتے اتار دیتے ہیں اور انہیں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو دکھاتے ہیں تو سیکرٹری جنرل اس پر مسکراتے ہیں۔ بلند پلیٹ فارم سے نیچے اتر کر جاتے ہیں اور روس کے وزیر اعظم کے پاس جا کر ان سے ہاتھ ملاتے

www.bhutto.org

ہیں۔ میں روس کے وزیرِاعظم سے صرف تین قطار آگے بیٹھا ہوا تھا جب ایسا 1960ء کے موسم خزاں میں ہوا تھا۔ لیکن جب ہم اپنے ملک کے جائز حقوق کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں یا اسے بین الاقوامی برادری کا ایک زیادہ کار آمد ممبر بنانا چاہتے ہیں تو ہماری کوششوں کو غلط سمجھا جاتا ہے۔ فوجی انقلاب لانے کی سازش کی جاتی ہے اور اس قسم کے فوجی انقلاب کی کامیابی کے بعد اس قسم کا بیان دیا جاتا ہے تاکہ وہ توانائی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر بات کر رہا تھا۔ "میں اپنے ملک کے جوتے کسی کے چہرے کے سامنے تو نہیں لہراتا ہوں لیکن پھر بھی اقتدار کا نشہ اس قسم کی قابلِ افسوس باتیں کہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

براہِ کرم یہ خیال نہ کریں کہ فوجی جنتا نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں نے بہت زیادہ سختی کے ساتھ اپنی رائے قائم کی ہے۔ مجھے تاریخ کی کافی معلومات ہیں اور میں جانتا ہوں کہ پانسہ پلٹ جاتا ہے اور کل کے شہنشاہ آج کے فقیر بن جاتے ہیں۔ تمہیں علم ہے کہ میں نپولین بونا پارٹ کا مداح ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ فرانسیسی انقلاب اور نپولین کے دور کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کس قدر ہے۔ انقلابیوں نے نہ صرف اپنے بادشاہ کو قتل کیا بلکہ وہ اپنے ہی لائے ہوئے انقلاب میں غرق ہو گئے۔ روبیسپیئر اور ڈینٹن کو پھانسی کے تختہ پر چڑھنا پڑا اور وہ دونوں ممتاز انقلابی تھے۔ انتقام پر انتقام لیا گیا۔ نپولین جو ایک غیر معمولی صلاحیتوں کا انسان تھا اور تہذیب کے قافلہ کا مکمل کپتان تھا اس کو ایلبا اور سینٹ ہیلینا میں مقید کر دیا گیا۔ نپولین کو کس نے ایلبا اور سینٹ ہیلینا جلاوطن کیا؟ فرانس کے عوام نے تو ایسا نہیں کیا۔ فرانس کا انقلاب دو صدیوں پہلے آیا لیکن انتقام اور جوابی انتقام کی وجہ سے وہ اپنے بنیادی مقصد سے محروم ہو گیا۔ جب فرانس کا انقلاب مختلف المزاج ہو گیا اور ذاتیات پر اتر آیا تو فرانس کے عوام (جن کو انقلاب سے بہت زیادہ توقعات تھیں) کا انقلاب پر یقین اور انقلابیوں پر اعتماد ختم ہو گیا۔ فرانس انقلاب کی ماں ہے۔ اس نے انقلاب کے بچہ کو جنم دیا۔ اس وقت سے فرانس کے عوام نے اکثر اوقات فرانس کو انقلاب کے نطفہ سے حاملہ کیا لیکن پیدائش سے پہلے ہی اسقاطِ حمل کرا دیا۔ ہمیں زیادہ دور ماضی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فرانس میں انقلاب کا اسقاطِ حمل مئی 1958ء۔ مئی 1968ء اور مارچ 1978ء میں کیا گیا۔ اس کی جزوی طور پر توضیح تو اس تجربہ سے ہوتی ہے جو 200 سال پہلے فرانس کو انقلاب کے بچہ سے حاصل ہوا تھا۔ اس بچہ نے اسی قدر تخلیق کیا جس قدر کہ تباہ کیا۔ تضاد یہ ہے کہ اسے پرانے نظام کو ختم کرنا اور نئے نظام کی تعمیر کرنا تھا۔ انقلاب کے مخالفین نے اس تضاد کو غلط رخ دے دیا۔ انقلابی لیڈر "آزادی۔ مساوات اور برادرانہ مفاہمت" کے اعلیٰ وارفع اصولوں کو

سنجیدہ نوعیت کے اداروں میں مستحکم کرنے میں ناکام رہے۔ خون خرابہ انقلاب کا عنوان بن گیا۔ انقلاب نے شرفاء کو ختم کر دیا لیکن شرفاء پھر پیدا ہو گئے۔ انقلاب نے بادشاہ اور ملکہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن بادشاہ اور ملکہ فرانس کے تخت پر جلوہ افروز ہو گئے۔

زار اور اس کے خاندان والوں کو ہلاک کر دیا گیا لیکن روسی انقلاب کو اس اقدام کی بنیاد پر تعمیر اور

www.bhutto.org

مستحکم نہیں کیا گیا ہے۔ زار کا قتل روسی اقتدار کی تعمیر سے اس قدر تعلق نہیں رکھتا تھا جس قدر کہ چیانگ کائی شیک کا فرار چین میں انقلاب کی طاقت کی تعمیر سے متعلق نہیں تھا۔ جب جمال عبدالناصر نے فاروق کی بد عنوان حکومت کا تختہ الٹا تو ان کے بہت سے ساتھیوں کی خواہش تھی کہ فاروق کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن ناصر نے انکار کر دیا۔ انہوں نے فاروق کو مصر سے چلے جانے کی اجازت دے دی۔ ناصر کو مہذب دنیا کی نگاہوں میں بلند مقام حاصل ہو گیا۔ انہوں نے بنی نوع انسان کی اعلیٰ ترا قدار کو اپنایا۔ فاروق پورے احترام کے ساتھ مصر سے روانہ ہو گیا۔ ناصر نے اپنے سابق بادشاہ کو سلام کیا' جب شاہی جہاز مصر کے بحری ساحل سے روانہ ہوا۔ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے ناصر نے اسلامی تاریخ کی روایات کی پیروی کی' ان کے انقلاب کو اس لیئے نقصان نہیں پہنچا کہ انہوں نے انقلاب کے ساتھ رحم دلی کا مظاہرہ کیا۔

ترکی میں فوجی جنتا نے یہ خیال کیا کہ ترکی کے مسائل کا ایک آسان اور سادہ طریقہ ادنان میندیرز کو تختۂ دار پر لٹکا دینا ہے۔ ستمبر 1960ء میں ایوب خاں نے مجھے ترکی بھیجا تھا کہ میں فوجی جنتا سے میندیرز کو سزائے موت سے بچانے کی اپیل کروں۔ میں نے جنرل گرسل سے طویل ملاقات کی تھی۔ ترکی کے وزیر خارجہ سلیم موجود تھے۔ جنرل گرسل نے مجھ سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندیرز کی سزائے موت پر عمل کرنے سے حل ہو جائیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اناطولیہ کے کچھ حصوں میں موت کی سزا پر شدید تشدد پر مبنی ردِ عمل ہو گا لیکن پھر چند مہینوں میں ہر شخص میندیرز کو بھول جائے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ ترکی کے مسائل میندیرز کو پھانسی دے دینے سے حل نہیں ہوں گے بلکہ ترکی کے اصل مسائل کی ابتداہی میندیرز کی پھانسی سے ہو گی۔ میں نے ان سے کہا کہ ترکی کے عوام اس پھانسی کو چند مہینوں میں نہیں بھلا دیں گے۔ اس کے برعکس ہر ترک کئی نسلوں تک پھانسی کے گناہ کا احساس اپنے ساتھ لیئے پھرے گا۔ میں نے جنرل گرسل سے کہا کہ میندیرز تو پھانسی پا کر لافانی ہو جائے گا اور اس سانحہ کا گہرا داغ ترکی کے چہرے پر نمودار ہو جائے گا۔ اور اس کی سیاست میں ایک گہری تفریق پیدا ہو جائے گی۔ جب میں جنرل گرسل کے دفتر سے روانہ ہوا تو سلیم سارپر نے اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا کہ "اللہ تمہارا بھلا کرے۔" اس سے قبل میری گرما گرم بحث کرنل الپاسلان ترکیز کے ساتھ ہوئی تھی جو اس وقت فوجی جنتا میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ ترکی اب بھی اس المناک سانحہ کے اثرات سے متاثر ہے۔ وہ اب تک اس نفسیاتی صدمہ سے نجات حاصل نہیں کر سکا ہے۔

حال ہی میں صدر داؤد اور ان کے خاندان والے افغانستان میں تبدیلی کے عمل کے دوران ہلاک کر دیئے گئے۔ ایسا انقلابی جنگ کے دوران ہوا۔ ایسا وقت کی منطق کے مطابق تھا۔ وہ قتل پہلے سے سوچے سمجھے اور بے رحمانہ طریقہ سے اور عدالتی قتل کے ذریعہ نہیں کیا گیا تھا جس کا کہ میں شکار کیا گیا ہوں۔ کسی لمحہ میں اشتعال کے باعث جو کچھ ہو جاتا ہے اور ایک گندی سازش کے درمیان جو مہینوں تک چلتی رہے بہت زیادہ فرق ہوا کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ایک زلزلہ یا کوہِ آتش فشاں کے پھٹنے کی طرح ہے جبکہ

www.bhutto.org

دوسری صورت آہستہ آہستہ زہر دینے کے مترادف ہے یا کسی زنجیر میں جکڑے ہوئے انسان پر سرخ چیونٹیاں چھوڑ دینے کے مترادف ہے۔ آخر کار اس ابتدائی زمانہ کے سے انتقام کا کیا مقصد ہے؟ اس معاملہ میں یہ رویہ مطلب پرستی اور رجعت پسندی پر مبنی ہے۔ ایسا کرنا فوجی جنتا کے فائدہ کی چیز ہے۔ نہ کہ ملک کے عوام کے لئے مفید ہے۔ اگر عوام میرا سر چاہتے تو میں بلا پس و پیش اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیتا۔ اگر میں عوام کے اعتماد و احترام سے محروم ہو گیا تھا تو میں خود ہی زندہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس ڈرامہ کا المیہ یہ ہے کہ مخالف صورت حال درست ہے۔ فوجی جنتا ہر قسم کے مشیر جمع کرتی ہے۔ فوجی جنتا کا ذہن کوئی اچھا مشورہ قبول نہیں کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ کہا گیا تھا کہ انگریز امریکیوں کے نزدیک ویسے ہی ہوں گے جیسے کہ یونانی رومیوں کے نزدیک تھے۔ ایسا نہیں ہوا اس لئے کہ امریکیوں نے اطالوی لوگوں کی طرح برتاؤ کیا۔ فوجی جنتا کے کرتا دھرتا ال کیپو یز یونانیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔

ان وحشیوں نے "میرے" ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر اشتعال اور ذاتی غصہ کا ہونا لازمی ہے۔ "میرے" سے میری مراد ہم سب ہیں یعنی ہمارے دوست اور پارٹی کے وفادار ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے قومی مفادات کو اور زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ بلاشبہ ذاتی تلخی ہے لیکن غیر ذاتی تکلیف کا احساس ذاتی جذبات پر غالب ہے۔ یہ افراد پاکستان کو 1947ء کے دور میں واپس لے گئے ہیں۔ اس عمل میں انہوں نے قوم کو ان اعلیٰ و ارفع نظریات اور اخوت کے جذبہ سے محروم کر دیا ہے۔ جس کا مظاہرہ عوام نے 1947ء میں کیا تھا اور جو ان کے اندر اس وقت موجود تھا۔ یہ صورت حال یہ کہنے سے بھی خراب تر ہے کہ ہم الٹے پاؤں لوٹ آئے ہیں یا یہ کہ ہم اس جگہ پھر واپس آ گئے ہیں جہاں سے ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا۔ قومیں الٹے پاؤں واپس نہیں آیا کرتی ہیں۔ قومیں یا تو ترقی کرتی ہیں یا پھر دھماکہ کے ساتھ انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور یا خاموشی کے ساتھ روبہ زوال ہو جاتی ہیں۔

تم اپنی عمر کے موسم بہار میں ہو لیکن تاریک و مایوس کن سردی کے موسم کی دنیا میں رہ رہی ہو۔ ہر جگہ نامساعد حالات کی پیشگوئی کا احساس ہے۔ یہ ایک گڑبڑ والی اور فتنہ انگیز دنیا ہے۔ عدم اطمینان اور مایوسی کی کیفیت طاری ہے۔ کچھ علاقوں میں دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں صورت حال زیادہ خراب ہے۔ کچھ ممالک میں تو بحران کا تدارک کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ ممالک میں بحران نے اس قدر پیش رفت کر لی ہے کہ وہ تدارک کے مقام سے گزر گیا ہے۔ انسانیت بدترین بحران سے دوچار ہے۔ یہ وہ شدید اور نازک صورت حال ہے جس نے ہنگ سیاؤ پنگ کو 9 جون 1978ء کو دنیا کو خبردار کرنے کے لئے مجبور کیا کہ وہ اس حقیقت کا احساس کرے کہ تیسری جنگ عظیم شروع ہونے والی ہے۔

میں نے مسئلے کے حل سے پہلے باعزت مفاہمت کی ضرورت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خطرناک صورت حال سے بچنے کی آخری کوشش ہے۔ میں زیادہ پرامید نہیں ہوں۔ میں تباہی کو آتا دیکھ رہا ہوں جو ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر اور ساری دنیا کے بچوں کی خاطر میں مسئلے کے آخری

حل سے پہلے مفاہمت کا خواہاں ہوں۔ لیکن اگر میں اپنے پوتے پوتیوں کے بارے میں سوچتا (یعنی میرے وہ پوتے پوتیاں جو ساری دنیا میں ہیں) تو میں کہتا کہ تباہی آنے دو۔ جو لوگ اس عالمی تباہی سے معجزانہ طور پر بچ جائیں گے ان کو از سر نو نئی دنیا تعمیر کرنے کا شاندار موقع حاصل ہو گا۔ ساری ٹوٹی پھوٹی دنیا ان کے قدموں پر ہو گی۔ وہ ایک نئے عالمی نظام کے وضع کرنے والے ہوں گے۔ وہ بغیر کسی حد بندی کے قوم کی تقدیر کے محافظ ہوں گے۔ وہ راکھ اٹھائیں گے اور زیادہ نئے اور بہتر خطوط کی تعمیر کریں گے۔ ان میں سے ہر کوئی ایک بہتر فریک لائیڈ رائٹ اور لے کوربزیر ہو گا۔ شاید ریکارڈو بوفل جیسا غیر معمولی ذہین شخص اس قتلِ عام سے بچ جائے اور مائیکل انجیلو یا گاڈی کی عظمت و بلندی تک اپنے عزم و حوصلہ کے مطابق پہنچ جائے۔ اگر عظیم دھماکہ ہوتا ہی ہے تو اسے ہو لینے دیں۔ کنفیوشس کا تو یہی کہنا ہے۔ موجودہ ڈراؤنے خواب کا ہیجان بغیر کسی اخراج و تحلیل کے ہے۔ جو بھی بھاری عالمی ڈھانچہ کو روکے یا قائم کئے ہوئے ہیں وہ چرچرا رہے ہیں۔ اب یہ ڈھانچہ نیچے گر پڑے گا۔ عارضی انتظامات کس طرح ایک ایسے ڈھانچہ کو برقرار رکھ سکتے ہیں جس میں ڈھانچہ کے بنیادی نقائص موجود ہوں؟۔ سرمایہ دارانہ نظام سڑک کے ایک کنارے پر ہے۔ کمیونزم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور وہ داخلی تنازعات کا شکار ہے۔ تیسری دنیا بڑے بوٹ والے فوجی ڈکٹیٹروں کے لئے فٹبال کا میدان بن گئی ہے۔ فٹبال کو ادھر ادھر لاتیں ماری جا رہی ہے لیکن گول کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ تیسری دنیا کے وہ خطے جہاں آگ بھڑک اٹھنے کا امکان ہے مندرجہ ذیل ہیں ......

1۔ مشرقِ وسطیٰ
2۔ وسطی یورپ
3۔ جنوب مشرقی بحر روم
4۔ شمال مشرقی ایشیاء
5۔ افریقہ

جنگ کے شعلے بھڑک اٹھنے کے اس قدر زیادہ امکانات ہیں کہ تیسری جنگِ عظیم کسی بھی غیر اہم کونہ سے شروع ہو سکتی ہے۔ چیمپئن پہلے ہی اکھاڑے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہ اس وقت نظروں سے اوجھل ہو کر باکسنگ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پہلا مکہ کون مارتا ہے۔ کیا ساری لڑائی میں روایتی قسم کی مکہ بازی ہو گی؟ یہ باکسنگ ایک روایتی لڑائی کی شکل میں شروع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ وسیع ہو کر ایٹمی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے اور اس کا خاتمہ ایٹمی اسلحہ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ ایٹمی اسلحہ کی گنجائش محدود ہے۔ اسی سبب سے بڑی طاقتیں ایٹمی اسلحہ کے بارے میں سمجھوتہ کرنے کی خواہشمند ہیں۔ بڑی طاقتیں باقی دنیا کی تباہی کو کسی بلند پلیٹ فارم سے نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ اس سے جزوی طور پر اس امر کی توضیح ہوتی ہے کہ یورپ کے جارح نوجوانوں نے کیوں چھوٹے پیمانہ پر اور قسط وار اپنی خود تباہی کا انتخاب کیا ہے۔ تباہی یا تو

قسطوں میں یا پھر ایک ہی وار یا جھٹکے میں آ رہی ہے۔ وہ یا تو روایتی ذرائع سے یا ایٹمی ذرائع سے اور یا دونوں ذرائع سے آ رہی ہے۔

تم اس کے لئے تیاری کس طرح کر رہی ہو؟ تم اسکے واسطے تیاری نہ تو سرمایہ دارانہ نظام اور نہ ہی کیمونزم کی طرفداری کر کے کر سکتی ہو اور نہ ہی اس کے واسطے تیاری دونوں بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے کر سکتی ہو بلکہ اس کے واسطے تیار عوام کے ساتھ روابط قائم کر کے اور ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر کے کر سکتی ہو۔ "انسان دس لاکھ ٹن سے بھی یادہ طاقتور ہے" تمہیں آخر تک بنی نوع انسان کے وقار، ذاتی احترام اور مساوات کے لئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیئے۔ ننگے پیر لوگوں کے نقش قدم پر چلو۔ ایک غریب بچے کے بالوں میں جو جوں ہے وہ تمہارا ہتھیار ہے۔ ایک کاشت کار کی مٹی کی جھونپڑی کی گندی بدبو تمہاری زہریلی گیس ہے۔ عوام کی قوت کا اندازہ ہل کی بنائی ہوئی گہری لکیر سے اور کارخانے کے نکلتے ہوئے دھوئیں سے لگا سکتی ہو۔ نظریہ کا رسم الخط ایک فاقہ زدہ انسان کی چیخوں سے پیدا ہو گا۔

براہ کرم یہ خیال نہ کریں کہ میں نظریاتی رہنما اصول پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے حقائق سے سچائی تلاش کرنے کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ میں تمہاری رہنمائی کر رہا ہوں کہ تم ہمارے معاشرے کے تاریخی حالات کے حقائق سے سچائی کی تلاش کرو اور مسائل کی شناخت کرو۔ مسائل کی صحیح شناخت کرنے کے ساتھ ساتھ صحیح حل بھی پیدا ہو گا۔ اور ان بنیادی دستاویزات سے جو میں نے تحریر کی ہیں اور ان تقاریر سے جو میں نے وقتاً فوقتاً کی ہیں (خصوصاً پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد) ان سے بھی استفادہ کریں۔ ان سے اس قدر تخیل کی عکاسی ہوتی ہے اور اس قدر خیالات و نظریات کا اظہار ہوتا ہے کہ ہمارے ناقدین نے بھی ان کو "بھٹوازم" کا نام دیا ہے۔ میں اس قدر بڑھ چڑھ کر دعویٰ نہیں کروں گا۔ تاہم میں یہ تسلیم کروں گا کہ وہ خیالات و نظریات دیسی نوعیت کے ہیں حالانکہ وہ اسلامی تاریخ کے تناظر کے اندر ہیں اور جدید حالات و واقعات سے عبارت ہیں جنہوں نے دنیا کو ہلا ڈالا ہے۔ میں ایسا فرد نہیں ہوں جو تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ہو جبکہ گھوڑا آگے کی طرف جا رہا ہو اور میں سارے سفر کے دوران پیچھے ہی کی طرف دیکھتا رہوں۔ خوفزدہ نہ ہوں۔ ہمت کا زوال تہذیب کے زوال کی پہلی علامت ہے۔ تم صحیح قسم کے اسلحہ اور نظریات سے پوری طرح مسلح ہو گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تمہاری رہنمائی کرے گا۔ وہی مالک اور خالق ہے۔

اس سے پہلے میں نے تمہیں بہت زیادہ عملی مطمع نظر یا عملیت کے نظریہ کے بارے میں متنبہ کیا ہے۔ اب میں تمہیں بہت زیادہ عوامی مقبولیت کے نظریہ سے محتاط رہنے کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی ایک مقبول فیصلہ بالآخر عوام کے لئے مفید نہیں ہوا کرتا ہے۔ نہ تو عملیت کا نظریہ اور نہ ہی عوامی مقبولیت کا نظریہ بنیادی سیاسی اور سماجی و اقتصادی اصول ہیں۔ اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ تم انہیں آزماؤ۔ میں نے اذیت کی حالت میں یہ افسردہ قسم کا تجربہ کیا ہے۔ جیل کی فضا نے میری غیر جانبداری کو

www.bhutto.org

متاثر نہیں کیا ہے۔ میں یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ چونکہ میں موت کی کوٹھڑی میں ہوں اس لئے ساری دنیا موت کی کوٹھڑی میں ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہائی کورٹ نے ساری دنیا کو موت کی سزا سنا دی ہے اس لئے کہ اس نے مجھے موت کی سزا سنائی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کروں گا کہ بنی نوع انسان کے تاریک موسم سرما میں دھوپ کی کرن پھوٹ پڑے اور رنگ برنگ کے پھول کھل جائیں۔ دنیا تو بہت خوبصورت ہے۔ "ایک خوبصورت شے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسرت و شادمانی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ "سطح مرتفع کی خوبصورتی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں کی خوبصورتی ہے۔ ہرے بھرے میدانوں کا حسن ہے۔ غیر ہموار ریگستانوں کا اپنا حسن ہے۔ پھولوں اور جنگلات کا حسن ہے۔ نیلے سمندروں اور بل کھاتے ہوئے دریاؤں کا حسن ہے۔ طرز تعمیر کی شان و شوکت ہے۔ موسیقی کی شان و شوکت ہے اور رقص کی چمک دمک کا حسن ہے۔ سب سے بڑھ کر تو مرد اور عورت کا اپنا حسن ہے جو اللہ تعالیٰ کی تکمیل تخلیق ہیں۔

میں شیلی کے وجودیت کے نظریہ کی حمایت کرتا ہوں۔ حسن ہر جگہ ہے۔ ایک مکمل تباہی والی جنگ میں بھی حسن کو بالکل ملیامیٹ کر دینا ممکن نہیں ہو گا۔ حسن اس قدر زیادہ حسن ہے کہ وہ بالکل ختم نہیں ہو سکتا۔ اس قید تنہائی کے بارہ مہینوں میں میں نے ماضی کا کوئی ناخوشگوار منظر مشکل سے ہی یاد کیا ہے۔ جب میں اس قید خانہ کی دیواروں کو گھنٹوں تک دیکھتا رہتا ہوں تو ماضی کے بہت سے واقعات میرے ذہن میں آتے ہیں۔ ماضی کے کچھ مناظر از سر نو نظروں کے سامنے آئے ہیں۔ جو کبھی بھی میری نظروں کے سامنے دوبارہ نہیں آتے 'اگر میں یہاں مقید نہ کیا جاتا' میں نے بار بار اپنے بچپن کے زمانہ کو جو میں نے گڑھی خدا بخش میں گزارا تھا۔ ان برسوں کو جو میں نے بمبئی میں اسکول میں گزارے اور ان آب و تاب والے برسوں کو جو میں نے برکلے اور آکسفورڈ میں گزارے یاد کیا ہے۔ آگرہ کے تاج محل کی شاہانہ شان و شوکت بار بار میرے ذہن میں آتی ہے۔ اسی طرح مجھے وہ پرسکون دن یاد آتے ہیں جو میں نے سری نگر' گلمرگ اور پہلگام میں گزارے تھے۔ وادی کشمیر حیرت انگیز طور پر خوبصورت ہے۔ اپنے طور پر یورپ کا حسن عدیم النظیر ہے' کوئی شخص بھی اس طمانیت قلب کو نہیں بھول سکتا جو کرائسٹ چرچ کے سبزہ زاروں میں چہل قدمی کر کے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد کیلی فورنیا میں ساحلی سمندر پر کارمل کی طلسماتی کشش کو فراموش کر سکتا ہے۔

زندگی محبت کا ملہ ہے۔ نیچر کی ہر خوبصورتی کے ساتھ اظہار عشق کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ میرا سب سے زیادہ جذباتی عشق اور جذبات خیز یا جسم میں جھرجھری پیدا کر دینے والا رومانس عوام کے ساتھ رہا ہے۔ سیاست اور عوام کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی شادی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "آدمی ایک سیاسی جانور" ہے اور ریاست یا مملکت ایک سیاسی تھیٹر ہے۔ میں بیس سال سے زائد ہنگامہ خیز برسوں سے اس سیاسی اسٹیج پر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے اب بھی کوئی رول ادا کرنا

www.bhutto.org

ہے۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ اب بھی چاہتے ہیں کہ میں سیاست کے اسٹیج پر ہوں۔ لیکن اگر مجبوراً مجھے سیاسی اسٹیج سے علیحدہ رہنا پڑا تو میں تمہیں اپنے احساسات کا تحفہ دیتا ہوں۔ میرے مقابلہ میں تم زیادہ بہتر طور پر یہ جنگ لڑ سکو گی۔ تمہاری تقاریر میری تقاریر کے مقابلہ میں زیادہ فصیح و بلیغ ہوں گی۔ عوام کے ساتھ تمہاری وابستگی مساوی طور پر مکمل ہو گی۔ تمہاری جدوجہد میں زیادہ توانائی اور جوانی کا جوش ہو گا۔ تمہارے اقدامات زیادہ جرأت مندانہ ہوں گے۔ میں اس انتہائی مقدس مشن کی برکتیں تمہیں منتقل کرتا ہوں۔ صرف یہی تحفہ میں تمہیں تمہاری پیدائش کی سالگرہ پر دے سکتا ہوں۔

یہ تو خراب سیاست ہو گی اگر ایسی صورت کو جو متحرک نوعیت کی ہے اس کی اہمیت کو کم کر کے پیش کیا جائے۔ بنی نوع انسان پر اور اس کے مشن پر یقین رکھیں۔ اللہ جو خالق ہے وہ ساری بنی نوع انسان کا اللہ ہے۔ اللہ ہی قادر مطلق ہے' اس دنیا اور اس کے بعد کی دنیا کے خالق نے خود ہی اپنے اوپر مہربانی کرنے اور معاف کرنے کا فرض عائد کیا ہے۔ کوئی بھی فوجی ڈکٹیٹر اپنے اوپر اس قسم کا فرض عائد کرنے کا اہل نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ تو یہ فضول شیخی بگھارتا ہے کہ وہ کسی کو بھی جوابدہ نہیں ہے۔

افریقہ پاگلوں یا خردماغ لوگوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ افریقہ یہ ثابت کرنے کے لئے زندہ رہے گا کہ سیاہ رنگ بھی خوبصورت ہوا کرتا ہے۔ افریقہ قدیم ہے لیکن ایشیاء تو سدا جوان ہے۔ اس کے بانکپن والے حسن نے تو بنی نوع انسان کی پیدائش کے وقت سے ہی تہذیب کو چار چاند لگائے ہیں۔ لاطینی امریکہ ایک ایسے بین الاقوامی کلچر کی کھڑتال بن گیا ہے جو اندلوسیا کو عرب سے اور کیریبین سے منسلک کرتی ہے۔ اس کے شعلہ کی لو میں کس قدر حسن ہے۔ یورپ آب و تاب والا اور محبت کئے جانے کے قابل ہے۔ وہ کئی بار چہرے کو خوبصورت اور پرکشش بنوانے کے باوجود اب بھی دلکش اور خوبصورت ہے۔ امریکہ کے بحری ساحل پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ اس کے رکے ہوئے پانی کے بہاؤ میں اس کے حسن کی عکاسی ہوتی ہے۔ فضائی اصطلاح میں تو ساری دنیا خوبصورت ہے۔ طبیعاتی معنی میں میں نے شاذونادر ہی اس سے زیادہ مناظر کی خوبصورتی دیکھی ہے جیسی کہ میں نے کیلی فورنیا اور ٹیکساس میں دیکھی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اس سب سے زیادہ طاقتور معاشرہ یا ملک کی اندھی قوت اس خوبصورتی کو ایسی بری شکل میں تبدیل کر رہی ہے جیسی کہ ڈورین گرے کی تصویر ہے۔

مذہب اللہ اور بندے کے درمیان اور انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے۔ سیاسی نظریہ انسان اور انسان کے درمیان ایک کڑی یا رابطہ ہے۔ اسی سبب سے ہندومت۔ بودھ مت۔ یہودیت۔ نصرانیت اور اسلام جیسے دنیا کے بڑے مذاہب سیاسی نظریات کے مقابلہ میں زیادہ دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کم علم مہم جو سیاسی اقتدار کی خواہش کے تحت اور اپنے اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے مذہب کو اس کی آفاقی سطح سے گرا کر دنیاوی یا مادی سطح پر لے آتا ہے اور اسے ایک تنگ نظر سیاسی نظریہ میں تبدیل کر دیتا ہے تو وہ مہم جو اللہ اور بندے کے درمیان اور انسان اور انسان کے درمیان کی کڑی یا تعلق کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔

www.bhutto.org

چار معاملات ہیں جن کے ذکر کے ساتھ ہی میں اس خط کو ختم کرنا چاہوں گا۔

1۔ جب میں نے تمہاری والدہ کے ساتھ ستمبر 1951ء میں شادی کی تھی تو میں ہنی مون منانے کے لئے انہیں استنبول لے گیا تھا۔ استنبول ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک پل ہے۔ تاہم میں انہیں استنبول اس لئے لے گیا تھا کہ میں ان کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اسلامی تاریخ کے سنہرے اور سب سے زیادہ جرأت مندابوں یا دوار کے کاریڈوروں میں سے ہو کر گزروں۔ اسلام کی تاریخ جذبات میں تموج پیدا کرنے والی ہے لیکن جس قدر وہ ترکی میں متواتر حیثیت سے جذبات میں تموج پیدا کرتی ہے اس قدر کسی اور ملک میں نہیں کرتی۔

2۔ جوانی کے زمانہ سے ہی میں برطانوی سامراجیت کے خلاف جنگ کرتا رہا ہوں۔ مجھے سامراجیت سے سخت نفرت ہے لیکن جب میں ان ذلت آمیز یا تذلیل کن دنوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے اندر کوئی تلخی باقی نہیں ہے اب وہ دور ایک بند باب کی طرح ہے۔ تم ماضی کی جدوجہد کی یاد میں تو زندگی نہیں گزار سکتی ہو جب تم مکمل طور پر حال کی جدوجہد میں مصروف ہو۔

3۔ 15 رجون 1978ء کو جنرل شوکت مجھے دیکھنے کے لئے آئے اس لئے کہ میں بیمار تھا۔ انہوں نے سول اور ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی میں میرا آپریشن 1963ء میں کیا تھا جب میں وزیر خارجہ تھا۔ ہمیں یاد تھا کہ جب میں کلوروفارم کے اثر سے مغلوب ہوتا جارہا تھا تو میں بار بار کہتا جا رہا تھا کہ میں اکبر بگٹی کو حکومت کے ہاتھوں موت کی سزا نہیں ہونے دوں گا۔ میں اکبر بگٹی اور خیر بخش مری کے نام پکارتا رہا۔ تاریخی واقعات کا گھروندا کس قدر عجیب ہے؟ 1973ء میں پاکستان کے صدر کی حیثیت سے میری پاکستان کی خاطر ان ہی بلوچ لیڈروں سے محاذ آرائی ہوئی۔ اگر اتفاق سے تمہاری ملاقات ان لیڈروں سے ہو جائے تو ان سے کہنا کہ مجھے اس بات پر یقین ہے کہ ایک بلوچ ایک بہادر باپ کا بیٹا اور ایک ایسی ماں کا بیٹا ہوتا ہے جس کو اپنے اوپر فخر ہوتا ہے۔ بہادری اور فخر دونوں ہی بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کے چہرے سے نمایاں ہوتے ہیں۔

4۔ 1957ء کے موسم سرما میں جب تم چار سال کی تھیں تو ہم "المرتضیٰ" کے بلند چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صبح کے وقت موسم بڑا خوشگوار تھا۔ میرے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ ایک بیرل 22ء اور دوسرا 480ء کا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک جنگلی طوطا مار گرایا۔ جب طوطا چبوترے کے قریب آکر گرا تو تم نے چیخ ماری۔ تم نے اسے اپنی موجودگی میں دفن کرایا۔ تم برابر چیختی رہیں۔ تم نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ ایک مردہ طوطے نے 1957ء کے موسم سرما میں لاڑکانہ میں ایک چھوٹی سی لڑکی کو رلا دیا تھا۔ 21 سال بعد وہ چھوٹی سی لڑکی ایک نوجوان لڑکی بن گئی ہے جس کے اعصاب فولادی ہیں اور جو ظلم کی طویل ترین رات کی وحشت کا بہادری سے مقابلہ کر رہی ہے۔ حقیقتاً تم نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ بہادر سپاہیوں کا خون تمہاری رگوں میں موجزن ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ کمزوریوں سے پر ہے۔ میں بارہ مہینے سے قیدِ تنہائی میں ہوں اور تین مہینے سے موت کی کوٹھڑی میں ہوں اور تمام سہولتوں سے محروم ہوں۔ میں نے اس خط کا کافی حصہ ناقابلِ برداشت گرمی میں اپنی ران پر کاغذ کو رکھ کر لکھا ہے۔ میرے پاس حوالے دینے کا کوئی مواد یا لائبریری نہیں ہے۔ میں نے نیلا آسمان بھی شاذونادر ہی دیکھا ہے۔ حوالہ جات ان چند کتابوں سے لئے گئے ہیں جن کو پڑھنے کی مجھے اجازت تھی اور ان اخبارات ور سائل سے لئے گئے ہیں جو تم یا تمہاری والدہ اس دم گھونٹنے والی کوٹھڑی میں مجھ سے ہفتے میں ایک بار ملاقات کرنے کے وقت ساتھ لے کر آتی ہو۔ میں اپنی خامیوں کے لئے بہانے نہیں تراش رہا ہوں۔ لیکن اس قسم کے جسمانی اور ذہنی حالات میں گرتی ہوئی یادداشت پر بھروسہ کرنا بہت مشکل ہوا کرتا ہے۔

میں پچاس سال کا ہوں اور تمہاری عمر میری عمر سے نصف ہے۔ جس وقت تک تم میری عمر کو پہنچو گی تمہیں عوام کے لئے اس سے دوگنی کامیابی حاصل کرنی چاہئے۔ جس قدر کہ میں نے ان کے لئے حاصل کی ہے۔ میر غلام مرتضیٰ جو میرا بیٹا اور وارث ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہے اور نہ ہی شاہنواز اور صنم میرے ساتھ ہیں۔ میرے ورثہ کے حصہ کے طور پر اس پیغام میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔ میر سائیں رابرٹ کینیڈی کے بیٹے کا قریبی دوست ہے۔

"ہر نسل کا اپنا مرکزی مسئلہ ہوا کرتا ہے کہ آیا جنگ کو ختم کرنا ہے۔ نسلی نا انصافی کو مٹانا ہے یا کارکنوں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کے نوجوانوں کو انفرادی انسان کے وقار کی فکر ہے اور وہ ضرورت سے زائد اختیار اور طاقت کی حد بندی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ ایسی حکومت چاہتے ہیں جو اپنے شہریوں سے براہ راست اور دیانتداری کے ساتھ بات کرے۔ امکانات تو بہت زیادہ ہیں۔ داؤ پر بہت کچھ لگا ہوا ہے۔ میں آنے والی نسل کے لئے ٹینی سن کا مایوس کن لیکن ایک طرح سے پیغمبرانہ پیغام چھوڑتا ہوں کہ "ارے پچاس سال کی عمر میں میں کیسا ہو جاؤں گا اگر قدرت نے مجھے زندہ رکھا جبکہ اس پچیس سال ہی کی عمر میں میں دنیا کو اس قدر تلخ پاتا ہوں۔"

ذوالفقار علی بھٹو

ڈسٹرکٹ جیل۔ راولپنڈی

21جون1978ء

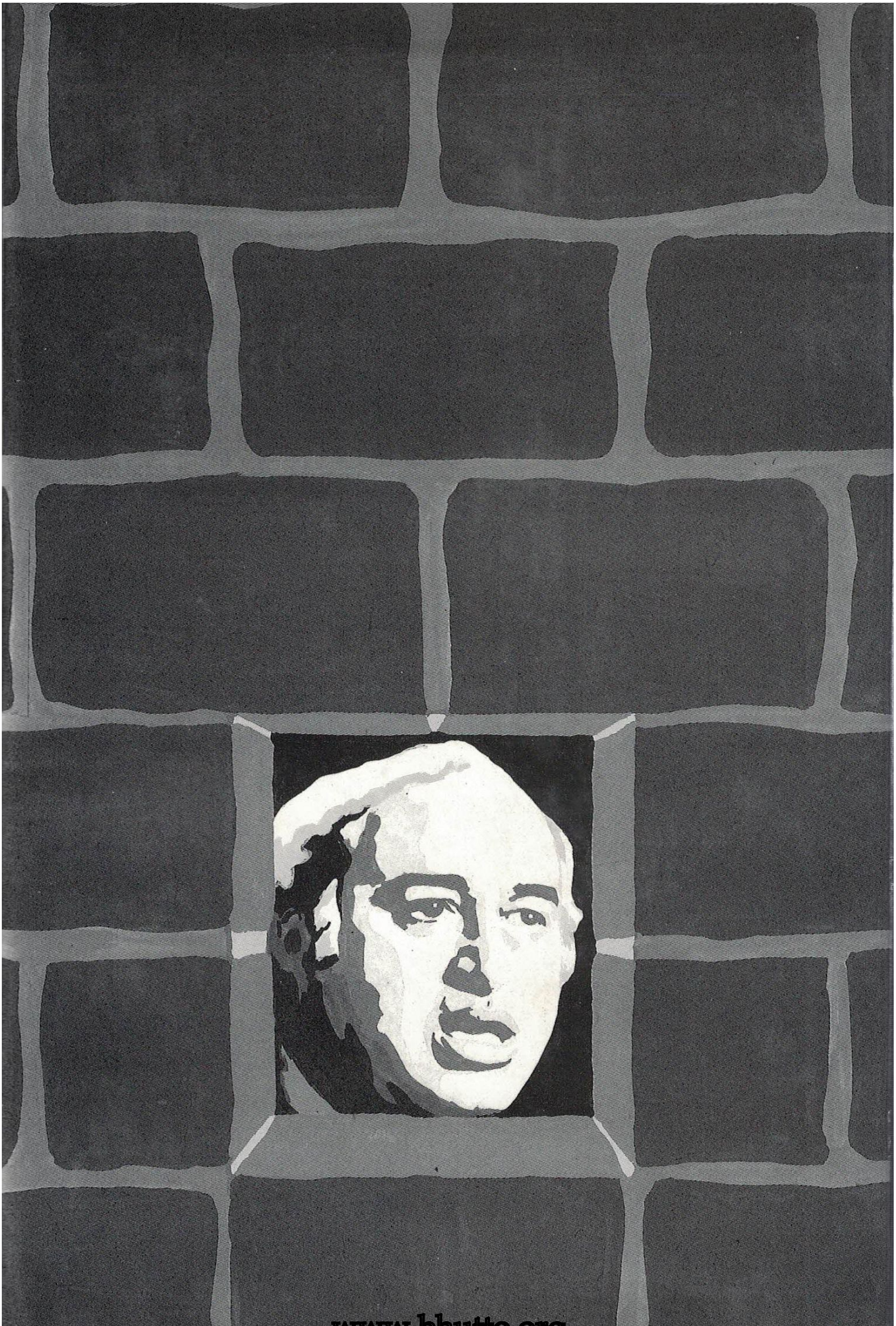

www.bhutto.org